تشریحات ترمذی
تالیف
حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی
جلد ہفتم
قدیمی کتب خانہ
مقابل آرام باغ۔ کراچی

تشریحات ترمذی

تالیف

حضرت مولانا کمال الدین المسترشد

خادم الاحادیث النبویہ

جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی

جلد ہفتم

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ۔ کراچی

نام کتاب: تشریحاتِ ترمذی

تالیف: حضرت مولانا کمال الدین المسترشد

کمپوزنگ: مولانا شمس الحق

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ۔ کراچی

فون: 021-32627608
021-32623782

فہرست عنوانات تشریحات ترمذی جلد ہفتم

فہرست عربی ابواب

تم المجلد السابع

ويليه المجلد الثامن

اوله ابواب فضائل القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ماجاء فی اشراط الساعة

علاماتِ قیامت کے بیان میں

عن انس بن مالکؓ انه قال: احدثکم حدیثاً سمعته من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لایُحَدِّثکم احدبعدی "انه سمعه من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم" قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: "ان من اشراط الساعة ان یُرفع العلم ویَظهر الجهل ویَفشُو الزنا ویُشرب الخمر ویُکثر النساء ویَقِلُّ الرجال حتی یکون لخمسین امرأة قَیِّم واحد". (حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں تمہیں ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے میرے بعد کوئی بھی تم کو یہ نہیں بتا سکے گا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ راست) سنا ہے، (کیونکہ ایسا صحابی ہی کہہ سکتا ہے جو میرے بعد یہاں موجود نہیں رہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کی علامات میں سے یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا اور جہل ظاہر (عام) ہوجائے گا اور زنا عام ہوجائے گا اور شراب پی جانے لگے گی اور عورتیں زیادہ ہوجائیں گی اور مرد کم ہوجائیں گے یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا ایک ہی ذمہ دار ہوگا (یعنی منتظم ہوگا)۔

لغات:۔قولہ: "اشراط" شَرَط بفتح الراء کی جمع ہے بمعنی علامت ونشانی کے کمامر۔
قولہ: "یفشو" فَشَا یفشو فُشُوّاً وفَشْواً بمعنی ظاہر ہونے، پھیلنے اور عام ہونے کے ہے۔**قولہ:** "قَیِّم" بفتح القاف وتشدید الیاء المکسورة سربراہ، منتظم اور ذمہ دار کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اس حدیث میں یہ انداز گفتار اپنانا ترغیب کے لئے ہے پس اگر مخاطب اہل بصرہ ہوں تو چونکہ یہ بصرہ میں آخری صحابی رہ گئے تھے لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ میرے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے یہ حدیث یا نفس حدیث آنحضور علیہ السلام سے سنی ہے کہ بصرہ میں ان کے بعد کوئی صحابی تھا ہی نہیں۔ اور اگر یہ عام خطاب ہو تو پھر اگرچہ ان کے بعد صحابہ کرام کا وجود تو تھا مگر شاذ ونادر۔ اس لئے نفی عموم صحیح ہے کہ القلیل کالمعدوم۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ان الفاظ میں کوئی بھی تم کو نبی علیہ السلام سے براہ راست

نقل نہیں کر سکے گا کہ اس کا سماع آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جن حضرات کو حاصل ہے ان میں صرف میں ہی باقی ہوں۔

اس حدیث میں رفع العلم کی پیش گوئی کی گئی ہے جس کا تذکرہ سابقہ باب سے پیوستہ "باب ماجاء فی الھرج" میں گذرا ہے تاہم وہاں بجائے جہل بڑھ جانے کے قتل عام ہونے کا ذکر تھا مگر ان دونوں میں تلازم ہے کیونکہ علم جس تناسب سے کم ہوتا ہے اسی تناسب سے جہل بڑھ جاتا ہے کہ دونوں متضاد چیزیں ہیں اور جہل عام ہونے کی صورت میں قتل بھی عام ہونا لازمی سی بات ہے کہ دنیاوی مفادات کے لئے کسی کا خون بہانا آسان تر ہو جائے گا، علاوہ ازیں آج کل عام علماء میں دنیاوی تذکرہ عام ہوتا ہے یہ بھی تقلیل علم کا سبب ہے جہاں تک شراب پی جانے کے عموم کی بات ہے تو اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ یا تو لوگ اس کی حرمت سے انکار کر دیں گے یا نام تبدیل کر کے تاویل کر لیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حرمت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے اجتناب نہیں کیا جائے گا کہ حرام و حلال کی اہمیت ختم ہو جائے گی، اسی پر قیاس کر کے زنا کا عام ہونا مستبعد نہیں بلکہ آج تو یہ دونوں صورتیں ہمارے سامنے ہیں عورتوں کا سیلاب بازاروں میں اُمڈ آیا ہے اور تحسین کی نت نئی صورتیں روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہیں ایک سے ایک انداز اختیار کئے جا رہے ہیں، موسیقی عام ہوگئی ہے اور مستی کے سارے دروازے کھل گئے ہیں حکومتی کوششوں بلکہ بین الاقوامی سازشوں کی وجہ سے فحاشی و عریانی کو فروغ دینے کے لئے بڑی بڑی رقوم خرچ کی جا رہی ہیں اور حقوق نسواں کے نام پر عورتوں کو زنا و غنا کی آزادی دی جا رہی ہے ایسے میں ناقصات العقل اپنی عفت کو خیر باد کہنا ترقی نہیں سمجھیں گی تو کیا کریں گی؟

عورتوں کی کثرت کی سائنسی وجہ یہ ہے کہ عورت کے نطفے میں X (ایکس) نوعیت کا بیضہ ہوتا ہے جبکہ مرد کے نطفے میں X اور Y (ایکس اور وائی) دونوں ہوتے ہیں پس اگر جماع کے وقت ایکس منتقل ہو جائے تو دونوں ایکس مل کر لڑکی جنم دینے کا سبب بنتے ہیں جبکہ وائی منتقل ہونے کی صورت میں لڑکا پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ وائی چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر رحم میں X تلاش کر کے اس سے مل جائے ورنہ تو ضائع ہو جاتا ہے جبکہ ایکس کی زندگی نسبتاً زیادہ ہے، دوسری طرف کثرت جماع سے وائی کی پیداوار بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ نوجوانی میں شادی کر لیتے ہیں یا وہ محنت کش ہوتے ہیں تو مردانہ طاقت زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بیوی سے جلدی جلدی ملتے ہیں اس طرح لڑکے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بخلاف تاخیر سے شادی کرنے والوں اور سُست و کاہل لوگوں کے۔ کیونکہ قدرتی طور پر ان دونوں فریقین کی مردانہ طاقت خود بخود کم ہو جاتی ہے، آج کل لوگ دیر سے شادی

کرنے کے عادی ہوگئے ہیں اور کام کاج و محنت بھی کم ہوگئی اس لئے لڑکیاں کثیر ہوگئیں ان گنت آلات تعیش وصنعت نے انسان کو محنت سے تقریباً فارغ کر دیا ہے جو کام پہلے ہاتھ سے کئے جاتے تھے وہ آج مشینوں کے ذریعے کئے جاتے ہیں اور جو مسافت پیدل چلنے سے طے کی جاتی تھی وہ آج گاڑیوں اور جہازوں کے ذریعے طے کی جاتی ہے لہٰذا اس کالازمی نتیجہ مردانہ طاقت اور پھر ''وائی'' کا کم ہونا ہے جس سے لڑکیوں کی شرح پیداوار بڑھ رہی ہیں آج کی دنیا میں بھی لڑکیوں کا تناسب لڑکوں سے زیادہ ہے اور اس میں تیزی سے اضافہ شروع ہوگیا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لڑکے کے ماں باپ رشتے کے لئے لڑکی تلاش کرتے مگر اس میں بعض دفعہ ناکامی ہوجاتی جبکہ آج لڑکی کے ماں باپ کو رشتہ کے لئے سرگرداں پھرنا پڑتا ہے اور پھر بھی بہت سی لڑکیاں رشتۂ ازدواج سے محروم ہیں آگے چل کر یہ اضافہ اور بھی زیادہ ہوگا۔

اس حدیث میں '' قَیِّـم '' سے مراد شوہر نہیں بلکہ ذمہ دار اور متولی ہے یعنی ایک گھر میں کثرت سے لڑکیاں ہوں گی خواہ ان میں بہنیں اور بیٹیاں ہوں یا بیویاں اور ماسیاں، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری دنیا کا یہ حال ہو بلکہ بعض علاقے جیسے گرم خطے اگر اس کی لپیٹ میں آجائیں تو بھی پیش گوئی صادق ہوگی، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ کثرت کا تناسب اٹھانوے فیصد یا ناوے فیصد ہو بلکہ نفس تکثیر سے بھی حدیث کا مصداق پایا جائے گا خواہ وہ اٹھانوے فیصد سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ غرض ان امور سے عقول وانساب برباد ہونگے اور نتیجۃً معاد بھی متاثر ہوگا۔

دوسری حدیث:۔ عن الزبیر بن عدی قال دخلنا علی انس بن مالک قال: ''فشکونا الیہ مانلقیٰ من الحجاج فقال: مامن عام الاّ والذی بعدہ شرٌّ منہ حتی تلقوا ربکم سمعت ھذا من نبیّکم صلی اللہ علیہ وسلم ''. (ھذا حدیث حسن صحیح)

حضرت زبیر بن عدی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) کے پاس (اندر یعنی ان کے گھر) گئے اور ان سے حجاج کی جانب سے ملنے والی تکلیفات کی شکایت کی تو حضرت انسؓ نے فرمایا کوئی سال ایسا نہیں مگر اس کے بعد آنے والا سال اس سے زیادہ بدتر ہوگا یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو یہ (بات) میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

تشریح:۔ یہ باعتبار اغلب حالات کے ہیں یا باعتبار زمانہ کے ہے کہ ہر آنے والا وقت گذرے ہوئے

زمانے سے برا ہوگا کیونکہ مرور زمانہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد پاک سے دوری آنا لازمی بات ہے نہ اس میں پہلے جیسے لوگ رہتے ہیں اور نہ ہی پہلے جیسا علم وعمل اور ورع وتقویٰ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ برکات ہوتی ہیں ہاں البتہ جب ایک سخت دور گذرتا ہے تو لوگ کچھ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اکثریت گناہوں سے توبہ تائب ہو جاتی ہے پھر ان میں سے نیک وصالح قیادت سامنے آجاتی ہے اور جب دوبارہ آسائشوں میں گم ہو جاتے ہیں تو پھر نئی نسل عیاشی کے درپے ہو جاتی ہے پھر ان میں فساق حکمران سامنے آتے ہیں جو اپنے ہی لوگوں پر مظالم ڈھاتے ہیں اس طرح ایک دور اچھا گذرتا ہے اور ایک خراب مگر مجموعی اعتبار سے برائی غالب اور بڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ ان ادوار میں مشکل ترین اور بدترین دور دجال ملعون کا آئے گا پھر اللہ کے فضل سے اسی تناسب سے بہترین دور متصل آئے گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے شروع ہوگا، بہرحال حدیث میں شر سے مراد باعتبار دنیا کے نہیں بلکہ باعتبار دین کے ہے۔

تیسری حدیث:۔ عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لایقوم الساعة حتی لایقال فی الارض "اللّٰہ، اللّٰہ". (حدیث حسن)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمین میں اللہ، اللہ نہیں کہا جائے گا، یعنی جب تک اللہ کو یاد کرنے والے موجود ہوں گے اور اللہ کی یاد باقی ہوگی اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی کیونکہ دنیا وکائنات کی تخلیق کا اصل فائدہ اللہ کی عبادت اور اس کی یاد ہے تو جب تک ذکر باقی ہے تو دنیا کا فائدہ باقی ہے اور جب ذکر ختم ہوگا تو دنیا کا فائدہ ختم ہو جائے گا اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان کو بلا فائدہ پیدا نہیں کیا ہے لہٰذا ذکر کے اختتام کے ساتھ ہی دنیا کا بھی خاتمہ کر دیا جائے گا تاکہ کوئی فضول اور محض لغویت لازم نہ آئے۔

تشریح:۔ یہ حدیث مسلم وغیرہ میں بھی آئی ہے اس میں لفظ "اللہ" مکرر تاکید کے لئے ہے یا تاسیس کے لئے؟ اس کا دارومدار، اس پر ہے کہ اس حدیث کا مطلب کیا ہے تو اس بارے میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف کافی پرانا ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ بعض علماء وصوفیاء کرام کے یہاں فقط لفظ اللہ کا ورد کرنا بھی ذکر ہے علیٰ ہٰذا یہاں تکرار برائے تاسیس ہے یعنی اس میں ذکر کا ایک طریقہ بتلایا گیا ہے، مگر اس کے برعکس بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حدیث کا مطلب تو ذکر اللہ ہی ہے مگر لفظ مفرد کے ساتھ نہیں بلکہ جملہ کی صورت میں مثلاً سبحان اللہ، والحمد للہ، واللہ اکبر وغیرہ۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس پر زیادہ بحث نہیں فرمائی ہے بلکہ اس کے بارے میں صرف چند باتیں تحریر فرمائی ہیں:

(ا)مامعنی الحدیث فهوان القیٰمة انماتقوم علی شرار الخلق....

.(۲) یہ ہے کہ اللہ، اللہ کا اعراب رفع ہے اور رفع کی صورت میں یہ معرب ہوگا اور کسی محذوف کے ساتھ مرکب ہوگا جیسے "یااللّٰہ" یالَااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وغیرہ۔ تدبر المستر شد

(۳)واعلم ان الروایات کلهامتفقة علی تکریر اسم اللّٰہ تعالیٰ فی الروایتین وهکذافی جمیع الاصول ،قال القاضی عیاض وفی روایة ابن ابی جعفریقول :"لااِلٰهَ اِلاّاللّٰہ". و اللّٰہ اعلم (نووی شرح مسلم ص:۸۴ ج:۱)

یعنی ابن ابی جعفر کی روایت حدیث الباب کی مفسر ہے، اور مراد ایمان باللہ ہے تاہم اذکار میں اہم قاعدہ یہ ہے کہ بعض اوقات جہر دلجمعی میں معاون ثابت ہوتا ہے اور بعض دفعہ اخفاء، کبھی اسم الذات سے دفع وساوس وجمع خواطر میں زیادہ فائدہ محسوس ہوتا ہے اور کبھی ذکر نفی واثبات سے لہٰذا اصل تو پورا جملہ اور اخفاء ہے مگر جن اوقات میں مذکورہ فوائد ملحوظ ہوں تو واضح فائدے کی صورت میں اس طریق کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے مگر معمول اصل ہی ہونا چاہئے **فان الضروری یتقدر بقدر الضرورة ۔**

حدیث آخر:۔عن حذیفة بن الیمان قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم :"لاتقوم الساعة حتی یکون اَسعَدَالناسِ بالدنیالُکَعُ بن لکع".(حدیث حسن)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کمینہ ولد کمینہ دنیاوی اعتبار سے خوش حال نہ بن جائے۔

لغات وترکیب مع التشریح:۔قوله: اسعد الناس منصوب ہے بنا بر خبریت۔**قوله** "لُکَعُ بن لکع" مرفوع ہے کہ یکون کا اسم مؤخر ہے یہاں تقدیم خبر مبالغہ کے لئے ہے یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہی ہوگا یعنی تصور کیا جائے گا اور شمار کیا جائے گا جو دنیاوی مال ومتاع اور منصب واثر ورسوخ والا ہوگا خواہ وہ نسب واخلاق اور علم وعقل کے اعتبار سے کمتر ہی کیوں نہ ہو۔لکع بضم اللام وفتح الکاف کمینہ اور نیچ ذات کے آدمی کو کہا جاتا ہے، کم علم اور کم عقل والے پر بھی اطلاق ہوتا ہے یعنی دنیاداری اتنی بڑھ جائے گی کہ تمام تر خوبیوں کا محور مال ومتاع اور منصب ہوگا۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ سفلہ اور نیچ ذات کے لوگ جب تک دنیاوی معاملات، سیاسات واختیارات وغیرہ کے متصرف وارباب اختیار نہیں بنیں گے قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی کیونکہ جب تک حسب ونسب کے لوگ ارباب اختیار ہوں گے تب تک خسیس حرکات کا راستہ بند ہوگا اور جب گھٹیا قسم کے لوگ اوپر آجائیں گے اور شریف لوگ بے اثر ہوجائیں گے تو پھر فحاشی وعریانی اور زنا وغنا کا راج ہوگا غرض قلب الحقائق کے بعد ہی قیامت قائم ہوگی، چنانچہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے حدیث جبرئیل ودیگر احادیث کو یکجا کرنے کے بعد لکھا ہے: "وهذا كله من انقلاب الحقائق في آخر الزمان وانعكاس الامور"۔

صحیح الحاکم میں مرفوع حدیث ہے:

"ان من اشراط الساعة ان يوضع الاخيار وترفع الاشرار". (شرح الخمسین ص ۵۵)

آج کل یہ پیش گوئی بھی صادق ہوچکی ہے کیونکہ اب معاشرے میں علماء کو دہشت گرد اور فلمی اداکاروں اور گلوکاروں اور دیگران پیشہ ور لوگوں کو جن کا تعلق عموماً غلط والدین اور نیچ ذات کے ساتھ ہوتا ہے امن کے داعی اور قوم کا ہیرو سمجھا اور گردانا جاتا ہے اور اب تو ہیجڑوں نے بھی مطالبہ کردیا کہ اسمبلی کی سیٹوں میں ہمارا بھی یعنی جیسے اقلیتوں کا ہے کوٹہ مقرر ہونا چاہئے۔

حدیث آخر:۔ عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ": تَقِيُّ الارض افلاذ كبدها اَمثَال الاُسطوانة من الذهب والفضة قال: فيجئ سارق فيقول: "في هذا قُطِعَت يَدِى "ويجئ القاتل فيقول "في هذا قَتَلتُ "ويجئ القاطع فيقول "في هذا قَطَعتُ رحمى ثم يَدَعُونَه فلا يأخذون منه شيئا". (هذا حديث حسن غريب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے (یعنی اندرونی) خزانے سونے چاندی کے بشکل ستونوں کے اُگل دے گی، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: پس چور آکر کہے گا کہ اسی کے حصول میں میرا ہاتھ کاٹا گیا ہے، اور قاتل (اس کے پاس) آکر کہے گا اسی کی خاطر میں نے قتل کیا ہے اور صلہ رحمی توڑنے والا آئے گا تو کہے گا کہ اسی کے لئے میں نے قطع رحمی کی ہے، پھر وہ سب اس کو چھوڑ دیں گے اور اس میں سے کچھ بھی نہیں لیں گے۔

لغات:۔ **قوله:** "تقئ" قی سے بمعنی خارج کرنے اور اُگلنے کے ہے۔ **قوله:** "اَفلاذ" بفتح الهمزة فَلذَةٌ کی جمع ہے وہ ٹکڑا جو لمبائی میں کاٹا گیا ہو۔ اس لئے فرمایا "امثال الاسطوانة" یعنی جیسے لمبے لمبے ستون

ہوتے ہیں، سونے چاندی کے یہ ٹکڑے بھی ایسے لمبے لمبے ہونگے، پھران کو زمین کے جگر کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح جگر بطن میں یعنی اندر ہوتا ہے اسی طرح یہ معدنیات بھی زمین کے پیٹ میں ہوتی ہیں۔

تشریح:۔ زمین کا مرکز جو سطح سے تقریباً ساڑھے چھ ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے مائع مواد پر مشتمل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مرکز انتہائی گرم ہے اور درجۂ حرارت زیادہ ہونے کی وجہ سے کوئی چیز منجمد نہیں رہ سکتی چنانچہ وہ حرارت ہر وقت باہر نکلنے کے لئے کوشاں رہتی ہے جو عموماً لاوے کی شکل میں کمزور حصوں سے خارج ہوتی ہے اس کے نتیجے میں زلزلے بھی آتے ہیں اس طرح دونوں صورتوں میں یعنی خواہ زلزلے کی جنبش ہو یا لاوے کا دباؤ معدنیات کو باہر پھینکا جاتا ہے چونکہ قیامت کے قریب لاوے اور زلزلے کثرت سے رونما ہوں گے۔ اس لئے سونے چاندی کا اخراج ہوگا۔ اور چونکہ زمین میں بھی رگیں ہوتی ہیں اس لئے ان کی صورت ستونوں کی طرح ہوگی۔

اس حدیث میں چور، قاتل اور قاطع سے مراد جنس بھی لے سکتے ہیں اور معین افراد بھی جنہوں نے خود یہ اعمال کئے ہوں اور اپنے ہی بارے میں افسوس کرتے ہوں گے، اور ان کا سونا چاندی چھوڑنا دو وجہ سے ہوسکتا ہے کہ یا تو مال کی بہتات ہوگی اس لئے وہ ضرورت محسوس نہیں کریں گے یا پھر فتنوں کی شدت اتنی زیادہ ہوگی کہ سونا چاندی یا دیگر نقدی کسی کام کی نہ رہے گی کیونکہ بازاروں میں سودا سلف کے بجائے قتل وقتال کا بازار گرم ہوگا یا افراتفری کی وجہ سے ان لوگوں کو اس سونا چاندی میں سے کچھ کاٹ کر لینے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ (تدبر)

باب

پندرہ علامتیں

"عن علی بن ابی طالب قال قال رسول صلی اللہ علیه وسلم :اذافَعَلَت اُمّتِی خمس عشرۃ خصلۃً حَلَّ بھاالبلاءُ قیل:ماھی؟یارسول اللہ!قال:اذاکان المغنم دُوَلاً والامانة مَغنَماًوالزکاۃ مغرماًواطاع الرجلُ زوجته وعَقَّ اُمَّه وَبَرَّ صدیقه وجَفَاأباہ وارتفعت الاصوات فی المساجدوکان زعیم القوم اَرذلھم واُکرِمَ الرجلُ مخافة شرہ وشُرِبَتِ الخمورولُبس الحریرواُتّخِذَتِ القِیانِ والمعازف والَعَنَ اٰخرُھذہ الامة اَوَّلَھا،فلیرتقبواعندذالک

ریحاً حمراء او خسفا او مسخا". (هذا حديث غريب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میری امت پندرہ چیزوں کی عادت بنالے گی تو ان پر مصیبت (آزمائش) نازل ہوگی، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! وہ اشیاء کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مال غنیمت کو اپنی دولت سمجھا جائے اور امانت کو غنیمت (یعنی اس میں تصرف اپنا حق) سمجھا جانے لگے اور زکوۃ کو تاوان سمجھا جائے اور آدمی اپنی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے اور اپنے دوست سے نیک سلوک کرے اور پدر شفیق پر ستم کرے (یعنی دوری اختیار کرے جو موجب ظلم وستم ہے) اور مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں اور قوم کا رذیل آدمی ان کا ذمہ دار (بڑا) بن جائے اور آدمی کا اکرام اس کے شر کے خوف کی بناء پر کیا جائے اور (بکثرت) شراب پی جائے اور ریشم (کالباس) پہنا جائے اور گانے والیوں کے رکھنے (یعنی پالنے اور حوصلہ افزائی کرنے یا تنخواہ پر رکھنے) کا رواج ہو جائے اور موسیقی کے آلات اختیار کئے جائیں اور اس امت کے آخر والے اس کے اگلوں پر لعن وطعن کرنے لگیں تو چاہیئے کہ اس وقت وہ انتظار کریں سرخ آندھی کا یا دھنس جانے کا یا شکلوں کے بگڑ جانے کا۔

لغات:۔قولہ: "خصلة" عادت کو کہتے ہیں اچھی ہو یا بری یہاں مذموم عادتیں مراد ہیں۔**قولہ:** "حَلَّ بها" بفتح الحاء واللام المشددة ای نزل. **قولہ:** "البلاء" آزمائش، مصیبت اور رنج وغم۔**قولہ:** "دُوَلاً"، بضم الدال وفتح الواو جو چیز ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے چنانچہ پیسے بھی ہاتھ در ہاتھ ادلتے بدلتے ہیں اس لئے ان کو دولت کہتے ہیں۔**قولہ:** "مغرماً" وہ چیز جو لازم نہ ہو اور ذمے پڑ جائے، جرمانے اور تاوان بھرنے کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** "جفا" سخت ہونے اور بے رُخی وسختی سے پیش آنے کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** "زعیم" کفیل اور ذمہ دار کو کہتے ہیں چونکہ قوم کا سردار ان کا ذمہ دار ہوتا ہے اس لئے اسے زعیم کہتے ہیں۔ **قولہ:** "القینات" قینۃ بفتح القاف کی جمع ہے قِیَان بروزن قیام بھی جمع آتی ہے باندی کو کہتے ہیں مگر زیادہ تر استعمال مُغَنِّیہ یعنی گانے والی لونڈی میں ہوتا ہے۔**قولہ:** "المعازف" بفتح المیم وکسر الزاء معزف بروزن منبر یا عزف کی جمع ہے، باجے ودیگر آلات غنا کو کہتے ہیں پھر معازف وہ آلات کہلاتے ہیں جو ہاتھ سے بجائے جائیں جبکہ مزامیر منہ سے بجائے جانے والے آلات کو کہتے ہیں جیسے بانسری وغیرہ کذافی الکوکب الدری۔

تشریح:۔ یہ حدیث فرج بن فضالہ کی وجہ سے بظاہر ضعیف ہے جیسا کہ ترمذی نے اخیر میں تصریح

فرمائی ہے تاہم اس مضمون کی اور روایات بھی وارد ہوئی ہیں جیسا کہ باب کی دوسری اور تیسری حدیث مع کمی بیشی الفاظ کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا امور اتنا فروغ پائیں کہ رواج اور معاشرے کا حصہ بن جائے تو پھر علامات قیامت کا انتظار کیا جانا چاہئے یعنی پھر امت کی خیر و بھلائی کی امید منقطع ہو جائے گی اور پورا کا پورا ڈھانچہ خراب ہونے کی وجہ سے قابل علاج نہیں رہے گا اس لئے موت عالَم یقینی اور قریب ہو جائے گی ان امور میں سے ایک مال غنیمت پر حکام اور دولت مند لوگوں کا قبضہ ہے حالانکہ غنیمت میں دیگر کا بھی حق ہوتا ہے۔

دوم: امانت میں خیانت کرنے کو اپنا حق شمار کیا جانے لگے گا جیسے آج کل ہوتا ہے اور بہت سارے حرام کاموں کو اپنا ذاتی حق شمار کیا جاتا ہے آپ کسی بھی محکمے کے ارباب اختیار پر نظر ڈالیں وہ لوگوں کی املاک جو ان کے پاس امانتیں ہیں کس طرح ذاتی حق سمجھ کر ان میں تصرف کرتے ہیں۔

سوم: زکوٰۃ کو اپنے اوپر ٹیکس سمجھ کر یا تو ادا نہیں کریں گے اور اگر کسی طرح مجبور بھی ہو جائیں تو ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ کسی مفادات کے تحت ادا کریں گے جیسے ایک غیر ضروری بوجھ کو ادا کیا جاتا ہے۔

چہارم: بیوی کی اطاعت یعنی ہر معاملے میں اسے حاکم کی طرح مان کر اس کی فرمانبرداری ہوگی جو قلب الحقیقت ہے۔

۵: ماں کی نافرمانی۔ ۶: دوست کے ساتھ غیر اخلاقی طور پر قرب، خاص کر باپ کے مقابلے میں۔

۷: باپ پر ستم اور بُرا سلوک گویا چوتھا و پانچواں اور چھٹا و ساتواں ایک دوسرے کے تناظر و تقابل کی وجہ سے ہر دو اولین مذموم ہو گئے کہ بیوی کو ماں پر اور دوست کو باپ پر برتری دے دی۔

۸: مسجدوں میں شور کرنا اور زور سے بولنا، اور یہ تب ہی ہوگا جب مسجد کے تقدس کا خیال ختم ہو جائے گا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

"وهذا مما كثير في هذا الزمان وقد نصّ بعض علمائنا يعني الحنفية: بأن رفع الصوت في المسجد ولو بالذكر حرام". كذا في التحفة عن المرقات.

المسترشد عرض کرتا ہے کہ آج کل مسجدوں میں جلسے ہوتے ہیں اور ان میں انتہائی تیز لاؤڈ سپیکر استعمال ہوتے ہیں چند مقتدیوں کے لئے نمازیں لاؤڈ سپیکر پر پڑھائی جاتی ہے تاہم وعظ و نصیحت میں آواز بلند ہو جائے تو حسب ضرورت جائز ہے۔

۹: لوگوں کا سردار رذیل ونکمہ آدمی ہوگا جیسا کہ سابقہ باب میں گذرا ہے۔

۱۰: آدمی کا اکرام اس کے شر سے بچنے کے لئے کیا جائے گا آج کل اس کا ظہور بھی ہوگیا ہے عام بدمعاشوں سے لے کر پولیس افیسروں اور بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کی مدح کے ترانے گائے جاتے ہیں۔

۱۱: شراب پینا عام ہوگا یعنی حرمت کی پرواہ کئے بغیر یا نام تبدیل کر کے خواہش پوری کرنے کے لئے جو بھی ناجائز راستہ ہوگا اسے اپنایا جائے گا۔

۱۲: ریشمی لباس مذکورہ بالا وجہوں کی بناء پر مرد پہنیں گے۔

۱۳: مُغَنِّیہ عورتیں جن کو آج کل گلوکار کہا جاتا ہے اور (۱۴) موسیقی کے آلات دونوں عام ہوجائیں گے آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ فلمی صنعت ہو یا ریڈیو اور ٹی وی اور اسٹیج ڈراموں کے پروگرام ہوں ایسی عورتوں کو بھاری رقوم دے کر ان کو بڑی بڑی تنخواہوں پر اور فیسوں پر رکھا جاتا ہے بلکہ باعزت طریقے سے دعوت دی جاتی ہے جس سے اس شعبے کو غیر معمولی ترقی مل رہی ہے۔

۱۵: اسلاف پر لعن طعن کرنے والوں کی بھی آج کوئی کمی نہیں پہلے صرف شیعہ تھے جو خلفاء ثلاثہ کو قابض اور غاصب کہتے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھتے جبکہ آج کل روشن خیال کسی کو معاف نہیں کرتے اور بعض غالی قسم کے غیر مقلدین امام صاحب اور دیگر فقہائے کرام کو بھی نشانہ سب وشتم بناتے ہیں، ان سب کے جواب میں فرمایا: "فلیر تقبوا الخ"۔

ان لوگوں پر جو آندھی آئے گی اس کا رنگ سُرخ ہوگا جو عذاب کی نشانی ہوگی خسف اور مسخ کے بارے میں باب ما جاء فی الخسف میں گذرا ہے فلیراجع۔

علاوہ ازیں مسخ کا ان گناہوں سے گہرا تعلق ہے کہ جب باطن بگڑ جائے گا تو اس کا اثر ظاہر پر رونما ہوگا اس طرح گناہ کے مناسب حال پر چہرے بگڑ جائیں گے۔

اس باب میں دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے اس کا مفہوم ومضمون بھی پہلی حدیث کی طرح ہے تاہم اس میں دو جملوں کا اضافہ ہے ایک یہ کہ "وتعلم لغیر الدین" یعنی علم شریعت کو دنیا کے لئے حاصل کیا جائے گا، یہ بھی خواہشات کی بہتات کا اثر ہے کہ دین کو دنیائے حقیر کے حصول میں لگائیں گے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ جب صدر پاکستان اور چیف آرمی ضیاء الحق نے وفاق المدارس العربیہ

پاکستان کے ذمہ داران کی کوششوں سے مدرسوں کی اسانید سرکاری سطح پر ایم اے کی مساوی قرار دیں تو مدارس میں طلبہ کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اگر ان میں ایسے طلبہ ہوں جو ہوا کا رُخ دیکھتے ہوں تو وہ اس حدیث سے اپنی اصلاح کریں۔ دوسرا "وآیات تتابع کنظامٍ بالٍ قطع سِلکه فتتابع" جیسے بوسیدہ ہار ہو اس کی لڑی ٹوٹ جانے سے اس کے موتی لگا تار گرنے لگیں، نظام بکسر النون ہار، بال بمعنی پُرانے کے اور سِلک بکسر السین وسکون اللام لڑی اور وہ دھاگا جس میں موتی وغیرہ پروتے ہیں یعنی لڑی ٹوٹتے ہی جس طرح پے در پے موتی گرتے ہیں اسی طرح ان علامات میں تیزی آئے گی، علاوہ ازیں اس روایت میں زلزلوں کی کثرت اور پتھروں کی بارش کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے جو عظیم پر حقیر کو ترجیح دینے والوں پر برسیں گی۔

باب ماجاء فی قول النبی ﷺ: بُعِثْتُ اناوالساعة کَهَاتَینِ

میں قیامت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں

"عن المُستَورد بن شدادالفِهری رواه عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: بُعِثتُ اَنَافی نفس الساعة فَسَبَقتُها کماسبقت هٰذِهِ لِاصبَعیه السبابة والوُسطیٰ". (هذاحدیث غریب)

حضرت مستورد رضی اللہ عنہ (بضم المیم وسکون السین وفتح التاء وکسر الراء) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں قیامت کی آمد کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں تاہم میں کچھ پہلے آ گیا اس سے جیسے یہ اس سے آگے ہے اپنی دو انگلیوں سبابہ اور درمیانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

تشریح:۔ قوله: "فی نفس الساعةالخ" بفتح النون والفاء نَفَس کے کئی معنی ہیں از اں جملہ ایک "سانس" بھی ہے مگر یہاں مراد قرب اور ظہور ہے چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا ہی قیامت کو مستلزم ہے پھر لازم وملزوم کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درمیانی اور اشارے کی انگلیوں سے تشبیہ دے کر فرمایا کہ جیسے یہ دونوں متصل ہیں اسی طرح میرے اور قیامت کا حال ہے لھذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث ہوئے تھے مگر علامات کبریٰ کے وقت ان

کا نزول ہوگا جو شے دیگر ہے، غرض یہاں نفی نبوت جدیدہ اور قرب قیامت کا بیان ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ تشبیہ مقدار میں ہے کہ سبابہ وسطیٰ سے نصف سُبع کے بقدر چھوٹی ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور قیامت کے درمیان نصفِ سُبع کی نسبت ہے مگر ابن العربی نے عارضہ میں اس توجیہ کو رد کیا ہے لہٰذا پہلی توجیہ ہی افضل ہے، کیونکہ دنیا کی بقاء کا وقت معلوم نہیں قیامت کا علم اللہ عزوجل نے صرف اپنے پاس رکھا ہے۔

باب کی دوسری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بُعِثْتُ انا والساعة" اس میں الساعۃ کو منصوب پڑھنا افضل ہے تاکہ واو بمعنی مع کی وجہ سے مفعول معہ بن جائے اور بعثت کی نسبت قیامت کی طرف نہ آئے، اس حدیث کی وضاحت جو راوی سے منقول ہے "فما فضل احداهما علی الأخریٰ" یعنی جتنی زیادتی وسطیٰ کو حاصل ہے سبابہ پر اتنی ہی سبقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے قیامت پر یعنی نصفِ سُبع، تو اوپر گذر گیا کہ راوی کا یہ مطلب بیان کرنا حدیث کی مرجوح شرح ہے۔ (ھذا حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء فی قتال التُرک

غزوۂ ترک

عن ابی هريرة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: لاتقوم الساعة حتیٰ تقاتلوا قوماً نِعالهم الشَعَر ولاتقوم الساعة حتی تقاتلوا قوماً كَاَنَّ وُجوههم المَجَانُّ المُطرَقة". (حسن صحيح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم ایسی قوم سے نہ لڑو جن کے جوتے بالوں کے ہوں گے اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم قتال کرو گے ایسی قوم سے جن کے چہرے ڈھال کی طرح تہ بہ تہ ہوں گے۔

لغات:۔ قوله: "المجان" بفتح الجیم وتشدید النون جمع مجن ہے سپر اور ڈھال کو کہتے ہیں۔ قوله: "المطرقة" بضم المیم وفتح الراء تہ بتہ کو کہتے ہیں یعنی پُر گوشت ہوں گے پس ڈھال کے ساتھ تشبیہ گولائی میں ہے اور تہ بتہ کہنا باعتبار پُر گوشت اور سخت ہونے کے ہے۔ بخاری شریف میں چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناکوں کا بھی ذکر ہے۔ (بخاری ص:۱۰۱۴ ج:۱)

تشریح:۔ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث ہذا میں جن دو قوموں کا ذکر ہے ان سے مراد ترک ہیں دیکھئے مسلم ج ۲ ص ۳۹۵ پر ایسی متعدد روایات ہیں مثلاً **"لاتقوم الساعة حتیٰ یقاتل المسلمون الترک قوما وجوههم کالمجان المطرقة یلبسونَ الشعر ویمشون فی الشعر"۔**

بالوں سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے جوتے (بوٹ) ایسے چمڑوں سے بنے ہوئے ہوں گے جن کو دباغت نہ دی گئی ہو، اور ظاہری معنی بھی لے سکتے ہیں کہ مکمل بالوں کے بنے ہوئے ہوں گے اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ اہل یورپ اور ترکی مل کر مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کے خلاف متحد ہو کر جنگ لڑیں پس اہل یورپ بالوں والے ہوں گے اور ترکی گول، پُر گوشت چہروں، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناکوں والے ہوں گے، نیز ترکیوں سے مراد صرف ترکی کے باشندے ہی نہیں لینے چاہئے بلکہ ترکی النسل سب لوگ اس میں شامل ہوسکتے ہیں جو ترکی سے جاپان تک پوری پٹی کے لوگ ہیں جن میں وسط ایشیائی ممالک، چین، منگولیا، دونوں کوریا، جاپان اور تھائی لینڈ تمام ممالک کے لوگ شامل ہیں، اگر مخصوص ترکی کے لوگ ہوں تو یہ بھی بعید نہیں کہ کمال اتاترک کے بعد ترکی یورپ کے قرب اور عربوں سے نفرت کی طرف مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ اس توجیہ میں ایک ہی معرکہ ہوگا۔

لیکن اگر حدیث باب میں دونوں قوموں کو الگ الگ لے لیا جائے تو جنگیں دو ماننی پڑیں گی ایک تو ترکوں (ترکی النسل) کے ساتھ جبکہ دوم کے بارے میں ظاہر یہ ہے کہ یورپیوں کے ساتھ ہوگی جو بالوں کی جیکٹ، لباس اور جوتے استعمال کرتے ہیں، ماہرین کے مطابق یہ دنیا کی تیسری جنگ عظیم ہوگی۔

پھر ظاہر یہ ہے کہ یہ جنگ حضرت مہدیؒ کے وقت میں ہوگی جس سے پہلے کئی چھوٹی چھوٹی جنگیں بھی ہوں گی، جو چھ سات سال تک جاری رہیں گی۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاءَ اذاذهب کِسریٰ فلا کِسریٰ بعده

جب کسریٰ ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا

"عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم :اذاهلک کِسریٰ فلاکسریٰ بعده واذا هلک قیصر فلاقیصر بعده والذی نفسی بیده لَتُنفَقَنّ کنوزهما فی سبیل اللّٰہ". (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسری ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی کسری نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم لامحالہ ان کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کروگے۔

تشریح:۔ کسری بکسرالکاف والف مقصورہ فارس کے بادشاہ کالقب تھا اور قیصر رومیوں کے بادشاہ کالقب تھا۔ چنانچہ اس حدیث میں بیان کردہ پیش گوئی کے مطابق پرویز کی حکومت تو مکمل ختم ہوگئی اگرچہ پرویز کے بعد مزاحمت کرنے والے تھے مگر وہ بھی بالآخر نیست ونابود ہوگئے جیسا کہ حکومتوں اور قوموں کے مٹنے کا عام طریقہ ہے کہ دھیرے دھیرے ختم ہوجاتی ہیں اور جہاں تک رومیوں کا تعلق ہے تو وہ اس شان وشوکت کے ساتھ باقی نہ رہے جو مسلمانوں کو چیلنج کرسکیں، پس خلاصہ یہ ہوا کہ یہاں ان کے دبدبے کی نفی مراد ہے کیونکہ رومیوں کی بقاء کی بھی احادیث ملتی ہیں کہ مثلاً ان سے لڑائیاں ہوں گی جیسا کہ سابقہ باب میں اشارۃً اور دیگر احادیث میں صراحتاً مذکور ہے، چونکہ پرویز نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو پھاڑ دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کی دعا فرمائی تھی اس لئے وہ تو مکمل ختم ہوا۔ جبکہ قیصر (ہرقل) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ ریشمی کپڑے میں بڑے احترام کے ساتھ محفوظ کرلیا تھا اس لئے وہ مکمل تباہی سے محفوظ رہا۔ بہرحال مسلمان ان پر غالب رہے اور ان کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔

اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی حکومتیں عراق اور شام میں دوبارہ نہیں آئیں گی جو صحابہ کرام کے لئے خوش خبری تھی کہ اسلام لانے کی وجہ سے جو خطرات تجارت کے حوالے سے لاحق ہوگئے تھے وہاں جاکر فارس اور روم والے ہمیں تنگ کریں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی۔

باب لاتقوم الساعة حتى تخرج نارمن قِبَلِ الحجاز

قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک حجاز کی جانب سے آگ نہ نکلے

"عن سالم بن عبداللہ عن ابیه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :ستخرج نارٌمن حَضـرَمَوتَ اومن نحوبحرحضرموت قبل یوم القیٰمة تحشرالناس، قالوایارسول اللہ فما تأمرنا؟ فقال علیکم بالشام". (حسن صحیح)

حضرت سالم اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ عنقریب ایک آگ قبل از قیامت حضر موت سے یا فرمایا کہ بحر حضر موت کی جانب سے نکلے گی جو لوگوں کو جمع کرے گی، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! پس آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی خروج نار کے وقت) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پر شام چلے جانا لازم ہے۔

تشریح:۔ "حضر موت" اس میں ح، ر، م اور ت مفتوح اور باقی دو یعنی ض اور واو ساکن ہیں، یمن کے ایک علاقے اور شہر کا نام ہے یہ وہی آگ ہے جس کا تذکرہ پہلے "باب ماجاء فی الخسف" میں گذرا ہے جو عدن سے نکلے گی چونکہ عدن یمن کے جنوب مغرب میں ایک جزیرے کا نام ہے لہٰذا اصلاً یہ آگ عدن کے قعر (جڑ) سے نکلے گی اور براستہ حضر موت اور حجاز مقدس گذر کر شام تک لوگوں کو ہانکے گی امام ترمذیؒ نے ترجمۃ الباب میں اسی تطبیق کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ شام کی خصوصیت بھی وہاں بیان کی گئی ہے۔

باب ماجاء لاتقوم الساعة حتى يخرج كَذّابون

قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ نبوت کے جھوٹے دعویدار نہیں نکلیں گے

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لاتقوم الساعة حتى يَنْبَعِثَ كذّابون دجّالون قريب من ثلاثين كلهم يزعم انه رسول الله". (حسن صحيح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ برآمد ہو جائیں تیس کے قریب سخت دروغ گو اور سخت فریب کار سب دعوی کریں گے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

لغات:۔ قولہ "ينبعث" انبعاث کے معنی جاگنے، روانہ ہونے، زندہ ہونے، تیز چلنے اور اٹھنے کے آتے ہیں یہاں یہی آخری معنی مراد ہے ای یخرج۔ قولہ: "كذّابون" یہ اور "دجّالون" دونوں مبالغے کے صیغے ہیں ثانی پہلے کی تاکید معنوی ہے دجل کے معنی خلط کرنے، فریب اور جھوٹ کے آتے ہیں، دجّال اصل میں گوبر پر سونے کے پانی چڑھانے کو کہتے ہیں یعنی ملمّع ساز۔ قولہ: "يزعم" زعم اعتقاد فاسد کو بھی کہتے ہیں اور نفس قول کو بھی یہاں مراد جھوٹا دعوی ہے۔

تشریح:۔دجال اصل میں مسیح کذاب کا لقب ہے جب مطلق بولا جائے تو وہی مراد ہوتا ہے مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ جب کوئی بڑا واقعہ ہوتا ہے تو اس سے پہلے اس کے آثار رونما ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔چنانچہ دجال اعظم سے قبل نسبۃً چھوٹے چھوٹے دجال پیدا ہوں گے جو نبوت کے دعویدار ہوں گے ان میں سے تین تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں ظاہر ہوئے تھے ایک اَسْوَدْ عنسی اور دوم مُسیلمہ کذاب،اسود کو فیروز نے قتل کیا تھا جس کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی قاصد آنے سے پہلے ہوگئی تھی جب قاصد پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا تھا جبکہ مسیلمہ جنگ یمامہ میں مارا گیا تھا یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی ایام کی بات ہے،جبکہ تیسرا شخص طلیحہ اسدی بھی مدعی نبوت ہو گیا تھا مگر وہ عہد فاروقی میں توبہ تائب ہو گیا تھا۔غرض دجال اعظم تک یہ تعداد پوری ہو جائے گی بعض روایاتؒ میں تعداد ستائیس آئی ہے جن میں چار عورتیں ہوں گی لہٰذا اب کی زیر بحث روایت اگلی روایت کے لئے شارح ہوگی یعنی تقریباً تیس، جہاں تک دجال اکبر کی بات ہے تو وہ دعوائے الوہیت بھی کرے گا۔کما سیأتی فی بابہ۔

بعض روایات میں ستر کی تعداد آئی ہے مگر وہ روایت اولاً تو صحیح نہیں یا پھر وہ چھوٹے یعنی تیسرے درجے کے دجال ہوں گے پس کہا جائے گا کہ سب سے بڑا دجال تو وہ ہوگا جو بالکل آخر میں آئے گا اور جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل کریں گے، دوسرے درجے کے وہ ہوں گے جو تقریباً تیس ہوں گے جبکہ تیسرے درجے والے تیس سے زیادہ ہوں گے جن کا دعویٰ نسبتاً کم درجے کا ہوگا مثلاً مہدی اور مجدد وغیرہ کا دعویٰ۔

حدیث آخر:۔"عن ثوبان قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لاتقوم الساعة حتی تلحق قبائل من امتی بالمشرکین وحتی یعبُدُوا الاوثان، وانه سیکون فی امتی ثلاثون کذّابون کلهم یزعم انه نبی وانا خاتم النبیّن لانبی بعدی". (صحیح)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میری امت کے بہت سے قبائل مشرکین کے ساتھ مل جائیں گے، اور حتی کہ لوگ (قبائل والے) بتوں کی عبادت کرنے لگ جائیں گے۔اور یہ کہ عنقریب میری امت میں تیس انتہائی جھوٹے نکلیں گے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں تمام انبیاء میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

تشریح:۔یہ فتنۂ ارتداد کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے متصل

رونما ہوا تھا، مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ پیش گوئی حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول اور وفات کے بعد کے حالات کے بارے میں ہے کہ لوگ تیزی سے مرتد ہوں گے اور بتوں کی عبادت کریں گے انہی پر قیامت قائم ہوگی۔

قولہ :"انا خاتم النبیین" خاتم بکسر التاء وفتحھا دونوں پڑھنا جائز ہے تاہم مشہور فتحہ ہے، یہ کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تا کہ کسی کو ان کذابوں کی چرب زبانی سے سچ کا گمان پیدا نہ ہو، جیسا کہ بہت سے لوگ قادیانی کے جالِ وبال میں پھنس گئے اگر ان جاہلوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان اور ختم نبوت پر یقین وایمان ہوتا تو کبھی بھی غلام احمد ملعون کی باتوں پر کان نہ دھرتے، ختم نبوت کے اور بھی بہت سارے دلائل ہیں اور امت کا متفقہ عقیدہ ہے مگر یہ موقعہ اس کے بیان کا نہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ غلام احمد قادیانی تک مدعیان نبوت کی تعداد ستائیس تک جا پہنچی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ قادیانی خاتم المتنبیین المضلین ثابت ہوتا ہے یا اس کے کچھ اور بھائی بھی آئیں گے جو گندی میراث کے وارث ہونگے اگر وہ دجال اکبر سے پہلے کے سلسلے کی آخری کڑی ہے تو پھر مطلب یہ ہے کہ دجال اکبر کا زمانہ بہت قریب ہے۔

باب ماجاء فی ثَقیف کذّاب ومُبِیر

بنو ثقیف میں ایک جھوٹا اور ایک سفاک ہے

"عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :فی ثقیف کذّاب ومُبِیر"(حسن غریب)....ویقال الکذّاب المختار بن ابی عبید والمبیر الحجاج بن یوسف.....عن هِشام بن حسان قال اَحصُوا ما قتل الحجاج صَبراً فبلغ مائة الف وعشرین الف قتیل".

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثقیف میں ایک بہت جھوٹا اور ایک سَفّاک ہوگا...کہا جاتا ہے کہ جھوٹا مختار ہے اور سفاک حجاج ہے، ہشام نے کہا کہ گنو حجاج نے جو صرف نہتے اور بے گناہوں کو قتل کیا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔

لغات:۔قولہ:"مبیر" بضم المیم وکسر الباء وہ شخص جو قتل وسفا کی میں بہت مبالغہ کرتا ہو۔

قولہ:"صبراً" بفتح الصاد وسکون الباء جو شخص کسی لڑائی اور غلطی کے بغیر مارا جائے۔

تشریح:۔ثقیف طائف کے ایک قبیلے کا نام ہے جو اپنے جد اعلیٰ کی طرف منسوب ہے یہ روایت اگرچہ عبداللہ بن عُصم کی وجہ سے سنداً کمزور سی ہے مگر دوسرے طرق کی بناء پر امام ترمذیؒ نے اس کو حسن کہا ہے، اسی وجہ سے حضرت اسماء نے حجاج سے کہا تھا: "**سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: في ثقيف كذاب ومبير فانت المبير**" اس پر حجاج نے غلط تاویل کر کے جواب دیا کہ میں منافقین کا مبیر یعنی قاتل ہوں۔ یہ اپنا عیب چھپانے کی غرض سے کہا تھا، حجاج بن یوسف کے ظلم کی داستانیں مشہور ہیں اس لئے وہ ظلم میں ضرب المثل بن گیا، حضرت شاہ صاحبؒ العرف میں فرماتے ہیں: "**ويروى عن احمد بن حنبل ان حجاجاً كافر**"۔ ابن العربیؒ عارضہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"**والحجاج ظالم متعدّ ملعون على لسان النبى عليه السلام من طرق، خارج عن الاسلام عندى باستخفافه بالصحابة كابن عمر وانس**".

شاید امام احمد کا مطلب بھی یہی ہو کہ وہ صحابہ کرام کی توہین کی وجہ سے کافر ہوا تھا۔ واللہ اعلم

ثقیف کا دوسرا آدمی مختار بن ابی عبید ہے اس کی ولادت ہجرت کے سال ہوئی تھی مگر صحبت ثابت نہیں اس کے والد اجل صحابہ میں سے تھے۔ اور اس کی بہن صفیہ بنت ابی عبید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بیوی تھیں جو بڑی زاہدہ خاتون تھیں، مختار نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قصاص اور بدلے کا نعرہ بلند کر کے حب مال وجاہ کی بناء پر شہرت ودولت کے لئے ایک سیڑھی لگائی اور اس کی آڑ میں شہرت ودولت بھی پائی مگر حقیقت میں وہ جھوٹا ہی تھا حتی کہ وہ حضرت جبریل سے ملاقات کا ڈھونگ بھی رچاتا۔ اور بدباطن کو چھپاتا۔

باب ماجاء فی القرن الثالث

قرن سوئم کا بیان

"**عن عمران بن حصين قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: خير الناس قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم، ثم يأتي من بعدهم قوم يتسمّنون ويحبّون السِمَنَ يعطون الشهادة قبل ان يسألوها**".

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ سب سے اچھے لوگ میرے زمانہ کے ہیں پھر وہ ہیں جو ان کے بعد ہیں پھر وہ

لوگ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے، پھر ان (تبع تابعین) کے بعد ایسے لوگ (قوم) آئیں گے جو موٹا بننے کی کوشش کریں گے اور موٹاپا پسند کریں گے، وہ گواہی دیں گے قبل اس کے کہ ان سے گواہی کا مطالبہ کیا جائے۔

دوسری حدیث:۔ دوسری حدیث بھی ان ہی سے مروی ہے جس کے الفاظ تھوڑے سے مختلف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خیر امتی القرن الذی بُعِثتُ فیهم ،ثم الذین یلونهم ولا اعلم اَذکر الثالث ام لا،ثم ینشوءُ اَقوام یَشهَدُون ولایُستَشهَدُونَ ویخونون ولایؤتمنون ویفشُوفیهم السِمَنُ". (حسن صحیح)

میری امت کا بہترین زمانہ وہ ہے (یعنی سب سے اچھے لوگ وہ ہیں) جس میں میں بھیجا گیا ہوں پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد ہوں گے حضرت عمران فرماتے ہیں مجھے یاد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرن ثالث کا ذکر فرمایا یا نہیں پھر ایسی قومیں پیدا ہوں گی جو گواہی دیں گی (یعنی از خود) حالانکہ ان سے گواہی طلب نہیں کی جا رہی ہوگی اور وہ خیانت کریں گی جب کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جائے گا اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا۔

لغات:۔قولہ: "قرنی" قرن زمانے کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں ایک پیڑھی یعنی نسل اور ہم عصر آکر ختم ہو جائیں جو عموماً سو سال کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ **قولہ:** "یتسمّنون" باب تفعل میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی ان کا موٹاپا طبعی نہیں ہوگا بلکہ زیادہ کھانے کے شوق اور حرص کا نتیجہ ہوگا، یہ لفظ سمن سے مشتق ہے جو بکسر السین وفتح المیم ہے موٹاپے کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** "ثم ینشؤ" ای یخلق. **قولہ:** "ولایؤتمنون" یعنی لوگ ان پر عدم اعتماد کی وجہ سے ان کو امین نہیں سمجھیں گے۔ **قولہ:** "ویفشو فیهم" ای یظهر۔

تشریح:۔ یہ حدیث متعدد طرق میں شک کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرن ثالث کا ذکر فرمایا ہے یا نہیں مگر بہت سے طرق میں بغیر شک کے بھی آئی ہے خود حضرت عمرانؓ کی حدیث امام ترمذیؒ نے آگے ابواب الشہادات میں ذکر فرمائی ہے اس میں قرون ثلاثہ کا ذکر بغیر شک کے آیا ہے اسی طرح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

قال رجل یارسول اللّٰہ!اَیُّ الناس خیر قال "القرن الذی انا فیه ثم الثانی ،ثم الثالث".

لہٰذا کہا جائے گا کہ آپ علیہ السلام کا عہد پاک اور مابعد کے دو قرنیں، اپنے، ماضی و مستقبل کے تمام

زمانوں سے افضل اور مشہود لھا بالخیریت ہیں ان میں الاول فالاول بہتر ہے۔

صحابہ کرام کا قرن ۱۱۰ھ ہجری پر ختم ہوا بنا بر مشہور اور تبع تابعین کا دو سو بیس ۲۲۰ھ پر منقطع ہوا اس کے بعد وہی حالات رونما ہو گئے جن کی آپ علیہ السلام نے اس حدیث میں پیش گوئی فرمائی تھی، تاہم ان تمام ادوار میں یہ بات طے ہے کہ جو وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے جتنا قریب تر رہا یا ہو گا وہ ہر آنے والے وقت سے افضل ہے اور رہے گا، اور یہ فرق مجموعی اعتبار سے رہتا ہے ورنہ اچھے زمانہ میں کسی بُرے شخص کی موجودگی اور بُرے وقت میں اچھے لوگوں کا ہونا ممکن بھی ہے اور واقع بھی چنانچہ قرن اول میں بعض لوگ نفاق کے مرض میں مبتلاء رہ چکے ہیں جب کہ بدترین زمانہ میں نیک اور صالح لوگ پائے جاتے ہیں گو ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

جس زمانہ میں بُرے لوگ ہوں گے ان کے اندر کون سا عیب ہو گا جس کی بناء پر وہ ناپسندہ ٹھہرا دیئے گئے تو یہاں ان کی تین خامیاں ذکر کی گئی ہیں: ایک یہ کہ وہ موٹے ہوں گے جو زیادہ کھانے کی وجہ سے اس مذموم شرعی مقام تک جا پہنچے ہوں گے یعنی انہوں نے اپنا نصب العین اور زندگی کا مقصد کھانے پینے کی اشیاء میں توسع بنایا ہو گا جو آج کل کہیں بھی دیکھا جا سکتا ہے حتی کہ زیادہ کھانے پینے سے نہ صرف وہ موٹے ہو گئے بلکہ شوگر کے بھی وہ شکار ہو گئے، البتہ جو شخص پیدائشی طور پر صحت مند ہو اور اس کا وزن بھی زیادہ ہو وہ اس وعید میں نہیں آتا کیونکہ مذموم فقط موٹاپا نہیں بلکہ کھانے پینے میں توسع ہے، عارضہ میں ہے:

"وانما ذکر حب السمن لان المؤمن حسبه لُقیمات یقمن صلبه فان کان ولابُدّ فثلث طعام وثُلث شراب وثُلث نفس فاماموالاة الشبع والرفاهیة فمکروه واما محبة السِمَن فهی مکروهة فی النفس محبوبة فی الغیر کالزوجة والجاریةُ" الخ.

الاشباہ والنظائر میں علامہ ابن نُجیم رحمہ اللہ قاعدہ ثانیہ: "الامور بمقاصدھا" کے تحت لکھتے ہیں:

"قالوا الاکل فوق الشبع حرام بقصد الشهوة وان قصدبه التَّقَوِّی علی الصوم اومؤاکلة الضیف فمستحب". (ص:۳۳)

یعنی شہوت میں اضافے، موٹاپے اور دیگر مذموم مقاصد کے لئے زیادہ کھانا حرام ہے جب کہ نیک مقصد کے تحت نہ صرف جائز بلکہ حسب اہمیت مقصد عبادت ہے۔

حاشیہ ترمذی میں دوسرا مطلب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ لوگ اپنی مدح کریں گے اور پسند بھی کریں گے کہ وہ لوگوں سے اپنی تعریفات سنیں حالانکہ وہ ان صفات سے خالی ہوں گے، افسوس ہے کہ کم از کم یہ دونوں باتیں اکثر علماء میں بھی پائی جاتی ہیں۔ فیا اسفاہ ثم وثم

اس حدیث میں دوسرا عیب گواہی میں پیش پیش رہنا ہے جب کہ اس کا مطالبہ ان سے نہیں ہوگا، ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مراد یا تو جھوٹی شہادت ہے جس کا مطالبہ نہیں تھا یا پھر جھوٹی قسمیں ہیں جو فساد زمانہ کا اثر ہے کیونکہ اس میں تہمت زیادہ ہوگی اور اعتماد کم جیسا کہ یہ تیسرا عیب ہے کہ وہ لوگ خائن ہوں گے اس لئے ان پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا آج کل یہ عیب بھی عام ہے کہ آدمی اپنے پدر شفیق اور رفیق حیات کے ساتھ بھی مخلص نہیں رہا بے شمار واقعات اس پر شاہد ہیں ایسے میں اعتماد کہاں؟

باب ماجاء فی الخُلفاء

خلفاء کا بیان

"عن جابر بن سَمُرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: یکون من بعدی اثنا عشر امیراً قال ثم تکلم بشئی لم افهمه فسألت الذی یلینی فقال: قال: کلهم من قریش". (حسن صحیح)

حضرت جابر بن سَمُرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد بارہ امیر ہوں گے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات ارشاد فرمائی جس کو میں نہ سمجھ سکا۔ پس میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ سارے قریش میں سے ہوں گے، مسلم میں ہے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ: **ماقال؟ قال کلهم من قریش.**

تشریح:۔ اس حدیث کے مطلب میں متعدد اقوال ہیں جن میں قابل ذکر دو ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ بارہ امام زمانہ غلبۂ اسلام میں مراد ہیں پس حاصل یہ ہے کہ میرے بعد بارہ امام ایسے ہوں گے جن کی امامت پر امت کا اتفاق اور بیعت پر سب کا اِطباق ہوگا یہ رائے اصلاً قاضی عیاض رحمہ اللہ کی ہے جسے ابن حجر رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے اور امام نووی نے بھی شرح مسلم میں نقل کیا ہے اسی طرح حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ

الخلفاء میں ذکر کیا ہے۔(دیکھئے نووی بر مسلم ص:۱۱۹ ج:۲ وتاریخ الخلفاء ص:۹)اس کی تائید ابوداؤد کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ "**کلهم تجتمع علیه الامة**" ایک طریق میں ہے:"**کلهم یجتمع علیه الناس**"۔

علی ہذا ان کی ترتیب یہ ہوگی ، ابوبکر، عمر، عثمان، علی، معاویہ(بعد صلح الحسن) یزید، عبدالملک بن مروان بعد قتل ابن الزبیر، پھر عبدالملک کے چار بیٹے ولید، سلیمان، یزید، ہشام، تاہم سلیمان اور یزید کے درمیان عمر بن عبدالعزیز بھی آئے ہیں والثانی عشر ھوالولید بن یزید بن عبدالملک۔

تاہم یہ تعداد بارہ سے زیادہ ہے بعض حضرات نے بنوامیہ کے بعض ناموں میں اختلاف کیا ہے اور خلافت کا دامن بنوعباس تک پھیلایا ہے بعض نے حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن زبیر کو بھی شامل کیا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ بارہ کا عدد کم از کم ہے اس سے زیادہ کی نفی مراد نہیں ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس پر تفصیل سے بحث فرمائی ہے(دیکھئے فتح الباری جلد:۱۳ ص:۲۶۳) سے آگے طبع قدیمی:

"وفیه....الی ان لم یبق من الخلافة الاّ الاسم فی بعض البلاد بعد ان کانوا فی ایام بنی عبدالملک بن مروان یخطب للخلیفة فی جمیع اقطار الارض شرقاًوغرباًوشمالاًویمیناًمما غلب علیه المسلمون ولا یتولّٰی احد فی بلد من البلاد کلها الاِمارة علی شئ منها اِلّا بامر الخلیفة "الخ .

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد مطلق بارہ کی تعداد ہے اس میں کسی زمانے کی تخصیص ملحوظ نہیں بلکہ اسلام کی ابتداء سے انتہاء تک پورے دور میں یہ تعداد مکمل ہوگی اس توجیہ کے مطابق مراد وہ خلفاء ہوں گے جنہوں نے حق وصداقت اور عدالت کی مستحکم بنیادوں پر قائم عمارت خلافت کا بھرپور خیال رکھ کر قرآن وسنت کے اصول، کلیات وجزئیات کا استعمال کیا ہو اگرچہ ان کی خلافت پر سب کا اتفاق نہ رہا ہو سیوطیؒ تاریخ الخلفاء میں اور دیگر حضرات لکھتے ہیں:

" ویؤید ھذا ما اخرجه مسدّد فی مسنده الکبیر عن ابی الخلد انه قال :لاتهلک ھذه الامة حتی یکون منها اثنا عشر خلیفة کلهم یعمل بالھُدیٰ ودین الحق منهم رجلان من اھل البیت محمد(صلی اللہ علیه وسلم) .

پھر آگے لکھتے ہیں کہ وہ بارہ یہ ہیں:

خلفاء اربعه والحسن ،ومعاویة،وابن الزبیر وعمر بن عبدالعزیز ھؤلاء

ثمانية ويحتمل ان يضم اليهم المهتدى من العباسين لانه فيهم كعمر بن عبدالعزيز في بني امية وكذالک الطاهر لما اوتيه من العدل وبقي الاثنان المنتظران احدهما المهدى لانه من ال بيت محمد صلى الله عليه وسلم".

(ص ۱۰)

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر مراد وہ خلفاء ہوں جن کی خلافت وبیعت پر اتفاق ہو اور ان کی وجہ سے اسلام کی شوکت ودبدبہ قائم رہا ہو تو پھر پہلا قول ہے اور اگر عدل وحقانیت مراد ہو تو پھر دوسرے قول میں مندرج حضرات ہیں۔ واللہ اعلم، بہر حال شیعوں کا قول قابل التفات نہیں۔

دوسری حدیث:۔"عن زياد بن كُسَيب العدوى قال كنتُ مع ابى بكرة تحت منبر ابن عامر وهو يخطب وعليه ثياب رِقاق فقال ابو بلال انظروا الى اميرنا يلبس ثياب الفساق فقال ابوبكرة :أُسكُت اسمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من اَهان سلطان الله فى الارض اهانه الله". (حسن غريب)

حضرت زیاد بن کسیب فرماتے ہیں کہ میں ابوبکرہؓ کے ساتھ ابن عامر کے منبر کے نیچے بیٹھا تھا جب کہ ابن عامر باریک (قیمتی) کپڑے پہنے ہوئے تھے تو ابو بلال نے کہا ہمارے امیر کو دیکھو کہ فاسقوں کا لباس پہنتا ہے اس پر ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا خاموش ہو جاؤ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو شخص زمین پر اللہ کے (بنائے ہوئے) بادشاہ کی توہین کرتا ہے اللہ اس شخص کو ذلیل کرتا ہے۔

تشریح:۔ "کسیب" بروزن زبیر، ثیاب رقاق کے لغوی معنی باریک کپڑوں کے ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ ریشمی کپڑے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریشمی نہ ہوں مگر صلحاء کے لباس سے مختلف ہوں کیونکہ صلحاء عام کپڑے زیب تن فرماتے جو قیمت ونفاست میں اعلیٰ نہ تھے مگر ابن عامر نے بہت اعلیٰ لباس اختیار کیا جو محنت سے بنایا گیا تھا یہ دنیاداری کی علامت ہے۔

چونکہ بادشاہ کے قیام کا اصل مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام نافذ کرنا اور لوگوں تک عدل وانصاف پہنچانا ہے اس لئے وہ سلطان اللہ بالاضافۃ کہلاتا ہے جیسے تشریفاً ناقۃ اللہ اور بیت اللہ کہا جاتا ہے اس لئے ایسے سلطان کی تعظیم اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعظیم کے ضمن میں آتی ہے پس جو شخص اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ گویا اللہ کی عزت نہیں کرتا اس لئے بطور مکافات ومجازات من جانب اللہ اس کی توہین ہوگی۔

"قال في العارضة فمن كان بهذه الصفة فهو خليفة الله، ومن عصاه فهو خليفة الشيطان".

المسترشد:۔ ہمارے زمانے کے حکام وامراء اگرچہ مذہب سے کافی دور رہتے ہیں مگر رعایا میں بھی ایک بیماری عام ہے جو عجم میں بڑے پیمانے پر اور خصوصاً جنوبی ایشیا میں جہاں انگریزوں کی جمہوریت نے ہمارے اخلاق اور اسلامی اقدار کا ستیاناس کر دیا ہے پائی جاتی ہے کہ حکام کو بُرا بھلا کہنے کی ایک عادت بن چکی ہے حتی کہ اسے منابر پر بھی ضروری سمجھا جاتا ہے اگر یہ چیز رَدِّ منکر کے طور پر ہو اور نکیر کرنے والا بذات خود منکرات سے پاک ہو تو یہ امر مستحسن ہے مگر اس کو خواہ مخواہ کے لئے شغل بنانا یا سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے یہ رویہ اپنانا عیب ہے۔

باب ماجاء في الخلافة

خلافت کا بیان

"عن سعيد بن جُمهان قال ثني سفينة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الخلافة في امتي ثلاثون سنة ثم مُلكٌ بعد ذالك، ثم قال لي سفينة: امسِك خلافة ابي بكر ثم قال وخلافة عمر وخلافة عثمان ثم قال: اَمسِك خلافة عَليّ فوجدناها ثلثين سنة قال سعيد فقلتُ له: ان بني امية يزعمون ان الخلافة فيهم، قال: كذبوا ابنو الزرقاء بل هم ملوك من شر الملوك".

حضرت سعید بن جمہانؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خلافت میری امت میں تیس سال تک رہے گی پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی پھر سفینہ نے مجھ سے کہا کہ گنو خلافت ابی بکر (کی مدت) پھر فرمایا اور خلافت عمر (گن) اور عثمان کی خلافت پھر فرمایا شمار کرو علی کی خلافت پس ہم نے وہ (مدت) خلافت تیس سال کے مطابق پائی۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے ان (سفینہ) سے کہا کہ بنو امیہ تو دعوی کرتے ہیں کہ خلافت تو ان میں بھی ہے انہوں نے فرمایا بنو الزرقاء جھوٹ بولتے ہیں بلکہ وہ تو بڑے بادشاہوں میں سے بادشاہ لوگ ہیں۔ یعنی دنیوی بادشاہوں کی طرح مرضی کی حکومت

کرتے ہیں۔

تشریح:۔حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا تعارف (جلد اول ۲۰۷ ''باب الوضوء بالمد'') میں گذرا ہے ان کے اصل نام کے بارے میں ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کسی نے ان سے نام پوچھا تو انہوں نے بتانے سے انکار کیا کہ آپ علیہ السلام نے میرا نام سفینہ رکھا ہے اس لئے دوسرا کوئی نام پسند نہیں کرتا۔

قولہ:''الخلافة فی امتی ثلاثون سنة'' یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ خلافت تو تیس سال کے مابعد تک جاری رہی ہے جیسا کہ گزشتہ باب کی حدیث سے معلوم ہوا پھر تیس کی تحدید کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ خلافت مرضیہ تیس سال تک رہے گی یعنی ایسی خلافت جس میں سنت قائمہ سے ذرا بھی انحراف نہ ہو بلکہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہج ومنہاج پر سو فیصد قائم ہو جب کہ مابعد از تیس میں بعض اشیاء بھی شامل ہو جائیں گی چنانچہ الکوکب الدری میں اس کو یوں بیان کیا ہے:

''ای لایبقی الامراء بعدذالک علی سِیَرالخلفاء وان کان التغیریسیراً کمافی معاویة رضی اللّٰہ عنه وابن ابنه معاویة بن یزید''.

دوسرا جواب یہ ہے کہ خلافت راشدہ متصل یعنی بلا انقطاع تو تیس سال تک رہے گی اس کے بعد بھی ہوگی اور کبھی نہیں ہوگی کذا فی الکوکب وغیرہ۔

یہ دونوں جواب اس پر مبنی ہیں کہ اس حدیث کو صحیح تسلیم کرلیا جائے مگر محقق عبدالرحمٰن بن خلدون نے اس سے اختلاف کیا ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مصالحت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت وخلافت کے تحت اس پر بہت زیادہ زور لگایا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کسی طرح خلفاء سابقین سے کم نہ تھی وہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی طرف توجہ نہیں دینی چاہئے کہ یہ ضعیف ہے:

''ولاینظرفی ذالک الی حدیث:''الخلافة بعدی ثلاثون ''فانه لم یصح .

(دیکھئے تاریخ ابن خلدون ص ۶۲۱ ج ۲، دارالکتب العلمیۃ)

مگر ابن خلدون اس حکم میں ہمارے علم کے مطابق متفرد ہیں عام محدثین نے اس حدیث کو صحیح یا کم از کم حسن کہا ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے بھی اس کو حسن قرار دیا ہے، ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے اور امام احمد نے بھی اس کی تخریج فرمائی ہے اگرچہ اس میں حشرج اور سعید بن جُمہان صدوق ہیں مگر روایت کے طرق متعدد ہیں۔لہٰذا پہلے دو جواب ہی متعین ہوگئے۔

قولہ: "امسک" یعنی انگلیوں پر شمار کرتا کہ حساب میں غلطی نہ آئے، پھر تیس سال تک خلفاء اربعہ کی خلافت شمار کی تاہم اس مدت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے چھ ماہ اور چند دن بھی شامل ہیں چنانچہ دو سال سے کچھ زائد حضرت ابوبکرؓ کے ہیں ساڑھے دس سال حضرت عمرؓ کے ہیں، تقریباً بارہ سال حضرت عثمانؓ کے ہیں، پھر تین ماہ کم پانچ سال حضرت علیؓ کے ہیں۔

قولہ: "بنو الزرقاء" زرقاء بنو اُمیہ کی جدات میں سے ایک خاتون کا نام ہے، اس جملے "کذبوا بنو الزرقاء" کی ترکیب میں جمع کی ضمیر اسم ظاہر فاعل پر مقدم کی گئی ہے ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ سیبویہ اس پر استشہاد کے لئے "اکلونی البراغیث" کے محتاج ہوئے "**والقرآن وعامّة الحديث يشهدلهاوهي فصيحة مليحة**".

قولہ: "**وفي الباب عن عمرو عليّ قالا: لم يعهدالنبي صلى الله عليه وسلم في الخلافة شيئاً**"، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے بارے میں کوئی وصیت نہیں فرمائی ہے۔ یہ ارشاد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم الجمل میں فرمایا ہے، سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ مراد وفات کے وقت نفی وصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عندالوفات کسی خلیفہ کا تعین نہیں فرمایا لہٰذا اس روایت کی ان روایات سے کوئی منافات وتعارض نہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ وفات کے وقت نہیں بلکہ پہلے کی ہیں۔ (راجع للتفصیل تاریخ الخلفاء ص ۶، قدیمی کتب خانہ)

حدیث آخر:۔ "**عن ابن عمر قال قيل لعمر بن الخطاب: لو استخلفتَ؟ قال: ان استخلفتُ فقد استخلفَ ابوبكر وان لم اَستخلِف لم يستخلِف رسول الله صلى الله عليه وسلم**" (صحيح) كذافي الصحيحين.

اس حدیث میں لفظ "لو" کو تمنائیہ کے بجائے شرطیہ بنانا زیادہ اچھا ہے پس جواب محذوف ہوگا یعنی لکان حسناً یعنی اگر آپ کسی کو اپنا خلیفہ نامزد کر لیتے تو بہت اچھا ہوتا تا کہ کوئی فتنہ برپا نہ ہو جائے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں بناؤں تو بھی ٹھیک ہے کہ ابوبکرؓ نے بنایا تھا اور اگر نہ بناؤں تو بھی درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بنایا تھا، مطلب یہ ہے کہ میرے سامنے دو صورتیں ہیں اور دونوں سنت اور درست ہیں اس لئے مجھے اختیار ہے اور کوئی تنگی نہیں ہے۔ اس کا ایک مطلب تو وہی ہوا جو اوپر گذر گیا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عندالوفات کسی کو نہیں بنایا ہے، دوسرا مطلب ابن العربی نے عارضہ میں بیان کیا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے کسی کو صریح طور پر خلیفہ نہیں بنایا ہے۔ جہاں تک اشارے کا تعلق ہے تو اس کی نفی یہاں مراد نہیں، الکوکب میں ہے کہ اس میں جواز تقلید کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال صحابہ کرامؓ کے متفقہ فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا لازمی ہے اور شیعہ وروافض نے اس بارے میں جو روایات گھڑ لی ہیں وہ قطعاً قابل التفات نہیں۔ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصب امام کی ذمہ داری چھ رکنی شوریٰ پر ڈالی تھی اس لئے یہ طریقہ بھی صحیح ثابت ہوا۔ "فیجب علی کل مسلم التسلیم لذالک".

(عارضۃ الاحوذی)

باب ماجاء ان الخُلَفاء من قریش الی ان تقوم الساعة

خلفاء قریش میں سے ہوں قیامت تک

"عن حبیب بن الزبیر قال سمعت عبداللہ بن ابی الھزیل یقول: کان ناس من ربیعة عند عمرو بن العاص فقال رجل من بکر بن وائل: لَتَنتَهِيَنَّ قریش او لیجعلنَّ اللہ ھذا الامر فی جمھور من العرب غیرھم، فقال عمرو بن العاص: کذبتَ! سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: قریش وُلاۃ الناس فی الخیر والشر الی یوم القیٰمة". (حسن صحیح غریب)

حبیب بن زبیر فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن ابی الھزیل سے یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ربیعہ قبیلہ کے کچھ لوگ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے تو بکر بن وائل نامی قبیلہ کے ایک شخص نے کہا کہ یا تو قریش (اپنی حرکات سے) بالکل ہی باز آجائیں یا پھر اللہ تعالیٰ یہ امر (خلافت) قریش کے علاوہ باقی سب عربوں میں منتقل فرمادیں گے، اس پر عمرو بن العاصؓ نے فرمایا تم نے غلط بات کہی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے کہ قریش قیامت تک لوگوں کے والی (حکمران) ہوں گے خیر میں بھی اور شر میں بھی۔

تشریح:۔ بکر بن وائل ربیعہ قبیلے کی ذیلی شاخ ہے یہ لوگ قریش کی ہمسری کے دعویدار تھے مگر حقیقت میں قریش ان سے بہت آگے تھے اگر چہ ربیعہ والے قریش کے اعمام تھے، چونکہ عمومی طور پر رعایا کو ارباب اختیار واقتدار سے عدم مساوات کی شکایات رہتی ہیں اس لئے انہوں نے قریش پر اعتراض کیا کہ وہ اپنی زیادتیوں سے باز آجائیں ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے حکومت لے کر باقی عربوں کو دے دیں گے حالانکہ واقعہ میں ایسا نہ تھا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس آدمی کے قول کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ خلافت وسلطنت تو قریش کا حق ہے جیسے

وہ جاہلیت میں اس کے مستحق تھے تو خیر یعنی اسلام میں بھی وہ اس کے مستحق ہیں وہ الگ بات ہے کہ کوئی متغلبہ ان پر غالب آ کر ان کا یہ حق چھین لیں مگر حدیث باب کی رو سے یہ حق قیامت تک قریش کے پاس ہونا چاہئے کیونکہ ان کے اندر صداقت وعدالت اور شجاعت وغیرہ کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو حکمران کے لئے لازمی ہیں جب کہ باقی لوگ مجموعی اعتبار سے ان خوبیوں سے محروم ہیں ہاں اگر چہ کسی جزوی مسئلہ میں یا غلبہ کی صورت میں غیر قریش کی امارت بھی واجب الاطاعت ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو عقائد نسفی اور شرح عقائد میں امامت کی بحث میں ہے:

"ویکون من قریش ولایجوز من غیرھم ولایختص ببنی ھاشم واولاد علیؓ یعنی یشترط ان یکون الامام قریشیاً لقولہٗ: الائمۃ من قریش وھذا وان کان خبراً واحداً لکن لما رواہ ابوبکر محتجّاً بہ علی الانصار ولم ینکرہ احد فصار مجمعاً علیہ ولم یخالف فیہ الا الخوارج وبعض المعتزلۃ ولایشترط ان یکون ھاشمیاً او علویاً" الخ.

اسی طرح عارضہ، شرح مسلم ودیگر میں اجماع کا قول کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ سے متعلقہ بحث اور سوال وجواب "باب ماجاء فی طاعۃ الامام" میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۵۲۰ جلد: ۵)

باب کی دوسری حدیث:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ختم نہیں ہوں گے رات دن حتی کہ مالک ہو جائے گا (یعنی والی وبادشاہ بن جائے گا) ایک شخص عجمیوں میں سے جس کو جہجاہ کہا جائے گا۔

تشریح:۔ موالی مولیٰ کی جمع ہے اگر چہ اس کا اطلاق عموماً غلاموں پر ہوتا ہے مگر یہاں مراد اعاجم ہیں، بعض روایات میں ہائے ثانیہ نہیں یعنی جہجا ہے مسلم کی روایت میں جہجاہ ہے، ایک اور صحیح حدیث میں ہے: "لن تقوم الساعۃ حتی یخرج رجل من قحطان یسوق الناس بعصاہ" چنانچہ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ جہجاہ وہی قحطانی ہے جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ حکمران ہوں گے پھر اس حدیث کا یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ ایسا کرنا جائز ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسا بھی ہوگا کہ زمام حکومت عربوں اور خصوصاً قریش کے ہاتھوں سے نکل کر اعاجم کے پاس چلی جائے گی جو علامات قیامت میں سے ہے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ شاید یہ دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رونما ہوگا۔

باب ماجاء فی الائمة المضلّین

گمراہ کرنے والے حکمرانوں کے بارے میں

"عن ثوبان قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: انما اخاف علی امتی ائمةَ مضلین قال وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لاتزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرین لایضرهم من خَذَلهم حتی یأتی امر الله". (حدیث صحیح)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی امت کے بارے میں گمراہ کرنے والے حکمرانوں سے خوف کرتا ہوں اور فرمایا کہ میری امت کی ایک جماعت مسلسل حق پر قائم اور باطل پر غالب رہے گی نقصان نہیں پہنچا سکے گا ان کو وہ شخص جو ان کی مدد کرنا چھوڑ دے گا تا آنکہ اللہ کا حکم آجائے۔

تشریح:۔ اس حدیث کے دوسرے حصے کی تشریح "باب ماجاء فی اہل الشام" میں عنقریب گذری ہے فلانعیدھا جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے تو یہ پیش گوئی بھی صادق آئی ہے دونوں پیش گوئیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں۔ اس حدیث میں ظاہرین خبر ثانی بھی بن سکتا ہے اور حال بھی پھر غلبہ باعتبار حجت ہمیشہ رہے گا جب کہ باعتبار قوت وسلطنت کے کبھی ہوگا جب صلاح ہو اور کبھی نہیں ہوگا جب فساد ہو۔

باب ماجاء فی المهدی

مہدی کے بارے میں

"عن عبدالله قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لاتذهب الدنیا حتی یملک العربَ رجلٌ من اهل بیتی یواطئ اسمه اسمی". (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ عربوں کا حکمران بن جائے گا میرے اہل بیت میں سے ایک شخص جس کا نام میرے نام کے مطابق ہوگا۔

باب کی تیسری روایت میں ہے کہ اگر دنیا کا صرف ایک ہی دن بچ جائے تو بھی اللہ اس کو لمبا فرمادیں

4/1

گے یہاں تک کہ یہ شخص (یعنی مہدی) والی بن جائے۔

تشریح:۔"لاتذهب الدنيا"اى لاتنقضى یعنی دنیا مہدی کی آمد کے بغیر ختم نہ ہوگی۔قولہ: "یواطئی" وَطأٌ بمعنی موافقت کے ہے چنانچہ موطأ امام مالکؒ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ جب انہوں نے اپنی کتاب علماء وقت پر پیش کی تو انہوں نے اس سے موافقت فرمائی، حدیث میں عربوں کا ذکر اصالۃً ہے۔

باب کی یہ دونوں روایتیں بتصریح امام ترمذیؒ صحیح ہیں تاہم باب کی آخری حدیث جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے درجۂ حسن کی ہے۔اس روایت میں مہدی کی تصریح بھی ہے اور مدت ولایت بھی متعین کی گئی ہے تاہم راوی کو شک ہے کہ وہ مدت پانچ یا سات یا نو سال کی ہے اور یہ کہ ان کے پاس ایک شخص آئے گا اور مال (غنیمت و بیت المال) کا مطالبہ کرے گا، حضرت مہدی لپ بھر بھر کر اسے اتنا دیں گے جتنا وہ اپنی چادر میں اٹھا سکے گا۔یعنی بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔

مہدی کی آمد:۔حضرت مہدی کے بارے میں اہل علم کی کل ملا کر تین آراء ہیں :ایک جماعت کے خیال میں حضرت مہدی سے متعلق تمام احادیث ضعیف ہیں۔(۲) احادیث صحیح ہیں مگر حضرت مہدی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں۔(۳) یہ احادیث متواتر ہیں اور حضرت مہدی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مختلف و مستقل شخصیت کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تشریف لائیں گے پھر ان کے بعد دجال کا خروج ہوگا تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور وہی دجال کو قتل کریں گے جیسا کہ ترمذی کے "باب ماجاء فی فتنۃ الدجال" میں تصریح ہے۔

جو حضرات ظہور و آمد مہدی کے منکر ہیں ان میں سر فہرست علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون المؤرخ کا نام ہے جنہوں نے اپنے مقدمہ کی جلد دوم میں مہدی سے متعلق اکیس مرفوع احادیث نقل کر کے ان کے راویوں پر تفصیلی جرح کی ہے اور ان روایات کی تضعیف کے لئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جرح مقدم ہوتی ہے تعدیل پر لہٰذا ایسے مختلف فیہم راوی ضعیف ہی کہلائیں گے، دوم حضرت مہدی سے متعلق احادیث اور دلائل میں شیعہ و روافض پیش پیش ہیں جس سے ان روایات کی توثیق مشکوک ہوگئی ہے، مگر جمہور علماء کرام نے ابن خلدون کے اس استدلال کو رد کیا ہے کہ اولاً تو ابن خلدون تاریخ و عمرانیات کے ماہر ہیں فقہ و احادیث کے ماہرین میں ان کا شمار نہیں ہوتا، ثانیاً یہ بات صحیح ہے کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہوتی ہے لیکن اگر تعدیل مقدم ہو تو مؤخر جرح قابل التفات نہیں ہوتی دوم کبھی راوی ضعیف یا مختلف فیہ ہوتا ہے مگر کثرت طرق اور تعدد متابعات کی وجہ سے وہ درجۂ

ضعف سے بلند ہو کر درجۂ حسن اور کبھی کبھی اس کی روایت صحت تک جا پہنچتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے باب کی روایت جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے عاصم کے باوجود پر حسن صحیح کا حکم لگایا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حدیث پر حکم کبھی امور خارجیہ کے پیش نظر بھی ہوتا ہے لہٰذا امام ترمذیؒ کا یہ حکم اس کی ایک اور مثال سمجھیں۔

جہاں تک دوسرے فریق کا تعلق ہے کہ مہدی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو اس رائے کو خود ابن خلدون نے بھی رد کیا ہے کہ ظاہر احادیث سے اس تاویل کی صاف نفی ہوتی ہے۔

اب رہا تیسرے فریق کا موقف تو اس بارے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس پر امت کا اجماع ہے اور یہ کہ مہدی سے مراد وہ امام منتظر نہیں جو شیعوں کے من گھڑت عقیدے کے مطابق وہ بارھویں امام غائب ہیں کیونکہ ان کے نزدیک امام غائب کا نام محمد بن الحسن العسکری ہے جب کہ ابوداؤد (جلد:۲ص:۵۸۸) کی روایت میں تصریح ہے کہ: "یواطئی اسمه اسمی و اسم ابیه اسم ابی" یعنی محمد بن عبداللہ نام ہوگا۔ ہاں جن روایات میں ہے کہ وہ اولاد فاطمہ میں سے ہوں گے، بعض میں "من اولاد الحسن" اور بعض میں "من اولاد الحسین" کے الفاظ آئے ہیں تو اس کا جواب ابن حجر ہیثمیؒ نے یہ دیا ہے کہ ان روایات میں کوئی منافات نہیں کہ ایک ہی شخص میں دو مختلف قبیلوں کے نسب ملنا عام سی بات ہے کہ ماں مثلاً حسنی ہوں اور باپ حسینی، قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مہدی کے بارے میں کل احادیث پچاس مروی ہیں ان میں اٹھائیس آثار ہیں یعنی باقی مرفوع۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہت سے علماء اپنا حساب لگا کر حضرت مہدی کی آمد کے لئے ایک وقت مقرر کرتے ہیں پھر جب وہ وقت گذر جاتا ہے تو ان کے مرید و شاگرد پھر تاویلات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ایسی پیشن گوئی شیخ اکبر ابن عربیؒ نے بھی کی تھی کہ مہدی ۶۸۳ھ میں آئیں گے مگر وہ صحیح ثابت نہ ہو سکیں، آج کل بھی بہت سے علماء نے اس بارے میں پیش گوئیاں کی ہیں، اس سے گریز کرنا لازمی ہے کیونکہ اس سے عوام کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔ دجال کے بارے میں بھی یہ قاعدہ ملحوظ رہنا چاہئے۔

باب ماجاء فی نزول عیسیٰ بن مریم

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا بیان

"عن ابی ھریرة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: والذی نفسی بیدہ لَیُوشِکَنَّ ان ینزل فیکم ابن مریم حَکَماً مُقسِطاًفیُکسِرُ الصَّلِیبَ ویقتل الخنزیرویضع الجزیة ویَفِیضُ المالُ حتی لایقبلہ احد". (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ عنقریب ابن مریم تمہارے درمیان ضرور اتریں گے دراں حالیکہ وہ انصاف والے حاکم ہوں گے پس وہ صلیب توڑیں گے اور خنزیز (سور) کو قتل کریں گے اور جزیہ کو ختم کریں گے اور مال غنیمت زیادہ ہوجائے گا حتی کہ کوئی شخص مال کو قبول نہیں کرے گا (یعنی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا)۔

تشریح:۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اہل السنہ والجماعت کا متفقہ اور مجمع علیہا مسئلہ ہے اور یہ کہ وہ دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی منارہ پر فرشتوں کے کندھوں پر دونوں ہاتھوں سے تکیہ لگائے ہوئے جلوہ افروز ہوں گے پھر منارہ سے سیڑھی کے ذریعہ نیچے اتریں گے اور حضرت مہدی کی امامت میں نماز ادا فرمائیں گے جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس امت مرحومہ کی صف میں شامل ہوکر بحیثیت امتی خلافت کے فرائض انجام دیں گے اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہود کو قتل کریں گے اور ہر اس کافر کو قتل فرمائیں گے یا اسلام پر مجبور فرمائیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول و نبی یا آخری نبی نہیں مانتا، اس لئے ان کے نزول کے بعد پورا کا پورا دین صرف اللہ ہی کے لئے ہوگا جو اسلام ہی ہے باقی کوئی دین اور کسی بھی دین کے پیروکار نہیں رہیں گے ، چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام صلیب کو توڑیں گے یعنی زمین پر کہیں بھی اس کے بنانے یا رکھنے کی اجازت کسی کو بھی نہیں دیں گے جس سے یہود و نصاریٰ دونوں کا زعم باطل ہوجائے گا کیونکہ یہود نے یہ مشہور کردیا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو صلیب (جو لکڑی کی مثلث طرز کا آلہ ونشان ہوتا ہے) پر پھانسی دی گئی ہے اور نصاریٰ اس کو مبارک سمجھ کر اس کی حد درجہ تعظیم کرتے ہیں، اسی طرح خنزیر کے قتل میں بھی ان کے زعم کی تردید ہے کہ خنزیر تو حلال نہیں اس لئے اس کے ذبح سے کوئی حلت وذکاۃ حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ تو مارے جانے کا مستحق ہے تاکہ نہ تو کوئی اسے پال رکھے اور نہ ہی اس سے کسی طرح کا استفادہ کرے۔

رہا جزیہ ختم کرنے کا مسئلہ تو اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہئے کہ حضرت عیسی علیہ السلام جزیہ کو منسوخ کریں گے کیونکہ وہ تو پورے کے پورے اسلام کے پابند ہوں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کافر ختم ہو جائیں گے تو جزیہ خود بخود ختم ہو جائے گا جیسے مولفۃ القلوب کا حکم ہے یا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیہ کا حکم بیان فرمایا کہ یہ حکم حضرت عیسی علیہ السلام تک رہے گا اور ان کے نزول کے ساتھ ختم ہو جائے گا پس یہ تنسیخ حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف سے نہیں بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور انہوں نے پہلے ہی اس کا حکم بتلا دیا۔

نزول عیسیٰ اور حکمت باری:۔ ویسے تو اللہ رب العزت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں اور عالمین میں جو کچھ رونما ہوتا ہے اس میں بے شمار حکمتیں اور بے تحاشا راز پنہاں ہوتے ہیں خصوصاً عالم اسباب میں تو ہر شے دوسری شے کے ساتھ اس طرح مرتب ومنسلک ہے جیسے زنجیر کی کڑیاں ہوتی ہیں، اس لئے یہ بات سو فیصد یقینی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو بحالت حیات آسمان کی طرف اٹھانا اور پھر بالکل قیامت کے قریب ان کو نازل فرمانا ضرور کسی بڑی حکمت پر مبنی ہے اور یہ کہ ہماری عقل وفہم اس حکمت کے ادراک سے قاصر ہے مگر ممکن ہے کہ ان حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہو کہ جب انسانیت کا بگاڑ انتہاء تک پہنچ جاتا ہے تو عام انسان اس کی اصلاح سے قاصر وعاجز ہو جاتے ہیں ایسے میں اللہ کی مہربانی کا تقاضا ہوتا ہے کہ لوگوں کی دستگیری کے لئے ان میں سے کسی ایسے شخص کا انتخاب کر کے بھیجا جائے جو تمام لوگوں سے زیادہ عاقل، ذہین، دیانت دار اور ہمدرد وخیر خواہ ہو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جب انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری تھا تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہر زمانے والوں کے لئے نیا نبی اور رسول بھیجتا مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عمارت کی آخری اینٹ کی طرح خاتم النبیین قرار پائے تو وہ سلسلہ مکمل ہوا اور ارسال الرسل کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہوا، دوسری طرف لوگ آخری زمانے میں ہدایت سے بہت دور جا نکلیں گے۔ نصرانیت کے نام پر گمراہی عام ہو جائے گی اور ظلمات وتوہمات ہر سو چھا جائیں گے، ایسے میں نیا نبی بھی نہیں آسکے گا اور موجودہ لوگوں میں کوئی ایسا بھی نہیں ہوگا جو حالات کو بدل سکے ساری دنیا نصاریٰ کے رحم وکرم پر گویا زندہ ہوگی۔ ایسے میں اللہ نے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور نصاریٰ ویہود کو شرمندہ کرنے کے لئے حضرت عیسی علیہ السلام کو محفوظ رکھا جو اپنے مقررہ وقت پر نزول فرما کر حالات کو اللہ کے حکم سے بدل ڈالیں گے اور تمام مردہ دلوں کو جوان میں قابل علاج ہوں گے باذن اللہ زندہ فرمائیں گے اور جو نا قابل علاج ہوں گے وہ مر جائیں گے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی سانس میں

اللہ یہ تاثیر ودیعت فرمائیں گے کہ تا حد نگاہ کوئی کافر سامنا نہیں کرسکے گا گویا یہ ایٹم بم کا جواب ہوگا اور اس وقت یہ ٹیکنالوجی دنیا والوں کے پاس نہیں ہوگی اس لئے ان کے آگے سب بے بس ہوں گے ویکون الدین کلہ للہ۔

باب ماجاء فی الدجال

دجّال کا بیان

"عن ابی عبیدة ابن الجرّاح قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: انہ لم یکن نبی بعدَ نوح الّا قد انذر قومَہ الدجالَ وانی انذِرُکُمُوہ فوصف لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: لعلہ سیدرکہ بعض من رانی اوسمع کلامی قالوا: یارسول اللہ افکیف قلوبنا یومئذٍ؟ فقال مثلہا یعنی الیوم اوخیر". (حسن غریب)

حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ نوح علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں گذرا ہے مگر اس نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا ہے اور میں بھی تم کو اس سے ڈراتا ہوں پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات سے ہمیں آگاہ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید اسے وہ لوگ پالیں گے جنہوں نے مجھے دیکھا ہے یا (وہ لوگ) جنہوں نے میرا کلام سنا ہو صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اس وقت ہمارے دل کیسے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج کی طرح ہوں گے یا اس سے اچھے۔

تشریح:۔ امام ترمذیؒ نے چند ابواب میں دجال کے متعلق مختلف زاویوں پر نظر ڈالی ہے اور متعدد سوالات کے جوابات تلاش کئے ہیں جو اس اندھے فتنے کا تقاضا تھا کہ اس پر تفصیل سے بحث کی جائے۔ دجال بتشدید الجیم مبالغے کا صیغہ ہے اور دجل سے مشتق ہے جو بمعنی فریب، جھوٹ اور خلط ملط کرنے کے آتا ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔

دجال کے متعلق ان ابواب کی تشریحات سے قبل ایک تمہید بیان کرنا مناسب ہے تا کہ صحیح صورت حال سمجھنا آسان رہے وباللہ التوفیق۔

(۱)...حق اور باطل کا معرکہ اس دنیا پر رہنے والے انسانوں کے لئے آزمائش بھی ہے اور ترقی وتباہی

کا سامان بھی۔ اہل ایمان اس جنگ میں فتح یاب ہو کر ترقی کرتے ہیں اور ایمان کے ثمرات سے بہرور ہو جاتے ہیں جبکہ اہل عصیان تباہ ہو جاتے ہیں۔

قرآن وسنت اور تاریخ گواہ ہے کہ حق وباطل کے میدان جنگ میں آخری فتح حق کو نصیب ہوتی ہے پس جس قدر باطل طاقت ور ہوتا ہے اسی طرح حق بھی من جانب اللہ مضبوط تر ہو جاتا ہے اور بالآخر غالب ہی رہتا ہے اگر کسی کو یہ طاقت عالم اسباب کی رُو سے نظر نہ بھی آجائے تو غیبی مدد کے بے شمار واقعات اس کا بین ثبوت ہے۔ امم معذبہ کے کھنڈرات آج بھی بزبان حال اس کا اعلان کر رہے ہیں۔ علی ہذا جب کفر مزید مضبوط ہوگا تو مسلمانوں کی تقویت کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مہدی کو منتخب فرمائیں گے جو اہل باطل کو شکست دے کر ان کو یورپ کی وادیوں میں دھکیل دیں گے وہ ابھی تک خلافت کی بنیادیں صحیح طور پر مضبوط نہ کر چکے ہوں گے کہ ان کے مقابلے کے لئے دجال کا خروج ہو جائے گا جس کی طاقت اور ظاہری شوکت کا عالم وہ ہوگا جس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے جس کا تذکرہ اگلے ابواب میں آرہا ہے، جب اس عظیم فتنہ سے دنیا تقریباً بھر جائے گی اور یوں محسوس ہوگا جیسے دجال غالب ہونے والا، اور پوری دنیا پر حاکم بننے والا ہے تو عین اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے وہ دجال کو قتل فرمائیں گے اس طرح باطل کا مکمل صفایا ہو جائے گا، اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد کفر بہت جلد عام ہو جائے گا مگر وہاں مقابلہ کی کوئی صورت نہ ہوگی تو فتح کا سوال ہی بے کار ہے۔

(۲)....اس زمانے میں خرق عادت امور کی کثرت ہو جائے گی جیسا کہ عارضہ میں ہے:"لان ذالک زمان خرق العادات" آج کل عجائبات کی کثرت تو مشاہدۂ عام ہے جس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں تاہم جیسے جیسے وقت گذرے گا تو نت نئی ایجادات اور حیران کن حد تک اشیاءِ استعمال میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا تا آنکہ دجال ان سے بھی بڑھ کر کرتب دکھائے۔

(۳)....بعض لوگ دجال سے انکار کرتے ہیں اور بعض ان روایات میں ایسی تاویلات کرتے ہیں جو بظاہر نصوص کے خلاف ہیں مثلاً دجال سے مراد ایک طاغوتی نظام ہے وغیرہ وغیرہ حالانکہ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں پہلے فریق کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ایسی نصوص کا انکار کیا جو معناً متواتر ہیں اور امت کا اس پر اجماع، جبکہ دوسرے فریق نے بلا کسی ناگزیر وجوہ کے نصوص کو ظاہر سے پھیر دیا، یہ دونوں باتیں اصول کے خلاف ہیں۔

شرح عقائد میں ہے:

"وما اخبر النبی عم من اشراط الساعة ای من علاماتها من خروج الدجال ودابة الارض ویاجوج وماجوج ونزول عیسی عم من السماء وطلوع الشمس من مغربها فهو حق لانها امور ممکنة اخبر بها الصادق الخ". (ص: ۱۲۴)

دوسری بات کے متعلق لکھا ہے:

"والنصوص من الکتاب والسنة تُحمل علی ظواهرها مالم یصرف عنها دلیل قطعی الخ". (۱۱۹، مکتبہ علوم اسلامیہ پشاور)

اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ ان روایات کے مطابق دجال کے متعلق صحیح احادیث کو اپنے ظاہر ہی پر محمول کرنا لازمی ہے تاہم اس کے وقت کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ فلاں سال یا فلاں مہینے میں نکلے گا کیونکہ بڑے واقعات کے رونما ہونے میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ ہم لوگ جلد باز ہوتے ہیں اللہ کو کوئی جلدی نہیں ہے۔

قولہ: "لم یکن نبی بعد نوح الخ" یہاں مبدأ یعنی حضرت نوح بھی اس انذار میں شامل ہیں اور تخصیص ان کی شہرت کی بناء پر ہے یا پھر طولِ زمانہ کی وجہ سے یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول الله! کیف تعرف امتک من بین الامم فیما بین نوح الی امتک ؟قال غر محجلون الخ (مشکوٰۃ ص: ۴۰) علی ہذا اس روایت میں اور باب کی اگلی روایت میں کوئی تعارض نہیں ، رہی یہ بات کہ ان سب انبیاء علیہم السلام نے اپنی امتوں کو کیوں ڈرایا حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ دجال تو علامات کبریٰ میں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت کے قریب نکلے گا؟ اگرچہ ایک رائے کے مطابق ان کو پتہ نہیں تھا اس کا جواب ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ دیا ہے کہ:

انذار الانبیاء من نوح الی محمد علیه السلام بأمر الدجال تحذیر للقلوب من الفتن وطمأنیة لها.... الخ .

یعنی ان کا مقصد لوگوں کو نفس فتنوں سے ڈرانا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھرپور انداز سے بیان فرمایا جیسا کہ "باب ماجاء فی فتنة الدجال" میں آرہا ہے:

فخفّض فیه ورفّع حتی ظننّاه فی طائفة النخل الخ ....لانه ان لم تکن

فتنة الدجال قريبة فان قريباً منها قريب في فساد الاديان واتباع الائمة المضلين والافتتان بالسلاطين ". (عارضہ)

مطلب یہ ہے کہ جب کسی نوع کا بڑا فرد سامنے ہو تو دیگر چھوٹے چھوٹے افراد کو اس پر قیاس کرنا آسان ہوتا ہے۔ تدبر

قوله:"واني انذر كموه " اگلی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو اس کے بارے میں ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی قوم سے نہیں کہی ہے، چونکہ باقی انبیاء کو معلوم تھا کہ وہ ہماری امتوں کے زمانہ میں نہیں آئے گا اس لئے ان کو شخصی تعارف کی ضرورت نہ تھی جبکہ اس امت کے لئے یہ فتنہ یقینی تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی۔

قوله"لعله سيدر كه بعض من رائي اوسمع كلامي" جو حضرات اس حدیث کو صحیح نہیں مانتے ہیں ان کے لئے تو کوئی پیچیدگی نہیں جیسا کہ ابن العربیؒ آخری جملے **"فقال مثلها يعني اليوم اوخير"** کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"فهذه الكلمة واشباهها تسقط الاحاديث وان رواها المستورون الخ......وقد روى ابوعيسى عن ابن عبدة غريباً وعن ابن عمر صحيحاً".

مگر پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امام بخاریؒ اور امام ابن العربیؒ کے نزدیک درجۂ حسن کی روایت بھی ضعیف ہوتی ہے جبکہ جمہور کے نزدیک حسن قابل استدلال ہوتی ہے، لہٰذا یہاں حدیث کو ثابت مان کر توجیہ کی ضرورت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والے اور سننے والے کیسے دجال کو پالیں گے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سو سال کے بعد کوئی بھی (موجودہ لوگوں میں سے) نہیں بچے گا۔

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ سماع عام ہے خواہ براہ راست ہو یا بالواسطہ لہٰذا مراد اس امت کا کوئی شخص ہے جس نے دجال کے متعلق احادیث بالواسطہ سنی ہوں گی مگر یہ توجیہ پہلے جملے **"من رانی"** کے ساتھ نہیں لگتی اس لئے بعض شارحینِ بخاری جیسے قسطلانی وغیرہ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ دجال جس شخص کے دو ٹکڑے کرے گا وہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کوئی معمر جن ہوگا حضرت تھانویؒ نے تقریر ترمذی (المسک الذکی) میں فرمایا کہ حدیث کو ظاہر پر محمول کرنا اولیٰ ہے بلکہ لازمی ہے اور کہا جائے گا کہ اس عہد پاک کا کوئی شخص مراد ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سو سال کے بعد کوئی بھی نہیں رہے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عام مخصوص منہ البعض ہے چونکہ شیطان بالاتفاق اب تک موجود ہے اور دجال بھی زندہ ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت خضر یا کوئی جن وغیرہ بھی اس وقت تک زندہ رہے گا، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، ابن العربی نے اس کو رد کیا ہے۔

قولہ "مثلھا یعنی الیوم او خیر" اس کے بارے میں تو ابن العربیؒ کی رائے گذر گئی کہ یہ جملہ بہت سی احادیث سے معارض ہے اور دلوں کی حالت میں گراوٹ اور تنزلی امر بدیہی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ماانفضنا ایدینامن تربۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی انکرنا قلوبنا" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور جیسے ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہوا تو ابھی ہم نے قبر مبارک کی مٹی سے اپنے ہاتھوں کو نہیں جھاڑا تھا کہ ہم نے اپنے دلوں میں فرق محسوس کیا یعنی وہ تجلیات وانوارات اس شان سے نہ رہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تھے۔

بصورت صحت مطلب یہ ہے کہ جن کے دل میں ایمان ہوگا تو وہ فتنے کو یقین سے دفع کریں گے۔

عارضہ میں ہے: "انھم اذا کانوا علی الایمان ثابتین دفعوا الشبھۃ بالیقین" یعنی یہ مراد نہیں کہ ان کا ایمان صحابہ کرامؓ کے ایمان سے اچھا ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اس فتنہ کو آسانی سے دفع کرسکیں گے جو اس وقت کے حالات کا تقاضا ہوگا، کیونکہ وہ زمانہ ہی خوارق عادات کا ہوگا تو ان کے لئے دجال کے کرتب اتنے اہم اور مسحور کن نہیں ہوں گے، اور کسی کمزور آدمی کا بڑے معرکہ کو سر کرنا ممکن ہے۔

قولہ: " تعلمون انہ أعور وان اللہ لیس باعور" اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دجال ناقص الخلقت ہے کیونکہ اعور (کانا) ہونا بڑا عیب ہے جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام عیوب ونقائص سے پاک ومنزہ ہے پس اس کا دعوائے ربوبیت کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ جو شخص خود کو نہیں بچاسکتا اور اپنا نقصان نہیں ہٹا سکتا وہ دوسروں کا خدا کیونکر بن سکتا ہے؟ گویا یہ ایسا فتنہ ہے جس کے بطلان کی دلیل اسی کے اندر بلکہ اوپر موجود ہے لیکن فتنہ میں مبتلاء لوگ عموماً سوچا نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں اس کے بال بھی بہت زیادہ ہوں گے اور داہنی آنکھ کے کنارے پر گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا بھی ہوگا تو ایسا شخص جس کی بائیں آنکھ کانی، داہنی زائد گوشت کی بناء پر بہت بدنما اور غیر ضروری بالوں کی وجہ سے نہایت قبیح ہو وہ الٰہ ومعبود اور رازق کیسے ہوسکتا ہے؟۔ کذا فی العارضہ

قولہ: " تعلمون انہ لن یریٰ احدمنکم رَبَّہٗ حتی یموت" یہ اس کے دجل وفریب

کا دوسرا بڑا قرینہ بتلایا کہ دجال تمہارے سامنے ہوگا تو اگر وہ خدا ہوتا آپ کو ہر گز نظر نہ آتا کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ تم میں سے کوئی اپنے رب کو نہ دیکھ سکے گا جب تک وہ مر نہ جائے۔

یہاں امت کے دیکھنے کی نفی کی گئی ہے رہی یہ بات کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقعہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں تو وہ الگ مسئلہ ہے اس حدیث سے اس کی نفی مراد نہیں، تاہم وہاں بھی دو قول ہیں حضرت عائشہ وابن مسعود رضی اللہ عنہما نفی کے قائل ہیں اور بعض دیگر صحابہ رویت کے، راجع للتفصیل شرح العقائد۔

قوله:"وانه مكتوب بين عينيه كافر" یہ تیسرا قرینہ ہے اس کے بطلان دعوی پر کہ اس کی آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوا ہوگا پھر لفظ کافر تعبیر اور حاصل مراد ہے ورنہ کتابت کی شکل حروف تہجی میں ہوگی یعنی ک، ف، ر۔

قوله:"يقرأه من كره عمله" ہر وہ شخص اس کو پڑھ سکے گا جو دجال کے عمل کو برا سمجھے گا۔ عارضہ میں ہے کہ وہ مسلمان بھی اس کو پڑھ سکیں گے جو ان پڑھ ہوں گے کیونکہ وہ زمانہ خوارق کا ہوگا جبکہ کافر اس کو نہیں پڑھ سکے گا کہ اس کی بصیرت ہی ختم ہوگئی ہوگی گویا اس قرأت کا تعلق بجائے بصارت کے بصیرت سے ہے۔

"عن ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تقاتلكم اليهود فتُسَلَّطُون عليهم حتى يقول الحجر يامسلم هذا اليهودي ورائي فاقتله". (حسن صحيح)

یعنی یہود تم سے لڑیں گے پس تم ان پر غالب آجاؤ گے یہاں تک کہ پتھر پکارے گا: اے مسلم! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اسے مار ڈالو۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ زمانہ خرق عادات کا ہوگا اس لئے پتھر کا بولنا قابل یقین ہے بلکہ واجب الیقین ہے کہ ہر ممکن جس کی خبر صادق ومصدوق دے دیں واجب الیقین ہو جاتا ہے مسلم کی روایت میں درخت کا بھی اضافہ ہے البتہ غرقد نامی درخت جو بیت المقدس میں پایا جاتا ہے اور خاردار بھی ہے وہ خاموش رہے گا یہ شائد نوع کی خباثت ہے۔ اس حدیث کی مزید شرح اگلے باب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء من این یخرج الدجال

دجال کہاں سے نکلے گا

"عن ابی بکر الصدیق قال حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :قال الدجال یخرج من ارض بالمشرق یقال لها خُراسان یتبعه اقوام کَاَنَّ وجوههم المجانُّ المطرقةُ".

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا کہ دجال مشرق کے ایک علاقہ جسے خراسان کہا جاتا ہے سے نکلے گا، اس کی پیروی ایسے لوگ کریں گے (یعنی اس کے ساتھ ہوں گے) جن کے چہرے ڈھال کی طرح تہہ بتہہ ہوں گے۔

تشریح:۔ قدیم جغرافیہ میں ایران کا مشرقی اور افغانستان کا مغربی حصہ ہرات وغیرہ خراسان کہلاتا تھا یہ اگرچہ مدینہ منورہ کے عین مشرق میں نہیں ہے مگر اہل عرب عراق اور ایران وغیرہ پورے خطے کو مشرق کہتے ہیں گویا یہاں عرفی مشرق مراد ہے۔

دجال کے خروج کے بارے میں تمام روایات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں اور یورپ ومغرب والوں کے درمیان سخت لڑائی ہوگی جسے اگلے باب میں "الملحمة العظمیٰ" یعنی جنگ عظیم سے تعبیر کیا ہے، اس جنگ میں رومی قُسطنطنیہ یعنی استنبول پر قبضہ کرلیں گے پھر حضرت مہدی آکر ان کی کمانڈ میں مسلمان اسے دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ابھی وہ تقسیم غنائم سے فارغ نہیں ہوئے ہوں گے کہ دجال کے خروج کی خبر پہنچ جائے گی گویا جب کافروں کو استنبول کے محاذ پر شکست کا سامنا ہوجائے گا تو وہ پیچھے سے تیاری کر کے حملہ آور ہونے کی کوشش کریں گے اور اپنے زعم کے مطابق ایک ایسی طاقت کے ساتھ میدان میں اتریں گے جو بظاہر ناقابل شکست ہوگی یہ دجالی قوت ہوگی ایک روایت میں ہے کہ دجال کے ساتھ شریک لشکر یہودی ہوں گے اور ان کی تعداد ستر ہزار ہوگی جبکہ باب کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ ان لشکریوں کے چہرے ڈھال کی مانند گول مول اور پر گوشت ہوں گے یہ وصف ترکی النسل ازبک وغیرہ ماوراء النہر کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

پھر بعض روایات کے مطابق دجال کا خروج ایک جزیرہ سے ہوگا ایک روایت میں شام وعراق کے درمیان سے گذرنا ثابت ہے مگر ان روایات میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اولین خروج تو جزیرہ سے ہوگا مگر وہ خفیہ

ہوگا جبکہ خراسان مین ظہور ہوگا اور شام تک پہنچتے پہنچتے اس کی قوت وکثرتِ اتباع انتہاء تک پہنچ جائے گی مگر اللہ کے فضل سے وہ مزید ترقی کے بجائے ہلاکت کا شکار ہوں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے اور اس کا لشکر سب ختم ہو جائے گا حتی کہ پتھر اور درخت بھی ان کے خلاف ہو جائیں گے۔

باب ماجاء فی علامات خروج الدجال

خروج دجال کی علامات کے بارے میں مروی حدیث

"عن معاذبن جبل عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: الملحمة العُظمیٰ وفتح القُسطُنطِنيةِ وخروج الدجال فی سبعة اشهر". (حسن)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنگ عظیم اور قسطنطنیہ کی فتح اور دجال کا خروج سات ماہ میں ہوگا۔

تشریح:۔ جنگ کو ملحمہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں لحم یعنی گوشت کٹتا ہے قسطنطنیہ میں قاف مضموم اور سین ساکن ہے طائے اول پر ضمہ اور دوم پر کسرہ ہے بعض لغات میں نون کے بعد ایک اور یاء مشددہ کا بھی اضافہ ہے یہ شہر ترکی میں ہے جو قسطنطین بادشاہ کی طرف منسوب ہے آج کل اس کا نام استنبول ہے، ترکی ایشائی ملک ہے مگر یہ صوبہ یورپ میں ہے جس کو بحر اسود کو ملانے والے ابنائے پر ایک پل ملاتا ہے جو بٹن سے کھلتا ہے۔

مذکورہ روایت میں سات مہینوں کا ذکر ہے مگر بعض دیگر روایات میں چھ سالوں کا ذکر ہے اس لئے بعض حضرات نے باب کی روایت کو ابوبکر بن ابی مریم کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ جنگوں کا ایک سلسلہ چھ سال پر مشتمل ہوگا اور دوسرا سلسلہ فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال پر مشتمل ہوگا جس میں پہلے سلسلہ کے آواخر بھی داخل ہوں گے اس کا دورانیہ سات ماہ پر مشتمل ہوگا گویا جنگ عظیم چھ سال تک جاری رہے گی۔ اس موضوع پر آج کل تفصیلی کتابیں لکھی جا چکی ہیں شرح حدیث کے لئے اس قدر وضاحت کافی ہے۔

باب ماجاء فی فتنة الدجال

دجال کے فتنہ سے متعلق حدیث کا بیان

"عن النوّاس بن سمعان الكِلابی قال ذكر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الدجالَ

ذات غداة فَخَفَّضَ فيه ورَفَّعَ حتى ظَنَنَّاه في طائفة النخل قال: فانصرفنامن عندرسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم رُحنااليه فعرف ذالك فينا، فقال: ماشانكم؟؟ قال قلنايارسول الله اذكرتَ الدجالَ الغداةَ فَخَفَّضتَ ورَفَّعتَ حتى ظنناه في طائفة النخل. قال: غيرالدجال اخوف لي عليكم إن يخرج وانافيكم فاناحجيجه دونكم، وان يخرج ولستُ فيكم فامرؤ حجيج نفسه والله خليفتي على كل مسلم، انه شابٌّ قَطَطٌ عينُه قائمة شبيه بعبدالعُزّى بن قَطَن فمن راٰه منكم فليقرأ فواتح سورة اصحاب الكهف، قال يخرج مابين الشام والعراق فعاث يميناً وشمالاً، ياعباد اللّٰه! اثْبُتوا! قلنا يا رسول الله ومالُبثُه في الارض؟ قال: اربعين يوماً، يوم كسنة ويوم كشهرويوم كجمعة وسائرايامه كايامكم، قال قلنايارسول الله ارأيت اليوم الذى كالسنة اَتكفينافيه صلاةُ يوم؟ قال: "لا" ولكن اقدرواله! قلنايارسول الله فماسرعته في الارض؟ قال: كالغيث استدبرته الريح فياتي القوم فيدعوهم فيُكَذِّبُونه ويَرُدُّون عليه قوله فينصرف عنهم فتتبعه اموالُهم فيصبحون ليس بايديهم شئٌ ثم يأتي القومَ فيدعوهم فيستجيبون له ويُصَدِّقونه فيأمر السماءَ ان تمطِرفتمطِرويأمرالارضَ ان تنبتَ فتنبتُ فتروح عليهم سارحتهم كاطول ماكانت ذُرًى وامدِّه خواصِرَواَدَرِّه ضروعاً، ثم يأتي الخَربَةَ فيقول لهااَخرِجي كنوزَكِ فينصرف منهافتَتبَعُه كيعاسيب النحل ثم يدعورجلاً شاباً ممتلياًشبابافيضربه بالسيف فيقطعُه جِزلتين ثم يدعوه فيقبل يَتَهَلَّلُ وجههُ يضحكُ، فبينما هو كذالك اذهبط عيسىٰ بن مريم بشرقي دِمشق عندالمنارة البيضاء بين مهرودتين واضعاً يده على اجنحة ملكين اذاطأطأراسه قَطَرَواذارفعه تَحَدَّر منه جُمَّان كاللؤلؤقال: ولايجدريحَ نفسِه يعني احدٌالاّمات وريحُ نفسِه منتهى بصره قال فيطلبه حتى يدركه بِبَابِ لُدٍّ فيقتله قال فيلبثُ كذالك ماشاء الله قال ثم يوحِي الله اليه ان حَوِّزعبادى الى الطورفاني قد انزلت عباداًلِي لايَدَانِ لِاَحَدٍ بقتالهم قال ويبعث الله ياجوج وماجوج وهم كماقال الله "وهم من كل حدب ينسلون"، قال ويمرُّ اولهم بِبُحيرة الطبرية فيشرب مافيهاثم يَمُرُّ بهاآخِرُهم فيقولون لقدكان بهذه مرة ماء ثم يسيرون حتى ينتهواالى جبل بيت المقدس فيقولون: لقدقَتَلنَامن في الارض فَهَلُمَّ فلنقتل من في السماء فيرمون بنُشّابهم الى

السماء فيردُّ اللهُ عليهم نُشّابهم مُحمرّاً دماً ويُحاصَرُ عيسىٰ بن مريم واصحابُه حتى يكون رأسُ الثور يومئذٍ خيراً لهم من مائة دينار لاحدكم اليوم قال: فيرغبُ عيسىٰ بن مريم الى الله واصحابه، قال: فيُرسِلُ اللهُ عليهم النَّغَفَ في رِقابهم فيصبحون فرسىٰ مَوتىٰ كموت نفس واحدة، قال: ويهبِطُ عيسىٰ واصحابه فلايجِدُ موضع شِبرٍ الّا وقدملأته زَهَمَتُهم ونَتَنُهُم ودِماءُهم قال فيرغب عيسىٰ الى الله واصحابه قال فيرسل الله عليهم طيراً كاعناق البُخت فتحمِلهم فتطرَحُهُم بالمَهبَل ويَستَوقِدُ المسلمون من قِسِيّهم ونُشّابهم وجِعابِهم سبع سنين ويرسل الله عليهم مطراً لايُكَن منه بيت وَبَرٍ ولامَدَرٍ قال: فَيَغسِلُ الارضَ فيتركها كالزَّلَفَة قال ثم يقال للارض اَخرِجي ثمرتكِ ورُدّي بركتكِ فيومئذٍ تاكل العِصابةُ الرمانة ويستظلون بقحفِها ويبارك في الرِّسل حتى ان الفِئامَ من الناس لَيَكتفُونَ باللِّقحةِ من الابل وان القبيلة لَيَكتفون باللِّقحةِ من البقر وان الفَخِذ لَيَكتفُون باللقحة من الغنم فبينماهم كذالك اذبعث الله ريحافقبضت روحَ كل مؤمن ويبقىٰ سائر الناس يتهارجون كمايتهارج الحُمر فعليهم تقوم الساعة". (غريب حسن صحيح) واخرجه مسلم واحمد رحمهما الله.

حضرت نواس بن سمعان کلابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کے وقت دجال کا تذکرہ فرمایا پس اس کے حال کو نیچا بھی کیا اور بلند بھی کیا (یعنی اس کی حقارت بھری حالت بھی پیش کی اور اس کی بڑی بڑی کرتوت بھی بیان کیں) حتی کہ ہم اس کو کھجوروں کے جھنڈ میں (یا کنارے پر) سمجھنے لگے چنانچہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے لوٹ گئے (یعنی گھروں کو چلے گئے) پھر شام کے وقت دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے خوف کو بھانپ لیا اور فرمایا تمہیں کیا ہوا؟ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے صبح دجال کا ذکر کیا اور اسے پست بھی کیا اور اونچا بھی، یہاں تک کہ ہم نے اسے کھجوروں کے درختوں کے پاس تصور کیا،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دجال کے علاوہ ایک اور چیز کا تم پر خوف کرتا ہوں (کیونکہ) اگر وہ نکلے اور میں تمہارے درمیان موجود رہا تو میں تم سے آگے بڑھ کر اس پر حجت میں غالب رہوں گا، اور اگر وہ نکلے اور میں موجود نہ رہا تو ہر آدمی اپنے طور پر (یعنی اپنی طرف سے) حجت پیش کر کے اس پر غالب آجائے گا (یعنی پکے مؤمن) اور میرے بعد اللہ ہر مسلمان کا محافظ ہے (یعنی میں رہوں یا نہ رہوں اللہ تمہاری حفاظت کرے گا)

دجال جوان ہے اس کے بہت زیادہ گھنگھریالے بال ہیں اس کی آنکھ اپنی جگہ باقی ہے (یعنی باوجودیکہ باہر کی طرف نکلی ہوئی ہے) وہ عبدالعزیٰ بن قطن کے ہم شکل ہے تم میں سے جو بھی اس کو دیکھے تو سورۃ الکہف کی شروع کی آیتیں پڑھ لے (کیونکہ یہ آیات دفع فتنہ کے لئے مجرب ہیں)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شام اور عراق کے درمیانی علاقے سے برآمد ہوگا پس خراب و برباد کرے گا دائیں بائیں کو (یعنی دونوں جانب فساد پھیلائے گا) اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہو! ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! زمین میں اس کا رہنا کتنا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چالیس دن، ایک یوم سال جتنا ہوگا دوسرا مہینے کے برابر ہوگا اور ایک (تیسرا) دن ایک ہفتے کے مساوی ہوگا جبکہ باقی تمام دن تمہارے دنوں (یعنی معمول کے ایام) کے بقدر ہوں گے، حضرت نواسؓ فرماتے ہیں ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ بتائیں کہ جو دن سال کے برابر ہے تو اس میں ہمارے لئے ایک ہی دن کی نمازیں کافی ہو جائیں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ اس کا اندازہ (حساب) لگا لینا، ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! زمین میں اس کی تیز رفتاری کتنی ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسے بادل (یا بارش) ہوتا ہے جس کی پشت پر (تیز) ہوا ہو۔

چنانچہ وہ ایک قوم کے پاس آئے گا اور ان کو اپنی (الوہیت کی) دعوت دے گا تو وہ لوگ اس کو جھٹلائیں گے اور اس کے دعوے کو مسترد کریں گے چنانچہ وہ ان کو چھوڑ کر واپس لوٹے گا پس ان کے اموال اس کے پیچھے چلے جائیں گے جب وہ سو کر صبح اٹھیں گے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا ہوگا پھر وہ ان لوگوں کے پاس آئے گا اور انہیں دعوت دے گا تو وہ لوگ (یا دوسرے لوگ) اس کی بات مان لیں گے اور اس کی تصدیق کر لیں گے (یعنی اقرار)، دجال بادلوں کو حکم دے گا کہ بارش برسا! تو بادل بارش برسائیں گے اور زمین کو حکم دے گا کہ گھاس اُگا تو وہ چارہ وغیرہ اُگائے گی چنانچہ ان کے جانور شام کو چراگاہ سے واپس آئیں گے تو ان کے کوہان لمبے (بڑے) ہوں گے اور کوکھ بہت پھولی ہوئی ہوں گی اور تھنوں میں دودھ بہت ہوگا، پھر وہ ایک ویران زمین کے پاس آئے گا اور اس سے کہے گا کہ اپنے خزانے باہر نکال دو، پس جب وہ وہاں سے واپس لوٹے گا تو وہ خزانے اس کے پیچھے ایسے دوڑیں گے جیسے شہد کی مکھیوں کے بہت سے سردار ہوں (جن کے پیچھے شہد کی مکھیوں کے غول کے غول ہوتے ہیں)

پھر دجال ایک جوان آدمی کو تلاش کرے گا (جو اس کا مخالف ہوگا) جو بھرا ہوا ہوگا جوانی سے اس پر تلوار

سے وار کر کے اس کے دو ٹکڑے کرے گا، پھر اسے بلائے گا (یعنی زندہ ہو کر اٹھنے کو کہے گا) تو وہ چمکتے ہوئے چہرے اور (دجال پر طنزاً) مسکراتا ہوا سامنے آئے گا ابھی وہ (جوان) اسی حالت پر ہو گا (یعنی دجال کے دوبارہ نشانہ بننے سے قبل ہی) اچانک عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) دمشق کے مشرقی جانب سفید مینار کے (اوپر) پاس دو زرد کپڑوں میں اتر جائیں گے دراں حالیکہ وہ اپنا ہاتھ فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے ہوں گے، پھر سر جھکائیں گے تو قطرے ٹپکیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو موتیوں کی طرح چاندی کے دانے جھڑیں گے (یعنی پانی کے صاف قطرے گریں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی سانس کی مہک جو بھی (کافر) پائے گا تو وہ مرے گا اور ان کی سانس کی خوشبو تا حد نگاہ پہنچے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت عیسیٰ دجال کو ڈھونڈیں گے تو (مقامِ) لُدّ کے دروازے کے پاس اسے پائیں گے اور پاتے ہی قتل کر دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح رہیں گے جتنا اللہ کو منظور ہو گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر اللہ ان کو وحی فرمائیں گے کہ میرے بندوں کو، کوہ طور پر لے جاؤ کہ میں نے اپنے ایسے بندے بھیجے ہیں جن سے لڑنے کی تاب کسی میں نہیں۔

چنانچہ اللہ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ایسے ہی ہوں گے جیسے اللہ نے فرمایا ہے "وہ ہر بلندی سے پھیل پڑیں گے" (یعنی پھسلتے دوڑتے آئیں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کے اگلے بُحیرۂ طبریہ پر سے گذریں گے تو اس کا سارا پانی پی جائیں گے، پھر ان کے بعد والے اس پر سے گذریں گے تو (اسے خشک پا کر) کہیں گے کہ کبھی یہاں پانی تھا (کہ اس کا اثر کیچڑ باقی ہے) پھر چل پڑیں گے اور چلتے چلتے بیت المقدس کے پہاڑ کے پاس پہنچ جائیں گے تو کہیں گے کہ ہم نے سب زمین والوں کو قتل کر دیا، آؤ اب آسمان والوں کو قتل کر ڈالیں، چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود لوٹائیں گے اور (ادھر) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کو کوہ طور پر روک لیا جائے گا (فاقہ کا یہ عالم ہو گا) حتی کہ اس وقت ان کے لئے بیل کا سر اس سے بھی بہتر ہو گا جتنے آپ کے لئے آج سو دینار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دیکھ کر عیسیٰ بن مریم اور ان کے ساتھی اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے تو اللہ ان (یاجوج، ماجوج) پر ایک قسم کے کیڑے مسلط کر دیں گے جو ان کی گردنوں میں ہوں گے پس (نتیجۃً) سارے یاجوج، ماجوج زخمی ہو کر یکبارگی مر جائیں گے جیسے ایک آدمی کی موت ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ اور ان کے ساتھی اتریں گے جبکہ ایک بالشت کے بقدر خالی جگہ نہیں پائیں گے مگر اس کو یاجوج، ماجوج کی چکنائی اور بدبو اور خون

نے بھر دیا ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کی طرف خوب متوجہ ہوں گے اور ان کے ساتھی بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس اللہ ان پر ایسے پرندے بھیجیں گے جن کی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح لمبی ہوں گی، تو وہ ان کو اٹھا کر پہاڑوں کے دروں میں پھینک دیں گے، اور ان کی کمانوں اور تیروں اور ترکشوں سے مسلمان سات سالوں تک آگ جلاتے رہیں گے، اور اللہ ان پر بارش برسائیں گے جس سے کوئی خیمہ یا گھر نہیں بچے گا پس وہ زمین کو دھو کر شیشہ کی طرح صاف ستھرا کر دے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے بعد زمین سے ارشاد ہوگا کہ اپنے میوے اور پھل نکال! اور اپنی برکت دوبارہ لوٹا! پس اس وقت ایک جماعت ایک انار کھائے گی اور اس کے چھلکے کی چھاؤں میں آرام کرے گی، اسی طرح دودھ میں برکت دی جائے گی یہاں تک کہ تازہ جنم دینے والی ایک اونٹنی کا دودھ کئی جماعتوں کے لئے کافی ہوگا اور ایک قبیلہ ایک گائے (کے دودھ) پر گذر بسر کرے گا اور ایک چھوٹا قبیلہ تازہ جنم دینے والی بکری (کے دودھ) پر بسر کرے گا،

دریں اثنا کہ لوگ اسی حالت پر ہوں گے کہ ناگہاں اللہ ایک ہوا بھیجیں گے جو ہر مسلمان کی روح قبض کرلے گی اور باقی (بُرے) لوگ بچ جائیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ بے حجاب عورتوں سے جماع کریں گے جیسے گدھے کیا کرتے ہیں۔ پس انہی لوگوں پر قیامت آئے گی۔

تشریح:۔قوله: "فخفّض فيه ورَفّعَ" دونوں میں فائین مشدد ہیں یعنی دجال کو اعور کانا وغیرہ کہہ کر اسے معمولی نوعیت کا شخص قرار دیا اور اس کے خوارق کا ذکر فرما کر اس کا ظاہری رعب و دبدبہ ظاہر فرمایا۔ **قوله:** "حتى ظنناه في طائفة النخل" کنایہ ہے شدت خوف سے کیونکہ جس چیز سے ڈر لگتا ہے وہ قریب ہی محسوس ہوتی ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ کھجور کے جھنڈ و جھرمٹ کے اندر محسوس ہو رہا تھا کیونکہ یہ تو یقین تھا کہ اس کا ظہور بعد میں ہوگا۔ **قوله:** "غير الدجال اخوف لي عليكم" امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ مراد ائمہ مضلین ہیں یعنی گمراہ اور گمراہ کرنے والے حکمرانوں کا فتنہ دجال کے فتنہ سے زیادہ خطرناک ہے مگر عارضہ میں ہے کہ قریب خواہ چھوٹا ہو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ تدبر

قوله: "فانا حجيجه" فعیل بمعنی فاعل ہے حجت سے مشتق ہے یعنی میں حجت قائم کرنے میں اس پر غالب رہوں گا۔ **قوله:** "فامرءٌ حجيج نفسه" مضاف مقدر ہے ای فكل امرٍ الهذا مبتدا معرفہ ہی ہے پورا جملہ اس طرح بنتا ہے "فكل امرأ يحاجه ويحاوره ويغالبه لنفسه كذاقال الطيبى".

قوله: "قطط" بروزن سبب بہت مُڑے ہوئے بال جو بہت معیوب اور بُرے لگتے ہیں اور جو جعودت حسن کی

علامت ہے وہ معمولی بچہ ار بال ہوتے ہیں۔قولہ:"عینه قائمة"مسلم کی روایت میں طافئۃ ہے یعنی مرتفعۃ مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھ خراب اور بے نور ہوگی، اپنی جگہ اٹھی ہوئی باہر کی طرف ابھری ہوئی قائم ہوگی۔قولہ: "فعاث" بمعنی افسد یعنی دائیں بائیں سخت فساد پھیلائے گا۔قولہ:"البثوا"لبث باب سمع سے ہے بمعنی مکث بمعنی ٹھہراؤاور ثبات کے ہے، مسلم کی روایت میں "فالبثوا" ہے۔قولہ:"یوم کسنة الخ"جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ وہ زمانہ خوارق کا ہوگا لہٰذا اس میں کسی طرح کا استبعاد نہیں ہے خواہ وہاں کوئی ظاہری اسباب پیدا کردیئے جائیں یا باطنی وغیبی۔

قولہ:"ولکن اقدروا له" اس سے فقہاء نے استنباط کرکے ناروے وغیرہ ان ممالک کے باشندوں کے لئے جو ۶۶ درجے سے زیادہ دوری پر واقع ہیں نمازوں کے اوقات کو اندازے کے مطابق پڑھنے کا حکم دیا ہے اس میں شمالی ناروے، فن لینڈ اور سویڈن وغیرہ شمالی روس اور شمالی امریکہ کے قطب سے قریب ترین خطے داخل ہیں جبکہ جنوبی قطب کے پاس اب تک انسانی آبادی نہیں ہے۔مندرجہ بالا منطقوں میں یہ مسئلہ جون کے مہینے میں پیدا ہوتا ہے۔قولہ:"ثم یأتی القوم" ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں گے جن کے پاس وہ پہلے آیا تھا کیونکہ معرفہ جب معاد ہوجائے تو ثانی عین اولیٰ ہوتا ہے۔قولہ:"سارحتهم"ان کے جانور۔قولہ: "ذُرَی" کسی بھی چیز کی بلند ترین حصے کو کہتے ہیں مگر عموماً کوہان کی چوٹی اور اوپر والے حصے پر اطلاق ہوتا ہے مفرد ذروۃ بکسر الذال وضمتها آتا ہے یہ اور مابعد کا جملہ "وامَدّه خواصر"، زیادہ کھانے اور فربہ وموٹے ہونے سے کنایہ ہے یعنی زمین میں گھاس اور چراگاہوں کی اتنی کثرت ہوجائے گی کہ جانوروں کے کوہان بڑے بڑے اور کوکھ پھولی ہوئی اور تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں گے۔قولہ:"کیعاسیب النحل' یعسوب کی جمع ہے شہد کی مکھیوں کے سردار کو کہتے ہیں یہ کنایہ ہے کثرتِ اَتباع اور سرعت اِتباع سے یعنی جیسے یعسوب کے پیچھے بے شمار شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں اور انتہائی سرعت سے اس کی پیروی کرتی ہیں جبکہ یعاسیب میں یہ تعداد اور رفتار اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے اسی طرح دجال کے پیچھے خزانوں کا ہجوم ہوگا۔

قولہ:"ثم یدعو رجلاشابا الخ" باور کیا جاتا ہے کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے مگر ابن العربیؒ نے اس تاثر کو رد کیا ہے۔واللہ اعلم قولہ:"ممتلیاً" جوانی سے بھرا ہونا کنایہ ہے بھرپور جوانی سے۔ قولہ:"جزلتین" ای قطعتین" اس میں جیم کا کسرہ فتحہ سے افضل ہے، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں ٹکڑوں کو دور دور پھینک دے گا جن کے درمیان میں تیر پھینکنے جتنا فاصلہ ہوگا اور مقصد لوگوں کو باور کرانا ہوگا جیسے

جادوگراور شعبدہ باز لوگ کرتے ہیں۔ قولہ "ثم یدعوہ فیقبل یتھلّل وجھہ" یعنی اسے کہے گا کہ زندہ ہو کر اٹھو اور میرے پاس آجاؤ پس وہ اُٹھ کر آئے گا جس کا چہرہ چمکتا دمکتا ہوگا۔ قولہ: "یضحک" ای ضاحکا بالدجال یعنی وہ دجال پر ہنسے گا اور کہے گا کہ یہ کیسے خدا ہو سکتا ہے... بخاری شریف جلد اص ۲۵۳ پر ہے کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کے باہر قریب میں ہوگا جب یہ شخص زندہ ہو جائے گا تو کہنے لگے گا "واللہ ما کنت قط اشد بصیرۃ منی الیوم فیقول الدجال اقتله فلایسلّط علیه" یعنی مجھے آج اس بات کا زیادہ یقین ہوگیا کہ تم دجال ہو مگر دجال اسے دوبارہ مارنے سے قاصر رہے گا، گویا اس کی قوت وشوکت اور ظاہری رعب ودبدبے کا خاتمہ یہی ہو جائے گا جبکہ مکمل صفایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں بیت المقدس کے قریب ہوگا۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ زمانہ خوارق کا ہوگا اس لئے یہ امور بطور استدراج دجال سے سرزد ہوں گے جن میں لوگوں کے لئے زبردست آزمائش وامتحان ہے دجال کے اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں جو مختلف روایات میں پائی جاتی ہیں مثلاً وہ جس گدھے پر سوار ہوگا اس کے دونوں کانوں کے درمیان فاصلہ چالیس گز کا ہوگا جس سے فتنے کا ہول اور بھی بڑھ جائے گا، رہا یہ امر کہ حمار سے کیا مراد ہے؟ تو اس قسم کی روایات میں تاویل کی بھی گنجائش ہے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز مراد ہو اور اپنے معنی حقیقی پر بھی محمول کرنا ممکن ہیں جیسا کہ آج کل کلوننگ کا نظریہ فروغ پا رہا ہے ممکن ہے اس سے بڑے بڑے جانور معرض وجود میں آجائے۔

خوارق کی چھ قسمیں:۔ خیالی وغیرہ میں امر خارق للعادۃ کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ جس کے ہاتھوں امر خارق دکھایا جاتا ہے وہ یا تو دین سماوی کا تابع ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے پھر قسم اول میں وہ شخص یا تو نبوت کا مدعی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے اگر مدعی نبوت ہو تو امر خارق قبل الدعوی ارہاص کہلاتا ہے اور بعد الدعوی معجزہ، جبکہ غیر مدعی نبوت اگر ولی ہو تو اس سے سرزد ہونے والا امر خارق کرامت ہے اور عام آدمی کے بارے میں معونت ہے۔ قسم دوم میں اگر امر خارق اس کے دعوی کے مطابق ہو تو استدراج کہلاتا ہے جبکہ ناموافق کو اہانت کہتے ہیں۔

قولہ: "مھرودتین" دال اور ذال دونوں جائز ہیں البتہ دال کے ساتھ اکثر اور زیادہ مشہور ہے وہ کپڑے جس کو ورس اور زعفران سے رنگا گیا ہو یعنی زرد۔ قولہ: "طأطأ" بھمزتین بمعنی خَفَضَ یعنی جب سر جھکائیں گے۔ قولہ: "تحدَّرَ" ماضی معلوم کا صیغہ ہے بمعنی نزل یعنی اتریں گے اور ٹپکیں گے۔ قولہ: "جمان" بضم الجیم وتخفیف المیم موتیوں کی طرح چاندی کے دانوں کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے سر مبارک کے بالوں سے انتہائی صاف پانی چاندی اور موتیوں کی مانند کے قطرے گریں گے۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ حمام میں غسل کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے اس لئے بالوں سے پانی ٹپکے گا جو لوگ سائنس کے نظریۂ اضافت کو جانتے ہیں ان کے لئے یہ حقیقت سمجھنا نہایت آسان ہے۔ قولہ: "ولا یجد ریح نفسه الخ" جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے سانس اور آواز میں مردوں کو زندہ کرنے کی قوت ودیعت فرمادی تھی اس کے برعکس اب زندوں کو مارنے کی طاقت ودیعت فرمائیں گے کہ پہلے زمانہ میں طِب کا عروج تھا تو اس وقت یہی معجزہ مناسب تھا جب کہ دوبارہ آمد پر ایٹمی طاقت اور مہلک ہتھیار کا مقابلہ ہوگا تو دوسرا مناسب ہوگا۔

قولہ: "حتی یدرکه بباب لُدّ" بضم اللام وتشدید الدال، لُدّ تل ابیب سے جنوب مشرق میں اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا شہر ہے یہاں اسرائیل نے دنیا کا جدید ترین سیکورٹی سے لیس ایئر پورٹ بنایا ہے، ممکن ہے کہ دجال یہاں سے فرار کی کوشش کرنا چاہتا ہو جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ناکام بنائیں گے۔

قولہ: "عِباداً لّی" اتنی سی بات تو طے شدہ ہے کہ یاجوج، ماجوج وحشی، جاہل اور جفاکش اور ظالم قسم کے لوگ ہیں مگر اس کے ساتھ وہ سارے کافر بھی ہوں گے؟ تو حضرت تھانوی صاحبؒ المسک الذکی میں فرماتے ہیں کہ ان پر ایمان یا کفر کا حکم نہیں لگانا چاہئے اگرچہ وہ کسی ایک حالت سے خالی نہیں ہوں گے اور جہاں تک آسمان کی طرف تیر پھینکنے کا تعلق ہے تو یہ زیادہ سے زیادہ جہالت کا نتیجہ ہوسکتا ہے اور اللہ عزوجل کا معاملہ ہر بندے کے ساتھ اس کی حالت کے مطابق ہوتا ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ عمومات سے یاجوج، ماجوج کا بے راہ وگمراہ ہونے کا تأثر ملتا ہے ممکن ہے کہ ان میں اچھے بُرے دونوں قسم کے لوگ ہوں مگر غالب اکثریت شاید کفار کی ہو۔ واللہ اعلم

قولہ: "لایدان" ید کا تثنیہ برائے مبالغہ ہے یعنی کسی کی قدرت وطاقت نہیں کہ ان سے مقابلہ کرسکے۔

قولہ: "ببحیرة الطبریة" بحیرہ طبریہ ایک بہت بڑی جھیل ہے جو اسرائیل کے شمال مشرق میں اردن کی سرحد کے قریب واقع ہے شمالاً وجنوباً اس کی لمبائی تیئیس (۲۳) کلومیٹر اور چوڑائی شمال میں زیادہ سے زیادہ تیرہ (۱۳) کلومیٹر ہے جبکہ انتہائی گہرائی ۱۵۷ فٹ ہے کل رقبہ ۱۶۶ مربع کلومیٹر ہے۔ قولہ: "النغف" بروزن سبب ایک سفید قسم کے کیڑے ہیں جو جانوروں کی ناک میں پیدا ہوتے ہیں واحد نغفة آتا ہے۔ قولہ: "فرسی" فریس کی جمع ہے جیسے "قتلی" قتیل کی جمع ہے فریس وہ ہوتا ہے جسے کوئی حیوان مفترس یعنی پھاڑنے والا جانور زخمی کر کے پھاڑ چیر دے۔ قولہ: "زھمتھم" مسلم میں بغیر تاء کے آیا ہے چکناہٹ کو کہتے ہیں جبکہ "نتن" بسکون التاء

بد بو کو اور بکسر الثاء بد بودار چیز کو کہتے ہیں یعنی ان کی چربی کی چکناہٹ اور دیگر بد بودار اشیاء اور خون نے زمین کو بھر دیا ہوگا۔ قولہ: "المهبل" کھائی اور درے کو کہتے ہیں۔ قولہ: "قِسیهم" بکسر القاف والسین وتشدید الیاء قوس کی جمع ہے کمان کو کہتے ہیں۔ قولہ: "نُشابهم" بضم النون وتشدید الشین نُشابة کی جمع بمعنی تیر کے ہے۔ قولہ: "وجعابهم" بکسر الجیم جعبة کی جمع بمعنی ترکش کے ہے۔ قولہ: "کالزلفة" بفتح الزاء واللام یہ لفظ بجائے فاء کے قاف کے ساتھ بھی پڑھا جاسکتا ہے آئینہ اور شیشے کو کہتے ہیں۔ قولہ: "عِصابة" بکسر العین دس تا چالیس آدمیوں پر مشتمل جماعت کو کہتے ہیں۔ قولہ: "بِقحفها" بکسر القاف چھلکا۔ قولہ "الرسل" بکسر الراء دودھ۔ قولہ: "فئام" بکسر الفاء جماعتوں یا بڑی جماعت کو کہتے ہیں اس کا واحد نہیں آتا ہے۔ قولہ: "لقحة" وہ اونٹنی وغیرہ جس کو بچہ جنم دینے میں زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو یعنی تازہ۔ قولہ: "فخذ" بطن سے چھوٹا قبیلہ جو اقربہ پر مشتمل ہو۔

قولہ: "هرج" بسکون الراء کسی چیز کی کثرت کو کہتے ہیں یہاں مراد کثرت سے اور بے شرمی سے جماع ہے یعنی ان لوگوں میں زنا عام ہوگا اور اس میں کسی سے شرم وحیاء بھی نہیں کی جائے گی بلکہ گدھوں کی طرح جہاں موقعہ میسر ہو خواہ پردہ ہو یا نہ ہو اس میں لگ جائیں گے پس انہی پر قیامت آئے گی کہ وہ حد انسانیت سے گذر گئے ہوں گے وہ انسان نما جانور ہوں گے جبکہ یہ زمین انسانوں کے لئے ہے نہ کہ جانوروں کے لئے اس لئے وہ قیامت کے زلزلے سے نیست ونابود کردئے جائیں گے، علاوہ ازیں ان لوگوں میں بت پرستی بھی عام ہوجائے گی۔

ملحوظ: ۔ایک روایت میں ہے کہ دجال جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو نمک کی طرح پگل جائے گا لہٰذا یا تو عیسیٰ علیہ السلام اس کو اسی حالت میں قتل کریں گے یا قتل کی نسبت مجازی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سبب قتل بن جائیں گے۔

باب ماجاء فی صفة الدجال

دجال کی حالت کے بیان میں

"عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه سئل عن الدجال فقال: آلا ان ربکم لیس باعور آلا وانه اعور عینه الیمنیٰ کانها عِنَبَةٌ طافیة". (حسن صحیح غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دجال کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگاہ ہو کہ تمہارا رب کانا نہیں، آگاہ ہو کہ دجال کانا ہے اس کی داہنی آنکھ گویا انگور کا ابھرا ہوا دانہ ہے۔

تشریح:۔ اس باب میں دجال کی علامت بتلانا مقصود ہے کیونکہ صفت بمعنی حالت ونشانی کے آتی ہے یعنی دجال خدا کیسے بن سکتا ہے؟ جبکہ وہ خود کو عیوب سے نہیں بچا سکتا؟ تفصیل سابقہ باب میں گذری ہے۔

باب ماجاء ان الدجال لایدخل المدینة

دجال مدینہ میں داخل نہیں ہوگا

"عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :یأتی الدجال المدینة فیجد الملائکة یحرسونھافلایدخلھاالطاعون ولاالدجال انشاء اللّٰہ". (صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دجال مدینہ (میں داخل ہونے کی غرض سے) آئے گا تو فرشتوں کو اس کا پہرا دیتے ہوئے پائے گا، پس مدینہ میں نہ تو طاعون داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی دجال۔

تشریح:۔ طاعون ایک وبائی مرض ہے جو جلد میں پھوڑے کی طرح خطرناک ورم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے یہ بیماری وبائی بھی ہے اور مہلک بھی وبائی امراض کی تفصیل پہلے گذری ہے۔

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ دجال مکہ ومدینہ کے علاوہ تمام شہروں میں داخل ہوگا جبکہ حرمین کے نقاب یعنی داخل ہونے کے مقامات (دروازوں اور گیٹوں) پر صف بندی کئے ہوئے فرشتے ہوں گے جو اس کی حفاظت کریں گے پھر مدینہ منورہ میں تین بار زلزلہ آئے گا جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ ہر کافر ومنافق کو نکال باہر کر دیں گے۔ (ص:۲۵۳ جلد:۲ باب لایدخل الدجال المدینة)

جیسا کہ پہلے گذرا ہے کہ باطل قوت کے ظاہری غلبہ سے بھی مسلمانوں کی مرکزیت ختم نہیں ہوگی اس لئے دجال کی طاقت اور اسباب ظاہریہ کے لحاظ سے اس کی حکومت جتنی بھی وسیع اور مضبوط ہوگی مگر مخلص ایمان والوں پر اس کا کچھ بھی اثر نہ چلے گا۔ اور نہ ہی ان کے مرکز وبیضہ تک اس کی رسائی ممکن ہوگی۔

"عن ابی ھریرة ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال:الایمان یمان والکفرمن قِبَل

المشرق والسكينة لاهل الغنم والفخر والرِّياء في الفدادين اهل الخيل واهل الوبر، يأتي المسيحُ اذا جاء دُبُرَ اُحد صرفت الملائكةُ وجهَه قبل الشام وهناك يُهلك". (صحيح)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان تو یمنی ہے اور کفر مشرق کی طرف سے ظاہر ہوگا اور سکون (وقار) بکری والوں میں ہوتا ہے جبکہ فخر اور دکھاوا چیخنے چلانے والوں میں ہوتا ہے جو گھوڑوں والے اور پشم (اونٹ اور خیموں) والے ہوتے ہیں مسیح (دجال) آئے گا تو جب احد کے پیچھے پہنچے گا فرشتے اس کا رُخ شام کی جانب موڑ دیں گے اور وہیں جا کے مرے گا۔

تشریح:۔ "**الايمان يمان**" اصل میں یمنی منسوب بسوئے یمن تھا اخیر سے یا کو حذف کر کے اس کے عوض میں الف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، چونکہ یمن ساحلی علاقہ ہے جس کی وجہ سے اس کا موسم معتدل رہتا ہے اور ضابطے کے مطابق معتدل خطے کے لوگوں کا مزاج بھی معتدل ہوتا ہے اس لئے معتدل مذہب یعنی ایمان واسلام ان کے مزاج کے عین مطابق ہوتا ہے اور ہم مزاج چیز کو قبول کرنا آسان بھی ہوتا ہے، دائم بھی، اسی بناء پر اہل یمن والوں نے بغیر لڑائی کے ایمان کو قبول کیا گویا یہ ان کا طبعی تقاضا ہوتا ہے اس کی کچھ تفصیل "**باب ما جاء في اهل الشام**" من ابواب الفتن میں گذری ہے فلیراجع۔

اس ارشاد کا مقصد اہل حرمین کی ایمانی حالت کی کمزوری بتانا نہیں بلکہ اہل یمن کی فضیلت مراد ہے نہ کہ افضلیت اور بلاغت میں ایسا ہوتا ہے کہ قابل ذکر چیز کی فضیلت کو اُجاگر کرنے کے لئے کلام میں ادوات حصر شامل کئے جاتے ہیں یا انداز کلام بظاہر مفید للحصر لایا جاتا ہے حالانکہ وہاں حصر مقصود نہیں ہوتا ہے جیسا کہ مطول مختصر المعانی وغیرہ میں ہے۔

"**والكفر من قبل المشرق**" اگر مراد حقیقی مشرق ہو تو پھر مشرق والوں سے مراد قبیلۂ مضر ہے جو اہل یمن کے مقابلے میں ایمان سے پیچھے رہا تھا اور ان کا کفر شدید بھی تھا اور اگر عرفی مشرق مراد ہو جو عراق وایران وغیرہ ہیں تو اگر کفر سے مراد حقیقی کفر ہو تو مجوس کا مذہب مراد ہے ممکن ہے ہندومت اور بدھ مت وغیرہما بھی مراد ہو لیکن اگر کفر سے مراد اعمال کفریہ ہوں تو پھر وہ فتنے مراد ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے باہمی جنگ وارتداد کے موجب بنے، اور یہ سلسلہ جاری ہے تا آنکہ دجال کا خروج مشرق سے ہو جائے غرض مشرق ایسے فتنوں کی جولان گاہ بنا ہوا ہے جبکہ یمن ان فتنوں سے محفوظ رہا ہے، چنانچہ فتنۂ خوارج، معتزلہ، روافض، انکار حدیث اور قادیانیت وذکری سب مشرقی فتنے ہیں۔

قولہ:"والسکینة لاهل الغنم" یہ صحبت کا اثر ظاہر فرمایا چونکہ بکریاں نرم مزاج اور متواضع جانور ہیں اس لئے ان کے چرانے والے پر مثبت اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں جبکہ اونٹ وغیرہ سرکش اور طاقتور جانور ہیں جن میں "ہم چنیں دیگرے نیست" کا جذبہ پایا جاتا ہے تو ان کی صحبت میں رہنے والے پر وہی اثر ہوگا۔ قولہ:"فَدّادِین" فدّاد کی جمع ہے بتشدید الدال الاولی وہ لوگ جو کھیتوں میں اور جانوروں کے پیچھے چلّا چلّا کر بولتے ہیں اور چیختے ہیں۔قولہ:"وبر" اونٹ کے بالوں کو کہتے ہیں مراد خیمہ ہے یعنی خانہ بدوش اور دیہاتی لوگ فخر ومباہات میں پیش پیش ہوتے ہیں یہ بھی صحبت اور ماحول کا منحوس اثر ہوتا ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ ایک عام دیہاتی ،گدھا چرانے والا بھی اپنی حالت پر فخر کرتا ہے بلکہ گاؤں دیہات والے عموماً ہر کام میں افتخار کا دامن تھامے ہوئے ہوتے ہیں مسجد بنانے ، مہمان نوازی اور دیگران امور میں بھی مقابلے کرتے ہیں جن کا مقصد محض اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو۔

قولہ:"یاتی المسیح" دجال کو مسیح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ایک آنکھ ممسوح یعنی ہموار ہے یا کثرت مساحت کی بناء پر مسیح کہلاتا ہے ، یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی بولا جاتا ہے مگر اس کی وجوہات مختلف ہیں مثلاً اندھے کو مسح کرنے سے وہ ٹھیک ہوتا ، یا وہ کثرت سے سیاحت برائے عبرت یا برائے تبلیغ فرماتے وغیرہ وغیرہ۔

باب ماجاء فی قتل عیسیٰ بن مریم الدّجال

حضرت عیسیٰ بن مریم کا دجال کو قتل کرنے کے بارے میں

باب کی حدیث کی تشریح "باب ماجاء فی فتنة الدجال" میں عنقریب گذری ہے۔

باب (بلا ترجمه)

"وفیه عن قتادة عن انسؓ الخ" اس باب کی حدیث کی تشریح "باب ماجاء فی الدجال" میں گذری ہے۔

باب ماجاء فی ذکر ابن صیّاد

ابن صیاد کا ذکر

"عن ابی سعید قال صحبنی ابن صیاد اِمّا حُجّاجاً و اِمّا معتمرین فانطلق الناس و تُرِکتُ انا وھو فلَمّا خلصتُ به اقشعررتُ منه واستوحشتُ منه مما یقول الناس فیه فلما نزلتُ قلتُ له ضَع متاعکَ حیثُ تلک الشجرة قال: فابصرَ غنماً فاخذ القدح فانطلق فاستحلَبَ ثم اَتانی بلبن فقال لی: یااباسعید اِشرب اَفکَرِھتُ ان اشرب عن یده شیئاً لِمَا یقول الناس فیه، فقلت له ھذا الیوم یوم صائف وانی اکره فیه اللبن فقال: یااباسعید لقد ھَممتُ ان آخذ حبلاً فاوثقه الی الشجرة ثم اَختنِقَ لِمَا یقول الناس لی وفِیَّ، اَرأیتَ من خَفِیَ علیه حدیثی فلن یخفی علیکم! أنتم اعلم الناس بحدیث رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، یامعشر الانصار! اَلَم یقل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انه کافر؟ وانا مسلم، اَلَم یقل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انه عقیم لایولد له؟ وقد خَلّفتُ ولدی بالمدینة، اَلم یقل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لاتحل له مکة والمدینة؟ اَلستُ من اھل المدینة؟ وھوذا انطلِقُ معک الی مکة! قال: فواللّٰه مازال یجیءُ بھذا حتی قلتُ فلعلّه مکذوب علیه، ثم قال یااباسعید واللّٰه لَاُخبرنک خبراً حقاً واللّٰه انی لَاَعرفهُ واعرف والده واین ھو الساعة من الارض فقلتُ تباً لّکَ سائر الیوم. (حسن)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ ابن صیاد ہو گیا دراں حالیکہ ہم حج یا عمرہ کے لئے جا رہے تھے پس لوگ آگے نکلے جبکہ میں اور وہ (ابن صیاد) دونوں پیچھے رہ گئے پس جب میں اس کے ساتھ تنہا رہ گیا تو اس سے (ڈر کے مارے) میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے اس سے وحشت محسوس کی اس بات کی وجہ سے جو لوگ اس کے بارے میں کہتے تھے (یعنی کہ یہ دجال ہے) پس جب میں سواری سے اُترا تو میں نے اس سے کہا کہ تو اپنا سامان اس درخت کے نیچے رکھ! ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ اس نے ایک بکری دیکھی تو پیالہ لے کر وہ چلا اور دودھ دوہ کر پھر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا: اے ابوسعید! پیو، مگر میں نے اس کے ہاتھ سے کچھ پینا مناسب نہیں سمجھا اس وجہ سے کہ لوگ اس کے بارے میں چہ می گوئیاں

کرتے تھے پس میں نے اس سے کہا کہ آج کا دن گرم ہے اور میں اس میں دودھ پسند نہیں کرتا، پھر وہ کہنے لگا اے ابوسعید! میں چاہتا ہوں کہ ایک رسی لے لوں اور اسے درخت سے باندھ لوں پھر گلا گھونٹ کر مر جاؤں بوجہ اس بات کے جو لوگ مجھ سے اور میرے بارے میں کہتے ہیں، آپ بتائیں کہ اگر میری بات کسی اور پر پوشیدہ ہے تو تم پر تو مخفی نہیں ہو سکتی، کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے خوب باخبر ہو اے انصار کی جماعت! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا ہے کہ دجال کافر ہوگا؟ جبکہ میں مسلمان ہوں، کیا نہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ وہ (دجال) بے اولاد ہوگا اور میں نے مدینہ میں اولاد چھوڑی ہے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ حلال نہیں ہے دجال کے لئے مکہ ومدینہ، تو کیا مدینہ والوں میں سے نہیں ہوں اور شان یہ ہے کہ اب تیرے ساتھ مکہ جا رہا ہوں ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ بخُدا! وہ اس طرح کی باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ میرا گمان ہونے لگا کہ اس پر جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں، وہ پھر کہنے لگا اے ابوسعید! بخدا میں تم کو صحیح بات بتلاتا ہوں، خدا کی قسم میں اس (دجال) کو جانتا ہوں اور اس کے باپ کو بھی پہچانتا ہوں اور یہ کہ وہ اس وقت زمین میں کہاں ہے (ابوسعید فرماتے ہیں کہ) پس میں نے کہا تیری ہلاکت ہو ہمیشہ کے لئے (کہ تیرا معاملہ پھر مشتبہ ہو گیا)۔

تشریح:۔ ابن صیاد بتشدید الیاء کو ابن صائد بھی کہتے ہیں اصلی نام صاف تھا بعض نے عبداللہ بھی بتایا ہے۔ **قولہ:** "حُجّاجاً او معتمرین" صحبنی کے فاعل سے حال ہے۔ **قولہ:** "خلصت" ای انفردت به یعنی جب میں اس کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ **قولہ:** "اِقشعررت" ای قام شعری رونگٹے کھڑے ہو گئے میرے کیونکہ مجھے اس کے بارے میں اندیشہ تھا کہ یہ دجال ہے۔ **قولہ:** "استوحشت" میں نے اس سے وحشت محسوس کی اُنس کی ضد ہے، اسی بناء پر جب اس نے اپنا سامان دوپہر کے آرام کے وقت اسی درخت کے نیچے رکھا جہاں میں نے اپنا سامان رکھا ہوا تھا تو میں نے اس سے کہا کہ تم اپنا سامان اس دوسرے درخت کے نیچے رکھدو، تاکہ میں اس کے شر سے دور رہوں۔ **قولہ:** "صائف" ای حار، گرم۔ **قولہ:** "اکره فيه اللبن" یعنی عن یدک یا لبن معین یا مطلب یہ ہے کہ دودھ بھی طبعاً گرم ہے اس لئے آج گرمی کی سے وجہ میں نہیں پیتا۔ **قولہ:** "اختنق" گلا گھونٹ کر خودکشی کرلوں۔ **قولہ** "عقیم" بانجھ۔ **قولہ:** "مکذوب علیه" یعنی اس پر لوگوں نے جھوٹ بولا ہے۔ **قولہ:** "سائر الیوم" باقی دن یعنی ساری زندگی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ اس نے پہلے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر علم غیب کا مدعی بن گیا اور

مدعی علم غیب کافر ہوتا ہے اس لئے اس کا معاملہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ پر پھر مشتبہ ہوگیا۔

ابن صیاد کے بارے میں علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ وہی دجال اکبر تھا اور بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو بھی اس کے دجال ہونے کا جزم حاصل تھا چنانچہ حضرت عمر، حضرت جابر اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا موقف بھی یہی تھا حتی کہ ان حضرات نے اس پر قسم بھی کھائی ہے پھر ان میں دو رائے پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ ابن صیاد غائب ہو کر اصفہان چلا گیا ہے جہاں سے وقت موعود پر خروج وظہور کرے گا جبکہ دوسری رائے کے مطابق وہ مرگیا ہے مگر وقت مقررہ پر حکم خداوندی سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا گویا کہ اس کے دیگر معاملات کی طرح یہ عمل بھی یکے از خوارق العادت امر ہے، اور ایسا ہونا کوئی بعید از وقوع نہیں ہے مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ ابن صیاد اگرچہ دجال تو تھا کہ اس نے بہت سے معاملات کو خلط ملط کر دیا تھا لہٰذا اس میں دجل کے معنی پائے جاتے ہیں مگر وہ دجال اعظم نہ تھا بلکہ وہ مدینہ منورہ میں مرگیا تھا بعض کے نزدیک توبہ تائب ہو کر اور بعض کے نزدیک اس کے انجام کے بارے میں وثوق سے کہنا مشکل ہے، جہاں تک بعض صحابہ کی قسم کا تعلق ہے تو وہ ان کے ظن کے مطابق تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو قسم کھانے سے نہ روکنا بھی توقف کی وجہ سے تھا بعض لوگ طبعی کاہن ہوتے ہیں اگلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صیاد بھی ایک کاہن تھا اگرچہ کسبی نہ تھا مگر طبعی تو تھا ہی۔ واللہ اعلم

ابن حجرؒ و بعض دیگر شارحین کی رائے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دجال کی صرف علامات بتلائی گئی تھیں اور چونکہ ابن صیاد میں وہ اکثر علامات پائی جاتی تھیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء میں اس کے دجال ہونے یا نہ ہونے میں توقف فرماتے مگر جب تمیم داری کا قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان ہوا تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا توقف ختم ہوا اور اسی محصور فی الجزیرہ کے بارے میں رائے مجتمع ہوگئی کہ وہی دجال اعظم ہے۔

نوٹ:۔ جو لوگ ابن صیاد کے دجال ہونے کا باور کرتے ہیں وہ ابن صیاد کے مدینہ میں ہونے اور صاحب اولاد ہونے وغیرہ کے کچھ جوابات دیتے ہیں کہ مثلاً یہ علامات اس کے خروج کے بعد ہوں گی نہ کہ ابتداءً مگر ان کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی گئی کیونکہ یہ رائے کمزور ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

"عن ابن عمران رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم مَرّبابن صیادفی نَفَرِمن اصحابه منهم عمربن الخطاب هویلعب مع الغلمان عنداُطُم بنی مغالة وهوغلام فلم یشعُرحتی

ضرب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ظهره بیده ثم قال: اَتَشهدُ انی رسول اللّٰہ؟ فَنَظَرَ الیه ابن صیاد قال: اشهدُ انک رسول الاُمِّیِّین قال ثم قال ابن صیاد للنبی صلی اللّٰہ علیه وسلم :أتشهدُانی رسول اللّٰہ؟ فقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم امنتُ باللّٰہ وَرُسُلِه ،ثم قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: ما یأتیکَ؟ قال ابن صیاد: یأتینی صادق و کاذب فقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم :خُلِّطَ علیک الامر اثم قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم انی قدخَبَأتُ لَکَ خبیئا، وخَبَأله "یوم تأتی السَمَاءُ بدخان مبین" فقال ابن صیاد: وهو الدخ، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اِخسَأفلن تعدُوقدرَک اقال عمر یارسول اللّٰہ! إئذن لی فَاَضرب عنقه فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: اِن یکُ حقاًفلن تُسَلَّطَ علیه واِن لایَک فلاخیرلک فی قتله قال عبدالرزاق یعنی الدجال".

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کی ایک جماعت کے ہمراہ جن میں عمرؓ بھی تھے ابن صیاد کے پاس سے گذرے جبکہ وہ بچوں کے ساتھ بنی مغالہ کے قلعے کے پاس کھیل رہا تھا وہ ابھی بچہ ہی تھا پس اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا پتہ نہ چل سکا تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کی پُشت پر مارا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو ابن صیاد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ کر کہا: ہاں میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اُمّیّین کے رسول ہیں ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ پھر ابن صیاد نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کے رسولوں پر پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے پاس کیا چیز آتی ہے؟ ابن صیاد نے کہا میرے پاس سچا اور جھوٹا (یا سچ اور جھوٹ) دونوں آتے ہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے اوپر معاملہ گڈمڈ (خلط ملط) ہو گیا ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تجھ سے ایک بات چھپاتا ہوں (تم بتاؤ وہ کیا ہے؟) اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "یوم تأتی السماء بدخان مبین" (آیت کو صحابہ کے سامنے آہستہ تلاوت کر کے یا) دل میں متعین ومنتخب فرمالی، تو ابن صیاد کہنے لگا وہ "الدخ" ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پرے ہو تیری قدر ہرگز نہیں بڑھے گی، حضرت عمرؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجئے تا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نہیں) اگر یہ واقعی (وہ دجال) ہے تو پھر آپ اس پر مسلط نہیں

ہو سکتے (کیونکہ اس کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں) اور اگر یہ وہ نہیں تو پھر آپ کو اس کے قتل سے کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ راوی عبدالرزاق فرماتے ہے کہ ان یکن حقا کی ضمیر سے مراد دجال ہے۔

تشریح:۔ "اُطُم" بروزن کُتُب پتھروں کی بلند عمارت کو کہتے ہیں جو قلعہ نما ہوتی ہے جمع آطام آتی ہے۔ قولہ: "امنت باللہ ورسلہ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لطیف انداز اس لئے اختیار فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے دجال ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تأمل تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے آپ علیہ السلام کے سامنے قسم کھا کر فرمایا کہ یہی دجال ہے تو آپ نے اس کی نفی نہیں فرمائی پس یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کی بات کی تردید غیر محسوس انداز سے فرمائی کہ بالفرض اگر یہی دجال ہے تو کہیں بڑا فتنہ قبل از وقت برپا نہ ہو جائے۔

(کذا فی المسک الذکی للتھانوی رحمہ اللہ)

قولہ: "یأتینی صادق و کاذب" یا تو فرشتہ اور شیطان مراد ہے یا پھر موصوف مقدر ہے ای خبرٌ صادق وخبر کاذب یعنی مجھے بعض سچی باتیں القاء ہوتی ہیں اور بعض جھوٹی اور یہ کاہنوں کا شیوہ ہے جن کی باتوں میں نناوے فیصد باتیں جھوٹی ہوتی ہیں۔ لہذا صادق کی تنوین برائے تقلیل اور کاذب کی برائے تعظیم وتکثیر لیں گے۔ یعنی معمولی سچ اور زیادہ تر جھوٹ۔ قولہ: "وھو الدخ" بعض حضرات کہتے ہیں کہ درخ ایک لغت میں دخان کو کہتے ہیں عارضہ میں ہے کہ وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا پھر یہ اطلاع علم غیب کی دلیل نہیں بلکہ کہانت کی علامت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کاہنوں کو ایسے امور پر اطلاع دینے میں آزمائش کی حکمت مستتر ہوتی ہے تاکہ اہل زیغ گمراہ ہوں اور اہل یمان جان لیں کہ یہ کاہن ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِخسا" یہ الفاظ کُتے کو دھتکارنے کے لئے بولے جاتے ہیں، یعنی جب تمہیں اس قسم کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں تو پھر تم کاہن ہی ہو پھر ابن صیاد کو اس اطلاع کی صورت کیا تھی؟ تو اس بارے میں مشہور یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے چھپکے سے مشورہ کیا تھا جس کو ابن صیاد نے یا اس کے شیطان نے سُن لیا تھا، مگر حضرت تھانویؒ نے اس پر زور دیا ہے کہ شیطان کا انبیاء علیہم السلام کے قلوب تک رسائی کوئی مستبعد نہیں ہاں اس سے گناہ نہیں کروا سکتا ہے اس پر بطور استدلال حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ "انی مَسَّنِیَ الشیطٰن بنصب وعذاب" اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ "وماانسنیه الا الشیطٰن" نقل فرمایا ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ پہلا قول اسلم واحوط ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ تکلیف براہ راست

شیطان سے نہیں بلکہ ان کی بیوی کو ورغلانے سے پہنچی تھی جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ نسبت شیطان کی طرف کرنا بطورتأدب بھی ممکن ہے۔ واللہ اعلم

سوال:۔ جب ابن صیاد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو پھر آپ علیہ السلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی اجازت کس حکمت کے تحت مرحمت نہیں فرمائی ؟؟؟

جواب:۔ (۱) اس لئے کہ ابن صیاد یہودی بچہ تھا اور ان دنوں میں آپ علیہ السلام کی یہود کے ساتھ صلح چل رہی تھی۔

جواب:۔ (۲) ابن صیاد نابالغ تھا جیسا کہ روایت میں "وھو غلام" سے معلوم ہوتا ہے اور نابالغ بچوں کی بات کو اتنی سنجیدگی سے لینا لازمی تصور نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ مکلف نہیں ہوتے ہیں جبکہ قتل کی سزا اس عظیم جرم پر جاری ہوتی ہے جو اپنے محل میں ہو یعنی عاقل، بالغ سے صادر ہو۔

باب کی اگلی روایت کا مضمون بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اوپر کی روایت کا ہے بعض الفاظ کا اختلاف معنوی اختلاف کو مستلزم نہیں ہوتا ہے۔

قولہ: "ولہ ذوابة" چٹیا یعنی سر کے بالوں کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** "اری عرشا فوق الماء" ابن صیاد نے کہا میں پانی (سمندر) پر تخت دیکھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ابلیس کا تخت دیکھتا ہے جو سمندر پر ہے، عارضة الاحوذی میں ہے کہ جب ابلیس نے سنا کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ رب العزت کا عرش پانی پر (بلا احتیاج) تھا تو ابلیس نے بھی ایک تخت بنا کر سمندر پر رکھ دیا تا کہ وہ اللہ کی ہمسری کا تأثر دے۔ **والعیاذ باللہ، لعنة اللہ علی ابلیس واعوانه.**

رہا یہ مسئلہ کہ ابن صیاد ابلیس کو کیسے دیکھ سکتا تھا جبکہ باقی لوگوں کو تو نظر نہیں آتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی مستبعد نہیں اللہ تبارک وتعالیٰ آنکھوں میں جس طرح قوت وصلاحیت ودیعت فرمانا چاہے اس کے لئے آسان ہے۔ آج کل کے دور میں جدید آلات سے یہ اشکال آسان ہوگیا ہے کہ جس آدمی نے اندھیرے میں دیکھنے والی عینک لگائی ہو وہ تاریکی میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ **قولہ:** "قال اری صادقا وکاذبین الخ" یعنی میرے پاس ملی جلی مخلوط خبریں آتی ہیں بعض سچی اور باقی جھوٹی ہیں۔ **قولہ:** "لُبِّسَ علیہ" بصیغۂ مجہول لبس یا تلبیس سے ہے باب ضرب سے بمعنی مشتبہ اور گڈمڈ، خلط ملط ہونے اور کرنے کے ہیں یعنی اس پر اشتباہ ہوگیا ہے۔ **قولہ:** "فدعاہ" امر کا صیغہ برائے تثنیہ ہے مخاطب شیخین رضی اللہ عنہما ہیں یعنی آپ دونوں اس کو چھوڑ

دیں۔ مسلم میں جمع کا صیغہ "دَعُوه" آیا ہے یعنی اگر تثنیہ ہو تو معنی اُتر کاہ ہے جبکہ جمع بمعنی اُتر کوہ ہے۔

"عن عبدالرحمن بن ابی بکرة عن ابیه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :یمکثُ ابوالدجال واُمُه ثلاثین عاماً لایولدلهماولدثم یولدلهماغلام اعوراَضرُّشئی واقله منفعةً تنام عیناه ولاینام قلبُه ثم نعت لنارسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ابویه فقال :ابوه طُوال ضرب اللحم کَاَنّ انفه مِنقار وامه امرأة فرضاخِیّة طویلة الثدیین قال ابوبکرة فسمعتُ بمولود فی الیهود بالمدینة فذهبتُ اناوالزبیربن العوام حتی دخلناعلی ابویه فاذانعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیهما،قلنا:هل لکماولد؟فقالامکثناثلاثین عاماً لایولدلناولدثم ولدلناغلام اعوراَضرُّشئی وَاَقَلُّه منفعة تنام عیناه ولاینام قلبه قال فخرجنامن عندهمافاذاهومنجدل فی الشمس فی قطیفة وله هَمهَمَةٌ فَکَشَفَ عن رأسه فقال ماقلتما؟قلناوهل سمعتَ ماقلنا؟قال نعم تنام عینایَ ولاینام قلبی". (حسن غریب)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دجال کے ماں باپ تیس سال تک بے اولاد رہیں گے ان کی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوگی پھر ان کا ایک بیٹا پیدا ہوگا جو کانا ہوگا جس کا ضرر بہت ہوگا اور نفع بہت معمولی، اس کی آنکھیں تو سوئیں گی مگر دل اس کا نہیں سوئے گا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس کے ماں باپ کا احوال بیان فرمایا کہ اس کا باپ لمبا تڑنگا اور کم گوشت (پتلا) ہوگا اس کی ناک گویا چونچ کی سی ہوگی جبکہ اس کی ماں بے تکی موٹی اور لمبی چھاتیوں والی ہوگی، ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ کے یہودی گھرانے کے ایک بچے کے بارے میں سُنا پس میں اور زبیر بن عوام دونوں گئے یہاں تک کہ اس کے ماں باپ کے پاس پہنچے، کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو حالت بیان فرمائی تھی وہ ان میں ہو بہو پائی جاتی تھی، ہم نے ان سے پوچھا کیا تمہاری کوئی اولاد ہے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ تیس سال تو ہم اسی طرح (بے اولاد) رہے ہماری کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی پھر ہمارا ایک کانا بچہ پیدا ہوا جو بہت نقصان دہ اور معمولی منفعت والا ہے اس کی آنکھیں تو سو جاتی ہیں مگر دل اس کا نہیں سوتا، فرماتے ہیں کہ ہم وہاں سے نکلے تو دیکھا کہ وہ دھوپ میں زمین پر چادر میں لپٹا ہوا لیٹا تھا، اور اس کی بھنبھناہٹ سُنائی دے رہی تھی، پس اس نے سر سے کپڑا اٹھایا اور کہا تم دونوں نے کیا کہا؟ ہم نے جواب دیا کیا تم نے سُن لیا اس نے کہا ہاں، میری آنکھیں تو سو جاتی ہیں لیکن دِل نہیں سوتا۔

تشریح:۔قولہ:"اضر شئی و اقله منفعة"ای اقل شئی منفعة یعنی اولاد کے جو منافع ہوتے ہیں وہ اس سے عاری تھا اگر چہ نفس اولاد محبت وسکون کا سامان تو ہے مگر وہ تسکین قلب کا اتنا سامان نہ تھا جتنا کہ تشویش اور پریشانی کا سبب تھا مع ھذا وہ معیوب بھی تھا۔قولہ:"طوال" بروزن غراب اس میں طوالت کے معنی بنسبت طویل کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔قولہ:"ضرب اللحم" یعنی کم گوشت والا اور لاغر قسم کا۔ قولہ:"مِنقار" بکسر المیم چونچ۔قولہ:"فِرضاخية" بکسر الفاء وتشدید الیاء وہ عورت جس کی ضخامت و جسامت بھی زیادہ ہو اور چھاتیاں بھی بڑی بڑی ہوں مع ھذا اس میں طوالت ولمبائی بھی ہو۔قولہ: "منجدل" بکسر الدال جدالہ زمین کو کہتے ہیں یعنی زمین پر پڑا ہوا تھا۔قولہ:"قطيفة" مخمل نما چادر۔ قولہ: "همهمة" نگنانے اور ایسی آواز کو کہتے ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح سُنائی دے لیکن مفہوم نہ سمجھا جا سکے۔

ابن صیاد کے بارے میں سابقہ روایات سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اصلی دجال یعنی دجال کبیر نہ تھا ہاں نفس دجال ضرور تھا مگر علامات کا پایا جانا ذی العلامات کی دلیل نہیں ہوتی ہے، پھر حضرت ابوبکرہؓ چونکہ فتح مکہ کے بعد ہجرت فرما کر مدینہ میں آئے ہیں لہٰذا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ انہوں نے اس وقت اس بچے کی پیدائش کے بارے میں سُنا کیونکہ وہ تو مراہق تھا بلکہ جب انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ علامات سُن لیں تو ان کو جستجو ہوئی پھر آپ نے سنا کہ اس طرح کا ایک بچہ مدینہ میں موجود ہے، چنانچہ بچے کی بات چیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نومولود نہ تھا بلکہ عاقل قریب الاحتلام تھا۔

نیز شیطان وابلیس کا بھی ایک سلسلۂ نبوت ہوتا ہے جس میں وہ جھوٹے نبیوں کی کڑیاں ملاتا رہتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کے دل بیدار رہتے ہیں۔تدبر وتشکر

باب (بلاترجمہ)

"عن جابر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ماعلی الارض نفس منفوسة یعنی الیوم یأتی علیهامائة سنة ".(حسن)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی متنفس زمین پر ایسا نہیں یعنی آج جس پر سو سال گذر جائیں گے۔

تشریح:۔نفس سے مراد انسان ہے اور منفوسہ جو سانس لیتا ہو یعنی آج جو بھی روئے زمین پر زندہ ہے

خواہ بالکل نومولود بچہ ہی کیوں نہ ہو وہ اگلے سو سال کے اندر اندر انتقال کر جائے گا۔

مسلم میں ہے کہ یہ ارشاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا چنانچہ سب سے آخری صحابی ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ ۱۱۰ھ کو وفات پائے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ۱۱ھ ربیع الاول میں ہوا ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ سو سال کے بعد قیامت آئے گی بلکہ مراد یہ ہے کہ اس قرن کے لوگ ختم ہو جائیں گے پس جن حضرات نے اس سے مراد قیامت لی ہے تو اس سے مراد قیامت صغریٰ ہے یعنی "من مات فقد قامت قیامته" کے تحت اس قرن کی قیامت مراد ہے۔

اس حدیث سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ وہ زمین پر نہ تھے بلکہ آسمان میں تھے، اسی طرح ابلیس بھی پانی پر تھا نیز ابلیس انسان بھی نہیں جبکہ یہاں انسانی حیات کی بات ہو رہی ہے، ہاں البتہ حضرت خضر علیہ السلام کی حیات اختلافی ہے، امام بخاریؒ، ابوبکر بن العربیؒ وغیرہ بعض محدثین ان کی وفات کے قائل ہیں ان کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ جبکہ جمہور ان کی حیات کے قائل ہیں، جمہور کے نزدیک یہ عام مخصوص منہ البعض ہے یا پھر حضرت خضر اس رات کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد فرما رہے تھے پانی پر ہوں گے نہ کہ ارض یعنی خشکی پر۔

اس بارے میں طرفین و فریقین کے دلائل ظنی ہیں اور کوئی حتمی و یقینی بات کسی کے پاس نہیں ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

قولہ: "فوھل الناس" بمعنی فزع بھی آتا ہے اور بمعنی غلط بھی آتا ہے پہلے معنی کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس ارشاد کی وجہ سے گھبرا گئے کہ سو سال میں خروج دجال وغیرہ سارے فتنے آجائیں گے جبکہ دوسرے معنی کے مطابق مطلب یہ ہے کہ لوگ اس حدیث کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے بلکہ اس میں غلطی کر گئے کہ قیامت آجائے گی حالانکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ "ان ینخرم ذالک القرن" یہ قرن ختم ہو جائے گا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ انخرام بمعنی انقطاع وفنا کے ہے ای لایبقیٰ احد۔ قولہ: "فی مقالة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما یتحدثون بھذہ الاحادیث الخ" یعنی لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کو سمجھنے میں غلطی کی یا اس سے خوف زدہ ہو گئے اور اس بارے میں اس قسم کی باتیں کرنے لگے کہ مثلاً سو سال کے بعد قیامت آئے گی یا سارے فتنے دجال اور خروج یاجوج و ماجوج وغیرہ سب آجائیں گے۔

باب ماجاء فی النھی عن سَبِّ الرِّیاح

ہوا کو بُرا بھلا کہنے کی ممانعت کے بارے میں

"عن ابی بن کعب قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لاتَسُبُّوا الریح فاذا رأیتم ماتکرھون فقولوا: اللھم انا نسئلک من خیر ھذہ الریح وخیر مافیھا وخیر ما اُمِرَت بہ ونعوذ بک من شر ھذہ الریح وشر مافیھا وشر ما اُمِرَت بہ". (حسن صحیح)

ہوا کو بُرا مت کہو پس جب تم کوئی ناگوار صورت حال دیکھو تو یوں کہو اے اللہ! ہم تجھ سے اس ہوا کی بھلائی کا سوال کرتے ہیں اور جو خیر اس میں ہے اور جس خیر کے ساتھ یہ بھیجی گئی ہے، اور تیری پناہ مانگتے ہیں اس ہوا کی شر سے اور جو شر اس کے اندر ہے اور جس شر کا اسے حکم دیا گیا ہے۔

تشریح:۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ لوگوں کی نفسیات اور طبعیت یہ ہے کہ جب بار بار کسی چیز کو دوسری چیز سے منسلک دیکھتے ہیں تو ثانی کی نسبت اول کی طرف کرتے ہیں جیسے زمانے کی طرف خیر و شر کو منسوب کرنا اور دواء کی طرف شفاء کو منسوب کرنا، علی ہذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہوا تو بذات خود کچھ نہیں کر سکتی یہ تو اللہ کی طرف سے مامور و مجبور ہے اس لئے ہوا کو قصوروار نہ سمجھا جائے، دوسری جانب اللہ حکیم ذات ہے وہ خیر کے فیصلے فرماتے ہیں اور حکیم کبھی بھی قلیل شر و نقصان کی بناء پر عظیم نفع و خیر یعنی مفاد عامہ کو نہیں روکتا لہٰذا ہوا ہو یا بارش وغیرہ ان سے اگر کسی کو جزوی نقصان اٹھانا پڑے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ پورا عمل بُرا ہے اور اس کو گالیاں دینے لگے بلکہ فائدہ کا سوال اور نقصان سے بچنے کی دعا مانگنی چاہئے۔

بابٌ

دجال کے بارے میں

"عن فاطمۃ بنت قیس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم صَعِدَ علی المنبر فضحک فقال: ان تمیما الداری حدثنی بحدیث ففرحت فاحببتُ ان اُحدِّثکم: ان ناسا من اھل فلسطین رکبوا سفینۃ فی البحر فجالت بھم حتی قذفتھم فی جزیرۃ من جزائر البحر فاذاھم بدابّۃٍ لبّاسۃٍ ناشرۃٍ شعرَھا، فقالوا ما انتِ قالت: انا الجساسہ، قالوا افاَخبرینا قالت: لااخبرکم

ولااستخبر کم ولکن اِئتوا اقصیٰ القریة فان ثَمَّ من یخبر کم ویستخبر کم فاتینااقصیٰ القریة فاذارجل مُوثَقٌ بسلسلة فقال: اخبرونی عن عین زُغَرَ قلنامَلأیٰ تدفُق قال اخبرونی عن البحیرة قلنامَلأیٰ تدفُق قال اخبرونی عن نخل بَیسان الذی بین الاُردن وفلسطین هل اَطعَمَ؟قلنانعم قال اخبرونی عن النبی هل بُعِثَ؟قلنانعم قال اخبرونی کیف الناس الیه؟ قلناسِراع ،قال فنزانزوةً حتیٰ کَادَ ،قلنافماانتَ؟ قال اناالدجال وانه یدخل الامصار کلّھاالّاطیبة وطیبة المدینة ۔(حسن صحیح)

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے (جلوہ افروز ہوگئے) اور مسکرا گئے اس کے ساتھ فرمانے لگے کہ تمیم داری نے مجھ سے ایک بات (واقعہ) بیان کی جس سے مجھے خوشی ہوئی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی بتادوں، بے شک فلسطین کے کچھ لوگ سمندر میں کشتی پر سوار ہوگئے تو وہ کشتی ان کو دوسری طرف لے گئی (یعنی ناموافق ہوا کی وجہ سے) تا آنکہ ان کو سمندر کے جزائر میں سے کسی جزیرہ پر پھینک دیا (اتاردیا) پس اچانک ان کا واسطہ ایک ایسے جانور سے پڑا جو بہت زیادہ بالوں والا (یا بہت فریب کار) تھا بکھرے ہوئے (یا لمبے لمبے) اس کے بال تھے، چنانچہ انہوں نے اس سے پوچھا تو کیا ہے؟ وہ کہنے لگا میں خبر رساں ہوں (جاسوسی کرنے والا) ان فلسطینیوں نے کہا پھر تم ہم کو (اپنی حقیقت یا خبروں سے) آگاہ کرو، وہ کہنے لگا کہ نہ تو میں تمہیں کوئی خبر دونگا اور نہ ہی تم سے کوئی بات پوچھوں گا، لیکن تم لوگ (میرے ساتھ) اس بستی کے اخیر میں چلے جاؤ بے شک وہاں ایسا شخص ہے جو تم کو خبر بھی دے گا اور تم سے خبریں بھی معلوم کرے گا، چنانچہ ہم اس بستی کے اخیر میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اس نے کہا مجھے زغر چشمے کے بارے میں بتاؤ ہم نے کہا وہ تو بھرپور بہہ رہا ہے، اس نے کہا مجھے بُحیرہ کے متعلق بتاؤ (یعنی طبریہ) ہم نے کہا وہ بھی بھرا ہوا چھلک رہا ہے اس نے کہا بیسان کے نخلستان کے بارے میں بتاؤ جو اردن اور فلسطین کے درمیان ہے کہ آیا وہ پھل دینے لگا ہے؟؟ ہم نے کہا ''ہاں'' اس نے کہا مجھے نبی (آخرالزمان) کے بارے میں بتاؤ کہ آیا وہ مبعوث ہوگئے ہیں؟ ہم نے کہا ''ہاں'' پوچھا مجھے بتاؤ ان کے بارے میں لوگوں کا ردعمل کیا ہے؟ ہم نے کہا تیزی سے ان پر ایمان لا رہے ہیں، کہتے ہیں کہ اس نے ایک زبردست جنبش کی حتی کی زنجیروں سے نکلنے کے قریب ہوگیا ہم نے پوچھا تم کون ہو (کیا ہے؟) اس نے کہا میں دجال ہوں، دجال سب شہروں میں داخل ہوگا سوائے طیبہ اور طیبہ وہی مدینہ ہے۔ **اخرجہ مسلم وابوداؤد وابن ماجہ**

واحمدو الحمیدی

تشریح:۔ یہ روایت مسلم میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے آئی ہے اس لئے تشریح میں اس کو بھی ملحوظ رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔قولہ: "صعِد علی المنبر" مسلم میں ہے کہ اس سے قبل اعلان ہوا تھا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" چنانچہ فاطمہ بنت قیس فرماتی ہیں کہ میں مسجد میں آئی اور عورتوں کی اس صف میں بیٹھ گئی جو مردوں کی صف سے متصل تھی، پھر جب آپ علیہ السلام نماز سے فارغ ہو گئے تو مسکراتے ہوئے منبر پر جلوہ افروز ہو گئے چونکہ اس میں جلس علی المنبر کی تصریح ہے اس لئے معلوم ہوا کہ خطبہ مشہورہ (جمعہ وغیرہ) کے علاوہ وعظ اور نصیحت کی غرض سے منبر پر بیٹھنا جائز ہے اگرچہ جمعہ وغیرہ مسنون خطبہ کھڑے ہو کر ہی دیا جائے گا۔قولہ: "ان تمیما الداری" یہ اپنے جد "دار" کی طرف منسوب ہے اس وقت مشرف بایمان نہ ہوئے تھے یہ روایت ان کی بڑی منقبت ہے کہ آپ علیہ السلام نے یہ واقعہ ان کے حوالے سے بیان فرمایا۔قولہ: "رکبوا سفینۃ" مسلم میں ہے کہ کل تیس آدمی تھے۔قولہ: "فجالت بھم" کشتی ان کو گھما پھرا کر لے گئی یعنی موجوں نے ان کی کشتی دھکیل دی یہاں تک کہ "قذفتھم" ان کو ایک جزیرہ پر ڈال دیا مسلم کی روایت میں ہے کہ یہ سفر ایک مہینے کا تھا اور مغرب الشمس میں ایک جزیرے تک پہنچ گئے، علی ہذا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ بحیرۂ روم میں سفر کر رہے تھے تو پھر یہ واقعہ بحر اوقیانوس میں شمال مغربی افریقہ اور جنوب مغربی یورپ میں سپین اور مراکش کے مغرب میں پیش آیا ہوگا، اور اگر ان کا سفر بحر قلزم (بحر احمر) میں تھا تو پھر بھی یہ بحر اوقیانوس جنوبی افریقہ کی سمت میں پیش آیا ہوگا کیونکہ بحر قلزم (بحر احمر) بجانب مشرق و مغرب اتنا چوڑا نہیں ہے بلکہ ایک خلیج ہے، اور جس روایت میں دجال کو از جانب مشرق برآمد ہونے والا قرار دیا ہے تو اس سے کوئی تعارض لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خروج کی بات ہے جبکہ مندرجہ بالا جملے میں اس کی موجودگی کی بات کی گئی ہے۔قولہ: "بدابۃ لباسۃ" مسلم کی روایت میں ہے کہ "فلقی انساناً یجر شعرہ" جبکہ ابوداؤد کی روایت میں اس پر امراۃ کا اطلاق بھی کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسان نما کوئی جانور تھا یا شیطان تھا، لبّاسہ مبالغے کا صیغہ ہے یا تو لبس بمعنی خلط ملط سے ہے یعنی بہت فریب کار یا بمعنی لباس سے ہے اور یہی راجح ہے یعنی وہ سرتاپا بالوں میں لپٹا ہوا تھا جیسے کوئی کپڑوں میں چھپا ہوا ہو، ایک روایت میں ہے کہ ان کی کشتی ٹوٹ گئی تھی یہ لوگ ایک تختے پر سوار ہو کر اس جزیرے تک پہنچے تھے جبکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی بڑی کشتی کے اندر موجود چھوٹی کشتی پر سوار ہو کر اس جزیرے تک پہنچے تھے اور پانی تلاش کر رہے تھے کہ اچانک ساحل پر اس دابہ سے آمنا سامنا ہو گیا۔

قولہ: "ناشرة شعرها" اس میں ناشرۃ مجرور ہے کہ دابہ کی صفت ثانیہ ہے جبکہ شعرھا بنا بر مفعولیت منصوب ہے، یہ گویا لباسۃ کا بیان ہے۔ قولہ: "الجسّاسه" تجسُّس کرنے والا یعنی میں خبر رساں اور مخبری کرنے والا ہوں۔ "ائتوا اقصیٰ القریة" مسلم میں ہے "انطلقوا الی هذا الرجل فی الدیر" یعنی اس گرجے میں موجود شخص کی طرف چلو چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ وہاں ایک بہت بڑا خوفناک انسان زنجیروں میں اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ کندھوں تک اور گھٹنے ٹخنوں تک لوہے کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے، پھر مسلم کی روایت کے مطابق دجال نے ان سے تعارف پوچھا تو انہوں نے پوری تفصیل سے واقعہ بیان کیا کہ ہم یہاں کیسے پہنچے۔

قولہ: "زغر" بضم الزاء وفتح الغین (معجم البلدان جلد: ۳، ۴ص: ۴۷۷) پر ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام سدوم سے نکلے تو ان کی دو صاحبزادیاں ان کے ہمراہ تھیں بڑی کا نام "ربّہ" تھا اور چھوٹی کا "زُغر" تھا، راستہ میں پہلے ربّہ کا انتقال ہوا جن کو ایک چشمے کے پاس دفنایا جس سے اس چشمے کا نام "عین ربّہ" پڑ گیا پھر زغر کا دوسرے مقام پر انتقال ہوا وہ جس چشمے کے پاس مدفون ہیں اس کا نام "عین زُغر" ہے۔ قولہ: "مَلأی" بھرا ہوا۔ قولہ: "تدفق" دفق کودنے اور اُچھلنے کو کہتے ہیں یعنی وہ خوب لبریز ہے اس کا پانی پُر جوش انداز سے بہہ رہا ہے لوگ اس سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ قولہ: "البحیرة" وہی طبریہ کا بحیرہ ہے جس کے بارے میں پہلے بتایا گیا ہے مسلم میں ہے کہ دجال نے کہا یہ بحیرہ خشک ہو جائے گا۔ قولہ: "نخل بیسان" بفتح الباء وسکون الیاء یہ علاقہ پہلے فلسطین اور اردن کا حصہ تھا مگر اب اس پر اسرائیل نے قبضہ کیا ہے مسلم میں ہے کہ دجال نے کہا کہ قریب ہے کہ یہ نخلستان ختم ہو جائے گا چنانچہ مشہور مؤرخ ابو عبداللہ حموی المتوفی ۶۲۶ھ فرماتے ہیں کہ بیسان اپنی کھجوروں کی وجہ سے مشہور تھا میں وہاں کئی مرتبہ گیا ہوں مگر مجھے وہاں صرف دو پرانے کھجوروں کے باغ ہی نظر آئے۔ (معجم البلدان ج:۱-۲ص:۴۱۴) تاہم آج کل بیسان کا جو حصہ اردن میں داخل ہے وہاں زیادہ تر گندم اور سبزیاں وغیرہ ہوتی ہیں۔

قولہ: "فنزا نزوة حتی کاد" یعنی اس نے اس زور کے ساتھ جنبش کی کہ قریب تھا کہ وہ زنجیروں کی قید سے آزاد ہو جاتا، یہ جنبش یا تو خوشی کے مارے تھی کہ اس کو وہ علامات معلوم ہو گئیں جن کا اس کو انتظار تھا کہ اس کے خروج کا زمانہ قریب آ گیا، یا پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبولیت کے بارے میں سُن کر وہ غم اور غصے سے بھر گیا اور پھر ایک مایوسی بھری جنبش کی۔

یہ حدیث دیگر متعدد صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہے جیسے حضرت عائشہ، حضرت جابر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم۔ قالہ الحافظ

بابٌ

"عن حذيفة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاينبغي للمؤمن ان يُذِلَّ نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال يتعرض من البلاء لِمَا لايطيق". (حسن غريب) اخرجه احمد ايضاً

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو رسوا کرے، صحابہ نے عرض کیا وہ خود کو کیسے ذلیل کرتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ایسی آزمائش کا بیڑا اٹھائے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔

تشریح:۔ ذلت، عزت کے مقابل آتی ہے خصوصاً جب آدمی اپنی مراد میں ناکام رہے تو اس پر اطلاق بوجہ اتم ہوتا ہے جبکہ بلاء آزمائش و مصیبت کو بھی کہتے ہیں اور زبردست کوشش و محنت کو بھی، یہاں بمعنی آزمائش بھی ہوسکتا ہے اور بمعنی تعب و مشقت یعنی ناقابل برداشت عمل یا قول بھی۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ یہ فعل یا قول اگر مندوبات کے زمرے میں سے ہوں تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں گویا لاینبغی بمعنی لایحل ولا یجوز ہوا، اور اگر فرائض میں سے ہوں جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر تو اس میں تفصیل و اختلاف ہے جو پہلے اپنے باب میں گذرا ہے۔

غرض ہر کام اور ہر بات میں اپنی قدرت کا جائزہ لینا لازمی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک کام یا ذمہ داری قبول کرے یا شروع کرے اور پھر اسے نبھا نہ سکے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وقت ضائع ہوگا، وسائل ضائع ہوں گے، مسائل میں اضافہ ہوگا اور لوگوں کے طنز و تمسخر کا دروازہ کھل جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ

باب

"عن انس بن مالک عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: اُنصر اخاک ظالماً اومظلوماً، قيل يارسول الله انصَرتُه مظلوماً فكيف انصره ظالماً؟ قال تَكُفُّه عن الظلم فذاک نصرُک اياه". (حسن صحيح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے (اسلامی) بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم، پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! جب وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد تو کر سکتا ہوں مگر جب وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیسے کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (بایں طور) کہ تم اس کو ظلم سے روک دو گے تو یہ اس کی مدد ہو جائے گی تیری طرف سے۔

تشریح:۔ قوله: "ظالماً" اخاک مفعول سے بناء برحالیت منصوب ہے۔ سائل کے سوال کا منشاء یہ تھا کہ شاید ظالم کا ساتھ دینا مراد ہے اور جواب کا مطلب ظاہر ہے کہ جب اسے ظلم سے اور جھگڑے کے اسباب سے باز رکھو گے تو یہ چیز اس کے ظلم سے روکنے اور ہلاکت اور شیطان کی شرارت سے حفاظت کا سبب ثابت ہوگی۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ مظلوم کی مدد کا وجوب استطاعت اور عدم فساد سے مشروط ہے اگر استطاعت نہ ہو تو وجوبِ نصرۃ ساقط ہو جائے گا جبکہ کسی بڑے فساد کے برپا ہونے کی صورت میں شاید ندب وجواز بھی ختم ہو جائے جیسے آج کل کے دور میں بعض دفعہ مظلوم کی مدد خطرناک ثابت ہو جاتی ہے۔ (واللہ اعلم)

باب

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من سكن البادية جَفَا ومن اِتَّبَعَ الصيد غفل، ومن اَتىٰ ابواب السلطان اُفتُتِنَ". (حسن غريب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بادیہ (صحراء، دیہات وجنگل) میں رہائش پذیر ہوگا اس کا دل سخت ہوگا اور جو شکار کے پیچھے پڑے گا وہ غافل ہوگا اور جو شخص بادشاہوں کے دروازوں پر جائے گا وہ فتنہ (آزمائش وگناہ وغیرہ) میں مبتلاء ہوگا۔

تشریح:۔ "جفا" ستم اور غلظت کو کہتے ہیں مشاہدہ یہی ہے کہ دیہاتی لوگ بڑے سخت جان اور سخت دل ہوتے ہیں کیونکہ وہ اہل علم اور شہری ماحول اور تہذیب سے دور ہوتے ہیں دیہاتیوں کی اپنی تہذیب ہوتی ہے جس پر عموماً جانوروں کی عادات کا اثر ہوتا ہے یہ صحبت اور پیشے کی تاثیر ہے، پتھروں اور لوہے کا اثر ان کے مزاج پر پڑتا ہے تاہم اگر شہری ماحول دیہی ماحول سے زیادہ بگڑ جائے تو پھر دیہات وجنگلات شہروں سے افضل ہیں جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذرا ہے چونکہ اثر قبول کرنے کے لئے وقت درکار ہے اس لئے یہ ارشاد عادی دیہاتی کے بارے میں ہے جو مستقل وہاں رہتا ہو چند ایام کے رہنے سے جیسے کوئی بطور سیر وتفریح یا کسی وقتی ضرورت

سے وہاں جائے، کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

شکار اگر بطور لہو ولعب کے ہو تو وہ غفلت کو مستلزم ہے کہ ایسا آدمی تعلیم، نمازوں اور دیگر لوازمات کا خیال نہیں رکھتا ہے یا کم رکھتا ہے اور شکار کے شوق سے یہ مرض اور بھی بڑھ جاتا ہے مگر بطور ضرورت وحاجت اور نمازوں کی رعایت کی صورت میں شکار معیوب نہیں۔

جہاں تک بادشاہوں کے دروازوں پر دستک دینے کی بات ہے تو آج کے دور میں اس سے فتنہ میں مبتلا ہونا اغلب ہے کہ وہ آدمی سے غلط کام لیتے ہیں اگر عالم ہے تو اس سے من پسند فتوی صادر کرواتے ہیں، ان کی طرز زندگی دیکھ کر آدمی اپنی حالت پر ناشکری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ تاہم اگر کوئی نیک نیتی سے ان کے دربار میں جاتا ہے اور ان کی اصلاح پر قادر بھی ہے اور کلمۂ حق بلند کرسکتا ہے تو وہ شخص ماجور ہوگا اگرچہ آج کل یہ ممکن عقلاً تو ہے مگر امکان وقوعی سے دور ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

دوسری حدیث:۔ "انكم منصورون ومصيبون ومفتوح لكم فمن ادرك ذاك منكم فليتّق الله وليأمر بالمعروف ولينهَ عن المنكر ومن يكذِب عَلَيَّ متعمدا فليتبو أمقعده من النار". (حسن صحيح)

تم مدد کئے جاؤ گے اور تم (مال تک یعنی غنیمت تک) رسائی حاصل کرنے والے ہو اور تمہارے لئے فتح کئے جائیں گے (شہر وممالک) پس جو شخص اس مذکور کو پائے تو اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتا رہے اور جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے پس وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنادے۔

چونکہ دولت وحکومت دونوں تقویٰ سے دور لے جانے کے اسباب میں سے ہیں کہ عموماً ان میں مبتلا شخص کم ہی تقویٰ بجالاتا ہے اس لئے آپ علیہ السلام نے فتوحات کی خوشخبری کے ساتھ ساتھ ان کو تقویٰ کی بھی وصیت کی اور یہ کہ اپنا اصل فریضہ نیکی کی طرف بلانے اور بدی سے روکنے کا عمل کبھی بھی نہ چھوڑیں۔

حدیث کا آخری جملہ ان شاء اللہ "**ابواب العلم، باب ماجاء فی تعظیم الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**" میں آئے گا، خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بمعنی اخبار ہے اور یہ روایت بیس سے زیادہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے۔

باب

"عن حذيفة قال قال عمر: ايكم يحفظ ماقال رسول الله صلى الله عليه وسلم في الفتنة؟فقال حذيفة انا، قال حُذيفة: فتنة الرجل في اهله وماله وولده وجاره تكفرّها الصلوٰة والصوم والصدقة والامر بالمعروف والنهي عن المنكر، قال عمر: لستُ عن هذا اَسالکَ ولكن عن الفتنة التي تموج كموج البحر، قال: ياامير المؤمنين اان بينکَ وبينها بابامغلقاًقال عمر أيُفتح ام يُكسر؟قال: بل يُكسَرُ قال: اذاًلايُغلق الي يوم القيٰمة، قال ابو وائل في حديث حماد فقلتُ لمسروق سَل حذيفة عن الباب فَسَألَه فقال: عمر".

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان یاد کیا ہے جو فتنے کے بارے میں ہے؟ تو حذیفہؓ نے فرمایا "میں نے" حضرت حذیفہؓ نے فرمایا (آپ علیہ السلام نے فرمایا ہے) آدمی کا فتنہ اس کے اہل و مال اور اولاد و پڑوسی کے بارے میں، ان کی تلافی کرتی ہے نماز، روزہ، صدقہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر، حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تم سے اس کے متعلق نہیں پوچھ رہا بلکہ اس فتنے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو سمندری موج کی طرح موج زن ہوگا، حضرت حذیفہؓ نے فرمایا اے امیر المؤمنین! بے شک آپ کے اور اس کے درمیان ایک بند دروازہ (حائل) ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا؟ حذیفہؓ نے فرمایا بلکہ وہ توڑا جائے گا، حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر تو وہ قیامت تک بند نہیں کیا جائے گا۔

ابو وائل کہتے ہیں (یہ صرف ان کے شاگرد) حماد کی حدیث ﷺ ہے (نہ کہ اعمش وعاصم کی) پس میں نے مسروق سے کہا کہ حضرت حذیفہؓ سے اس دروازے کے بارے میں پوچھو (کہ اس سے کون مراد ہے؟) چنانچہ انہوں نے پوچھ لیا تو حذیفہؓ نے کہا وہ عمرؓ ہیں۔

تشریح:۔قوله: "**فتنة الرجل في اهله**" یعنی آدمی سے مال وعیال اور جار کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بے اعتدالیاں ضرور ہوتی ہیں اور کبھی اولاد اور پڑوسیوں کے بعض مستحب حقوق میں بھی کوتاہیاں ہوتی ہیں ان دونوں صورتوں میں نماز وغیرہ عبادات سے ان کوتاہیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ کبائر تک نہ پہنچیں کیونکہ کبیرہ کے لئے توبہ لازمی ہے جیسا کہ کتاب کے شروع مباحث میں گذرا ہے۔قولہ: "التی تموج کموج البحر" سمندر کی موج

سے تشبیہ دینے سے غرض فتنے کی شدت اور کثرت شیوع ہے یعنی وہ فتنہ بتاؤ جو سب کو اپنی لپیٹ میں لے گا، ابن العربیؒ عارضہ میں اشارہ کررہے ہیں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے مابعد کے واقعات ہیں گویا وہ بند دروازہ حضرت عثمانؓ ہیں۔ لیکن حدیث کا ظاہری مطلب وہی ہے جو آخر میں بیان ہوا ہے یعنی حضرت عمرؓ۔

قوله: "**ان بينک وبينها بابا مغلقاً**" یعنی وہ فتنہ آپ تک نہیں پہنچ سکتا اور آپ کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے سکتا کہ آپ بند دروازے کے پیچھے مکمل محفوظ ہیں۔ **قوله:** "**أيُفتح ام يُكسر**" کیونکہ کھلا ہوا دروازہ بند کرنا تو آسان ہے مگر جو ٹوٹ جائے تو اسے کیسے بند کیا جائے گا۔ **قوله:** "**قال بل يكسر**" یعنی پھر بند نہیں ہوگا، بلغاء کے کلام میں ایسے ہی کنایات میں بات ہوتی ہے، نیز حضرت حذیفہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب السر یعنی راز داں تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منافقین کے نام اور بہت سے آنے والے فتنوں کے بارے میں آگاہ فرمایا تھا حضرت حذیفہؓ اس راز کو فاش نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے کنایات میں بات کرنا چاہتے ہیں تا کہ راز صرف حضرت عمرؓ تک محدود رہے، اس لئے بخاری شریف (جلد:۱ص: ۷۵) پر ہے جب حذیفہؓ سے دریافت کیا گیا کہ "**اكان عمر يعلم الباب ؟**" وہ دروازے کا مطلب جانتے تھے تو انہوں نے جواب دیا "**نعم كماان دون الغدالليلةالخ**" یعنی جی ہاں جس طرح کل سے پہلے رات کا یقین ہوتا ہے۔

قوله: "**فقال عمر**" یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اور فتنوں کے درمیان ایک بند دروازہ حائل ہے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ دروازہ حضرت عمرؓ سے غیر اور مختلف ہو جبکہ یہاں اسے عین عمر قرار دیا گیا فما جوابہ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا وجود فتنوں اور عہدِ محفوظ از فتن کے مابین رُکاوٹ وحاجز وساتر ہے جب تک آپ زندہ ہیں فتنے سر نہیں اٹھا سکیں گے مگر جب آپ کو شہید کیا جائے گا تو پھر فتنوں کا دروازہ گویا نہ صرف کھلے گا بلکہ ٹوٹے گا جیسا کہ بعد میں ایسا ہی ہوا، نیز اس میں آپؓ کی شہادت کی طرف اشارہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہؓ اس حد تک بتانے کے مجاز تھے۔

باب

"**عن كعب بن عجرة قال خرج الينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن تسعة خمسة واربعة احد العددين من العرب والآخر من العجم فقال اسمعوا اهل سمعتم انه**

سیکون بعدی امراء فمن دخل علیهم فَصَدَّقهم بکذبهم واعانهم علی ظلمهم فلیس منی ولستُ منه ولیس بوارد عَلَیَّ الحوض ومن لم یدخل علیهم ولم یُعنهم علی ظلمهم ولم یصدقهم بکذبهم فهو منی وانا منه وهو وارد عَلَیَّ الحوض". (صحیح غریب) اخرجه النسائی واحمد

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (حجرے سے باہر مسجد کی طرف) ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم نو آدمی تھے یعنی پانچ اور چار، ایک عدد ان میں سے عربوں کا تھا (مثلاً پانچ) اور دوسرا عجمیوں کا (مثلاً باقی چار) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ عنقریب میرے بعد امراء (برے حکمران) ہوں گے، جو شخص ان کے پاس جائے گا اور ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا اور ان کے ظلم میں تعاون کرے گا تو وہ مجھ سے نہیں اور نہ ہی میں اس سے ہوں وہ میرے پاس حوض (کوثر) پر نہیں آئے گا اور جو شخص ان کے پاس نہیں جائے گا اور ان کے مظالم میں ان کی مدد نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا تو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے پاس حوض پر (بھی) آئے گا۔

تشریح:۔قولہ: "خمسة واربعة" یہ نو (تسعہ) کی تفسیر ہے یعنی ان نو میں عرب و عجم دونوں طرح کے لوگ تھے، حدیث کی باقی شرح سابقہ باب سے پیوستہ باب حدیث ابن عباسؓ میں گذری ہے۔**قولہ:** "فلیس منی ولست منه" یہ شدید ناراضگی کا اظہار ہے یعنی گویا میرے اور ایسے شخص (عالم) کے درمیان کوئی گہرا تعلق نہیں اور میری طرف سے خلاصی کی شفاعت کا عہد نہیں ہے۔**قولہ: امراء** "امراء" کی یہ حالت باعتبار اغلب کے ہے ورنہ ان میں اچھے بھی گذرے ہیں۔

حدیث انسؓ:۔"یأتی علی الناس زمان الصابر فیهم علی دینه کالقابض علی الجمر". (حدیث غریب، تفرد به الترمذی)

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جن میں اپنے دین پر صبر کرنے (جمنے) والا ایسا ہوگا جیسے چنگاریوں کو ہاتھ میں تھامنے والا ہوتا ہے۔

تشریح:۔ ترمذی کی یہ حدیث ثلاثی ہے، ثلاثی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مؤلف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہوں چنانچہ یہاں اسماعیل بن موسیٰ، عمر بن شاکر اور حضرت انسؓ تین رجال

ہیں اور ترمذی میں فقط یہی ایک ثلاثی حدیث ہے تاہم اس میں عمر بن شاکر ضعیف ہیں اگرچہ ضعف زیادہ نہیں۔

قولہ: "جمر" جمرۃ کی جمع ہے چنگاری کو کہتے ہیں پس مطلب یہ ہے کہ جس طرح چنگاریاں مٹھی میں بند کر کے رکھنا آسان کام نہیں ایسا ہی اُس زمانے میں دین کی حفاظت اور اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہو جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ ضعف ایمان کی وجہ سے اور نامساعد حالات کی بناء پر کوئی شخص دین پر عمل کرنا گوارا نہیں کرے گا جیسے کوئی انگارے مٹھی میں بند کرنا گوارا نہیں کرتا۔

باب

"عن ابی هریرة ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وقف علی ناس جلوس فقال: آلا اخبرکم بخیرکم من شرکم قال فَسَکَتوا فقال :ذالک ثلاث مرات فقال رجل بلیٰ یارسول اللّٰه اَخبِرنا بخیرنا من شرنا قال: خیرکم من یُرجیٰ خیره ویُؤمن شره وشرکم من لایُرجیٰ خیره ولایُؤمَن شره". (صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس آ کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا تمہیں آگاہ نہ کروں تم میں سے اچھے لوگوں کے بارے میں بنسبت بُرے لوگوں کے راوی نے کہا پس لوگ خاموش ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد تین بار فرمایا تب ایک آدمی نے عرض کیا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! ہمیں خبر دیجئے ہم میں سے بہتر لوگوں کی بابت بنسبت اہل شر کے ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں اچھا آدمی وہ ہے جس سے خیر کی توقع کی جاتی ہو اور اس کے شر سے بے فکر رہا جائے جبکہ تم میں بُرا شخص وہ ہے جس سے خیر کی امید نہ رکھی جائے اور اس کے شر سے اطمینان نہ ہو۔

تشریح:۔ صحابہ کرامؓ کی خاموشی اس بناء پر تھی کہ وہ اس سے ڈر گئے کہ اگر آپ علیہ السلام نے ہمارے اندر یعنی ان لوگوں میں بُرے افراد کا تعین فرما دیا تو وہ رسوا و تباہ ہو جائیں گے اور چونکہ الایمان بین الخوف والرجاء اس لئے ہر شخص اس خوف کا شکار رہا تاہم جب آپ علیہ السلام نے اصرار فرمایا تب ایک صحابی نے ہمت کر کے فرمایا کہ ضرور بتلائے ،اور حضور علیہ السلام نے عام ضابطہ ارشاد فرما کر ان کا خوف بھی زائل فرمایا اور تعلیم عام بھی ہو گئی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ کسی کا نام لئے بغیر حکم ارشاد فرماتے ،چونکہ خیر اچھی چیز ہے اس لئے خیر والا افضل ہے جبکہ شر والا اپنے شر کی وجہ سے بُرا ہے۔

"عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذامشت امتی المُطیطیاء وخَدَمَهَا ابناء الملوک ابناء فارس والروم سُلِّطَ شرارها علی خیارها. (غریب ،تفرد به الترمذی وموسی بن عبیدة ضعیف)

جب میری امت اِتراتی ہوئی چلنے لگے اور شہزادے اس کی خدمت کرنے لگیں یعنی فارس وروم کے بیٹے تو اس کے بُرے لوگ اچھے لوگوں پر مسلط کردیئے جائیں گے۔

تشریح:۔قوله:"المُطَیطِیاء" اس میں دوطاء اور دو یاء ہیں میم مضموم اور طاء اولیٰ مفتوح ہے بعض یاء ثانیہ کو حذف کر کے مطیطاء بھی پڑھتے ہیں یہ لفظ مصغر ہے اس کا مکبر نہیں آتا، مَطٌّ بمعنی تکبر کے اور مططت بمعنی تمدد یعنی لمبا کرنا لہٰذا دونوں معنوں کی رعایت کرتے ہوئے مطلب یہ بنتا ہے کہ جب اس امت کے لوگ اکڑ کر اور اپنے بازوؤں مارتے ہوئے چلنے لگیں گے، اور شہزادے ان کے خادم ہوں گے تو پھر اشرار اخیار کے ملوک ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اشرار اس چیز کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کی نظر میں اس انداز اور طرز معاش کی بڑی مانگ ہوتی ہے اس لئے وہ حکومتوں پر قبضے کی خاطر آگے بڑھیں گے چنانچہ محشی نے لکھا ہے کہ بنوامیہ کے دور میں ایسا ہی ہوا اور آپ علیہ السلام کی پیش گوئی جوں کی توں ثابت ہوئی تاہم جس زمانے میں فارس وروم کی فتوحات ہوئیں اور جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس وقت موجود تھے تو وہ دوسری احادیث کی وجہ سے مستثناء ہیں لہٰذا اس سے مراد مابعد کا زمانہ ہے۔

قوله:"لن یفلح قوم ولّوا امرهم امراء ة الخ" حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس چیز (حدیث) کی وجہ سے میری حفاظت فرمائی جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی کہ جب کِسریٰ ہلاک ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کا جانشین کس کو بنایا؟ صحابی نے عرض کیا اس کی بیٹی کو پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنی حکومت عورت کے سپرد کرے چنانچہ جب حضرت عائشہ ؓ بصرہ تشریف لائیں تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا (یہ) فرمان یاد آیا، پس اللہ نے اس کی وجہ سے میری حفاظت فرمائی۔ (یعنی میں جنگ جمل میں شرکت سے گریزاں رہا)

تشریح:۔جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما دونوں نے مکہ جا کر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے سامنے واقعہ کی تفصیل بیان کی جو ان دنوں میں حج کرنے تشریف لے گئی تھیں باہمی مشاورت سے طے ہوا کہ بصرہ جا کر لوگوں کی ذہن سازی کی جائے تاکہ حضرت عثمانؓ کے خون

کا بدلہ لیا جائے ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کے ہاتھ پر لوگ شہادت عثمان کے فوراً بعد بیعت کر چکے تھے حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا چاہتے تھے مگر ان کو اولیاء عثمان کے آنے اور طلب قصاص کا انتظار تھا دوسری طرف باغیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی جن پر قابو پانا خاصا مشکل امر تھا بہر حال جب حضرت علیؓ کو ان حضرات کے بصرہ جانے کا پتہ چلا تو وہ بھی وہاں تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی رائے وہی تھی جو حضرت عائشہؓ کی تھی مگر مذکورہ روایت کے مطابق انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ فتح حضرت علیؓ کو نصیب ہوگی کہ وہ مرد ہیں جبکہ ام المؤمنین عورت ہیں، اس لئے وہ لڑائی سے اجتناب کرتے رہے۔

اس حدیث کے مطابق اہل فارس نے کسریٰ کی لڑکی کو حکمران بنالیا تھا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ ایسا کرنے والی کوئی قوم کامیاب نہ ہوگی۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک کے نام خطوط ارسال فرمائے تو حضرت عبداللہ بن خذافہ سہمیؓ کو ایک مکتوب دے کر شاہ فارس جس کا لقب کسریٰ اور نام خسرو پرویز تھا کی طرف بھیجا اس بد بخت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اپنے نام سے پہلے لکھا ہوا دیکھا تو کبر و نخوت کے نشہ میں دھت طیش میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ چاک کر دیا جس کی اطلاع مدینہ میں بھی پہنچی اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی کہ اے اللہ! اس کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دے، چنانچہ اس کی بیوی ''شیرین'' پر اس کا بیٹا شیرویہ جو عاشق ہو گیا تھا (یعنی اپنی سوتیلی ماں پر) نے باپ کو راستہ سے ہٹایا باپ کو اس کے ارادے کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے اس نے شاہی دواخانہ میں زہر کی شیشی رکھ کر اس پر لکھا ''مقوی باہ دوا'' جب شیرویہ نے یہ شیشی بعد میں دیکھی تو اسے شوق سے پی لیا کیونکہ وہ جماع کرنے کا بہت شوق رکھتا تھا، پس وہ بھی اپنے انجام کو پہنچا، اس طرح چھ ماہ کے اندر اندر اس خاندان کے سب مرد ختم ہو گئے اور بالآخر اس کی بیٹی ''بوران'' کو تخت پر بٹھا دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی کہ ان کو کامیابی نہیں ہوگی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ کے زمانہ میں ایران مسلمانوں کے قدموں کے نیچے آگیا، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ھذا یدل علی ان الولایۃ لِلرجال لیس للنساء فیھا مدخل باجماع اللّٰھم الّا ان اباحنیفۃ قال تکون المرأۃ قاضیۃ فیما تشھد فیہ یعنی علی الخصوص الخ''.

یعنی عورت کو بالاجماع ولایت کا حق حاصل نہیں البتہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جن مواقع میں

عورت گواہ بن سکتی ہے تو ان میں قاضیہ بھی بن سکتی ہے۔

شرح عقائد وغیرہ میں عورت کی عدم ولایت کی دلیل یہ دی ہے کہ وہ "ناقصات العقل والدّین" ہوتی ہیں، نیز امام کے لئے شجاعت وغیرہ ضروری ہے جو عورت میں بڑے پیمانے پر نہیں پائی جاتی ہے، البتہ قضا میں ضابطہ یہ ہے کہ جس چیز میں جس شخص کی شہادت معتبر ہے اس میں وہ قاضی بھی بن سکتا ہے کہ قضاء کا دارومدار شہادت پر ہے لہٰذا عورت حدود اور قصاص کے علاوہ باقی خصومات میں قاضیہ بن سکتی ہے۔ (کذا فی الہدایہ، باب کتاب القاضی الی القاضی فی فصل آخر)

اس باب میں حضرت عمرؓ کی حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آگاہ ہو! میں تم کو بتاتا ہوں تمہارے حکمرانوں میں سے اچھے اور بُرے، اچھے امراء وہ ہیں جن کو تم پسند کرو اور تم کو وہ پسند کریں تم ان کے لئے دعائیں مانگو اور وہ تمہارے لئے دعا کریں، اور برے حکمران وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں، تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔

یعنی اگر ان کے اندر ہمدردی اور خیر رسانی کا جذبہ اور خدمت وسیاست کا سلیقہ اور عدل کا ملکہ ہوگا تو تمہارے تعلقات خوشگوار اور ایک دوسرے کے لئے دعاگو ہوں گے، ورنہ دشمنی، نفرت اور عداوت واختلافات ہوں گے۔

"انہ سیکون علیکم ائمۃ تعرفون وتنکرون الخ" تم پر ایسے حکمران آئیں گے جن (کے بعض افعال) کو تم جانتے ہوں گے اور بعض (کاموں) کو ناآشنا سمجھو گے پس جس نے اعتراض کیا بے شک وہ بری (الذمہ) ہو گیا اور جس نے ناپسند کیا وہ (گناہ کی شرکت سے) محفوظ رہا لیکن جو شخص راضی ہو کر ان کی پیروی کرے گا.... (یعنی وہ شریک گناہ ہوگا)....عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! کیا ہم ان کے ساتھ قتال نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں"۔ قولہ: "تعرفون وتنکرون" معرفت ونکارت اگرچہ حکام کی طرف راجع صفات ہیں مگر باعتبار متعلقہ کی طرح افعال مراد ہیں یعنی ان کے بعض افعال تو شریعت کے مطابق ہوں گے جو تمہیں معلوم اور آپ کے لئے مانوس ہوں گے مگر بعض دیگر نامانوس اور غیر مشروع ہوں گے پس جس نے ان کے ایسے امور جو غیر شرعی ہوں پر کھل کر نکیر واعتراض کیا اس نے تبلیغ ودعوت کا حق ادا کیا اس لئے اس کا ذمہ فارغ ہے اور "ومن کرہ" یعنی جس نے ان افعال کو بُرا جانا اور دل سے ان کو ناپسند کیا، یہ اس شخص کے لئے یا اس زمانے کے اعتبار سے ہے جو واضح اور قولی اعتراض کا حامل نہ ہو تو وہ

کم از کم گناہ کی شرکت سے تو سالم ومحفوظ رہا مگر جو شخص ان افعال پر خوش بھی ہوا اور شریک بھی ہو تو وہ گناہ میں برابر کا شریک ہوگا، یہاں "لکن مَن رضی" کی خبر کو ظاہر ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا "ای فھو الذی شارکھم فی العصیان" وجہ ظہور یہ ہے کہ یہ صورت پہلی دونوں کے مقابل ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر:۹۱ "قل فَلِمَ تقتلون انبیاء اللہ من قبل ان کنتم مؤمنین" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ دنیا میں کہیں بھی معصیت ہو رہی ہو تو اس پر اعتراض کرنے والا بری اور راضی ہونے والا شریک شمار ہوتا ہے "قیل اذا عُملت المعصیة فی الارض فمن کَرِھَھا وانکر بَرِئ ومن رضیھا کان من اھلھا" تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لڑنے کی ممانعت فرمادی کیونکہ یہ ایک عموم بلویٰ کی کیفیت ہوگی اور ایسے منکرات کو بزور بازو روکنے کے لئے بہت زیادہ خون بہانے کی ضرورت ہوتی ہے جو بذات خود ایک المیہ سے کم نہیں۔ (ھذا حدیث حسن صحیح)

قوله: "اذا کانت امراء کم خیار کم واغنیاء کم سُمحاء کم وامور کم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا". جب تمہارے امراء تمہارے افضل لوگ ہوں گے اور تمہارے اغنیاء تمہارے سخی لوگ ہوں اور تمہارے کام باہمی مشاورت کے ساتھ ہوں تو زمین کی پشت تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے۔ یعنی ایسی صورت حال میں حیات موت کے مقابلہ میں افضل ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ جب ارباب اقتدار شریف اور متقی لوگ ہوں گے اور مالدار لوگ سخاوت کرتے ہوں اور معاملات وغیرہ باہمی مشورے کے ساتھ چل رہے ہوں تو یقیناً وہ زمانہ نیکی کمانے کا بہترین موسم ہوگا۔ کہ نیک عمل میں تعاون کرنے والے موجود ہوں گے لہٰذا زندہ رہنا اچھے اعمال کا ذریعہ ہوگا جو موت سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر حکمران بُرے ہوں اور اغنیاء بخل کرتے ہوں اور معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو پھر موت ہی اچھی ہے کیونکہ اس سے قبل جتنے اعمال کئے ہیں کم از کم وہ تو محفوظ رہیں گے اگرچہ جمہور اہل سنت کے نزدیک گناہوں سے نیکیاں حبط نہیں ہوتی ہیں مگر نیکی کے اوپر بدی بہرحال ایک بدنما دھبہ اور بدشگون تو ہے ہی اور اگر ایسے میں موت بچپن میں آجائے تو وہ تو اور بھی اچھی بات ہے کیونکہ گناہوں کی نوبت ہی نہیں آئے گی، بہرحال جب ماحول بگڑ جائے اور نیکی کرنا متعذر ہو جائے تو پھر زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ۔

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

اس حدیث میں عام فضا کی بات ہوئی ہے کہ جب عمومی فضا اس طرح بن جائے کہ اہل اقتدار سارے یا اکثر بُرے ہوں، اغنیاء بخیل ہوں اور عورتیں با اختیار یا معاملات میں پیش پیش ہوں یا کم از کم مردان کے مشوروں واشاروں پر چلنے لگیں تو چونکہ وہ "ناقصات العقل والدین" ہیں ظاہر ہے کہ وہ کسی بھلائی کا مشورہ تو نہیں دے سکتیں یا نہیں دیتیں تو ایسے میں خیر و نیکی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے اگرچہ نیک سیرت اور فضائل و اخلاق سے آراستہ خاتون اس فہرست سے مستثنیٰ ہے کہ وہ اگر صحیح مشورہ نہ بھی دے سکے تو کم از کم غلط رائے سے بھی گریز کرے گی لیکن ان کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے۔

باب

"عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: انكم فی زمان من ترک منكم عُشر ماأُمربه هلک، ثم يأتی زمان من عَمِل منهم بِعُشرِ ماأُمربه نَجا". (هذاحديث غريب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک تم لوگ ایسے زمانہ میں ہو کہ تم میں سے جو شخص اس کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے جس کا اسے حکم ہے تو ہلاک ہو جائے گا پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان میں سے جو شخص اس کا دسواں حصہ عمل میں لائے گا جس کا اسے حکم ہے تو نجات پائے گا (کیونکہ اس دور میں دین کے انصار کم یا معدوم ہوں گے)۔

تشریح:۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ اسلام کے شباب وطاقت کا دور تھا اور نیکیوں کی برکات وبارش کے لئے بمنزلہ ساون کا مہینہ تھا ظاہر ہے ایسے میں کوئی پودا خشک اور کوئی درخت بے ثمر نہیں رہتا ایسے ماحول میں نیکی کمانا نہ صرف آسان ہوتا ہے بلکہ ماحول کا تقاضا بھی ہوتا ہے جبکہ موسم خزاں میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور پھل گر جاتا ہے شاذ و نادر درختوں میں پھل نظر آتا ہے مگر کسی پودے یا درخت کا اپنی تازگی کو محفوظ و برقرار رکھنا موسم کے اعتبار سے ایک دشوار امر ہوتا ہے، ایسا ہی جب فتنوں کا زمانہ آئے گا تو ہر طرف نیکیوں کے خلاف ہوائیں اُمنڈ آئیں گی اور نیکی کو کرنے ہی نہیں دیں گی، وہ آدمی بڑا ہی باہمت اور ایمانی اعتبار سے مضبوط ہوگا جو ایسے میں بھی نیکی کے حصول کے پیچھے لگا رہے۔

یہاں تک تو بات بدیہی ہے مگر "ماموربہ" اور نیکی سے کیا مراد ہے؟ تو بعض حضرات سے اس کے تعین میں سہو ہوا ہے اور مراد فرائض لئے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ فرائض تا قیامت پوری امت پر یکساں لازم

ہیں ان میں کمی ورخصت کی کوئی گنجائش نہیں ہے سوائے عاجز کے۔

پھراس کا مطلب کیا ہے؟ تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مراد اخلاص ہے کہ فتنوں کے زمانہ میں تھوڑا سا اخلاص بھی نجات کا سبب بنے گا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مراد امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے کہ قرون اولیٰ میں منکرات کمزور تھے اس لئے ان کو سر اٹھانے سے روکنا آسان تھا اس لئے اس میں سُستی کی گنجائش نہ تھی جبکہ آج کل یا آگے چل کر منکرات کی جڑیں مضبوط ہیں اور مزید پختہ ہوں گی ایسے میں ان کو جڑ سے اکھاڑنا متعذر ہے البتہ استیصال کی دس فیصد کوشش بھی نجات کا ذریعہ بنے گی، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جب دسواں حصہ بھی قابل عمل نہ رہے تو پھر آدمی کو اس کی اجازت ہے کہ وہ لوگوں کے مسائل چھوڑ کر یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ کر صرف اپنی فکر میں لگا رہے اور پھر ایک دور ایسا بھی آجائے گا کہ خود بھی عمل دشوار ہوجائے گا جتنا مٹھی میں انگارے تھامنا متعذر ومشکل ہے جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں گذرا ہے "الصابر فیهم علی دینه کالقابض علی الجمر" حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مراد کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہے یعنی نماز میں خشوع وخلوص وغیرہ یا جیسے مستحبات وآداب بھی لے سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

قوله: "**ههنا ارض الفتن واشار الی المشرق**" اس پر بحث "**باب ماجاء ان الدجال لایدخل المدینة**" میں گذری ہے حدیث ابوھریرہؓ کی تشریح میں دیکھئے۔ **قوله:** "**حیث یطلع قرن الشیطان**" جہاں شیطان کا سینگ نکلتا ہے، یہ تو لفظی ترجمہ ہے مگر قرن الشیطان سے مراد اس کا تسلط اور اس کی جماعت وکارندے ہیں جو شیطان کے اشاروں پر چلتے ہیں چنانچہ جتنے فرق مبتدعہ گزرے ہیں یا آج کل نئے نئے نظریات لے کر نکل رہے ہیں یہ سب مشرقی لوگ ہیں یعنی عموماً ممکن ہے کہ شیطان سے مراد عام ہو خواہ من الجنات ہوں یا من الانس ہوں چنانچہ یہ فتنہ انگیز لوگ یورپی اقوام وانگریزوں کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

قوله: "**اوقال قرن الشمس**" لفظ او شک راوی کے لئے ہے یعنی جہاں سے سورج کا کنارہ طلوع ہوتا ہے۔ ھذا حدیث حسن صحیح واخرجہ الشیخان

قوله: "**یخرج من خراسان رایات سُود فلایردها شئی حتیٰ تنصب بایلیآء**". (غریب حسن) خراسان سے کالے جھنڈے نکلیں گے پس کوئی چیز ان کو نہیں لوٹا سکے گی تا آنکہ وہ ایلیاء (مقام) میں گاڑھ دیئے جائیں گے۔ **قوله:** "**رایات**" رایة کی جمع ہے بمعنی جھنڈے کے اور سود جمع ہے اسود کی۔ **قوله:**

"حتیٰ تُنصب" بصیغۂ مجہول نصب کے معنی گاڑھنے اور لہرانے کے ہیں۔ قولہ: "بإيلياء" إیلیاء بکسر الہمزہ وکسر اللام مد وقصر دونوں جائز ہیں بیت المقدس کے قریب ایک شہر کا نام ہے، پھر حتی متعلق ہے یخرج کے ساتھ نہ کہ "فلایردھا" کے ساتھ۔

اس لشکر اور جھنڈوں کو واپس کرنے کی کسی میں تاب وطاقت نہ ہوگی کیونکہ کنز العمال اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ان میں حضرت مہدی ہوں گے۔

"اذا رأيتم رايات السود قدجاء ت من قِبَلِ خراسان فائتوها فان فيها خليفة الله المهدى". لفظه لاحمد و رجاله ثقات

آخر ابواب الفتن ويليه ابواب الرؤيا

ابواب الرؤیا

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب اِن رؤیا المؤمن جزء من ستة واربعین جزءً من النبوة

(مومن کا خواب نبوت کا ۴۶/ر چھیالیسواں حصہ ہے)

"عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم :اذااقترب الزمان لم تکد رؤیا المؤمن تَکذِبُ واصدَقُهم رؤیاً اصدقهم حدیثاً ،ورؤیاالمسلم جزء من ستة واربعین جزءً من النبوة ،والرؤیاثلاث فالرؤیاالصالحة بُشریٰ من اللّٰہ والرؤیامن تحزین الشیطان والرؤیاممایُحَدِّث بهاالرجلُ نفسَه فاذارأیٰ احدکم مایکره فلیقم ولیتفُل ولایُحَدِّث به الناسَ قال واُحِبُّ القیدفی النوم واکره الغُلَّ ،القیدثباتٌ فی الدین". (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب زمانہ قریب ہوجائے گا تو مؤمن کا خواب بہت کم جھوٹا ہوگا لوگوں میں سب سے زیادہ سچے خواب والا وہ ہوگا جس کی بات (یا سوچ) سب سے زیادہ سچی ہو اور مسلمان کا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء (حصہ) ہے اور خواب تین طرح کے ہوتے ہیں، پس اچھا خواب اللہ کی طرف سے بشارت (خوشخبری) ہے اور ایک خواب شیطان کی طرف سے پریشان کن خیال ہوتا ہے اور ایک خواب آدمی کے دل میں سوچ و بچار کی وجہ سے ہوتا ہے پس تم میں کوئی اگر ایسا خواب دیکھے جو اسے ناگوار لگے تو اسے چاہئے کہ اُٹھ کر (بائیں جانب) تھوکے اور لوگوں سے اس کا تذکرہ نہ کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خواب میں بیڑی کو پسند کرتا ہوں اور طوق کو ناپسند کرتا ہوں (کیونکہ) بیڑی (کی تعبیر) دین پر ثابت قدم رہنا ہے۔

تشریح:۔قولہ:"اذااقترب الزمان" اس کے معنی ومطلب میں شارحین نے متعدداقوال بیان کئے ہیں مثلاً جب صبح کا وقت قریب ہو۔بعض نے کہا کہ دن رات مساوی ہوجائے یہ اس وقت ہوتا ہے جب سورج خط استواء پر ہو جیسے مارچ اور ستمبر کے مہینوں میں مگر اس کو ابن العربیؒ نے سختی سے رد کیا ہے لہٰذا بے غبار مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کا دن قریب ہوجائے گا پھر چاہے وہ حضرت مہدی وعیسیٰ علیہما السلام کا زمانہ ہو یا خروج دجال اور فتنوں کا زمانہ مانا جائے کیونکہ ایک تو وہ زمانہ عجائبات وخوارق کا ہوگا اور از اں جملہ ایک خواب بھی ہے دوم مؤمن ان فتنوں میں نامانوس ہوگا تو جس طرح ابتداء اسلام میں مؤمن کا خواب سچا ہوا کرتا تھا اسی طرح ان کی تالیف کے لئے آخر الزمان میں بھی ان کو سچے خواب دکھائے جائیں گے،اور اگر حضرت مہدی کا زمانہ لیا جائے تو پھر عدل وانصاف کی فراوانی کی وجہ سے خواب سچے ہوں گے۔

قولہ"لم تکدرؤیا المؤمن الخ" رؤیا بروزن یسریٰ اصل میں مصدر ہے مگر جب اس کا اطلاق خواب پر ہونے لگا تو اسے اسم کی طرح مانا گیا،خواب کی حقیقت جاننا ایک مشکل امر ہے بہت سے ماہرین نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور بعض حضرات نے اسے اپنی کتابوں میں ضمناً ذکر کیا ہے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ دہلوی کی اس موضوع پر مستقل کتاب بنام "تحقیق الرؤیا" بہت سے فوائد پر مشتمل ہے، حجۃ اللہ البالغہ اور مقدمۂ ابن خلدون میں بھی اس موضوع کو اُجاگر کیا گیا ہے، تحقیق الرؤیا کے صفحہ نمبر۶ پر حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"فمن ثم اضطرب الناس فی امر الرؤیا واختلفوا اختلافاً فاحشاً علی حسب اصولهم المختلفة فقال المتكلمون الرؤیا خیال الخ".

یعنی اس مسئلہ میں بہت سارا اختلاف ہے حکماء کچھ کہتے ہیں اور دیگر کچھ،مگر بعض متکلمین یعنی اہل سنت والجماعت کے نزدیک خواب ایک خیال ہے جس کا مطلب علامہ ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں یوں بیان کیا ہے کہ جب انسان سوجاتا ہے تو روح بجائے حواس ظاہرہ کے باطنی قویٰ کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے جس سے اس کو حافظہ کی صورتیں نظر آتی ہیں یہ صورتیں زیادہ تر وہی ہوتی ہیں جو عادی و مانوس ہوتی ہیں پھر حس مشترک ان کا حواس ظاہرہ کے مطابق ادراک کرلیتی ہیں۔(مقدمہ ص:۳۰۹ مترجم حصہ اول)

مگر صوفیاء اور فقہاء فرماتے ہیں کہ خواب ایک حقیقت ہے پس خواب تین طرح کا ہوتا ہے:

(۱) شیطانی وسوسہ (۲) خیالی (۳) الہامی خواب جو یہاں مراد ہے۔

قولہ:"اصدقهم رؤيا الخ" اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب درحقیقت ایک خیال ہوتا ہے لہٰذا جس کے مزاج میں دروغ گوئی نہیں ہوگی تو اس کی سوچ بھی اچھی اور حقیقت پر مبنی ہوگی اس لئے خواب سچے ہوں گے۔

قولہ:"رؤيا المسلم جزء من الخ" بعض شارحین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت چالیس سال پر مل گئی تھی جبکہ وحی کے آغاز سے چھ ماہ قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا مگر ابن خلدون نے اس توجیہ کو سختی سے رد کر کے اپنی توجیہ اس طرح کی ہے کہ:''انبیائے کرام کو مدارکِ بدنیہ سے مجرد ہو کر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ تر خواب کے علم سے مشابہ ہے اگرچہ نیند کی حالت، حالتِ وحی سے بہت پست ہے عام خواب اور وحی کے مراتب میں زمین وآسمان کا فرق ہے اسی مشابہت کی وجہ سے شارع علیہ السلام نے خواب کو نبوت کا ۴۶واں یا ۴۳واں یا ۷۰ ستر واں حصہ فرمایا ہے مقصد عدد نہیں بلکہ خواب ونبوت (میں مشابہت کے بعد دونوں) کے مرتبوں میں کثرت فرق کا اظہار مقصود ہے، کیونکہ عرب لفظ سبعین اظہار کثرت کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں۔ (مقدمہ حصہ اول ص:۳۰۷ نفیس اکیڈمی)

اس حدیث سے قادیانیوں کا استدلال:۔ قادیانی اس حدیث سے استدلال کی کوشش کر کے کہتے ہیں کہ جب نبوت کا جزء باقی ہے تو پھر مطلب یہ ہوا کہ نبوت بھی باقی ہے کیونکہ جزء من حیث الجزء بغیر کل کے موجود نہیں ہوسکتا، مگر یہ استدلال انتہائی کمزور بنیاد پر قائم ہے کہ اولاً تو جیسا کہ اوپر محقق عبدالرحمٰن بن خلدون کی عبارت میں تصریح کی گئی ہے کہ یہاں تشبیہ دے کر دونوں میں تباعد وتفارق بتلانا مقصود ہے نہ کہ جزئیت وکلیت۔ دوم جزء کے اندر حیثیت کو ملحوظ رکھنا ایک سنگین غلطی ہے، جیسا کہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے شرح عقائد میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے جو"**وهی لا هو ولا غيره**" کے تحت دیکھی جاسکتی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اگر اس قسم کی قیودات صحیح مانی جائیں تو پھر باپ من حیث الباپ بغیر بیٹے کے اور تمام متضائفین ایک دوسرے کے بغیر نہیں پائے جاسکیں گے بلکہ دو متغائر چیزیں بھی پھر ساتھ ساتھ رہیں گی جبکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

قولہ:"وليتفل الخ" پریشان کن خواب دیکھنے کے بعد جب آدمی نیند سے بیدار ہو جائے تو فوراً تعوذ کر کے بائیں جانب تھوکے کیونکہ شیطان بائیں جانب سے آکر وسوسہ ڈالتا ہے نیز جیسے دم کرنے والا تھوکتا ہے اسی طرح تعوذ کی صورت میں بھی تھوکنا چاہئے اور دل میں یہ خیال لائے کہ اس نے گویا شیطان کے منہ پر تھوکا، اس سے دفع وساوس میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے اور لوگوں سے اس کا تذکرہ نہ کرے کیونکہ جب لوگ اس کا آپس میں تذکرہ کریں گے تو اس سے وسوسے دوبارہ لوٹ آئیں گے بعض علماء فرماتے ہیں کہ کچھ صدقہ بھی

دے دے اور جتنا دے گا اُتنا ہی اس کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ واللہ اعلم اس کے لئے آگے مستقل باب آ رہا ہے۔ **فلینتظرہ**

قولہ: "واُحِبّ القید الخ" عارضہ میں ہے کہ یہ جملہ آخر تک مدرج من الراوی ہے یہ مرفوع حدیث کا حصہ نہیں ہے، بحوالہ خطیب ابوبکر فی کتاب الفصل بہر حال اس کو مرفوع مانیں تو مطلب یہ ہے کہ مقید آدمی چلنے سے قاصر ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی جگہ مقیم رہتا ہے جبکہ اغلال یعنی طوق تو اس کا تذکرہ قرآن میں جہنمیوں کی مذموم حالت کے بیان کے طور پر کیا گیا ہے۔

باب ذهبت النبوة وبقيت المبشرات

(نبوت اختتام پذیر ہوئی جبکہ مبشرات باقی ہیں)

"مختاربن فلفل نا انس بن مالک قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الرسالة والنبوة قدانقطعت فلارسول بعدى ولانبىّ قال: فَشَقَّ ذالک على الناس، فقال: "لكن المبشرات" فقالوايارسول الله!وماالمبشرات؟قال: رؤياالمسلم وهى جزء من اجزاء النبوة". (صحيح غريب)

مختار بن فلفل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک رسالت و نبوت یقیناً ختم ہوگئی پس نہ کوئی رسول آئے گا میرے بعد اور نہ ہی نبی، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو یہ بات گراں معلوم ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مگر مبشرات (خوشخبریاں) باقی رہیں گی، صحابہ کرامؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! مبشرات کیا ہیں؟؟ فرمایا مسلمان کا خواب، جبکہ وہ اجزائے نبوت کا ایک جزء ہے (یعنی مشابہ بجز ہے)۔

تشریح: ۔ مبشرات کی تفسیر خود ہی حدیث میں کی گئی ہے یعنی ایسے خواب جن سے بشارت معلوم ہو یہ صیغہ اسم فاعل بکسر الشین المشددہ ہے، چونکہ پہلے ارشاد سے صحابہ کرامؓ پر غم کا اثر ہوا کہ آپ علیہ السلام کے بعد جب نبوت کا دروازہ بند ہونے کی بناء پر کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا تو بھلے بُرے افعال کے بارے میں کوئی بشارت یا تنذیر بھی نہ رہے گی اس طرح تو لوگ جلد ہی راہِ مستقیم سے ہٹ سکتے ہیں کہ ان کا رابطہ عالم بالا سے مکمل منقطع ہوگا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ مبشرات باقی رہیں گی جو نیک آدمی کے لئے خوشخبری

لائیں گی اور بدعمل کرنے والے کے لئے تنبیہ ہوگی، پھر یہ کیفیت اگر بیداری کی حالت میں ہوتو اس کو الہام کہتے ہیں خواب اور الہام دونوں باقی ہیں مگر انبیاء کے علاوہ کسی اور کا خواب یا الہام شرعی حجت ودلیل نہیں گو اس سے تسلی مل سکتی ہے مگر جہاں کوئی اشارہ شریعت کے خلاف محسوس ہوگا تو اس پر عمل درآمد جائز نہیں، پھر خواب اگر عالم بالا میں دوری پر دیکھا جائے تو اس کی تعبیر آنے میں سالہا سال لگتے ہیں جبکہ قریب سے دیکھنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

دوسری حدیث میں ایک مصری شخص نے ابودرداء رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا "لهم البشرىٰ في الحياة الدنيا" تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا ہے تو سوائے تیرے اور ایک شخص کے کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھا ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب سے یہ آیت نازل ہوئی تیرے (ابودرداء کے) سوا کسی نے مجھ سے اس کے متعلق نہیں پوچھا ہے، یہ اچھے (سچے) خواب مراد ہیں جو کوئی مسلمان دیکھے یا اس کے لئے دیکھا جائے۔

اس روایت میں مصری شخص مجہول ہے اس کے باوجود امام ترمذیؒ نے اس کو حسن کہا ہے یہ شاید دیگر شواہد کے پیش نظر ہو۔ یہاں بھی اوپر حدیث کے ضمن میں جو بات کی گئی ہے اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے یعنی زندگانی دنیا میں اہل ایمان کے لئے خوشخبری بذریعۂ خواب ہو یا بذریعۂ الہام ہو، تاہم آیت کا مفہوم کافی عام ہے لہٰذا بشارت کی اور بھی صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً لوگوں میں مقبولیت، نیک اعمال سے شرح صدر اور مزید اعمال میں دلچسپی میں اضافہ اور موت کے وقت فرشتوں کی طرف سے نیک سلوک اور خوشخبری وغیرہ وغیرہ۔

قولہ: "اصدق الرؤيا بالاسحار" زیادہ سچا خواب وہ ہے جو سحر (طلوع فجر) کے وقت دیکھا جائے، اسحار جمع ہے سَحَر کی اگر رات کے چھ حصے بنا دیئے جائیں تو آخری چھٹے حصہ کو سحر کہتے ہیں اس وقت کے خواب کا زیادہ سچا ہونا دو باتوں پر مبنی ہے ایک یہ کہ یہ نزول رحمت کا وقت ہوتا ہے دوم یہ کہ دماغ اور قلب معدے کے بخارات سے خالی ہوتے ہیں چونکہ رات کے پہلے اور دوسرے وغیرہ پہروں اور حصوں میں قلب ودماغ حدیث النفس اور خیالات میں مبتلاء ہوتے ہیں اس لئے وہ خواب زیادہ معتبر نہیں کہ ان میں زیادہ احتمال خیال کا ہے جبکہ آخری حصہ میں دل ودماغ مکمل راحت حاصل کر چکے ہوتے ہیں اس لئے ان کا تعلق عالم بالا سے قوی تر ہو جاتا ہے اس لئے اس گھڑی کے خواب عموماً سچے اور الہامی ہوتے ہیں۔

باب ماجاء فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

"من رانی فی المنام فقدرانی"

جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھ لیا تحقیق اس نے مجھ کو ہی دیکھا

"عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رانی فی المنام فقدرانی فان الشیطان لایتمثّلُ بی". (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھ لیا پس تحقیق اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میرا روپ نہیں دھار سکتا۔

تشریح: اس حدیث میں "من رانی فی المنام فقدرانی" شرط اور جزاء دونوں متحد ہیں جو مبالغہ کے لئے ہیں یعنی اس نے حقیقت میں مجھ ہی کو دیکھ لیا کیونکہ "فان الشیطان لایتمثل بی" یعنی شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مظہرِ ہدایت ہیں اور شیطان مظہرِ ضلالت، اور دونوں میں تناقض ہے۔ عارضہ میں ہے کہ اس حدیث کے چار الفاظ ہیں: (۱) ایک جو یہاں حدیث میں ہے (۲) دوم "من رانی فقد رأی الحق" (۳) سوم "فسیرانی فی الیقظة (۴) چہارم "لکأنمارانی فی الیقظة"۔ پس اول کی وجہ تو گذر گئی جبکہ دوم میں شیطانی خیال وصورت کی نفی مراد ہے جبکہ سوم میں یہ بھی احتمال ہے کہ اسے اپنے خواب کی تفسیر وتاویل معلوم ہو جائے گی اور چہارم میں تشبیہ ہے یعنی اگر وہ مجھے بیداری کی حالت میں دیکھتا تو یقیناً وہ دیکھنا حق یعنی حقیقت پر مبنی ہوتا تو اسی طرح خواب کا دیکھنا بھی ایک حقیقت ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے "الحاوی" میں مضارع کا صیغہ نقل کر کے لکھا ہے کہ جس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ لیا اسے چاہئے کہ اپنے باطن کی صفائی پر توجہ دے کیونکہ وہ یقظہ میں آپ علیہ السلام کی زیارت کرے گا جیسے فرشتوں کا دیکھنا تصفیہ قلب کے بعد ہوسکتا ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بھی ہوسکتا ہے پھر جمہور کے نزدیک آپ علیہ السلام کا حلیہ مبارک آخری عمر کے مطابق ہو یا کہولت اور جوانی کا سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار میں برابر ہیں۔ البتہ اگر کسی شخص نے آپ علیہ السلام کو خواب میں کسی ایسی حالت میں دیکھا جو آپ علیہ السلام کے ساتھ مناسب یا منطبق نہیں تو وہ بھی آپ علیہ السلام کی رؤیت میں آتا ہے البتہ وہ دیکھنے والے کی حالت کا عکاس خواب شمار ہوگا غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

میں تبدیلی نہیں آتی مگر صفات میں دیکھنے والے کی حالت کے مطابق تبدیلی آسکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور آئینے کی مانند ہے جس میں دیکھنے والے کو اپنی حالت نظر آتی ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والے کی حالت عینک کی طرح ہے عینک جس رنگ کے شیشے کی ہوگی تو منظر اسی رنگ میں نظر آتا ہے، مثلاً انگریزی لباس والا شخص اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوٹ پتلون میں ملبوس دیکھے گا تو اس سے رائی کی حالت مراد ہوگی، چنانچہ محمد ابن سیرین رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص نے آکر کہا کہ اس نے آپ علیہ السلام کو لیٹے ہوئے حالتِ وفات میں دیکھا ہے تو ابن سیرینؒ نے تعبیر دی کہ تم مسجد میں جا کر خلافِ سنت کرتے ہو اس سے اماتۃِ سنت مراد ہے، غرض ذات میں تمثل نہیں ہوسکتا مگر صفات میں ہوسکتا ہے اسی طرح اگر خواب میں آپ علیہ السلام کا ارشاد سنے تو اگر وہ ظاہر احادیث وشریعت کے منافی ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہاں البتہ اگر وہ موافق ہو تو اس پر عمل جائز ہے واجب پھر بھی نہیں۔

یہ حدیث شمائل ترمذی میں بھی آئی ہے وہاں حضرت مدنی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمہما اللہ نے بڑی نفیس بحثیں فرمائی ہیں جو دیکھنے کے قابل ہیں۔ شیخ الحدیثؒ نے اس کی ایک مثال دی ہے کہ جیسے کوئی شخص آڑ میں بیٹھ کر اپنے سامنے ذرا فاصلے پر ایک بڑا آئینہ رکھ لے اور دوسرا شخص اس آئینہ کو دیکھے تو اس میں بیٹھنے والے شخص کی مثال یعنی عکس نظر آتا ہے، اس سے یہ اشکال بھی دور ہوا کہ بیک وقت مختلف خطوں میں آپ کی زیارت کیونکر ہوسکتی ہے؟ جواب آسان ہے کہ عالم مثال ایک بڑے آئینے کی طرح اسکرین ہے اس کو ہر جگہ سے دیکھا جاسکتا ہے جیسے آفتاب وماہتاب، تاہم صوفیاء اس کو حقیقت اور اصل رؤیت پر محمول کرتے ہیں یہ بحث کافی مشکل ہے، جس کو عالم مثال سمجھنا ہو تو وہ حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ ضرور کرے۔

باب ماجاء اذا رأى فی المنام مایکره مایصنع؟

خوفناک خواب دیکھ کر کیا کرنا چاہئے؟

عن ابی قتادة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال: الرؤیا من الله والحُلُمُ من الشیطان فاذا رای احدکم شیئایکرهُه فلینفث عن یساره ثلث مرات ولیستعذ بالله من شرها فانها لاتضره". (حسن صحیح)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: سچا خواب

اللہ کی طرف سے (الہام) ہوتا ہے اور بُرا خواب شیطان کی جانب سے (وسوسہ) ہوتا ہے پس اگر تم میں سے کوئی ایک ایسا خواب دیکھے جو اسے ناگوار گذرے تو (اٹھتے ہی) بائیں جانب تین بار تھوک دے اور چاہئے کہ اس کے مضر اثر سے اللہ کی پناہ مانگے کیونکہ (ایسا کرنے سے) وہ اس کو نقصان نہیں دے گا۔

لغات:۔قولہ: "الحُلُم" بضم الحاء واللام، لام کو ساکن بھی پڑھا جاسکتا ہے لغت میں مطلق خواب کو کہتے ہیں مگر عرف میں رؤیا کا اطلاق اچھے خواب پر ہوتا ہے اور حلم کا پراگندہ اور پریشان کن پر۔

قولہ: "فلینفث" بعض روایات میں "فلیبصق" ہے اور بعض میں "فلیتفل" ہے تینوں کے معنی تھوکنے کے ہیں، مگر نفث میں لعاب زیادہ نہیں ہوتا ہے۔

تشریح:۔ اصالتاً تو خواب تین طرح کے ہوتے ہیں: (۱) پراگندہ خیالات جو عموماً معدے کی تبخیر اور دماغی خشکی یا طبعیت کی ناسازی کے وقت ہوتے ہیں (۲) شیطانی تخیلات (۳) جو فرشتہ اللہ کے حکم سے کسی مؤمن کے دل ودماغ میں القاء کرے۔ پہلی دونوں قسموں کو شیطانی قرار دے کر دو ہی اقسام بنادی گئیں پھر اللہ کی طرف نسبت تشریف کی بناء پر اور شیطان کی جانب سوء ادب سے بچنے کے لئے ہے جیسا کہ عام ضابطہ ہے کہ اچھی چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف مستحب ہے اور بُری اشیاء کی شیطان کی طرف، ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پریشان کن خواب از قبیل انذار کے سچا ہو جو من جانب اللہ ہوتا ہے اور وہی ہر چیز کا خالق ہے۔

بہر حال حدیث کے بموجب اچھے خواب پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور پریشان کن خواب دیکھنے کے بعد جب آنکھیں کھل جائیں تو فوراً بائیں کندھے کی طرف تین مرتبہ تھوکے کیونکہ شیطان اسی جانب آکر وسوسہ ڈالتا ہے اور تھوکنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آدمی زیادہ لعاب تھوکے جیسا کہ لغات میں بتایا جاچکا ہے کہ لفظ "فلینفث" میں اسی طرف اشارہ ہے کیونکہ نفث بمعنی نفخ کے آتا ہے جس کے معنی سانس کے آتے ہیں لہٰذا تھوکتے وقت تھوک کے معمولی ذرات بھی اس مقصد کے لئے کفایت کرتے ہیں، اس سے بھی شیطان مردود رسوا ہوتا ہے اس کے ساتھ "اعوذ باللہ من الشیطان .... اعوذ باللہ من شرھا" بھی پڑھ لے، اور جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ کروٹ بھی تبدیل کرے بلکہ اگر ہوسکے تو اٹھ کر نماز پڑھ لے اور کچھ صدقہ بھی دے دے لوگوں سے اس خواب کا تذکرہ نہ کرے، اس طرح وہ ان شاء اللہ اس خواب کے ضرر سے بچ جائے گا خصوصاً جب وہ خیالی یا شیطانی خواب ہوگا ہاں اگر من جانب اللہ سچا خواب ہو اور اس کا ہونا مقدر ہو، تو وہ لامحالہ ہو کر رہے گا۔

غرض اس عمل سے ایک طرف تسلی ہوگی جو علاج کا ایک طریقہ ہے اور دوسری جانب یہ اس خواب کے نقصان کو روکنے کا ایک ذریعہ ہے جیسے دعاء ہوتی ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی تعبیر الرؤیا

خواب کی تعبیر کا بیان

تعبیر عبور سے بمعنی انتقال کے ہے خیالی صورت کے جسمانی صورت سے بیان کرنے کو تعبیر کہتے ہیں۔

"رؤیا المؤمن جزء من اربعین جزءً من النبوة وهي على رِجل طائر مالم يتحدث بها فاذا تحدث بها سقطت قال واحسبه؟ قال (ﷺ) : ولا تُحدث بها الا لبيباً او حبيباً". (حسن صحيح)

مؤمن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور وہ پرندے کے پیر پر ہوتا ہے جب تک اس کو بیان نہ کر دیا جائے پس جب بیان کر دیا جاتا ہے تو وہ ساقط (یعنی واقع) ہو جاتا ہے راوی نے کہا میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوائے ہوشیار اور غم خوار (دوست) کے اور کسی کو نہ بتایا جائے۔

تشریح: حدیث کا پہلا حصہ اس بحث کی پہلی حدیث میں گذرا ہے۔ **قولہ: "علی رِجل طائر"** حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے الکوکب میں فرمایا ہے کہ یہ بے قراری سے کنایہ ہے جو خواب دیکھنے والے کے دل میں تعبیر کے حوالے سے ہوتی ہے اس کا ذھن کبھی ایک تعبیر کی طرف جاتا ہے اور کبھی دوسری کی جانب مگر جب وہ کسی معبر سے بیان کرتا ہے تو دل کو ایک تعبیر پر قرار حاصل ہوتا ہے تو جس طرح پرندہ کے پیر پر رکھی ہوئی چیز غیر مستقل اور متزلزل ہوتی ہے مگر جب گر جاتی ہے تو ساکن ہو جاتی ہے اسی طرح حال خواب کا ہے تعبیر سے قبل کچا اور بعد میں پکا ہو جاتا ہے۔

عام شارحین کی شرح ذرا مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کی تعبیر محتمل ہوتی ہے مگر جب تعبیر نکالی جاتی ہے تو وہی متعین ہو جاتی ہے وفیہ مافیہ۔ حاشیہ قوت میں ایک اور مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ طائر سے مراد تقدیر ہے کیونکہ جو چیز کسی کے لئے مقرر و مختص کی جاتی ہے اسے طائر کہا جاتا ہے پس مطلب یہ ہوگا کہ خواب خیر و شر کے مابین کشمکش میں ہوتا ہے پس اس کلام میں تشبیہ ہے خواب کی پرندے کے پیر پر موجود چیز کے ساتھ لہٰذا اس کی تعبیر کے لئے ہوشیار اور غمخوار شخص کا انتخاب کرنا چاہئے تا کہ وہ اچھی تعبیر نکالے اور اگر تعبیر اچھی نہ ہو وہ خاموش رہے گا۔

صوفیاء اور فلاسفہ کہتے ہیں کہ جب اس عالم ناسوتی میں کوئی واقعہ رونما ہونے والا ہوتو پہلے عالم مثال میں اس کی صورت منقش ہو جاتی ہے، خواب دیکھنے والا (یعنی تیسری قسم، خواب میں) وہی نقشہ دیکھتا ہے مگر کبھی وہ صاف ہوتا ہے اور کبھی مدہم جس کو تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے ہوشیار آدمی ہوگا یعنی عالم مثال کی چیز کو سمجھنے والا ہوگا تو وہ تعبیر بتلا سکے گا ناواقف کو اس سے کیا واسطہ؟ پھر ماہر شخص وہ ہے جسے اللہ کی معرفت اور عالم مثال سے اُنس ہو جو عام طور پر لدنی علم ہوتا ہے اگرچہ کسب کے ذریعہ بھی آدمی اس کے قریب پہنچ سکتا ہے، مشہور یہ ہے کہ خواب تعبیر کے تابع رہتا ہے مگر یہ تاثر صحیح نہیں۔

باب

" الرؤیا ثلٰثٌ فرؤیا حق ورؤیا یُحدِّث الرجل بها نفسه ورؤیا تحزین من الشیطان فمن رای مایکره فلیقم فلیصل و کان یقول یعجبنی القید واکره الغل القید ثبات فی الدین و کان یقول من رانی فانی انا هو فانه لیس للشیطان ان یتمثّل بی و کان یقول لاتقص الرؤیا الاعلی عالم او ناصح". (حسن صحیح)

حدیث کے تمام حصے گذشتہ ابواب میں مع تشریح گذر گئے ہیں۔

یہاں صرف ترجمہ پیش ہے۔ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں سچا خواب اور وہ خواب جو آدمی اپنے دل میں سوچتا ہے (یعنی سوچ کا اثر) اور ایک خواب شیطان کی طرف سے پریشان کرنے والا ہوتا ہے، پس جو شخص ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اٹھ کر نماز پڑھ لے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے بیڑی پسند ہے اور طوق کو ناپسند کرتا ہوں، بیڑی سے مراد دین پر استقامت ہے اور فرماتے ہیں کہ جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو وہ میں ہی ہوں گا کیونکہ شیطان کے لئے روا نہیں کہ وہ میرا حلیہ اختیار کرے، اور فرماتے خواب سوائے عالم یا خیرخواہ کے کسی سے بیان نہ کیا جائے۔

باب ماجاء فی الذی یکذب فی حلمه

(اس شخص کے بارے میں جو جھوٹا خواب بیان کرتا ہے)

"من کذب فی حُلمه کُلِّفَ یوم القیٰمة عقد شعیرة".

ابوعبدالرحمٰن راوی کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے اس حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع نقل کیا ہے کہ جس شخص نے بیانِ خواب میں جھوٹ بولا اس کو قیامت کے دن "جَو" کی گرہ بندی پر مجبور کیا جائے گا۔

اگلی سند کے ساتھ یہ حدیث مرفوع ہی ہے جبکہ تیسری سند میں یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں ہے کہ جھوٹا خواب بیان کرنے والے کو قیامت کے دن دو "جَو" میں گرہ لگانے کا مکلف بنادیا جائے گا جبکہ وہ ان میں گرہ کبھی بھی نہیں لگا سکے گا۔

تشریح:۔ قولہ: "من كذب في حلمه" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس نے خواب تو دیکھا ہے مگر اس میں اپنی طرف سے اضافہ بھی ملاتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ پورا خواب ہی جھوٹا ہو جیسا کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے "من تحلّم كاذباً" کیونکہ تحلم باب تفعُّل سے بمعنی تکلف کرنے اور گھڑنے کے ہے، چونکہ اس شخص نے الہام کا جھوٹا دعویٰ کیا ہے اس لئے اس نے گویا اللہ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ الہام تو من جانب اللہ ہوتا ہے، اس بناء پر اس کی سزا دو جو میں گرہ بندی مقرر کردی گئی ہے یعنی ایسا عمل جس کے اجزاء میں کوئی جوڑ نہیں بن سکتا ہے چونکہ یہ آدمی جھوٹا ہے اور الہام تو صادقین اور سچے لوگوں کو ہی ہوتا ہے کہ مشابہ جزء نبوت ہے تو جھوٹے کو الہام سے کیا مناسبت ہے اسی طرح دو جو میں گرہ بندی کا کوئی امکان نہیں کہ گرہ بندی کے لئے کچھ طول درکار ہوتا ہے جو ان میں نہیں اس لئے وہ یہ سزا کاٹتا رہے گا اور یہ اس کے جھوٹا ہونے کی نشانی بھی ہوگی جو اہل محشر کو نظر آئے گی۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ ہم لفظ شعیرۃ کو شعیرتین پر محمول بھی کرسکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب پورا خواب جھوٹا ہو تو اس کو ایک جو دیا جائے اور جب اس میں جھوٹ ملائے تو اسے دو جو دیئے جائیں گویا یہ عذاب اپنے عمل کے ساتھ لفظی مناسبت کی بناء پر ہے کہ اس نے بلاشعور الہام کا دعویٰ کیا تو اسے شعیرۃ برائے گرہ دے دیا گیا۔ (تدبر)

پھر مُکلّف سے تکلیف شرعی مراد نہیں بلکہ سزا مراد ہے لہٰذا یہاں سے تکلیف بمالایطاق کی بحث نہیں نکلتی۔ ابن العربیؒ ان احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں "ذكرهما ابو عيسىٰ وغيره، وهو صحيح كله"۔

قولہ: "وهذا اصح من الحديث الاول" اگرچہ پہلی سند کے رجال بھی ثقات ہیں مگر ابواحمد الزبیری، سفیان ثوریؒ کی روایات میں کبھی کبھی غلطی کرتے ہیں۔ (کذا فی التحفہ عن التقریب)

باب

"عن ابن عمر قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: بینما انا نائم اِذْ اُتِیتُ بقدح لبنٍ فشربتُ منہ، ثم اعطیتُ فضلی عمر بن الخطاب قالوا فما اوّلتہ یا رسول اللّٰہ؟ قال "العلم". (صحیح)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ دریں اثنا جبکہ میں سویا تھا مجھے دودھ کا پیالہ دیا گیا پس میں نے اس سے پیا پھر اپنا بچا ہوا میں نے عمر بن خطابؓ کو دیا، صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کی کیا تعبیر نکالی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم۔

تشریح:۔ خواب کا تعلق چونکہ عالم مثال سے ہے جہاں اشیاء دنیا میں رونما ہونے سے پہلے ہی متشکل ہو جاتی ہیں تاہم دونوں حالتوں میں مناسبت ضروری ہوتی ہے یعنی امر دنیوی اور امر مثالی میں، مثلاً کوئی خواب میں انسان کی گندگی دیکھے تو اسے مال ملے گا، دنیا کی محبت اور انہماک سے عالم برزخ میں سانپ بن کر مسلط کر دیا جاتا ہے کیونکہ جس طرح دنیا بظاہر خوشنما اور پیاری مگر درحقیقت زہر سے بھری ہوئی ہے سپیرا اس سے کھیل سکتا ہے مگر ناواقف اس کے زہر سے ہلاک ہوتا ہے اسی طرح سانپ بھی بظاہر رنگ برنگی لکیروں اور نرم وملائم کھال کی وجہ سے بہت خوبصورت لگتا ہے مگر سپیرا کے علاوہ جو شخص اس سے کھیلتا ہے تو سانپ اسے ڈھنتا ہے، غرض بظاہر خوبصورت منظر اور اندر سے سب زہر ہی زہر ہوتا ہے، وعلی ھذ القیاس۔

شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ کے "باب ذکر عالم المثال" میں لکھتے ہیں:

"تَتَمَثَّلُ فیہ المعانی باجسام مناسبۃ لھافی الصفۃ وتتحقق ھناک الاشیاء قبل وجودھا فی الارض نحوا من التحقق".

یعنی اس عالم مثال میں معانی ایسے جسموں کے ساتھ پائے جاتے ہیں جو ان معانی کی حالت کے ساتھ مناسبت رکھنے والے ہوں اور زمین میں رونما ہونے سے پہلے وہاں چیزیں پائی جاتی ہیں وجود کی مخصوص نوعیت کے ساتھ۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کی تعبیر علم سے فرمادی کیونکہ جس طرح دودھ ایک فطری غذا ہے اسی طرح علم بھی ہے خصوصاً ابتداء خلق میں بچے کی تغذی کا دارومدار دودھ ہی پر ہوتا ہے تاہم دودھ جسمانی غذا ہے اور علم روحانی مگر یہ بات ذھن میں رہے کہ دونوں میں ایک نوع تلازم بھی پایا جاتا ہے۔ (تدبر)

(۲) دودھ مصلح جسم ہے بلکہ اطباء کہتے ہیں کہ دودھ ہر دوا کا بھی مصلح ہے اسی طرح علم بھی مصلح ہے، دودھ سے جسمانی جراثیم مرجاتے ہیں اور علم سے روحانی اور جسمانی دونوں، یعنی شک وجہل اور گندگیوں کے جراثیم۔

(۳) جس طرح انتہائی پاکیزہ دودھ گندگیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا نکلتا ہے اسی طرح علم کی روشنی اندھیروں کو چیرتی ہوئی اُجالا کر دیتی ہے یعنی شک اور جہل کی تاریکیوں سے نکل کر معرفت کا سبب بنتی ہے۔ قالہ ابن العربی فی العارضۃ۔

بظاہر یہاں یہ اشکال سا وارد ہوتا ہے کہ حدیث باب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی علمی فضیلت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ثابت ہو رہی ہے حالانکہ دیگر نصوص سے واضح طور پر صدیق اکبرؓ کی افضلیت محقق ہوتی ہے چنانچہ عقائد نسفی میں ہے: "وافضل البشر بعد نبینا ابو بکر الصدیقؓ ثم عمر الفاروقؓ الخ" اور یہ افضلیت علم وغیرہ سب صفات میں مراد ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ یہاں پر اضافت مراد نہیں ہے کہ ابوبکرؓ کو چھوڑ کر ان کو دیا بلکہ حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے اس لئے ان کو دیا جبکہ ابوبکرؓ وہاں پر موجود نہ تھے، یا اس علم سے مراد علم السیاست ہے یا پھر جزوی افضلیت مراد ہے یعنی الہامی جو کلی افضلیت کو مستلزم نہیں چنانچہ الہامات کے حوالے سے حضرت عمرؓ کے موافقات وحی تقریباً اکیس تک ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ کسی کو الہام ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسروں سے الہام کی بناء پر افضل ہی ہو کیونکہ کبھی اس کے مقابلہ میں ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو یقین وتصدیق اور محبت ومعرفت کے اس مقام ودرجہ پر فائز ہوتا ہے جہاں اس کو الہام وکشف کی ضرورت ہی نہیں رہتی اس لئے سابقہ امم میں مُلہم لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اس آخری توجیہ کو عام علماء شاید نہ سمجھ سکیں اہل تصوف واہل عرفان کے ہاں یہ مسلم ہے، جس کو معلوم کرنا ہو تو وہ صوفیہ اور خصوصاً حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی متعلقہ کتب کا مطالعہ کریں جو اس علم کے مجدد ہیں۔

قولہ: "العلم" منصوب ہے کہ فعل مقدر کا مفعول ہے ای اَوّلتُہ العلم۔

باب

"بینا انا نائم رأیت الناس یُعرضون علیّ وعلیهم قُمُصٌ منها ما یبلغ الثُدِیَّ ومنها ما یبلغ اسفل من ذالک قال فعُرِضَ علیَّ عمر وعلیه قمیص یَجُرُّہ قالوا فما اوّلته یا رسول اللّٰہ؟ قال الدینَ". (واخرجه احمد فی مسنده)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دریں اثناء کہ جب میں سویا تھا خواب دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کئے جارہے ہیں اور ان (کے بدنوں) پر قمیص ہیں ان میں سے بعض قمیص سینوں تک ہیں اور بعض اس سے نیچے تک (لمبی) ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس عمر میرے سامنے پیش کئے گئے جبکہ ان کی قمیص اتنی (لمبی) تھی کہ وہ اسے گھسیٹ رہے تھے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کی کیا تعبیر نکالی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دین" حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔

تشریح:۔ قولہ: "قمص" بضمتین بروزن کتب قمیص کی جمع ہے۔ **قولہ:** "الثدی" بضم الثاء وکسر الدال وتشدید الیاء ثُدِیّ، ثدی بفتح الثاء وسکون الدال کی جمع بمعنی پستان کے ہے ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قمیصوں کا سینے تک ہونا اشارہ ہے کہ دلوں کو کفر سے محفوظ کئے ہوئے تھیں، اور جو مزید نیچے تھیں انہوں نے شرمگاہوں کو بھی محفوظ کرلیا تھا جبکہ پیروں تک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی بھی گناہ کے راستے پر چلنے سے روکے ہوئے تھیں جبکہ گھسیٹنے والے حضرت عمرؓ ہر قسم کے تقویٰ میں مستور ومحفوظ اور ملبوس تھے، یہ تشریح اس روایت کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے جس میں گھٹنوں اور ساقین کا ذکر ہے۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں ایک اور لطیف وجہ کی تصریح کی ہے کہ جَر یعنی گھسیٹنے سے مراد اچھے اثرات کی بقاء ہے یعنی حضرت عمرؓ نے ایسے کارنامہائے خیر کی بنیادیں ڈالی ہیں جن پر اہل اسلام چل رہے ہیں اور وہ آثار آج تک باقی ہیں۔

یہاں بھی افضلیت عمر علی الصدیق والا اعتراض ہوسکتا ہے جیسا کہ سابقہ باب میں گذرا ہے، مگر حل بھی وہی ہے جو وہاں بیان ہوا یعنی یا تو یہ حضرت عمرؓ کی خلافت طولیٰ کی طرف اشارہ ہے جس میں ان کو تاسیس قواعد واجتماعات منعقد کرنے کا موقعہ میسر ہوا اور دینِ اسلام اپنے پھیلاؤ کی وجہ سے عروج کو پہنچا جو امت کے تمام ادوار سے مضبوط ترین دور ہے یعنی مابعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادوار میں سے، لہٰذا یہ فضیلت جزوی ہوگئی جبکہ

ابوبکرؓ کے فضائل دیگر اعتبارات سے بہت زیادہ ہیں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابوبکرؓ ان پیش کئے جانے والوں میں موجود نہ ہوں کہ ان کو پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی یا وہ بھی موجود ہوں اور ان کا کرتہ بھی حضرت عمرؓ جتنا یا اس سے زیادہ لمبا ہو جیسا کہ حاشیہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

باب ماجاء فی رؤیاالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المیزان والدلو

ترازو اور ڈول کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب (اور تعبیر)

"عن ابی بکرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ذات یوم :من رای منکم رؤیا؟ فقال رجل انا رأیت ، کَاَنّ میزانا نَزَلَ من السماء فَوُزِنتَ اَنتَ وابوبکر فرجحتَ انت بابی بکر، وَوُزِنَ ابوبکر وعمر فَرَجَحَ ابوبکر ووُزِنَ عمر وعثمان فَرَجَحَ عمر ثم رفع المیزان فرأینا الکراھیۃ فی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم". (حسن صحیح)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن پوچھا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ تو ایک شخص نے کہا میں نے دیکھا ہے، میں نے دیکھا جیسا ایک ترازو ہے وہ آسمان سے اُتری پس آپ اور ابوبکر دونوں تولے گئے تو آپ ابوبکر پر بھاری رہے اور ابوبکر و عمر تولے گئے تو ابوبکر بھاری ٹھہرے پھر عمر و عثمان تولے گئے تو عمر بھاری ہوئے پھر وہ میزان اٹھالی گئی، پس (یہ سن کر) ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے میں ناگواری کے آثار محسوس کئے۔

تشریح:۔ آگے ترمذی اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ علیہ السلام فجر کی نماز کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھتے کہ تم میں سے کسی نے رات کو کوئی خواب دیکھا ہے؟..... حدیث باب میں اسی طرح ایک دن کا ذکر ہے چونکہ موازنہ ملتی جلتی متقارب اشیاء میں ہوتا ہے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت تک اخیار کی کثرت تھی جن میں مہاجرین وانصار اور بالخصوص السابقون الاولون بھی پائے جاتے تھے جبکہ خلفاء کا مقام ان میں بہت نمایاں تھا اس لئے میزان اتاری گئی تاکہ ان کے مراتب معلوم ہو جائیں جبکہ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں آپ کے فضائل بلاموازنہ نمایاں تھے کہ سابق الایمان تھے۔

عام شارحین حدیث کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس خواب میں اشارہ ہے کہ امن وامان کا بہترین دور شہادت عثمانؓ پر ختم ہونے والا ہے پھر فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں

باہمی لڑائی پورے دور پر محیط رہی اگرچہ یہ ان حضرات کے لئے اُخروی نقصان کی موجب نہ تھی مگر آنے والی امت کے لئے ایک آزمائش تھی۔

بنابر ہر تقدیر آپ علیہ السلام اس خواب سے پریشان نظر آئے پہلی توجیہ کی بناء اس لئے کہ آپ کی خواہش تھی کہ اخیار کا یہ دورانیہ طویل ہوتا تو اچھا ہوتا، جبکہ دوسری توجیہ میں پریشانی کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انحطاط کا خطرہ محسوس ہوا۔

حدیث سے ان تینوں خلفاء کی فضیلت باقی صحابہ پر اور ان کے آپس میں ایک دوسرے پر اسی ترتیب سے ثابت ہوئی اور یہی جمہور کا مذہب ہے جبکہ بعض حضرات حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ سے افضل مانتے ہیں اس مسئلہ کا موضع شرح عقائد ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موازنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی ایسی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے کہ کوئی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتا، ابن العربیؒ نے اس مقام پر بہت تفصیل سے بحث فرمائی ہے جسے درکار ہو وہ عارضۃ الاحوذی میں دیکھے۔

حدیث آخر:۔ دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ورقہ بن نوفل ابن اسد کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرت خدیجہؓ نے ورقہ کی طرف سے کہا کہ انہوں نے تو آپ کی تصدیق کی تھی اور آپ کے اظہارِ نبوت سے قبل ہی فوت ہوگئے ہیں پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ مجھے خواب میں دکھادیئے گئے دراں حالیکہ ان پر سفید لباس تھا اگر وہ دوزخی ہوتے تو ان پر سفید کے علاوہ دوسرے کپڑے ہوتے۔(یعنی سیاہ رنگ کے) یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح:۔ ورقہ بفتحتین ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے زمانہ فترۃ میں نصرانی ہوگئے تھے اور شرک سے بے زار تھے، بخاری شریف کی تیسری حدیث میں ان کا تذکرہ یوں آیا ہے کہ جب آپ علیہ السلام پر پہلی وحی نازل ہوئی اور غار حراء سے گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ آپ علیہ السلام کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں تو ورقہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "ھذا الناموس الذی نزّلَ اللہ علی موسیٰ یالیتنی فیھا جذعا الخ" یعنی یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کرتا تھا، کاش میں اس زمانے (دعوت یا نبوت) میں توانا جوان اور زندہ ہوتا۔ یعنی آپ کی نصرت کرتا

چونکہ پہلی وحی کے بعد کچھ مدت کے لئے وحی بند ہوگئی تھی اور ورقہ کا انتقال بظاہر اسی دوران ہوا تھا اس

لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ علیہ السلام کے باقاعدہ تبلیغ کے آغاز سے قبل ورقہ کا ایمان کیسا تھا اس لئے اس بارے میں علماء کے دواقوال ہیں مگر زیادہ تر محققین ان کی نجاۃ کے قائل ہیں چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بارے میں کوئی وحی جلی نازل نہیں ہوئی تھی اس لئے آپ نے فرمایا کہ ان کے لباس سے وہ جنتی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ سفید لباس طہارتِ قول وعمل پر دلالت کرتا ہے اسی طرح سبز کپڑے بھی جنتی ہونے کی علامت ہیں یہ روایت بظاہر ان کے جنتی ہونے پر صریح ہے مگر یہ عثمان بن عبدالرحمٰن کی وجہ سے کمزور ہے ہاں البتہ دیگر قرائن ان کے نجات یافتہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

حدیث آخر:۔"عن عبداللہ بن عمر عن رؤیا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر و عمر فقال: رأیتُ الناس اجتمعوا فنزع ابوبکر ذَنُوباً اَوذنوبین فیه ضعف واللہ یغفرله ثم قام عمر فنزع فاستحالت غَرباً فلم اَرَعَبقَرِیّاً یَفرِی فَرِیَّه حتی ضرب الناس بالعَطَنِ". (صحیح غریب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ وعمرؓ کے خواب کے بارے میں مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب دیکھا ہے کہ لوگ جمع ہوئے پس ابوبکرؓ نے ایک ڈول یا دو ڈول پانی نکالا اور اس میں ضعف تھا اللہ ان کو معاف فرمائے پھر عمر کھڑے ہوئے پس انہوں نے کھینچا تو وہ ڈول بڑا بن گیا پس میں نے کسی پہلوان کو نہیں دیکھا جوان جیسا کام کرے، یہاں تک کہ جگہ پکڑی لوگوں نے اپنی آرام گاہوں میں (یعنی خوب سیراب ہوگئے)

تشریح:۔ عام نسخوں میں "ابوبکر" مرفوع ہے حالانکہ یہ "النبیؐ" پر عطف کی وجہ سے مجرور ہونا چاہئے، اسی طرح "فقال" بغیر فاء کے اصح ہے یعنی "قال رأیت" الخ۔ قوله: "فنزع ابوبکر ذنوبا او ذنوبین فیه ضعف" ذنوب وہ بڑا ڈول کہلاتا ہے جو بیل کے چمڑے سے بنا ہوا ہو، عام شارحین اس جملے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دو ڈول ان کی خلافت کے دو سال کی طرف اور ضعف فتنۂ ارتداد کی جانب اشارہ کرتا ہے، مگر زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذنوبا او ذنوبین قلت فتوحات اور ضعف میں قلت مدت خلافت کی طرف اشارہ ہے (تدبر) جہاں تک ان کے لئے مغفرت کی دعاء کا تعلق ہے تو یہ کسی تقصیر و کوتاہی سے بخشش کے لئے نہیں بلکہ عارضہ میں ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ ان کو کم مدتِ خلافت پر بھی طویل خلافت کا اجر دے یعنی زیادہ عمل کا جبکہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یغفر اللہ لہ یا لک عام طور پر کلام میں بطور تکیۂ کلام کے مستعمل ہوتا ہے۔

قوله: "فاستحالت غربا" بروزن عبداً وشمساً حاشیۂ قوت میں ہے کہ وہ بڑا ڈول جو بیل کی کھال سے

بنا ہوا ہو ہم نے اوپر ذنوب کی تشریح بھی اسی طرح کی تھی وہ عارضۃ الاحوذی سے لی ہے، بہر حال مراد یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جب پانی نکالنے کے لئے وہ ڈول کھینچا تو وہ بہت بڑے ڈول سے تبدیل ہو گیا جو کہ اشارہ ہے کثرت فتوحات اور مملکت کے پھیلاؤ کی طرف۔

قولہ: "عَبقَرِیًّا" بفتح العین وسکون الباء وفتح القاف وکسر الرّاء وتشدید الیاء توانا وطاقت ور شخص کو کہتے ہیں جبکہ یفری بروزن یرمی اور فریہ بفتح الفاء وکسر الراء وتشدید الیاء ہے فریہ اصل میں کھال بنانے اور درست کرنے کو کہتے ہیں یہاں مراد اصلاح ہے، یعنی جو مثل عمر کے عمل کرے۔ **قولہ:** "عطن" بروزن قمر وہ جگہ جہاں بڑے جانور گھاٹ میں پانی پینے کے بعد آرام کرتے ہیں یعنی حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں لوگ بے فکر ہو کر زندگی بسر کریں گے۔ عارضہ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اور اسی طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت کی طرف اشارہ نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ شر پسندوں کی شرارت سے اخیار کے مراتب میں کسی طرح کمی نہیں آتی کیونکہ اہل عدل کے ساتھ اہل جور کی دشمنی لازمی سی بات ہے۔

حدیث آخر: حضرت ابن عمرؓ سے ایک اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے پراگندہ بالوں والی ایک کالی عورت کو دیکھا وہ مدینہ سے نکل کر مہیعَہ میں قیام پذیر ہو گئی اور وہ (مہیعہ) جُحفہ ہے پس میں نے اس کی تعبیر یہ کر دی کہ مدینہ کی وباء جُحفہ منتقل کر دی جائے گی۔

تشریح: مدینہ کا جاہلی نام یثرب بمعنی ندامت وپچھتاوے کے تھا کیونکہ یہاں کی آب وہوا میں وبائی امراض کا اثر تھا اس لئے جو شخص یہاں باہر سے آتا وہ اپنے آنے پر نادم ہوتا صحابہ کرامؓ نے جب اس کی طرف ہجرت فرمائی تو تقریباً سب بیمار ہو گئے، بخار میں مبتلاء ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی بدولت اللہ نے اس کو طیبہ بنایا اور وہاں کی وباء کو مہیعہ یعنی جُحفہ منتقل فرمایا جو یہود ومشرکین کا علاقہ تھا مہیعَہ میں ہاء ساکن اور باقی مفتوح ہیں جبکہ جُحفہ بروزن غرفۃ مہیعہ کی تفسیر ہے جو بظاہر مدرج من الراوی ہے۔

ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ عورت کی تعبیر میں ہزار احتمالات ودرجات ہیں جبکہ سیاہی مطلقاً مکروہ اور بیاض مطلقاً پسندیدہ ہے الّا یہ کہ ان کے ساتھ کوئی ایسی چیز شامل ہو جائے جو اسے اپنے اطلاق سے خارج کر دے پھر سیاہی میں خیر اور سفیدی میں شر داخل ہو جاتا ہے جبکہ منتشر بال بھی ناگواری کی طرف مشیر ہیں پس مدینہ تو منورہ تھا اس لئے اس میں کسی بکھرے بالوں والی کالی عورت کا نظر آنا وباء ہی ہو گئی کیونکہ ان میں مناسبت نہیں لہٰذا کالے ملکوں میں کالی عورت دیکھنا بُرا نہ ہوگا کہ دونوں میں مناسبت پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کے تمام قطعات پہلے گذرے ہیں اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ سونے کے دو کنگن میرے ہاتھوں میں ہیں چنانچہ ان کی موجودگی نے مجھے پریشان کر دیا پس مجھے وحی کی گئی کہ میں ان کو پھونک دوں چنانچہ میں نے ان کو پھونک دیا تو وہ دونوں اُڑ گئے، تو میں نے اس کی یہ تعبیر نکالی کہ میرے بعد دو جھوٹے (متنبی) نکلیں گے ایک کو مسلمہ کہا جائے گا یمامہ والا اور دوسرا عنسی ہوگا صنعاء (یمن) والا۔

تشریح:۔قولہ: "سوارین" بکسر السین اور ضمہ بھی جائز ہے سوار بروزن کتاب کا تثنیہ ہے بمعنی کنگن کے۔ **قولہ:** "انفخهما" بضم الفاء وسکون الخاء ای ارمهما یعنی کہ میں ان کو پھینک دوں اگر چہ لفظی معنی بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔ **قولہ:** "مسلمہ" بفتح المیم واللام اس کو مسیلمہ (بالتصغیر) بھی کہتے ہیں یمامہ کے حدود اربعہ یہ ہیں مشرق میں عمان اور بحرین، مغرب میں حجاز اور حصہ یمن، جنوب میں احقاف یا الربع الخالی شمال میں نجد۔ (تاریخ ارض القرآن ص:۹۶)

قولہ: "عنسی" بفتح العین وسکون النون کا نام اسود تھا جو صنعاء یمن کا رہنے والا تھا کنگنوں کی اس تعبیر تنبی سے کیا مناسبت ہے؟ تو اس بارے میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ سونا مردوں کے لئے ناقابل استعمال ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ہاتھوں میں دیکھا تو پریشان ہو گئے چونکہ یہ کنگن بے محل دیکھے گئے تھے اس لئے تعبیر جھوٹی نبوت سے کی گئی کیونکہ جھوٹ بھی بے محل ہوتا ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ سارے انبیاء علیہم السلام ایک دوسرے کی تائید اور تحسین کرتے ہیں کنگنوں کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ جن سے ہاتھ خوبصورت اور مالی وسلطانی اعتبار سے طاقت ور بن جاتے ہیں مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آپ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں بن سکتا اس لئے ایسے کنگن سونے کی صورت میں دکھائے گئے جو کہ جھوٹے نبی ہی ہو سکتے ہیں جو بظاہر سلسلہ نبوت کی کڑیاں دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ متنبی یعنی جھوٹے تھے۔

دوسری وجہ ابن العربیؒ نے عارضہ میں بیان فرمائی ہے کہ کنگن ملوک کا زیور ہے اس لئے کفار نے اعتراض کیا تھا "فلولا القی علیه اسورة من ذهب" (سورۂ زخرف آیت:۵۳) یعنی اگر یہ واقعی قیادت کے

مستحق ہیں تو پھران کے ہاتھوں میں کنگن کیوں نہیں ہیں؟ جبکہ 'یدان' یا 'ید' عربی میں کئی معانی کے لئے آتا ہے۔ یہاں بمعنی غلبہ کے ہے یعنی آپ علیہ السلام نے دیکھا کہ کوئی ان کے امر (نبوت) پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا ہے کہ علامت سے ذی العلامت پر استدلال ہوتا ہے، چونکہ غلط چیز کا ازالہ ضروری ہوتا ہے اس لئے آپ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم ہوا کہ ان میں پھونک ماریں، چنانچہ اسود عنسی تو آپ علیہ السلام کے مرض الوفات ہی میں فیروز دیلمیؓ کے ہاتھوں مارا گیا جس کی اطلاع آپ علیہ السلام کو سرلانے سے پہلے ہی دی گئی اور آپ علیہ السلام نے فرمایا "فاز فیروز" اس کا واقعہ تاریخ ابن خلدون میں تفصیلاً پڑھا جا سکتا ہے، جبکہ مسیلمہ کو حضرت وحشیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں قتل کر دیا تھا جس کا قصہ اور جنگ یمامہ کی تفصیل سیر و تاریخ کی کتب میں پڑھی جا سکتی ہے۔ حضرت وحشیؓ نے اسلام سے قبل حضرت حمزہؓ کو اُحد میں شہید کر دیا تھا۔

یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ان دونوں کا دعویٰ تو آپ علیہ السلام کے حین حیات ہی سامنے آیا تھا پھر "یخرجان من بعدی" کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ من بعدی سے مراد بعد موتی نہیں بلکہ بعد نبوتی ہے، شاہ صاحبؒ عرف میں فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مدعی نبوت اب بالا جماع کافر ہے اور واجب القتل ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابو ہریرہؓ نے بیان کیا کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میں نے رات کو خواب دیکھا ہے کہ ایک سائبان ہے اس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے اور میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے ہاتھوں میں بھر بھر کر لے رہے ہیں کچھ زیادہ حاصل کرنے والے ہیں اور کچھ کم، اور میں نے دیکھا کہ ایک رسی آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے، پس میں نے آپ کو دیکھا اے اللہ کے رسول! کہ آپ نے اس رسی کو پکڑ لیا اور آپ چڑھ گئے پھر آپ کے بعد ایک اور شخص نے اس کو پکڑ لیا اور وہ بھی چڑھ گیا، پھر اس کے بعد ایک اور شخص نے وہ رسی پکڑی اور وہ بھی چڑھ گیا، پھر اس کے بعد ایک اور شخص نے وہ رسی پکڑی پس وہ ٹوٹ گئی، پھر اس کو جوڑ دیا گیا اس طرح وہ بھی چڑھ گیا، پس حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے اس کی تعبیر دینے دیجئے (یعنی تعبیر کی اجازت فرمائیں) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم تعبیر دو! پس ابوبکرؓ نے فرمایا کہ وہ سائبان تو اسلام کا سائبان ہے اور جو گھی اور شہد اس سے ٹپک رہا ہے وہ قرآن ہے جس کے مضامین نرم اور میٹھے ہیں اور زیادہ اور کم لینے (پینے) والے وہ قرآن کریم کو زیادہ اور کم اختیار کرنے (حاصل کرنے) والے ہیں اور وہ رسی جو واصل ہے آسمان سے زمین تک

تو وہ حق ہے جس پر آپ ہیں پس آپ نے اس کو اختیار فرمایا تو اللہ نے آپ کو اوپر چڑھا دیا پھر آپ کے بعد کسی شخص نے حق کو اختیار کیا وہ بھی اوپر چڑھے گا، پھر اس کے بعد ایک اور شخص اس کو پکڑے گا تو وہ بھی چڑھے گا، پھر اس کے بعد ایک اور شخص اُسے پکڑے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی پھر وہ اس کے لئے جوڑ دی جائے گی تو وہ بھی چڑھ جائے گا اے اللہ کے رسول! آپ ضرور بتائے کہ میں نے صحیح تعبیر دی ہے یا غلطی کی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض صحیح بتلا دی اور بعض میں غلطی کی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ بتایئے کہ میں نے کیا خطا کی ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم نہ دیں۔ (یہ متفق علیہ صحیح حدیث ہے)

تشریح:۔ عارضہ میں ہے کہ اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کی شان و منزلت اور تعبیر الرؤیا میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام کے بعد ان جیسا کوئی نہ تھا''ظلہ'' کو اسلام سے تعبیر کرنا صحیح تھا مگر گھی اور شہد کو ایک ہی معنی میں لینا شاید وہم تھا کہ یہ دونوں الگ الگ ہیں پس مراد تو یا قرآن وسنت دونوں ہیں یا علم وعمل، یا پھر حفظ اور سمجھ،

آپ علیہ السلام کے بعد جن تین آدمیوں کا ذکر ہے وہ بالترتیب ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ ہیں البتہ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی تو قتل کیا گیا ہے ان کی رسی بھی ٹوٹنی چاہئے تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی رسی بوجہ ولایت کے توڑی گئی تھی جبکہ حضرت عمرؓ کی بوجہ ذاتی دشمنی کے نہ کہ بوجہ خلافت کے۔ (تدبر وانظر)

قولہ: ''ثم وصل'' یعنی خلافت کی رسی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعے جوڑ دی گئی البتہ اس میں علو یعنی اتفاق نہ تھا اس لئے کوئی نئی فتوحات اور غلبہ حاصل نہ ہو سکا اگر چہ وہ حق پر تھے، غلطی کی وجہ ایک تو وہی ہوئی جو اوپر گذر گئی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے رسی کو حق کہا حالانکہ اس سے مراد خلافت تھی کیونکہ حضرت عثمانؓ کے لئے حق منقطع نہیں ہوا تھا بلکہ خلافت منقطع کر دی گئی تھی۔ **قولہ:** ''اقسم'' کے ساتھ اگر باللہ کو ذکر نہ کیا جائے تو امام مالکؒ کے نزدیک قسم نہیں ہوتی الا یہ کہ اس کی نیت کی ہو جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لفظ اقسم سے بھی قسم ہو جاتی ہے یہ روایت امام ابوحنیفہؒ کی دلیل ہے مالکیہ کہہ سکتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے باللہ کی نیت کی تھی کہ غیر اللہ کی قسم جائز نہیں۔ **(ھذا کلہ من عارضۃ الاحوذی)**

حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کسی کو قسم دے اور ابراء مصلحت کے خلاف ہو تو اس سے اعراض کیا

جاسکتا ہے یہاں حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر آپ علیہ السلام افشاء کرنا فی الحال مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔

حدیث سمرۃ بن جندبؓ:۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر فرماتے: تم میں سے کسی نے رات کو خواب دیکھا ہے؟ (حسن صحیح)

اگر کوئی نہ دیکھ چکا ہوتا اور آپ علیہ السلام دیکھ چکے ہوتے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بیان فرماتے جیسا کہ "رأیت رجلین اتیانی فاخذابیدی الخ" معراج کا ایک واقعہ تفصیل سے بیان فرمانا وغیرہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم کے حصول میں بہت دلچسپی فرماتے اس لئے صحابہ کرامؓ سے خواب پوچھتے پھر جب کوئی صحابی خواب بیان کرتا تو آپ فرماتے ماشاء اللہ مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ بعض خواب ناپسندیدہ معنی پر مشتمل ہوتے ہیں اور ایسے خوابوں کا بیان مناسب نہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معمول چھوڑ دیا۔ (کذا فی العارضۃ)

ابواب الشهادات

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

(گواہی کا بیان)

شہادات جمع ہے شہادت کی بمعنی گواہی کے ہے۔

قوله: "اَ لَا اخبر كم بخير الشهداء الذى يأتى بشهادته قبل ان يُسئلها". (حَسن)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو خبر نہ دوں گواہوں میں سے اچھے کی، یہ وہ شخص ہے جو گواہی کے مطالبہ سے پہلے ہی اپنی گواہی دے۔

تشریح:۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ابواب الفتن میں "**باب ماجاء فى القرن الثالث**" میں حضرت عمران بن حصین کی مرفوع حدیث میں ایسے لوگوں کو ناپسندیدہ ظاہر کیا گیا ہے جو بغیر طلب کے ازخود گواہی دیں گے "**يعطون الشهادة قبل ان يسالوها**" جبکہ باب کی حدیث میں ایسے گواہ کو خیر الشہداء کہا گیا ہے، اور یہ تو تعارض ہے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی، یہ حدیث ابواب الشہادات کے آخر میں بھی آرہی ہے۔

اس کا جواب وہیں پر گذرا ہے کہ معیوب اور مذموم جھوٹی گواہی ہے جس میں لوگ پیش پیش ہوں گے جیسے آج کل ہوتا ہے یا مراد جھوٹی قسمیں ہیں جو لاپرواہی کی وجہ سے لوگ کھاتے رہیں گے اگرچہ ان سے مطالبہ نہ کیا گیا ہو۔

جبکہ باب کی حدیث میں سچی گواہی کا ذکر ہے جو ہرگز مذموم نہیں ہے بشرطیکہ اس سے کسی بڑے مفسدہ یا نقصان کا خطرہ نہ ہو، کیونکہ کبھی گواہی تو سچی ہوتی ہے مگر اس کی ادائیگی معیوب ہوتی ہے جیسے چھوٹے بچے اور بچی کو ناجائز تعلقات میں دیکھا اور خاندانی اعتبار سے دونوں شریف لوگ ہیں تو بجائے شور مچانے کے ان کو ڈرائے دھمکائے تاکہ وہ آئندہ اس قسم کی حرکت نہ کریں شور مچانے سے دونوں خاندانوں کی رسوائی ہوگی اسی طرح اگر گواہی کی نوبت آجائے تو حتی الامکان بچنے کی کوشش کرے۔ واللہ اعلم۔ لہٰذا روایات میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے۔

بعض حضرات نے حدیث باب کا یہ بھی مطلب لیا ہے کہ صاحب حق کو اپنے گواہ کا علم نہ ہوتو اچھا گواہ وہ ہے جواز خود گواہی دے کر اس کو حق دلا دے، یا یہ کنایہ ہے سرعت قبولیت سے یعنی وہ گواہ طلب کے بعد اتنی جلدی آتا ہے گویا کہ وہ مطالبہ سے پہلے ہی پہنچ گیا۔

قولہ: ''لاتجوز شهادة خائن ولا خائنة ولا مجلودٍ حداً ولا مجلودةٍ ولا ذی غِمرٍ لِاِخْنِہٖ (والصواب لِاَخِیہ) ولا مجرّب شهادة ولا القانع اهل البيت لهم ولا ظنين فی وِلاء ولا قرابة''. (غریب)

جائز نہیں گواہی کسی خیانت کرنے والے مرد اور عورت کی اور نہ ہی اس مرد اور عورت کی جن کو کسی حد میں کوڑے لگائے گئے ہوں (یعنی حد قذف) اور قبول نہیں شہادت حسد کرنے والے کی کینہ کی وجہ سے (یا محسود بھائی کے خلاف) اور ایسے شخص کی بھی جو جھوٹی گواہی میں آزمودہ ہو اور قبول نہیں ایسے شخص کی بھی جس کی روزی کسی گھر سے وابستہ ہو، اس گھر والوں کے لئے۔ اور نہ ہی اس شخص کی جو موالات اور قرابت کے انتساب میں متہم ہو (یعنی جھوٹا سمجھا جاتا ہو)۔

تشریح ولغات:۔ قولہ: ''خائن'' خیانت کرنے والا خواہ حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں خصوصاً حقوق مالیہ میں، چونکہ ایسا شخص فاسق ہوتا ہے اور فاسق کی گواہی قابل قبول نہیں اس لئے خائن کی گواہی نہیں چلے گی۔

قولہ: ''ولا مجلود حداً'' مجلود وہ شخص ہے جس کو جلد یعنی کوڑے بطور حد لگ چکے ہوں پس اگر مراد مطلق حد ہو تو پھر عدم قبولیت اس وقت ہوگی جب تک اس نے گناہ سے توبہ نہ کی ہو اور اگر حد قذف مراد ہو تو پھر حنفیہ کے نزدیک اس کی شہادت حد کے بعد کسی صورت میں قبول نہیں کی جائے گی اگر چہ اس نے توبہ کر لی ہو جبکہ شافعیہ و مالکیہ وغیرہ کے نزدیک توبہ کرنے کے بعد محدود فی القذف کی شہادت قابل قبول ہے۔ اس اختلاف کا دارومدار اس اصولی اختلاف پر ہے کہ اگر کلام میں متعدد معطوفات مذکور ہوں اور آخر میں استثناء آجائے تو کیا وہ صرف آخری حکم یعنی معطوف سے ہوگا یا سب سے؟ حنفیہ کہتے ہیں کہ اس استثناء کا تعلق آخری معطوف سے ہوتا ہے جبکہ جمہور کے نزدیک سب سے ہوتا ہے۔ چنانچہ حد قذف کے بارے میں حکم ہے۔

''فاجلدوهم ثمٰنينَ جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابداً واُولٰئِکَ هم الفاسقون ۝ الا الذين تابوا من بعد ذالک واصلحوا''. (نور آیت نمبر:۵)

پس احناف کے نزدیک توبہ کرنے سے فقط اس کا فسق ختم ہوگا جو آخری حکم اور معطوف ہے اس سے قبل والا حکم "ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابداً" بدستور باقی رہے گا لہٰذا کہا جائے گا کہ قاذف کی حد دو سزاؤں سے مرکب ہے ایک کوڑے لگانا اور دوم گواہی ہمیشہ کے لئے نا قابل قبول ہونا۔ مزید تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

قوله: "ولاذی غِمر" بکسر الغین بروزن سدر حقد اور کینہ کو کہتے ہیں۔

قوله: "لِإحنه" لام اجلیہ ہے جبکہ إحن بکسر الہمزہ وسکون الحاء بھی حقد اور غضب کو کہتے ہیں یعنی اس کے کینہ کی وجہ سے محقود محسود کے خلاف گواہی منظور نہیں۔ بعض نسخوں میں "لِاَخیہ" بالخاء والیاء ہے جبکہ بعض میں لِاختہ بالتاء ہے اس میں لاخیہ زیادہ صحیح ہے، دونوں میں لام بمعنی علی ہوگا یعنی جس بہن بھائی سے آپس کا کینہ چل رہا ہے اس کے خلاف اس کی گواہی نہیں چلے گی۔

قوله: "ولا مجرب الخ" یعنی جس کی جھوٹی گواہی مشہور ہو اور اسے بار بار آزمایا گیا ہو۔

قوله: "ولا القانع" قانع اصل میں اس سائل کو کہتے ہیں جو تھوڑے بہت پر صبر کرتا ہو مگر یہاں وہ شخص مراد ہے جو کسی گھر سے کھاتا پیتا ہو خواہ مفت میں وہ کھلاتے ہوں یا بطور خادم واجیر کے ان کے گھر میں رہتا ہو جیسے چوکیدار، ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ۔

قوله: "ظنین" متہم کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد وہ ہے جو اپنی ولاء کی نسبت اپنے اصلی موالی کے بجائے غیر کی طرف کرتا ہو یا اپنا نسب غیر باپ کی طرف منسوب کرتا ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص فاسق ہو یا گواہی میں متہم یعنی مشکوک ہو اس کی گواہی نامنظور ہوگی چنانچہ خائن اور ظنین اور محدود بغیر توبہ کے فاسق ہیں اس لئے ان کی گواہی نہیں مانی جائے گی جبکہ ذی غمر اور قانع کی گواہی مشکوک ہے کیونکہ دشمنی عداوت رکھنے والا دشمن کے خلاف گواہی اپنے ذاتی مفاد کے لئے بھی دے سکتا ہے جبکہ عام قانع اہل بیت کے حق میں گواہی دے کر اپنی وفاداری اور نفع رسانی کا تأثر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اسی بناء پر باپ بیٹے کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قابل قبول نہیں ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے ذکر فرمایا ہے اور یہی جمہور وحنفیہ کا مذہب بھی ہے اگرچہ حضرت عمرؓ اور بعض اہل الظواہر نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ غرض اصول وفروع کے لئے گواہی ممنوع ہے تہمت کی وجہ سے اس کے علاوہ تمام رشتہ داروں کے لئے گواہی دینا منظور ہے، سوائے زوجین کے کہ ان میں بھی تہمت قائم ہے کہ مفادات مشترک ہوتے ہیں

خلافاً للشافعیؒ۔ ابن العربیؒ لکھتے ہیں: ''وساعدنا ابو حنیفة علیه وهو الصحیح ''یعنی شہادة الزوجین قبول نہیں ہے۔

حدیث آخر:۔ ''**قوله فما زال رسول الله صلی الله علیه وسلم یقولها حتی قلنا لیته سکت** '' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے گناہوں میں جب جھوٹی گواہی کا ذکر فرمایا تو اس جملہ کو بار بار دہراتے اور مکرر فرماتے رہے یہاں تک کہ ہماری خواہش ہوئی کہ کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچ رہی ہے اور تھک رہے ہیں۔

اگلی حدیث میں شہادت زور کو شرک کے برابر قرار دیا گیا ''عُدِلت ''یعنی برابر کی گئی ہے اس کی وجہ ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ بیان فرمائی ہے کہ جس طرح شرک موجب فساد ہے اسی طرح جھوٹی گواہی بھی باعث فساد ہے کہ کبھی بے گناہ کو گواہی کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے اور کبھی دوسری سزا دی جاتی ہے اس طرح نظام سارا تباہ و برباد ہو جاتا ہے جیسا کہ آج کل ہوا ہے۔ آخری حدیث عمران بن حصینؓ کی ابواب الفتن ''باب ما جاء فی القرن الثالث ''میں مع التشریح گذری ہے۔ فلیراجع

ابواب الزهد

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

"عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس،الصحة والفراغ".(حسن صحيح)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سارے لوگ خسارہ میں رہتے ہیں صحت مندی اور فارغ البالی۔

تشریح:۔ زہد اور زہادت بمعنی بے رغبتی کے ہیں یعنی دنیا سے زیادہ تعلق نہ جوڑنا۔

قولہ: "مغبون'' دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جو تجارت میں نقصان یعنی گھاٹے میں رہتا ہے چونکہ اعمال صالحہ اُخروی ثواب کا سامان ہے اس لئے اس عمل کو بھی بزبان قرآن تجارت کہا گیا ہے یعنی نیکیوں کی تجارت، یہاں جن دو نعمتوں کا ذکر ہے ان میں ایک تو تندرستی ہے جو عبادت کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ بیمار آدمی عموماً اپنی ہی فکر اور پریشانیوں میں گھرا رہتا ہے یا پھر عبادت کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ دوسری نعمت فراغت ہے یعنی آدمی کا دنیوی مصائب و پریشانیوں سے محفوظ ہونا، کیونکہ پریشانیوں میں گھرا آدمی کہاں جاندار عبادت کرسکتا ہے خصوصاً عبادتِ تفکر۔ مطلب یہ ہے کہ کم ہی لوگ ایسے ہیں جو ان دو نعمتوں سے خوب اُخروی تجارت کرتے ہیں جبکہ عام لوگ ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے وہ نہ تو صحت سے نفع اٹھاتے ہیں اور نہ ہی خوشحالی سے نفع کما سکتے ہیں بلکہ عموماً وہ اس سرمایہ کو فضول کاموں یا دنیوی مشاغل اور کبھی گناہ کے عوامل میں خرچ کر کے آخرت کے فائدے سے محروم رہتے ہیں، یہ ایسا ہے جیسے ایک آدمی کی دکان مالِ تجارت سے بھری پڑی ہو مگر وہ اسے بند رکھتا ہو یا اس میں بجائے کاروبار کے کھیل تماشے اور گپ شپ کرتا ہو ظاہر ہے وہ اس سے کیا کمائے گا؟۔

غرض آدمی کو چاہئے کہ بجائے حظِ دنیا کے حُبّ آخرت پر زور لگائے اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی دنیا کو ضرورت سمجھ کر اس کے مطابق حاصل کرے آخرت کو مقصود و مطلوب جان کر اس پر توجہ

دینا چاہئے، اسی نکتہ کی طرف حضرت شاہ صاحبؒ نے اشارہ کر کے عرف میں فرمایا ہے: ''قالوا ان ذرة من الزهد خير من عبادة الثقلين''۔

دوسری حدیث:۔ اس باب میں دوسری حدیث ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: کون ہے جو مجھ سے یہ باتیں (احکام ومشورے) حاصل کر کے ان پر خود عمل کرے اور اس شخص کو بتلادے جوان پر عمل کرے؟ ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! میں ہوں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پانچ باتیں شمار کرائیں۔(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حرام سے بچ کر رہنا اس طرح تم لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار بن جاؤ گے۔(۲) اور اللہ نے تیرے لئے جو مقدر فرمایا ہے اس پر راضی رہو تو لوگوں میں سب سے زیادہ غنی بن جاؤ گے۔(۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو کامل مؤمن بن جاؤ گے۔(۴) لوگوں کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو تو کامل مسلمان ہو جاؤ گے اور (۵) زیادہ مت ہنسو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

تشریح:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوھریرہؓ کا ہاتھ پکڑنا ان باتوں کی اہمیت کے پیش نظر تھا، اس حدیث میں ''اَوْ یُعلّم الخ'' کا ''او'' بمعنی واو کے ہے حدیث کا مطلب آسان ہے البتہ اس سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ دین اسلام میں علم اور عمل دونوں اہم ہیں۔ دوم یہ کہ علم اس کو پڑھانا چاہئے جو عمل کی غرض سے پڑھتا ہو یا کم از کم عمل کا شوق رکھتا ہو اگر چہ اتمام حجت کے لئے عام تعلیم دینا بھی جائز ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ عبادت صرف کرنے کا نام نہیں بلکہ ترک اور چھوڑنا بھی عبادت ہے لہٰذا ترک دنیا اور ترک گناہ بھی عبادت بلکہ عبادت کی جڑ ہے۔ چوتھی بات ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے ایمان مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو منقطع قرار دیا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کا سماع حضرت ابوہریرہؓ سے ثابت نہیں۔

باب ماجاء فی المبادرة بالعمل

(عمل کرنے میں جلدی کرنا)

''عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: بادروا بالاعمال سبعاً هل تنظرون اِلّاالى فقرمُنسٍ اوغِنىً مُطغٍ اومرض مُفسدٍ اوهَرَم مُفنِدٍ اوموت مُجهزٍ اوالدجال

فَشَرٌّ غائب يُنتظَرُ او الساعة فالساعة اَدهٰى و اَمَرُّ. (حديث غريب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات چیزوں سے پہلے ہی عمل میں شتابی (جلدی) کرو (عمل نہ کرکے) تم انتظار نہیں کرتے ہو مگر (۱) بُھلا دینے والے فقر کا (۲) یا بھٹکا دینے والی مالداری کا (۳) یا بگاڑ دینے والے مرض کا (جس سے دین اور بدن دونوں برباد ہو جاتے ہیں) (۴) یا (عقل کو) فاسد کرنے والے بڑھاپے کا (پھر صحیح قول وعمل کی قدرت نہیں رہتی) (۵) یا اچانک آنے والی موت کا (۶) یا پھر دجال کا انتظار ہے پس وہ تو ایسا شر ہے جو غائب ہے اور اس (کے خروج) کا انتظار ہو رہا ہے (۷) یا قیامت کا انتظار ہے پس قیامت تو بہت ہی ہولناک اور سخت کڑوی ہے۔

تشریح:۔ "مُنس" اور باقی تمام صفات مجہز تک باب افعال سے اسم فاعل کے صیغے ہیں نسیان سے ہے کیونکہ فقر وفاقہ عموماً لوگوں کو معاش کی فکر میں لگا کر معاد کی طرف توجہ کو بُھلا دیتا ہے۔

قولہ: "مُطغٍ" طغیان سے ہے بمعنی سرکشی کے کیونکہ مال عموماً آدمی کو سرکش ونافرمان بنا دیتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ **قولہ:** "هرم" بروزن قمر بڑھاپا اور "مفند" افناد سے بمعنی فَنَد میں یعنی فتور دماغی اور عقل کی شکست وریخت میں مبتلا کر دینے والا، کیونکہ زیادہ بوڑھا آدمی بچوں کی طرح بے معنی باتوں اور بے مقصد کاموں میں سرگرم ہو جاتا ہے عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتا بلکہ بعض تو چھوڑ ہی دیتے ہیں۔

قولہ: "مجهز" اِجہاز سے بمعنی جلدی رخصت کرنے والی موت کے ہے۔ **قولہ:** "ادهى و امر" دونوں اسم تفضیل کے صیغے ہیں داھیہ گھبرا دینے والی چیز اور امرمرّ سے بمعنی کڑوا کے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مندرجہ موانع عبادت کی آمد سے پہلے پہلے عبادت میں لگے رہو تاکہ آخرت کے لئے کچھ ذخیرۂ اعمال جمع کیا جا سکے کیونکہ ان آفات کے آنے کے بعد عبادت کرنے کی فرصت یا طاقت نہیں رہے گی یا پھر عبادت کی اہمیت نہیں رہے گی کیونکہ جو شخص جوانی میں اور صحت کے دور میں عبادت پر توجہ نہ دے تو یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ ان فتنوں میں وہ عبادت کے لئے کمر کس لے گا، چونکہ ان آفات میں سے بعض کا آنا تو یقینی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم لوگ عبادت میں خوب محنت نہیں کرتے ہو کیا تمہیں ان آفات کا انتظار ہے پس اگر ایسا ہے تو یہ تباہ کن بیماریاں ہیں ان میں ابتلاء کے بعد عبادت کہاں ہو سکے گی اس لئے ان سے سبقت کرو۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ علیہ السلام کے سامنے مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ وہ گویا اعمال میں کمزور تھے کلّا وحاشا صحابہ رضوان اللہ علیہم سے بڑھ کر کون زیادہ عبادت کر سکتا ہے بلکہ یہ خطاب

امت کے ہر اس شخص سے ہے جو عمل کے اعتبار سے سست ہو اور جتنی عبادت کرتا ہو اس سے بھی زیادہ کرسکتا ہو مگر بوجہ سستی کے نہ کرتا ہو تو اس سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں کس چیز کا انتظار ہے؟ تحفۃ الاحوذی اور عارضۃ الاحوذی میں اس حدیث کو حسن بھی کہا ہے۔

باب ماجاء فی ذکر الموت

(موت کے تذکرہ کے بارے میں)

"اکثروا ھاذم اللذات یعنی الموت". (غریب حسن)

لذتوں کو منقطع کرنے والی چیز کو بکثرت یاد کرو یعنی موت کو۔

تشریح:۔ یہ لفظ دال مہملہ اور ذال معجمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے دونوں قریب المعنی ہیں ھادم کے معنی ڈھانے دینے والی چیز اور ھاذم کے معنی قاطع کے ہیں مراد موت ہے جیسا کہ راوی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے "یعنی الموت" حاشیۂ قوت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ "موت" بالجر بغیر یعنی کے عطف بیان ہے۔

موت کو بکثرت یاد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے دنیا کی حقارت اور بے وفائی کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ جب موت سے مادی تعمیر و ترقی منہدم ہو کر ختم ہو جاتی ہے تو پھر کیوں نہ ایسی زندگی کے لئے تیاری کریں جس کی حیات ابدی، میوے لافانی اور عمر بھر جوانی ہی جوانی رہتی ہے جہاں کا منظر کچھ اس طرح ہے کہ:

"افتضاض الابکار، علی شطِ الانھار، تحت الاشجار، اوضرب الاوتار و ضیافۃ الجبار. (کذافی المدارک، سورہ یس آیت: ۵۵)

باب

قبر کی ہولناکی کا بیان

"کان عثمان اذا وقف علیٰ قبر بکیٰ حتی یبل لحیتہ فقیل لہ تُذْکَرُ الجنۃُ والنارُ فلا تبکیٰ وتبکی من ھذا؟ فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان القبر اول منزل من منازل الآخرۃ فان نجا منہ فمابعدہ ایسرُ منہ وان لم ینجُ منہ فمابعدہ اشدمنہ قال وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مارأیتُ منظراً قطُّ اِلا القبر افظع منہ". (حسن غریب)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہو جاتے تو رونے لگتے یہاں تک کہ ان کی داڑھی گیلی ہو جاتی چنانچہ ان سے دریافت کیا گیا کہ جب جنت وجہنم کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو آپؓ نہیں روتے اور قبر کے پاس روتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے پس اگر آدمی یہاں سے بحفاظت گذرا تو اس کے بعد (کی منزلیں) اس سے آسان تر ہیں لیکن اگر یہاں نجات نہ ملی تو اس کے بعد (کی منازل) زیادہ کٹھن ہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں نے کوئی منظر نہیں دیکھا مگر قبر اس سے زیادہ بھیانک ہے۔

تشریح:۔قولہ: "یبل" بضم الباء وتشدید اللام بلل تری کو کہتے ہیں۔ **قولہ: "تذکر"** بصیغۂ مجہول۔ **قولہ: "فان نجا"** ضمیر مقبور یعنی صاحب قبر کی طرف راجع ہے۔

قولہ: "افظع" فظع سے ہے بمعنی بھیانک اور ڈراؤنے کے۔ یہاں باقی مناظر سے مراد دنیاوی مقامات ہیں ورنہ تو اُخروی عذابوں میں قبر سے زیادہ خطرناک بھی پائے جاتے ہیں جیسے آگ۔ جب موت آتی ہے تو نامہ اعمال لپیٹ دیا جاتا ہے اور جزاوسزا کا عمل شروع ہو جاتا ہے چونکہ صحیح معنوں میں آنکھیں اسی وقت کھل جاتی ہیں اس لئے گناہ میں لت پت شخص پر اتنا خوف طاری ہوتا ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، پھر قبر کی تنہائی الگ مصیبت اور فرشتوں کی سختی الگ عذاب اور باقی انواع عذاب کا تسلط تو ہے ہی عذاب، اگر کوئی خوش نصیب یہاں نرمی اور رحمت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کے نجات یافتہ ہونے کا نیک شگون ہے جبکہ قبر کے عذاب میں مبتلاء شخص اگر کافر ومنافق ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد بطریق اولیٰ وہ سختیوں کا مستحق ہے لیکن اگر مومن ہو تو ممکن ہے کہ قبر کا عذاب اس کے سارے گناہوں یا خوف کا کفارہ نہ بن سکے اور اسے مزید کٹھن مراحل سے گذرنا پڑے۔ **اعاذنا اللہ منہا**

ضروری نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رونا اپنے اوپر ہو کیونکہ وہ تو جنت کی خوش خبری صادق ومصدوق علیہ السلام کی زبان مبارک سے سُن چکے تھے بلکہ امت کے گنہگاروں کے بارے میں وہ رویا کرتے تھے جیسے ماں باپ اپنے قیدی یا بیمار بیٹے کی تکلیف پر روتے ہیں کتنے لوگ ہیں جو امت کے غم سے بیمار پڑ گئے، یہ بھی ممکن ہے کہ قبر کے پاس کھڑے ہو کر وہ عذاب قبر کے بارے میں سوچتے ہوں اور بدرجہ "لابشرط شئی" یعنی خوش خبری سے قطع نظر کر کے روتے کیونکہ "**انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**"۔ الآیۃ

باب من اَحَبَّ لِقاءَ الله اَحَبَّ الله لِقاءہ

(جواللہ سے ملنا پسند کرے، اللہ اس سے ملنا پسند فرماتے ہیں)

"من اَحَبَّ لِقاءَ الله اَحَبَّ الله لقائه ،ومن كَرِهَ لِقاءَ الله كَرِهَ الله لقاءه". (صحيح)

جوشخص اللہ سے ملنے کو پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو پسند فرماتے ہیں اور جوشخص اللہ سے ملنا پسند نہیں کرتا تو اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں فرماتے۔

تشریح:۔اس حدیث میں شوق ملاقات اور عدم شوق کا تعلق نزع کی حالت اور زندگی کے ان آخری لمحات سے ہے جن میں توبہ وغیرہ اعمال کا دروازہ بند کردیا جاتا ہے اور آخرت کے مناظر اور اپنا انجام نظر آنے لگتا ہے مومن اور نیک آدمی اس وقت دنیوی وابستگیوں سے لاتعلق ہوکر خوشی میں جلدی کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا جنازہ جلدی لے جاؤ، اللہ کی طرف سے ملاقات پسند کرنے کا مطلب اس کے لئے انعامات اور خوشیوں کا مافوق التصور تیاری کرنا ہے جبکہ محروم آدمی نزع کی حالت میں بھاگنے اور بچنے کی کوشش میں ہوتا ہے اگرچہ وہ بھاگ نہیں سکتا اور انعامات سے محروم رکھ کر عذاب میں مبتلاء کرنا اللہ کی طرف سے ملاقات کو ناپسند کرنا ہے، اس حدیث کی تشریح ابواب الجنائز میں گذری ہے۔(دیکھئے "باب ماجاء من احب لقاء الله احب الله لقاءہ" من حديث عبادة بن الصامتؓ، تشریحات ترمذی ص:۳۹۰ جلد:۴)

باب ماجاء فی اِنذار النبی صلی اللہ علیہ وسلم قومَه

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم کو شفقت کے ساتھ ڈرانا)

"عن عائشة قالت لمانزلت هذه الاية:"وانذرعشيرتک الاقربين "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :ياصفيّة بنت عبدالمطلب!يافاطمة بنت محمد!يابنى عبدالمطلب!انى لاَاَملکُ لكم من الله شيئاسلونى مِن مالى ماشئتم ". (حسن وصحيح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "اور ڈر سنادے اپنے قریب کے رشتہ داروں کو" (سورۃ شعراء آیت ۲۱۴) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے فاطمہ بنت محمد! اور اے عبدالمطلب کی اولاد میں اللہ کے ہاں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا، میرے مال میں سے

جو چاہو مانگ لو۔

تشریح:۔ تفسیر عثمانی میں اس آیت کے حاشیہ پر لکھا ہے: یعنی اوروں سے پہلے اپنے اقارب کو تنبیہ کیجئے کہ خیر خواہی میں اُن کا حق مقدم ہے اور ویسے بھی آدمی کی صداقت وحقانیت، اقارب کے معاملہ سے پرکھی جاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے قریش کو پکار کر سُنا دیا اور اپنی پھوپی تک اور اپنی بیٹی تک اور چچا تک کو کہہ سُنایا کہ اللہ کے ہاں اپنی فکر کرو۔ خدا کے ہاں میں تمہارا کچھ نہیں کرسکتا۔ انتہیٰ

المسترشد عرض کرتا ہے کہ انذار مطلق ڈرانے کو نہیں کہتے بلکہ اللہ کے عذاب سے شفقت کے ساتھ ڈرانے کو کہا جاتا ہے اس لئے سب انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ امتیوں کے لئے باپ کے مانند تھے، یہ روایت تفسیر میں بھی آرہی ہے وہاں امام ترمذیؒ نے اس کی تصحیح کی ہے، مسلم میں یہ نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ آئی ہے اور یہ کہ یہ اجتماع صفا پہاڑی پر پیش آیا اور ان لوگوں میں ابولہب بھی تھا جس نے دعوت کو حقارت کے ساتھ رد کردیا جو "تبت یدا ابی لهب" کے نزول کا سبب بنا، آپ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی سے ناراض ہوکر اس کے گناہوں یا کفر پر سزا دینا چاہیں گے تو میں اس عذاب کو نہیں ٹال سکتا کہ میں اس کا مالک نہیں ہوں البتہ دنیاوی امور میں جہاں تک مجھے تصرف کا حق ہے اس میں آپ کی مدد کے لئے تیار ہوں لیکن یہ فائدہ آخرت کے مقابلہ میں بہت قلیل ہے اس لئے تم لوگ آخرت کے لئے تیاری کر کے خود ہی تقویٰ اختیار کرو۔

بظاہر یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے ایک شروع میں ہجرت سے قبل اور دوسری بار ہجرت کے بعد لہٰذا وفی الباب کی روایات جو حضرت ابو ہریرۃ ودیگر اصحاب سے مروی ہیں کو مرسل ماننے کی ضرورت نہیں اور ایک آیت کا متعدد بار نازل ہونا ثابت ہے جیسا کہ امام سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں بیان فرمایا ہے راقم نے بھی ''زاد یسیر'' میں اس کی مثالیں نقل کی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش امت کے عُصاۃ المؤمنین کے لئے حق ہے جیسا کہ شرح عقائد وغیرہ میں ہے ممکن ہے کہ حدیث باب کا واقعہ اس کے علم سے قبل ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ ''انی لا املک'' یعنی میں اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا لہٰذا تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ ہماری نجات بہر حال ہوجائے گی جیسے دنیا کے لوگ دنیا میں اپنے اقربہ کو بہر حال پاس کرتے اور کراتے ہیں، اللہ کے ہاں شفاعت اِذنی تو ہوسکتی ہے

لیکن اس سے ہٹ کر کوئی زور، کوئی شور وغیرہ نہیں چلتا۔

باب ماجاء فی فضل البکاء من خشیة اللّٰہ

(اللہ کے خوف سے رونے کی فضیلت کا بیان)

”لایلج النار رجل بکیٰ من خشیة اللہ حتی یعود اللبن فی الضرع ولایجتمع غبار فی سبیل اللہ ودخان جھنم“. (صحیح)

جہنم میں ہرگز وہ شخص داخل نہیں ہوگا جو اللہ کے خوف سے روئے تا آنکہ داخل ہوجائے دودھ تھن میں اور اللہ کی راہ کا غبار اور دوزخ کا دھواں ہرگز جمع نہیں ہوسکتے ہیں۔

تشریح:۔ چونکہ اللہ کے خوف سے رونا اور اس کے راستہ میں چلنا ایمان کے ساتھ لازم ہیں اور دوزخ اور اس کا دھواں کفر کے لوازمات میں سے ہیں اور ملزومیں یعنی ایمان اور کفر میں تو تضاد ہے اس لئے ان کے لوازم میں بھی تضاد ہے اور نفی لازم سے نفی ملزوم ہونا بدیہی ہے جیسا کہ منطق کی کتب میں بیان ہوا ہے اور ”حتی یعود اللبن الخ“ تعلیق بالمحال ہے ”حتی یلج الجمل فی سم الخیاط“ کی طرح یعنی دودھ تو واپس تھنوں میں نہیں جاسکتا اسی طرح اللہ کے خوف سے رونے والا اور اللہ کی راہ میں غبار سے گرد آلود ہونے والا بھی دوزخ میں نہیں جاسکتا، پھر اس گرد آلود ہونے سے مراد غیر اختیاری گرد وغبار ہے اگر کوئی شخص مٹی لے کر اپنے اوپر چھڑک دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔ نیز یہ بھی گذرا ہے کہ اس قسم کی تاثیرات خاصیات المفردات کہلاتی ہیں۔

باب ماجاء فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لوتعلمون مااعلم لضحکتم قلیلاً

(اگر تم وہ بات جانتے جو میں جانتا ہوں تو بخدا تم کم ہی ہنستے)

”عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :انی اَریٰ مالاترون واسمَعُ مالاتسمعون اَطّتِ السماء وحُقّ لھاان تَاِطّ مافیھاموضع اربع اصابع اِلاوملک واضع جَبھَتَه لِلّٰہ ساجداً واللہ لوتعلمون مااعلم لضحکتم قلیلاً ولَبکیتم کثیراً، وماتَلَذّذتم بالنساء

علی الفُرش ولخَرَجتم الی الصَّعَدات تجأرون الی اللّٰہ لَوَدِدتُ انی کنتُ شجرۃً تُعضَد".

(حسن غریب)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک میں وہ اشیاء دیکھتا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے اور سنتا ہوں وہ جو تم نہیں سنتے ہو چر چراتا ہے آسمان اور اس کے لئے یہی چر چراہٹ مناسب ہے کہ اس میں بقدر چار انگشت خالی جگہ نہیں مگر فرشتہ اس پر اپنی پیشانی اللہ کے لئے سجدہ میں رکھے ہوئے ہے، بخدا اگر تمہیں معلوم ہوتا وہ جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہی ہنستے اور زیادہ ہی روتے اور بیویوں سے بستروں پر ہرگز لطف اندوز نہ ہوتے بلکہ بیابانوں کی طرف ضرور نکل کر اللہ کی طرف گریہ وزاری کرتے۔ (یہ روایت بیان کر کے حضرت ابوذرؓ نے فرمایا) کاش! میں درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

تشریح:۔ قولہ: "انی اَریٰ واسمع" اس سے مراد آسمان کی حالت بھی ہوسکتی ہے اور دیگر وہ سب قرائن جو اللہ کی عظمتِ شان پر دال ہیں۔

قولہ: "اَطّت" بتشدید الطاء اطیط چر چرانے اور چر چراہٹ کو کہتے ہیں جو لکڑی کے ٹوٹنے اور کجاوے کی آواز ہوتی ہے جو بوجہ بوجھ نکلتی ہے۔

قولہ: "وحق" بصیغۂ مجہول یعنی اس کے لئے یہی مناسب ہے۔

قولہ: "الصُعُدات" بضمتین صعید کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور صُعدۃ کی بھی صحرا اور بیابان کو کہتے ہیں۔

قولہ: "تجأرون" تم فریاد کر کے زار و قطار روتے اور چیختے چلاتے یعنی صرف دعائیں ہی مانگتے۔ بعض روایات کے مطابق آپ علیہ السلام نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا جب آپ مسجد میں تشریف لائے اور وہاں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کو دیکھا جو باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

حدیث کا لُب لباب یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی عظمت اور قدرت اتنی زیادہ ہے کہ آسمان بھی بغیر چر چراہٹ کے نہیں رہ سکتا پھر اس کی وجہ بیان فرمائی کہ اس پر قدم رکھنے کی جگہ بھی خالی نہیں اس لئے وہ اس بوجھ تلے دبا رہتا ہے اگر تم لوگوں کو موت اور اس کی سختیوں اور قبر اور اس کے مابعد والی پریشانیوں کا علم ہوتا تو تم گھروں سے نکل جاتے اور جنگلوں میں اللہ سے دعائیں مانگتے اور چیختے چلاتے، کیونکہ جب کسی آدمی پر بہت زیادہ پریشانی آتی ہے تو وہ گھر سے نکل جاتا ہے اور دشت وصحراء کا رُخ کر کے نجات طلب کرنے لگتا ہے۔ آخر میں جو "لوددتُ انی الخ" جملہ ہے یہ دیگر روایات کی تصریح کے مطابق حضرت ابوذرؓ کا قول ہے جیسا کہ امام

ترمذیؒ نے فرمایا ہے"ویروی من غیر هذا الوجه ان اباذرؓ قال لوددت الخ"۔عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

باب ماجاء من تَکَلّم بالکلمة لِیُضحکَ الناسَ

(جس نے ایک بات کی تا کہ لوگوں کو ہنسائے)

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :ان الرجل لَیَتَکَلّم بالکلمة لایری بهابأساً یهوی بهاسبعین خریفاً فی النار".(حسن غریب)

فرمایارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بے شک آدمی ایک ایسی بات کرتا ہے جس میں وہ کوئی حرج (برائی) نہیں سمجھتا (مگر) وہ اس کی وجہ سے دوزخ میں ستر سال گرتا چلا جاتا ہے۔

تشریح:۔قولہ:"یهوی" هویٰ یهوی باب ضرب سے نیچے کی طرف گرنے کو کہتے ہیں جب کہ"خریف" اصالۃً موسم خزاں کو کہتے ہیں مگر اس کا اطلاق سال پر بھی ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے، جیسے جمعہ اور ہفتہ بولے جاتے ہیں مگر ان سے مراد پورے سات دن ہوتے ہیں۔**قولہ:"سبعین"** کا عدد تحدید کے لئے نہیں بلکہ کثرت اور دوام مراد ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بعض دفعہ آدمی اتنی غلط بات منہ سے نکالتا ہے کہ وہ شخص اگر چہ اسے غیر معمولی نہیں سمجھتا لیکن درحقیقت وہ اتنی تباہ کن ہوتی ہے کہ سب کچھ لٹ جاتا ہے اور ایمان کی دولت ختم ہو جاتی ہے۔آج کل بہت سے لوگ مذاق میں داڑھی والے کو"داڑھی" کے نام سے پکارتے ہیں کوئی شخص پردہ پوش عورت کا ہتک آمیز نام رکھتا ہے کبھی مولوی صاحب کا مذاق اڑایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ یہ درحقیقت دین کا تمسخر ہے جو زوالِ ایمان کا سبب بن سکتا ہے اس سے پرہیز لازمی ہے، دوسری حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو ہلاکت کی بددعاء دی ہے جو لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے جھوٹی بات بنا کر پیش کرتا ہے، جھوٹ اگر چہ بذاتِ خود بھی گناہ ہے مگر جب اس سے حاصل کردہ مراد بھی فضول یا غلط ہو تو اس کی شناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ جس طرح ایک نیکی کسی زمان ومکان یا محل کے اعتبار سے مزید بلند ہو جاتی ہے اسی طرح گناہ بھی زمان ومکان اور موقع ومحل کے حوالے سے بڑھ جاتا ہے اس لئے جب لوگوں کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولا جائے گا تو ڈبل گناہ ہوگا، خاص کر جب اسے مشغلہ بنایا جائے جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت بکواس

کرتے رہتے ہیں۔

البتہ کبھی کبھار سچی بات سے کسی کی دلداری ودلجوئی کی غرض سے مزاح کیا جائے تو وہ معیوب نہیں بلکہ بعض دفعہ سابقہ ضابطے کے مطابق مستحسن ہوتا ہے، جیسے کسی دوست کو منانے کے لئے یا اس کا غم کم کرنے کے لئے مزاح کیا جائے اس میں بھی یہ خیال ہونا چاہئے کہ بات صرف سچی ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہو جیسے کوئی علمی لطیفہ ہے، پھر اس طرز کو بھی عادت ومعمول نہیں بنانا چاہئے۔ ہمارے اساتذہ کرام جب کسی مجلس میں جلوہ افروز ہوتے تو اکثر علمی بحث کرتے اب فضاء یکدم ویکسر تبدیل ہوگئی اکثر اہل علم اپنا عیب چھپانے کے لئے علمی بحث سے گریز کرتے ہیں اور تمام تر توجہ سیاسی گفتگو پر ہوتی ہے جس میں غیبت بھی آتی ہے اور ضیاع وقت اور طنز وتمسخر وغیرہ کئی خرابیاں مجتمع ہوجاتی ہیں اس سے بھی بچنا چاہئے ہاں مفید وجائز سیاست اور سیاسی گفتگو جائز بلکہ نیک نیتی سے بسا اوقات عبادت بن جاتی ہے۔

باب

کسی کو جنت کی خوشخبری دینے کا بیان

"عن انس بن مالک قال تُوُفِّيَ رجل من اصحابه فقال يعنى رجلا(رَجُلٌ) "اَبشر بالجنة" افقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :اَوَلَاتدرى؟ فَلَعَلّه تكلم فيما لايعنيه اوبخل بما لاينقصُه". (غريب)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں سے ایک شخص کی وفات ہوگئی تو ایک شخص نے کہا تجھے جنت کی بشارت ہو، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے ہو؟ شاید اس نے کوئی فضول سی بات کی ہو یا کسی ایسی چیز کو روکا ہو جس کے خرچ کرنے سے اسے نقصان نہ ہوتا ہو۔

تشریح:۔ قولہ: "اَوَلَاتدری" جب بھی کلام میں حرف استفہام اور حرف عطف اس طرح جمع ہوجائیں تو وہاں معطوف علیہ مقدر ہوگا کیونکہ ہمزہ صدارتِ کلام کو مقتضی ہے اور "واؤ" کو معطوفین چاہئے۔ لہٰذا یہاں تقدیر یہ ہوگی: اَتُبَشِّرہ وَلاتدری؟"۔

جنائز ترمذی میں ایک باب گذرا ہے "باب ماجاء فی الثناء الحسن علی المیت" جس میں صاف کہا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ایک جنازے کی تعریف کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وجبت" اسی

طرح ترمذی کے جنائز میں یہ حدیث بھی گذری ہے: ''اذکروا محاسن موتاکم'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہئے اوران کے محاسن کا تذکرہ کرلینا چاہئے لیکن جہاں تک اُخروی فلاح کا تعلق ہے تواس بارے میں حکم یہ ہے کہ جب تک کسی شخص کے بارے میں نص معلوم نہ ہوئی ہوتب تک یہ حکم نہیں لگانا چاہئے کہ وہ جنتی ہے، چنانچہ مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک انصاری بچے کے بارے میں فرمایا:

''طوبیٰ لھٰذا عُصفورمن عصافیرالجنة لم یعمل السوء ولم یدرکه فقال(رسول الله صلی الله علیه وسلم)اَوَغیرذالک یاعائشة الخ''(مشکوٰة ص: ۲۰ الایمان بالقدر) یعنی اَتعتقدی ماقلتِ والحق غیر ذالک وھوعدم الجزم بِکونه من اھل الجنة. کذافی المرقاة.

قوله:''فلعله تکلم الخ'' یعنی جزم اور بشارت تواس کے بارے میں ہے جوحساب سے آزادہویا حساب کے بعدجنت کاپروانہ وصول کرچکاہواس سے پہلے بشارت نہیں دینی چاہئے کیونکہ کبھی مباحات پربھی محاسبہ ہوسکتاہے، جیساکہ اوپرعرض کیاجاچکاہے کہ بےمحل عمل اپنے درجہ سے اوپرنیچے ہوجاتاہے، اسی طرح بے فائدہ بخل بھی قابل گرفت ہوسکتاہے مثلاً ایک آدمی کواللہ نے صلاحیت تدریس کی دی ہےاورتدریس یاافتاء وغیرہ میں کوئی رکاوٹ یامالی نقصان بھی نہیں مگروہ اس میں حصہ نہیں لیتاتویہ ایسابخل ہے جس سے کوئی کمی نہیں ہوتی علی ہٰذازائدکھانا، بھلی بات، کسی کوراستہ بتاناوغیرہ کاحکم ہے۔حدیث الباب کے سارے راوی ثقہ ہیں البتہ اعمش کاسماع انسؓ سے نہیں ہے۔

حدیث آخر:۔''من حسن اسلام المرء ترکه مالایعنیه''.(غریب)

آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے ہے بےمقصدبات (اورکام) کوچھوڑنااگرغیرمسلم فضولیات میں لگا رہےتوشایداس لئے کہ اس کے سامنے کوئی عظیم مقصدنہیں اورنہ ہی اس نے اپنی اصلی منزل پہچانی ہے، مگرمسلمان تواصل صورت حال اورزندگی واعمال کے مآل سے آگاہ ہوتاہے پھربھی اگروہ ایسی بات کرتاہے یاایساکام کرتا ہے جواس کی ضرورت اورفائدے کے زمرے میں نہ آتاہوتواس کاکم ازکم نقصان یہ ہے کہ اس کاانتہائی قیمتی وقت ضائع ہوااگروہ اس وقت میں اللہ کاذکرکرتایاآخرت کی فکرکرتا، یاکوئی اورکارِخیرکرتاتویقیناً اس کابہت فائدہ ملتا، اورجب فضول بات اورلغوعمل کایہ حال ہےتوجس کاعمل یاقول گناہ پرمشتمل ہواس کاعالم کیاہوگا؟۔بہرحال

"لایعنی" قول یا عمل وہ ہوتا ہے جس سے نہ ضرورت متعلق ہو اور نہ ہی کوئی فائدہ وابستہ ہو اس کا آسان ضابطہ یہ ہے کہ جس کے ترک میں ضرر نہ ہو بس وہ لایعنی ہے۔ امام نوویؒ نے اس حدیث کی تحسین کی ہے۔

باب ماجاء في قلة الكلام

(کم گوئی کا بیان)

"ان احدكم ليتكلم بالكلمة من رضوان الله مايظن ان تبلُغ مابَلَغَت فيكتب الله له بهارضوانَه الى يوم يلقاه وان احدكم ليتكلم بالكلمة من سَخَط الله مايظن ان تبلغ مابلغت فيكتب الله عليه بهاسَخَطَه الى يوم يلقاه". (حسن صحيح)

بے شک تم میں سے کوئی ایک اللہ کی خوشنودی کے مطابق بات کرتا ہے جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتا کہ وہ پہنچے گی وہاں جہاں تک وہ جا چکی ہے پس اللہ اس پر اس کے لئے ملاقات (قیامت) کے دن تک اپنی رضا مقدر فرما دیتے ہیں اور بے شک تم میں سے کوئی ایک ایسی بات کرتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہوتی ہے وہ گمان نہیں کرتا کہ وہ اس مقام تک پہنچے گی جہاں تک وہ گئی ہے اللہ اس پر اس کے لئے اپنی ناراضگی قیامت تک لکھ دیتے ہیں۔

تشریح:۔ قولہ: "مايظن ان تبلغ مابلغت" یعنی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ بات میں اس قدر اچھی ہوگی یا دوسری صورت میں اس قدر بُری ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ جزاء وسزاء کا دارومدار عامل وقائل کے علم پر موقوف نہیں بلکہ قول وفعل کی اپنی ایک ماہیت وحقیقت ہے اسی پر ترتب ہوتا ہے جزاء یا سزا کا۔

قولہ: "الى يوم القيامة" یعنی اچھی بات کی صورت میں قیامت تک اس کے اعمال میں برکت واضافہ ہوتا رہتا ہے جیسے کسی نے کوئی اچھی بات کی مثلاً اس کے کہنے پر ایک بادشاہ نے ملک کا نظام عادلانہ بنایا اب وہ کہنے والا تو مر گیا مگر اس بات کے ثمرات اسے قیامت تک ملتے رہیں گے، اس کے برعکس اگر کسی کی بات پر بُرائی کی بنیاد پڑ گئی تو اس کے جانے کے بعد بھی اس بات کی نحوست قیامت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

کتنے ایسے لوگ گذرے ہیں جن کی باتوں سے آج ہم مستفید ہو رہے ہیں اور کتنے گلوکار اور شیطانی صفات کے حامل لوگ گذرے ہیں جن کی باتوں کا زہر آج بھی پھیل رہا ہے۔

باب ماجاء فی ھوان الدنیاعلی اللّٰہ

(اللہ کے نزدیک دنیا کی بے وقعتی کا بیان)

"لو كانت الدنيا تَعدِلُ عندالله جناح بعوضة ماسَقىٰ كافراً منها شَربَةَ مَاء". (صحيح غريب)

اگر دنیا اللہ کے یہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اس سے کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتے۔

تشریح:۔قولہ: "ھوان" بے وقعتی اور حقارت کو کہتے ہیں یعنی اللہ کے نزدیک دنیا کی کوئی قدر نہیں حتیٰ کہ اگر دنیا عنداللہ مچھر کے پر کے برابر ومساوی بھی ہوتی تو پوری دنیا کیا بلکہ پانی کا ایک گھونٹ بھی کافر کو نہ دیتے حالانکہ پانی ایک عام سی چیز ہے اور اس کے ایک گھونٹ کی کوئی قدر نہیں۔

اس حدیث میں دنیا کی مثال مچھر کے پر کے ساتھ دینے کا مطلب تحقیر ہے کیونکہ مچھر کا پر چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بے وقعت بھی، مع ھذا جب ہم کائنات میں کرۂ ارض کا موازنہ باقی اجرام فلکیہ کے ساتھ کرتے ہیں تو اس کی نسبت یقیناً مچھر کے پر سے کم ہے ہاں البتہ جب دنیا کا ذکر آتا ہے تو کبھی اس سے مراد دنیوی حیات ہوتی ہے اور کبھی مال واسباب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو یہاں مراد ہیں، چونکہ دنیا کی حیثیت ایک پُل کی ہے اس لئے یہ وسیلہ اور ذریعہ آخرت تو ہے مگر بذاتِ خود اس کی کوئی حیثیت نہیں، خصوصاً آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں۔

حدیث آخر:۔ حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان سواروں کے ساتھ تھا جو رُکے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک بھیڑ (یا بکری) کے مرے ہوئے بچے کے پاس، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ اپنے مالکوں کے ہاں بے وقعت ہے جب ہی تو انہوں نے پھینک ڈالا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا (ہاں) اے اللہ کے رسول! انہوں نے اس کو بے وقعتی کی وجہ سے ہی پھینک ڈالا ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا اللہ کے یہاں اس سے بھی زیادہ بے قدر ہے جتنا یہ اپنے مالکوں کے یہاں بے وقعت ہے۔ (حدیث حسن)

اس حدیث میں لفظ "سَخلَة" بروزن نخلۃ ہے بکری یا بھیڑ کے بچے کو کہتے ہیں۔ صرف جدید تحقیق ہی

نہیں بلکہ زمانہ غربت وجہالت میں بھی لوگ جانتے تھے کہ مراہوا جانور کھانا یا اپنے پاس رکھنا مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے اسی طرح جن لوگوں پر اللہ نے حقیقت کو منکشف کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ دنیا کی ماہیت کیا ہے؟ اگرچہ دنیادار اس پر ایسے ٹوٹ پڑتے اور لپکتے ہیں جیسے مکھیاں گندگی پر۔

حدیث آخر:۔"ان الدنیا ملعونة، ملعون ما فیھا اِلّا ذکر اللہ وَمَا وَالَاہ وعالم او متعلم". (حسن غریب)

بے شک دنیا ملعون ہے، جو اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے اور وہ جو اللہ کو پسند ہے اور عالم و متعلم کے۔

ملعون بمعنی مبغوض کے ہے یعنی دنیا اور اس کی وہ تمام چیزیں جو اللہ کی یاد سے غافل کردینے والی ہیں اللہ کو ناپسند ہیں "والاہ" بمعنی اَحَبَّہ یعنی جو چیزیں واعمال وغیرہ اللہ کی طرف کھینچتے اور قرب باری تعالیٰ کا ذریعہ بنتے ہیں وہ اللہ کو محبوب ہیں یہ اس صورت میں ہے جب اس کو "موالات" بمعنی دوستی ومحبت سے لیا جائے اگرچہ یہ باب مفاعلہ سے محبت جانبین کو مقتضی ہے مگر کبھی کبھی مفاعلہ وتفاعل وغیرہ ابواب میں یکطرفہ فعل بھی مراد ہوتا ہے اور یہاں بھی یہی مطلب ہے یعنی اللہ کو پسند ومحبوب ہونا۔ یا موالاۃ بمعنی مقارب اور متابع کے ہے یعنی جو چیزیں اللہ کے ذکر کی تابع اور مقارب ہیں وہ ملعون نہیں مثلاً علوم عربیت جتنے بھی ہیں اگر ان کو قرآن فہمی اور دین کی سمجھ کی غرض سے پڑھا اور پڑھایا جائے تو یہ قرآن کے تابع اور مقارب ہیں۔

قولہ:"عالم او متعلم" او بمعنی واؤ بھی ہوسکتا ہے اور تنویع کے لئے بھی ابن ماجہ کی روایت میں یہ دونوں منصوب آئے ہیں اور قاعدے کے مطابق وہی روایت اصح معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ ذکر اللہ پر عطف ہے جو بوجہ استثناء منصوب ہے۔

عالم اور متعلم کا ذکر ماوالاہ کے بعد ان کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے ہے کہ باقی لوگوں کا حال بے کار سا ہے جہاں تک علماء کا تعلق ہے تو اللہ نے ان کی خیر کا ارادہ فرمایا ہے"من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین" (بخاری جلد:۱ص:۱۶) بہرحال معلوم ہوا کہ کسی چیز کا حسن وقبح اس سے متعلق غرض پر مبنی ہے اگر کوئی عمل اللہ کے قرب کا ذریعہ بنتا ہے جیسے نیکی اور شرعی علم تو وہ اللہ کو محبوب ہے جبکہ اللہ سے دور کرنے والا ہر عمل اور ہر علم ملعون یعنی اللہ کو ناپسند ہے اگرچہ وہ ساری دنیا والوں کی نظر میں محبوب ہی کیوں نہ ہو۔

اس بارے میں ضابطہ گذرا ہے کہ صحیح نیت وغرض کی وجہ سے مباح اور عادت کو بھی عبادت بنایا جاسکتا

ہے جبکہ غلط ارادے سے مباحات گناہ بن جاتے ہیں۔فلیتدبر

حدیث آخر:۔"ماالدنیافی الآخرۃ الامثل مایجعل احدکم اصبعه فی الیم فلینظر بما ذا ترجع". (حسن صحیح)

آخرت کے مقابلے میں دنیا بس ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی داخل کرے سمندر میں پھر دیکھے کہ وہ کتنے پانی کے ساتھ لوٹتی (نکلتی) ہے۔

آج کل ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ اگرایک آدمی کی عمر سوسال پر مشتمل ہوتو وہ قیامت کے پچاس ہزارسال کے مقابلہ میں صرف تین منٹ کے بقدر بنتی ہے،اس میں بھی ایک منٹ بچپن کا،دوسرا سونے کا جبکہ تیسرا جوانی کے جوش و بیداری کامگر سوسال آج کس کو ملتے ہیں؟

بہرحال یہ موازنہ تو قیامت کے دن کے ساتھ ہے جبکہ اس کے مابعد کی زندگی تولامحدود ہے اس لئے کہاجائے گا کہ حدیث میں یہ مثال نہیں بلکہ نظیر ہےاور تقریب الی الفہم کے لئے دی گئی ہے۔یعنی جس طرح پانی کے ایک قطرہ کی سمندر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ایسا ہی دنیاوآخرت کا موازنہ فرض کیاجائے اور سمجھا جائے۔

باب ماجاء ان الدنیاسجن المؤمن وجنة الکافر

(دنیامؤمن کی جیل اورکافر کی جنت ہے)

"الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر". (حسن صحیح)

دنیامؤمن کے لئے قیدخانہ (کی مانند) ہےاور کافر کے لئے جنت (کی طرح) ہے

تشریح:۔جیل میں آدمی اپنی مرضی سے جو کچھ چاہے کرنے کامجاز نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے محدود دائرہ ہوتا ہےاس کے اندر رہناپڑتا ہے،بحیثیت مسلمان ہرآدمی کودنیامیں اوامرونواہی کے دائرے میں محدود کردیا جاتا ہے ،سارے محرمات شدید خواہش کے باوجود ممنوع ہوتے ہیں اور جس طرح بامشقت قید میں کام کاج بھی کرنا پڑتا ہےاسی طرح مؤمن پر احکام تکلیفیہ کا بار بھی لدارہتا ہے جوزندگی بھراس کے کندھوں پر پڑا رہتا ہےعلاوہ ازیں جیل میں دیگر مصائب کی بھی بوچھاڑ ہوتی ہے مؤمن بھی ان مراحل سے گذرتا ہےخواہ وہ اس کے اختیار میں ہوں جیسے فقراختیاری اور نفلی روزہ وغیرہ یاوہ بےاختیار ان میں مبتلا ہوجیسے بیماریاں اوردکھ درد وغیرہا۔

جب مؤمن مرتا ہے تو ان مصائب و آلام سے آزاد ہو کر جنت میں ہر قسم کی خواہش پوری کرنے میں آزاد ہو جاتا ہے جبکہ کافر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

باب ماجاء مَثَلُ الدنیا مَثَلُ اربعة نفر

(دنیا کی حالت، چار آدمیوں کی حالت)

"ثلاث أُقسم علیهن ،وأُحَدِّثکم حدیثاً فاحفظوه ،قال :مانقص مالُ عبد من صدقة، ولا ظُلِمَ عبد مظلمة صبر علیها إلّا زاده الله عِزّاً ،ولا فتح عبدٌ بابَ مسئلة الا فتح الله علیه بَابَ فقر او کلمة نحوها، وأُحَدِّثکم حدیثاً فاحفظوه ،قال انما الدنیا لاربعة نفرٍ عبدٍ رَزَقَه الله مالاً وعلماً فهو یتقی رَبَّه فیه ویصل به رَحِمَهُ ویعلم لله فیه حقاً فهذا بافضل المنازل ،وعبدٍ رزقه الله عِلماً ولم یرزقه مالاً فهو صادق النیة یقول لو ان لی مالاً لَعَمِلتُ بعمل فلان، فهو بنیّتهٖ فَاَجرُهما سواء ،وعبد رزقه الله مالاً ولم یرزقه علماً ،یخبِطُ فی ماله بغیر علم لا یتقی فیه ربه ولا یصل فیه رَحِمَه ولا یعلم لِلّٰه فیه حقا فهو باخبث المنازل وعبدٍ لم یرزقه الله مالا و لا علما فهو یقول: لو ان لی مالاً لَعَمِلتُ فیه بعمل فلان فهو بنیّتهٖ فَوِزرُهما سواء ".(حسن صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں اور ایک حدیث تم لوگوں سے بیان کرتا ہوں اس کو یاد رکھو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کم نہیں ہوا کسی بندے کا مال صدقہ دینے سے، اور کسی بندے پر کوئی (چھوٹی بڑی زیادتی والا) ظلم نہیں کیا گیا اور اس نے اس پر صبر کیا مگر اللہ اس کی عزت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور نہیں کھولا کسی بندہ نے سوال کا دروازہ مگر اللہ اس پر فقر کا دروازہ کھول دیتے ہیں یا اس طرح کوئی بات فرمادی۔ (یعنی مضمون یہی ہے اور الفاظ شاید یہ نہ ہوں) اور ایک حدیث بیان کرتا ہوں اسے یاد کرو! پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا چار آدمیوں کے درمیان ہے:

(۱)......اول وہ بندہ جس کو اللہ نے مال اور علم دیا ہو پس وہ اس کے حوالے سے اللہ سے خوف کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ صلہ رحمی کرتا ہے اور اس کے بارے میں اللہ کا حق بھی جانتا ہے تو ایسا شخص بہتر مرتبہ پر ہے۔

(۲)......دوم وہ بندہ جس کو اللہ نے علم تو دیا ہے لیکن اسے مال نہیں دیا ہے پس وہ نیت میں سچا ہے (دل میں) کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں (امیر و عالم) کی طرح عمل (خرچ) کرتا پس وہ شخص

اپنی نیت کی وجہ سے ماجور ہے، ان دونوں کا ثواب برابر ہے۔

(۳)......سوم وہ بندہ جس کو اللہ نے مال تو دیا ہے مگر علم نہیں دیا ہے وہ اپنا مال بے علمی میں خراب کرتا ہے نہ تو اس کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ اس میں اللہ کا حق جانتا (سمجھتا) ہے پس وہ شخص بُرے مقام پر ہے۔

(۴)...... چہارم وہ بندہ جس کو اللہ نے نہ تو مال دیا ہے اور نہ ہی علم، پس وہ کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں (مالدار جاہل) کی طرح عمل کرتا پس وہ اپنی نیت کے مطابق (گنہگار) ہے دونوں کا گناہ برابر ہے۔

تشریح:۔قولہ:"مظلمة" بفتح المیم وکسر اللام مصدر ہے تنوین تنکیر کے لئے ہے۔

قولہ:"عبد" چاروں مقامات پر مجرور ہیں کہ نفر سے بدل ہیں۔**قولہ:**"یخبط" بکسر الباء باب ضرب سے بمعنی روندنے، سخت کچلنے کو کہتے ہیں یعنی بے سوچے سمجھے خرچ کرتا ہے جہاں خواہش ہوئی وہاں خرچ کر دیا، علم اور شریعت کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھتا۔

اس حدیث شریف میں انتہائی اہم باتیں فرمائی گئی ہیں ایک یہ کہ صدقہ کرنے سے مال میں کمی نہیں آتی یہ باعتبار دنیا کے بھی صحیح ہے کیونکہ سخی آدمی کا ہاتھ کبھی بھی پیسوں سے خالی نہیں ہوتا اور باعتبار آخرت کے بھی صحیح ہے کیونکہ جو صدقہ دیا جاتا ہے وہ درحقیقت کم اور ضائع نہیں ہوتا بلکہ دار آخرت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے یہ ایسا ہے جیسے کوئی آدمی اپنے مال کا کچھ حصہ یقینی نفع بخش کاروبار میں لگائے جیسے آج کل لوگ بینکوں میں جمع کرانے کو گھٹنا نہیں کہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ تجربہ شاہد ہے کہ جو کوئی بھی کسی کی زیادتی پر صبر کرتا ہے تو اس سے اس کی عزت اور وقار میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔تیسری بات یہ ہے کہ تجربہ گواہ وناطق ہے کہ جو شخص بھیک اور گدائی کا عمل شروع کرتا ہے تو زندگی بھر وہ اس کو پیشہ اختیار کر کے دوسروں کے دروازوں پر دستک دیتا رہتا ہے حتیٰ کہ مسجد میں بھی وہ اللہ سے مانگنے کے بجائے مخلوق سے مانگتا رہتا ہے، یہ باتیں اتنی یقینی ہیں کہ ان پر آپ علیہ السلام نے قسم کھائی ہے اور آج تک ان میں کوئی دوسرا پہلو نظر نہیں آیا ہے۔او کلمة نحوها شک من الراوی کے لئے ہے جہاں تک مابعد حدیث کا تعلق ہے تو اس میں مجموعی طور پر چار اقسام کو بیان کیا گیا ہے اور تقریباً سارے افراد ان میں منحصر ہیں ایک وہ جس کے پاس علم و مال دونوں کی دولت ہے اور وہ علم کے مقتضی پر چلتا ہوا مال کو خرچ کرتا ہے یہ

بے شک اچھا ہی آدمی ہے دوم وہ جو عالم تو ہے مگر مالدار نہیں تاہم اس کا جذبہ پہلے والے شخص کی طرح ہے تو اسے بھی صدق نیت اور عزم کی وجہ سے پورا ثواب ملتا ہے۔

سوم وہ جو جاہل اور مالدار ہے وہ اپنا مال خواہشات میں خرچ کرتا ہے اور جہالت کی بناء پر اس کی وعید اور انجام بد سے نہیں ڈرتا یہ اپنی دنیا کی وجہ سے گنہگار ہو جاتا ہے۔ چہارم وہ ہے جو غریب بھی ہے اور جاہل بھی، مگر وہ باوجود غربت کے تیسرے آدمی کے عمل پر رشک کرتا ہے اور تمنی کرتا ہے کہ اگر مال ملا تو وہ بھی عیاشی کرے گا تو وہ اس حرصِ گناہ کی وجہ سے جاہل مالدار کی طرح گنہگار ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی هَمِّ الدنیا و حُبِّها

(دنیا کی فکرمندی اور محبت کے بیان میں)

"من نزلت به فاقة فَاَنزَلَهَا بالناس لم تُسَدفاقته ومن نزلت به فاقة فانزلها بالله فیوشک الله له برزق عاجل او اٰجل". (حسن صحیح غریب)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس کو فاقہ (فقر) پیش آئے اور وہ اسے لوگوں کے سامنے رکھ دے تو اس کا فاقہ بند (ختم) نہیں کیا جائیگا۔ اور جس شخص کو فاقہ عارض ہو جائے اور وہ اس کو اللہ کے حوالے کر دے تو قریب ہے کہ اللہ اس کو جلد یا بدیر رزق عطا فرمادے۔

تشریح:۔ کاملین کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا دکھ درد مخلوق کے سامنے بیان نہیں کرتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ''اِنما اَشکو بَثّی و حزنی الی اللّٰه''۔ (یوسف آیت نمبر:۸۶) مگر اکثر عوام صبر کے دائرہ سے جلد ہی نکل جاتے ہیں اور تھوڑی سی آزمائش میں بھی آہ و بکا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر یہ چیز اللہ کے حضور ہو تو یہ آزمائش میں کامیابی کی علامت ہے مگر لوگوں کے سامنے جزع و فزع اور سوال کرنا ناکامی کی نشانی ہے۔ اس پر اللہ ناراض ہو جاتا ہے اور بندے کو اسی حالت پر چھوڑ دیتا ہے چنانچہ وہ ہمیشہ کے لئے گداگری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے اگرچہ وہ مادی اعتبار سے بہت بڑا مالدار کیوں نہ بن جائے۔ اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ اگر کوئی دور غربت و افلاس کا آجائے تو بجائے مخلوق کے خالق کی طرف انابت کی جائے حسب ایمان کی پختگی کے بعد اللہ جل جلالہ تکلیف کو دور فرما کر آسانی و مہربانی کا معاملہ فرمادے گا بایں صورت کہ دنیا میں بھی آرام عطاء فرمائے ورنہ آخرت میں دے دے گا یہ اس صورت میں کہ عاجل سے مراد دنیا اور آجل سے آخرت لی جائے، اگر عاجل

واجل دونوں کا تعلق دنیا سے ہوتو پھر مطلب یہ ہے کہ یا جلدی دے کہ بغیر کمائے کسی ذریعہ کے اسے مالدار بنائے مثلاً وراثت کا ملنا یا کسی اور ذریعہ سے اور آجل جیسے اس کی نوکری لگ جائے اور اس میں بچت شروع کردے یا تجارت وغیرہ یا اس کے بیٹے بڑے ہوکر اس کی تسکین کا ذریعہ بن جائیں۔

حدیث آخر:۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ابو ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ جو کہ بیمار تھے کے پاس عیادت کی غرض سے تشریف لائے، حضرت معاویہؓ کہنے لگے اے ماموں! آپ کو کیا چیز رُلاتی ہے؟ کوئی درد ہے جو آپ کو اذیت دیتا ہے یا دنیا کی حرص؟ ابو ہاشم نے کہا ایسی کوئی بات نہیں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا تھا (یعنی وصیت فرمائی تھی) جو میں پورا نہ کرسکا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: بس تمہیں مال جمع کرنے کے لئے ایک خادم اور ایک سواری راہِ خدا کے لئے کافی ہے جب کہ میں آج اپنے آپ کو (اس سے زیادہ) مال جمع کرنے والا پاتا ہوں۔

تشریح:۔ ابو ہاشمؓ فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے مگر پھر شام میں قیام پذیر ہوئے تھے، باب کا واقعہ وہیں پیش آیا، یہ حضرت معاویہؓ کے ماموں تھے۔

قولہ: "اَوَجع یشئزک" وجع درد کو کہتے ہیں اور یشئز باب افعال سے قلق کو اور بے چین و پریشان کردینے کو کہتے ہیں۔

قولہ: "کل لا" ای کل من ھذین الامرین لایشئزنی یعنی رونے کی وجہ ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے مجھے ایک وصیت فرمائی تھی جس پر میں پوری طرح عمل نہ کرسکا، ابو ہاشم کا نام شیبہ بن عتبہ بن ربیعہ ہے الکوکب الدری میں ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے پاس سولہ دراہم تھے، تحفۃ الاحوذی میں ہے کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کے ترکہ کی قیمت لگادی گئی تو وہ تیس دراہم تک پہنچ گیا جس میں ایک وہ پیالہ بھی شامل تھا جس میں آٹا گوندھا جاتا اور کھانا کھایا جاتا تھا۔ (بحوالہ رزین)

حدیث آخر:۔ "لاتتخذوا الضیعة فترغبوا فی الدنیا". (حسن)

"جاگیر مت بناؤ ورنہ دنیا ہی میں لگ جاؤ گے۔"

ضیعہ مالداری کے ذرائع واسباب کو کہتے ہیں جیسے زمینداری اور باغات وباغبانی وغیرہ یعنی کوئی بھی جائیداد خواہ زمین کی شکل میں ہو یا جیسے آج کل ملوں اور فیکٹریوں کی صورت میں۔

حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ معاش کا کوئی ذریعہ اختیار نہ کرو بلکہ معنی یہ ہیں کہ اپنے دنیوی مشاغل

اور کاروبار کو زیادہ مت پھیلاؤ کیونکہ اس طرح تم اللہ کے ذکر اور آخرت کی فکر سے محروم ہو جاؤ گے چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ جن لوگوں کا وسیع کاروبار ہوتا ہے وہ باقی ذکر واذکار کیا بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے الا ماشاء اللہ وقلیل ما ہم، اور جب ان سے کہا جائے تو کہتے ہیں کیا کریں ٹائم ہی نہیں ملتا، ان کی نظر میں اپنے کام کی اہمیت نماز سے بھی زیادہ ہوتی ہے بہر حال دنیا اگر اللہ کے ذکر سے غافل کر دینے والی بنے تو یہ دشمن ہے اور زہر آلود شہد ہے اس لئے عالَمِ مثال کے قانون کے مطابق قبر میں آدمی پر اژدھا مسلط کر دیا جاتا ہے جو بظاہر خوشنما اور درحقیقت انتہائی المناک ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح طریقہ سے کمایا جائے اور شرعی طریقہ پر صرف کیا جائے یعنی آمد و رفت میں کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ کیا جائے تو دنیا ہرگز مذموم نہیں بلکہ ممدوح بن جاتی ہے تاہم چونکہ اکثر لوگ اس میں احتیاط نہیں کرتے اس لئے شریعت میں اس سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ خطرات سے یقینی طور پر بچا جائے، غرض مال میں سے حقوق ادا کرنے کے بعد وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے سانپ کا زہر نکال پھینکا جائے۔ ورنہ وہ زہریلا سانپ بن کر قیامت میں اس کا طوق بنا رہے گا۔

آج کل لوگ فقر وفاقہ پر صبر نہیں کر سکتے ہیں اس لئے لوگوں کو زہد کے اس معیار پر چلانا جس پر اسلاف گذرے ہیں ناممکن بلکہ خطرناک ہے اور ''کاد الفقر ان یکون کفراً'' ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے جو ایمانی حالت کے حوالہ سے کمزور ہوں اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ خود بھی اور لوگوں کو نصیحت میں بھی یہ اصول اپنایا جائے کہ دنیا حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں احتیاط کی جائے، چنانچہ مشکوۃ شریف میں اس کے لئے ایک باب بعنوان ''استحباب المال و العمر للطاعة'' باندھا گیا ہے۔ اس کی فصل سوم میں امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا گیا ہے:

''قال: کان المال فیما مَضیٰ یُکرَہ فاما الیوم فھو تُرس المؤمن وقال: لو لاھذہ الدنیا لَتَمَندَل بنا ھؤلاء الملوک، وقال: من کان فی یدہ من ھذہ شیء فلیصلحہ فانہ زمان اِن احتاج کان اول من یبذل دینہ الخ''. (ص:۴۵۱)

یعنی اگلے زمانہ میں مال معیوب سمجھا جاتا تھا جب کہ آج وہ مسلمان کی ڈھال ہے اگر یہ دنیا (مالداری) نہ ہوتی تو یہ حکمران ہمیں پونچھا بنا دیتے (یعنی اپنی مذموم غرض میں استعمال کرتے اور تحقیر کرتے) اور فرمایا جس کے پاس کچھ مال ہو تو اس کی حفاظت کرے کیونکہ یہ ایسا زمانہ ہے کہ اگر مال کی ضرورت پڑے گی تو وہ سب سے پہلے اپنا دین دنیا پر قربان کرے گا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نوکری کی خاطر آغا خانی اور قادیانی وغیرہ بن جاتے ہیں والعیاذ باللہ، بہر حال اصل چیز اللہ کی اطاعت اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے اس کے لئے اطمینان، دلجمعی اور یکسوئی درکار ہے کسی کو غربت میں عبادت کا زیادہ موقع ملتا ہے یہ عام لوگوں کا حال ہے جب کہ بعض کو مالداری میں یہ کیف نصیب ہوتا ہے۔

مدرس کے لئے بھی یہ ضابطہ ہے کوئی مدرس کم تنخواہ میں صحیح کام کرتا ہے جب کہ بعض حضرات زیادہ تنخواہ لے کر اپنے کام کے لئے یکسو ہو جاتے ہیں ہر آدمی اپنی حالت کے مطابق لائحہ عمل طے کرے۔

باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن

(مؤمن کی درازی عمر کی فضیلت)

"عن عبداللہ بن قیس ان اعرابیاً قال: یارسول اللّٰہ!من خیر الناس ؟قال:من طال عمرُہ وحَسُنَ عَمَلُہ". (حسن غریب)

ایک اعرابی نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! لوگوں میں بہتر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ جس کی عمر دراز، اور عمل اچھا ہو۔

صاحب تحفۃ الاحوذی نے نقل کیا ہے کہ صحیح عبداللہ بن بُسر ہے، نہ کہ قیس۔

نیک عمل پر آخرت میں بہت کچھ ملتا ہے اس لئے عمل جتنا زیادہ ہوگا اُخروی نعمتوں میں اس قدر اضافہ ہوگا الّا یہ کہ اللہ عزوجل کسی کے تھوڑے سے عمل میں برکت دے۔ اور کثیر عمل کے لئے طویل مدت درکار ہے، اس کے برعکس جس نے جتنے زیادہ گناہ کئے اسی تناسب سے آخرت میں وبال پائے گا اس لئے اگلی حدیث میں بُرے لوگوں کے بارے میں پوچھے گئے سوال پر فرمایا کہ بُرے وہ ہیں جن کی عمریں طویل اور اعمال بُرے ہوں۔

باب ماجاء فی اعمار ھذہ الامۃ مابین ستین الیٰ سبعین

(اس امت کی عمر 60 تا 70 سال کے درمیان ہے۔)

"عُمر امتی من ستین سنۃ الیٰ سبعین". (حسن غریب)

میری امت کی عمر ساٹھ تا ستر سال ہے۔

یعنی عام طور پر اوسط عمر ساٹھ ستر سال ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ ساٹھ کی دہائی میں انتقال کر جاتے ہیں اگر چہ بعض لوگ ساٹھ سے پہلے اور بعض ستر کے بعد مرتے ہیں، اسی طرح عمومی اقوام کی زندگیاں اتنی ہیں یعنی اوسط ساٹھ، ستر سال ورنہ بعض ممالک جیسے جاپان کے لوگوں کی عمریں اوسطاً ستر سے متجاوز ہوتی ہیں، جبکہ افغانستان اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں اوسط عمریں ساٹھ سے کم ہیں۔

حدیث کا سیاق اس بات کی تلقین ہے کہ ہر آدمی کو سوچنا چاہئے کہ وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا عملِ صالح کی کوشش تیز تر کر دے۔

باب ماجاء فی تقارب الزمن وقصر الْاَمَل

(زمانہ کا سمٹنا اور امید کا چھوٹا پا)

"عن انس بن مالک قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لاتقوم الساعۃ حتیٰ یتقارب الزمان ویکون السنۃ کالشھر والشھر کالجمعۃ وتکون الجمعۃ کالیوم ویکون الیوم کالساعۃ وتکون الساعۃ کالضَرَمَۃ بالنار". (غریب)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ کوتاہ ہو جائے گا چنانچہ ایک سال ایک ماہ کی مانند ہو جائے گا اور مہینہ جمعہ کی طرح اور جمعہ ایک دن جیسا ہوگا اور ایک یوم ایک گھڑی (گھنٹے) جیسا لگے گا اور ایک گھڑی آگ کی بھڑک کی طرح ہوگی۔

تشریح:۔قولہ "ضرمۃ" بفتح الضاد وسکون الراء بروزن رحمۃ اور راء کا فتحہ بھی صحیح ہے یعنی بروزن رَقَبَۃ آگ کا شعلہ جب بلند ہو کر بجھ جائے ضرمہ کہلاتا ہے۔ زمانہ کی رفتار تو ہمیشہ ایک ہی طرح جاری ہے کہیں ہزاروں یا سینکڑوں سالوں میں ایک دو سیکنڈ کا فرق آجاتا ہے اس لئے حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ زمانہ کی رفتار تیز ہو جائے گی پھر کیا مطلب ہے؟ تو اس بارے میں شروحات میں متعدد توجیہات کی گئی ہیں جن میں راجح دو ہی ہیں ایک یہ کہ مراد برکت کا اٹھ جانا ہے کہ جو کام تھوڑی دیر میں ہوسکتا ہے وہ گھنٹہ بھر میں ہوگا اور گھنٹے کا کام پورے دن میں ہو سکے گا، اس طرح دن کا کام جمعہ میں، جمعے کا ایک ماہ میں اور مہینہ کا پورے سال میں چنانچہ

اسلاف نے جو کارنامے اپنی حیات میں سرانجام دیئے ہیں آج کئی لوگ مل کر بھی وہ کام نہیں کر سکتے ہیں وہ ایک ہی دن میں ہزاروں احادیث یاد کرتے مگر آج وہ کام سال میں بھی نہیں ہوسکتا وہ ایک دن میں ایک کتاب تصنیف کرتے جس سے آج لوگ قاصر ہیں تصنیف تو بڑی بات ہے تالیف کے لئے بھی بہت وقت درکار ہے وعلیٰ ھذا القیاس۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیاداری و مالداری بڑھے گی اور دین کا اہتمام کم یا ختم ہوگا پس لوگ خرمستیوں میں مصروف ہوں گے جن کی زندگی سکر اور نشہ کی حالت کی طرح گذرے گی جس میں وقت کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔

باب ماجاء فی قصر الامل

(کوتاہ امیدوں کے بارے میں)

"عن ابن عمر قال اخذ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ببعض جسدی قال کُن فی الدنیا کانک غریب اوعابر سبیل وَعُدَّ نفسَکَ من اھل القبور، فقال لی: ابن عمر! اذا أصبحتَ فلا تُحدِّث نَفسَکَ بالمساء واذا اَمسیتَ فلا تحدِّث نفسک بالصباح وخُذ من صحتک قبل سَقَمِکَ ومن حیاتک قبل موتک فانک لا تدری یاعبداللّٰہ مااسمکَ غداً"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کے ایک حصے (عضو یعنی کندھے) کو پکڑ کر فرمایا کہ دنیا میں یوں رہا کرو جیسا تم کوئی پردیسی ہو یا (بلکہ) ایک مسافر ہو جو راستہ سے گذر رہے ہو اور خود کو قبرستان والوں میں سے شمار کرتے رہنا اور فرمایا مجھ سے کہ اے ابن عمر! جب تم صبح کو اٹھو تو اپنے ساتھ شام کی باتیں مت کرو اور جب شام تک زندہ رہو تو دل میں صبح (کل) کی باتیں مت سوچو اور اپنی بیماری سے قبل ہی اپنی صحت سے فائدہ اٹھاؤ اور زندگی سے نفع حاصل کرو موت آنے سے پہلے کیونکہ اے عبداللہ! تم نہیں جانتے ہو کہ کل تیرا نام کیا ہوگا؟ (یعنی زندہ یا مردہ یا صالح او طالح؟)

تشریح:۔قولہ: "**ببعض جسدی**" اس روایت میں ابہام ہے جبکہ بخاری شریف میں "**بِمنکبی**" کی تصریح ہے لہٰذا یہاں بھی کندھا ہی مراد ہے جس کے پکڑنے سے مراد مخاطب کی توجہ بات پر مرکوز کرنا ہوتی ہے۔**قولہ:** "**غریب**" نامانوس اور پردیسی کو کہتے ہیں۔

قولہ: "عابر" عبور سے ہے بمعنی گذرنے کے "او عابر سبیل" میں او کا لفظ شک کے لئے نہیں بلکہ تخییر کے لئے ہے جیسے جالسِ الحسن اوابن سیرین، یا بمعنی بل کے ہے۔ قولہ: "عُدَّ" بضم العین وتشدید الدال عدَّ یَعُدّ سے امر کا صیغہ ہے۔

قولہ: "فقال لی ابن عمر" اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ قال کا فاعل ابن عمر ہو علیٰ ھذا ابن مرفوع ہوگا اور اس کا قائل حضرت مجاہد ہوں گے پس مرفوع حدیث اہل القبور پر ختم ہوئی اور آگے ابن عمرؓ مجاھد کو نصیحت فرمارہے ہیں، بخاری کی روایت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ بھی مرفوع حدیث کا حصہ ہو اور پوری حدیث مرفوع ہو علیٰ ھذا ابن عمر میں ابن منادی مضاف کی وجہ سے منصوب پڑھا جائے گا اور حدیث کے آخری جملہ "فانک لاتدری یاعبد اللہ" سے اس کی تائید بھی ہورہی ہے۔ واللہ اعلم

قولہ: "سقمک" اس لفظ میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر سین پر فتحہ پڑھا جائے تو قاف کو بھی مفتوح پڑھا جائے گا جبکہ سین کے ضمہ کی صورت میں قاف کو ساکن پڑھا جائے گا۔

حدیث کا مطلب بالکل واضح ہے کہ دنیا میں دل لگا کر اسے مستقل ٹھکانہ اور مقصد حیات نہیں بنانا چاہئے بلکہ ایک پردیسی کی طرح صرف عارضی ٹھکانہ اختیار کیا جائے پھر ترقی کر کے فرمایا کہ مسافر کی طرح بننا چاہئے جو اگلی منزل طے کرنے کے لئے کچھ دیر کے لئے درخت کے نیچے استراحت کی غرض سے ٹھہرتا ہے اور جب پسینہ خشک ہو جائے اور ٹانگوں میں جان آجائے تو پھر چل پڑتا ہے تاکہ منزل تک پہنچ جائے، پھر اس میں ترقی کر کے فرمایا کہ اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرنا چاہئے کہ گویا زندگی نام کی چیز ختم ہی ختم ہے اب میرا معاملہ اللہ کی عدالت میں ہے اور میں اس کے رُوبرُو کھڑا ہوں، اس لئے ایک دن بھر کی منصوبہ بندی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ اور صحت میں زیادہ عمل کرے تاکہ بیماری میں زائد عبادت کا ثواب ملتا رہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے متعدد پہلو ہیں آپ علیہ السلام بحیثیت استاذ مخاطبین کی حالت کو جس طرح سمجھتے اور تربیت فرماتے اس سے اچھا کون کرسکتا ہے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتماعی تعلیم دیتے اور کبھی انفرادی طور پر فرداً فرداً کو الگ الگ پیرایہ میں سمجھاتے، یہ استاذ کی ذہانت ومہارت پر منحصر ہے کہ وہ ہر ہر شاگرد کی صلاحیتوں کو کس طرح سمجھ سکتا ہے، اس لئے آپ علیہ السلام صحابہ کے افراد میں صلاحیتوں کو بھانپ کر ان کے مناسب حال تعلیم دیتے، یہ نکتہ بہت سے مقامات میں کارآمد ہے اور

بہت سے اشکال کے حل میں معاون ومفید ہے۔

حدیث آخر:۔"هذاابن آدم وهذا اجله ووضع يده عند قفاه ثم بَسَطَها فقال وثَمَّ اَمَلُه وَثَمَّ اَمَلُه". (حسن صحيح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آدمی ہے اور یہ اس کی اجل ہے اور اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ گردن پر رکھ کر پھر اسے (آگے کی طرف) پھیلا دیا اور فرمایا وہاں اس کی امید ہے، وہاں اس کی امید ہے۔

تشریح:۔حدیث میں تمثیل وتشبیہ ہے کہ آدمی کی موت اس کے اتنی قریب ہوتی ہے جیسے یہ ہاتھ گردن کے قریب ہے شاید "عند قفاه" کی تعبیر میں یہ اشارہ مقصود ہو کہ آپ علیہ السلام نے ہاتھ مبارک کو گردن سے لگایا نہ ہو بلکہ تھوڑا سا فاصلہ گردن اور ہاتھ کے درمیان رکھا ہو یعنی موت آدمی پر ہر وقت ننگی تلوار کی طرح لٹکتی اور سوار رہتی ہے اور کسی بھی وقت "انشبت المنية اظفارها" کا قضیہ صادق ہوسکتا ہے تو ایک طرف موت اپنے پنجے گاڑنے کے لئے حکم کی منتظر ہے اور دوسری طرف آدمی اپنی اجل سے کہیں زیادہ اور دور دور کی منصوبہ بندیوں میں مصروف عمل رہتا ہے کہ موت گردن کے پاس ہے اور دنیوی اھداف وہاں دور ہیں جس کی طرف آپ علیہ السلام نے ہاتھ پھیلا کر اشارہ فرمایا۔ پل کی خبر نہیں سامان سو برس کا۔

حدیث آخر:۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام ہمارے پاس سے گذرے جبکہ ہم اپنا ایک چھپرہ درست کر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کیا کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ یہ ذرا ڈھیلا ہو گیا تھا تو ہم اسے ٹھیک یعنی ٹائٹ کر رہے ہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو امر (موت) کو اس سے جلدی (قبل) آتے دیکھ رہا ہوں۔

اس حدیث میں "نعالج" بضم النون وکسر اللام بمعنی اصلاح کے ہے اصل میں عالج کے کئی معنی آتے ہیں ازاں جملہ ایک انجام دہی اور حل نکالنا بھی آتے ہیں۔

قوله: "خُصّالنا" بضم الخاء وتشدید الصاد لکڑی یا بانس کی جھونپڑی یا چھپر کو کہتے ہیں۔

قوله: "وَهی" ، بمعنی ضعف یعنی سُست وکمزور ہو گیا ہے۔

قوله: "ماأُریٰ الامرالخ" بضم الھمزة بمعنی اظن یعنی میں موت کو اس جھونپڑی کی ویرانی سے قبل آنے والا سمجھتا ہوں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے خیال میں طویل زندگی گذارنے کے لئے طویل المدتی رہائش گاہ کی ضرورت ہے اس لئے آپ اپنے گھر وغیرہ کی مرمت میں لگے ہوئے ہو حالانکہ آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ موت اس کے بالکل قریب ہے لہٰذا لمبی امیدیں نہیں رکھنی چاہئے۔

پس یہاں صیغہ اگرچہ متکلم کا ہے مگر مراد اس سے مخاطب پر تعریض ہے کہ آپ کو اتنی طویل امید نہیں رکھنی چاہئے جیسے سورت یٰسٓ کی اس آیت "ومالی لااعبدالذی فطرنی" میں صیغہ متکلم کا ہے مگر مقصود تعریض ہے یعنی "مالکم لاتعبدون الذی فطرکم" کیونکہ اس طرح وعظ ونصیحت زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ (ہٰذا حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء ان فتنة هذه الامة فی المال

(اس امت کا فتنہ مال میں ہے)

"عن کعب بن عیاض قال سمعت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: ان لکل امة فتنةً وفتنة امتی المال". (حسن صحیح غریب)

ہرامت کے لئے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

تشریح: ۔قرآن پاک میں بھی ہے "اِنما اموالکم واولادکم فتنة" الایۃ ۔شاہ ولی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لوگوں کے اقسام سے تفصیلاً بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے اندر دو قسم کی قوتیں ہیں: (۱) ایک قوت ملکیہ (۲) دوم قوت بہیمیہ، چونکہ زیادہ تر لوگوں میں قوت بہیمیہ کا غلبہ رہتا ہے اور زیادہ کھانے پینے سے اس کو مزید فروغ بھی ملتا ہے اس لئے مال آنے کی صورت میں انسان عموماً قوت بہیمیہ کے تقاضوں کو پورا کرنا اپنی ضرورت اور زندگی کا مقصد سمجھنے لگتا ہے چونکہ مال کی فراوانی میں قوت بہیمیہ کے تقاضے بھی بڑھ جاتے ہیں اس لئے فکر آخرت سے بے نیاز ہو کر آدمی عیاشی میں گھر جاتا ہے جس سے بڑا فتنہ کیا ہوسکتا ہے، یہ بڑے فتنہ کا ذکر ہے ورنہ جس طرح دوسری امتوں کے بہت سارے فتنے تھے اسی طرح اس امت کے فتنے بھی زیادہ ہیں مگر مال اکثر فتنوں کا دروازہ ہے اس لئے بطور خاص اس کا ذکر فرمایا۔

باب ماجاء لو کان لابن آدم وادیان من مال لابتغیٰ ثالثاً

(اگر ابن آدم (آدمی) کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری بھی طلب کرے گا)

"لو کان لابن آدم وادیاً من ذهب لأحبَّ ان یکون له ثانیاً ولا یملأُ فاه اِلّا التراب ویتوب الله علی من تاب". (حسن صحیح غریب)

اگر ابن آدم کے پاس سونے کی ایک وادی ہو تو وہ چاہے گا کہ اس کے پاس دوسری بھی ہو اور اس کے منہ کو نہیں بھر سکتی (کوئی چیز) سوائے مٹی کے اور اللہ رحم فرماتے ہیں اس شخص پر بھی جو باز رہے۔

تشریح:۔ شروع کتاب میں عرض کیا جاچکا ہے کہ امام ترمذیؒ اکثر و بیشتر تراجم مذکور فی الباب کی احادیث سے لیتے ہیں مگر کبھی کبھار کسی دوسری حدیث سے بھی اخذ کرتے ہیں اور شاذ و نادر بطور استنباط بھی ذکر فرماتے ہیں چنانچہ یہاں باب کی حدیث میں صرف ایک وادی کا ذکر ہے اس لئے یا تو ترجمۃ الباب صحیحین کی اس حدیث سے لیا گیا ہے جس میں وادیان کا لفظ ہے یا کہا جائے گا کہ انہوں نے حدیث کے معنی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ ترجمہ ذکر کیا ہے کہ حدیث الباب کو حصر پر محمول نہ کیا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ ابن آدم کی حرص اور ہوس مال کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے وہ نہ ایک وادی پر اکتفا کرتا ہے اور نہ دو اور تین وغیرہ پر۔

قوله:"ولا یملأُ فاه الا التراب" تراب سے مراد قبر کی مٹی ہے اور لا یملأ الخ کنایہ ہے مسلسل حرص اور حُبِّ دنیا سے یعنی آدمی جب تک زندہ رہتا ہے مسلسل دنیا کی تلاش میں رہتا ہے اور جب مرجاتا ہے تو اس کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ یعنی حقیقت منکشف ہونے پر اس کا دل و دماغ ٹھنڈا ہو کر منہ بند اور پیٹ بھر جاتا ہے یعنی طلب ختم ہو جاتی ہے۔

قوله:"ویتوب الله الخ" میں اشارہ ہے کہ آدمی اگرچہ ایک طرف حُبِّ دنیا کو لیے پیدا ہوتا ہے مگر دوسری طرف وہ اس محبت کے ازالہ پر مامور ہے اور اس کا ازالہ کوئی ناممکنات میں سے نہیں کہ تکلیف بمالا یطاق لازم آجائے اس لئے جو شروع ہی سے حب مال سے اپنا سینہ پاک رکھے گا وہ تو ہے ہی مرحوم مگر جو کسی حد تک جانے کے بعد ہوش کے ناخن لے کر اپنی ہوس کو مزید آگے جانے سے روکے اور فکر کثرت مال کے بجائے فکر آخرت کی طرف رجوع کرے اور دنیا صرف ضرورت سمجھ کر حاصل کرے اور غلط آمد و خرچ سے باز آجائے تو اللہ اس پر بھی رحم فرماتے ہیں۔ اس موضوع پر راقم نے نقش قدم میں تفصیل سے لکھا ہے۔

باب ماجاء قلب الشیخ شابّ علی حُبّ اثنتین

(بوڑھے کا دل دو چیزوں کی محبت میں جوان رہتا ہے)

"قلب الشیخ شابٌ علی حُبِّ اثنتین طولِ الحیاۃ و کثرۃِ المال". (حسن صحیح)

بوڑھے شخص کا دل دو چیزوں (کے شوق) میں جوان رہتا ہے (ایک) لمبی زندگی اور (دوم) زیادہ مال۔

تشریح:۔"طول الحیاۃ و کثرۃ المال" دونوں مجرور پڑھنا بھی جائز ہے کہ اثنتین سے بدل ہیں اور خبر مبتدا بنا کر مرفوع پڑھنا بھی صحیح ہے یعنی "ھما یا احداھما و ثانیتھما"، بوڑھے کے دل کی جوانی سے مراد، ہمت، دلچسپی اور شوق ہے کہ جس طرح ایک جوان شخص درازئی عمر اور کثرتِ مال کو پسند کرتا ہے کہ اس کے پیش نظر کچھ خواہشات کی تکمیل ملحوظ ہوتی ہے جو عمر اور مال پر موقوف ہوتی ہے اسی طرح بوڑھا شخص باوجود جسمانی ضعف وکم ہمتی اور موت کے قریب آنے کے، زندگی کو طویل مدت تک جاری رکھنے میں پرعزم اور مال کی طلب میں سرگرم رہتا ہے، چنانچہ ساٹھ سال کے بوڑھے کو اگر کہا جائے کہ ایک لڑکی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر تیری عمر زیادہ ہے جو تیری سفید داڑھی سے معلوم ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تو ابھی جوان ہوں یہ داڑھی تو قبل از وقت سفید ہوئی ہے چنانچہ وہ اس کو کالا کرتا ہے اور خود کو جوان سمجھنے لگتا ہے، جبکہ عورتوں میں کم عمری کی محبت تو عام سی بات ہے اسی طرح ریٹائرمنٹ ملنے کے بعد بھی ساٹھ سالہ بوڑھا پرائیویٹ نوکری تلاش کرتا رہتا ہے، غرض آدمی بڑھاپے میں بھی دونوں کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں۔

اس مضمون کو باب کی اگلی حدیث میں یوں بیان کیا ہے کہ آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے اور اس کی دو خصلتیں جوان ہوجاتی ہیں (یعنی بدستور طاقت ور رہتی ہیں) زندگی کی خواہش اور مال کی حرص ولالچ۔ (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الزھادۃ فی الدنیا

(دنیا {مال} میں دلچسپی نہ رکھنا)

"الزھادۃ فی الدنیا لیست بتحریم الحلال و لا اضاعۃ المال و لکن الزھادۃ فی الدنیا ان لاتکون بما فی یدیک اوثق مما فی ید اللہ و ان تکون فی ثواب المصیبۃ اذا انت اُصبتَ

بها ارغبَ فيها لو انها اُبقيَت لکَ. (غريب)

دنیا (مال) کے ترکِ رغبت کا مطلب یہ نہیں کہ کسی حلال کو حرام قرار دیا جائے یا مال کو ضائع کر دیا جائے بلکہ دنیا کا ترکِ رغبت یہ ہے کہ تیرے ہاتھوں میں جو چیز (مال) ہے وہ اس چیز سے زیادہ قابل بھروسہ نہ ہو جو اللہ کے قبضے میں ہے، اور یہ کہ تجھ پر کوئی مصیبت آن پڑے تو تم اس پر بوجہ ثواب زیادہ خوش ہو بمقابلہ اس کے کہ وہ تیرے لئے مؤخر کردی جاتی (یعنی وہ مصیبت آخرت تک مؤخر کردی جاتی)۔

تشریح:۔ یعنی زہد کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو جائے کہ جنگل میں جا کر رہبانیت اختیار کرے نہ مال کمائے اور نہ کھائے پیئے، نہ شادی کرے اور نہ لباس زیب تن کرے کیونکہ یہ تو شیطان کا دھوکہ ہے جو آدمی سے حلال چیزوں کو حرام کراتا ہے بلکہ زہد کا مطلب یہ ہے کہ جب تیرے پاس کوئی مادی طاقت ہو جیسے زر و زمین، دوا اور بندوق وغیرہ تو ان پر پورا اعتماد نہ ہو بلکہ یہ یقین ہو کہ اگر اللہ کا فیصلہ ان اسباب کے مسببات کے خلاف ہو تو یہ سب اسباب فیل ہو جائیں گے نہ زر و زمین کارآمد ہوگی اور نہ ہی دوا اور بندوق کچھ کر سکیں گی اور یہی فرق ہوتا ہے مسلمان اور کافر کے درمیان کہ مسلمان اسباب تو اختیار کر لیتا ہے لیکن یقین تقدیر پر کرتا ہے جبکہ کافر کو اسباب پر ناز ہوتا ہے۔

قوله: "وان تكون فى ثواب المصيبة اذاانت اُصبتَ بها" بصیغہ مجہول یعنی جب تجھ پر کوئی مصیبت مسلط کردی جائے۔ اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو اوپر ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے یعنی مصیبت کے وقت یہ سوچنا چاہئے کہ مصیبت کا آنا تو تھا ہی یا دنیا میں یا پھر آخرت میں (جیسا کہ عام ضابطہ ہے اگرچہ بعض لوگ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں کہ یا تو ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہوتی ہیں یا دونوں بہتر ہوتی ہیں مگر عموماً دنیا و آخرت مد مقابل ہیں اگر یہاں نعمت ملتی ہے تو وہاں سے کٹ جاتی ہے اور یہاں مصیبت ملتی ہے بخار آلام وغیرہ کوئی بھی تکلیف، تو اس کے بدلے آخرت میں ثواب ملتا ہے جبکہ یہاں کی پر تعیش زندگی آخرت کی مصیبت کی گھنٹی ہے) تو اچھا ہوا کہ دنیا میں آگئی ورنہ آخرت میں یہ مصیبت و تکلیف آتی تو ناقابل برداشت اور اللہ کی ناراضگی کا اثر ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مصیبت کا باقی رہنا تیرے نزدیک ختم ہونے سے زیادہ محبوب ہو کیونکہ جب تک تکلیف جاری رہے گی تو ثواب بھی جاری رہے گا، بظاہر پہلا مطلب زیادہ اچھا ہے۔

حدیث عثمان بن عفانؓ:۔ "ليس لابن ادم الخ" یعنی آدمی کو ان خصال (چار اشیاء) کے علاوہ

کسی چیز میں (حصول کا) حق نہیں ایک گھر جس میں رہے اور کپڑا جو اس کے ستر کو چھپائے، اور خشک روٹی اور پانی۔ (حدیث صحیح)

قولہ: "جلف" بکسر الجیم وسکون اللام بروزن سدر خشک موٹی روٹی جو بغیر سالن کے ہو اس کو لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے بروزنِ عنب روٹی رکھنے کے ظرف کو کہتے ہیں تاہم یہاں مراد مظروف یعنی روٹی کا ٹکڑا ہے۔

حق سے مراد ضروریات زندگی بھی لے سکتے ہیں اور وہ اسباب بھی ہو سکتے ہیں جو جائز صورت میں حصول کے باوجود قیامت میں سوال کا موجب نہیں بنیں گے جبکہ ان سے زیادہ کے متعلق قیامت میں سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا؟ کیسے کمایا، کہاں خرچ کیا اور شکر کتنا کیا؟؟؟ وغیرہ

مطلب یہ ہے کہ ہونا یہ چاہئے کہ آدمی اقل قلیل پر اکتفاء کرے حتیٰ کہ اگر یہ چار چیزیں آدمی کو مُیسّر ہوں تو ان سے زیادہ کی تعب وطلب میں لگنے کے بجائے عبادت میں لگنا چاہئے کیونکہ زیادہ کی تو حد نہیں لہٰذا ابتدائی حدودِ سامانِ زندگی کو اپنانا چاہئے ورنہ ساری زندگی دوڑ دھوپ میں گذر جائے گی اور پھر بھی اہداف حاصل نہیں ہوں گے، یہاں وہ ضابطہ ملحوظ رکھا جائے کہ آپ علیہ السلام صحابہ کی بطور خاص تربیت کرنا چاہتے اور جانتے تھے ظاہر ہے کہ ایسے اصول ہر ایک کے بس کی بات نہیں لہٰذا اہلِ دنیا کو اعتراض کا کوئی حق نہیں کہ زندگی کو تنگ بنا دیا گیا۔ تدبر

حدیث عبداللہ بن الشخیر: حضرت مُطرِّف بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد (عبداللہ بن شخیر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت پہنچے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم "الھاکم التکاثر" پڑھ رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم زاد کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال حالانکہ تیرا مال تو صرف وہی ہے جو تو نے صدقہ کر کے روانہ کر دیا (یعنی اللہ کے پاس) یا کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر پُرانا کر دیا۔ "الھاکم التکاثر" کا مطلب مشہور تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ تم کو غافل بنا دیا بُہتات نے یعنی مال و اولاد وغیرہ کی کثرت نے تم کو آخرت سے بے نیاز بنا دیا اس حدیث کے مطابق آدمی اپنے مال پر اتراتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ مال اسی کا ہے حالانکہ آدمی کا مال میں سے فقط اتنا حصہ ہوتا ہے کہ یا تو صدقہ کر کے اللہ کے یہاں بھیج دے یا جتنا کھالے اور زیب تن کر کے ختم کر دے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض خوش فہمی میں مبتلا کر دینے والا ہے لہٰذا اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے "یحسب ان مالہ اخلدہ" آدمی سمجھتا ہے کہ وہ اور اس کا مال سدا باقی اور ساتھ رہیں گے "کلا" ہرگز نہیں وہ مال یقیناً پیچھے

رہنے والا ہے۔(ھذا حدیث حسن صحیح)

حدیث ابی امامۃ:۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: اے ابن آدم! اگر تم زائد چیز خرچ کروگے تو یہ تیرے لئے بہتر ہوگا اور اگر اسے روکوگے تو تیرے لئے بُرا ہوگا اور تیری ملامت نہیں کی جائے گی گذارہ کرنے پر، اور خرچ کرنے میں اس سے شروع کر جو تیری عیال داری میں ہے اور اوپر کا (دینے والا) ہاتھ، نیچے (لینے والے) سے بہتر ہے۔(حسن صحیح)

یعنی کاملین کو چاہئے کہ بقدر کفاف اور قوت لایموت پر اکتفاء کریں کیونکہ اتنی قلیل مقدار کا آخرت میں حساب نہیں ہوگا جبکہ زائد پر سوال وحساب ہوگا لہٰذا حساب کی زحمت سے بچنا چاہئے اگرچہ حقوق ادا کرنے کے بعد مال جمع کرنا جائز ہے مگر خطرناک بھی ہے لہٰذا خطرہ مول لینے سے بچنا ہی احتیاط ہے، اور خرچ کرنے میں ضابطہ یہ ہے کہ پہلے اپنے بچوں، بیوی، ماں باپ وغیرہ الاقرب فالاقرب جن کے نان نفقے کی ذمہ داری آدمی پر عائد ہوتی ہے کو مقدم رکھے ایسا آدمی جو دوسروں پر خرچ کرتا ہے دنیا وآخرت میں لینے والے سے افضل ہے لہٰذا آدمی کو افضل بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حدیث عمر بن الخطابؓ:۔ "لو انکم توکّلون علی اللہ حق توکلہ الخ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم اللہ پر اس کے شایان شان توکل کرتے تو تم اس طرح رزق دیئے جاتے جیسے پرندوں کو دیا جاتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ یعنی بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس لوٹتے ہیں۔(حسن صحیح)

قولہ: "تغدو" صبح جانے کو غدوۃ کہتے ہیں جبکہ تروح روحۃ سے بمعنی شام کو چلنے کو کہتے ہیں یہاں مراد شام کو اپنے گھونسلوں میں واپسی ہے۔**قولہ:** "خِماصاً" بروزن کتاب خمیص کی جمع ہے جبکہ بطان بھی کتاب کے وزن پر بطین کی جمع ہے، خُمص البطن اس وقت کہتے ہیں جب پیٹ اندر کو ہوجائے یعنی خالی ہوجائے کنایہ ہے بھوک کی شدت سے جبکہ بطان اس کے برعکس پیٹ کی عظمت اور بڑھنے کے لئے آتا ہے مراد سیر ہونا اور پیٹ کا بھر جانا ہے۔حاشیۂ قوت میں بحوالۂ امام بیہقیؒ لکھا ہے کہ اس حدیث میں ترک اسباب پر کسی طرح کی دلالت نہیں ہوتی کیونکہ پرندوں کے ساتھ تشبیہ سے اسباب اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ رزق کمانے کے لئے اتنا بے تاب نہیں ہونا چاہئے کہ اس کے لئے حرام ذریعوں کو استعمال میں لایا جائے، نہ جھوٹ کی پرواہ کرے اور نہ کسی کی حق تلفی کی پرواہ ہو بس صرف کمانے سے غرض ہو وہ خواہ جیسا بھی ہو یہ غلط ہے، ہونا یہ چاہئے کہ آدمی پرندوں کی طرح صبح نکلے اور یقین رکھے کہ اللہ نے اس کے لئے جو رزق مقرر کیا

ہے وہ اسے ضرور ملے گا وہ کوئی دوسرا نہیں چھین سکتا اور جو اس کا رزق نہیں وہ اسے کبھی بھی حاصل نہیں کرسکتا، اس طرح وہ رزق بھی بآسانی حاصل کرے گا اور سکون سے اپنی عبادت کو بھی بروقت کرسکے گا۔

حدیث انسؓ:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو بھائی تھے ان میں سے ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتا تھا اور دوسرا کام کاج میں لگا رہتا تھا چنانچہ اس کاروباری بھائی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بھائی کی شکایت کی (مثلاً فارغ بیٹھا رہتا ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باور کرو تجھے اس کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے۔

قولہ: "یحترف" حرفت سے ہے بمعنی ہاتھ کے ہنر، پیشہ اور عادت کے آتا ہے یہاں مطلق اسباب معاش اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔ **قولہ:** "لعلک" شارع کے کلام میں جب بھی لعل کا لفظ آجائے تو تردد وترجی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ بمعنی یقین کے آتا ہے ہاں اگر ترجی مخاطب کے اعتبار سے ہو تو پھر معنی ترجی کا صحیح بنتا ہے اور ترجمہ یوں ہوگا کہ امید رکھو۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان دو بھائیوں میں سے ایک اپنے کاروزگار میں معروف رہتا اور دوسرا آپ علیہ السلام کی خدمت میں علم ومعرفت حاصل کرنے کی غرض سے آتا، دوسرے بھائی نے اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرے ساتھ تعاون تو کرتا نہیں اور خرچ میں مثلاً شریک رہتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ کچھ ایسے مخفی اسباب ہوتے ہیں جو ظاہری اسباب سے زیادہ مفید ہوتے ہیں لہٰذا تم یہ نہ سمجھو کہ تم جو کچھ کمارہے ہو وہ بس تیرے ہنر اور کمال کا نتیجہ ہے بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تیرے بھائی کی یہاں آمد کی وجہ سے تیرے کاروبار میں برکت ڈالتا ہے لہٰذا تم اس کو اپنی کمائی تصور مت کرو یہ تم دونوں کی ہے، کتنے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو سب کمانے کی کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ غربت کی دلدل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتے اس کے برعکس کبھی ایک ہی بھائی کماتا ہے اور باقی سب بھائی پڑھتے ہیں مگر ان کا روزگار عروج پر ہوتا ہے یہ دینی تعلیم ہی کی تو برکت ہوتی ہے، بشرط صحت نیت۔

باب کی آخری حدیث:۔ حضرت عبیداللہ بن محصن صحابیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھے کہ وہ اپنے گھر میں محفوظ ہو اور جسمانی اعتبار سے تندرست ہو، اس کے پاس ایک دن کا خرچہ ہو تو گویا اس کے لئے دنیا سمیٹی گئی ہے۔ (حسن غریب)

قولہ: "وكانت له صحبة" چونکہ عبیداللہ بن محصن کی صحابیت میں اختلاف تھا اس لئے امام ترمذیؒ

نے صحابی ہونے کی تصریح فرمادی اور یہی محقق قول ہے۔ قولہ: "فی سَربه" یہ لفظ بروزن قمر بمعنی بیت اور گھر کے آتا ہے جو اوپر ترجمہ میں لیا گیا ہے جبکہ بکسر السین بروزن سِدر بمعنی نفس کے آتا ہے یعنی جو فارغ البال اور خوش حال ہو، اور عبد و شمس کے وزن پر بمعنی راستے کے آتا ہے بنا بر ہر تقدیر مطلب یہ ہے کہ وہ شخص خود اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھر میں اور باہر، ہر لحاظ سے بے خوف ہو نہ دشمن کا خطرہ ہو اور نہ کوئی بیماری ہو اور گھر میں اس دن کے کھانے پینے کی اشیاء بھی موجود ہوں تو بس یہ ایسا ہے جیسے اس کے لئے ساری دنیا کو جمع کر دیا گیا ہے، کیونکہ جس کے پاس ساری دنیا ہوگی وہ بھی تو صرف اتنا ہی کھا سکے گا جتنا یہ شخص کھاتا ہے باقی تو خوش فہمی اور افتخار کا سامان ہے۔ عقلمند کے نزدیک دونوں میں کوئی معتد بہ فرق نہیں جیسے ایک آدمی کا وزن ساٹھ کلو ہے اور دوسرے کا دوسو کلوگرام، بظاہر دوسو کلو والا اچھا لگتا ہے مگر اسے اپنے جسم سے جتنا فائدہ پہنچ رہا ہے اس لاغر کا فائدۂ جسمانی اس سے کسی طرح کم نہیں بلکہ شاید وہ زیادہ اچھا ہو۔ قولہ: "مُعَافَی" باب مفاعلہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔

باب ماجاء فی الکفاف والصبر علیه

(کفایت وقناعت کے بیان میں)

"ان اَغبَطَ اولیائی عندی لَمؤمن خفیف الحاذ وحظّ من الصلوٰة اَحسَنَ عبادة ربه وَاَطَاعَه فی السر وکان غامضا فی الناس لایُشار الیه بالاصابع وکان رزقه کفافاً فصبر علی ذالک، ثم نقر بیده فقال عُجّلت منیّتهٗ قَلّت بَوَاکِیه قَلّ تُراثُه ...وبهذا الاسناد...قال عَرَضَ عَلَیَّ ربی لِیجعل لی بطحَاءَ مکة ذهباً ،قلتُ: لایارب ولکن اَشبَعُ یوماً واجوع یوما اوقال ثلاثاً اونحو هذا فاذا جُعتُ تضرّعتُ الیک وذکرتک واذاشَبِعتُ شکرتُک وحمدتُک". (حسن)

آپ علیہ السلام نے فرمایا میرے دوستوں میں سب سے زیادہ قابل رشک میرے نزدیک وہ مؤمن ہے جو ہلکی بار برداری والا ہو نماز میں حصہ رکھنے (ملانے) والا ہو، اپنے رب کی عبادت خوبی کے ساتھ کرنے والا ہو، اور خلوت میں (بھی) اس کی اطاعت کرتا ہو وہ لوگوں میں چھپا ہوا (غیر معروف) ہو، اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہ کیا جاتا ہو (یعنی کسی طرح شہرت کا حامل نہ ہو) اور اس کا رزق برابر سرابر ہو اور وہ اس پر قناعت وصبر کرے، (یعنی اپنی گمنامی، اور کفایت طعامی کی حالت پر صبر کرتا ہو) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ (کی

انگلیوں) کو دوسرے ہاتھ (کی انگلیوں) پر مارااور اس کے ساتھ فرمایا اس کی موت جلد ہی بھیج دی گئی ہو، اس پر رونے والی عورتیں کم ہوں اور اس کا متروکہ مال بھی تھوڑا سا ہو اسی سند مذکور سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے رب نے مجھے پیش کش کردی کہ میرے لئے مکہ کی سرزمین کو سونا بنادیں، میں نے عرض کیا اے میرے رب! ایسا نہ کیجئے کیونکہ میں یہی پسند کرتا ہوں کہ ایک دن سیر رہا کروں اور ایک دن بھوکا رہوں (راوی کو شک ہے کہ ایک دن فرمایا یا تین دن) یا اس کی مانند بات فرمائی، پس جب بھوک لگے تو تیری طرف گریہ وزاری کروں اور تجھ کو یاد کروں اور جب سیر ہو جاؤں تو تیرا شکر ادا کروں اور تیری حمد کروں۔

تشریح:۔قولہ: "اَغبَطُ" غِبطہ سے اسم تفضیل ہے بمعنی رشک کے لیکن معنی مفعولی میں یعنی مغبوط۔

قولہ: "حاذ" بروزن حال دراصل گھوڑے کی کمر اور پشت کو کہتے ہیں جس پر سامان رکھا جاتا ہے پس خفیف الحاذ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پاس زیادہ ساز وسامان نہ ہو بلکہ ہلکا پھلکا سامان زندگی ہو۔

قولہ: "فی السر" عموماً نصوص میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی مقابل اشیاء میں سے ایک جانب کو ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری کو ظاہر ہونے کی وجہ سے حذف کیا جاتا ہے جیسے "وسرابیل تقیکم الحر" حالانکہ لباس سردی سے بھی حفاظت اور بچاؤ کا سامان ہے اس لئے تقدیر اس طرح ہے: "تقیکم الحر و البرد" یہاں بھی مطلب یہ ہے کہ جیسے جلوۃ میں وہ عبادت گذار رہتا ہے تو اسی طرح خلوت میں عبادت کرتا رہتا ہے کیونکہ صرف علانیہ عبادت بغیر سِرّی عبادت کے ریا ودکھاوے کی نشانی ہے جو مفید نہیں۔**قولہ:** "غامضاً" یعنی وہ معاشرہ میں دنیوی مقام نہ رکھنے کی وجہ سے چھپا ہوا ہو کیونکہ لوگ تو مالدار کو یاد کرتے ہیں جبکہ غریب کو قابل ذکر نہیں سمجھا جاتا ہے۔

قولہ: "لایشار الیہ الخ" غامضاً کا بیان ہے کیونکہ مالدار آدمی جہاں سے گذرتا ہے لوگ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ فلاں صاحب جارہا ہے جبکہ غریب کے گذرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا بہر حال یہ کنایہ ہے عدم شہرت سے یعنی یہ شخص مشہور نہ ہو۔

قولہ: "ثم نقر بیدہ" جب کسی چیز کی سرعت اشارے سے ظاہر کی جاتی ہے تو چٹکی بجائی جاتی ہے اور کبھی دونوں ہاتھ کی انگلیاں یا ہتھیلیاں ایک دوسرے پر مارنے سے۔ یہاں دوسری صورت مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اسے اگلے جملے یعنی سرعتِ موت کو سمجھانے کے لئے اشارے کے طور پر بجایا اور سرعت موت

سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کا دل ویسے بھی آخرت میں معلق تھا اس لئے جب موت آئی تو اس نے فوراً سینے سے لگادی یہ مطلب نہیں کہ جوانی میں جلدی انتقال کرگیا، (تدبر) بخلاف مالدار کے کہ عموماً اس کی جان اگر چہ سفر آخرت کے وقت بستر مرگ پر، پرواز تو کررہی ہوتی ہے مگر وہ اپنی دنیوی دولت، گاڑیوں، حسین وجمیل عورتوں اور کوٹھیوں میں پھنسی رہتی ہے اس لئے بدن سے نکلنے کو گوارا نہیں کرتی، یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو غریب کی بیماری کا علم نہیں ہوتا وہ اس کی موت کو اچانک سمجھتے ہیں ہاں البتہ یہ اعزاز اس غریب کو حاصل ہے جو اپنی حالت کذائی پر صبر کرے ورنہ واویلا کرنے والا تو فیل درامتحان ہوجاتا ہے، اس کی غربت قابل رشک نہیں ہے۔

پھر جب وہ شخص مرتا ہے تو اس پر رونے والی زیادہ عورتیں بھی نہیں ہوتیں کیونکہ عورتیں تو مالداروں سے رشتہ اور تعلق جوڑتی ہیں اور اسی کی موت کو حقیقی صدمہ سمجھتی ہیں غریب جو عموماً لوگوں اور خصوصاً عورتوں کی نظروں میں بے کار رہتا ہے اس کی موت اس قابل نہیں ہوتی کہ وہاں جمع ہوکر مصیبت کا اظہار کیا جائے۔

قولہ: ”تراثہ“ بضم التاء اس میں تاء واو کے بدلے میں آئی ہے قرآن میں ہے: ”وتاکلون التراث اکلاً لمّاً“ (الفجر آیت:۱۹) موت کے بعد جو مال ومتاع وغیرہ رہتا ہے اسے میراث اور تُراث کہتے ہیں۔

قولہ: ”عرض علیَّ“ یعنی مجھے اختیار دے دیا کہ آپ چاہیں تو بطحاء مکہ یعنی پورے مکہ کو یا مکہ کے سنگریزوں اور چٹانوں کو سونا بناکر آپ کو اس کا مالک بنادوں، میں نے کہا نہیں میں مادی دولت کے بجائے غربت اختیار کرتا ہوں تاکہ نعمت کی قدر معلوم ہو اور اس پر شکر گذار رہوں اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب بھوک لگے اور رزق کی طلب پیدا ہو، طلب کے لئے میں دعا مانگوں اور ملنے پر تیرا شکر ادا کروں۔ معلوم ہوا کہ فقر اختیاری مع الصبر مالداری سے افضل ہے۔

حدیث ابن عمرؓ: ۔”قد افلح من اسلم ورُزِقَ کفافاً وقنّعه الله“. (حسن صحیح)

یقیناً وہ شخص کامیاب رہا جس کو برابر سرابر رزق دیا گیا اور اللہ نے اسے اس پر قانع بنایا۔

ایسا شخص جسے یقین ہو کہ اس کے مقدر رزق سے زیادہ نہیں مل سکتا اس لئے وہ کم پر بھی صبر کرتا ہے، زیادہ کے لئے نہیں تڑپتا اور اپنی چادر اور بساط کے مطابق پیر پھیلا کر عبادت میں لگا رہتا ہے یقیناً یہ بڑا شخص ہے بشرطیکہ وہ اتقیاء و حکم الٰہی کی فرمانبرداری کرتا ہو۔

حدیث فضالة بن عبیدؓ: ۔اس کا مضمون بھی ابن عمرؓ کی حدیث کے مطابق ہے البتہ یہاں فلاح کی

جگہ طوبیٰ یعنی خوش خبری کا ذکر ہے کہ بقدر کفاف رزق والے صابر کے لئے خوش خبری ہے یعنی رضائے الٰہی، کامیابی اور جنت کی۔ (حدیث صحیح)

باب ماجاء فی فضل الفقر

(غربت کی فضیلت کا بیان)

"عن عبداللہ مُغَفَّل قال قال رجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم :یارسول اللہ! واللہِ انی لَاُحِبُّک فقال: أنظر ماتقول، قال واللہ انی لاحبک ثلاث مَرّاتٍ، قال :اِن کنتَ تُحِبّنی فَاَعِدَّ للفقرِ تجفافاً فان الفقر اسرع اِلیٰ مَن یُحِبُّنی من السَّیل اِلیٰ مُنتھاہ". (حسن غریب)

ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے اللہ کے رسول بخدا میں آپ سے محبت کرتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوچ سمجھ کر بولو جو تم کہہ رہے ہو، اس نے تین بار کہا کہ بخدا میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو فقر کے لئے جھول تیار رکھو کیونکہ فقر مجھ سے محبت کرنے والے کی طرف سیلاب سے جو اپنی انتہاء کی طرف بڑھتا ہے زیادہ جلدی دوڑتا ہے۔

تشریح:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے تو سارے اہل ایمان ہیں مگر مع فرقِ مراتب کے ساتھ یہاں صحابی کے دعوے کا مقصد فرطِ محبت یعنی شدید چاہت مراد ہے۔

قولہ: "تجفافاً" بکسر التاء وسکون الجیم بروزن مفتاح زرہ کی طرح ایک جال ہوتا ہے جو لڑائی کے وقت گھوڑے کو پہناتے ہیں تا کہ دشمن کے وار سے محفوظ ہو اردو میں اس کو جھول کہا جاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ تیرے دعویٰ کے مطابق اب تجھ پر فقر کا بحران آئے گا اس کی رفتار وشدت سیل رواں سے بھی زیادہ ہوگی اگر تم اس کے لئے تیار ہو تو فقر سے لڑائی جیتنے کے لئے جھول تیار کر کے رکھو کہ ایسا نہ ہو کہ اس کے اچانک حملہ سے شکست کھالو۔

اس حدیث سے فقرِ اختیاری کی غِنیٰ مع شکر گذاری پر فضیلت معلوم ہوئی اگر چہ ایسے غنی جو اپنا مال طاعات میں خرچ کرتا ہے کے بھی بہت سے فضائل ہیں زکوۃ، حج وغیرہ بہت سارے امورِ خیر کا حصول مال پر مبنی ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی عمل ،فقر اختیار کرنے کا رہا ہے جیسے سابقہ باب میں گذرا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ فقر اختیاری مالداری سے افضل ہے اگر چہ آج لوگوں کو اس کی زیادہ ترغیب دینا نہیں چاہئے کہ

عام لوگ "کاد الفقران یکون کفراً" کے زمرے میں آتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔ اگرچہ "کاد الفقر" والی حدیث ضعیف ہے۔

باب جاء ان فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنياء هم

(غریب مہاجر، مالدار مہاجروں سے پہلے جنت میں جائیں گے)

"عن ابی سعید قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: فقرآء المهاجرين يدخلون الجنةقبل اغنيائهم بخمس مائة عام". (حسن غريب)

فقیر مہاجرین امیر مہاجروں سے پانچ سو سال قبل جنت میں داخل ہوں گے۔

تشریح:۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ جس سے دنیا میں کوئی نعمت روک دی جاتی ہے تو اس کے بدلہ میں عقبیٰ میں نعمت ملتی ہے و بالعکس چونکہ فقراء دنیا میں بہت ساری نعمتوں کو دیکھ کر حصول کے لئے ترستے ہیں جبکہ اغنیاء بآسانی ان تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اس لئے آخرت میں فقراء کو جنت کی خوشبو سونگھنے اور منظر دیکھنے کے بعد زیادہ انتظار اور تڑپنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی جبکہ اغنیاء ان کے مقابلہ میں اپنے حساب و کتاب کی وجہ سے اور کچھ دنیوی نعمتوں کے حصول کے بدلے میں کچھ عرصہ انتظار کر کے پھر داخل ہوں گے تاہم یہ مدت تعدد روایات میں مختلف آئی ہے۔ باب کی تین احادیث میں پانچ سو سال کا ذکر ہے جبکہ دو میں چالیس کا۔

یہ فرق فقراء کے مراتب کی بناء پر ہے کیونکہ بعض فقراء کا فقر طویل صبر آزما ہوتا ہے اور اس کا حامل اپنے معاشرہ میں ذلیل سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس بعض فقراء کا فقر زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ فقیر ہونے کے باوجود معاشرہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

البتہ یہ تصویر کا ایک رخ ہے تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اغنیاء میں سے وہ لوگ جو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور مال خرچ کر کے نیکیوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں وہ اگرچہ میدانِ محشر میں وقت نسبتاً زیادہ گذار دیں گے مگر جنت میں داخل ہونے کے بعد اپنے اعمال خیرات، صدقات و دیگر تبرعات کی وجہ سے اونچے مقامات پر فائز ہوں گے "ذالک فضل اللہ یؤتیه من یشآء"۔

غرض ہر رنگ کی اپنی اپنی خصوصیت وشرافت ہے اس لئے آپ علیہ السلام کی حیاۃ طیبہ میں دونوں رنگ نظر آتے ہیں کبھی پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آتی اور کبھی بحرین وغیرہ اکناف واطراف سے آیا ہوا مال اتنا خرچ فرماتے کہ اس کا کوئی حساب نہیں ہوتا بلکہ جو جتنا لے جانا چاہتا وہ اس میں مکمل باختیار ہوتا۔ حضرت عباسؓ نے چادر اتنی بھر دی کہ اٹھا نہ سکے۔

حدیث انسؓ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا: اے اللہ! مجھے مسکین (متواضع) رہنے کی زندگی عطا کر دیں اور موت مسکنت کی حالت میں دیں، اور قیامت کے دن مساکین کی جماعت میں میرا حشر فرما دیں، پس حضرت عائشہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ فقراء جنت میں چالیس سال اغنیاء سے پہلے داخل ہوں گے، اے عائشہؓ! مسکین کو خالی مت لوٹا خواہ اسے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ دینا پڑے، اے عائشہؓ! غریبوں سے محبت کرو اور ان کو اپنے قریب بٹھا دیا کرو (یعنی جب حدیث بیان کرو تو ان کو آگے بٹھاؤ) اس پر اللہ تجھے قیامت کے دن اپنا قرب عطاء فرمائیں گے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موضوعات میں شمار کیا ہے جیسا کہ حاشیہ قوت میں ہے حافظؒ نے بھی ''تلخیص'' میں اسے ضعیف مانا ہے۔ (کمافی التحفۃ) بصورت صحت مسکین سے مراد متواضع ہے اس طرح ان احادیث سے تعارض نہیں آئے گا جن میں آپ علیہ السلام نے فقر سے پناہ مانگی ہے، غرض مسکنت الگ چیز ہے اور فقر الگ، فقیر تو غریب ہی کو کہتے ہیں جبکہ مسکین کبھی بمعنی متواضع بھی آتا ہے ابن قتیبہ نے ''تاویل مختلف الحدیث'' میں لکھا ہے:

''ومعنی المسکنہ فی قولہ ''احشرنی مِسکینا'' التواضع والاِخبات کانہ سأل اللہ تعالیٰ ان لایجعلہ من الجبّارین والمتکبرین ولایحشرہ فی زمرتھم الخ. (ص:۱۵۵)

اس میں مزید تفصیل اور دلیل بھی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے التلخیص میں یوں تطبیق دی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس فقر سے پناہ مانگی ہے وہ قلبی فقر ہے کیونکہ غناو فقر قلبی بھی ہوتے ہیں قلبی فقر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا دل مال کی محبت اور جمع میں لگ جائے یہ بہت بڑا عیب ہے مال کا آنا عیب نہیں ہے۔ کہ قلبی فقر اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے نہ کہ ظاہری حال۔ غرض فکرِ معاد میں ہر معاون چیز، غافل کر دینے والی سے افضل ہے۔

باب ماجاء فی معیشۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واھلہ

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والوں کی معاشی زندگی)

"عن مسروق قال دخلت علیٰ عائشة فدعت لی بطعام وقالت:۔مااَشبَعُ من طعام فَاَشَاءُ اَن اَبکِیَ اِلّابکیتُ قال قلت:لِمَ؟قالت:اَذکرُالحال التی فارق علیھارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الدنیاواللّٰہِ ماشَبِعَ من خبزولحم مرتین فی یوم".(حسن)اخرجہ مسلم

حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے یہاں داخل ہوا تو انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا اور فرمانے لگیں کہ میں جب بھی پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہوں اور رونا چاہتی ہوں تو رو پڑوں، مسروق کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا ایسا کیوں؟ فرمانے لگیں مجھے وہ حالت یاد آتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جدا ہوئے ہیں، بخدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن میں دو مرتبہ سیر ہو کر روٹی اور گوشت نہیں کھایا ہے۔

تشریح:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میں جب پورا کھانا کھاتی ہوں تو مجھے آپ علیہ السلام کی حالت یاد آتی ہے اور اس کے ساتھ مجھے رونا بھی آتا ہے اگر میں چاہوں کہ رونے لگوں اور رونا ضبط نہ کروں تو میں یقیناً رونے لگوں مگر میں رونے کو ضبط کرتی ہوں اور نہیں روتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کا آخری ٹکڑا بظاہر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معارض ہے جو "باب فی ترک الوضوء مماغیرت النار" میں گذری ہے اور شمائل میں بھی آرہی ہے کہ ایک انصاریہ عورت نے آپ علیہ السلام کی دعوت کی آپ نے ظہر کی نماز سے پہلے ذبح شدہ بکری کا گوشت کھایا پھر نماز کے بعد واپسی پر بچا ہوا گوشت پھر خدمت عالیہ میں پیش کیا گیا آپ علیہ السلام نے اس سے تناول فرمایا پھر عصر کی نماز پڑھی۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث باب میں آپ علیہ السلام کے گھر کے حال کا بیان ہے جبکہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں دعوت کا ذکر ہے لہٰذا ہر ایک کا محمل الگ الگ ہے، یا پھر حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ان کے اپنے علم کے مطابق ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے اس بکری کے گوشت میں دوبارہ تھوڑا سا تناول فرمایا ہو لہٰذا ایک دن میں دو دفعہ شکم سیری ثابت نہیں ہوئی۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فقر اختیاری تھا آپ علیہ السلام کے پاس جو کچھ آتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بطور ایثار دوسروں کو عطاء فرماتے: ''والکمال فی الایثار لان العبادۃ بالاختیار اولیٰ من الاضطرار''۔(تدبر)

اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں لگاتار پے درپے دو تین دنوں تک کھانے کا انتظام نہیں ہوتا تھا جیسا کہ باب کی دوسری اور تیسری حدیث میں ہے۔

قولہ: ''تِباعاً'' بروزن کتاب کا مطلب پے درپے ہے، پھر جب کھانا پکتا تھا تو وہ بھی صرف اتنا ہوتا تھا کہ اس سے بچتا نہیں تھا گویا صرف بقدر کفاف ہوتا تھا، بلکہ کبھی تو نوبت یہاں تک پہنچتی کہ کئی کئی دنوں تک گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا حالانکہ ان کا عام کھانا جو کی روٹی تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والے خالی پیٹ سو جاتے اور رات کا کھانا نہیں ہوتا تھا۔''طاویا'' کے معنی جائعا بھوکا اور خالی پیٹ کے ہیں۔

اور یہ حالت کوئی اضطراری بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس پر ناراضگی ہوتی بلکہ آپ فرماتے: ''اللّٰھم اجعل رزق اٰل محمد قوتا'' قوت اس کو کہتے ہیں کہ عبادت پر قدرت کے بقدر کھانا ملے اور بہت زیادہ نہ ہو یہ دراصل معتدل حالت اور درمیانہ راستہ ہے کہ نہ تو آدمی بھوک سے اتنا کمزور ہو کہ عبادت بھی نہ کر سکے اور حقوق بھی ادا نہ کر سکے اور نہ ہی اتنا زیادہ کھائے کہ مالک سے نظر ہٹ جائے۔

''عن انس قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایدخر شیئاً لغد''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے، یعنی اپنی ذات کے دنیوی فائدے کے لئے کسی چیز کا رکھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہ تھی، جہاں تک کپڑوں، سواری اور ہتھیار کا تعلق ہے تو وہ دین کی خاطر رکھتے تھے اور جب دینی ضرورت نہ رہی تو ان کے بارے میں فرمایا کہ ہماری کوئی میراث نہیں یہ سب صدقہ ہے، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے لئے فتوحات کے بعد سال بھر کا نفقہ بطور تملیک دیتے تو گویا بطور ذاتی ملک کے ذاتی فائدہ کے لئے کوئی چیز نہیں رکھتے البتہ بطور تملیک یا بنیت عبادت رکھنا ثابت ہے لہٰذا روایات میں کسی طرح تعارض نہیں پھر جو نفقہ ازواج مطہرات کا ہوتا وہ بھی مہمانوں کی آمد یا بوجہ تصدق کے سال سے پہلے پہلے ختم ہو جاتا اور سال کے اخیر میں فاقوں کی نوبت آجاتی۔اس باب میں حضرت انسؓ کی دوسری حدیث ترمذی شریف جلد دوم کے بالکل شروع باب میں گذری ہے ترجمہ و مطلب وہاں دیکھ لیجئے۔

حدیث آخر:۔ حضرت سہل بن سعد سے پوچھا گیا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقی یعنی باریک پسا ہوا آٹا (میدے کی روٹی کو) کھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات تک دیکھا بھی نہیں ہے، کہا آپ کے پاس چھلنیاں ہوتی تھیں؟ فرمایا نہیں تھیں پوچھا گیا پھر آپ لوگ جو کے ساتھ کیا کرتے تھے (یعنی اس میں تو موٹی موٹی بھوسی ہوتی ہے) فرمایا بس پھونکتے تو اس سے اڑنے والی چیز (بھوسی) اڑ جاتی پھر باقی میں پانی ڈال کر گوندھ لیتے۔

قولہ: "نقی" بروزن غنی جو چھلکے سے صاف ہو چونکہ زیادہ باریک پینے سے چھلکا ختم ہو جاتا ہے اس لئے اس کی تفسیر حواری یعنی میدہ سے کی گئی اس سے مراد گندم کا آٹا لینا زیادہ مناسب ہے اگرچہ جو کو بار بار پینے سے بھی وہ باریک بن جاتا ہے، نیز چھاننے سے بھی صاف و باریک بن جاتا ہے۔ یہاں نفی رؤیت یا تو مبالغہ پر مبنی ہے یا حقیقت پر کیونکہ مدینہ اور مکہ میں گندم کا استعمال اور جو کو باریک پینے کا رواج نہ تھا اس لئے وہاں میدہ نظر نہ آنا کوئی بعید نہیں اور چھاننے کا شوق بھی نہ تھا، لیکن اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے جس کے مطابق آپ علیہ السلام کا قبل النبوت شام جانا مذکور ہے تو پھر نفی مبالغہ پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(صحابہ کرامؓ کی معاشی زندگی کا بیان)

"عن قیس قال سمعت سعدبن ابی وقاص یقول انی لَاَوّلُ رجل اَهرَاقَ دَماً فی سبیل اللہ وانی لَاَوّلُ رجل رَمیٰ بسهم فی سبیل اللہ ولقدرأیتُنِی اَغزُوفی العِصابة من اصحاب محمدصلی اللہ علیه وسلم ماناکل الاورق الشجروالحُبلة حتیٰ ان احدنالَیَضَعُ کما تضع الشاة ثم اصحبت بَنُواَسَدیُعَزِّرُوننی فی الدین لقدخِبتُ اذن وضَلَّ عملی". (حسن صحیح)

حضرت قیس سے مروی ہے کہ میں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک میں پہلا وہ شخص ہوں جس نے اللہ کی راہ میں خون بہایا ہے اور میں وہ پہلا شخص بھی ہوں جس نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا (پھینکا) ہے اور میں نے خود کو ایسی حالت میں پایا ہے کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک جماعت کے ہمراہ جہاد کرتا، ہم سوائے درختوں کے پتوں اور خاردار جھاڑیوں کے پھل (یا کیکر کے پھل) کے سوا کچھ نہیں

کھاتے (یعنی اس کے علاوہ کوئی غذا نہ ہوتی) یہاں تک کہ ہم میں سے ہر ایک اسی طرح اجابت کرتا جیسے بکری اور اونٹ اجابت (مینگنیاں) کرتے ہیں (مگر اس کے باوجود) اب بنو اسد مجھے دین کے بارے میں طعنے دیتے ہیں (یعنی مجھے نماز کی تعلیم دیتے ہیں کہ تم صحیح نہیں پڑھتا) یقیناً ایسے میں تو میں نامراد ہوں گا اور میرا سب عمل برباد ہوگا۔

تشریح:۔ اگلی روایت میں بجائے ابی وقاص کے مالک آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کے والد کا نام مالک تھا اور ابو وقاص کنیت تھی اگلی روایت میں حُبلہ کے بعد سمر کا بھی اضافہ ہے جو سمرۃ کی جمع بمعنی کیکر کے ہے جبکہ حُبلہ بضم الحاء کیکر کے پھل کو کہتے ہیں جو لوبیا کے مشابہ ہوتا ہے بعض نے مطلق خاردار درخت کے پھل کو کہا ہے۔

یہ روایت بخاری شریف میں بھی ہے (مناقب جلد:اص:۵۲۸ کی روایت میں ہے): "ماله خلط" یعنی پیٹ سے جو فضلہ خارج ہوتا وہ ایک دوسرے سے نہیں چپکتا بوجہ شدت خشکی کے اس کو اوپر ترجمہ میں مینگنیوں سے تعبیر کیا گیا ہے چونکہ بنو اسد نے ان کی شکایت دربار خلافت مآب میں کی تھی جیسا کہ بخاری کی مندرجہ روایت میں ہے: "وکانوا وَشوا به الی عمر قالوا لایحسن یصلی" یعنی صحیح نماز نہیں پڑھا سکتے ہیں تو حضرت سعدؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں سابق الاسلام ہونے کے باوجود اگر ان لوگوں کی تعلیم کا محتاج رہوں تو پھر میری سبقت اسلامی کا کیا فائدہ؟ اور یہ اگرچہ بظاہر اپنی مدح ہے مگر بطور اظہار شکر وتحدیث بالنعمت اور احقاق حق کے لئے ایسا کرنا جائز ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا "انی حفیظ علیم"۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے عرف الشذی میں فرمایا ہے کہ حاشیہ ترمذی پر مجمع البحار کے حوالے سے بنو اسد کی تفسیر جو بنو الزبیر بن العوام سے کی گئی ہے یہ غلط ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ بنو اسد وہ لوگ ہیں جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدعی نبوت طلیحہ بن خویلد اسدی کی پیروی میں مرتد ہو گئے تھے اور حضرت خالد بن ولید نے ان سے جہاد کیا تھا پھر طلیحہ جب توبہ تائب ہوئے تو ماتحتی اتباع نے بھی توبہ کر لی اور ان کی اکثریت کوفہ میں مقیم ہوئی۔

حافظ عینیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ۱۴ھ میں حضرت عمرؓ نے فارس سے جہاد پر مقرر فرمایا تھا اللہ نے ان کو فتح دی اور کوفہ پر ۲۰ھ یا ۲۱ھ تک امیر رہے، یعنی اس الزام تک۔ تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ ان دنوں میں یزدگرد نے مسلمانوں کے خلاف ڈیڑھ لاکھ کا ٹڈی دل

لشکر نہاوند میں جمع کیا تھا، حضرت عمرؓ نے تفتیش حال کے لئے محمد بن مسلمہ کو بھیج دیا تھا، تفتیش سے معلوم ہوا کہ صرف بنو عبس شکایت کرر ہے ہیں۔ (ص: ۳۶۵ ج: ا نفیس اکیڈمی)

یہ روایت بخاری ج: اص: ۱۰۴ پر تفصیل سے آئی ہے جس کے مطابق تفتیش کا یہ عمل ہر مسجد میں جاری رہا چنانچہ سب لوگوں نے حضرت سعدؓ کی تعریف ہی کی یہاں تک کہ بنو عبس کی مسجد میں فقط ایک آدمی جس کا نام اسامہ بن قتادہ تھا نے الزام تراشی کرتے ہوئے کہا کہ وہ سرایہ نہیں بھیجتا، تقسیم میں انصاف نہیں کرتا اور فیصلہ میں عدل سے کام نہیں لیتا ہے اس جھوٹے الزام پر حضرت سعدؓ نے اس کو بددعاء دی جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی بڑھاپے میں راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا تھا اور جب اس سے کہا جاتا تو کہتا تھا: ''اَصَابتنی دعوۃ سعد'' مجھے سعد کی بددعا لگی ہے۔ (باب وجوب القرآءۃ للامام والماموم فی الصلوٰت الخ)

حدیث آخر:۔ محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ہم ابو ہریرہؓ کے پاس تھے جو گیرو میں رنگے ہوئے سَن کے دو کپڑے پہنے ہوئے تھے پس انہوں نے ان میں سے ایک سے ناک صاف کی پھر فرمایا واہ، واہ ابو ہریرہ (اس وقت) سن کے (اعلیٰ) کپڑے سے ناک صاف کر رہا ہے جبکہ میں نے خود کو ایسی حالت میں بھی پایا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور عائشہؓ کے گھر کے درمیان بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر جاتا تھا تو آنے والا آکر اپنا پیر میری گردن پر رکھتا وہ یہ سمجھتا کہ مجھے دماغی خلل کا دورہ ہے حالانکہ مجھے کوئی دیوانگی نہیں ہوتی وہ تو صرف بھوک ہی تھی (جو ستایا کرتی تھی کوئی مرگی وغیرہ نہ تھی)۔ (حسن صحیح)

قولہ: ''مُمَشِّقان'' ای مصبوغان بِالمِشق مِشق بکسرۂ میم سرخ قسم کی مٹی ہے جسے گیرو (گے رُو) کہتے ہیں۔

قولہ: ''کتان'' بفتحۂ کاف وتشدید التاء سَن (پٹ سن) کے ریشہ کے بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ کتان اَلسی (ال سی) کے ریشے سے بنے ہوئے کپڑے کو کہا جاتا ہے السی تقریباً دو فٹ کا پودا ہوتا ہے جس کے بیج کا تیل بھی نکالا جاتا ہے۔

قولہ: ''بَخ بَخ'' بفتح الباء وسکون الخاء تعجب کے وقت بولا جاتا ہے۔

قولہ: ''یَتمَخَّطُ'' تمخُّط مخاط سے ناک سِنکنے کے معنی میں ہے۔

یہ ایک روایتی علاج تھا کہ لوگ خبطی اور دیوانہ یا مرگی کے مریض کی گردن پر پیر رکھتے تھے جیسے آج کل اسے جوتا سونگھاتے ہیں یعنی لوگ میری یہ حالت دیکھ کر مجھے مجنون سمجھتے، حالانکہ اصل واقعہ یہ ہوتا کہ میں بھوک کی

وجہ سے بے ہوش ہو چکا ہوتا، غربت میں صبر کیا اور نعمت پر شکر کیا۔

حدیث فضالہ بن عبیدؓ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تو کچھ لوگ بھوک کی وجہ سے کھڑے ہونے (کی تاب نہ لاکر) نماز میں گر جاتے یہ لوگ اصحاب صفہ تھے، یہاں تک (یہ مشاہدہ زیادہ تھا) کہ اعرابی لوگ کہتے یہ لوگ دیوانے (خبطی) ہیں چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوجاتے تو ان (اصحاب صفہ) کی طرف متوجہ ہوکر فرماتے اگر تم لوگ جانتے کہ اللہ کے یہاں تمہارے لئے کتنا (یا جتنا) اجر ہے تو تم آرزو کرتے کہ تمہارا فقر و فاقہ اور زیادہ ہوتا حضرت فضالہؓ فرماتے ہیں کہ میں اس دن (جب یہ ارشاد فرمایا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔

قولہ: "الخصاصة" بفتح الخاء فقر و فاقہ کو کہتے ہیں شدید بھوک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔

قولہ: "اصحاب الصفہ" صفہ بضم الصاد وتشدید الفاء چبوترے کو کہتے ہیں یہاں مراد مخصوص چبوترا ہے جو مسجد نبوی سے متصل تھا اس میں غرباء و مساکین صحابہ کرام رہتے جن کا اپنا گھر بار نہیں ہوتا تھا اغنیاء صحابہ کرامؓ و انصار ان پر تصدق کرتے، ان کی تعداد اوسطاً ستر تھی جیسا کہ حاشیۂ ترمذی پر ہے۔

یہ انہی حضرات صحابہ کرامؓ کی محنتوں کی برکات اور صبر آزما مشکلات کے ثمرات ہیں کہ آج ہم دین کی روشنی سے روشناس ہوئے ہیں کسی نے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن فیض پکڑا تو کسی نے اپنا مال اللہ کی راہ میں بہادیا اس طرح سب یکجان ہوکر دین کے پروانے بنے اور ہمارے لئے تاریک رات میں مطلع اسلام اور افق دین مبین کے ستارے بنے، پس انہی کے نقش قدم پر چل کر کامرانی و کامیابی سے ہمکنار ہونا ممکن ہوا ہے اگر کوئی چاہے تو ان سے رہنمائی لے ورنہ اپنی تباہی کا انتظار کرے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے وقت (گھر سے) نکلے جس میں نہ تو باہر نکل آنے کی عادت تھی اور نہ ہی کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس وقت) ملاقات کرتا تھا (یعنی آرام کرنے کا وقت تھا مثلاً دوپہر کا ٹائم) پس (حسن اتفاق یا قوت ادراک سے) ابوبکرؓ بھی وہاں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اے ابوبکر! کیا بات تمہیں یہاں (اس وقت) لے آئی؟ انہوں نے عرض کی میں نکلا تا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرلوں اور ان کے چہرۂ انور کو دیکھوں اور انہیں سلام کرنے آیا ہوں، ابھی زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ عمرؓ بھی وہاں پہنچ گئے، آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرؓ! تم کو کیا چیز لے کر آئی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول بھوک (نے آنے پر مجبور کیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے بھی کچھ بھوک لگی ہے، چنانچہ یہ حضرات ابوالہیثم انصاریؓ کے گھر کی جانب تشریف لے گئے ابوالہیثم ایسے آدمی تھے جن کی بہت سی کھجور (کے درخت) اور بکریاں تھیں (یعنی غنی ومالدار آدمی تھے) مع ہذا ان کے کوئی خادم نہ تھے، تو وہ ان کو گھر میں نہیں ملے، تو ان کی بیوی سے پوچھا کہ تیرا میاں کہاں ہے؟ وہ کہنے لگی کہ وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گئے ہیں ابھی انہوں نے زیادہ دیر نہیں گذاری تھی کہ اتنے میں ابوالہیثم پانی کی مشک اٹھائے ہوئے اور تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے آگئے جلدی سے اس کو رکھا، پھر آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغل گیر ہوئے (یعنی لپٹ گئے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے ماں باپ کو قربان کرنے کے الفاظ دہراتے رہے، پھر ان سب کو اپنے باغ میں لے گئے، وہاں ان کے لئے فرش بچھایا اور خود ایک درخت کے پاس گئے اور یکا یک ایک گچھا (کھجور کا توڑ کر) لائے اور ان کے سامنے رکھ دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (شاخ دیکھ کر) فرمایا کہ (بجائے پوری شاخ کے) تم نے صرف تازہ کھجوریں کیوں نہیں توڑیں (یعنی چن چن کر لاتے تا کہ باقی ضائع نہ ہوتیں) تو انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں نے چاہا کہ آپ خود پسند فرمالیں یا فرمایا کہ آپ کو جو پکی اور نیم پختہ (گدر) پسند ہوں خود توڑ دیں (کیونکہ شاخ اور درخت سے توڑنے کا مزہ الگ ہوتا ہے) چنانچہ انہوں نے کھایا اور اس پانی میں سے پیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا یہ کھانا پینا اور اکرام وغیرہ ان نعمتوں میں سے ہے جس کے متعلق قیامت کے دن تم سے سوال کیا جائے گا، ٹھنڈا سایہ، تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی ہے، پھر ابوالہیثم چلے گئے تا کہ ان کے لئے کھانا تیار کریں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ دودھ والی بکری ہرگز ذبح نہ کرنا چنانچہ انہوں نے بکری کی بچی یا بچہ ذبح کر دیا اور لا کر ان کی خدمت میں پیش فرمایا (یعنی بھوننے کے بعد) چنانچہ سب سے مل کر کھایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا کوئی خادم ہے؟ فرمایا نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ہمارے پاس (دشمن کے) قیدی آجائیں تو تم اس وقت میرے پاس آجانا (تا کہ تمہیں خادم دے دو) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف دو ہی غلام لائے گئے ان کے ساتھ تیسرا نہیں تھا چنانچہ ابوالہیثم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دونوں میں جونسا چاہو لے لو، تو ابوالہیثم نے کہا اے اللہ کے نبی! آپ ہی میرے لئے منتخب (وپسند) فرمالیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے (اسے اچھا مشورہ ہی دینا چاہئے لہٰذا) تم یہ والا لے جاؤ کیونکہ میں نے

اسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں میری وصیت قبول کرو چنانچہ ابوالہیثم اسے لے کر اپنی بیوی کے پاس (گھر) لوٹے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان (وصیت وتاکید پر) کے بارے میں بتایا تو ان کی بیوی نے کہا تم وہ کام پورا نہیں کرسکو گے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق (اچھائی کا حکم) فرمایا ہے سوائے اس صورت کے کہ آپ اس کو آزاد کر دیں، ابوالہیثم نے فرمایا کہ وہ آزاد ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (معلوم ہونے پر) فرمایا کہ بے شک اللہ نے کسی نبی اور خلیفہ کو نہیں بھیجا مگر اس کے دو راز دار ہوتے ہیں، ایک راز دار وہ ہوتا ہے جو اسے بھلائی کا حکم دیتا ہے اور بُرائی سے روکتا ہے (یعنی مشورہ دیتا ہے) اور دوسرا راز دار اس کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا اور جسے بُرے راز دار سے محفوظ کیا گیا بے شک وہ (شر سے) بچا دیا گیا۔ (حسن صحیح)

قولہ: "والشاء" شاۃ کی جمع ہے۔ **قولہ:** "خَدَمَ" جمع ہے خادم کی۔ **قولہ:** "یستعذب" سین طلب کے لئے ہے عذب میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔

قولہ: "یزعبها" بھرا ہوا مشکیزہ چونکہ کندھے سے پھسل جاتا ہے اس لئے اسے بار بار اوپر کی طرف کھینچنا پڑتا ہے عموماً مشک بردار آدمی کو اسے نیچے سے اوپر کی طرف جھٹکا دھکا دینا پڑتا ہے۔

قولہ: "یلتزم" یہاں التزام سے مراد انتہائی خوشی سے لپٹ جانا ہے۔

قولہ: "بِقِنوٍ" قنو بکسر القاف پختہ کھجوروں سے بھرا ہوا گچھا۔

قولہ: "تنقیت" اِنتقاہ وتَنَقّاہ بمعنی پسند کرنے کے یعنی تم خود ہی ہمارے لئے اس میں سے اچھی اچھی اور پختہ کھجور توڑتے تو سارا گچھا ضائع نہ ہوتا۔

قولہ: "ذات دَرّ" دَر دودھ کو کہتے ہیں ذات در یعنی دودھ والی۔

قولہ: "عَناقاً" بروزن سحاباً بکری کی بچی "جدیا" بچے یعنی نر (بکرے) کو کہتے ہیں دونوں کے درمیان لفظ 'او' راوی کے شک کے لئے ہے۔

قولہ: "سَبیٌ" قیدیوں کو کہتے ہیں عموماً اس لفظ کا اطلاق عورتوں پر کیا جاتا ہے کیونکہ وہ دلوں کو اسیر بناتی ہیں 'بر اسین' "یعنی غلامین۔

قولہ: "اِستوصِ بہ" اس کے بارے میں میری وصیت مانو اور قبول کرو۔

قولہ: "بِطانۃ" بکسر الباء بطن سے بمعنی پوشیدہ کے استر کو بھی کہتے ہیں اور ہم راز ومصاحب کو بھی

کہا جاتا ہے یہاں آخری معنی مراد ہیں، مراد فرشتہ اور شیطان ہے بعض نے کہا کہ نفس لوامہ والمارہ بالسوء ہے مگر اس کو عام رکھنا افضل ہے یعنی اچھی قوت ومحرک اور بُری۔

قوله: "لاتالوه" لاتقصر کوتاہی نہیں کرتا یعنی موقع ضائع نہیں ہونے دیتا ہے۔ **قوله: "خبالا"** فساد، بگاڑ اور نقصان کو کہتے ہیں "فقدوقی' ای الشر۔ مشکوۃ ص: ۱۸ باب فی الوسوسۃ میں مسلم کی حدیث ہے:

مامنكم من احدالاوقدوُكِلَ به قرينه من الجن وقرينه من الملائكة قالوا واياكَ يارسول الله؟قال واياى ولكن الله اعاننى عليه فاسلم فلايأمرنى الا بخير".

لہٰذا حدیث باب کے آخری جملہ سے کوئی وہم پیدا نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی والعیاذ باللہ وسوسے آتے ہوں گے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے محفوظ بلکہ معصوم بنادیا گیا تھا۔ حدیث میں خلیفہ سے مراد نبی کا جانشین ہے۔

اس حدیث سے چند مسائل معلوم ہوتے ہیں: (۱) اپنے آرام کے لئے کوئی وقت مختص کرنا اور اس میں لوگوں سے نہ ملنا جائز ہے بشرطیکہ وہ ٹائم بہت طویل نہ ہو جیسے آج کل بعض لوگوں نے معمول بنایا ہے۔ نیز یہاں یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ملتے تھے بلکہ یہ ہے کہ لوگ نہیں ملتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ یہ وقت آپ علیہ السلام کے آرام کا ہے، لہٰذا ملاقات کرنے والے کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ (۲) اس سے حضرات شیخین کے درمیان فرق مراتب معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان کے جواب سے نمایاں ہے۔ (۳) اپنی بھوک یا کسی دیگر تکلیف کا اظہار جائز ہے بشرطیکہ شکوہ کے طور پر نہ ہو بلکہ کسی مصلحت کے پیش نظر ہو مثلاً کسی کی تسلی کے لئے کہ تجھ جیسی حالت تو میری بھی ہے لہٰذا ہمیں صبر کرنا چاہئے یا اس کے ازالہ کی غرض سے وغیرہ۔ (۴) بغیر دعوت کے بھی کسی با اعتماد شخص کے گھر جانا جائز ہے یعنی بشرطیکہ اسے تکلیف نہ ہو اور جانے والوں کی تحقیر نہ کرتا ہو بلکہ اسے خوشی ہوتی ہو۔ (۵) اگر یہ واقعہ پردے کے نزول کے بعد کا ہے تو اس سے بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت اجنبیہ کے ساتھ بات کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ (۶) اگر فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو عورت اپنے شوہر کے مہمانوں کو گھر میں کچھ دیر کے لئے یعنی جب شوہر کی آمد قریب ہو بٹھا سکتی ہے بشرطیکہ ان کے الگ بٹھانے اور پردے کا محفوظ انتظام ہو، اور شوہر کی رضا معلوم ہو۔ (۷) معزز مہمان کی آمد پر خصوصاً اور عام مہمان کے آنے پر عموماً خوشی کا اظہار کرنا چاہئے۔ (۸) فوری طور پر کچھ نہ کچھ ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہئے۔ اور یہ انتظام ان سے

پوچھے بغیر کرنا چاہئے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آیت ہے: ''فراغ الیٰ اھلہ فجاء بعجل سمین'' ہاں البتہ اگر ان کا منشاء معلوم کرنا ہو اور بے تکلفی بھی ہو تو وہ الگ بات ہے۔ (۹) عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے۔ (۱۰) مہمان کو چاہئے کہ میزبان کو زیادہ نقصان اٹھانے سے بچانے کی کوشش کرے۔ (۱۱) مناسب وقت پر میزبان کی مہمان نوازی کا عملی شکریہ یعنی کچھ سلوک کرنا چاہئے۔ (۱۲) اور یہ کہ ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ آداب برائے مہمان اور ضیافت کے آداب راقم نے نقش اخلاق یا نقش قدم کامل میں: ''آداب ضیافت'' میں ذکر کئے ہیں تفصیل درکار ہو تو رجوع فرمائیں (چوتھا باب حصہ دوم ص:۴۲۳)۔

(۱۳) مشورے کی وجہ بھی بتانی چاہئے: ''فانی رایتُه یصلی ''یعنی گرفتاری کے بعد مسلمان ہوا ہے۔

حدیث آخر:۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے اپنے پیٹ (پر بندھے ہوئے) ایک ایک پتھر سے کپڑا (دامن) اٹھا کر (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بندھے ہوئے) دو پتھروں سے کپڑا اٹھایا۔ (غریب)

مطلب وتقدیر عبارت اس طرح ہے: ''کشفنا ثیابنا عن بطوننا کشفاً صادراً عن حجر حجر''۔ (تحفۃ الاحوذی) چونکہ جمع بمقابلہ جمع توزیع کے لئے آتی ہے جیسے لبسوا ثیابھم ورکبوا دوابھم یعنی اپنے اپنے کپڑے پہن کر اپنی اپنی سواری پر سوار ہوگئے لہٰذا یہاں مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک نے ایک ایک پتھر باندھا تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھا دیا رفعنا متضمن ہے معنی کشف کو اس لئے صلہ میں عن آنا قابل اعتراض نہ ہوا۔

جدید تحقیق کے مطابق معدہ کے اندر کچھ حسی خلیے ہیں جن کو ریسپٹر کہتے ہیں یہ نظام ہضم کا اہم ترین عنصر ہیں چنانچہ جب ان پر دباؤ پڑتا ہے تو اس سے بھوک اور پیاس کا احساس ختم یا کم ہو جاتا ہے چنانچہ جب بھوکا شخص کھانا کھاتا ہے یا پیاسا پانی پیتا ہے تو اس کی تحلیل سے بھوک و پیاس کا احساس فوراً ختم ہو جاتا ہے پتھر وغیرہ باندھنے سے بھی ان خلیوں پر دباؤ آجاتا ہے اور بھوک کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت سماک بن حرب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیرؓ سے یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ کیا تم لوگ کھانے پینے کی آسودگی میں نہیں ہو؟ جیسا تم چاہتے ہو (ویسا ہی کھاتے ہو) جبکہ میں نے آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے جن کو ردی کھجور بھی اتنی نہ ملتی جو آپ کے پیٹ کو بھر دیتی۔ (حسن صحیح)

حضرت نعمان کا خطاب یا تو متاخرین صحابہ کرامؓ سے ہے یا تابعین آپ کے مخاطب ہیں، یہ بھی

ہوسکتا ہے کہ مجمع میں دونوں قسم کے حضرات موجود ہوں۔

قولہ: "نبیکم" میں نبی کی اضافت ضمیر مخاطب کی طرف ان کو احساس دلانے کے لئے ہے کہ تم لوگوں نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں کوتاہی برتنا شروع کی ہے اور عیش وعشرت کی طرف بڑھنے لگے ہو۔

قولہ: "دقل" بفتحتین" خشک اور ردی کھجور کو کہتے ہیں جو سب سے زیادہ سستی ہوتی ہے، غرض آپ لوگ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی کو ملحوظ رکھیں وہ پیٹ بھر کر معمولی غذا جیسے دقل وغیرہ بھی نہیں کھا سکتے تھے جبکہ تم لوگ آج ہر قسم کی نعمتوں میں گھرے ہوئے ہو، آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مال جمع کرنے کا شوق نہ تھا بلکہ ایثار کا جذبہ تھا اور اتنا کہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ خرچ فرماتے، مگر تم دنیا جمع کرنے میں مشغول ہو گئے ہو جس سے لگتا ہے کہ تم لوگوں نے اپنا نصب العین تبدیل کر دیا ہے، یہ سب بطور توبیخ کے ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس باب میں متعدد احادیث ذکر کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زندگی کا ایک اہم باب ہمارے سامنے کھول دیا ہے جس سے ہمیں ان مقدس ہستیوں کی طرز زندگی سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے، عاقل کے لئے تو اشارہ بھی کافی ہوتا ہے جبکہ مصنف نے تو ہمارے سامنے مینار کھڑا کر دیا ہے اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر دے تو اسے تو پہاڑ بھی نظر نہیں آسکتا، بہرحال ان حضرات نے اسلام کا فلسفہ صحیح معنوں میں سمجھا تھا اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ یہ فلسفہ محض تصوراتی حیات کا تخیل نہیں بلکہ قابل عمل اور الباقیات الصالحات کے تناول وحصول کی بہترین حکمت نظری وحکمت عملی پر مشتمل ہے صحابہ کرامؓ دنیا کے حکمران بننے کے باوجود اور دنیا کا ان کے دامن میں کودنے کے باوجود دنیا و دولت کے تابع نہ بنے بلکہ دنیا ہمیشہ ان کی تابع بنی پہلے دنیا نے نخرے دکھائے تاکہ صحابہ کرام کے سینوں میں اس کی قدر بڑھے جیسے حسین عورت کے نخرے ہوتے ہیں مگر جب صحابہ نے اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تو وہ خود روتی ہوئی ان کی قدم بوسی کرنے لگی، پھر انہوں نے اس کے ساتھ لونڈی جیسا سلوک کیا، مگر آج ہماری حالت یہ ہوئی کہ ہم نے دنیا کی قدم بوسی، چاپلوسی بلکہ اگر میں یوں کہوں کہ اکثریت نے پرستش کی تو مبالغہ نہیں ہوگا تو دنیا ہم سے وہ سب کچھ منوانے میں کامیاب ہوئی جو ایک بدعمل، مکار حسین عورت اپنے چاہنے والے سے منواتی ہے۔ فیا اسفا علی ہذا

باب ماجاء ان الغِنٰی غِنَی النفس

(اصل بے نیازی دل کی ہوتی ہے) (تونگری بہ دل است)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :ليس الغِنٰى عن كثرة العرض ولكن الغِنٰى غِنى النفس". (حسن صحيح)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تونگری (دولت مندی) زیادہ ساز وسامان سے نہیں بلکہ اصل بے نیازی تو دل کی تونگری ہے۔

تشریح:۔ غِنـــا بکسر العین مالداری جس کی وجہ سے آدمی دوسروں کا محتاج نہیں رہتا بلکہ بے نیاز ومستغنی ہوجاتا ہے "عرض" سامان ومتاع کو کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض دفعہ آدمی کے پاس مال نہیں ہوتا مگر اس کا دل اس حالت پر مطمئن رہتا ہے کہ اس کے حصے میں صرف وہی آئے گا جو اللہ نے مقدر فرمایا ہے اس لئے وہ نہ تو اس حالت پر زیادہ پریشان رہتا ہے اور نہ ہی لوگوں کی چیزوں کی طمع رکھتا ہے اس کے برعکس بہت سے لوگ مالدار ہونے کے باوجود مزید دولت کمانے کے لئے بے چین اور ہمہ وقت متحرک رہتے ہیں اسی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں تو کیا فائدہ ہوا ان کی کثرۃ مال کا؟

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حضرت علیؓ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ اگر آدمی تمام زمین کی چیزوں کو حاصل کرے مگر نیت خدا ہی کی خاطر ہو تو وہ زاہد ہی رہے گا، جبکہ دنیا کی تمام چیزیں چھوڑنے والے کی نیت اگر خدا کے واسطے نہ ہو تو وہ زاہد نہیں ہوگا، لہٰذا دل دنیا میں نہیں ڈوبنا چاہئے، مولانا رومی رحمہ اللہ نے مثال دی ہے کہ اگر کشتی پانی کے اوپر اوپر چلتی رہے تو محفوظ ہوگی لیکن اگر پانی اس کے اندر چلا جائے تو یقیناً وہ ڈوب جائے گی: "ولاتحبوا الدنیافتکونوا من الخاسرین"۔

باب ماجاء فی اخذالمال بحقّه

(مال کمانے کا طریقہ)

"ان هذاالمال خضرة حلوة من اصابه بحقه بورک له فيه،ورُبَّ مُتَخَوِّضٍ فيما

شاء ت به نفسه من مال الله ورسوله ليس له يوم القيٰمة اِلّاالنار". (حسن صحيح)

یہ مال ہرا، ہرا، میٹھا میٹھا ہے، جس نے اس کو جائز طریقہ سے لیا تو اس کے لئے اس میں برکت دی جائے گی اور بسا اوقات وہ گھسنے والا اللہ اور اس کے رسول کے مال میں (اپنی مرضی کے مطابق) جیسا اس کا دل کرے، قیامت کے روز اس کے لئے آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

تشریح:۔ یہاں مال سے مراد دنیا ہے اس کو سبز اور میٹھا کہنا باعتبار تشبیہ کے ہے کہ جس طرح سبز وشاداب منظر جاذب نظر اور دلکش ہوتا ہے اسی طرح دنیا بھی حسین وعزیز لگتی ہے پس جو شخص بقدر حاجت، بقدر کفایت اور جائز طریقہ سے لے گا اس کے حق میں دنیا مفید ثابت ہوگی کیونکہ وہ اس سے اپنی ضروریات پوری کرے گا اور عبادات میں معاون ثابت ہوگی، مگر جو شخص اس میں بے ہنگم تصرف کرے گا وہ قیامت کے دن ہلاک ہوگا کیونکہ ایسے میں دنیا زہر کے سوا کچھ بھی نہیں تو جس طرح سانپ کو سپیرا ہاتھ لگا سکتا ہے اور اناڑی اس سے مرجاتا ہے اسی طرح حال دنیا کا ہے، اس مضمون کی حدیث پہلے گذری ہے۔

قوله: "متخوض" خوض سے بمعنی پانی میں گھسنے کے آتا ہے لیکن یہاں مراد تصرف ہے البتہ اس میں ایک باریک تشبیہ ہے کہ جس طرح آدمی دنیا میں دولت ودنیا کے اندر گھسنا اپنا مقصد بناتا ہے اور جائز وناجائز کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تو اسی طرح وہ قیامت کے دن آگ میں گھسے گا۔ اعاذنا اللہ منھا

اوپر متنِ حدیث میں مال کی اضافت آپ علیہ السلام کی طرف اگرچہ بیت المال کی طرف مشیر ہے مگر یہاں بیت المال کے علاوہ عام مال بھی لینا درست ہے جیسا کہ تشریح میں گذرا ہے یعنی بے جا سوال کرنا، ہر طرح کی کمائی اور خرچ کو شامل ہے۔

باب

"لُعِنَ عبدُالدينار لُعِنَ عبدُالدرهم". (حسن غريب)

یعنی دینار اور درہم کا بندہ ملعون ہے۔

چونکہ دنیاوی مال ومتاع میں بنیادی کردار پیسوں کا ہے اس لئے دینار ودرہم کی تخصیص کی گئی ورنہ مراد اس سے مطلق دُنیا اور تعیش ہے، دنیا کی عبدیت وغلامی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی اپنی ساری زندگی اور ساری توانائی اس کے درپے کردے، اس سے بقدر ضرورت لینے کی مذمت ثابت نہیں ہوتی، قال اللہ: "اَرأیت

من اتخذ الٰھه ھواهُ'' ط (الفرقان آیت: ۴۳) بھلا دیکھ تو اس کو جس نے پوجنا اختیار کیا اپنی خواہش کا، یعنی خواہش پرستی کا عالم یہ ہو جیسے وہی ان کا معبود ہے اس کی ایسے مانتے ہیں جیسے خدا کا ماننا چاہئے ایسے لوگ ملعون نہیں تو کیا ہیں؟ حفظنا اللہ

باب

''ماذِئبان جائعان اُرسلافی غنم باَفسدَلھامن حِرص المرء علی المال والشرف لِدِینه''. (حسن صحیح)

وہ دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں میں چھوڑ دیئے جائیں ان (بکریوں) کے لئے، آدمی کے حُب مال وجاہ کی اس کی دینی تباہی سے زیادہ تباہ کن نہیں ہیں۔

تشریح:۔ شرف سے مراد جاہ وعزت ہے اور ''لدینه'' جار مجرور ''باَفسدَ'' کے ساتھ متعلق ہے یعنی آدمی کی یہ دو خصلتیں جو حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ ہیں دین کو ان دو بھوکے بھیڑیوں سے بھی زیادہ تباہ کر دیتی ہیں جو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں آزاد چھوڑ دیئے جائیں حالانکہ بھیڑیا اتنا حریص ہوتا ہے کہ اس خوف کے پیش نظر کہ کہیں یہ سب بکریاں بھاگ نہ جائیں پہلے ان کو جان سے مارنے کی کوشش کرتا ہے اور جو رہ جاتی ہیں وہ بھاگ نکلتی ہیں اس طرح سارا ریوڑ تتر بتر ہو جاتا ہے مگر حب مال وحب جاہ دونوں آدمی کے دین کو ان بھیڑیوں سے بھی زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔

حب مال وجاہ اور دیگر رذائل اخلاق کی تفصیل راقم نے نقش قدم میں دی ہے فمن شاء التفصیل فلیراجع۔

باب

''عن عبداللہ قال نامَ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی حصیر فقامَ وقداَثّرَ فی جنبه فقلنا: یارسول اللہ لو اتخذنا لک وِطَاءً؟ فقال: مالی ولِلدنیا؟ ماانافی الدنیا اِلّا کراکب استظل تحت شجرۃٍ ثم رَاحَ وترکھا''. (صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر سوئے پس جب اُٹھے تو پہلو پر چٹائی نے نشانات بنا لیئے تھے، ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اگر ہم آپ کے لئے بساط بنا (کر بچھا) لیتے (تو اچھا ہوتا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے دنیا سے کیا مطلب؟؟؟ میں دنیا میں

بس ایسا ہی ہوں جیسے ایک سوار (مسافر) ہوتا ہے جو کسی درخت کے نیچے سایہ (آرام) حاصل کرنے کے لئے رُکے اور پھر چل پڑے اور اسے (درخت کو) چھوڑ دے۔

تشریح:۔ لفظ "لو" یہاں پر بمعنی شرط زیادہ مناسب ہے بنسبت تمنائی کے۔

قولہ: "وطاء" سحاب اور کتاب دونوں وزنوں پر آسکتا ہے، فرش جیسے بستر وغیرہ کو کہتے ہیں، ابن مسعودؓ کے عرض کرنے کا مطلب تو بالکل واضح ہے کہ اگر ہم ایسا کرتے تو آپ کو یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی، جبکہ جواب کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مثال ایک سایہ دار درخت کی سی ہے اور مومن کی مثال ایک مسافر کی مانند ہے مسافر اگلی منزل کے سفر کی غرض سے تازہ دم ہونے کے لئے درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے اتر کر قیلولہ کرتا ہے وہ وہاں مستقل پڑاؤ نہیں کرتا کیونکہ زیادہ آرام سفر میں سستی کا باعث بنتا ہے۔ راقم کو اس کا تجربہ ہے کہ جب ہم گرمیوں میں صبح سے شام تک گھاس کاٹتے تو دوپہر کو کھانے کے بعد جب جلدی کام شروع کرتے تو ٹھیک رہتے جبکہ زیادہ دیر تک سایہ کے نیچے بیٹھنے سے سُست ہو جاتے اور پھر اٹھنے کی ہمت نہ رہتی۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ ائرکنڈیشنڈ کمروں میں نرم بستروں پر محوخواب لوگ عموماً تہجد بلکہ صبح کی جماعت سے رہ جاتے ہیں اِلّا ماشاء اللہ وقلیل ماھم۔

غرض، عرضِ دنیا وراحت طلبی سفر آخرت یعنی عبادت کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اپنی ہمت کے مطابق اس سے بچنا چاہئے۔ **وبقدر الکد تُکتسبُ المعالی**

باب

دوستی کا اثر

"الرجل علیٰ دین خلیله فلینظر احدکم من یُخالِل ؟(حسن غریب)

آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے؟

تشریح:۔ ترمذی کے حاشیہ قوت المتغذی پر سراج الدین قزوینی سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے اور اس کی ذمہ داری موسیٰ بن وردان پر ڈالی گئی ہے لیکن یہ تأثر ٹھیک نہیں یہ حدیث کم از کم حسن ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے جبکہ اس کا مضمون بالکل صحیح ہے کیونکہ۔

(۱) صحبت صالح تُرا صالح کند
صحبت طالح تُرا طالح کند

(۲) پسر نوح چوں بابداں بہ نشست
خاندان نبوتش گم شد

مجرب ہے۔ صحبت کے اثرات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، راقم نے بھی نقش قدم میں اس پر تھوڑا سا لکھا ہے، بہر حال دوستی میں اچھے دوست کا انتخاب انتہائی اہم اور لازمی امر ہے ہر کس و ناکس سے مراسم رکھنے سے آخرت کی تباہی ممکن ہے۔

باب

دنیا فانی اور عمل خیر جاویدانی ہے

"یتبع المیتَ ثلاث فیرجع اثنان ویبقیٰ واحد، یتبعه اهلُه ومالُه وعملُه، فیرجع اهلُه ومالُه ویبقیٰ عملُه". (حسن صحیح)

تین چیزیں میت کی پیچھے چلتی ہیں پس دو تو لوٹ کر واپس آجاتی ہیں جبکہ ایک رہ جاتی ہے چنانچہ اس کے اہل و مال اور عمل اس کے ساتھ (پیچھے) جاتے ہیں تو اس کے اہل و مال تو واپس آجاتے ہیں اور اس کا عمل (اس کے ساتھ قبر میں) باقی رہ جاتا ہے۔

اس حدیث پاک میں ایک اہم مضمون کو ذکر فرمایا ہے کہ جب آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے مال وعیال جیسے اُقربہ واَحِبہ، کا نفع اس کی قبر تک رہتا ہے مال کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے لوگ تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح اس کے دوستوں کا حلقہ قائم ہو جاتا ہے دور، دور کے رشتہ دار قریبی رشتہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ سب لوگ دفن تک اس کا ساتھ دے سکتے ہیں اور بڑی بڑی گاڑیاں اس کے ساتھ قبرستان تک جاسکتی ہیں جب وارث واپس آجاتے ہیں تو اس کے مال (میراث) کو تقسیم کر کے اس پر قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔ سوائے صدقہ جاریہ اور دعا گو نیک اولاد کے، مگر وہ بھی عمل میں داخل ہیں۔ یہ تیسری چیز یعنی اس آدمی کا عمل اس کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے قبر میں بھی اور حشر میں بھی لہٰذا ہر عاقل کو چاہئے کہ وہ خود ہی فیصلہ کر لے کہ وہ ان تینوں دوستوں میں سے کس کو زیادہ اہم

سمجھے اور کس پر زیادہ اعتماد کرے، رشتہ داروں پر؟ مال پر؟ یا عمل پر پھر اسے جو زیادہ نفع بخش اور مفید لگے اس کی طرف زیادہ توجہ دے۔

باب ماجاء في كراهية كثرة الاكل

زیادہ کھانا مکروہ ہے

"مَامَلأَادمیٌّ وِعاءً شَراً من بطن، بحسب ابن ادم اُكلاتٌ يُقِمن صُلبَه فان كان لامحالة فَثُلثٌ لِطعامه وثُلثٌ لِشرابه وثُلثٌ لِنَفَسِه". (حسن صحیح)

انسان نے پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی ظرف نہیں بھرا، آدمی کے لئے تو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھیں، لیکن اگر زیادہ ہی ناگزیر ہے تو (پھر) ایک تہائی (معدہ) اس کے کھانے کے لئے ہو اور ایک تہائی پینے کے لئے ہو اور ایک تہائی سانس لینے کے لئے ہونا چاہئے۔

تشریح:۔ قوله: "بحسب الخ" اس میں باء زائدہ ہے اور حسب بمعنی کفایة وکافی کے ہے جبکہ اُکلات بضمتین اس کی خبر ہے اکلات اُکلة بضم الہمزہ وسکون الکاف کی جمع ہے نوالہ کو کہتے ہیں جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

قوله: "فان كان لامحالة" یعنی اگر پیٹ بھرنا لازمی سمجھے تو پھر سارا پیٹ نہ بھرے بلکہ بقدر ایک تہائی کے کھائے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت زیادہ کھانا مکروہ ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے ترجمۃ الباب میں ذکر فرمایا ہے، پہلے بھی یہ مسئلہ گذرا ہے، فلیراجع خلاصہ یہ ہے کہ بذاتِ خود زیادہ کھانا معیوب ہے البتہ غرض محمود کے تحت پیٹ بھر کر کھانا جائز ہے جیسے سحری زیادہ کھانے سے مراد تقویت علی العبادۃ کا حصول ہو یا مہمان کے ساتھ وغیرہ، الاشباہ والنظائر میں ہے:

"وقالوا الاكل فوق الشبع حرام بقصد الشهوة وان قصدبه التَّقَوِّیَ على الصوم اومؤاكلةَ الضيف فمستحب". (ص: ۳۳ قدیمی کتب خانہ)

بعض نام نہاد حکماء نے اس حدیث پر اعتراض کیا تھا کہ انسان تو عناصر اربعہ سے مرکب ہے جبکہ اس حدیث میں چوتھے عنصر یعنی آگ کا ذکر نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آگ کے عنصر ہونے میں حکمائے اشراقین ومشائین کا اختلاف تو تھا ہی مگر جدید سائنس کے تمام ماہرین اس پر متفق ہیں کہ آگ بذات خود کوئی

عنصر نہیں بلکہ ایک قوت ہے جو کسی مادہ سے نکلتی ہے۔

بہر حال حدیث باب میں زیادہ کھانے کو ناپسند کیا گیا ہے، اس کے مفاسد کا بیان تشریحات میں پہلے گذرا ہے۔ آج کل جدید بیماریاں مثلاً شوگر وغیرہ زیادہ کھانے سے جنم لیتی ہیں۔ اخلاقی عیوب اس کے علاوہ ہیں کیونکہ اس سے بہیمیت بڑھتی ہے اور قوت ملکیہ کمزور ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی الریاء والسُمعة

(دکھاوے اور شہرت پسندی کا بیان)

"من یُرَائی، یُرَائِیَ اللہ به ومن یُسَمِّع یُسَمِّعِ اللّٰہُ به". (حسن غریب)

جو شخص (اپنے اعمال لوگوں کو) دکھاتا ہے اللہ (قیامت کے روز) اس (کے عیوب وباطن) کو ظاہر فرمائیں گے اور جو شخص (لوگوں کو) سُناتا ہے (یعنی اپنے کسی قول وعمل سے شہرت چاہتا ہے) تو اللہ (قیامت کے دن) اس (کے عیوب) کی تشہیر فرمائیں گے۔ اور آپ علیہ السلام نے فرمایا جو شخص لوگوں پر مہربانی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر بھی رحم نہیں فرماتے۔ (حسن غریب)

تشریح:۔ "یُرائِی اور یُسمِّع" دونوں معتدی افعال ہیں تاہم پہلا بابِ افعال سے اور دوسرا باب تفعیل سے ہے۔ حدیث کا مطلب یا تو وہ ہے جو اوپر ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے یعنی جو شخص اپنی نیکیوں سے دنیوی شہرت کا مُتلاشی ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیوب لوگوں پر ظاہر فرمائیں گے تاکہ سب لوگوں کے سامنے اس کی رسوائی ہو اور اِس کی دنیوی عزت اُخروی ذلت میں تبدیل ہو۔

یا پھر مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیوی شہرت کے حصول کے لئے نیک اعمال کو سیڑھی بنائے گا تو اس کو دنیا میں شہرت تو ملے گی مگر یہی اس کی جزاء بن جائے گی اور وہ اُخروی ثمرات وثواب سے محروم کر دیا جائے گا جیسا کہ باب کی اگلی طویل حدیث میں ہے۔ اور سورۂ ھود کی آیت نمبر ۱۵، ۱۶ کے ظاہر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

"من کان یرید الحیٰوۃَ الدنیا وزینتها نُوَفِّ اِلیهم اعمالهم فیها وهم فیها لایُبخسون O اولٰئک الذین لیس لهم فی الآخرة اِلّا النار وحبط ماصنعوا فیها وبٰطِل ماکانوا یعملون O"

اگرچہ اس آیت کا مصداق یہود یا منافقین ہیں۔

حدیث کے یہی دو مطلب ظاہر ہیں اگر چہ اس میں دیگر اقوال بھی ہیں۔ بہر حال اس سے اخلاص کی قدر کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حدیث شُفَیّا:۔ حضرت شُفَیّا الاصبحی نے عقبہ بن مسلم کو یہ حدیث بیان کی ہے کہ وہ (شفیا) مدینہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص کے گرد لوگ جمع ہیں شفیا نے پوچھا یہ شخص کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ ابو ہریرہ ہیں تو میں (یعنی شفیا) اس کے قریب گیا یہاں تک کہ اُن کے آگے بیٹھ گیا جبکہ آپ لوگوں کو حدیث بیان فرما رہے تھے پس جب ابو ہریرہ خاموش ہو گئے اور تنہا رہ گئے (یعنی لوگ چلے گئے) تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ سے صحیح صحیح بات پوچھتا ہوں کہ آپ مجھے وہی حدیث سُنایئے جو آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہو اور سمجھی ہو اور وہ آپ کو یاد بھی ہو تو ابو ہریرہؓ نے فرمایا: میں ایسا ہی کرتا ہوں، میں تجھے ایسی ہی حدیث سُناتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بیان فرمائی ہے اور جسے میں نے سمجھ لیا ہے اور یاد کیا ہے، پھر ابو ہریرہ سسکیاں لے کر بے ہوش ہو گئے (یعنی محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے یا آخرت کے ہولناک منظر کے ذہن میں گردش کرنے سے) تھوڑی دیر کے بعد پھر ہوش میں آکر کہنے لگے میں تجھے ایسی حدیث سُناتا ہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اس گھر میں بیان کیا ہے جبکہ ہمارے ساتھ میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور پھر ابو ہریرہؓ سسکیاں بھرتے ہوئے زیادہ بے ہوش ہو گئے، پھر ان کو افاقہ ہوا اور اپنے چہرے کو پونچھ لیا اور فرمایا میں تیرا کام کرتا ہوں میں تجھے ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بیان فرمائی تھی، میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس گھر میں اکیلے تھے ہمارے ساتھ میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا، اور پھر اس کے ساتھ ابو ہریرہ بہت زیادہ سسکیاں لیتے ہوئے بے ہوش ہو گئے اور مُنہ کے بل جھک کر گرنے لگے تو میں نے ان کو کافی دیر تک سہارا دیا چنانچہ وہ پھر ہوش میں آگئے، تو فرمانے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بیان فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندوں کی طرف (اپنی شان کے مطابق) نزول فرمائیں گے تا کہ ان کے درمیان فیصلہ فرمادیں اور ہر امت گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی پس سب سے پہلے وہ جس کو (حساب کے لئے) بُلائیں گے وہ ایک ایسا شخص ہوگا جس نے قرآن یاد کیا ہوگا اور نمبر۲ ایک ایسا شخص ہوگا جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جاچکا ہوگا اور نمبر۳ ایک مالدار شخص ہوگا چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس قاری سے فرمائیں گے، کیا میں نے تجھے اس (قرآن) کا عالم نہیں بنایا تھا جو میں نے اپنے رسول پر اُتارا تھا؟ وہ کہے گا کیوں نہیں اے میرے رب! (یعنی بے شک تو نے مجھے علم

قرآنی سے نوازا تھا) اللہ عزوجل فرمائیں گے تو پھر تو نے اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟ وہ قاری کہے گا میں دن رات کے اوقات میں اس قرآن کے ساتھ لگا رہتا تھا (یعنی پڑھنے پڑھانے اور نماز میں قرأت وغیرہ میں مشغول رہتا) پس اللہ اس سے فرمائیں گے تم نے جھوٹ بولا اور فرشتے بھی کہیں گے تم جھوٹ بولتے ہو اللہ فرمائیں گے کہ تمہاری چاہت تو یہ تھی کہ کہا جائے (یعنی یہ چرچا ہو) کہ فلاں شخص قاری ہے، پس وہ گفتگو تو ہو چکی (یعنی تجھے دنیا میں شہرت مل گئی) اور مالدار کو پیش کیا جائے گا تو اس سے اللہ فرمائیں گے کیا میں نے تجھے مال کی فراوانی نہیں دی تھی؟ یہاں تک کہ میں نے تجھے کسی کا محتاج نہیں چھوڑا؟ وہ عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! تو اللہ فرمائیں گے پس تو نے میرے دیئے ہوئے میں کیا کیا تصرف کیا تھا؟ وہ کہے گا کہ میں نے صلہ رحمی کی اور صدقات دیتا رہا! اللہ اس سے فرمائیں گے تم نے جھوٹ بولا اور فرشتے بھی کہیں گے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، اللہ فرمائیں گے کہ تیرا مطلب (اس خرچ سے) یہ تھا کہ یہ چرچا ہو کہ فلاں سخی ہے تو ایسا ہو گیا ہے (یعنی دنیا میں) اور اس کے ساتھ وہ (تیسرا) شخص بھی لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا ہو گا اللہ اس سے فرمائیں گے کہ تم کس لئے مارا گیا تھا؟ وہ کہے گا کہ تو نے اپنی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ میں لڑتا رہا یہاں تک کہ قتل کیا گیا، اللہ اس سے فرمائیں گے کہ تم نے جھوٹ بنایا اور فرشتے بھی کہیں گے کہ تم نے جھوٹ بنایا ہے اللہ فرمائیں گے بلکہ تیری غرض یہ تھی کہ کہا جائے کہ فلاں شخص بہت بہادر ہے پس وہ بات کی گئی ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور فرمایا اے ابوہریرہؓ! اللہ کی مخلوق میں یہ تینوں وہ پہلے لوگ ہوں گے جن سے قیامت کے روز دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی۔

ولید ابو عثمان مدائنی فرماتے ہیں کہ عقبہ نے مجھے (یہ بھی) بتلایا کہ شُفَیّ ہی وہ شخص ہیں جو حضرت معاویہؓ کے پاس گئے اور ان کو یہ حدیث سُنائی، ابو عثمان فرماتے ہیں کہ علاء بن ابی حکیم نے مجھے بتایا کہ وہ (یعنی علاء بن ابی حکیم) حضرت معاویہؓ کے جلاد تھے چنانچہ علاء بن ابی حکیم کہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کے پاس (دربار میں) ایک آدمی (شُفَیّ) داخل ہوا (چونکہ علاء شُفَیّ کو نہیں جانتے تھے اس لئے نام کے بجائے رجل کہا) اور ان کو ابوہریرہؓ کی یہ حدیث بیان کی تو امیر معاویہؓ نے فرمایا کہ یہ معاملہ تو ان تینوں کا ہوا باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ پھر حضرت معاویہؓ بہت زیادہ روئے حتیٰ کہ ہم تو یہ سمجھے کہ اب یہ فوت ہو جائیں گے اور ہم نے (آپس میں یا دلوں میں) کہا کہ یہ شخص (شفیا) ایک خطرناک خبر لے کر آیا پھر حضرت معاویہؓ کو افاقہ ہوا اور چہرے کو پونچھ لیا اور فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا ہے: "من کان یرید الحیٰوۃ الدنیا وزینتها نوف الیهم اعمالهم

فیھا''۔الآیۃ (ھود آیت:۱۵،۱۶)

جس شخص نے زندگانی دنیا اور اس کی رونق ہی کو مقصد بنالیا تو ہم ان کے اعمال خیر کا صلہ (دنیا ہی میں) پورا پورا دیتے ہیں اور (دنیا میں) اس کے صلہ میں کچھ کمی نہیں کی جاتی (سو) یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں نار جہنم کے سوا کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے عمل خیر کیا، آخرت میں سب ضائع ہوگا۔ (حسن غریب)

تشریح:۔قولہ: ''شُفَیّ''، تصغیر کا صیغہ ہے۔ **قولہ:** ''بحق وبحق'' تکرار برائے تاکید ہے اور با زائد ہے۔ **قولہ:** ''لَمّا'' بمعنیٰ ''اِلّا'' کے ہے۔

قولہ: ''نَشَغَ'' لمبے سانس، اور سسکیاں بھرنے کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** ''جاثیۃ'' گھٹنوں کے بل سرنگوں کو کہتے ہیں۔

قولہ: ''خاراً'' خرور سے بمعنیٰ گرنے کے ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا کہ یہ آیت دراصل کافروں یا منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر حضرت معاویہؓ کا اس سے استدلال باعتبار عموم الفاظ کے ہے یعنی ریاکار حسب ریا اپنے نیک اعمال کے ثمرات سے محروم ہوں گے کفار بالکلیہ اور کمی محروم ہوں گے جبکہ اہل ایمان اخلاص کی کمی کے بقدر واللہ اعلم۔ تاہم مؤمنین کے لئے اس کو خاصیت مفرد کہیں گے بہرحال باب کی احادیث سے ریا و دکھاوے کی قباحت بیّن طریقے سے معلوم ہوئی اور اخلاص کی قدر بھی اُجاگر ہوئی۔

باب

ریا کا تلخ ثمرہ

''تعوّذوا باللہ من جُبِّ الحُزن! قالوا یارسول اللہ ما جُبُّ الحُزن؟ قال وادٍ فی جھنم یتعوذ منہ جھنم کُلّ یوم مائۃ مرۃ، قیل یارسول اللہ ومن یدخلہ؟ قال القرّاء المراؤون باعمالھم''. (غریب)

رنج کے بڑے کنویں (گڑھے) سے اللہ کی پناہ مانگو صحابہؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! جب الحزن کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم میں ایک وادی ہے جس سے دوزخ بھی روزانہ سو مرتبہ پناہ مانگتا ہے عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! اس میں کون لوگ داخل ہوں گے؟ فرمایا وہ قراء (عبادت گذار) جو اپنی

(قرأت و) عبادت میں ریا کار ہوں۔

تشریح:۔قولہ:"جُب" وہ بڑا کنواں یا گڑھا جو اوپر سے ڈھکا ہوا نہ ہو یہ لفظ گویا دار السلام کے مقابل ہے کہ جنت میں سلامتی وخوشی ہوگی جبکہ دوزخ میں اَلَم ورنج ہوگا۔

قولہ:"قرّاء" قاریٔ کی جمع ہے قرآن پڑھنے والے اور عالم کو بھی کہتے ہیں اور عبادت گذار کو بھی، یہاں تینوں معانی مراد ہیں یعنی جو شخص اپنی نیکی سے دنیوی فائدہ ہی حاصل کرنا چاہتا ہو خواہ وہ شہرت کی شکل میں ہو یا جاہ وعزت اور دولت کی صورت میں وہ اس عمل کے ثواب سے محروم ہوگا۔

بَابٌ

"قال رجل یارسول اللّٰہ!الرجل یعمل العمل فیُسِرُّہ فاذااُطُّلِعَ اَعجبہ ،قال ،قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :لہ اجران اجرالسِرِّ واجرالعلانیۃ". (غریب)

ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول! ایک شخص کوئی عمل کرتا ہے اور اسے چھپاتا ہے تاہم جب اس کا پتہ چلتا ہے (یعنی کسی کو معلوم ہوجاتا ہے) تو اس کو خوشی ہوتی ہے (یعنی وہ اس شہرت پر خوش ہوجاتا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لئے دگنا اجر ہے ایک پوشیدہ عمل کا اور دوسرا ظاہری عمل کا۔ (کیونکہ ہر ایک پہلو اچھی نیت پر مبنی ہے **وانماالاعمال بالنیات**)

تشریح:۔اس حدیث پر بعض نسخوں میں ترجمۃ الباب "عمل السر" ہے یہ حدیث مشکوٰۃ میں بھی آئی ہے اور وہاں تصریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے والے خود ابو ہریرہؓ ہیں۔

قولہ:"فیسرہ" سرور بمعنی خوشی سے نہیں بلکہ اسرار بمعنی چھپانے کے ہے یعنی باب افعال کے مضارع کا صیغہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ عمل کرتے وقت نیت ریاکاری کی نہ ہو بلکہ دورانِ عمل یا بعد از عمل اس کا علم دوسروں کو ہوجاتا ہے۔

قولہ:"اَعجبہ" یہاں مراد اعجاب یا عجب ممنوع نہیں اور نہ ہی ریا والی خوشی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ لوگ زمین پر اللہ کے گواہ ہیں لہٰذا وہ قیامت کے دن اس کی گواہی دیں گے اور موت کے بعد اس کا ذکر خیر کریں گے جو آخرت میں مفید ہوگا یا خوشی اس وجہ سے ہونی مراد ہے تاکہ لوگ اس عمل میں اس کی پیروی کریں اور یہ "من سَنَّ سُنۃ حسنۃ کان لہ اجرھا واجر من عمِل بھا" کا مصداق بن جائے جیسا کہ امام

ترمذیؒ نے نقل کیا ہے ایسے شخص کو یقیناً دُہرا اجر ملتا ہے، اور اگر اطلاع پر خوشی دنیوی فائدہ کے لئے تو یہ عین ریا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم وترغیب یا کسی اور مصلحت کے پیشِ نظر عمل کا اظہار ممنوع نہیں بلکہ بعض دفعہ اس کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے خصوصاً فرائض وشعائر کا، ہاں نوافل میں اگر تعلیم وغیرہ مراد نہ ہو تو اخفاء افضل ہے۔

باب المرأمع من اَحَبَّ

(آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے)

"المرأمع من اَحَبَّ وله مااكتَسَبَ". (حسن غريب)

یعنی آدمی کا حشر اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اسے وہی ملے گا جو اس نے دوستی (کی غرض) سے حاصل کیا ہوگا۔

تشریح:۔ آخرت میں معیت ومفارقت کا دارومدار دنیوی محبت ومنافرت پر مبنی ہے یہاں کی دوستی وہاں کی معیت کو جنم دیتی ہے تاہم دنیا میں نیکوکاروں کی دوستی وہاں مزید مستحکم ومضبوط بنے گی جبکہ بدکاروں کی دنیوی دوستی آخرت میں لعن وطعن کا موجب بنے گی، غرض اچھے لوگوں سے دوستی اخروی دوستی کو مستلزم ہے اور ان سے نفرت ودوری آخرت میں دوری کو مستلزم ہے، پھر وہاں کی معیت دنیوی دوستی میں ملنے والے اثرات وثمرات کے تفاوت پر مبنی ہوگی جو شخص دنیا میں جتنے نیک ثمرات حاصل کرے گا وہ وہاں اسی تناسب سے دوست ومحبوب کے قریب ہونے میں کامیاب ہوگا، اگرچہ ان کے درجات ومنازل الگ الگ ہوں گے۔

حدیث انسؓ آخر:۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا اے اللہ کے رسول! قیامت کا وقوع کب ہوگا؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم (کوئی جواب دیئے بغیر) نماز کے لئے کھڑے ہوگئے پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی تو فرمایا کہاں ہے وہ شخص جو قیامت کی آمد کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟؟؟ وہ شخص کہنے لگا میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ (جو اس کے آنے میں جلدی کرتے ہو؟) اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں نے نمازوں اور روزوں کے حوالے سے تو کوئی بڑی تیاری نہیں کی ہے (یعنی نوافل وغیرہ کا زیادہ اہتمام تو نہیں کیا ہے) البتہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت ضرور کرتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی اسی

کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہو اور تم بھی اسی کے ساتھ ہوں گے جس سے تمہیں محبت ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد اس بات سے خوش جتنا خوش ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ (صحیح)

کیونکہ وہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے تھے جب ہی تو اپنی جانوں پر کھیلتے تھے اور اس فرمان میں زبردست خوش خبری تھی اس لئے سب خوش ہوئے۔

حدیث صفوان:۔ ایک بلند آواز گنوار آ کر کہنے لگا اے محمد! ایک آدمی کسی ایک قوم سے محبت تو کرتا ہے۔ تاہم وہ ابھی تک ان (قوم) سے ملا نہیں (تو کیا وہ ان سے پیچھے اور الگ ہی رہے گا؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر آدمی اسی کے ساتھ رہے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ (حدیث صحیح)

قولہ: "جھوری" بمعنی بلند اور زوردار کے ہے جیسا کہ عام دیہاتیوں کی زور سے بولنے کی عادت ہوتی ہے چونکہ وہ لوگ آداب سے عموماً معرّیٰ ہوتے ہیں اس لئے آپ علیہ السلام کو اس بلند آوازی سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی پس رفع صوت کی علت ممانعت جو ایذاء وسوءِ ادب ہے متحقق نہ ہوئی لہٰذا یہ رفع ممنوع میں داخل نہ ہوئی فلا اشکال۔

ان صاحب کا مقصد یہ تھا کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی صحابہ کرامؓ سے محبت تو بہت کرتا ہوں اور ان جیسا عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں جیسا کہ لفظ "لَمَّا" میں اس کی طرف اشارہ ہے مگر میں ان جیسے عمل کرنے سے قاصر رہتا ہوں ہاں البتہ محبت میری سچی اور پکی ہے، آپ علیہ السلام کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ یہ محبت بھی جالب عمل اور مفید قرب ہے اس کی بدولت آدمی اپنے محبوبین کے مقام اور قرب کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے چونکہ اللہ والوں سے محبت کی بنیاد اللہ سے محبت پر قائم رہتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ محبت کرنے والوں کو اپنے قریب (لافی المکان) بلاتا ہے اس لئے تمام محبین اور محبوبین حسبِ تفاوتِ محبت ایک دوسرے کی وساطت سے یا بلاواسطہ اللہ عزوجل رحمٰن ورحیم کے قریب رہیں گے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم اٰمین یارب العٰلمین

باب حسن الظن باللّٰہ تعالیٰ

(اللہ تعالیٰ پر نیک گمان کرنے کا بیان)

"اِن اللّٰہ تعالیٰ یقول انا عند ظن عبدی بی وانا معه اذا دعانی". (حسن صحیح)

یہ حدیث قدسی ہے "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے میرے بارے میں گمان کے پاس (مطابق) ہوں اور میں اس کے پاس ہوتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔

تشریح:۔ یعنی آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے جس طرح توقع ہوگی اور جیسا یقین ہوگا اس کے ساتھ اللہ عزوجل کا معاملہ بھی اسی طرح ہوگا جیسا کہ مشاہدہ ہے جب آدمی کا یقین ہوتا ہے کہ عزت وذلت دینے والا صرف اللہ ہے، رزق عطا کرنے والا فقط اللہ، بیماری اور اس پر ثواب اسی کے دست قدرت میں ہے، غیبی مدد کرنے والا اور آہ سننے والا اور دعائیں قبول کرنے والا وہی ہے تو ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جس کی نظر مادی اسباب پر رہتی ہے تو وہ اسباب کا ہمیشہ محتاج رہتا ہے اس کا کام پھر بظاہر بغیر اسباب کے ہوتا نظر نہیں آتا ہے یہ تو دنیا کا حال ہے جب کہ آخرت میں فقط وہ لوگ کامران وسرخ رُو ہوں گے جن کا گمان یعنی یقین اللہ پر ہی ہو مادی اسباب وغیرہ سے تمام ناتے ٹوٹ جائیں گے۔

باب ماجاء فی البرِّ والاثم

(نیکی وبدی کے بیان میں)

"ان رجلاً سأل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن البرِّ والاثم فقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: البِرُّحسن الخُلق والاثم ماحاکَ فی نفسکَ وکرِهتَ ان یَطّلِعَ الناس علیه".
(حسن صحیح)

حضرت نوّاس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی وبدی (اچھائی وبُرائی) کے بارے میں پوچھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیکی خوش اخلاقی ہے اور بُرائی وہ ہے (یعنی اس کی پہچان یہ ہے) کہ جو تیرے دل میں کھٹکے اور اس پر لوگوں کی آگہی تمہیں ناگوار گذرے۔

تشریح:۔ قوله: "بِرّ" بکسر الباء وتشدید الراء دراصل اِحسان، شفقت اور مہربانی کو کہتے ہیں جو خوش

اخلاقی کے ساتھ لازم ہے جبکہ بداخلاقی میں جفا، ظلم اور بدسلوکی ہوتی ہے، چونکہ ایمان ایک نور ہے اور ہر گناہ ظلمت ہے دونوں میں تضاد ہے اس لئے دل نیکی سے مطمئن رہتا ہے کہ نیکی بھی نور بڑھانے کا سبب ہے جبکہ گناہ سے دل جو محل ایمان ہے کے اندر بے چینی پیدا ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں ایک محل میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں یا کم از کم موافق نہیں رہتی ہیں پھر اس سے ایماندار کو شرمندگی بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ ضمیر کے منافی ہوتا ہے خصوصاً جب دوسروں کو اس کی اطلاع ہو جائے تو شرمندگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

باب ماجاء فی الحب فی اللّٰہ

(اللہ ہی کے لئے محبت کرنے کا بیان)

"قال اللّٰہ عزّوجلّ: المُتَحَابُّون فی جلالی لھم منابرٌ من نورٍ یغبِطُھم النبیُّون والشھداء". (حسن صحیح)

(یہ حدیث بھی قدسی ہے) اللہ عزوجل نے فرمایا: میری جلالت وعظمت کی بناء پر محبت کرنے والوں کے لئے (قیامت کے دن) نور کے منبر ہوں گے جن پر انبیاء اور شہداء بھی (گویا) رشک کریں گے۔

تشریح:۔ یعنی جن لوگوں کے آپس میں خوشگوار تعلقات اور محبت واُلفت کی بناء محض اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے حصول پر ہو بایں طور کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اس لئے بڑا سمجھ کر محبوب بناتا ہے کہ وہ اللہ کا مقرب اور نیک بندہ ہے، اس کے علاوہ کوئی دنیوی وذاتی لالچ نہ ہو تو قیامت کے دن یہ لوگ ایک عظیم نعمت سے سرفراز ہوں گے چونکہ ان کی محبت کا مقصد عالی تھا اس لئے ان کو نور کے میناروں پر بٹھادیا جائے گا جہاں وہ دوسروں کے لئے قابل رشک ثابت ہوں گے۔

قولہ: "یغبطھم" بکسر الباء غبطہ سے بمعنی رشک کے ہے، یہاں محشی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جو شخص کسی علم یا عمل سے آراستہ ہوجاتا ہے تو اس کو اس شخصی علم وعمل کی وجہ سے مخصوص درجہ دیا جاتا ہے جو اس کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتا اگرچہ اس سے ارفع واعلیٰ درجات پر بھی فائز لوگ ہوتے ہیں تاہم ان میں سے بعض درجات ایسے بھی ہوں گے جو عالی مراتب والے بھی ان پر رشک کریں گے ازاں جملہ ایک مرتبہ نور کے مینار بھی ہیں۔ لیکن حضرت گنگوہیؒ نے اس رائے کو مسترد فرمایا ہے وہ کوکب میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انبیاء کو یہ مقام حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی اس پر رشک فرماتے گویا یہ مبالغہ ہے، مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام تو اس

محبت سے یقیناً سرشار ہیں اس لئے ان کو غبطہ کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

حدیث آخر:۔ یہ روایت حضرت ابو ہریرہ یا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما میں کسی ایک سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات لوگ ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے گا اس دن جس روز اللہ کے سایۂ رحمت کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا (۱) انصاف کرنے والا بادشاہ (۲) وہ جوان جس کی نشو ونما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو (۳) وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو جب اس (مسجد) سے نکلے، تا آنکہ اس کی طرف لوٹ جائے (۴) اور ایسے دو شخص جو محض اللہ کے لئے باہمی محبت کرتے ہوں اسی پر ملتے ہوں اور اسی پر الگ ہوتے ہوں (۵) وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے تو اس کی آنکھیں آنسو بہا دیں (۶) وہ شخص جس کو کوئی اثر ورسوخ اور حسن وجمال والی خاتون اپنی طرف بُلائے تو یہ جواب دے کہ میں اللہ عزوجل سے ڈرتا ہوں (۷) اور وہ شخص جو کوئی چیز صدقہ کرے تو اسے اتنا خفیہ رکھے کہ اس کے بائیں کو بھی پتہ نہ چلے کہ دایاں کیا دے رہا ہے؟ (حسن صحیح)

تشریح:۔ چونکہ یہ ساتوں امور بہت مشکل بھی ہیں اور مع ہذا بغیر اخلاص کے ممکن بھی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت کاملہ کے بغیر ممکن نہیں کہ آدمی پر جب تک اللہ کی محبت غالب نہ آئے تو وہ ان امور کی انجام دہی سے بہر حال قاصر رہتا ہے اس لئے جو آدمی ان امور میں سے کسی بھی ایک کو سرانجام دے تو وہ اس کی محبت کاملہ کی دلیل ہے اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر قیامت کے روز خصوصی مہربانی فرمائیں گے کہ اس کو عرش کے قریب مقام عطاء فرما کر امتیازی عنایت فرمائیں گے۔

ظل وسایہ کی اضافت اللہ کی طرف تشریف کے لئے ہے مراد عرش کا سایہ ہے یا ظل بمعنی قریب کے ہے یعنی اپنی خصوصی رحمت کے قریب کر دے گا کیونکہ ہر شے کا سایہ اس کے قریب ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نسبت مجازی ہے اور عرش کے نیچے کا مطلب یہ نہیں کہ باقی اشیاء عرش سے باہر ہیں کیونکہ سورج سمیت ہر چیز اور ساری کائنات عرش کے نیچے ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بمقابلہ دوسروں کے اقرب اور میدان محشر میں ایسے مقام پر ہوں گے جہاں سے جنت کے مناظر نظر آئیں گے، ٹھنڈی ہوائیں ان تک پہنچیں گی اور جنت کی خوشبو سے گھرے ہوئے ہوں گے جب کہ اشقیاء دوزخ کے قریب اور اس کی تپش اور دھویں میں گھرے ہوئے ہوں گے، اعاذنا اللہ منھا۔ پھر جس طرح اہل ایمان کے باعتبار قرب کے درجات ہیں اسی طرح کفر کے باعتبار بعد کے طبقات ہوں گے۔ بہر حال اگر کوئی آدمی کمزور ہو یا مامور ہو عدل پر تو اس کا عدل بادشاہ

کے عدل کی طرح نہیں، بوڑھے کی عبادت گذاری جوان کی طرح نہیں مسجد میں بے شوق جانا یا کبھی کبھار جانا خواہشمند کی طرح نہیں، اور نفس تعلق رکھنے والے اللہ کی خاطر مجتمع ومتفرق ہونے والوں کی مانند نہیں اور کسی عام عورت کی دعوتِ بدی کو ٹھکرانا شہرت اور عزت اور حسینا کی دعوت کے مسترد کرنے کی طرح نہیں اور علانیہ صدقہ نفلیہ، خفیہ کی طرح نہیں اس لئے ان امور پر اس عظیم انعام کا ترتب ہوتا ہے۔

قولہ: "حتیٰ لاتعلم شماله الخ" مبالغہ ہے اِخفاء میں یعنی اگر ہاتھ کو علم ہوتا تو بھی بائیں کو پتہ نہ چلتا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے چونکہ دینا سیدھے ہاتھ سے ہوتا ہے اس لئے نسبت یمین کی طرف کی گئی ہے اور یہی صحیح ہے مسلم کی روایت میں اس کے برعکس ہے مگر وہ راوی کا سہو ہے، بعض حضرات نے یہ مطلب لیا ہے کہ بائیں جانب والے شخص کو معلوم نہ ہو کہ دائیں والے کو کیا دیا گیا؟ مگر اول معنی اظہر واصح ہے۔

باب ماجاء فی اعلام الحُبِّ

(محبت کے اِظہار کا بیان)

"اذااَحَبَّ احدُکم اخاہ فَلْیُعلِمہ ایّاہ". (حسن صحیح غریب)

جب تم میں سے کوئی ایک اپنے (اسلامی) بھائی سے محبت کرے تو اس کو بتلادے

تشریح: چونکہ رضائے اِلٰہی کی غرض سے باہمی محبت آپس کے خوشگوار تعلقات کے لئے بیج کی طرح ہے اور اظہار محبت اس کے لئے آب پاشی کی مانند ہے اس لئے بتادینا چاہئے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں تاکہ اس فریق کی طرف سے بھی محبت میں اضافہ ہو جائے۔ پھر "فلیعلمه" اگرچہ امر کا صیغہ ہے مگر یہاں وجوبِ اعلام کے لئے نہیں بلکہ ندب واستحباب کے لئے ہے۔

باب کی اگلی حدیث میں اس پر یہ بھی اضافہ ہے کہ اس سے اس کے نام، والد کے نام اور قبیلہ کے بارے میں بھی پوچھے "فانه اوصل لِلمحبة" کیونکہ یہ سوال (وجواب) محبت کو زیادہ جوڑنے والا اور مضبوط کرنے والا ہے کیونکہ جیسے جیسے تعارف بڑھتا ہے ویسے ویسے محبت بڑھتی ہے اور یہ مجرب ومشاہد ہے، اور اس لئے بھی کہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی صورت میں رابطہ بھی آسان ہو جاتا ہے آج کل لوگ موبائل نمبر دیتے ہیں یہ بھی اہم چیز ہے۔

باب كراهية المدحة والمداحين

(تعریف اور تعریف کرنے والوں کی ناپسندیدگی کا بیان)

"عن ابی معمر قال: قام رجل فاثنیٰ علی امیر من الامراء فجعل المقداد بن الاسود یحثو فی وجهه التراب، وقال: اَمَرَنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نحثو فی وجوه المداحین التراب". (حسن صحیح)

ابومعمر سے مروی ہے کہ ایک شخص اٹھا اور امراء میں سے کسی ایک امیر کی تعریف کرنے لگا تو حضرت مقداد بن اسودؓ نے اس کے منہ پر مٹی پھینکنی شروع کی اور اس کے ساتھ فرمانے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم فرمایا ہے کہ ہم تعریف کرنے والوں کے مونہوں پر خاک ڈالیں۔

تشریح:۔ "حثا التراب حثواً" مٹھی بھر کر مٹی پھینکنے کو بھی کہتے ہیں اور نفس مٹی پھینکنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں مَدَّاحین سے مراد وہ پیشہ ور لوگ ہیں جو لوگوں کی تعریف مال کے حصول کا ذریعہ بناتے ہوں عربوں میں جیسے نیاحت ونوحہ کرنے والے پیشہ ور ماہر ہوتے تھے تو اسی طرح مداح بھی ہوا کرتے تھے، اس حدیث میں ان کے اس پیشہ کو ناپسند گردانا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو نامراد لوٹاؤ تاکہ وہ اس پیشہ کو چھوڑ دیں کیونکہ جب ان کی یہ حقیر مراد پوری نہ ہوگی تو مجبوراً ان کو اسے چھوڑنا پڑے گا، اس سے معلوم ہوا کہ ہر اس پیشہ ور آدمی کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے جس کا پیشہ ناجائز یا نامناسب ہو۔ بہرحال یہاں مٹی ڈالنے سے مراد، نامراد لوٹانا ہے اگرچہ حدیث کے دوسرے معانی بھی بیان کئے گئے ہیں، مثلاً بعض نے اس کو ظاہر پر حمل کیا ہے جیسا کہ حدیث باب کے راوی حضرت مقداد بن عمروؓ نے کیا ہے، جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ان کو کچھ نہ کچھ دینا چاہئے تاکہ وہ مخالف بن کر ہجو ومذمت نہ کرنے لگے جیسا کہ ان کی عادت ہے البتہ چونکہ دنیا ایک حقیر چیز ہے اس لئے اس کو تراب سے تعبیر کیا۔ مگر ظاہر وہی ہے جو اوپر اولاً ذکر ہوا یعنی محروم کردینا، جس سے رُودررُو مدح کی کراہیت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ترجمۃ الباب میں ہے چونکہ مُنہ پر مدح وتعریف سے عُجب وغیرہ امراض پیدا ہوتے ہیں اس لئے اس کی ممانعت فرمادی گئی البتہ جہاں یہ وجہ نہ ہو جو آج کل ناممکن ہے تو وہاں روبرو تعریف کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مدحیہ کلام حقیقت پر مبنی ہو چنانچہ امام نوویؒ نے اس کی بہت ساری مثالیں نقل کی ہیں از اں جملہ ایک یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: "ان فیک لخصلتین یحبهما الله

الحلم والاناۃ" اس پر امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وفیہ جواز الثناء علی الانسان فی وجھہ اذا لم یخف علیہ فتنۃ باعجاب ونحوہ واما استحبابہ فیختلف بحسب الاحوال والاشخاص واما النھی عن المدح فی الوجہ فھو فی حق من یخاف علیہ الفتنۃ بما ذکرناہ وقد مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی مواضع کثیرۃ فی الوجہ الخ راجع نووی شرح مسلم. (ج:۱ص:۳۶)

قولہ: "ویکنی ابا معبد وانما نسب الی الاسود الخ" یعنی حضرت مقدادؓ کی کنیت ابو معبد ہے اور اسود کی طرف ان کی نسبت بوجہ تبنّی کے ہے جیسا کہ عربوں میں جاہلی رسم تھی ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے کہ ابو معبد کنیت نقل کرنے میں امام ترمذیؒ منفرد ہیں لگتا ہے کہ یہ تصحیف ہے اصل میں ابو سعید ہے اور یہ کہ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ان کی نسبت اسود کی طرف شروع اسلام میں تھی لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی "ادعوھم لآبائھم" (احزاب آیت:۵) تو اس کے بعد بجائے مقداد بن اسود کے ان کا نام مقداد بن عمرو ہی رہا "واشتھر وبھا کشھرتہ بابن الاسود"۔ (عارضہ ج:۵ص:۱۷۴)

باب ماجاء فی صحبۃ المؤمن

(مؤمن کے ساتھ رہنے کی ترغیب وتلقین)

"لاتُصاحِب اِلّا مؤمناً ولا یاکل طعامک اِلّا تقی".

ساتھی (اور دوست) مت بناؤ مگر مؤمن کو اور تیرا کھانا متقی شخص کے علاوہ کوئی نہ کھائے۔

تشریح:۔ یعنی دوستانہ تعلقات اور خوشگوار مراسم صرف مومن کے ساتھ ہی قائم کرو کیونکہ کفار ومنافقین کی دوستی وتعلق نقصان دہ ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں مومن بمقابل کافر کے نہ ہو بلکہ بمقابلہ کمزور مومن کے ہو یعنی اپنی دوستی کاملین کے ساتھ قائم کرو کیونکہ ضعیف مومن کی دوستی میں خطرہ اور سستی وکاہلی متوقع ہے علیٰ ہذا جب کمزور ایمان والوں کی دوستی سے منع فرمایا تو کفار ومنافقین سے دوستانہ تعلق بطریق اولیٰ ممنوع ہوا۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

جہاں تک کھانے کی بات ہے تو یہاں مراد ضیافت وحاجت کا کھانا نہیں بلکہ وہ کھانا ہے جو اکرام کے طور پر کھلایا جاتا ہے جیسے کسی کی دعوت کرنا چونکہ خصوصی دعوت محبت بڑھانے کا مؤثر ذریعہ ہے اس لئے فرمایا کہ ایسا کھانا صرف پرہیزگار لوگوں کو کھلانا چاہئے تاکہ ان سے اچھے تعلقات قائم ودائم رہے، نیز ان کی تطییب خاطر میں اللہ کی خوشنودی بھی حاصل کی جاتی ہے اور اچھی محفل کے ثمرات وبرکات کا حصول بھی تقریباً یقینی ہے بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور کھانا حلال ہو جہاں تک عام کھانے اور صدقات نفلیہ کا تعلق ہے تو وہ کافر کو بھی کھلانا جائز ہے۔

باب فی الصبر علی البلاء

(تکلیف ومصیبت پر صبر کرنے کا بیان)

"اذا اراد اللہ بعبدہ الخیر عَجَّلَ له العقوبة فی الدنیا واذا اراد بعبدہ الشر امسک عنه بذنبه حتیٰ یوافی به یوم القیٰمة" وبهذا الاسناد عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: ان عُظم الجزاء مع عُظم البلاء وان اللہ اذا اَحَبَّ قوماً ابتلاهم فمن رَضِیَ فله الرِضیٰ ومن سَخِطَ فله السَخَطُ". (حسن غریب)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو (گناہوں پر) دنیا میں ہی جلد سزا دیتے ہیں اور جب کسی بندے کے ساتھ بُرائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس سے اس کے گناہ کی سزا کو روک لیتے ہیں تا آنکہ قیامت کے دن اس گناہ پر پوری سزا دیں۔ اور اسی اسناد کے ساتھ آپ علیہ السلام سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جزاء کا بڑھاؤ آزمائش کے بڑھاؤ سے منسلک ہے اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتے ہیں تو اس کو آزماتے ہیں پس جو راضی رہے تو اس کے لئے رضامندی ہے اور جو غصہ ہو جائے تو اس کے لئے غصہ ہے۔

تشریح:۔ آزمائش عموماً تکلیف کی شکل میں ہوتی ہے جیسے غربت، مرض اور کسی محبوب شخص یا شے کا فراق وغیرہ گو کبھی کبھار دولت وراحت اور صحت کی صورت میں بھی ہوتی ہے بنا بر ہر تقدیر امتحان و آزمائش کبھی گناہوں کی نحوست کے طور پر ہوتی ہے اور کبھی رفع درجات کے لئے جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں ہے باب کی اس پہلی حدیث میں یعنی سند اول والی میں گناہ پر سزا کا بیان ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اللہ جس شخص کو پسند فرماتے ہیں اور جس سے راضی ہوتے ہیں تو اسے اس کے گناہ پر دنیا میں ہی سزا دیتے ہیں جبکہ ناپسندیدہ شخص

کی سزا آخرت تک کے لئے ذخیرہ کردی جاتی ہے چونکہ دنیا وآخرت کی سزاؤں میں ناقابل تصور فرق ہے کہ دنیا کی سزا انتہائی مختصر اور آسان ہے اگر چہ بظاہر بھاری لگے مگر آخرت کے مقابلہ میں گویا کچھ بھی نہیں اس لئے یہ اللہ کی طرف سے خصوصی نرمی وشفقت ومہربانی کا اثر ہے جبکہ بُرے آدمی پر دنیا میں گناہوں سے کچھ آفت نہیں آتی مگر اس کا حشر آخرت میں انتہائی درجہ کا سخت ہوتا ہے کیونکہ وہ سزا وافی یعنی پوری بھی ہے اور بھرپور بھی، والعیاذ باللہ۔ اللّٰھم انا نسئلک الخیر والعفو والعافیۃ والمعافاۃ فی الدنیا والآخرۃ

قولہ: "ان عُظم الجزاء مع عظم البلاء" بضم العین وسکون الظاء بمعنی عظمت وزیادتی کے ہے یعنی دنیا میں جتنی آزمائش سخت اور مشکل ہوگی اسی تناسب سے اس کا اجر وثواب بھی زیادہ ہوگا اور چونکہ آزمائش وامتحان کی حیثیت ٹریننگ کی ہے اس لئے اس کے لئے اُن لوگوں کا انتخاب ہوتا ہے جو اچھی استعداد وصلاحیت کے حامل ہوں ہاں البتہ جو شخص امتحان میں فیل ہو جاتا ہے تو وہ بجائے کامیابی کے فیل ہو کر اپنے درجے سے بھی نیچے چلا جاتا ہے اس پر اللہ کی ناراضگی نازل ہوتی ہے اس لئے انتہائی ضروری ہے کہ مصیبت کے وقت رضا بالقضاء کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور نازیبا الفاظ زبان پر نہ آنے دیا جائے۔ تاہم یہ قاعدہ اکثریہ ہے ورنہ کبھی جہنمی شخص بھی اپنے گناہ کی وجہ سے دنیا میں مبتلائے عذاب ہوتا ہے جیسے ماں باپ کا نافرمان اور کبھی غیر محبوب بھی آزمائش میں مبتلاء کیا جاتا ہے تاکہ وہ بے صبری کی وجہ سے مزید پستی میں چلا جائے جیسے فرعون والوں پر طرح طرح کے عذاب آئیں مگر انہوں نے عبرت نہیں پکڑی بلکہ پوری قوم مزید بگڑی۔

"قالت عائشۃ مارأیت الوجع علی احداشدّمنہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم". (حسن صحیح)

عرب وجع بیماری کو کہتے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضؐ سے زیادہ سخت بیماری کسی کی نہیں دیکھی ہے، اس کی مزید وضاحت اگلی حدیث سے بآسانی معلوم ہوسکتی ہے۔

حدیث آخر: ۔حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! سب سے مشکل آزمائش کن لوگوں کی ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء کی پھر زیادہ افضل کی، آدمی اپنے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے پس اگر اس کے دین میں صلابت (پختگی) ہوگی تو اس کا امتحان بھی سخت ہوگا اور اگر اس کے دین میں کمزوری ہوتی ہے تو دین (کی قوت وضعف) کے بقدر اسے آزمایا جاتا ہے پس ابتلاء آدمی کے ساتھ لگا رہتا ہے تا آنکہ اسے چھوڑ دے زمین پر چلتا ہو اور اں حالیکہ اس کا کوئی گناہ (باقی) نہیں رہتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ والے تکلیفات سے اللہ کی طرف مزید جھکتے ہیں اس لئے ان کے رفع درجات کے پیش نظر ان کو تکلیفات میں مبتلا کیا جاتا ہے کیونکہ مصیبت اور اس پر صبر کی بدولت آدمی کو جنت کے اس درجہ تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے جہاں وہ اپنے عمل کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتا اگرچہ مقربین کے اعمال انتہائی عالی ہوتے ہیں لیکن اللہ کے قرب اور جنت کے درجات بھی بے شمار ہیں تو کچھ اعمال کی وجہ سے اور کچھ آزمائش کی بناء پر بطور غیبی مدد کے حاصل کئے جاتے ہیں گویا آزمائش بھی سیر الی اللہ اور سلوک کے زمرہ میں آتی ہے پس جو لوگ فنافی السیر ہیں ان کی آزمائش ان کی شان کے مطابق یعنی سخت ہوتی ہے تاکہ ان کی سیر اور سفر ورفتار مزید تیز ہو، جبکہ ان سے نیچے درجے کے لوگ اپنی استعداد کے مطابق مکلّف بنادیئے جاتے ہیں اور جو لنگڑے ہوتے ہیں وہ گویا اس مقابلے میں شریک بھی نہیں کردیئے جاتے جبکہ اندھے تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتے البتہ لنگڑا کوشش تو کرتا ہے اور اپنے عمل کے مطابق نمبر حاصل کرتا ہے جبکہ اعمٰی اس میدان کے شہسواروں میں شمار بھی نہیں ہوتا۔

باب ماجاء فی ذَھاب البصر

(نابینا ہونے کا ثواب)

"ان اللہ یقول: اذا اَخذتُ کریمتی عبدی فی الدنیا لم یکن لہ جزاء عندی اِلّا الجنة". (غریب)

حدیث قدسی ہے اللہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے بندے کی دونوں آنکھوں (کی بینائی) لیتا ہوں دنیا میں تو میرے پاس اس کی جزاء جنت کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔

تشریح:۔ قولہ: "ذھاب" بفتح الذال ختم ہونے اور چلے جانے کو کہتے ہیں جبکہ بکسر الذال بارش کو کہا جاتا ہے۔

قولہ: "کریمتین" کریمۃ کا تثنیہ ہے اس کے معنی محبوبۃ کے ہیں چونکہ آنکھ آدمی کو بہت عزیز ہوتی ہے اس لئے اس کو کریمۃ کہتے ہیں اور اس لئے بھی کہ انسان آنکھ یعنی نگاہ کی وجہ سے مکرم ومعزز رہتا ہے اس کے بدلے میں جنت کا مطلب یہ ہے کہ نابینا بغیر کسی تعذیب کے جنت میں جائے گا علی ہذا یہ خاصیت المفرد ہوگی جیسا کہ پہلے وضاحت گذر چکی ہے یا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اس پر صبر کرے تو اس کے لئے جنت ہے کیونکہ بغیر صبر کے تکلیف کا ثمرہ ضائع ہوجاتا ہے یا کڑوا بن جاتا ہے اگلی حدیث میں اس قید کی تصریح کی گئی ہے

ارشاد ہے: "من اَذھبتُ حَبِیبَتَیہ فصبرواحتسب لم ارض لہ ثواباً دون الجنۃ "یعنی میں جس کی دونوں آنکھیں ختم کروں یعنی نابینا بنادوں اور وہ اس پر صبر کرے اور ثواب کی نیت کرے تو میں اس کے لئے جنت سے کم ثواب پر راضی نہیں ہوں۔ (حسن صحیح)

حدیث آخر:۔ "یَوَدّ اھل العافیۃ الخ" یعنی قیامت کے دن جب مصیبت زدہ لوگوں کو (بے حساب) ثواب دیا جائے گا تو (دنیا میں) تندرستی سے رہنے والے تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھالوں کو دنیا میں قینچیوں سے کاٹ دیا ہوتا۔

یہ روایت اگرچہ عبدالرحمن بن مَغراء کی وجہ سے قوی سند سے ثابت نہیں بلکہ امام ترمذیؒ کے بقول غریب ہے تاہم اصولی طور پر یہ طے ہے کہ ہر مصیبت پر صبر اور احتساب اجر جزیل کا سبب ہے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے "اِنّما یوفّیٰ الصابرون اجرھم بغیر حساب " (زمر آیت:۱۰) اور پھر کون ہوسکتا ہے جو بے حساب ثواب کو دیکھ کر رشک بلکہ تمنیٰ نہ کرے؟

حدیث آخر:۔ "مامن احدٍ یموت اِلّانَدِمَ الخ" کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو مرتے وقت نہ پچھتائے صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اس کے افسوس (حسرت) کرنے کی کیا وجہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ نیکوکار ہے تو افسوس کرے گا کہ اس نے زیادہ عمل کیوں نہیں کیا، اور اگر بدکردار ہو تو وہ اس پر ندامت کرے گا کہ وہ برائی سے باز کیوں نہ آیا (یعنی کیوں توبہ تائب نہ ہوا)۔

یہ روایت بتصریح امام ترمذیؒ ضعیف ہے البتہ یہ امر یقینی ہے کہ موت کے وقت نشہ اُتر جاتا ہے اور حقیقت ہر ایک پر منکشف ہو جاتی ہے تفصیل مطلوب ہو تو احیاء العلوم للغزالی" وحجۃ اللہ البالغہ لشاہ ولی اللہ" کی طرف مراجعت کی جائے۔

حدیث آخر:۔ قولہ: "یخرج فی آخر الزمان رجال یختلون الدنیابالدین الخ" آخر زمانہ میں ایسے لوگ آئیں گے جو دنیا کو دین کے بدلے دھوکے سے کمائیں گے، لوگوں کو فریب دینے کے لئے بھیڑ کی کھالیں نرمی دکھانے کی خاطر پہنیں گے ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی جبکہ ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں کی مانند (سخت) ہوں گے، اللہ فرماتے ہیں: کیا تم میرے ساتھ غرور کرتے ہو یا میرے سامنے یہ جرأت کرتے ہو، پس میں اپنی قسم کھاتا ہوں کہ میں ایسے لوگوں پر ان ہی میں سے ایسا فتنہ ضرور بھیجوں گا جو بُردبار شخص کو بھی حیرت زدہ کردے گا۔

قولہ: "یختلون" ختل دراصل دھوکہ دہی کو کہتے ہیں یہ لفظ بھیڑیئے کے لئے اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ چھپ کر شکار پر حملہ کرے یہاں مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی شعار اپنا کر اس سے دنیا شکار کرنا چاہیں گے، چنانچہ وہ بھیڑ کی کھال سے بنا ہوا لباس پہنیں گے جیسے پوستین جو زاہد لوگ پہنا کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو اپنے دیندار و زاہد ہونے کا باور کراسکیں، یہ تو الفاظ کا ظاہری مطلب ہے اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ کنایہ ہے ظاہری نرمی اور خوش اخلاقی سے اور "من اللین" قید سے اس معنی کی تائید معلوم ہوتی ہے یعنی وہ دنیا داروں سے پیش آنے میں بڑے شگفتہ زبان اور نرم بیان ہوں گے جس سے وہ دنیا داروں کے دل اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہوں گے، مگر یہ میٹھا انداز اور میٹھی زبان ایک تکلف کے سوا کچھ نہ ہوگا کیونکہ اندر سے وہ بالکل بھیڑیئے کی طرح خراب ہوں گے، چونکہ ان کا یہ فعل انتہائی خودغرضی، دھوکہ دہی اور قساوت قلبی پر مبنی ہے اس لئے اللہ عزوجل نے اپنے جلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ ایسے مغروروں اور ایسی جسارت کرنے والوں پر ایسا فتنہ نازل کروں گا جس سے بچنے کی صورت عالم وعقلمند کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گی چہ جائیکہ عام آدمی کو سمجھ آئے۔

اگلی حدیث کا مضمون بھی اس سے ملتا جلتا ہے تاہم اس میں بجائے شکر کے عسل یعنی شہد کا ذکر ہے یعنی ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی اور دل ایلوا سے زیادہ کڑوے ہوں گے چونکہ ایلوا شہد کو فاسد کرتا ہے اس لئے ان لوگوں کی یہ شیریں زبانی ان کے کڑوے دلوں کے سامنے کسی طرح مفید ثابت نہیں ہوں گی۔

قولہ: "لَأُتِيحَنَّهم" بروزن لَأُقِيمَنَّهُم، اتاح یتیح باب افعال سے متکلم با نون ثقیلہ کا صیغہ ہے بمعنی لأقدِّرَنَّ لهم ولأُنزِلَنَّ بهم یعنی میں ضرور ان کے لئے مقدر کروں گا یا ضرور نازل کروں گا الخ (حسن غریب)

تنبیہ:۔ ان آخری دونوں حدیثوں کا ترجمۃ الباب "ذهاب البصر" کے ساتھ کوئی مناسبت نظر نہیں آتی اس لئے بعض شارحین کی رائے میں یہ دونوں حدیثیں کسی مستقل باب کے تحت ذکر ہوئی ہیں مگر ناسخ کے قلم سے وہ باب مع الترجمہ یا اگر بلا ترجمہ تھا تو وہ ساقط ہوا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

باب ماجاء في حفظ اللسان

(زبان کی حفاظت کا بیان)

"عن عُقبة بن عامر قال قلتُ يارسول الله ما النجاة؟ قال: امِلكْ عليك لسانَكَ

وَلیَسَعکَ بیتُک وابکِ علی خطِیئتِک". (حسن)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! نجات (کا سبب) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی زبان کو اپنے قابو میں رکھ اور تیرا گھر تیرے لئے کشادہ ہونا چاہئے اور یہ کہ تو اپنی خطاء پر رویا کر (یعنی نادم ہوا کرو)۔

تشریح: اس ارشاد میں تینوں صیغے امر کے ہیں" اَملِک وابکِ " مخاطب کے اور " ولیَسَعکَ " امر غائب کا ہے۔ محشی نے "املك" میں کسرۂ ہمزہ پر زور دیا ہے بمعنی اِحفظھا چونکہ حضرت عقبہؓ قیام وصیام کے پابند تھے اس لئے ان کو صرف گناہوں سے بچنے کی تلقین فرمائی جن میں بطور خاص زبان اور صحبتِ عام کے نقصانات سے اجتناب اور استغفار کی تاکید فرمائی، زبان کی حفاظت اور قابو کرنے کا مطلب اسے بے جا استعمال سے روکنا ہے اور گھر کی کشادگی کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زبان کا اندھا دُھند استعمال غلط باتوں کا سبب ہے اسی طرح عام لوگوں کے ساتھ زیادہ اختلاط بھی گناہوں کا ذریعہ ہے اس لئے آدمی کو بلاضرورت گھر سے باہر نہیں جانا چاہئے ہونا یہ چاہئے کہ آدمی اپنے گھر کا ماحول دینی بنا کر اسی میں رہنے کو اور زیادہ یا پورا وقت گذارنے کو ترجیح دے ہاں ضرورت دینی یا دنیوی کی صورت میں باہر جانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ نقصان غالب نہ ہو۔ نفع ونقصان مساوی ہونے کی صورت میں دفع مضرت کو جلب منفعت پر مقدم رکھنے کے اصول پر عمل ہونا چاہئے مثلاً کسی مسجد میں مرد اور عورتیں مخلوط نماز پڑھتے ہوں تو وہاں جانا جائز ہی نہیں اور اگر وہ مرتب طریقے سے پڑھتے ہوں مگر ماحول ایسا بنا دیا گیا ہے کہ وہاں کسی نہ کسی طرح فتنے کا قوی اندیشہ رہتا ہے مثلاً وضوخانہ ایک ہے جس میں سب وضو کر رہے ہیں یا بے حجابانہ اختلاط ہو رہا ہو تو بھی وہاں نہیں جانا چاہئے اگر کوئی اور مسجد وہاں نہ ہو تو آدمی گھر پر ہی نماز پڑھے جیسے عورتوں کا حکم ہے۔

حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ:۔ جب آدمی صبح کرتا ہے تو (اس کے) سارے اعضاء زبان سے عاجزانہ اپیل کر کے کہتے ہیں: تو ہمارے خاطر اللہ سے ڈرو کیونکہ ہمارا دارومدار تجھ پر ہے اگر تو سیدھی رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہو جائے گی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ (اخرجہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ)

قولہ: "تکفر اللسان" تکفیر سے بتشدید الفاء بمعنی متواضع اور عاجز ہونے کے ہے جو عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کسی کی تعظیم کو ملحوظ رکھتے ہو اس کے آگے سر جھکا کر ٹیڑھا کھڑا ہو جائے۔ یہ مکالمہ بزبان قال بھی ممکن

ہے اور بزبانِ حال بھی، چونکہ زبان ترجمان قلب ہے اس لئے اعضاء اس سے درخواست کرتے ہیں تا کہ وہ ان کی بات گویا دل سے کہہ دے جیسا کہ وہ اندر کی بات باہر لے جاتی ہے تو اسی طرح دل تک بھی ہماری درخواست پہنچادے۔ تدبر

غرض کلام میں مجاز ہے، تو جس طرح ملک کے سفیر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرے ورنہ سارا ملک مشکلات سے دوچار ہوگا اسی طرح زبان کو سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ نپی تلی بات سے ادھر ادھر منحرف نہ ہو۔

حدیث سہل بن سعد رضی اللہ عنہ:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھے اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان (زبان) اور دونوں پیروں کے مابین (شرمگاہ کی حفاظت) کی ضمانت دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ (حسن صحیح غریب)

قوله: "یتو کل و اتو کل" مصری نسخے میں "یتکفل و اتکفل" ہے لہٰذا توکل بمعنی تکفل یعنی ذمہ داری کے ہے بخاری میں "یضمن" کا لفظ آیا ہے جو زیادہ صریح ہے۔

چونکہ زبان اور شرمگاہ پر قابو پانا بہت ہی دشوار ہے اس لئے جو شخص ان دونوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوگا وہ دوسرے اعضاء پر قابو پانے میں بطریق اولیٰ کامیاب رہے گا اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص فرشتہ صفت ہوتا ہے جو جنت میں اولاً یا عالی درجات حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے اور کامیابی بھی ایسی جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذمہ داری اٹھا رہے ہیں جس کے بعد شک کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق بحکم خداوندی ہوتا ہے اس لئے کوئی اعتراض وارد نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ پر تو کوئی چیز واجب نہیں پھر ضمانت کا کیا مطلب ہے؟ اور اللہ کی طرف سے اس کی اجازت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا جس کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرماتے ہیں اگرچہ واجب نہیں ہوتا۔ تدبر

بعض حضرات نے دونوں جبڑوں کے درمیان کو پورے منہ سے کنایہ بنایا ہے تا کہ کھانے پینے کو شامل ہو جائے مگر اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اولاً تو بغیر زبان کے کھایا پیا نہیں جا سکتا ثانیاً یہاں ان معظم الامور کا تذکرہ ہے جو مشکل ہوں جبکہ حرام غذاء سے پرہیز آسان ہے اس لئے اس کا درجہ مؤخر ہے۔ تدبر ثانیاً۔

قوله: "وِقایه" بچانے کو کہتے ہیں۔

حدیث سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ:۔ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول!

مجھے ایسی چیز (بات یا عمل) بتادیجئے جسے میں مضبوط پکڑلوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو "ربی اللہ" میرا رب اللہ ہے پھراسی پر قائم رہو، فرماتے ہیں میں نے عرض کیا وہ کیا چیز ہوسکتی ہے جس سے آپ میرے بارے میں زیادہ خوف محسوس فرماتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑلی پھر فرمایا "اس" (سے)۔ (حسن صحیح)

استقامت علی الدین ایک مشکل ترین ذمہ داری ہے اس کا پوراحق اس وقت تک ادا نہیں کیا جاسکتا جب تک آدمی اپنی خواہشات کو بالائے طاق رکھ کراپنی تمام تر جدوجہد اللہ کی مرضی میں نہ لگائے اس لئے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے فرمایا "قد اسرع الیک الشیب" یعنی آپ پر بڑھاپے کے آثار جلدی ظاہر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "شیبتنی ھود واخواتھا" کیونکہ سورۂ ہود میں حکم تھا "فاستقم کما اُمِرتَ" یہ کام خواص ہی کا ہے باب کی حدیث اوراس جیسی احادیث قرآن کی آیت "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا" الآیۃ کے مطابق اور جوامع الکلم میں سے ہیں۔

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما:۔ اللہ کے ذکر کے علاوہ زیادہ باتیں مت کرو اس لئے کہ اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ بولنا دل سخت ہونے کا سبب ہے اور بلا شبہ اللہ (کی رحمت) سے زیادہ دور لوگوں میں سے وہ شخص ہے جس کا قلب سخت ہو۔

قولہ: "قسوۃ للقلب" امام رازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو چیز جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے سے قاصر رہے تو اسے قاسی کہتے ہیں چونکہ قلب کائنات میں غور اور اللہ کے احکام کے آگے منقاد ہوکر تعمیل اور پند ونصیحت قبول کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو جب وہ اس مقصد اعلیٰ سے ہٹ جاتا ہے تو وہ قاسی کہلاتا ہے زیادہ فضول گوئی اور خصوصاً غلط گوئی اس قسوۃ کا قوی سبب ہے۔

راقم نے نقش قدم کامل میں زبان کی تباہ کاریوں اور قسوۃ قلبی پر تفصیل سے لکھا ہے فمن شاء فلیراجع، پھر قلب سے مراد ایک غیبی لطیفہ ہے جو قلب یعنی دل کے اوپر عطائے ربانی کے طور پر ودیعت کیا گیا ہے اصل ادراک اس کا ہوتا ہے۔

باب کی آخری حدیث:۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابن آدم کی ہر بات اس کے خلاف جاتی ہے سوائے امر بالمعروف یا نہی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے۔ (حسن غریب)

روایت کا یہ ترجمہ کہ ''ابن آدم کی ہر بات اس کے خلاف جاتی ہے'' اس صورت پر محمول ہے کہ حدیث مبالغہ پر محمول ہو جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مذکورہ تینوں باتوں کے علاوہ تمام باتیں نقصان دِہ ہیں اس میں مباح بھی داخل ہے جس سے گویا سدذرائع کے طور پر روکنا مقصود ہے کیونکہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مباح باتوں سے غلطی کے امکان کے پیش نظر پرہیز کیا جائے، قال اللہ تعالیٰ: یا ایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اِثم ''(حجرات آیت:۱۲) دیکھئے اس آیت میں بہت سے گمان کرنے سے روکا ہے حالانکہ گناہ ان میں سے بعض ہوتا ہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''لَا لَہٗ'' ''عَلَیہ'' کی تفسیر ہے یعنی علیہ سے مراد غیر مفید ہے اور ظاہر ہے کہ مباح اگرچہ مضر نہیں لیکن مفید بھی نہیں۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ کلام میں تقدیر ہے ''کل کلام ابن آدم حسرۃ علیہ'' اور ظاہر ہے کہ مذکورہ تینوں باتوں کے علاوہ تمام باتیں خواہ وہ مباح کیوں نہ ہوں موجب افسوس ہوں گی کم از کم اتنا افسوس تو ضرور ہوگا کہ ان کے بجائے اللہ کا ذکر کیا ہوتا یا پھر خاموش رہتا۔

باب

''عن عون بن ابی جُحیفة عن ابیه قال اٰخیٰ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بین سلمان وابی الدرداء فزارسلمان اباالدرداء فرایٰ اُمَّ الدرداء مُتَبَذِّلَةً، قال ماشانکِ مُتَبَذِّلَةً؟ قالت: ان اخاکَ اباالدرداء لیس له حاجة فی الدنیا، قال فلماجاء ابو الدرداء قرّب الیه طعاماً فقال: کُل فانی صائم، قال ماانابِاٰکِلٍ حتیٰ تأکُلَ قال فاکل فلماکان اللیل ذهب ابو الدرداء لیقوم فقال له سلمان ''نم'' فنام ثم ذهب لیقوم قال له ''نَمْ'' فنام فلماکان عندالصبح فقال له سلمان قُمِ الاٰنَ فقامافصَلَّیافقال: ان لِنفسک علیک حقاً ولربک علیک حقاً ولِضیفک علیک حقاً وان لِاَهْلِکَ علیک حقاً فَاعطِ کل ذی حق حقه فاتیاالنبی صلی اللّٰه علیه وسلم فذکراذالک له فقال صدق سلمانُ''. (صحیح)

حضرت ابوجُحیفہ (وھب بن عبداللہ) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان (فارسی) اور ابودرداء کے مابین بھائی چارگی (مواخاۃ) کرائی پس سلمان ابودرداء کی زیارت (ملاقات) کرنے کے لئے آئے تو ام درداء کو خستگی میں دیکھا، پوچھا تیری یہ حالت کیسی؟ کہ پُرانے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے ہیں، وہ کہنے لگی آپ کے بھائی ابودرداء کو دنیا کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ پس

جب ابو درداء آئے تو انہوں نے حضرت سلمان کے سامنے کھانا رکھا اور فرمایا آپ کھائیے کہ میں روزہ دار ہوں سلمان نے کہا میں کھانے والا نہیں جب تک آپ نہیں کھائیں گے فرمایا تو ابو درداء نے کھایا پس جب رات ہوئی تو ابو درداء اُٹھ کر جانے لگے تا کہ نماز پڑھے تو سلمان نے ان سے کہا سو جائیں پس وہ سو گئے، پھر وہ دوبارہ جانے لگے تا کہ نماز پڑھے انہوں نے فرمایا سو جائیں وہ پھر سو گئے پس جب صبح کا وقت قریب ہوا تو سلمان نے ان سے کہا اب اُٹھ جائیں، چنانچہ دونوں نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، پھر حضرت سلمان نے فرمایا بے شک آپ پر آپ کے نفس کا حق ہے، آپ کے رب کا حق ہے، اور آپ کے مہمان کا بھی حق ہے اور بے شک آپ پر آپ کے گھر والوں کا بھی حق ہے، لہٰذا ہر حق والے کے حق کو ادا کیجئے پھر دونوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعے کا دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان نے سچ کہا ہے۔

تشریح:۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں تحریر فرمایا ہے کہ ہجرت کے بعد جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی اور حضرت عائشہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہما کے حُجرتین کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو مہاجرین وانصار صحابہ کرامؓ کے مابین مواخاۃ (بھائی چارہ) فرمائی جن کی تعداد نوے/90 تھی آدھے مہاجرین اور آدھے انصار تھے پھر وہ واقعۂ بدر تک ایک دوسرے کے وارث بھی بنتے رہے مگر جب یہ آیت "**واولوا الارحام بعضهم اولىٰ ببعض**" (احزاب) نازل ہوئی تو توارث خونی رشتہ کی طرف لوٹا دیا گیا۔ (مختصر زاد المعاد ص:۱۵ فصل فی بناء المسجد) چنانچہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اسی بناء پر اپنے بھائی کے گھر ملاقات کرنے اور خبر گیری کی غرض سے تشریف لے گئے چنانچہ دیکھا کہ ان کی بھابھی گھر کے عام کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

قوله: "**متبذلة**" بصیغۂ اسم فاعل تشدید ذال کے ساتھ بِذلۃ کام کاج کے کپڑوں کو کہتے ہیں چونکہ شادی شدہ عورت کو گھر کے کام سے فارغ ہونے پر اور خصوصاً جب شوہر کے آنے کا وقت ہو جائے زینت اختیار کرنی چاہئے بایں طور کہ صاف ہو کر اور اگر ہو سکے تو نئے کپڑے پہن کر بناؤ سنگار کرے خصوصاً عرب عورتوں میں شوہر کا بہت زیادہ لحاظ رکھنے کا دستور تھا جبکہ ام الدرداء رضی اللہ عنہا پر آرائش نظر نہیں آ رہی تھی اس لئے حضرت سلمانؓ نے تعجب کر کے اس کی وجہ پوچھی، ام الدرداءؓ نے جو جواب دیا ہے کہ ابو الدرداء کو دنیا یعنی دنیوی عورتوں وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں تو یہ ایک قسم کا شکوہ بھی ہو سکتا ہے اور بیانِ عذر بھی، کہ جب وہ میری طرف کوئی خاص رغبت نہیں رکھتے تو پھر بناؤ سنگار کا کیا فائدہ؟؟؟

بخاری کی روایت میں ہے "فجاء ابو الدرداء فَصَنَعَ له طعاماً فقال کُل فانی صائم"۔
(ج:۱ص:۲۶۴ قدیمی کتب خانہ)

جواب میں حضرت سلمانؓ نے ان کو قسم دے کر فرمایا "اَقسمتُ علیک لَتُفطِرَن" جیسا کہ بزار کی روایت میں ہے یعنی میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ روزہ کھولیں مقصد یہ تھا کہ ایک تو ان کو اعتدال فی العادت والعبادت پر لانا تھا اور دوم حضرت ام الدرداءؓ کی شکایت کا ازالہ تھا جیسا کہ حدیث کے اخیر میں تصریح ہے، نیز اصل مقصد تکثیر عبادت نہیں بلکہ اللہ کی رضا ہے۔ تدبر

باب

"عن رجل من اهل المدينة قال کتبَ معاوية الی عائشة ان اُكتُبی اِلَیَّ كتابا توصينی فيه ولاتكثری عَلَیَّ، قال فكتبَت عائشةُ الی معاوية: سلامٌ علیک امابعد! فانی سمعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم يقول: من اِلتَمَسَ رِضیٰ اللّٰه بِسَخَطِ الناس كفاه اللّٰهُ مؤنةَ الناس ومن التمس رِضیٰ الناس بِسَخَطِ اللّٰه وَکَلَه اللّٰه الی الناس والسلام علیک".

مدینہ والوں میں سے ایک شخص روایت کرتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کو خط لکھا کہ آپ مجھے ایک خط لکھئے جس میں مجھے وصیت (ونصیحت) کیجئے گا اور زیادہ نہ لکھئے گا (تا کہ یاد کرنا آسان ہو) راوی نے کہا پس حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا تم پر سلامتی ہو بعد اس کے کچھ شک نہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے لوگوں کے ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر اللہ کی خوشنودی تلاش کرنا چاہی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے لوگوں کے تعاون کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے (یعنی غیب سے اس کی مدد کرتا ہے) اور جس نے اللہ کی ناراضگی مول کر لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے تم پر سلامتی ہو۔

تشریح:۔ یعنی جس شخص کی نظر اللہ پر ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اسباب اور مخلوق کے ضرر سے محفوظ بنا دیتے ہیں اگر چہ دنیا دارالاسباب ہے اور کچھ نہ کچھ اسباب پر تکیہ کرنا پڑتا ہے مگر اسباب پر اعتماد کرنے والے کو جتنے قوی اسباب سے فائدہ ہوتا ہے اس مرد مومن کو اس سے کہیں گنا کم سے فائدہ ملتا ہے وہ جب تک سب سے بڑے ہسپتال جا کر بڑے ڈاکٹر سے علاج نہ کرائے اسے فائدہ نہیں ہوتا جبکہ اس کو عام اور معمولی حیلہ

اختیار کرنے سے فائدہ ہوتا ہے وعلی القیاس، اسی طرح اسباب اور مخلوق پر نظر رکھنے والے کو جتنا نقصان کمزور ترین سبب سے ہوتا ہے اس مردمومن کو اتنا نقصان قوی سبب سے بھی نہیں ہوتا آپ غور فرمائیں اسباب پر یقین رکھنے والے دعائیں بھی مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں کیونکہ ان کی زبان پر یارب تو ہوتا ہے مگر ان کا مشن لوگوں کو راضی رکھنا یعنی اسباب تلاش کرنا ہوتا ہے جبکہ اللہ والوں کے مریض کی شفایابی اور بہت سی مشکلات محض دعاؤں سے حل ہو جاتی ہیں۔غرض حکمران کے لئے بھی اپنی نظر اللہ ہی کی رضا پر رکھنی چاہیے کہ حکومتیں عارضی ہوتی ہیں۔صاحب تحفہ نے امام منذریؒ کی ''الترغیب والترھیب'' سے نقل کیا ہے کہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس حدیث کا صرف مرفوع حصہ نقل کیا ہے جبکہ اگلی سند میں یہ روایت غیر مرفوع آئی ہے۔

ابواب صفة القيمة

(احوالِ قیامت کا بیان)

قیامت کی وجہ تسمیہ ایک یہ بیان کی گئی ہے کہ اس روز لوگ میدانِ محشر میں کھڑے ہی کھڑے رہیں گے اس لمبے قیام کی وجہ سے اس کو قیامت کہتے ہیں گو کہ مقربین کو جلد حسب درجات مختلف نشستوں پر بٹھا دیا جائے گا۔ جب احکام ودیگر متعلقہ مباحث سے فارغ ہوئے تو قیامت اور جنت ودوزخ کے بیان کا آغاز فرمایا۔

بابِ ماجاء فی شأنِ الحساب والقصاص

(بدلہ اور حساب کی کیفیت کے بیان میں)

"مامنکم من رجل اِلّاسَیُکلِّمُہٗ رَبُّہ یوم القیٰمة ولیس بینه وبینه تُرجُمان، ثم ینظر ایمَنَ منه فلایریٰ شیئاً اِلّاشیئاً قَدّمه ثم ینظر اَشأَمَ منه فلایریٰ شیئاً اِلّاشیئاً قدمه ثم ینظر تِلقاءَ وجهِه فتستقبله النار، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :من استطاع منکم ان یقِیَ وجهَهُ النارَ ولوبشِقِ تمرة فلیفعل ".(حسن صحیح)

نہیں تم میں سے کوئی آدمی مگر اس کا رب قیامت کے دن ضرور اس سے بات فرمائیں گے جب کہ اُس کے اور اس کے درمیان کوئی ترجمانی کرنے والا نہ ہوگا، پھر وہ شخص اپنی داہنی جانب دیکھے گا تو اسے کوئی چیز نظر نہ آئے گی سوائے اس چیز کے جو اس نے آگے (پہلے) بھیجی ہوگی، پھر وہ اپنی بائیں طرف دیکھے گا تو کچھ نظر نہیں آئے گا علاوہ اس کے جو اس نے آگے بھیجا ہوگا پھر وہ اپنے سامنے کی طرف دیکھے گا تو آگ استقبال کرتی ہوئی (نظر) آئے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جو ایسا کر سکے کہ اپنا چہرہ آگ سے بچا سکے اگر چہ کھجور کے ٹکڑے کے ذریعہ ہی ہو تو وہ ایسا (ضرور) کرلے۔

تشریح:۔ اس حکم سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔

قولہ: "ترجمان" وہ شخص جو ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کرے اس میں "ت" پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں جبکہ جیم مضموم ہے، یعنی قیامت کے دن ہر شخص اپنے رب کے سامنے روبرو پیش کیا جائے

گا اور خلاصی کی کوئی صورت بھی نہیں ملے گی سوائے ان نیکیوں کے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کا سبب ہیں چنانچہ اس گفتگو کے دوران آدمی دائیں بائیں دیکھے گا کہ کوئی راہِ نجات ہے؟ یا کوئی دادرسی کرنے والا ہے؟ تو کوئی صورت نظر نہیں آئے گی ہاں اگر کوئی نیک عمل کیا ہوگا تو وہ آدمی کے دائیں بائیں کھڑا ہوگا ''ایمن واشأم'' دونوں منصوب بنا برظرفیت ہیں بمعنی یمین وشمال کے ہیں اور ''منه'' کی ضمیر کو اگرچہ موقف کی طرف راجع کرنا صحیح ہے مگر ''تلقاء وجهه'' سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد اس شخص کے یمین وشمال ہے لہٰذا ضمائر کا مرجع وہی شخص لینا اصح بلکہ متعین ہے۔

سامنے آگ ہونے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ محشر کے دائیں بائیں آگ ہی آگ ہوگی اور آگے پل صراط ہوگا جس کے نیچے بھی آگ ہوگی اور نجات کی واحد صورت یہ ہوگی کہ وہ پل صراط کو عبور کرے۔ اور عبور کی صورت یہ ہے کہ وہ نیک عمل کی طاقت اپنے ہمراہ لے کر جائے خصوصاً صدقہ آگ بجھانے میں پانی کی طرح ہے اگر زیادہ نہ ہوسکے تو کھجور کا ایک ٹکڑا یعنی معمولی چیز کا صدقہ کرے تا کہ آگ کی لپٹ سے بچ سکے، چونکہ آدمی عموماً آفت کے وقت اپنے منہ اور چہرے پر غیر اختیاری طور پر ہاتھ رکھ کر اسے بچاتا ہے اس لئے حدیث میں ''وجهه'' کا لفظ آیا ورنہ مراد پورا جسم ہے۔

قوله: ''فلما فرغ وكيع من هذا الحديث الخ'' ابوالسائب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام وکیعؒ نے ہم سے یہ روایت بیان فرمائی اور جب تحدیث سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ یہاں جو خراسانی طلبہ ہیں وہ اس روایت کو اپنے علاقہ میں بیان کرنے میں ثواب کی نیت کریں یعنی ثواب کمائیں کیونکہ خراسان پر جہم بن صفوان مبتدع کا اثر ورسوخ زیادہ ہے اور جہمیہ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت کلام کے منکر ہیں جبکہ اس حدیث میں کلام باری تعالیٰ کی تصریح کی گئی ہے تو اس سے ان کی بدعتِ نظریہ کی تردید کر کے ثواب حاصل کریں یعنی دگنا اجر وثواب، ایک بیانِ حدیث کا اور دوسرا فرقہ باطلہ کے زعم کی تردید کا۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی کے قدم اپنے رب کے پاس سے ہلنے نہ پائیں گے تا آنکہ اس سے پانچ خصلتوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے۔ (۱) اس کی عمر کے متعلق کہ کس مقصد میں گذاری ہے؟ (۲) اور اس کی جوانی کے بابت کہ کس مشغلہ میں لگا کر ختم کی ہے؟ (۳) اور اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے حاصل کیا ہے (۴) اور کس کس مد میں خرچ کیا ہے؟ (یعنی حلال ذریعہ سے کمایا ہے یا حرام سے اور جائز طریقے سے

خرچ کیا ہے یا ناجائز؟)(۵) اور یہ کہ اپنے علم پر کتنا عمل کیا ہے؟۔(غریب واشار المصنف الی ضعفہ)

اس حدیث میں جوانی کا ذکر عمر کے بعد بطور خاص، قوت وطاقت کی فراوانی کی وجہ سے ہے کہ زندگی کے بیچ میں یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں عبدیت کا ثبوت دینا زیادہ اجر کا سبب ہے اور آخری سوال میں کلام کا اسلوب تبدیل کرنے میں علم کی اہمیت اور اس پر عمل کرنے کے اہتمام کو اُجاگر کرنا مقصود ہے۔

باب کی اگلی حدیث جو حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں یہی مضمون ہے البتہ اس میں شباب یعنی جوانی کے بجائے جسم کا ذکر ہے لیکن دونوں کا مطلب ایک ہی بنتا ہے کیونکہ جوانی میں صحت اچھی رہتی ہے عبادت کی طاقت زیادہ ہوتی ہے اگر تھوڑی بہت بیماری لاحق بھی ہو جائے تو وہ عبادت پر اور معمولات پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔(حسن صحیح) اس حدیث سے سابقہ حدیث کی تائید ہوتی ہے چونکہ اس کی سند صحیح ہے لہٰذا سابقہ حدیث کا مضمون بھی صحیح ہوا۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ ہم میں سے (یعنی دنیا میں) تو مفلس وہ کہلاتا ہے جس کے پاس درہم (پیسے) اور سامان (یعنی مال) نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوۃ لے کر آئے گا چنانچہ وہ پیش ہوگا دراں حالیکہ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی اور کسی پر زنا وغیرہ کا الزام لگایا ہوگا اور کسی کا مال کھایا ہوگا (یعنی ناجائز طریقے سے) اور کسی کا خون (ناحق) بہایا ہوگا اور کسی کو (بلا وجہ) مارا ہوگا پس وہ (شخص) بیٹھ جائے گا تو وہ آ کر بدلے میں اس کی نیکیوں میں سے لے لے گا اور وہ بھی اس کی نیکیوں میں سے لے لے گا پس اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں قبل اس کے کہ اس کے ذمے زیادتیوں کا بدلہ پورا ہو جائے تو ان (مظلومین) کے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈالے جائیں گے اور پھر اسے آگ میں پھینکا جائے گا۔(حسن صحیح)

یہ حدیث مسلم شریف میں بھی ہے امام نوویؒ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ جس کے پاس مال ومتاع نہ ہو وہ حقیقی مفلس نہیں کیونکہ دنیوی غربت وافلاس تو عارضی ہے وہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے یا مالداری سے یا پھر موت سے جبکہ حقیقی مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اپنی تمام نیکیوں سے محروم کر دیا جائے گا اور خالی ہاتھ بیٹھ جائے گا پھر امام مازریؒ سے نقل کیا ہے کہ بعض مبتدعہ نے اس حدیث کو فرمان باری تعالیٰ "**ولا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ**" (فاطر آیت ۱۸) سے معارض قرار دیا ہے مگر ان کا موقف غلط ہے اور ان کی جہالت واضح ہے کیونکہ اس

مفلس کو اپنے ہی مظالم کی پاداش میں یہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا نہ کہ کسی اور کی۔ (نووی بر مسلم ص: ۳۲۰ ج:۲ باب تحریم الظلم، کتاب البر والصلہ والادب)

حضرت گنگوہیؒ کوکب میں فرماتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں وہ مفلس زیادہ بُری حالت میں ہوتا ہے جو پہلے امیر ہو اور پھر مفلس بن جائے اسی طرح یہ شخص جب اپنی نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا تو اسے سخت تکلیف ہوگی۔ (اس اذیت اور رنج کی مثال نہیں ملتی)

حدیث آخر:۔ "رَحِمَ اللّٰہُ عبداً الخ" اللہ اس بندے پر رحم فرمائیں جس پر کسی (مظلوم) کا (بدلہ) ظلم باقی ہو خواہ آبرو سے متعلق ہو یا مال سے، پس وہ (ظالم شخص) اس مظلوم کے پاس جا کر اس سے قبل از مؤاخذہ معاف کرائے (یعنی موت سے پہلے پہلے) جہاں (قیامت میں) نہ دینار ہوگا اور نہ ہی درہم، (جس کے ذریعہ حق ادا کرے) پس (وہاں) اگر اس کی نیکیاں ہوں گی تو ان میں سے (اُن کا حق) وصول کیا جائے گا لیکن اگر نیکیاں نہیں ہوں گی تو وہ لوگ اس پر اپنے گناہ لاد دیں گے (اور پھر وہ بوجہ گناہ دوزخی بن جائے گا)۔ (حسن صحیح)

حدیث آخر:۔ "لَتُؤَدُّنَّ الحقوقُ الخ" حقوق ضرور ادا کئے جائیں گے حتیٰ کہ سینگوں والی بکری سے بغیر سینگ والی بکری کا بدلہ لیا جائے گا۔

قولہ: "لَتُؤَدُّنَّ الحقوقُ" حقوق مرفوع ہے نائب فاعل ہے۔ قولہ: "تقاد" تحفۃ الاحوذی اور عارضۃ الاحوذی کے متن پر الفاظ اس طرح ہیں "حتیٰ یُقادَ لِلشاۃ الجَلحَاء من الشاۃ القرناء" (مسلم باب تحریم الظلم ص: ۳۲۰ ج:۲) پر بھی اسی طرح ہے یعنی بصیغۂ مجہول، جلحاء بالمد بغیر سینگ والی بکری کو کہتے ہیں جبکہ قرناء قرن سے ہے بمعنی سینگوں والی۔ ملا علی قاریؒ نے "لتؤدن" کو جمع معلوم کا صیغہ قرار دیا ہے علی ہذا حقوق کو منصوب پڑھنا ہوگا مگر تورپشتیؒ نے معروف کو غیر صحیح کہا ہے۔

اس حدیث کے مطلب میں علماء کا اختلاف ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں ابوالحسن اشعریؒ سے نقل کیا ہے کہ قصاص اور مجازات کا دار و مدار افعال تکلیفیہ پر ہے چونکہ جانور مکلف نہیں اس لئے یہ حدیث تمثیل پر محمول ہوگی یعنی ہر ظالم شخص سے مظلوم کے لئے بدلہ لیا جائے گا پس قرناء سے مراد ظالم اور جلحاء سے مراد مظلوم ہے، جبکہ امام نوویؒ اور حافظ ابوالخطاب مغربیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اور ظاہر حدیث سے ان کی تائید ہوتی ہے امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جانوروں کے قیامت

کے دن زندہ ہونے پر صریح ہے اور قرآن کی آیت: "واذا الوحوش حشرت" (سورۃالتکویر آیت:۵) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور چونکہ بلاوجہ نصوص کو ظاہر سے نہیں پھیرنا چاہئے اس لئے ظاہری مطلب ہی صحیح ہے رہا جانوروں کا مکلف نہ ہونا تو یہ بدلہ بطور حکم تکلیفی کی خلاف ورزی پر نہیں بلکہ بطور مقابلہ یعنی برابری کے لئے ہے۔ (ص:۳۲۰ ج:۲)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ "واذا الوحوش حشرت" نفخہ اولیٰ وثانیہ کے درمیان کے چھ/6 احوال میں سے ایک واقعہ ہے جو قیامت کے ابتدائی مراحل میں سے ہے اور ان جانوروں کا جمع ہونا خوف کے مارے ہوگا نہ کہ دوبارہ زندہ ہونے کی وجہ سے۔ تدبر واللہ اعلم

بابٌ

"اذا كان يوم القيٰمة اُدنِيَتِ الشمسُ من العبادقِيدَ ميل اواثنتين قال سليم بن عامر: لاادرى اَىَّ الميلين عَنىٰ اَمسافةَ الارض ام الميل الذى يُكحل به العين؟ قال فتصهرُهم الشمس فيكونون فى العَرَقِ بقدراعمالهم فمنهم من يأخذه الى عَقِبيَه ومنهم من يأخذه الى رُكبَتيه ومنهم من يأخذه الى حقويه ومنهم من يُلجِمُه اِلجَاماً فرأيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يشيربيده الى فيه اى يُلجِمُهُ اِلجاماً". (حسن صحيح)

جب قیامت کا دن ہوگا تو سورج بقدر ایک یا دو میل کے بندوں کے قریب کردیا جائے گا سلیم بن عامر راوی کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ دونوں میلین میں سے کون سی قسم مراد لی ہے زمین کی مسافت یا وہ میل (سلائی) جس سے آنکھوں میں سرمہ لگایا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج ان کو پگھلادے گا، پس وہ لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے پس ان میں سے بعض ایسے ہونگے جن کو پسینے نے ایڑیوں تک گھیر لیا ہوگا، اور بعض ایسے ہونگے جن کو دونوں گھٹنوں تک پھنسایا ہوگا، اور ان میں سے کچھ ایسے ہونگے جن کو پسینے نے ازار بند (اِزار باندھنے) کی جگہ تک ڈبویا ہوگا اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہوگا جس کو پسینے نے لگام دی ہوگی (یعنی لگام کی طرح منہ کے نچلے حصے تک پھنسا ہوگا اس معنی کو ظاہر کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ کی طرف اشارہ کیا چنانچہ راوی کہتا ہے کہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جو اپنے ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کررہے تھے یعنی لگام پہنانے کی طرح۔

تشریح:۔ قولہ: "قید" بکسر القاف مقدار کو کہتے ہیں مسلم کی روایت میں ہے "کمقدار میل" ظاہر یہی ہے کہ میل سے مراد مسافت ہے۔ "صھر" بمعنی پگھلنے کے جبکہ "حقوہ" شلوار یا ازار باندھنے کی جگہ جو عموماً ناف بنتا ہے، لگام سے مراد یہ ہے کہ پسینہ ان کے منہ تک آجائے گا تو جس طرح منہ میں لگام بولنے سے مانع بنتی ہے اسی طرح یہ لوگ بھی بولنے سے قاصر ہوں گے، اگلی روایت میں آدھے کانوں تک کے الفاظ ہیں کیونکہ جب وہ لوگ منہ میں پسینہ آنے کی وجہ سے اوپر دیکھیں گے تو پسینے کی سطح نصف کانوں تک پہنچ جائے گی، البتہ یہ حالت تمام لوگوں کی نہیں ہوگی بلکہ عصاۃ کی ہوگی انبیاء علیہم السلام اور دیگر اولیاء واتقیاء بالانشین ہوں گے، اللہ ان کو اس مصیبت سے محفوظ رکھے گا۔

دو اعتراض:۔ ایک اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ ایک ہی میدان میں پسینے کی سطح میں اس طرح اونچ نیچ کیسے ممکن ہے؟ حالانکہ پسینہ مائع سیال مادہ ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آخرت کے واقعات میں بطور خرق عادت کے کوئی واقعہ رونما ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ وہ عالم دارالاسباب نہیں ہے ممکن ہے کہ وہ پسینہ موم کی ڈھیری کی طرح ان کے گرد جمع ہوتا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ میدان محشر کی سطح ساری یکساں نہ ہو بلکہ اس وقت یا بعض مقامات پر اس میں اتار چڑھاؤ اور نشیب وفراز پایا جاتا ہو جیسے ساحل سمندر پر جو شخص زیادہ آگے ہوتا ہے وہ اسی تناسب سے پانی کے اندر ڈوب جاتا ہے جبکہ خشکی کے قریب تر شخص کم پانی میں ہوتا ہے۔ غرض ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی نشیب میں ہو اور کوئی نسبتاً بلندی پر اگرچہ شروع میں سطح ہموار ہوگی۔

دوسرا اعتراض:۔ یہ ہے کہ وہاں سورج کہاں ہوگا؟ اور یہ کہ اتنا قریب آجانا کشش ثقل کے بموجب تصادم یا کم ازکم ملاپ کو مستلزم ہے۔

اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ سورۂ تکویر کی پہلی آیت سے سورج کا بے نور ہونا ثابت ہے "اذا الشمس کُوِّرت واذا النجوم انکدرت" جس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ سورج ابھی تک اپنی تباہی کے عمل سے گذر رہا ہوگا اس کا موجودہ درجۂ حرارت اگرچہ بہت حد تک کم ہو چکا ہوگا تاہم وہ اپنی ذات میں پھر بھی بہت گرم ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ سورج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہو اور کچھ حصہ زمین کے اس قدر قریب آگیا ہو یا پھر اس کا حجم چھوٹا ہو جائے گا جیسا کہ "کوّرت" میں اس کی طرف اشارہ ہے، اور جہاں تک کشش ثقل کا تعلق ہے تو یہ اس دار فانی کا حکم ہے وہاں ہر چیز کی طاقت ختم ہو جائے گی الا ماشاء اللہ۔

یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ باقی روایات ونصوص کو سامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اجرام فلکیہ اور

خصوصاً سورج زمین سے جُڑ جائے گا جس سے سمندر کا پانی آگ میں تبدیل ہو جائے گا، چونکہ دو کروی جسموں کے باہم ملنے سے ملنے والی جگہ میں فاصلہ کم وبیش ہوتا ہے یعنی زاویہ حادہ بننے کی وجہ سے ملنے والی جگہ میں فاصلہ انتہائی کم اور ذرا آگے ایک میل پھر مزید آگے بہت زیادہ ہوتا ہے، یہ لوگ اسی میل والے فاصلے کی جگہ پر ہوں گے پھر جب پل صراط کے ذریعہ اہل جنت نکل اور چڑھ جائیں گے تو یہ ساری فضا دوزخ میں شامل کر دی جائے گی سوائے مقاماتِ مقدسہ کے جیسے مساجد، حجرا سود اور کعبہ وغیرہ۔

باب ماجاء فی شأن الحشر

(لوگوں کے جمع ہونے کے احوال کا بیان)

"یحشر الناس یوم القیٰمة حُفاةً عُراةً غُرلاً کماخُلِقوا ثم قَرَاً "کمابَدَأنَا اول خلق نعیده وعداً علینا انا کنا فاعلین" واول من یکسی من الخلائق ابراهیم، ویؤخذمن اصحابی برجال ذات الیمین وذات الشمال فیقول (فاقول) یارب! اصحابی افیقال: انک لا تدری ما احدثوا بعدک، انهم لم یزالوا مرتدین علیٰ اعقابهم مُنذ فارَقتَهم فاقول کماقال العبدالصالح: ان تعذبهم فانهم عبادک وان تغفرلهم فانک انت العزیزالحکیم". (اخرجه الشیخان)

لوگوں کو قیامت کے دن ننگے پیر، ننگے جسم، بغیر ختنہ کے جمع کر دیا جائے گا ایسے ہی جیسے وہ پیدا کئے گئے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی "جس طرح ہم نے پہلے پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کر دیں گے (یہ) وعدہ لازم ہے ہم (ایسا) ضرور کرنے والے ہیں (انبیاء آیت ۱۰۴) اور سب سے پہلے مخلوق میں سے جسے لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم ہوں گے اور میرے صحابہ (یا امت) میں سے کچھ لوگوں کو دائیں (جنت) اور بائیں (دوزخ) طرف لے جایا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے (بخاری میں ہے میں کہوں گا) اے میرے رب! یہ میرے صحابہ (یا امتی) ہیں پس کہا جائے گا آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ کے (وصال کے) بعد کیا کیا نئی چیزیں نکالیں۔ یہ لوگ اس وقت سے جب آپ نے ان کو چھوڑا تھا الٹے پاؤں واپس جاتے رہے (یعنی اسلام کو چھوڑ کر یا سنت کو چھوڑ کر) پس میں ایسا ہی کہوں گا جیسے اس نیک بندے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا تھا۔ ان تعذبھم الآیہ۔

تشریح:۔ قوله: "حُفاةً عُراةً غُرلاً" تینوں بضم الاول ہیں حفاة حافی کی جمع ہے عُراة عاری کی اور

غرلاً اغرل کی جمع ہے، جس کا ختنہ نہ کیا گیا ہو یعنی حشفہ پر وہ زائد کھال موجود ہوگی جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی اعضاء میں سے کوئی حصہ گمشدہ نہ ہوگا۔ مسلم ص:۳۸۴ ج:۲ میں یہ حدیث ہے اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ مرد اور عورتیں جب سب ننگے ہوں گے تو پھر تو وہ ایک دوسرے کو نظر آئیں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہؓ! معاملہ اس سے زیادہ سخت ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔

اس حدیث سے مذکورہ آیت کی تفسیر بھی معلوم ہوئی کہ اس میں تشبیہ سے کیا مراد ہے۔

قولہ: "یارب اصحابی" یعنی بائیں طرف والوں کے لئے میں کہوں گا کہ یہ تو میرے صحابہ ہیں دراصل یہ لوگ پیاس بجھانے کے لئے حوض کوثر پر آرہے ہوں گے جن کو فرشتے روک لیں گے بلکہ بائیں موڑ دیں گے ان کو پہچان کر آپ علیہ السلام یہ ارشاد فرمائیں گے ... یہ کون لوگ ہوں گے؟ تو حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو آپ علیہ السلام کے وصال کے بعد مرتد ہو گئے تھے چونکہ آپ کی حیات میں وہ مسلمان تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے اصحابی الخ۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ یہ وہ مبتدعین ہوں گے جو اپنی بدعت کی وجہ سے اسلام سے خارج نہ ہوئے ہوں گے یہ لوگ اگرچہ ابتداءً جہنم میں جائیں گے اور سنت کے پیروکار نہ ہونے کی وجہ سے حوض کوثر سے محروم کر دیئے جائیں گے مگر وہ مخلد فی النار نہیں ہوں گے علیٰ ھذا پھر اصحابی سے مراد آثار وضوء کی وجہ سے عام غر محجلین ہیں امام نوویؒ نے حافظ ابن عبد البرؒ سے نقل کیا ہے کہ ہر مبتدع حوض سے دھتکارا جائے گا۔

"کل من احدث فی الدین فھو من المطرودین عن الحوض کالخوارج والروافض وسائر اصحاب الاھواء قال وکذالک الظلمۃ المسرفون فی الجور وطمس الحق والمعلنون بالکبائر قال وکل ھؤلاء یخاف علیھم ان یکونوا ممن عنوا بھذا الخبر" واللہ اعلم. (شرح مسلم ص:۱۲۶ ج:۱)

اس حدیث میں "اول من یکسی من الخلائق ابراھیم" سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں اس سے زیادہ سے زیادہ جزوی فضیلت حاصل ہوتی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے دلائل واضح ومشہور ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے کیوں (سفید) کپڑے پہنائے جائیں گے؟ تو اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ جب ان کو آگ میں پھینکا جارہا تھا تو ان کے کپڑے اتار لئے گئے تھے اس لئے ان کو بطور خاص انعام سے نوازا جائے گا۔ (۲) دوسرا یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے شلوار کی سنت مشروع فرمائی ہے (۳) وہ ابوالانبیاء اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ہونے کی بناء پر مقدم کئے جائیں گے یعنی ابوت کی فضیلت کی وجہ سے۔

قوله: "رِجالاً" بکسر الراء راجل کی جمع ہے بمعنی پیدل پا چلنے والا۔

قوله: "رکباناً" بضم الراء راکب کی جمع بمعنی سوار کے ہے۔

قوله: "وتجرّون" بصیغۂ مجہول تمہیں منہ کے بل گھسیٹا جائے گا یا چلایا جائے گا یعنی کاملین سوار ہوں گے اور ناقصین پیدل اور بعض الٹے ہوں گے۔ رِجال کی تقدیم رکبان پر کثرت تعداد کی وجہ سے ہے۔

باب ماجاء فی العرض

(پیش ہونے کا بیان)

"یعرض الناس یوم القیٰمة ثلٰث عَرَضات فَاَمّاعرضتان فجِدالٌ ومعا ذیر واما العرضة الثالثة فعند ذالک تطیر الصُحُفُ فی الایدی فَاٰخِذٌبیمینه واٰخذٌبشماله".

قیامت کے دن تین پیشیاں ہوں گی پس دو جو ہوں گی ان میں حجت بازی اور معذرتیں ہوں گی اور جب تیسری پیشی ہوگی تو اس وقت اعمال نامے اُڑ کر ہاتھوں میں آجائیں گے، پس کوئی اپنے داہنے ہاتھ سے تھامے ہوئے ہوگا اور کوئی بائیں سے پکڑے ہوئے ہوگا۔

تشریح:۔ قوله: "عرضات" بفتح العین والراء اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور پیش ہونا مراد ہے ان تینوں میں سے پہلی پیشی کے وقت جدال یعنی انکار وحجت بازی کی سی صورت ہوگی کہ مجرم لوگ کہیں گے ہم کو دعوت نہیں پہنچی عارضة الاحوذی میں ہے کہ جدل کہتے ہیں حجت کا مقابلہ حجت سے کرنے کو جبکہ مجادلہ مناظرے کو کہتے ہیں غرض وہ لوگ انکار کریں گے مگر اللہ کی حجت غالب رہے گی۔ اس طرح دوسری پیشی میں مجرم لوگ معاذیر یعنی اعذار پیش کریں گے کہ جب انکار سے کام نہیں بنے گا تو وہ اعذار پر آجائیں گے کہ ہم مجبور تھے بے بس تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ان کی ایک بھی نہیں سنی جائے گی۔ اور تیسری پیشی میں ان کے اعمال نامے خواہی وناخواہی ان کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں گے یہاں طیران کنایہ ہے سرعت وقوع سے، حدیث کا یہ مطلب حاشیہ پر لمعات کے

حوالہ سے بیان کیا گیا ہے تحفۃ الاحوذی میں فتح الباری سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلی پیشی کفار کی ہوگی چونکہ وہ اللہ کو کما حقہ نہیں جانتے اس لئے وہ انکار کی وجہ سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتے ہوں گے۔ جبکہ دوسری پیشی اور معذرتیں انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہوں گی کہ ہم نے ان تک اللہ کے پیغامات پہنچائے ہیں۔ اور تیسری پیشی سب مؤمنین سے متعلق ہوگی اس کو عرض اکبر کہتے ہیں۔ یہ مطلب بھی صحیح بن سکتا ہے۔ غرض جو کامیاب ہوگا وہ سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال پکڑے گا اور جو نامراد ہوگا وہ الٹے ہاتھ میں تھامے گا۔

یہ روایت منقطع ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح فرمائی ہے تاہم یہ روایت ابن ماجہ ص ۳۱۶ پر ''باب ذکر البعث'' میں ''عن الحسن عن ابی موسیٰ الاشعری'' سے بھی مروی ہے، جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اخیر میں تصریح فرمائی ہے۔

باب منه

''عن عائشة قالت سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من نُوقِش الحساب هَلَکَ، قلتُ يارسول الله! ان الله يقول: فَأَمَّا من أُوتي كتابه بيمينه فسوف يحاسب حساباً يسيراً؟ قال ذاک العرض''. (حسن صحيح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جس سے حساب میں گرما گرم بحث ہوگئی تو وہ ہلاک ہوگیا میں نے کہا اے اللہ کے رسول! اللہ نے تو فرمایا ہے ''سو جسے ملا اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب''؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ (صرف) پیشی ہے۔

تشریح:۔ قوله: ''نوقش الحساب'' حساب میں مناقشہ یہ ہے کہ اس سے ہر ایک بات کے بارے میں پوچھا جائے اور گرفت گیری سے لبریز گرما گرم بحث ہو یقیناً ایسا شخص ہلاک ہوگا یعنی عذاب کا مستحق ہوگا چونکہ یہاں بظاہر اس حدیث کا مندرجہ بالا آیت سے تعارض کا شبہ ہوسکتا تھا کہ یہاں مطلقاً اس شخص کو قابلِ ہلاکت قرار دیا ہے جس کے ساتھ حساب ہو جبکہ آیت میں حساب کو یسیر یعنی آسان حساب کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض حساب آسان بھی ہوتا ہے، اور آپ علیہ السلام کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ حساب کی ایک صورت سختی سے پوچھ گچھ کی ہے جو یہاں حدیث میں مراد ہے اور دوم نرمی سے اعمال اس شخص کے سامنے بیان کرنا ہے

جو آیت میں مراد ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں، پھر حساب یسیر کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ سرسری جائزہ کے بعد اسے جنت کا پروانہ دے دیا جائے گا اور عذاب بالکل نہ دیا جائے دوسری یہ کہ اسے دائمی عذاب تو نہ دیا جائے مگر کچھ عذاب گناہوں پر دیا جائے پھر جنت میں داخل کیا جائے یہ دونوں اہلِ ایمان کے لئے ہیں جبکہ کفار عذاب سے کسی صورت نہیں بچیں گے ان کا عذاب وحساب بہرحال سخت ہوگا۔

باب منه

"يُجاء بابن آدم يوم القيٰمة كأنّه بَذَجٌ فيوقف بين يدي الله تعالىٰ فيقول الله: أعطيتُك وخوّلتُك وانعمتُ عليك فما ذا صنعتَ؟ فيقول: يارب جمعتُه وثمّرته وتركته اكثر ما كان فارجعني آتِك به كله فيقول له: أرِني ماقدّمتَ؟ فيقول يارب جمعته وثمّرته فتركته اكثر ما كان فارجعني آتك به كله، فاذا عبد لم يقدّم خيراً فيُمضىٰ به الى النار".

قیامت کے دن آدمی کو لایا جائے گا جو گویا بھیڑ کا بچہ ہوگا (یعنی گھبراہٹ سے سمٹ گیا ہوگا) سوا سے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا کر دیا جائے گا، اللہ فرمائیں گے میں نے تجھے دولت دی، نوکر چاکر دیئے اور (دیگر) انعامات کئے تجھ پر تو تم نے کیا کیا؟ پس وہ کہے گا اے میرے رب! میں نے وہ مال جمع کیا اور بڑھایا اور زیادہ سے زیادہ چھوڑ چکا ہوں پس مجھے واپس لوٹا دیں میں وہ سارا مال تیرے پاس لاتا ہوں، اللہ اس سے فرمائیں گے مجھے دکھاؤ تم نے آگے کیا بھیجا ہے؟ (یعنی موت سے پہلے) وہ (پھر) کہے گا اے میرے رب! میں نے اسے جمع کیا ہے اور بڑھایا ہے اور زیادہ سے زیادہ چھوڑا ہے پس مجھے واپس جانے دیں میں وہ سب تیرے سامنے پیش کرتا ہوں (یعنی صدقہ کرتا ہوں) چنانچہ جب اس شخص نے کچھ بھلائی نہیں کی ہوگی تو اسے جہنم کی جانب چلتا کیا جائے گا۔

تشریح:۔ قوله: "كانه بذج" بروزن سَبَبٌ بھیڑ اور دنبے کے بچے کو کہتے ہیں یہاں مراد حقارت اور خوف کے مارے سکڑنا ہے۔

قوله: "خولتك" ای اعطيتك خولاً، خول بفتحتین خادم، نوکر چاکر وغیرہ کو کہتے ہیں، آج کل گاڑیاں اور دیگر تمام مشینیں اس میں آتی ہیں کیونکہ یہ سب انسان کی خادم ہیں۔ قوله: "ثمرته" بتشدید المیم تثمیر زیادہ کرنے اور اضافے کو کہتے ہیں کیونکہ ثمرہ ایک زائد چیز ہوتا ہے۔

اس حدیث میں اگر ابن آدم سے مراد کافر ہو تو پھر مطلق صدقہ وانفاق فی سبیل اللہ پر حمل کیا جائے گا کیونکہ کافر نہ تو صدقہ نفلیہ مانتا ہے اور نہ ہی واجبی، لیکن اگر یہ مطلق ابن ادم ہو خواہ مسلمان کیوں نہ ہو تو پھر یہ سزا وگرفت زکوٰۃ ودیگر صدقات واجبیہ میں کوتاہی کی بناء پر ہوگی کیونکہ صدقہ نفلیہ کے ترک پر سرزنش نہیں ہے اگرچہ اس کا فائدہ بہت ہے۔

حدیث آخر:۔ ایک بندہ قیامت کے دن لایا جائے گا اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: کیا میں نے تجھے سننے اور دیکھنے کی قوت نہیں دی تھی اور دولت واولاد نہیں دی تھی اور چوپائے اور کھیتی کو تیرے تابع نہیں بنایا تھا اور تجھے سرداری کرتا ہوا اور چوتھائی حصہ مال کا لیتا ہوا نہیں بنایا تھا؟ تو کیا تمہیں یقین آرہا تھا کہ تم اس دن سے آملو گے؟ تو وہ کہے گا نہیں! تو اللہ اس سے فرمائیں گے آج ہم تجھے اسی طرح (جہنم میں) چھوڑ دیں گے جس طرح تم نے ہم (سے ملنے) کو نظر انداز کیا تھا۔ (صحیح غریب)

قولہ: "ترأس" رأس اور رئیس پیشوا کو کہتے ہیں یعنی تم سرداری کیا کرتا تھا۔

قولہ: "تربع" رُبع یعنی مال میں سے چوتھائی حصہ لینے کو کہتے ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں سردار غنیمت اور دیگر پیداوار سے چوتھائی وصول کرتے تھے۔

قولہ: "اَنساکَ" یہ نسبت بطور مشاکلت کے ہے چونکہ اس آدمی کی طرف نسیان کی نسبت کی گئی ہے اس لئے اللہ کی طرف بھی نسبت کی گئی، مراد ترک ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح فرمائی ہے یعنی جس طرح بھولی ہوئی چیز کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا ہے ایسا ہی تم کو چھوڑ دیا جائے گا۔

باب منه

"یومئذ تُحَدِّثُ اخبارها" قال أتدرون ما اخبارها؟ قالوا: الله ورسوله اعلم، قال: فان اخبارها ان تشهدَ علی کل عبدٍ اَوْ اَمَةٍ بما عمل کذا وکذا فی یوم کذا وکذا قال بهذا (هذا) امرها". (حسن غریب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: اس دن (زمین) کہہ ڈالے گی اپنی باتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ اس کی باتیں کیا ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس دن (زمین) کی باتیں یہ ہوگی کہ وہ

گواہی دے گی ہر بندے اور ہر باندی کے بارے میں کہ اُس نے اِس کی پشت پر فلاں فلاں وقت میں فلاں فلاں عمل کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح گویائی کا اللہ نے اس کو حکم دیا ہوگا۔

تشریح:۔ بعض نسخوں میں ''فهذا امرها'' اور بعض میں ''امرها'' کے بجائے ''اخبارها'' ہے پس ''بهذا امرها'' والے نسخے کے مطابق امرھا میں میم کو مفتوح ماضی کے صیغہ سے پڑھا جائے گا جبکہ هذا امرها میں میم ساکن ہے یعنی مصدر اور ھذا کی خبر ہے اسی طرح اخبارھا بھی ھذا کی خبر ہے۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ زمین پر جو بھی نیکی بدی کا عمل کیا جاتا ہے زمین اس کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے اور قیامت کے روز سارا ڈیٹا اور تمام تفصیلات، سن، مہینہ اور وقت بتا کر گواہی دے گی کہ کس نے کس وقت کیا کیا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے ہوگا۔

باب ماجاء فی الصور

(صور پھونکنے کا بیان)

''جاء اعرابی الی النبی صلی الله علیه وسلم فقال: ماالصُّور؟ قال: قَرنٌ يُنفَخُ فيه''.

(حسن صحيح)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا صور کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سینگ (کی طرح ایک چیز ہے) جس میں پھونکا جائے گا۔

تشریح:۔ ''صور''، بضم الصاد وسکون الواو بوق اور نرسنگھے کو کہتے ہیں بعض حضرات نے اس کو صورۃ کی جمع قرار دیا ہے گویا بضم الواو پڑھا ہے مگر صحیح اول ہی ہے کیونکہ یمن کی اصطلاح ولغت میں صور قرن کو کہتے ہیں۔

قوله: ''قرن'' بسکون الراء بگل کو کہتے ہیں، سوال گویا اس آیت سے ناشی و پیدا ہوا ''ونفخ فی الصور'' یا کسی اور آیت سے جبکہ جواب کا مقصد یہ ہے کہ صور بگل کی مانند ایک آلہ ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے، اس کی پوری حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ ہی جانتے ہیں تاہم اس قسم کی تعبیرات لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہوتی ہیں کیونکہ لوگ تو بگل جانتے ہیں اصل صور تو کسی نے نہیں دیکھا مگر اس کے مشابہ تر چیز چونکہ قرن

تھی اس لئے اسے قرن سے تعبیر کیا گیا۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا ایک بار پھونکنے سے سب انتہائی خوف زدہ ہو جائیں گے، دوسری مرتبہ بے ہوش ہو جائیں گے اور تیسری مرتبہ پھونکنے سے سب زندہ ہو جائیں گے۔ اگر اسے قول ضعیف کے مطابق جمع صور الموتی مانا جائے تو مطلب یہ بنے گا کہ مردوں میں ارواح ڈالی جائیں گی۔

حدیث ابی سعیدؓ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں کیسے شادماں رہوں جبکہ بگل والے (حضرت اسرافیلؑ) نے قرن کو منہ میں لیا ہوا ہے اور کان لگائے رکھے ہیں کہ کب اسے پھونکنے کا حکم ملے گا تا کہ وہ فوراً ہی پھونک دے تو گویا یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر سخت گراں گذری، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہو: حسبنا اللہ الخ"۔ (حسن)

قولہ: "انعم" بصیغہ واحد متکلم نَعِمَۃ بفتح النون سے بمعنی خوش وخرم کے ہے یعنی میں کیونکر سرور وراحت کی زندگی گذاروں جبکہ صورت حال بہت گھمبیر ہے یہاں کیف سے پہلے "واؤ" کا اضافہ ہے مگر سورۂ زمر کی تفسیر میں بغیر واؤ کے آیا ہے اور بظاہر وہی یعنی بغیر واؤ کے زیادہ صحیح ہے۔

قولہ: "التقم" لقمہ ونوالہ بنانا یعنی صور پھونکنے پر مامور فرشتہ حضرت اسرافیل علیہ السلام منہ میں قرن لئے حکم کے منتظر ہیں اور اس کے لئے گویا ہمہ تن گوش بن گئے ہیں، اس روایت کو ظاہر ہی پر محمول کیا جائے گا۔

ابواب التفسیر میں ہے کہ صحابہ نے آپ علیہ السلام سے پوچھا ہم کیا پڑھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ دعاء کی تلقین فرمائی کیونکہ جب آدمی اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور اسے اپنا کفیل ووکیل اور کافی سمجھنے لگتا ہے تو اللہ اس کی حفاظت ضرور کرتا ہے۔

باب ماجاء فی شأن الصراط

(پُلِ صراط کی کیفیت کا بیان)

"عن المغيرة بن شعبة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :شِعار المؤمنين على الصراط ربِّ سَلِّم،سَلِّم".

پُل صراط پر ایمان والوں کی شناخت "رب سَلِّم سَلِّم" ہوگی یعنی اے رب امان میں رکھ، حفاظت میں رکھ۔

تنبیہ:۔ پل صراط عالم مثال میں اسلام کا جسم مثالی ہے جو یہاں دین اسلام سے محروم رہا وہ آخرت میں پل صراط عبور نہیں کر سکے گا اور جو یہاں جتنی سہولت سے اسلام پر رہا وہ وہاں بھی آسانی سے عبور کر سکے گا

تشریح:۔ قولہ:"شِعار" بکسر الشین وہ مخصوص الفاظ جو شناخت، تمیز اور علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں جیسے مجاہدین رات کی پہرے داری کے دوران اپنے ساتھیوں کی شناخت ایسے ہی الفاظ سے کرتے ہیں جو اس رات کے لئے مخصوص کر دیئے جاتے ہیں ان کو اصطلاح میں "نامِ شب" کہا جاتا ہے جبکہ معجم کبیر للطبرانی میں شعار کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں "یا لا اِلٰہ اِلّا انت" یعنی "یا اللہ لا الٰہ الّا انت" دونوں میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ سلم سلم عام امتیوں کا شعار ہوگا جبکہ "یا لا الٰہ الّا انت" خواص کا۔

پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی یہ دعاء پڑھتا رہے بلکہ ہر امت کی طرف سے اس کا نبی ایسا پڑھتے رہیں گے چنانچہ ایک روایت میں ہے "فاکون اول من یجیزُ و دعاء الرسل یومئذٍ :اللّٰھم سلّم سلّم" علیٰ ھذا امت میں جو یہ دعاء پڑھے گا وہ اس کی محمدی ہونے کی نشانی ہوگی۔

حدیث انسؓ:۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے لئے قیامت کے دن (خصوصی) سفارش فرمائیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ایسا کرنے والا ہوں، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! تو میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے مجھے پل صراط پر ڈھونڈو، میں نے کہا اگر پل صراط پر آپ سے نہ مل سکوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر مجھے میزان کے پاس تلاش کرو، میں نے عرض کیا تو اگر میزان کے پاس بھی آپ سے نہ مل سکا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر مجھے حوض (کوثر) کے پاس ڈھونڈو کیونکہ بلاشبہ میں ان تین مقامات سے ادھر ادھر نہیں ہوں گا۔ (حسن غریب)

یعنی شفاعت کے لئے میں ان تین مقامات میں کسی نہ کسی مقام پر ضرور ملوں گا، اس حدیث کی ظاہری ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ صراط پہلے ہے پھر میزان ہے اور اخیر میں حوض ہے اور یہی بعض شارحین کی رائے ہے، امام بخاریؒ نے بھی حوض کی حدیث اخیر میں ذکر کر کے اسی ترتیب کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لیکن اصح یہ ہے کہ حوض مقدم ہے پھر میزان یعنی حساب ہے اور اخیر میں صراط ہے، مذکورہ باب کی حدیث کی ترتیب باعتبار ترتیب وقوعی کے نہیں بلکہ باعتبار ہولناکی کے ہے یعنی سب سے اشد ضرورت پل صراط پر سفارش اور دستگیری کی پڑے گی کہ وہ انتہائی ہولناک منظر ہے پھر بعدہ میزان ہے اور پھر نسبۃً آسان حوض ہے، علیٰ ھذا

"اَوّلُ ماتطلبنی" باعتبار ضرورت کے ہے یعنی سب سے زیادہ ضرورت سفارش کی پل صراط پر پڑے گی پھر میزان پر۔

حاشیہ ترمذی پر حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی گئی ہے کہ ایک دفعہ وہ رونے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ مجھے آگ یاد آگئی اس لئے رونے لگی پھر کہنے لگیں:

"فهل تذكرون اهليكم يوم القيٰمة ؟قال صلى الله عليه وسلم اَمّافى ثلثة مواطن فلايذكر احدٌ احداً عند الميزان ".الحديث

یعنی اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تین مقامات پر سفارش نہیں ہوگی جبکہ حدیث باب سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور یہ تو تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں مگر میری کوتاہ سمجھ میں یہ توجیہ آتی ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے "هل تذكرون اهليكم ؟" یعنی آپ کو یا انبیاء کی جماعت کو اپنے اقارب یاد آئیں گے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی میں جواب دیا ہے یعنی کسی کو کوئی بھی یاد نہیں آئے گا اس میں شفاعت کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ معاملہ انتہائی سخت ہوگا جس کی بناء پر کوئی بھی یاد نہیں رہے گا ہاں اگر کوئی سامنے آجائے جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث باب میں ہے تو پھر اس کی سفارش کی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فى الشفاعة

(سفارش کے بیان میں)

"عن ابى هريرة قال اُتِىَ رسول الله صلى الله عليه وسلم بلحم فَرُفِعَ اليه الذراع فاكله وكان يعجبه فَنَهَشَ منه نَهشَةً ثم قال :اناسيّدالناس يوم القيٰمة هل تدرون لِمَ ذاكَ؟ يجمع الله الناس الاولين والآخرين فى صعيدواحد فيُسمِعُهم الداعى وينفذهم البَصَرُ وتدنوا الشمس منهم فيبلغ الناس من الغم والكرب مالايطيقون ولايَتَحَمَّلُون فيقول الناس بعضهم لبعض :اَلا ترون ماقدبَلَغكم؟ آلاتنظرون من يشفع لكم الى ربكم؟ فيقول الناس بعضهم لبعض :عليكم بادم فيأتون ادم فيقولون:انت ابوالبشر خَلَقَكَ اللهُ بيده ونفخ فيك من روحه وَاَمَرَالملائكة فَسَجَدُوالكَ اِشفَع لنا الى ربك اَماترىٰ مانحن فيه آلاترىٰ ما قد بَلَغنا

فيقول لهم آدم :ان ربی قدغضِب اليوم غضَباً لم يغضب قبله مثله ولن يغضب بعده مثله وانه قد نَهَانی عن الشجرة فَعَصيتُه نفسِی نفسِی نفسِی اذهبوا الی غيری اذهبوا الی نوح فيأتون نوحاً فيقولون :يانوح انت اول الرسل الی اهل الارض وقدسمّاک اللّٰه عبداً شكوراً اِشفع لَنَا الی ربک اَ لَا تریٰ ماقدبَلَغنَا؟فيقول لهم نوح:ان ربی قد غضب اليوم غضباً لم يغضب قبله مثله ولن يغضب بعده مثله وانه قدكانت لی دعوة دعوتها علی قومی نفسی نفسی نفسی اِذهبوا الی غيری اِذهبوا الی ابراهيم فيأتو ن ابراهيم فيقولون:ياابراهيم !اَنتَ نبی اللّٰه وخليله من اهل الارض فاشفع لنا الی ربک آلاتریٰ مانحن فيه؟فيقول ان ربی قدغضب اليوم غضباً لم يغضب قبله مثله ولن يغضب بعده مثله وانی قدكذبتُ ثلاث كَذِبات فذكرهن ابوحيان فی الحديث،نفسی نفسی نفسی،اذهبوا الی غيری اذهبوا الی موسیٰ!فيأتون موسیٰ فيقولون ياموسی!أنتَ رسول اللّٰه فَضّلَکَ اللّٰه برسالته وكلامه علی الناس اشفع لنا الی ربک آلاتریٰ مانحن فيه؟فيقول:ان ربی قدغضب اليوم غضباً لم يغضب قبله مثله ولن يغضب بعده مثله وانی قدقتلتُ نفساً لَم اُومربقتلها نفسی نفسی نفسی اذهبوا الی غيری اذهبوا الی عيسیٰ!فيأتون عيسیٰ فيقولون :ياعيسیٰ !اَنتَ رسول اللّٰه وكلمته القاها الی مريم وروح منه وكَلَّمتَ الناس فی المهد اِشفع لنا الی ربک آلاتریٰ مانحن فيه فيقول: عيسیٰ ان ربی قدغضب اليوم غضباً لم يغضب قبله مثله ولن يغضب بعده مثله ولم يذكر ذنباً نفسی نفسی نفسی اذهبوا الیٰ غيری اذهبوا الیٰ محمدصلی اللّٰه عليه وسلم قال فيأتون محمداً صلی اللّٰه عليه وسلم فيقولون:يامحمد!انت رسول اللّٰه وخاتم الانبياء وغُفِرَلَکَ ما تقدم من ذنبک وماتأخر اشفع لنا الیٰ ربک !آلاتریٰ مانحن فيه فَانطَلِقُ فاٰتِی تحت العرش فَاَخِرُّ ساجداً لِربی ثم يفتح اللّٰه عَلَیَّ من محامده وحُسنِ الثناء عليه شيئاً لم يفتحه علی احدقبلی ثم يقال يامحمد!ارفع رأسک سَل تُعطَه واشفع تُشَفَّع !فارفع رأسی فاقول يارب! امتی يارب امتی!فيقول يامحمد!اَدخِل من امتک من لاحساب عليه من الباب الايمن من ابواب الجنة وهم شركاء الناس فيماسویٰ ذالک من الابواب ثم قال:والذی نفسی بيده ان مابين المصراعين من مصاريع الجنة كمابين مكة وهجر وكمابين مكة

وبُصریٰ".(حسن صحیح واخرجه البخاری فی کتابِ الانبیاء باب قول الله عزوجل "ولقد ارسلنا نوحاً الیٰ قومه"(ص ۴۷۰ ج ۱)وکتاب التفسیرباب قوله ذرّیة من حملنامع نوح الخ (ص ۶۸۴ ج ۲)واخرجه مسلم فی کتاب الایمان(ص ۱۰۸ ج ۱)باب اثبات الشفاعة الخ وکذااخرجه ابن ماجه واحمدوالبزاروابویعلیٰ وابن حبان فی صحیحه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک بازو اٹھا دیا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھایا آپ کو ذراع پسند تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نوچ نوچ کر تناول فرمایا پھر آپ نے فرمایا میں قیامت کے روز لوگوں کا سردار ہوں، کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیوں؟ (اس لئے کہ) اللہ اگلے پچھلے سب لوگوں کو ایک ہی (ہموار) میدان میں جمع فرمائیں گے (بایں طور کہ) ایک پکارنے والا ان سب کو سُنا سکے گا اور ایک نظر سب تک پہنچے گی اور سورج ان کے قریب ہو جائے گا، پس لوگ غم ومصیبت کے اس درجہ تک پہنچ جائیں گے جس کی وہ (صبر کی) قدرت نہیں رکھیں گے اور نہ ہی تاب لاسکیں گے، پس لوگ ایک دوسرے سے کہیں گے کیا تم نہیں دیکھتے ہو وہ مصیبت جو تمہیں پہنچی ہے؟ کیا تم غور نہیں کر رہے ہو ایسے شخص کے بارے میں جو تمہاری سفارش کرے تمہارے رب سے؟ پس لوگ ایک دوسرے سے کہیں گے بس تم سب آدمؑ ہی کے پاس چلے جاؤ! چنانچہ وہ آئیں گے آدم کے پاس اور کہیں گے کہ آپ سب انسانوں کے پدر ہیں اللہ نے آپ کو اپنے دستِ (قدرت) سے پیدا کیا ہے اور آپ میں اپنی طرف سے روح ڈالی ہے (یعنی بلا اسباب) اور فرشتوں کو حکم دیا تو انہوں نے آپ کو سجدہ کیا (اس لئے) آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کیجئے؟ کیا آپ وہ مصیبت نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلاء ہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں جو آفت ہم پر آپڑی ہے؟ سو فرمائیں گے آدمؑ بلاشبہ میرا رب آج ایسا غصہ ہوا ہے کہ نہ تو اس طرح کبھی پہلے غصہ ہوا تھا اور نہ ہی کبھی بعد میں ایسا غصہ ہوگا اور بے شک اس نے مجھے ایک درخت (کھانے) سے روکا تھا سو میں وہ حکم پورا نہ کر سکا مجھے اپنی فکر دامن گیر ہے، تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ (بلکہ) تم نوحؑ کے پاس چلے جاؤ! چنانچہ لوگ نوحؑ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے نوح! آپ زمین والوں کی طرف پہلے (بھیجے گئے) رسول ہیں، اور بتحقیق اللہ نے آپ کا نام عبدِ شکور (شکر گذار بندہ) رکھا ہے آپ اپنے رب سے ہماری شفاعت کیجئے! کیا آپ نہیں دیکھ رہے جس مصیبت میں ہم گرفتار ہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے جو مصیبت ہم پر آگئی ہے؟ پس حضرت نوحؑ ان سے فرمائیں گے: میرا رب آج اتنا غصہ ہوا ہے

جواس طرح نہ کبھی پہلے غصہ ہوا تھا اور نہ ہی کبھی بعد میں ایسا غصہ ہوگا بے شک میرے لئے ایک مستجاب دعاء تھی تو وہ میں نے مانگی ہے (یا خرچ کی ہے) اپنی قوم کی ہلاکت کے لئے مجھے تو اپنی فکر لگی ہے..تم میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ (بلکہ) چلے جاؤ تم لوگ ابراہیمؑ کے پاس چنانچہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے کہ اے ابراہیم! آپ اللہ کے نبی ہیں اور زمین والوں میں سے اللہ کے دوست ہیں سو آپ اپنے رب سے ہمارے لئے سفارش کیجئے! کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہم جس مصیبت میں پڑے ہیں؟ تو وہ فرمائیں گے میرا رب آج اتنا غصہ ہوا ہے جتنا نہ کبھی اس سے پہلے غصہ ہوا تھا اور نہ اتنا کبھی بعد میں غصہ ہوگا اور میں نے تین جھوٹ (یعنی بصورت جھوٹ) بولے ہیں (چنانچہ ابوحیان راوی نے وہ تین باتیں اپنی روایت میں ذکر فرمادیں۔) مجھے اپنی فکر لاحق ہے..تم کسی اور کے پاس جاؤ، تم لوگ موسیٰ کے پاس جاؤ پس وہ لوگ موسیٰ کے پاس آئیں گے اور گذارش کریں گے کہ اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ نے اپنی رسالت اور اپنے کلام کے ذریعہ آپ کو لوگوں پر برتری دی ہے (لہٰذا) آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کیجئے! کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہم جس بلا میں ہیں؟ تو وہ فرمائیں گے تحقیق میرا رب آج اس قدر غضبناک ہے جو اس طرح نہ پہلے غضبناک ہوا ہے اور نہ کبھی بعد میں ہوگا، بے شک میں نے ایک جان کو مار ڈالا تھا جس کے مارنے کا مجھے حکم نہیں ہوا تھا (یعنی قبطی کو) مجھے اپنی فکر درپیش ہے..تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس چلے جاؤ، تم عیسیٰ کے پاس جاؤ! چنانچہ وہ لوگ عیسیٰ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے عیسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ (کن) ہیں جو ڈالا ہے اس نے مریم کی طرف اور اس کی (طرف سے) روح ہیں (یعنی آپ کو بغیر اسباب کے لفظ کن سے پیدا کیا ہے) اور آپ نے گہوارے میں لوگوں سے بات کی ہے (یعنی پیدائش کے فوراً بعد) آپ ہمارے لئے اپنے رب سے سفارش کیجئے! کیا آپ نہیں دیکھ رہے وہ تکلیف جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں؟ پس عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: بے شک آج میرا رب اتنا غضبناک ہے جو نہ تو کبھی اس سے پہلے اتنا غضبناک ہوا تھا اور نہ ہی کبھی بعد میں ہوگا وہ کسی کوتاہی کا ذکر نہیں فرمائیں مجھے اپنی فکر نے بے چین کیا ہے، تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ! تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ! فرمایا پس وہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں اور سب انبیاءؑ میں آخری نبی ہیں اور بخشے گئے ہیں آپ کے اگلے پچھلے سب بار خاطر بوجھ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کیجئے! کیا آپ نہیں دیکھ رہے وہ رنج جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟ پس میں چلا جاؤں گا اور عرش کے نیچے آؤں گا پس اپنے رب کی تعظیم کے لئے سجدہ میں گر پڑوں

گا، پھر اللہ اپنی حمد اور اچھی اچھی تعریفوں کے وہ کلمات مجھ پر کھولے گا (یعنی میری زبان اور جنان پر جاری فرمائے گا) جو مجھ سے پہلے اللہ نے کسی پر نہیں کھولے ہوں گے پھر ارشاد ہوگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ! اپنا سر اٹھاؤ! مانگو تمہیں دیا جائے گا (یعنی سوال قبول ہوگا) اور شفاعت کرو تیری شفاعت قبول کی جائے گی ! تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور کہوں گا: اے میرے رب! میری امت! اے رب! میری امت! (یعنی میں اپنی امت کی نجات و بخشش مانگتا ہوں) پس اللہ فرمائیں گے: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اپنی امت میں سے ان لوگوں کو جن پر حساب نہیں جنت کے داہنے دروازے سے داخل کرو اور وہ (امتی) جنت کے باقی ماندہ دروازوں میں بھی لوگوں کے شریک ہیں (یعنی اگر وہ چاہیں تو کسی بھی دروازے سے داخل ہو سکتے ہیں) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے جنت کے (دروازوں کے) پٹوں میں سے دو پٹوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا مکہ اور ہجر کے درمیان ہے یا جیسے مکہ اور بُصریٰ کے مابین ہے۔

تشریح:۔قوله: "ذِراع" بروزن کتاب اصل میں کلائی یعنی کہنی سے ہتھیلی تک کے حصے کو کہتے ہیں جسے ساعد بھی کہا جاتا ہے۔

قوله: "وكان يعجبه" آپ علیہ السلام کو ہاتھ کا گوشت اس لئے پسند تھا کہ یہ گندگی کی جگہ سے دور ہوتا ہے اور جلدی بھی پک جاتا ہے کچھ مزید وجوہات ابواب الاطعمۃ کے "باب ماجاء ایُّ اللحم کان احب الی رسول الله ﷺ" میں گذری ہے، فلیراجع۔

قوله: "فنهش" اس کے لئے ابواب الاطعمہ میں مستقل باب گذرا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نَہس بسین مہملہ اور بشین معجمہ یعنی نہش دونوں مترادف المعنیٰ بمعنی دانتوں سے نوچنے کے ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگلے دانتوں سے نوچ کر کھانے کے لئے نہس بغیر نقطوں کے آتا ہے اور داڑھوں سے نوچا جائے تو اس کے لئے نہش بالشین معجمہ آتا ہے۔

قوله: انا سید الناس الخ" یہ بطور تحدیث بالنعمۃ کے فرمایا نیز آپ علیہ السلام اپنے مقام متعارف کرانے پر مامور بھی تھے البتہ اس موقعہ پر اس ارشاد فرمانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ تو یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور ایک غلط فہمی کے ازالہ کے طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو معمولی یا خلاف ادب اور بے شائستگی نہ سمجھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت برکت اور خیر کی باعث بلکہ خیر و برکت سے لبریز ہے۔ سید سے مراد مالک نہیں بلکہ وہ ہے جس کے گرد لوگ مصیبت و پریشانی کے وقت جمع ہو جاتے ہیں یہ

وصف اگرچہ آپ علیہ السلام کو دنیا میں بھی حاصل رہا ہے کہ صحابہ کرامؓ ہر پریشانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو جاتے تاہم قیامت کے دن جب اولین وآخرین سب آپ علیہ السلام کے پاس مجتمع ہو جائیں گے تو سیادت وسرداری کے معنی ومصداق میں کسی طرح ابہام یا کسی کو انکار نہیں رہے گا بلکہ سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کریں گے جس کی وجہ سے آپ کا مقام مقام محمود کہلائے گا۔

قولہ:"فی صعید" یہاں مراد صعید سے بالاتفاق روئے زمین ہے جس سے حنفیہ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ تیمم مطلق جنس ارض سے درست ہے پھر یہ میدان باعتبار بادی نظر کے بھی مراد ہوسکتا ہے علیٰ ھذا یہ زمین کی گولائی کے منافی نہیں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ درحقیقت بھی ہموار ہو علیٰ ھذا ہوسکتا ہے کہ زمین قیامت کے حادثہ یا اجرام فلک کے ٹکرانے سے گولائی کی خاصیت سے نکل کر ایک تختے کی شکل اختیار کر جائے۔

قولہ:"ینفذھم البصر" یعنی وہ اس طرح کھلے میدان میں ہوں گے کہ آواز اول تا آخر سنائی دے گی اور نظر اخیر تک جا پہنچے گی، یہ لفظ نفاذ سے بمعنی تجاوز کے ہے یعنی آواز اخیر تک گذر کر پہنچے گی، یہ لفظ بفتح الیاء وضم الفاء بھی پڑھا گیا ہے یعنی ثلاثی سے اور بضم الیاء وکسر الفاء یعنی مزید سے بھی پڑھا گیا ہے۔ بہرحال نظر سے مراد مخلوق کی نظر ہے کیونکہ اللہ کا دیکھنا کسی شرط پر موقوف نہیں۔ (تدبر)

قولہ:"والکرب" شدید غم ورنج کو کہتے ہیں۔ قولہ:"خلقک اللہ بیدہ الخ" یعنی بغیر تولد اور بغیر معروف طریقہ کے۔

قولہ:"من روحہ" من تبعیض کے لئے نہیں بلکہ ابتداء کے لئے ہے فلیتنبہ۔ قولہ:"قد غضب الیوم" اللہ تبارک وتعالیٰ جس طرح جسمیت وحیوانیت سے پاک ہے اسی طرح جسمانی وحیوانی صفات ولوازمات سے بھی منزہ وپاک ہے لہٰذا یہاں مراد غضب سے گنہگاروں کے عقاب کا ارادہ اور انتقام کے مظاہر ہیں کہ دوزخ جوش میں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

قولہ:"نفسی نفسی نفسی" یعنی میرا نفس خود اس قابل ہے کہ کوئی اس کی شفاعت کرے۔

قولہ:"انت اول الرسل الی اھل الارض" اگر حضرت ادریس علیہ السلام وہی حضرت الیاس علیہ السلام ہوں جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے نقل کیا ہے تو پھر تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانہ میں مبعوث ہوئے تھے لیکن اگر مؤرخین کی بات مانی جائے کہ حضرت ادریسؑ حضرت نوحؑ کے دادا ہیں تو پھر کہا جائے گا کہ حضرت آدم وشیث علیہما السلام اور ادریسؑ کی رسالت یعنی بعثت

کفار کی طرف نہ تھی بلکہ اپنی اولاد کی طرف ایمان وطاعۃ کی دعوت کے لئے تھی جبکہ حضرت نوحؑ کی رسالت کفار کو تبلیغ کے لئے تھی۔ (کذا قالہ النووی علی مسلم ص:۱۰۸ ج:۱)

قولہ: "ثلاث کذبات" ترمذی کے حاشیہ پر ہے کہ یہ دراصل معاریض یعنی توریات ہیں مگر بصورت جھوٹ ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آپ کو شفاعت کبریٰ کا مستحق نہیں سمجھا اسی طرح جہاں بھی انبیاء علیہم السلام کی طرف کسی خطاء کی نسبت کی گئی ہو تو اس سے مراد صورتاً خطاً ہے نہ کہ حقیقتاً، (قالہ الطیبیؒ) العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: "اتفق العلماء علیٰ ان الثلاثۃ توریات لا کذبات صریحۃ" وہ تین باتیں کیا ہیں؟ تو ان میں دو کا ذکر قرآن میں آیا ہے (۱) "انی سقیم" (۲) "فعلہ کبیرھم ھذا" اور تیسری (۳) کا حدیث میں ہے کہ تم اس ظالم بادشاہ سے کہو کہ میں (ابراہیم) تیرا (یعنی سارہ اپنی بیوی) کا بھائی ہوں۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ شفاعت کبریٰ کا یہ اعزازی تاج خاتم النبیین رحمۃ للعٰلمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھے اس لئے ان انبیاء علیہم السلام سے کچھ نہ کچھ ایسے قصور کروائے جو اگرچہ زمرۂ گناہ میں نہیں آتے تاہم انہوں نے اپنے علوِ مقام کی وجہ سے ان کو اپنے لئے گویا گناہ تصور کیا اور سفارش سے معذرت فرمالی۔ یہ ایسا ہے جیسے کسی انتہائی ہوشیار اور تابع فرمان خادم کی راہ میں پانی وغیرہ ڈالا جائے جس کی بناء پر وہ آتے ہوئے پھسل جائے اور ہاتھ میں پیالہ کی چائے کے چند قطرے گر جائیں اور مراد یہ ہو کہ وہ کہیں سفارش نہ کردے چنانچہ وہ زیرک خادم شرمندہ سا ہو جاتا ہے اور زبان کھولنے کی ہمت ہار جاتا ہے۔ تدبر

اس حدیث سے ایک طرف معتزلہ وغیرہ کے مذہب کی تردید ہوئی جو شفاعت کے منکر ہیں۔ امام ترمذیؒ نے یہ باب اسی مقصد کے لئے قائم کیا ہے، پھر شفاعت کی پانچ صورتیں واقسام ہیں: (۱) اول یہی جو باب کی حدیث میں مذکور ہے اس کو شفاعت کبریٰ کہتے ہیں (۲) دوم رفع درجات کے لئے اس قسم کے وقوع کے معتزلہ بھی قائل ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک جو شخص ایک مرتبہ دوزخی بن جائے تو پھر کبھی بھی وہ جنت میں نہیں جاسکتا۔ اس اختلاف کا دارومدار اس پر ہے کہ آیا گناہ سے آدمی ایمان سے خارج ہوتا ہے یا نہیں؟ تو معتزلہ وخوارج نفی ایمان کے قائل ہیں جبکہ اہلسنت والجماعت کسی گناہ کی وجہ سے کسی کو خارج از ایمان قرار نہیں دیتے۔ یہ مسئلہ ان شاء اللہ ابواب الایمان میں آجائے گا۔ (۳) سوم بلاحساب دخول جنت کے لئے (۴) چہارم مذنبین کے خروج من

النار کے لئے (۵) پنجم مستحق نار کے لئے یعنی تا کہ وہ دوزخ سے بچیں۔ان میں بعض کو بعض سے ضم کر کے تعداد کم بھی ہوسکتی ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کا یہ سجدہ سات دنوں تک جاری رہے گا۔دوسری طرف یہ حدیث قادیانی ملعون کی صاف تردید کررہی ہے،غرض آپ علیہ السلام خاتم النبیین ہیں، یہ روایت بخاری میں بھی ہے اگر آپ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی ہوتا تو یہ اعزاز اس کو مل جاتا کیونکہ وہی اکمل وکامل ہوتا بہر حال جب آپ علیہ السلام کی شفاعت حساب وکتاب کے لئے قبول کی جائے گی تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے شفاعت کریں گے اور فرمائیں گے یارب امتی الخ۔(کذافی الکوکب الدری)

اسی طرح اس حدیث سے ان لوگوں کے قول وزعم کی بھی صاف تردید ہوگئی جو آپ علیہ السلام کے لئے علم غیب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں العرف الشذی میں ہے کہ ایک حدیث میں ہے ''انی لااعلم المحامد التی یعلمنی اللہ ایّاھا وقت الشفاعۃ وانمااطلع علیھا فی المحشر فما شان جھل من الخ'' پھر انبیاء علیہم السلام تو سب معصوم ہیں مگر آپ علیہ السلام کو اس عصمت کا علم دنیا ہی میں دیا گیا تھا تا کہ وہ قیامت کے دن اس شفاعت کبریٰ کے لئے تیار رہیں۔

قولہ:''ھَجَر'' بفتحتین ھجر دو ہیں ایک بحرین میں جو یہاں مراد ہے اور دوم مدینہ کے پاس ہے اور حدیث قلتین میں اسی کے مٹکے مراد ہیں۔قولہ:''بُصریٰ'' بضم الباء والف مقصورہ کے ساتھ شام کے قریب بجانب حجاز ایک معروف بلدہ ہے۔

چونکہ مصراع بکسر المیم دروازے کے کنارے کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ جنت کے دروازے کے دونوں کناروں کے مابین مذکورہ فاصلہ ہے یہ اس کی وسعت کی طرف اشارہ بلکہ تصریح ہے۔

باب منه

''قوله علیه السلام :''شفاعتی لاهل الکبائرمن امتی ''.(حسن صحیح غریب)

میری شفاعت میری امت کے کبائر کے مرتکب لوگوں کے لئے ہوگی۔

تشریح:۔شفاعتی میں اضافت عہد کے لئے ہے یعنی جس سفارش کی قبولیت کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور جو میں نے محفوظ رکھ لی ہے وہ میں قیامت کے دن امت کے گنہگاروں کی نجات کے لئے کروں گا،جہاں تک رفع درجات کے لئے سفارش کا تعلق ہے تو وہ امت کے تمام اتقیاء واولیاء کو حاصل رہے

گی، اسی طرح امت کے صلحاء وعلماء کو بھی حق شفاعت دیا جائے گا کہ وہ کسی کی نجات کے لئے سفارش کریں مگر یہ سب شفاعتیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ کے بعد ہوں گی، العرف الشذی میں ہے "ثم بعدها شفاعات كثيرة صغرىٰ من العلماء والصلحاء والحفاظ وغيرهم " گویا شفاعت کبریٰ اور بلاحساب جنت میں داخلے کی شفاعت آپ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہیں جو سابقہ باب میں پہلے اور تیسرے نمبر پر ذکر کی گئی ہیں۔

معتزلہ وخوارج نفی شفاعت پر بعض آیات سے استدلال کرتے ہیں مثلاً "فما تنفعهم شفٰعة الشافعين " (المدثر:۴۸) وغیرہ جبکہ اہلسنت والجماعت باب کی حدیث وغیرہ ان نصوص سے استدلال کرتے ہیں جن میں شفاعت کا صاف ثبوت ہے۔ معتزلہ کے استدلال کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ وہ تمام نصوص جن سے نفی شفاعت معلوم ہوتی ہے یا تو کفار کے بارے میں ہیں یا پھر وہ نفی شفاعت قہری پر محمول ہیں یعنی کسی کو زبردستی سفارش کرنے کا ہرگز حق نہیں ہوگا ہاں جب اجازت مل جائے گی تو شفاعت اذنی شروع ہو جائے گی، خلاصہ یہ کہ نفی والی نصوص کا محمل شفاعت قہری ہے جبکہ اثبات والی نصوص کا محمل شفاعت اذنی ہے۔ تدبر

حدیث ابی امامةؓ:۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستّر ہزار آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائیں گے جن پر نہ حساب ہے اور نہ ہی عذاب، جبکہ ان میں ہر ہزار کے ساتھ مزید ستّر ہزار ہوں گے اور تین لپ بھری ہوئی میرے رب کی لپوں سے۔ (حسن غریب)

قوله: "مع كل الف سبعون الفاً" یہ زیادتی صحیحین میں نہیں ہے تاہم اس کو ضعیف نہیں کہہ سکتے کیونکہ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں یہ کئی اسانید کے ساتھ نقل فرمائی ہے جیسا کہ عرف شذی میں ہے۔ پھر بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ستر ہزار ائمہ ومتبوعین ہوں گے اور ان کے ساتھ داخل ہونے والے ان کے اتباع وپیروکار ہوں گے۔ (كذا في العرف الشذی)

قوله: "حثيات" بفتح الحاء والثاء حثية کی جمع ہے ایک ہاتھ سے یا دونوں ہاتھ ملا کر یکبارگی بھر کر کوئی چیز دینے کو کہتے ہیں۔ اگر ثلاث کو مرفوع پڑھا جائے تو یہ سبعون پر عطف ہوگا اور اس صورت میں مبالغہ زیادہ ہوگا کیونکہ اس طرح ترجمہ یوں ہوگا کہ ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور مزید تین لپ کے بقدر لوگ ہوں گے، علیٰ هذا لپوں کی تعداد دوسودس/210 ہو جائے گی جبکہ ثلاث نصب کی حالت میں سبعین پر عطف ہوگا اور یدخل

کامفعول بنے گا، علی ھذا ترجمہ یہ ہوگا کہ اللہ میری امت سے ستر ہزار اور بقدر تین لپ کے لوگ جنت میں بلاحساب وعذاب داخل فرمائیں گے اس صورت میں حثیات کی تعداد صرف تین ہوگی، بنابر ہر تقدیر مراد کثرت کا بیان ہے کیونکہ لپوں سے دینے میں تعداد ملحوظ نہیں ہوتی ہے نیز سبعین کا عدد بھی تکثیر کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہ حدیث یعنی ثلاث حثیات کے الفاظ متشابہات میں سے ہیں جس کی تفصیل (تشریحات ترمذی "باب ماجاء فی نزول الرب تبارک وتعالیٰ الی السماء الدنیا کل لیلة" ابواب الوتر سے تین باب پہلے جلد دوم ص:۳۰۷ پر گذری ہے) اعادہ کی ضرورت نہیں جسے تفصیل چاہئے وہیں پر ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن شقیقؒ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں اِیلیاء میں ایک جماعت کے ساتھ تھا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے جو فرما رہے تھے: میری امت میں سے ایک شخص کی سفارش سے بنی تمیم (قبیلہ) سے بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! وہ (شخص) آپ کے علاوہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ میرے سوا ہے، پھر جب وہ شخص (راوی حدیث) کھڑا ہوا (اور جانے لگا) تو میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ حاضرین نے کہا کہ یہ ابن ابی جذعان (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ (حسن صحیح غریب)

قولہ: "رھط" بروزن شمس آدمی کے خاندان کو کہتے ہیں اس لفظ کا مفرد استعمال نہیں ہوتا البتہ اس کی جمع الجمع آتی ہے جیسے ارھط، ارھاط، وارھط دس سے کم پر اطلاق ہوتا ہے وقیل الی الاربعین جن میں عورت نہ ہو۔ (کذافی العارضۃ الاحوذی) قولہ: "ایلیاء" بکسر الھمزۃ بروزن کبریاء یعنی بالمد جبکہ الف مقصورہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ بیت المقدس میں مشہور شہر کا نام ہے۔

قولہ: "فقال رجل" یہ حضرت عبداللہ بن ابی جذعان رضی اللہ عنہ صحابی ہیں جیسا کہ حدیث کے آخر میں تصریح ہے، یہ کون شخص ہوں گے جن کی سفارش سے بنی تمیم قبیلے سے (یا بنی غنم قبیلے سے) بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے؟ تو اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے البتہ ذخیرۂ احادیث میں دو حضرات کے ناموں کو دیکھ کر بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں اسی باب میں حسن بصریؒ کی مرسل روایت ہے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یشفع عثمان بن عفان یوم القیٰمة فی مثل ربیعة ومُضَر" جبکہ اسی مضمون کی ایک روایت ابن عدیؒ نے ابن عباسؓ سے بھی نقل فرمائی ہے اس میں اویس بن عبداللہ قرنیؒ کا نام ہے۔ (کذافی المرقات لعلی القاری

علی المشکوٰۃ)

پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سوال کرنا: یارسول اللہ سواک؟ تعجب پر مبنی ہوسکتا ہے کہ اتنی فضیلت غیر نبی کے لئے تعجب سے خالی نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں سے شمار ہوتے ہیں اس لئے ان کو پوچھنا پڑا کہ وہ آپ ہیں یا کوئی اور؟ علیٰ ھذا یہاں کوئی اعتراض وارد نہیں ہوا کہ "من امتی" کے لفظ کے بعد انہوں نے یہ کیسے سوال کیا؟ تدبر۔

قولہ: "فِئام" بالہمزۃ بعد الفاء بروزن کتاب لوگوں کی بڑی تعداد کے لئے استعمال ہوتا ہے بظاہر یہاں مراد قبائل ہیں کیونکہ آگے قبیلہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ فئام اس سے زیادہ ہیں جو قبائل ہی ہوسکتے ہیں۔ بعض نے فئام کو بغیر ہمزہ کے بھی پڑھا ہے یعنی فِیام، اس کا لفظی مفرد تو نہیں ہوتا البتہ معنوی مفرد فئۃ ہوسکتا ہے۔

قولہ: "عصبۃ" بضم العین دس اور چالیس کے درمیان کی تعداد میں لوگوں کو کہتے ہیں۔

قولہ: "حتیٰ یدخلوا الجنۃ" یعنی ان کی شفاعت کی جائے گی یہاں تک کہ مشفوعین جنت میں داخل ہوجائیں یا مطلب یہ ہے شفاعت کا سلسلہ اس وقت تک جاری ہوگا جب تک پوری امت جنت میں داخل نہیں ہوجاتی۔ (حدیث حسن)

حدیث عوف بن مالکؓ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس میرے رب کی جانب سے آنے والا آیا (یعنی فرشتہ) پس اس نے مجھے اختیار دیا ہے ان دو صورتوں میں کہ اللہ میری امت کا آدھا جنت میں داخل کرے یا پھر (ان کی) شفاعت ہوجائے تو میں نے شفاعت کا انتخاب کیا وہ ان لوگوں کے لئے ہوگی جو اللہ کے ساتھ کسی طرح شرک کئے بغیر مر جائیں یعنی توحید و رسالت پر"۔

اس بہترین انتخاب کی وجہ واضح ہے کہ شفاعت تو پوری امت کو شامل ہوسکتی ہے اگرچہ بعض گنہگار دوزخ میں جائیں گے مگر شفاعت کی برکت سے ایک نہ ایک دن تو نکل جائیں گے۔

قولہ: "نصف امتی" سے مراد امت اجابت ہے کیونکہ امت دعوت میں سے جو ایمان نہ لائے وہ جنت میں کسی صورت نہیں جاسکتا لہٰذا وہ موضوع بحث اور قابل شفاعت نہیں اگرچہ شفاعتِ کبریٰ کا کچھ فائدہ ان کو بھی ہوگا۔

باب ماجاء فی صفة الحوض

(حوضِ کوثر کے احوال کا بیان)

"ان فی حوضی من الاباریق بِعَدَدِ نجوم السمآء". (حسن صحیح غریب)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے حوض میں آسمان کے ستاروں کی تعداد میں صراحیاں ہیں۔

قولہ: "اباریق" ابریق کی جمع ہے پانی کے جگ اور صراحی کو کہتے ہیں جو لمبی گردن کا چھوٹا برتن ہوتا ہے یہ کنایہ ہے کثرت سے، یہ بھی ممکن ہے کہ تحدید مراد ہو اور ستاروں کے ساتھ ان برتنوں کی خاص مناسبت ہو کیونکہ ان کی تعداد سے اہل ایمان کی تعداد معلوم کرنے میں مدد مل سکتی ہے پھر ستاروں کی تعداد اگرچہ معلوم نہیں تاہم ماہرین اس پر متفق ہیں کہ یہ تعداد کھربوں سے متجاوز ہے، اس سے مسلمانوں کی کثرت بابرکت اور حوضِ کوثر کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو اگلے باب میں مذکور ہے۔

باب کی دوسری حدیث:۔ "اِنَّ لِکل نبیّ حوضاً وانهم یتباهون ایُّهم اکثر واردةً وانی ارجوان اکون اکثرهم واردةً". (حسن غریب)

ہر نبی کا ایک حوض ہے اور وہ آپس میں فخر کریں گے کہ کس کے پاس زیادہ پینے والے آتے ہیں جبکہ میں امید رکھتا ہوں کہ میرے حوض پر آنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

تشریح:۔ "اِنَّ لِکُلِّ نَبِیٍّ حَوضاً" اس کو ظاہر پر محمول کرنا متعین ہے اگرچہ طیبیؒ نے فرمایا کہ اس کو معنی مجازی یعنی ہدایت پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے تاہم مآلاً دونوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ جو شخص دنیا میں ہدایت قبول کرتا ہے تو اس کو حوض کی سیرابی نصیب ہوگی، مگر نصوص کو ظاہر پر رکھنا اور محمول کرنا اولین راستہ ہے ہاں بصورت ضرورت تاویل بھی جائز ہے۔ پھر جس طرح ایک نبی کی امت بڑی اور زیادہ ہوگی تو اسی تناسب سے حوض بھی وسیع ہوگا چونکہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سب سے زیادہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا حوض تمام انبیاء علیہم السلام کے حوضوں سے زیادہ کشادہ ہوگا۔

قولہ: "یتباهون" ای یتفاخرون کیونکہ یہ محنت کے ثمرات سمیٹنے کا سب سے اعلیٰ وموزون ترین موقعہ ہوگا اگرچہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام سارے کے سارے کامیاب ہیں مگر کامیابی کی سند حاصل کرنے

والوں میں بھی درجات ہوتے ہیں پس جس کی امت زیادہ ہوگی وہ اس قدر خوش ہوگا اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام فخر فرمائیں گے مع ھذا کسی کو شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی کیونکہ محبت کرنے والے بھائی آپس میں تفاوت کے باوجود خوش رہتے ہیں اور یہ تو عالم آخرت کی بات ہے جہاں عام لوگوں کے دلوں سے حسد وکینہ کی جڑ ختم کردی جائے گی تو انبیاء کی تو بات ہی الگ ہے وہ تو دنیا میں بھی رذائل اخلاق سے پاک اور مبراء ہوتے ہیں۔

قولہ: "وانی ارجوا الخ" ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس تعبیر کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ کی اُمت ایکسو بیس/120 صفوں میں سے اسی/80 صفوں یعنی دوتہائی پر مشتمل ہوگی، بہرحال یہ طے ہے کہ آپ علیہ السلام کی امت کی تعداد سابقہ تمام امتوں کے مجموعہ سے زیادہ ہے۔

ترمذی کے بعض نسخوں میں اس حدیث پر حسن غریب کا حکم لگایا ہے اور بعض میں صرف غریب کا۔

باب ماجاء فی صفة اوانی الحوض

(حوضِ کوثر کے برتنوں کا احوال)

"عن ابی سلاّم الحُبُشِی قال بَعَثَ اِلَیَّ عمربن عبدالعزیز فَحُمِلتُ علی البرید فلما دَخَلَ علیه قال: یاامیر المؤمنین لقدشَقّ عَلَیّ مرکبی البرید!فقال یا ابا السلام ماارِدتُ اَنْ اَشُقّ علیک ولکن بَلَغَنِی عنک حدیث تحدِّثه عن ثوبان عن النبی صلی الله علیه وسلم فی الحوض فاحببتُ ان تُشَافِهَنِی به!قال ابوسلاّم ثنی ثوبان عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: حوضی من عَدَنَ الیٰ عَمّانَ البلقاء ماؤهُ اشدُّبیاضامن اللبن واحلیٰ من العسل واکوابه عدد نجوم السماء،مَن شَرِبَهامنه شربة لم یظمأ بعدها ابداً،اوّل الناس وروداً علیه فُقراءُ المهاجرین الشُعثُ رؤوساً،الدُنسُ ثیاباً،الذین لاینکحون المتنعمات ولایُفتح لهم السُدَدُ، قال عُمر: لٰکنی نکحتُ المتنعِّمات وفتحت لی السُدَدُ،نکحتُ فاطمة بنت عبدالملک لاجرم انی لااغسل رأسی حتی یَشعَثَ ولااغسل ثوبی الذی یلی جسدی حتیٰ یتّسِخَ".

(حدیث غریب)

حضرت ابوسلاّم حبشی فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے میرے پاس پیغام بھیجا (کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں) چنانچہ مجھے برید (خچر) پر بٹھا دیا گیا پس جب یہ ان کے پاس پہنچے تو عرض کیا اے

امیر المؤمنین! میری سواری برید کی مجھ پر شاق گذری، توانہوں نے فرمایا اے ابوالسلام! میں تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجھے آپ کے حوالے سے ایک حدیث پہنچی تھی جسے آپ ثوبانؓ اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جو حوض سے متعلق ہے میری خواہش ہوئی کہ آپ وہ حدیث میرے رُوبرُو بیان کریں! ابوسلّام نے فرمایا حضرت ثوبانؓ نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا حوض عدن سے عمانِ بلقاء تک ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے اور اس کے آبخورے آسمان کے ستاروں کے شمار کے مطابق ہیں جس نے اس سے ایک بار پیا وہ اس کے بعد کبھی بھی پیاسا نہیں ہوگا، اس پر سب سے پہلے آنے والے مہاجر فقراء ہوں گے جو گرد آلود (پراگندہ) سروں والے، میلے کچیلے کپڑوں والے ہیں، نکاح نہیں کرتے ناز پروردہ عورتوں سے اور نہ کھولے جاتے ہیں ان کے لئے بند دروازے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا مگر میں تو ناز پروردہ عورتوں سے نکاح کر چکا ہوں اور دروازے بھی میرے لئے کھلوے گئے (اور کھولے جاتے ہیں) میں نے فاطمہ بنت عبدالملک شہزادی سے نکاح کیا ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ میں اپنا سر نہیں دھوتا یہاں تک کہ پراگندہ نہ ہو جائے اور جو کپڑے میرے جسم پر ہوتے ہیں اس وقت تک نہیں دھوتا جب تک کہ میلے نہ ہو جائیں۔

تشریح:۔ ابوسلّام بتشدید اللام ان کا نام ممطور ہے حبشی حبش کی طرف منسوب ہے عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ ابن ماجہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ ابوسلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے بلکہ انہوں نے یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت ثوبانؓ سے روایت کی ہے جیسا کہ ابوداؤد ونسائی نے فرمایا ہے اور ترمذی کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

قولہ "البرید" فارسی لفظ ہے اور بریدہ دم کا مخفف ہے خچر کو کہتے ہیں۔ چونکہ نشانی کے طور پر ڈاک کے خچر کی دم کاٹی جاتی تھی اس لئے اس کو برید کہا جاتا تھا۔ اگرچہ پھر یہ مطلق ڈاکیہ کے لئے استعمال ہونے لگا۔ کذا فی العارضۃ الاحوذی والتحفۃ الاحوذی

قولہ "ما اردت ان اشق علیک الخ" مشقت بمعنی تعب وتھکان کے ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس جملے میں معذرت کرنا چاہتے ہیں کہ جب مجھے پتہ چلا کہ آپ کے پاس حوض کوثر کے بارے میں ایک حدیث ہے تو میں آپ کے پاس اچھی سواری بھیجنے کے لئے انتظار نہ کر سکا بلکہ جو میسر تھا یعنی برید بس وہی بھیج کر آپ کو زحمت دی۔

قولہ "تشافهنی" یعنی بالمشافہہ تاکہ میں آپ سے براہ راست آمنے سامنے بیٹھ کر سنوں۔ قولہ "من عدن" یمن کے مشہور شہر کا نام ہے۔

قولہ "عمان البلقاء" بفتح العین وتشدید المیم بروزن شداد شام کے قریب ایک علاقے کا نام ہے اور بلقاء جو فلسطین کا علاقہ ہے اس عُمان سے تمیز واحتراز کے لئے ذکر فرمایا جو بحرین کے قریب ہے اور بروزن غراب ہے۔ بحر عُمان جو مشہور ہے وہ اسی بحرین والے عمان کی طرف منسوب ہے۔

قولہ "واکوابہ" کوب کی جمع ہے جو بغیر دستہ اور بغیر گردن کے چھوٹا سا برتن ہوتا ہے جو عموماً مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے اسے آبخورا کہتے ہیں۔ پیالہ اور گلاس کا ترجمہ بھی صحیح ہے۔

قولہ "لم یظمأ بعدها ابداً" تاہم جنت میں مشروبات کا استعمال رہے گا مگر وہ پیاس بجھانے کے لئے نہیں بلکہ لطف اندوز ہونے کے لئے ہوگا جیسے دنیا میں بہت سارے مشروبات کا استعمال التذاذ کی غرض سے ہوتا ہے۔

قولہ "الشعث رؤوساً" بضم الشین اشعث کی جمع ہے پراگندہ بالوں والے کو کہتے ہیں۔ رؤوساً تمیز ہے اسی طرح ثیاباً بھی منصوب بنا بر تمیز ہے۔ دُنس بضم الدال وسکون النون دَنَس بفتحتین کی جمع ہے دَنَس میل کو کہتے ہیں، اس روایت کا ابوداؤد کی روایت سے تعارض نہیں جس میں آپ علیہ السلام نے سر کے بالوں کی پراگندگی اور کپڑوں کے میلا ہونے کو ناپسند فرمایا ہے کیونکہ وہ حالت اختیار پر محمول ہے جبکہ باب کی حدیث اضطراری حالت پر محمول ہے یعنی یہ لوگ ایسے غریب ومفلس ہیں یا امور آخرت میں ایسے منہمک ہیں کہ وہ اپنی اس حالت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔

تشریحات ترمذی میں پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ اضطراری تکالیف پر صبر کی صورت میں ثواب ملتا ہے اختیاری تکلیف پر اجر نہیں ملتا، مثلاً ایک آدمی اللہ کی راہ میں گرد آلود ہو جائے تو اس پر جہنم کی آگ حرام ہوتی ہے لیکن اگر ایک شخص مٹی لے کر سر پر ڈال دے تو وہ یہ مقام حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے شہادت اور خودکشی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

قولہ: "المتنعمات" بصیغہ اسم فاعل خوش عیش عورتوں کو کہتے ہیں۔

قولہ: "السدد" بضم السین وفتح الدال سدة کی جمع ہے مطلق دروازے کو کہتے ہیں چونکہ یہ عموماً بند رہتا ہے اس لئے اس کو سدة کہا جاتا ہے گویا یہ سَدّ بمعنی بند کے ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ دروازے

کے اوپر بارش سے بچنے کے لئے جو سائبان ہوتا ہے اسے بھی کہتے ہیں، بہر حال مراد اس سے دروازہ ہے۔

اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو معاشرہ میں کوئی حیثیت نہیں دیجاتی نہ تو امیر گھرانوں میں ان کا نکاح ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے ملنا اور دعوتوں میں مدعو کیا جانا گوارا کیا جاتا ہے، اگر اس کا مصداق مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں تو پھر کون ہو سکتے ہیں؟ ہاں البتہ یہ خوشخبری کسی زمانہ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

عمر بن عبد العزیزؒ کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک آخری دونوں خصلتوں کا تعلق ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں کیونکہ رشتہ رد کرنا اور دروازہ بند کرنا اپنے بس کی بات نہیں بلکہ یہ دوسرے پر موقوف ہوتا ہے البتہ پہلی دونوں باتوں کا میں التزام کر سکتا ہوں جس کا مطلب یا تو عدم تکلف ہے کہ میں زیب و زینت میں زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا بلکہ اصل مقصد کی طرف توجہ دوں گا۔ یا مطلب یہ ہے کہ میں مہاجرین اولین سے مشابہت اختیار کرنے کے لئے فقر اختیاری پر عمل کروں گا کہ بس ایک جوڑا رکھ لیا دہ جب میلا ہو جائے تب دھوؤں گا اور غسل کر کے اسے پہنوں گا۔

المسترشد:۔ عرض کرتا ہے کہ متنعمات سے شادی کرنے میں وقت کا بے تحاشہ ضیاع مشاہدۂ عام ہے کہ کبھی ایک مارکیٹ میں خریداری کے لئے جانا پڑتا ہے اور کبھی دوسری مارکیٹ میں، آج کل تو متنعمات کی اکثریت نمازی و متشرع شوہر کو پسند بھی نہیں کرتیں پھر ان کی رضا کی خاطر داڑھی کو بھی صاف کرنا پڑتی ہے اور دیگر بہت سے غیر شرعی امور مثلاً ان کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے حلال و حرام مال کی تمیز کئے بغیر ہاتھ پاؤں بھی مارنا پڑتے ہیں۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! حوض کے برتن کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ بلاشبہ اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد اور اندھیری رات میں صاف آسمان پر چمکنے والے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں، وہ جنت کے برتنوں میں سے ہیں جو ان میں پیئے گا وہ آخر تک (یعنی کبھی بھی) پیاسا نہیں ہوگا، اس حوض کی چوڑائی اس کی لمبائی کی برابر ہے (یعنی مربع و چوکور ہے) عمان سے ایلہ تک جتنی (مسافت) ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (حسن صحیح)

قولہ: "نجوم السماء و کواکبھا" نجم اور کوکب دونوں ستاروں کو کہتے ہیں تاہم نجم میں ابھرنے اور ظہور کے معنی پائے جاتے ہیں اور کوکب میں چمکنے کے، یہ تو لغوی فرق سا ہے مگر عرف میں کوئی خاص فرق نہیں

ہے البتہ فلکیات کے عرف میں بعض نے یہ فرق کیا ہے کہ کوکب وہ ستارہ ہے جو سورج کے گرد گھومتا ہے اس کو مشہور اصطلاح کے مطابق سیارہ کہا جاتا ہے۔

قولہ: "مُصحِیَۃ" اس کا وزن بھی مُظلِمَۃ کی طرح یعنی بصیغۂ اسم فاعل ہے صحت السماء یا اصحت السماء اس وقت کہا جاتا ہے جب آسمان میں گرد وغبار اور بادل کہیں نہ ہو مطلع بالکل صاف ہوان دونوں قیود کا فائدہ تکثیر ہے کیونکہ چاندنی رات یا ابر آلود مطلع میں زیادہ ستارے نظر نہیں آتے۔ قولہ: "آخر ماعلیہ" کنایہ ہے دوام سے حاشیۂ قوت المغتذی پر ہے کہ عرب لفظ آخر کو ابد و دوام کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

قولہ: "عرضہ مثل طولہ مابین عمان الخ" یہ حوض کی کیفیت اور وسعت کا بیان ہے تحدید مراد نہیں اس لئے کبھی یہ الفاظ آتے ہیں اور کبھی من عدن الی عمان جیسا کہ سابقہ حدیث میں گذرا ہے اور کبھی ایک مہینے کی مسافت کا ذکر ہے وغیرھا یہ سب تقریب الی الفہم کے لئے ہے کہ حوض کم از کم اتنا وسیع ہوگا، چونکہ حوض کوثر اور پل صراط وغیرہ سب امور ممکنہ ہیں اور ان کی خبر صادق ومصدوق علیہ السلام نے دی ہے اس لئے ان کی تصدیق لازمی ہے جیسا کہ شرح عقائد میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

"عن ابن عباس قال لَمّاأُسرِیَ بالنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم جَعَلَ یَمُرُّبالنبی والنبیّین ومعھم القوم والنبی والنبیّین ومعھم الرھط والنبی والنبیّین ولیس معھم احدحتیٰ مَرَّ بسوادعظیم، فقلتُ من ھذا؟ قیل موسیٰ وقومہ ولکن ارفع رأسک فانظر فاذاسواد عظیم قدسَدَّ الأُفُقَ مِن ذاالجانب ومِن ذاالجانب، فقیل ھٰؤلآء أُمتک وسِویٰ ھٰؤلآء مِن امتک سبعون الفایدخلون الجنة بغیر حساب، فَدَخَلَ ولم یسئلوہ ولم یفسِّر لھم فقالوا نحن ھم، وقال قائلون ھم اَبناء الذین وُلِدُواعلی الفطرة والاسلام فَخَرَجَ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: ھم الذین لایکتوُوْن ولایسترقون ولایتطیّرون وعلی ربھم یتو کلون فقام عُکاشة بن مِحصَنٍ فقال انامنھم یارسول اللّٰہ؟قال نعم ثم جاء ہ اٰخرفقال انامنھم فقال سَبَقَکَ بھا عُکّاشة". (حسن صحیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس رات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (معراج کے لئے) لے جایا گیا تو آپ علیہ السلام گذرے ایک نبی اور دو نبیوں کے پاس سے اور ان کے ساتھ قوم (امت) تھی اور گذرے ایک ایک دو دو نبیوں کے پاس سے ان کے ساتھ (چھوٹی سی) جماعت تھی اور گذرے ایک ایک دو دو

نبیوں کے پاس سے دراں حالیکہ ان کے ہمراہ کوئی ایک شخص بھی نہ تھا، یہاں تک کہ گذرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جم غفیر پر تو میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ موسیٰ اوران کی قوم (امت) ہیں، لیکن اپنا سر اٹھا کر اوپر دیکھئے! پس ایک زبردست ہجوم تھا جس نے افق کو بھر دیا تھا اِس طرف سے (بھی) اوراُس جانب سے (بھی) پس کہا گیا یہ آپ کی امت ہے اوران لوگوں کے علاوہ آپ ہی کی امت میں سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے، (اس ارشاد کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوگئے اورلوگوں نے ان سے دریافت نہیں کیا (کہ وہ ستر ہزار کون ہیں؟) اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو وضاحت فرمائی، چنانچہ صحابہ کہنے لگے وہ ہم لوگ ہوں گے جبکہ بعض کہنے والوں نے کہا یہ وہ بچے ہوں گے جو فطرة اسلام پر پیدا ہوئے ہوں گے اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے آئے اور فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ داغ کرتے ہیں اور نہ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں اور نہ ہی بدفالی لیتے ہیں اوراپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں پس عُکّاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہا اے اللہ کے رسول! کیا میں ان میں سے ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں'' پھر آپ کے پاس ایک اور شخص آیا اور پوچھا میں بھی ان میں سے ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں عکاشہ تم پر سبقت لے گئے ہیں۔

تشریح:۔قوله: ''بسواد عظیم'' جب بہت سارے لوگ جمع ہوجاتے ہیں تو اس مقام پر ایک سیاہی سی نظر آتی ہے کثرت رؤس کی وجہ سے اس لئے اسے سواد کہتے ہیں۔

قوله: ''ولکن ارفع رأسک'' اس سے اس امت کی رفعت معلوم ہوئی کیونکہ اوپر دیکھنا بلندی کی طرف ہوتا ہے۔

قوله: ''سد الافق'' سد کے معنی چھپانے کے ہیں اور افق آسمان کے کناروں کو کہتے ہیں۔

قوله: ''فقالوا نحن هم'' کیونکہ صحابہ کرام امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔

قوله: ''هم ابناء الذین ولدوا علی الفطرة الخ'' اضافت موصوف الی الصفة ہے تاکہ صحابہ کرام کی اولاد کو بھی شامل ہوجائے تقدیر اس طرح ہوگی ''هم الابناء الذین الخ'' یعنی یہ وہ بچے ہیں جو فطرة اسلامی پر پیدا ہوئے ہیں اور بلوغت سے پہلے انتقال کر گئے ہیں وہ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔

قوله: ''فقام عُکّاشة'' بضم العین وتشدید الکاف اس کو تخفیف کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے، بدری صحابی ہیں غزوۂ بدر میں ان کی تلوار ٹوٹ گئی تھی تو آپ علیہ السلام نے ان کو کھجور کی خشک شاخ دے دی جو تلوار بن

گئی، پینتالیس ر۴۵ سال کی عمر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں انتقال کر گئے ہیں۔ (کذافی الاکمال فی اسماء الرجال لصاحب المشکوٰۃ)

قولہ: "ثم جاء اٰخر الخ" اس دوسرے آدمی کے بارے میں شارحین کے بہت سے اقوال ہیں کہ یہ کون تھا؟ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں صحیح اور راجح قول اس کو قرار دیا ہے کہ آپ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوا تھا کہ عُکاشہؓ کی درخواست اس حوالے سے قبول کی جائے گی دوسرے کی نہیں۔ (نووی بر مسلم ج:اص:۱۱۶) تاہم حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب الدری میں اس توجیہ کی نفی فرمائی ہے اور صحیح اس کو کہا ہے کہ آپ علیہ السلام کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ عکاشہؓ کی طرح تم ان صفات میں درجہ علیاء پر نہیں ہو کہ میں تمہیں بے حساب والوں میں سے ہونے کی خبر دے دوں، دونوں توجیہین کو بین السطور مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اوپر صاحب مشکوٰۃ کی اسماء الرجال کتاب کے حوالے سے حضرت عکاشہؓ کے توکل کے معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جن کے ہاتھ میں لکڑی بھی تلوار بن گئی اگرچہ یہ آپ علیہ السلام کا معجزہ ہے مگر حضرت عکاشہؓ کے توکل کا بھی عکاس ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر حساب کے جنت میں وہ لوگ جائیں گے جو انتہائی خاص الخاص متوکلین ہوں گے، رہا داغ، دم یعنی جھاڑ پھونک اور تَطَیُّر کا مسئلہ تو یہ سب تفصیل سے گذرا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں داغ کے لئے (تشریحات ترمذی ج: ششم ص:۳۵۴ "باب ماجاء فی کراھیۃ الکیّ" اور رقیہ کے لئے دیکھئے جلد ششم ص ۳۶۱ "باب ماجاء فی کراھیۃ الرقیۃ ...والرخصۃ فی ذالک")

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ داغ کو مؤثر گردانا جائز نہیں البتہ بطور سبب کے بوقت ضرورت علاج کے لئے جائز ہے۔ اسی طرح رقیہ یعنی جھاڑ پھونک بھی سبب کے درجہ میں جائز ہے بشرطیکہ وہ الفاظ غلط مضمون پر مشتمل نہ ہوں۔ یہ رخصت عام ہے اور عوام کے لئے ہے جہاں تک خاص الخاص لوگوں کا تعلق ہے تو وہ تکلیف پر صبر کرتے ہیں اور صحت یابی کے لئے اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں اسباب پر تکیہ نہیں کرتے۔ جہاں تک بدشگونی اور بدفالی کا تعلق ہے تو وہ کسی طرح کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔ تطیر کی تفصیل کے لئے دیکھئے (تشریحات ترمذی جلد پنجم ص:۴۶۷ "باب ماجاء فی الطِّیَرَۃِ" من ابواب السیر)

حدیث آخر:۔ ابو عمران جونی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم جس چیز (امور دین) پر تھے اب اس میں سے کوئی چیز (اُسی حالت میں) نہیں دیکھ رہا۔ میں (ابو عمران) نے کہا نماز کہاں ہے؟ (یعنی نماز تو باقی ہے) انہوں نے فرمایا کیا تم لوگوں نے

نماز میں وہ (کوتاہی) نہیں کی ہے جو تم جانتے ہو۔ (حسن غریب اخرجہ البخاری ایضاً)

اس حدیث کے دو مطلب ہیں: ایک جو ظاہری ہے اور ترجمہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے مطابق حضرت انسؓ اعمال میں تقصیر اور کوتاہی پر ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں چونکہ یہ ارشاد انہوں نے اس وقت فرمایا تھا کہ جب حجاج بن یوسف نے نماز کو مؤخر کیا اور حضرت انسؓ نے حجاج سے بات کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا مگر ساتھیوں نے ازروئے شفقت ان کو منع کیا کہ کہیں ان کی جان نہ چلی جائے جس پر حضرت انسؓ نے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے جاتے مذکورہ ارشاد فرمایا حافظؒ نے طبقات ابن سعد سے نقل کیا ہے کہ اس پر یہ بھی اضافہ ہے اِلّا شــهــادة ان لا الٰہ اِلّا اللّٰہ، تو ایک آدمی نے کہا اے ابوحمزہ! نماز جو ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے ظہر کو مغرب کے وقت رکھا ہے تو کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تھی؟ (کذا فی تحفۃ الاحوذی)

دوسرا مطلب:۔ مگر ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں سابقہ مطلب یعنی تبدیلی کو سخت ناپسند کیا ہے بلکہ اسے جاہلانہ قرار دیا ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے کہ انہوں نے اعمال میں کسی طرح تبدیلی کی ہوگی کیونکہ قرآن نے گواہی دی ہے کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے، علی ھذا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو قسم کی رحمتیں تھیں ایک دینی اور دوسری دنیوی، دینی رحمت تو قرآن وسنت کی صورت میں باقی ہے مگر دنیوی رحمتوں میں سے فخیم اور کثیر حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ساتھ ختم ہو چکا پس حضرت انسؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو فوائد ہمیں اس وقت نظر آتے تھے، مثلاً آپ علیہ السلام کے معجزات، آپ کی دعاؤں کے اثرات وغیرہ وغیرہ وہ چیز آج نظر نہیں آتی اور چونکہ ان تجلیات وبرکات کے ناپید ہونے سے دلوں میں نکارت، کبر اور عجب وغیرہ نے سرایت شروع کی ہے اس لئے اب نماز میں بھی وہ خلوص، حضور اور خشوع وغیرہ نہیں رہا۔ لانهم احدثوا تغییراً فی ارکانها، انتھٰی

تاہم اگر پہلی توجیہ میں اس قید کا اضافہ کر دیں تو وہ بھی درست ہو سکتی ہے یعنی آپ علیہ السلام کے عہد پاک میں اعمال کے ظاہر وباطن کی جو حالت تھی آج وہ بعینہ باقی نہیں کیونکہ اس کا روحانی پہلو کمزور ہو گیا ہے اگرچہ ظاہری شکل اور ڈھانچہ جوں کی توں باقی ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ بُرا بندہ ہے وہ شخص جو خود پسندی میں مبتلا ہو اور اِتراتا ہو اور بزرگ وبرتر (خدا) کو بھول گیا ہو اور بُرا بندہ ہے وہ شخص جو تکبر کرتا ہے اور حد سے بڑھتا ہے اور بھول گیا وہ سب

سے بڑے اور سب سے بالاتر (خدا) کو، بُرا بندہ ہے وہ شخص جو غفلت کرتا رہتا ہے اور کھیلتا رہتا ہے، اور قبروں اور ہڈیوں کے گل سڑ جانے کو بھول جاتا ہے، بُرا بندہ ہے وہ شخص جو فساد (وتکبر) کرتا ہے اور سرکشی اختیار کرتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے اپنی ابتداء (خلقت) کو اور انتہاءِ (کار) کو، بُرا بندہ ہے وہ شخص جو دین کے ذریعہ دنیا حاصل (کرنے میں بھیڑیے کی طرح چال بازی) کرتا ہے، بُرا بندہ ہے وہ شخص جو شبہات کی آڑ میں دین طلب کرتا ہے، بُرا بندہ ہے وہ شخص جسے لالچ کھینچتا ہے، بُرا بندہ ہے وہ شخص جسے ہوس گمراہ کرتی ہے، بُرا بندہ ہے وہ شخص جسے حرص ذلیل کرتی ہے۔ (هذا حديث .... ليس اسناده بالقوى)

قوله: "تَخَيَّلَ واختال" پہلا بروزن تَفَعَّلَ ہے دونوں صیغے خُيَلَاء بمعنی عجب وتکبر کے ہیں یعنی وہ شخص دل میں اپنے آپ کو دوسروں سے افضل وبرتر سمجھتا ہے واختـال اور ظاہر میں چال چلن سے بڑا ہونے کا تأثر دیتا ہے، جبکہ بڑائی وکبریائی تو صرف اور صرف اللہ عزوجل کا وصف خاصہ ہے جو مخلوق کی صفات سے پاک اور منزہ ہے مگر یہ ناداں شخص اس کو بھول جاتا ہے اس لئے خود کو بڑا سمجھتا ہے۔

قوله: "تَجَبَّرَ" وہ تکبر جس سے آدمی دوسروں کو حقیر سمجھ کر ان کو کسی کام پر مجبور کرتا ہو۔

قوله: "واعتدى" اعتداء حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں یعنی اس متکبر کی بات اگر نہ مانی جائے تو وہ اتنی سخت سزا دیتا ہے کہ حد کو توڑتا اور پامال کرتا ہے، جیسے جاہل وڈیروں کی عادت ہوتی ہے حالانکہ یہ تو خدائی وصف ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر کسی مخالف کو سزا دیں تو اس کے لئے کوئی حد اور کوئی پابندی نہیں مگر یہ بے وقوف شخص اس قہار وغالب کو بھول جاتا ہے جو سب کے اوپر ہے۔

قوله: "سَهَا" حق سے غافل ہو گیا ہے۔ اور "لها" لہو یعنی فضولیات اور بے فائدہ چیزوں میں مستغرق ہو گیا ہے گو کہ اس سے کچھ ظاہری اور وقتی فائدہ محسوس ہوتا ہے جیسے دنیوی مال ومتاع، جبکہ عقلمند کو دور اندیشیے کام لینا چاہئے کہ اس دنیا کے بعد قبر میں جانا ہے اور وہاں ہڈیوں کا بوسیدہ ہونا ہے۔ **قوله:** "بِلى" بکسر الباء بروزن اِلیٰ سڑ جانے کے معنی میں ہے۔

قوله: "عَتَا" عتوّ سے بمعنی شرارت کرنے اور اس میں بڑھتے رہنے کے ہے۔

قوله: "طغى" یہ بھی عتا کی طرح بروزن علیٰ کے ہے طغیان شر وفساد میں حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں حالانکہ اگر دیکھا جائے تو کسی کو یہ حرکت وعادت زیب نہیں دیتی کیونکہ آدمی ایک حقیر ناپاک پانی سے بنا ہے اور بالآخر پھر سڑی ہوئی بدبودار لاش اور گندہ مادہ میں تبدیل ہوگا مگر وہ بدمعاش اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے۔

قولہ: "یختل الدنیا بالدین" بکسر التاء ختل دھوکے کو کہتے ہیں خصوصاً جبکہ بھیڑیا اپنے شکار کے لئے چھپ کر حملہ کرتا ہے تو کہا جاتا ہے خَتَلَ الذئبُ الصیدَ، مطلب واضح ہے اور آج کل اس کی امثلہ دیکھنا بہت آسان ہے۔

قولہ: "یختِل الدین بالشبہات" ابن العربیؒ عارضة الاحوذی میں لکھتے ہیں "کلما عرضت له مسئلة یحرمها الشرع اعتمد علی شبهة فیها فَاَحَلَّها" یعنی جب کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جائے جو حرام ہو مگر اس میں ایک پہلو بظاہر جواز کا معلوم ہوتا ہو تو یہ شخص اسی پہلو اور شبہ کا فائدہ اٹھا کر اس مسئلہ کو جائز قرار دے کر اس پر عمل کرتا ہے، امور مشتبہ پر تفصیلی بحث (تشریحات ترمذی جلد:۵ ص:۱۲۱) پر بیوع کے پہلے باب میں گذری ہے۔ غرض جو شخص لالچ، خواہشات اور حرص کے درپے ہو وہ بُرا ہی ہے۔

حدیث آخر: ۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ جو مؤمن کسی بھوکے مؤمن کو کھانا کھلائے تو اللہ اس کو قیامت کے دن جنت کے پھلوں سے کھلائے گا، اور جو مؤمن کسی مؤمن کو پیاس کے وقت (پانی) پلائے گا تو اللہ اسے قیامت کے روز رحیق مختوم سے پلائے گا، اور جو مؤمن کسی ننگے مؤمن کو (لباس) پہنائے گا تو اللہ اس کو جنت کے سبز حلوں سے پہنائے گا۔ (غریب)

قولہ: "رحیق" بروزن رفیق شراب کو کہتے ہیں جبکہ 'مختوم' ختام سے بمعنی مُہر لگی ہوئی یعنی سَر بمہر کو کہتے ہیں۔

قولہ: "عُرِیٍ" بضم العین وسکون الراء مراد عرنی ننگا ہے یعنی جس کے پاس مناسب حال لباس نہ ہو۔

قولہ: "خضر" بضم الخاء وسکون الضاد اخضر کی جمع ہے بمعنی سبز کے کیونکہ یہ خوبصورت رنگ ہوتا ہے یعنی اگرچہ لباس تو ہر جنتی کو ملے گا مگر ایسا شخص بطور خاص سبز حلہ میں ملبوس ہوگا جو امتیازی حسن کا حامل ہوگا جیسے عام پرندوں میں سبز طوطے کا رنگ بہت ہی دلکش ہوتا ہے۔

حدیث ابی ھریرۃؓ: ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ڈرا تو وہ رات کے پہلے پہر میں چلا اور جو اوّلِ شب سے چلا وہ منزل کو پہنچا آگاہ رہو! کہ اللہ کی پونجی گراں قیمت ہے، آگاہ ہو! کہ اللہ کی پونجی جنت ہے۔ (حسن غریب)

قولہ: "اَدلَجَ" رات کے شروع میں نکلا۔

قولہ: "سِلعة" سامان ومتاع اور پونجی کو کہتے ہیں یہاں مراد جنت ہے جیسا کہ آگے تصریح ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دشمن کے لشکر سے بچنے کی غرض سے جو شخص رات کا اندھیرا ہوتے ہی نکلے تو صبح جب دشمن کا لشکر اس بستی میں داخل ہوگا اس کا خاندان بہت دور نکلا ہوگا جہاں تک دشمن کی رسائی ممکن نہیں ہوگی ایسا ہی جو مؤمن ابھی سے اپنی تیاری جاری رکھے گا تو موت کے وقت اللہ کے عذاب سے بہت دور ہوگا۔ اور جنت کی نعمتیں انتہائی گراں قدر مہنگی ہیں وہ قیمت دے کر ہی وصول وحاصل کی جاسکتی ہیں لہٰذا عمل کی صورت میں قیمت ادا کر کے وہ نعمتیں حاصل کیجئے!

حدیث آخر:۔ حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بندہ متقیوں میں سے ہونے کے درجہ تک اس وقت تک نہیں پہنچے گا جب تک نہ چھوڑے اس چیز کو جس میں کوئی حرج (گناہ وکراہیت) نہیں اس چیز سے بچنے کی خاطر جس میں حرج (شبہہ وغیرہ) ہے۔

چونکہ تقویٰ کے تین مراتب ہیں: (۱) ایک کفر وشرک سے بچنا تا کہ عذاب خلود ودائم سے بچے (۲) دوم گناہ سے پرہیز کرنا اگر چہ صغائر ہوں (۳) اور سوم غیر اللہ میں دل لگانے اور تفکر سے بچنا، اس لئے حدیث میں متقین سے درجہ دوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ آدمی جب تک گناہ کے ذرائع واسباب کو نہیں چھوڑے گا وہ متقی نہیں بن سکے گا کیونکہ گناہ کے قریب جانے سے گناہ میں مبتلاء ہونا گویا لازمی سی بات ہے، لیکن زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مراد اس حدیث میں درجہ سوم کے متقی ہیں یعنی جب آدمی لایعنی چیزوں کو چھوڑے گا تو وہ حقیقی متقی بن جائے گا اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں "اتقوا اللّٰہ حق تقاته"۔ (اعراف:۹۶)

حدیث آخر:۔ حضرت حنظلہ اُسیدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم (ہر وقت) ویسے ہی رہو جیسے میرے پاس ہوتے ہو تو فرشتے اپنے پروں سے تم پر سایہ کرنے لگیں گے۔ (حسن غریب)

حنظلہ اُسیدی بالتصغیر کو حنظلہ کاتب بھی کہتے ہیں یہ غسیل الملائکہ کے علاوہ ہیں کوفہ میں حضرت علیؓ کے بعد وفات پائی ہے۔

یہ روایت مختصر ہے مسلم شریف میں پوری روایت اس طرح آئی ہے اور آگے ترمذی میں بھی آرہی ہے کہ حضرت حنظلہؓ کی ملاقات ابوبکر صدیقؓ سے ہوئی ان کے دریافت کرنے پر انہوں نے جواب دیا کہ حنظلہ تو منافق ہوگیا ہے ابوبکرؓ نے فرمایا سبحان اللہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور وہ ہمیں دوزخ وجنت کی یاد دلاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ مناظر ہمارے سامنے ہوں پھر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے نکل آتے ہیں اور بیوی بچوں اور کام کاج میں مصروف ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں، پس ابوبکرؓ نے فرمایا بخدا یہ معاملہ تو میرے ساتھ بھی ہے پس میں اور ابوبکر دونوں چلے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس داخل ہوئے، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ ہم جب آپ کے پاس ہوتے ہیں.... الخ پوری صورت حال بتادی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا! اگر تم اسی حالت پر ہمیشہ ہوتے جو میرے پاس تمہاری حالت ہوتی ہے اور ہمیشہ ذکر کر رہے ہوتے تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور راستوں میں تم سے مصافحہ کرتے لیکن حنظلہ کوئی گھڑی کیسی ہوتی ہے اور کوئی کیسی۔ (ج: ۲ ص: ۳۵۵ باب فضل دوام الذکر والفکر الخ من کتاب التوبۃ)

حدیث آخر:۔ ''اِنَّ لِکُلِّ شیء شِرَّۃً ولکل شِرَّۃٍ فترۃً الخ'' ہر چیز کی ایک تیزی ونشاط ہوتی ہے اور ہر تیزی (کے پیچھے اس) کی کمزوری ہوتی ہے پس اگر وہ نشاط والا میانہ راہ چلے اور حق کے قریب رہے تو اس کی کامیابی کی امید رکھو لیکن اگر اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جانے لگے تو اسے (صالحین کے) شمار میں نہ لاؤ۔ (حدیث صحیح غریب)

قولہ: ''شرۃ'' بکسر الشین وتشدید الراء، تیزی، پھرتی، نشاط، چستی اور حرص کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** ''فترۃ'' بفتح الفاء وسکون التاء ضعف، کمزوری اور سستی کو کہتے ہیں بعض نے شرۃ کو راء کے بجائے دال کے ساتھ یعنی شِدّۃ نقل کیا ہے مطلب دونوں کا ایک ہے۔

قولہ: ''سَدَّد'' بتشدید الدال الاول سدا دراست روی، میانہ روی اور قول وفعل کی درستگی کو کہتے ہیں۔

قولہ: ''فارجوہ'' ای فلاحہ۔

قولہ: ''فلاتعدّوہ'' ای بِمُفلح، پس مطلب یہ ہوا کہ جس شخص کو عبادت اور نیکی کے کام کرنے کے اسباب اور جوش مل جائے تو اگر اس نے راہ راست پر چلنے کی کوشش کی اور چونکہ بالکل سیدھا چلنا تو مشکل ہے لہٰذا اگر وہ قریب الی الحق رہا تو اس کی کامیابی کی امید رکھو کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گا مگر اگر وہ مشار الیہ بالبنان بن جائے یعنی لوگوں میں عزت وشہرت پائے تو پھر اس کو صلحاء وکامیاب لوگوں میں سے شمار نہ کرو کیونکہ وہ اب ریاکاری کا شکار ہو ہی گیا ہے جہاں تک اس کی قوت وشہرت کا تعلق ہے تو وہ بھی ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے

گی یا کم ہو جائے گی کیونکہ ہر ترقی کے بعد تنزلی کا نمبر آتا ہے۔ ہاں جس پر اللہ کا خصوصی فضل ہو تو وہ مستثنیٰ ہے جیسا کہ اگلی حدیث میں ہے غرض عبادت میں بھی افراط و تفریط کے مابین چلنا محفوظ ترین راستہ ہے کہ اس میں دوام بھی نصیب ہوتا ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کو پسند ہے اور یہ طریقہ حُب جاہ سے بھی دور ہے اور شہرت سے بھی کنارہ پر ہے جبکہ نیکی کے کسی عمل میں تیزی لانے کا انجام جلدی شہرت ملنا اور پھر حب مال وحب جاہ کے جال میں پھنسنا ہے، لہٰذا دیگر عبادت گذاروں کی طرح کسی مصنف کو بھی اپنی تصنیفات کی تعداد محض شہرت کی غرض سے نہیں بڑھانی چاہئے کہ یہ اخلاص کے منافی ہے۔ واللہ اعلم

حدیث آخر:۔ "**بحسب امرئٍ من الشر ان یشار الیه بالاصابع فی دین او دنیا الا من عصمه الله**" کسی شخص کی بربادی کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارے کئے جائیں خواہ دین کے بارے میں ہو یا دنیا کے حوالے سے سوائے اس کے جس کو اللہ (بربادی وتباہی سے) بچائے۔

یہ حدیث معلق ہے امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بسند ضعیف اس کی تخریج کی ہے، اور مطلب اس کا یہ ہے کہ شہرت چاہے دینی ہو یا دنیوی جیسے سیاست وغیرہ وہ عموماً آدمی کو وادی ہلاکت کی طرف بہا دیتی ہے کہ ایسے میں آدمی تکبر و دیگر رذائل اخلاق کا شکار ہو جاتا ہے تاہم جسے اللہ تبارک و تعالیٰ محفوظ فرما دیں تو شہرت اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی کیونکہ اللہ والوں کی نظر میں اپنی مدح اور ہجو دونوں برابر رہتی ہیں۔ "**بحسب**" میں باء زائد ہے ای **یکفیه**۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے (سمجھانے کے) لئے ایک چوکور لکیر کھینچی اور اس مربع خط (شکل) کے اندر ایک اور لکیر کھینچی اور ایک خط اس مربع کے باہر کھینچا اور اس خط کے ارد گرد (یعنی دونوں طرف) بھی لکیریں کھینچیں جو درمیان میں تھا پھر آپ علیہ السلام نے فرمایا یہ (مجموعہ) ابن ادم ہے اور یہ (چوکور) اس کی اجل ہے (یعنی موت ہے) جو اسے گھیرے ہوئے ہے اور یہ خط جو درمیان میں ہے انسان ہے اور یہ (ارد گرد کے) خطوط اس کے عوارض ہیں (یعنی آفات اور بلیات) اگر وہ ایک سے بچ جائے تو دوسرا اس کو نوچ دے گا جبکہ (چوکور سے) باہر جانے والا خط اس کی اُمید ہے۔ (حدیث صحیح اخرجہ البخاری ایضاً)

قولہ: "**مربع**" جومیٹری کی اصطلاح میں وہ چوکور خط یا شکل جس کے چاروں اضلاع یعنی کونے اور چاروں گوشے برابر ہوں یہاں یہی مراد ہے۔

قوله: "هذا ابن آدم" یعنی یہ شکل اور خصوصاً درمیان والا خط انسان کی مثال ہے۔

قوله: "عروضه" یعنی انسان کو کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور موت سے قبل اسے ان آلام ومصائب نے گھیر رکھا ہے ایک سے بچے تو دوسرا اسے آگھیرتی ہے، اسی گھیراؤ کو نھش یعنی زہریلی چیز کے ڈسنے سے تعبیر کیا کیونکہ یہ تمام مصائب تکلیف دِہ ہیں، ہاں البتہ نہش مطلق دانتوں سے نوچنے کو بھی کہتے ہیں مطلب دونوں کا ایک ہے۔

حدیث پاک کا مطلب بالکل واضح ہے کہ انسان کئی خطرات سے گھرا ہوا ہے اس کے ہر جانب مسائل ہی مسائل اور مصائب ہی مصائب ہیں اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے نجات حاصل کرلے تو دوسرے کا نمبر آتا ہے اسی کشمکش میں زندگی گذرتی رہتی ہے یہاں تک کہ موت کا نمبر آتا ہے جس نے اس کو چاروں اطراف سے گھیر رکھا ہے مگر ناداں انسان کی امیدیں موت کے دائرہ سے باہر ہیں وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے اور سارے یا اکثر منصوبے ادھورے رہ جاتے ہیں۔
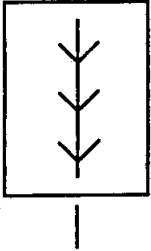
سامان سو برس کا ہے، پل کی خبر نہیں

مثال کی تقریب الی الفہم کی غرض سے شکل پیش ہے:

(طول امل سے متعلق بحث راقم کی کتاب "نقش قدم" میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

حدیث آخر:۔ "يهرم ابن آدم وتشبّ منه اثنتان الحرص على المال والحرص على العمر". (حديث صحيح اخرجه الشيخان وغيرهما)

آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے جبکہ اس کی دو خصلتیں جوان ہو جاتی ہیں ایک مال کی حرص دوسرے عمر (زندگی) کی حرص۔

قوله: "يهرم" بفتح الراء، ہرم کمزوری اور بڑھاپے کو کہتے ہیں۔

قوله: "تشِبُّ" بتشدید الباء شباب سے ہے بمعنی جوان ہونے کے۔

قوله: "منه" ای من اخلاقه وملكاته یعنی اس کے اخلاق وخصال میں دو چیزیں ایسی ہیں جو آدمی کے بوڑھے ہو جانے کے باوجود طاقت ور رہتی ہے چنانچہ بوڑھا آدمی مال کے شوق اور عمر کی محبت ولگن میں کسی طرح جوان آدمی سے پیچھے نہیں ہوتا اگرچہ اس کے جسم پر زوال کے بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں غرض ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقیقت حال کو تسلیم کرنا اور اس پر نظر کرنا چاہئے تاکہ موت کی گھنٹی سن کر کچھ تیاری کی جائے۔

حدیث آخر:۔ مُثِّلَ ابن آدم والیٰ جنبه تسعة وتسعون مَنِيَّةً ان اَخطأتهُ المنايا وقع فی الهَرَم". (حسن صحیح)

آدم زاد کو بنایا (یعنی پیدا کیا) جاتا ہے دراں حالیکہ اس کے پہلو میں (یعنی اردگرد) ننانوے اموات (مہلکات) ہیں اگر یہ سب چوک جائیں تو بالآخر وہ بڑھاپے میں مبتلا ہو جاتا ہے (یہاں تک کہ مرجاتا ہے)۔

یہ حدیث ابواب القدر میں گذری ہے دیکھئے (تشریحات ترمذی ج: ششم ص: ۴۹۷، ۴۹۸ باب بلاترجمہ) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی انسان موت سے نہیں بچ سکتا اگرچہ وہ ہر بیماری کا علاج کرواتا رہے لیکن بالآخر بڑھاپا ایک ایسا مرض ہے جس کی گرفت سے وہ کبھی بھی بچ نہیں سکے گا وہاں اس پر یہ اضافہ ہے "حتی یموت"۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے جب دو تہائی رات گذر جاتی اور فرماتے اے لوگو! اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو! آ گئی لرزانے والی چیز (نفخہ اولیٰ) اس کے درپے ہے دوسری (نفخہ ثانیہ) موت اپنے اندر (چھپے ہوئے برزخ وقیامت) کے احوال لئے ہوئے آ گئی، موت اپنے احوال کے ساتھ آ گئی حضرت اُبیؓ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں آپ پر بہت درود پڑھتا ہوں تو میں (بجائے دعاء کے) کتنا درود پڑھ لیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنا تم چاہو! میں نے کہا چوتھائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنا تم چاہو! تاہم جتنا زیادہ پڑھو گے تو اتنا زیادہ بہتر ہوگا (تیرے لئے) میں نے کہا پھر آدھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیری مرضی اگر زیادہ کرو گے تو وہ زیادہ مفید ہوگا! میں نے عرض کیا تو دو تہائی پڑھ لیا کروں گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جتنا چاہو اگر تم نے زیادہ کرلیا تو وہ افضل ہوگا! میں نے کہا بس میں اپنی دعاء کے بجائے تمام اوقات میں آپ پر درود پڑھوں گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تیرے سب کام پورے کر دیئے جائیں گے اور تیرے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ (حسن)

قولہ: "الراجفة" رجف سے بمعنی لرزنے اور کانپنے کے چونکہ پہلی بار صور پھونکنے سے ساری دنیا لرز اٹھے گی اس لئے اسے راجفہ کہا اور اس کے بعد ایک نفخہ دوسرا بھی ہوگا کہ جو لوگ پہلے نفخہ سے مر گئے تھے وہ اور باقی سب لوگ دوسرے سے زندہ ہو جائیں گے اس لئے اسے رادفہ کہا جیسے ردیف وہ شخص جو سواری کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہو کہلاتا ہے۔

قولہ: "جاء الموت بمافیہ" باء بمعنی مع کے ہے یعنی مع مافیہ یعنی جان نکلنے کی تکلیف قبر کے کٹھن حالات اور مابعد کے احوال۔

چونکہ یہ ارشاد آپ علیہ الصلوٰۃ السلام نے رات کے آخری پہر میں فرمایا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ آپ کے مخاطبین سوئے ہوئے لوگ ہیں خواہ وہ کسی بھی زمانہ کے ہوں یعنی خواب ضرورت کے بعد مزید سونا خواب غفلت کے زمرے میں آتا ہے اور کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ ہولناک واقعات کے آنے کا یقین کرنے کے باوجود سوتا رہے اور تیاری سے اور اللہ کی یاد سے غافل رہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے سوال کا مقصد یہ ہے کہ میں رات کو نماز پڑھتا ہوں اور اپنے لئے دعاء مانگتا ہوں اور آپ پر درود پڑھتا ہوں تو دعاء کے مقابلے میں یا نماز کے مقابلے میں درود پڑھنے کا حصہ کتنا مقرر کرلوں؟ مثلاً دو گھنٹوں کے معمولات میں چوتھائی یعنی آدھا گھنٹہ؟ اور جواب کا مطلب واضح ہے۔

قولہ: "اذاً تکفیٰ همک" تکفیٰ فعل مجہول کا صیغہ ہے دو مفعولین چاہتا ہے اوّل مرفوع نائب فاعل اور دوم منصوب، یہاں مفعول اول "انت" ہے اور همک مصدر مبنی للمفعول مفعول ثانی منصوب ہے ھم قصد وارادے کو کہتے ہیں مگر مبنی للمفعول کی صورت میں بمعنی مھموم یعنی کام ہوگیا کیونکہ کام کا ارادہ کیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ جب تم پورا وقت درود پڑھنے میں لگاؤ گے تو تیرے دنیا وآخرت کے سارے کام من جانب اللہ پورے کردیئے جائیں گے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "استحیوا من اللہ حق الحیاء الخ" اللہ سے ایسا ہی شرماؤ جیسا اس سے شرمانے کا حق ہے! ہم نے کہا اے اللہ کے نبی الحمدللہ ہم تو حیاء کرتے ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیاء کا اتنا سا حق نہیں (یعنی یہ حقیقی حیاء نہیں) بلکہ بھرپور حیاء اللہ سے یہ ہے تم سر اور جو کچھ اس میں ہے کی حفاظت کرلے (یعنی نگہداشت کی جائے) اور پیٹ کی اور جس کو پیٹ شامل ہے کی حفاظت کرلے، اور تم موت اور ہڈیوں کے گل سڑ جانے کو یاد رکھے اور جو شخص آخرت (کا ثواب) چاہتا ہے وہ دنیا کی زیبائش چھوڑ دیتا ہے، پس جس نے ایسا کیا تو بے شک اس نے (حقیقی) حیاء کی یعنی اللہ سے شرمانے کا حق ادا کیا۔ (غریب)

قولہ: "وَعَی" وَعی حفاظت کرنے اور جمع کرنے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ سر کے اندر کے تمام حواس جیسے آنکھیں، کان اور دماغ وغیرھا حتیٰ کہ افکار وتصورات کو بھی گناہ سے بچائے رکھے۔

قوله: "حَوَیٰ" حوی الشیء کے معنی قبضہ کرنے اور مشتمل ہونے کے آتے ہیں یعنی جو چیز پیٹ سے متعلق ہے جیسے شرمگاہ اور خواہشات ان کو قابو میں رکھنا۔

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور باقی صحابہ کرامؓ نے جو فرمایا کہ ہم تو حیاء کرتے ہیں تو اس سے مراد حیاء کا عام مفہوم ہے کہ ہم تو گناہ سے اپنے اعضاء بچاتے ہیں جبکہ آپ علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میری مراد حیاء کا اعلیٰ درجہ اور حقیقی حیاء ہے کہ آدمی سرتاپا اپنے ظاہر و باطن سب کو اللہ کے حکم کا تابعدار و فرمان بردار بنائے اور کسی لحہ سرتابی و حکم عدولی نہ کرے تو وہ شخص دراصل حقیقی حیاء دار ہے۔ ایسے شخص کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ دنیا کی زیب و زینت کے بجائے فکر آخرت میں مستغرق اور بحرِ محبت باری تعالیٰ میں غرق ہوگا، وہ نہ تو لوگوں سے داد وصول کرنے کا سوچتا ہے اور نہ ہی ان کے عتاب سے کوفتہ ہوجاتا ہے۔ یقیناً ایسا شخص اللہ والا ہوتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "الکَیّس من دَان نفسَه وعمل لمابعدالموت، والعاجز من اَتبَعَ نفسَه هَوَاهاو تمنّاعلی الله". (حسن)

عقلمند وہ ہے جو اپنے آپ کا حساب کرتا رہے اور موت کے مابعد (والی زندگی) کے لئے عمل کرے اور ناقص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے تابع بنادے اور اللہ سے توقعات رکھے۔

قوله: "الکیّس" صاحب بصیرت۔

قوله: "دان" دان یدین کے کئی معانی آتے ہیں یہاں مناسب ترجمہ و مطلب وہی ہے جو امام ترمذیؒ نے بیان کیا ہے جسے اوپر ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے یعنی نفس قابو میں رکھنے کے لئے ہر وقت اس کا حساب رکھنا اور اس کی نگہداشت اور نگرانی کرنا۔

قوله: "والعاجز" عجز کے معنی قاصر ہونا خواہ کسی بھی اعتبار سے ہو چونکہ یہ لفظ کیّس کے مقابلہ میں آیا ہے اس لئے مراد بے بصیرت اور بے وقوف بھی لے سکتے ہیں اور "عمل لمابعدالموت" کے مقابل آنے سے بمعنی کم عمل والا بھی مراد ہوسکتا ہے اس لئے اس کا ترجمہ ناقص سے کیا گیا تا کہ دونوں صورتوں کو شامل ہوجائے۔

قوله: "اتبع نفسه هواها" اِتباع سے ہے بمعنی در پے کرنے اور تابع بنانے کے۔

قوله: "وتمنّاعلی الله" یعنی وہ شخص اتنا بے وقوف ہے کہ ایک طرف ہوس کا غلام بن گیا ہے اور

دوسری طرف آخرت اور اس کے اعلیٰ درجات سے آس لگائے بیٹھا ہے، حالانکہ اگر یہ ہوشیار ہوتا تو اپنی حالت کے پیش نظر کہ وہ اپنے نفس سے ہار گیا ہے اور گناہوں میں دُھت ہے استغفار کرتا لیکن استغفار تو کرتا نہیں اور تمنائے کرتا ہے۔

خلاصۂ مطلب: یہ ہے کہ ہوشیار شخص وہ ہے جو حساب اکبر سے پہلے ہی اپنا حساب صاف کر لے اور پوری طرح تیاری کر کے چوکس رہے جبکہ بے وقوف اپنے نفس کے آگے بے بس رہتا ہے نفس کی غلامی چھوڑتا نہیں اور سر پر تاج عزت و جنت سجانے کا یقین رکھتا ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مصلیٰ (جائے نماز) میں داخل ہوئے تو کچھ لوگوں کو دیکھا جو گویا ہنس رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگاہ رہو! اگر تم لذتوں کو یکا یک ختم کر دینے والی چیز (موت) کو کثرت سے یاد رکھتے تو وہ تمہیں اس (ہنسنے) سے جو میں دیکھ رہا ہوں غافل کر دیتی پس ہاذم اللذات کو بہت یاد کیا کرو یعنی موت کو، کیونکہ قبر پر کوئی دن نہیں آتا مگر وہ (قبر) آواز دیتی ہے (یعنی بزبان حال) چنانچہ وہ کہتی ہے میں نامانوسی (وحشت) کا گھر ہوں میں تنہائی کا گھر ہوں، میں مٹی کا (بنا ہوا) گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر (جگہ) ہوں، چنانچہ جب کوئی مؤمن بندہ دفن کر دیا جاتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے ''مرحبا واھلا'' بلاشبہ میری پشت پر چلنے والوں میں تم میرا بہت پیارا تھا پس اب جبکہ میں آج تیرے کام کی متولی ہوئی اور تو میری طرف آ گیا تو بہت جلد دیکھے گا میرا احسن سلوک تجھ سے، پس وہ تا حد نگاہ کشادہ ہو جاتی ہے اور اس کے لئے جنت کی طرف سے ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

اور جب فاجر یا فرمایا کہ کافر آدمی کو دفنایا جاتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے: تجھے کوئی خوش آمدید نہیں! آگاہ ہو! تم مجھے میری پیٹھ پر چلنے والوں میں سب سے بُرا لگتا تھا تو جب آج تجھ کو میری تحویل میں سونپا گیا ہے اور تو میرے پاس آ گیا تو بہت جلد تم دیکھو گے میرا سلوک تجھ سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس قبر اس پر (دونوں طرف سے) جُڑ جاتی ہے یہاں تک کہ دونوں جانب سے اس پر مل جاتی ہے، اور اس کی پسلیاں آر پار ہو جاتی ہیں راوی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے بعض کو (یعنی ایک ہاتھ کو) بعض (یعنی دوسرے ہاتھ کی انگلیوں) میں داخل کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر ستر اژدہا مقرر کر دیئے جاتے ہیں اگر ان میں سے ایک بھی زمین پر پھونک مار دے تو رہتی دنیا تک کبھی نہ اُگائے گی کوئی چیز (گھاس وغیرہ) پھر وہ اژدھے اس کو دانتوں سے کاٹتے ہیں اور نوچتے ہیں یہاں تک کہ لے جایا جائے

گا اسے حساب کی طرف راوی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ (حدیث غریب)

قولہ: "مصلاہ" ملا علی قاریؒ مرقات میں فرماتے ہیں کہ بظاہر مراد جنازہ گاہ ہے کہ آپ علیہ السلام جنازہ دیکھتے وقت فکرمند و کم گو نظر آتے۔

قولہ: "یکتشرون" بمعنی یضحکون کے ہے تاہم کشر بالشین وہ ہنسی کہلاتی ہے جس میں دانت نظر آتے ہوں۔ پھر راوی کا یہ کہنا کہ "کانھم" اس کی طرف مشیر ہے کہ وہ لوگ کاشرین نہ تھے مگر چونکہ وہ ہشاش بشاش تھے اس لئے گویا کہ وہ ہنس رہے تھے۔

قولہ: "ھاذم اللذات" مراد موت ہے ھذم تیزی سے کاٹنے اور جلدی کھا کر ختم کر دینے کو کہتے ہیں جبکہ ھدم دال مہملہ کے ساتھ مسمار کرنے اور ڈھانے کو کہتے ہیں۔ موت سے ساری لذتیں یکبارگی ختم ہو جاتی ہیں۔

قولہ: "انا بیت الغربۃ" یعنی اپنے لئے ساتھی کا انتظام کرلو جو کہ نیک عمل ہے۔

قولہ: "الفاجر او الکافر" لفظ او راوی کے شک کے لئے ہے اگر فاجر سے مراد کامل فاجر لیا جائے تو بمعنی کافر بن جائے گا تاہم عصاۃ المؤمنین کے لئے بھی عذاب قبر ثابت ہے جیسا کہ شرح عقائد اور اس کے متن میں تصریح ہے اور ابواب الجنائز میں بھی گذرا ہے۔

قولہ: "وتختلف اضلاعہ" ضلع پسلی کو کہتے ہیں اور تختلف کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جانبین کی پسلیاں آپس میں مل جاتی ہیں اور گڈمڈ ہو جاتی ہیں اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر چلی جاتی ہیں۔

قولہ: "یُقیّض" مسلط کر دیئے جاتے ہیں قیض اصل میں انڈے کے چھلکے کو کہا جاتا ہے۔

قولہ: "تِنّینا" بکسر التاء وتشدید النون المکسورۃ بمعنی اژدھا کے۔ قولہ "فینھشہ" دانتوں سے نوچنے کو اور خدش زخمی کرنے کو کہتے ہیں یعنی وہ اسے کاٹتے اور ڈستے رہتے ہیں۔ تفصیل جنائز میں گذری ہے۔

قولہ: "فی حدیث عمر رضی اللہ عنہ فاذا ھو متکیٔ علی رملِ حصیر فرأیتُ اثرہٗ فی جنبہ" وفی الحدیث قصۃ طویلۃ".

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بُنی ہوئی چٹائی پر تکیہ لگائے تھے چنانچہ میں نے بناوٹ کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر دیکھا۔

حصیر چٹائی کو کہتے ہیں جبکہ رمل بفتح الراء وسکون المیم چٹائی کی پتیوں کی بناوٹ اور بُنائی کو کہتے ہیں اور کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کے جسد اطہر اور چٹائی کے درمیان کسی بستر، فرش یا کپڑے کا واسطہ نہ تھا بلکہ آپ علیہ السلام زمین پر بچھائی ہوئی چٹائی یا چار پائی پر بغیر کسی نرم کپڑے کے لیٹے ہوئے تھے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو مبارک پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آرہے تھے خاص کر جب بغیر قمیص کے آدمی لیٹ جائے تو نشانات واضح بنتے ہیں، اس سے آپ علیہ السلام کا زھد ثابت کرنا مراد ہے۔ کہ سید الکونین ہوتے ہوئے بھی سہولت وآسائش سے بچے رہے، یہ حدیث پوری تفصیل کے ساتھ صحیحین میں بھی آئی ہے اور خود امام ترمذیؒ نے ابواب التفسیر میں سورۂ تحریم میں ابن عباسؓ سے نقل فرمائی ہے جو''اِن تَتُوْبَا الی اللّٰہ فقد صَغَت قُلُوبُکُما'' (الآیۃ) کا مصداق پوچھنے کے لئے موقعہ کی تلاش میں تھے پس ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے وضوء کے دوران پانی ڈالتے وقت پوچھنے کا موقعہ مل گیا جس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے پورا قصہ بیان فرمایا کماسیأتی ان شاءاللہ۔

حدیث عمرو بن عوفؓ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ بن جراحؓ کو بھیجا، تو وہ بحرین سے کچھ مال لے کر آئے تو انصار نے ابوعبیدہؓ کی آمد کے بارے میں سُنا، چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز میں آکر شریک ہوئے پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تو (لوگوں کی طرف) متوجہ ہوئے اور (دوسری طرف) ان لوگوں نے خود کو پیش کرنے کا تأثر دیا چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو مسکرائے اور پھر فرمایا میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں نے سُنا ہے کہ ابوعبیدہ کچھ مال لائے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خوشخبری سنو اور توقع رکھو (یعنی کہ وہ آئے ہیں اور تمہیں امید رکھنی چاہئے) اس کی جو تمہیں خوش کرے گا (یعنی مال) بخدا! میں تم پر فقر سے نہیں ڈرتا بلکہ میں تم پر اس سے ڈرتا ہوں کہ تمہارے لئے دنیا اس طرح کشادہ کردی جائے گی جیسے تم سے اگلوں کے لئے پھیلا دی گئی تھی، پھر تم بھی اس میں دلچسپی لینے لگو گے جیسے وہ لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے تھے پھر دنیا تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کردے گی جیسے ان کو ہلاک کیا۔ (حدیث صحیح اخرجہ الشیخان)

قولہ: ''فوافوا'' بمعنی أتوا۔

قولہ: ''فتعرضوا'' تعریض کسی کلام یا کام کی آڑ میں مقصد کو اُجاگر کرنے کو کہتے ہیں جیسے کوئی غریب آدمی امیر کی ملاقات کرے اور کہے کہ میں سلام کرنے کے لئے آیا ہوں، اور مقصد پیسے وصول کرنا ہو۔

قوله: "املوا" امل یا تامیل سے ہے توقع اور امید کو کہتے ہیں۔ **قوله:** "فتنافسوها" اس میں ایک تاء محذوف ہے تنافس کسی چیز کی طرف میلان کو کہتے ہیں۔

حدیث کا مقصد واضح ہے کہ غربت پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے اس میں بگڑ جانے کا خطرہ کم رہتا ہے جبکہ مالداری پر صبر کرنا مشکل ہوتا ہے اور عموماً مالداری سے آدمی بگڑ جاتا ہے اِلّا یہ کہ کوئی بہت ہی مضبوط ایمان کا حامل اور صفت زہد میں کامل ہو چنانچہ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"قال الصحابة في الحديث الصحيح: اُبتلينا بالضراء فصبرنا و اُبتلينا بالسراء فلم نصبر، وقد قال العلماء يصبر على البلاء كُل مؤمن ولا يصبر على العافية اِلّا صديق" صبر کی تفصیل پیچھے گذری ہے۔

(تشریحات ترمذی: ج:۶ ص:۳۰۸ "باب ماجاء فی الصبر")

حوالہ بالا میں پہلا مقولہ ترمذی میں اگلی حدیث سے پیوستہ حدیث میں بھی ہے۔

حدیث آخر: حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مانگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (یعنی مال) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطاء کیا مجھ کو، میں نے پھر مانگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دیا، میں نے پھر طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ادا کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے حکیم! یہ مال ہرا بھرا ہے (یعنی خوشنما ہے) میٹھا میٹھا ہے پس جس نے سخاوت نفس سے لیا (یعنی بغیر سوال و اصرار و لالچ کے) تو اس کے لئے اس میں برکت دی جاتی ہے اور جو شخص اسے قلبی لالچ و طمع سے حاصل کرتا ہے تو اس کے لئے اس میں برکت نہیں دی جاتی اور وہ اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جو کھائے مگر اس کا پیٹ نہ بھرے اور اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نچلے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے، پس حکیمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! قسم ہے اس کی جس نے آپ کو سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے میں آپ کے بعد کسی کا مال کچھ نہ گھٹاؤں گا (یعنی کسی سے کچھ بھی نہیں لوں گا) یہاں تک کہ دنیا سے جُدا ہو جاؤں (یعنی مر جاؤں) چنانچہ پھر ابو بکرؓ حکیم کو عطایا لینے کے لئے بلاتے مگر وہ لینے سے انکار فرماتے، پھر عمرؓ ان کو بلاتے تا کہ ان کو (ان کا حق) دے دیں مگر وہ کسی بھی چیز کو قبول کرنے سے انکار فرماتے، پس عمرؓ نے فرمایا اے مسلمانوں کے گروہ! میں تمہیں حکیم پر گواہ بناتا ہوں کہ میں ان کا حق ان کو پیش کرتا ہوں اس فئی (غنیمت) میں سے مگر وہ لینے سے انکار کرتے ہیں چنانچہ حضرت حکیمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں کی کوئی چیز نہ گھٹائی (یعنی کچھ بھی قبول نہ کیا) یہاں تک کہ

وفات پائی۔ (حدیث صحیح)

قولہ: "باشراف النفس" یعنی لالچ کے ساتھ لینا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد دینے والے کی ناخوشی ہو۔

قولہ: "لاارزأ" ای لاانقص بالطلب۔

قولہ: "بعدک" یعنی آپ علیہ السلام کی وفات کے بعد کیونکہ آپ علیہ السلام کے ہاتھ مبارک سے لینے میں برکت تھی اور قبول نہ کرنے میں سوء ادب کا اندیشہ تھا اس لئے بعد ہذا نہیں کہا بلکہ "بعدک" فرمایا حضرت حکیم مؤلفۃ القلوب میں سے تھے مگر جو بات کہی اس پر سختی سے عمل کیا کما تریٰ۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سختی کی حالت (فقروفاقہ) میں آزمائے گئے تو ہم نے صبر کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم آسودگی میں آزمائے گئے تو ہم صبر نہ کرسکے۔ (حسن)

قولہ: "ضراء اور سراء" دونوں متضاد معنوں کے الفاظ ہیں دونوں مؤنث کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ سراء کے معنی خوش حالی اور مسرت وشادمانی کے آتے ہیں جبکہ ضراء تکلیف کی حالت کو کہتے ہیں جیسے غربت ومسکنت یا بیماری یہاں مراد فقروفاقہ ہے۔ یہاں صبر کے تینوں معانی کو ملحوظ رکھا جائے یعنی صبر عن المعصیت، صبر علی المصیبت اور صبر علی الطاعت، حدیث کا مطلب آسان بھی ہے اور پہلے بھی دو دفعہ گذرا ہے۔ فلیحفظ

حدیث آخر:۔ جس کا مقصود آخرت ہو تو اللہ اس کے دل میں بے نیازی ڈال دیتا ہے اور اس کے کاموں کو یکجا کر دیتا ہے (یعنی آسان بنا دیتا ہے) اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہوکر آتی ہے، اور جس کا مقصود دنیا ہو تو اللہ اس کی محتاجی اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس کے کاموں کا شیرازہ بکھیر دیتا ہے اور دنیا نہیں آتی اس کے پاس مگر صرف وہ (آتی ہے) جتنی مقدر ہو۔

قولہ: "ھمّۃ" کانت کی خبر ہے علی ھذا اسے منصوب پڑھا جائے گا نیت اور قصد کے معنی میں آتا ہے۔

قولہ: "شملہ" اس کے کئی معانی آتے ہیں یہاں بمعنی شیرازہ یعنی انتظام کے ہے، پس مطلب حدیث کا یہ ہوا کہ جو شخص آخرت کو اپنا مقصود ومطلوب بناتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا انتظام غیب سے کر دیتا ہے بایں طور کہ تھوڑی سی سعی اور محنت اس کی ضروریات کے لئے کافی بنا دیتا ہے جبکہ دنیا کو مقصد بنانے والے کے انتظامات کو خراب کر دیتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ عبدالدینار وعبدالدنیا بیچارے کے پاس نماز پڑھنے کا وقت بھی نہیں ہوتا ساری زندگی بھاگ دوڑ میں گذر جاتی ہے اور خالی ہاتھ قبر میں جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ

اس حدیث پر امام ترمذیؒ نے کوئی حکم نہیں لگایا ہے تاہم اس کی سند میں یزید رقاشی کو حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ضعیف قرار دیا ہے جبکہ امام منذریؒ نے الترغیب والترھیب میں ''لا باس بہ '' کہا ہے۔ (کذا فی تحفۃ الاحوذی)

باب کی آخری حدیث:۔ (یہ حدیث قدسی ہے) اللہ فرماتے ہیں اے ابن آدم! تم میری عبادت میں مصروف رہو تو میں تیرا سینہ بے نیازی سے بھردوں گا اور تجھ سے محتاجی کو دور رکھوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا (یعنی میری عبادت کے لئے خود کو فارغ نہیں کرے گا) تو میں تیرے دونوں ہاتھوں کو (محنت و مزدوری کی) مصروفیات سے بھردوں گا اور تیرے فقر و فاقہ (محتاجی) کو دور نہیں کروں گا۔ (حسن غریب وقال الحاکم صحیح الاسناد)

چونکہ سب لوگ محتاج پیدا ہوتے ہیں اس لئے فقر و فاقہ اور محتاجی دور نہ کرنے سے آدمی خود بخود محتاج رہ جائے گا پھر وہ کمانے کی کوشش کرتا رہے گا مگر اس کا دل بے نیاز نہیں بنے گا بلکہ ہمیشہ محتاج رہے گا کیونکہ اصل غنا تو دل کا ہوتا ہے۔ جبکہ عبادت گذار کو اللہ قلیل پر صبر عطاء کرتا ہے اور دنیا کی چیزوں سے اس کو بے نیاز بناتا ہے۔ **قولہ:** ''اَسُدُّ'' سِد اد بکسر السین سے بمعنی روکنے کے ہے۔

باب

''عن عائشة قالت كان لنا قِرام سَترفيه تماثيل علىٰ بابى فراه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: اِنزَعِيه فانه يذكّرنى الدنيا، قالت: وكانت لنا سَمَلُ قطيفة عَلَمُهَا حرير كنا نَلبَسُهَا''. (حسن صحيح غريب)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہمارے ہاں ایک باریک پردہ تھا جس پر تصویریں تھیں وہ پردہ میرے دروازے پر تھا پس اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا اسے اُتاردو اس لئے کہ یہ مجھے دنیا کو یاد دِلاتا ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس ایک پُرانی جھالردار چادر تھی اس میں ریشم سے نشان (نقوش) بنے ہوئے تھے ہم اسے اوڑھتے تھے۔

قولہ: ''قِرام'' بروزن کتاب باریک پردے کو کہتے ہیں بعض نے اس کا اطلاق اون کے رنگ برنگ خوب ٹھونک کر بنُے ہوئے کپڑے پر بھی کیا ہے، اس کی اضافت ستر کی طرف ثوب قمیص کی طرح ہے۔

قولہ: ''سمل قطیفة'' سمل پرانا کپڑا اور قطیفہ وہ چادر یا کمبل جس کی روئیں اور جھالر نکالے گئے ہوں۔

حضور علیہ السلام نے جس پردہ پر انکار فرمایا اگر اس میں تماثیل سے مراد نقوش ہوں یعنی غیر جاندار کی اشکال ہوں تو نکیر کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ایک گونہ زینت وزیبائش ہے جس کو دیکھ کر دل میں خوشی اور دنیا کی طرف میلان سا محسوس ہوتا ہے، لیکن اگر تماثیل سے مراد جاندار کی تصاویر ہوں تو پھر نفی اور نہی کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ تصاویر خواہ وہ کسی بھی جاندار کی ہوں ناجائز ہیں۔ اس لئے ان کی گھر میں رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں، آج کل کی الیکٹرونک تصاویر بھی تصویر محرم میں داخل ہیں راقم کی اس پر مستقل کتاب بنام "شعاعی تصاویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت" ہے اگرچہ خواہش کے لئے کمزور فتویٰ بھی کافی ہوجاتا ہے۔ جہاں تک ریشم کے استعمال کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ ابواب اللباس کے شروع میں گذرا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۵۳۱ ج:۵)

حدیث آخر:۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ تکیہ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹتے (یا ٹیک لگاتے) تھے چمڑے کا تھا، بھرتی اس کی کھجور کی چھال تھی۔ (حدیث صحیح حسن)

قولہ: "وسادۃ" سر کے نیچے رکھنے کی چیز جیسے تکیہ کو بھی کہتے ہیں اور غالیچہ یعنی فرش کو بھی کہا جاتا ہے یہاں معنیٰ دوم لینا زیادہ ظاہر ہے بقرینۂ یضطجع کے۔

قولہ: "حشو" اندر کی چیز یعنی جس سے کسی چیز کی بھرائی کی جائے جیسے تکیہ اور لحاف میں روئی۔

قولہ: "لیف" کھجور کی چھال۔

سبحان اللہ زہد کا اس سے بڑا نمونہ کیا ہوسکتا ہے جو ساری زندگی ایسی گذر جائے کہ نرم گدے وبستر پر ایک رات بھی نہ سوئے اگر آپ چاہتے تو دنیا کیا بلکہ جنت کے نمونے بھی آپ کی خدمت میں پیش ہوسکتے تھے مگر وہ دنیا والوں کی طرح نہ تھے کہ دوسروں کو صبر کی تلقین کریں اور خود نرم قالین کا استعمال کریں، آپ علیہ السلام نے مسلسل زہد کا بے نظیر عملی نمونہ پیش کیا جو دنیا کے سامنے کھلی کتاب ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اس سے کتنا بچ گیا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا اس سے سوائے ایک شانہ کے کچھ نہیں بچا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ساری باقی رہی سوائے اس کے شانہ کے۔ (حدیث صحیح)

چونکہ انہوں نے ایک بازو، وشانہ گھر کے لئے پکانے کی غرض سے چھوڑ کر باقی پورا گوشت صدقہ کیا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کا کیا ہوا سارا باقی ہے کہ اس پر ثواب مل گیا اور ثوابؒ باقی ہوتا

ہے جبکہ خود کھا کر استعمال والا حصہ کھا کر ختم ہو جائے گا۔قال اللہ تعالیٰ: "مَاعِندَکُم یَنفَدُ وَمَاعِندَاللہ بَاقٍ" (نحل پارہ:۱۴ آیت:۹۶)

حدیث آخر:۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم ال محمد ایسے تھے کہ ہم پورا پورا مہینہ گذارتے اور آگ نہ جلاتے (یعنی کچھ نہ پکاتے) پس ہماری خوراک صرف پانی اور کھجور تھی۔ (صحیح)

قوله:"اِن کنا ال محمد" اِن مخفف من المثقلہ ہے یعنی اِنّا کنّا الخ۔

اس میں شک نہیں کہ کھجور کا مسلسل استعمال انتہائی مشکل ہے بنی اسرائیل نے تو من وسلویٰ پر بھی صبر نہ کیا تھا مگر آقائے دوجہاں کے گھر والوں نے اگر اس کا اظہار فرمایا ہے تو فقط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد کی حالت بتانے کی غرض سے اور آسودگی سے خوف کے پیش نظر تھا جو اُسوۂ حسنہ کی تعلیم ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہمارے پاس کچھ جو (رہ گئے) تھے پس ہم اس سے کھاتے رہے جتنا اللہ کو منظور تھا، پھر میں نے جاریہ سے کہا کہ اسے ماپ لو چنانچہ اس نے ماپا اسے پھر زیادہ دیر نہ لگائی اس (جو) نے کہ ختم ہوا فرماتی ہیں کہ اگر ہم اس (ناپنے) کو چھوڑتے تو اس سے کھاتے اس سے زیادہ مدت تک۔ (حدیث صحیح)

قوله:"شطر" اس کے معنی امام ترمذیؒ نے بیان کئے ہیں یعنی شیئاً من شعیر۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کیل اور وزن سے برکت گھٹ جاتی ہے جبکہ ایک اور روایت میں کیل کا حکم آیا ہے "کیلوا طعامکم یبارک لکم فیہ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برکت کیل کرنے میں ہے، یہ بظاہر تعارض ہے۔اس کے دو جواب ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ کیل کا حکم خریدنے کے وقت سے متعلق ہے جبکہ ترک کیل گھر میں لانے کے بعد خرچ کے وقت سے متعلق ہے، یہ جواب تحفۃ الاحوذی میں ہے، حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں تطبیق یوں دی ہے کہ پکانے کے لئے جتنا لیا جائے وہ ناپ یا وزن وغیرہ حساب سے لیا جائے اور جو باقی رہے یعنی سٹاک کے طور پر اسے ناپ یا وزن نہ کیا جائے۔

اسی طرح یہ روایت بظاہر دوسری روایت سے بھی متعارض ہے کہ آپ علیہ السلام نے وفات کے وقت کچھ نہ چھوڑا تھا "ماترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عندموتہ دیناراً ولادرھماً ولاشیئاً" اس کا جواب یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے ذاتی ملک میں کچھ نہ چھوڑا تھا جبکہ حدیث باب میں اس شے (جو) کا ذکر ہے جو آپ علیہ السلام نے حین حیات عائشہ صدیقہؓ کی ملک میں دے رکھی تھی یعنی بطور نان نفقہ کے۔

ا/ 2

حدیث آخر:۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ڈرایا گیا ہوں اللہ کی راہ میں ایسا کہ کوئی بھی اتنا خوف زدہ نہیں کیا گیا ہے، اور میں ایذاء دیا گیا ہوں ایسی کہ ایذاء نہیں دیا گیا ہے کوئی۔ اور بے شک مجھ پر تیس شب و روز گذرے (یعنی لگاتار) دراں حالیکہ میرے اور بلال کے لئے کوئی کھانا نہ تھا جسے کوئی کلیجے والا (جاندار) کھائے سوائے اس معمولی شے کے جسے بلال کے بغل نے چھپا دیا تھا۔ (حسن صحیح)

اس حدیث میں "اُخِفتُ یُخاف اور اُوذیت و یوذی" مجہول کے صیغے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کے اظہار و تبلیغ سے روکنے کے لئے مجھے جتنا ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے ایسی صورت حال کا سامنا کسی کو نہیں کرنا پڑا ہے، چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ میرے اور بلال کے پورے تیس دن کے خرچے کے لئے صرف اتنی چیز تھی جو بلال نے بغل میں دبادی تھی یعنی تھوڑی سی غذاء۔

امام ترمذیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ علیہ السلام حضرت بلالؓ کے ہمراہ مکہ سے بنظر حفاظت نکلے تھے تو اپنے ساتھ اتنا سا کھانا لے گئے تھے جو حضرت بلال کے بغل میں آسانی سے آسکا تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شاید یہ طائف کے سفر کا واقعہ ہوسکتا ہے کیونکہ ہجرت مدینہ میں حضرت بلال آپ علیہ السلام کے ہمراہ نہ تھے جبکہ سفر طائف میں بھی حضرت زید بن حارثہ تھے جیسا کہ محشی نے دیا ہے، تاہم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ بلال کے ہونے سے زید بن حارثہ کی نفی لازم نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہو۔

یہاں بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام کی مدت حیات زیادہ نہ تھی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کو بھی سخت تکلیفات و ایذائیں دی گئی ہیں لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جن انبیاء علیہم السلام نے تکلیفات برداشت کی ہیں وہ اولاً تو تبلیغ کی وجہ سے نہ تھیں مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیفات جبکہ حدیث باب میں اسی پہلو کا ذکر ہے، دوم آپ علیہ السلام کی امت کے افراد کو اور آپ علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ کو بہت ستایا گیا یہ تکلیفات ذاتی تکلیف سے کسی طرح کم نہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا، جس کا علم اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمایا تھا، تو جس طرح باپ اولاد کی تکلیف کو آسانی سے برداشت نہیں کرسکتا تو جو ماں باپ سے زیادہ اولیٰ و شفیق ہو وہ ان تکلیفات کو کیونکر نظر انداز کرسکتا ہے؟

حدیث آخر:۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں کہ میں جاڑے کے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے نکلا جبکہ میں نے ایک بدبودار چمڑا جس کے بال جھڑے ہوئے تھے لیا پس کاٹ ڈالا میں نے اس کو بیچ سے (یعنی اس میں سوراخ کر دیا) اور اس میں اپنی گردن (سر) کو داخل کر دیا اور اپنی کمر میں نے زور سے باندھی (بایں صورت کہ) پس باندھا میں نے اس کو کھجور کی شاخ سے، اور مجھے شدید بھوک لگی تھی، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کچھ کھانا ہوتا تو میں کھا لیتا اس میں سے، چنانچہ میں کسی (کھانے کی) چیز کی تلاش کرتا ہوا نکلا سو گذرا میں ایک یہودی پر جو اپنے مال (مویشی اور باغ) میں تھا جو پانی پلا رہا تھا اپنی چرخی سے تو میں نے دیوار کے سوراخ سے اس کو جھانکا اس نے کہا: اے اعرابی! کیا (دیکھتا) ہے؟ کیا تو ایک کھجور پر ڈول کھینچے گا؟ میں نے کہا: ''ہاں'' تم دروازہ کھولو تاکہ میں اندر آسکوں! اس نے دروازہ کھولا اور میں اندر گیا چنانچہ اس نے مجھے وہ ڈول تھما دیا، تو جب میں ایک ڈول نکالتا تھا تو وہ مجھے ایک کھجور دیتا تھا، یہاں تک کہ جب میری مٹھی بھر گئی تو میں نے اس کا ڈول چھوڑ دیا اور میں نے کہا کہ بس یہ میرے لئے کافی ہے میں نے وہ کھجور کھائی اور پھر دو تین گھونٹ پانی پیا اور مسجد آ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں موجود پایا۔ (حسن غریب)

قولہ: ''شات'' ای بارِد۔

قولہ: ''من بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' شاید یہ ہجرت کے ابتدائی ایام کی بات ہو کہ جب حضرت علیؓ کی شادی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی پردے کے احکام نازل ہوئے تھے، واللہ اعلم۔

قولہ: ''اِھاباً'' بغیر دباغت والا چمڑا یا مطلق کھال۔

قولہ: ''معطوناً'' جس میں بدبو بھی ہو اور بال بھی جھڑ گئے ہوں۔

قولہ: ''فخزمتہ'' شدّ دث کا بیان ہے یعنی میں نے اس کو کھجور کے پتے (شاخ) سے اپنی کمر پر باندھ لیا تاکہ وہ سمٹ جائے۔

قولہ: ''بکرۃ'' بکرہ چرخی کو کہتے ہیں جس سے رسی بندھی ہوئی ہوتی ہے اور اسے گھما کر ڈول کھینچا جاتا ہے۔

قولہ: ''ثُلمۃ'' بروزن لقمۃ سوراخ اور دراڑ کو کہتے ہیں۔

قولہ: ''جرّعۃ'' تجرّع تھوڑا تھوڑا پینا یعنی گھونٹ گھونٹ پینے کو کہتے ہیں۔

اس روایت سے صحابہ کرامؓ اور خصوصاً مہاجرین کی قربانیوں اور سختیاں جھیلنے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ

حضرت علیؓ ایک طرف سردی سے بچنے کے لئے غیر مدبوغہ چمڑا جس سے بدبو بھی آتی ہو کو قمیص نما بنا کر سردی سے بچنے کا انتظام کر رہے ہیں اور دوسری طرف بھوک کا یہ عالم ہے کہ ایک کھجور پر یہودی کے لئے ایک ڈول پانی کھینچ رہے ہیں، یہ سب تکلیفات انہوں نے دین کی خاطر برداشت کیں گویا وہ خود کو مٹا کر دین کو بچانا چاہتے تھے مگر اللہ نے دین کے ساتھ ان کو بھی ابدی حیات طیبہ سے نوازا۔ ان اللہ لایضیع اجر المحسنین

یہ تو عام مہاجرین کا حال تھا جہاں تک اصحاب صفہ کی حالت کا تعلق ہے تو وہ ناقابل تصور حد تک صبر آزما ہے جس کی ایک جھلک آئندہ ابوہریرہؓ کی حدیث میں نظر آرہی ہے کہ اُنہیں شدید بھوک لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک ایک کھجور عطا فرمائی۔

حدیث آخر:۔ حضرت جابر بن عبداللہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بھیجا جبکہ ہم تین سو لوگ تھے ہم اپنا توشہ اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے تھے (یعنی ہر ایک کے پاس معمولی زادراہ تھا) چنانچہ وہ توشہ بھی ختم ہونے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم میں سے ہر آدمی کو دن میں صرف ایک کھجور ملتی تھی، ان سے پوچھا گیا کہ اے ابا عبداللہ! آدمی کے لئے ایک کھجور سے کیا بنتا ہوگا؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ ہم نے تو اس (ایک کھجور) کا فقدان بھی پایا (یعنی وہ ایک ایک بھی ملنا بند و ختم ہوا) کہ جب وہ سب ختم ہوئی۔ پس ہم سمندر کے (ساحل کے) پاس آئے تو یکایک وہاں ایک مچھلی ہمیں ملی جو سمندر نے پھینک دی تھی تو اس سے ہم اٹھارہ دن تک کھاتے رہے جتنا ہم چاہ رہے تھے۔ (حسن صحیح)

یہ روایت بخاری شریف میں متعدد مواضع پر آئی ہے جس کے مطابق اس سریہ کے امیر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے متعلق بحث کہ آیا سمندری جانور سب کے سب حلال ہیں یا صرف مچھلی جائز و حلال ہے؟ اسی طرح سمک طافی کا مسئلہ بالتفصیل "باب ماجاء فی البحر انہ طھور" میں گذرا ہے فلانعیدھا۔

(دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۲۳۰ تا ص: ۲۳۶ ج: ۱)

حدیث آخر:۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں مُصعب بن عمیر ہم پر نمودار ہوئے ان کے جسم پر صرف ایک چادر تھی جس میں پوستین کے پیوند لگے ہوئے تھے چنانچہ جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو رونے لگے بوجہ اس نعمت کے جس میں مصعب پہلے تھے (یعنی مکہ میں قبل از قبول اسلام) اور جس میں آج ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کیا حال ہوگا تمہارا کہ جب تم میں سے ایک صبح کو ایک جوڑے میں ہوگا اور شام کو دوسرے میں ہوگا (یعنی دن میں دومرتبہ کپڑے تبدیل کرے گا) اور رکھا جائے گا اس کے سامنے ایک برتن کھانے کا اور دوسرا اٹھایا جائے گا اور تم اپنے گھروں کو پردوں سے اس طرح آراستہ کروگے جیسے کعبہ کو پردوں سے ڈھانپا جاتا ہے (یعنی خوراک وپوشاک کی کوئی کمی نہ ہوگی) صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! پھر تو اُس دن ہم آج کی بہ نسبت زیادہ اچھے ہوں گے کہ ہم عبادت کے لئے بالکل ہی فارغ ہوں گے اور کام کی زحمت سے بھی بچیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" تم آج کے دن بہتر ہو اُن دنوں کی بہ نسبت۔ (حدیث غریب)

قولہ: "بُردۃ" وہ چادر جس میں سیاہ وسفید رنگ ہوں۔

قولہ: "مرقوعۃ" اس میں پیوند لگے تھے۔ "بفرو" پوستین یعنی چمڑے کے۔

قولہ: "بکی للذی کان فیہ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ رونا زوال نعمت یا تمنائے دولت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ حضرت مُصعب بن عمیر (بضم المیم وفتح العین وعمیر بالتصغیر) کی قربانی کی وجہ سے تھا کہ ناز ونعمت سے زہد ومشقت کے اس درجہ پر پہنچ گئے، یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا خوشی کی بناء پر ہو۔

قولہ: "اذاغدا" ای ذھب اسی طرح "راح" بمعنی ذھب کے آتا ہے البتہ غدا صبح جانے کو اور راح بعد الزوال جانے کو کہتے ہیں یعنی صبح ایک جوڑا پہنے گا اور شام کو دوسرا۔ قولہ: "کما تستر الکعبۃ" یہ کعبہ کی امتیازی شان ظاہر کرنا ہے۔

قولہ: "نکفیٰ المؤنۃ" بصیغۂ مجہول یعنی یہ تو بہت اچھا ہوگا کہ جب مال اور خدم نوکر چاکر زیادہ ہوں گے تو ہم عبادت کے لئے فارغ رہیں گے اور کام کی مشقت کے بجائے عبادت میں جہد ومحنت کریں گے۔

قولہ: "لاانتم الیوم خیر الخ" یعنی غربت ومسکنت میں عبادت کی لذت وکثرت کی توقع بمقابلہ غنا، ودولت مندی کے زمانہ کے زیادہ ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے کیونکہ غریب کی امیدیں مختصر اور محنت محدود ہوتی ہیں جبکہ امیر کی آمال ومنصوبہ بندیاں بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں وہ عبادت کے لئے کہاں فارغ ہوتا ہے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر ؓ مکہ میں حسن وجمال اور ہر قسم کے پوشاک کی نعمتوں سے آراستہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے "مارأیت بمکۃ احسن لِمّۃً ولا ارق حُلّۃً ولا انعم نِعمۃً من مصعب بن عمیر" حضرت مصعب بن عمیر کو جب پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو وہاں جا کر اسلام قبول فرمایا اور اپنے ماں باپ اور قوم کے خوف سے اپنے اسلام

کو چھپائے رکھا تا آنکہ ایک دن عثمان بن ابی طلحہؓ نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو ان کی ماں اور قوم کو اطلاع کر دی چنانچہ انہوں نے ان کو قید کر دیا۔ پھر انہوں نے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں بھی شریک رہے بنی عبدالدار سے فقط انہوں نے بدر میں شرکت کی اور سُوَیبِط بن حرملہ نے۔ آپ علیہ السلام نے عقبۂ ثانیہ کے بعد ان کو مدینہ روانہ کیا تھا جو اہل مدینہ کو قرآن پڑھاتے جس کی وجہ سے ان کو قاری و مقرئی کہا جانے لگا انہوں نے ہی مدینہ میں سب سے پہلے جمعہ ادا فرمایا (جس کا مسئلہ پہلے گذرا ہے) ان کے بعد عمرو بن ام مکتوم، عمار بن یاسر، سعد بن ابی وقاص، ابن مسعود و بلال اور پھر حضرت عمر بن خطاب بیس شہسواروں کے ہمراہ مدینہ تشریف لائے رضی اللہ عنہم۔ حضرت مصعب بن عمیر غزوۂ احد میں شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر کوئی چالیس سال کی تھی، زہد کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس صرف ایک چادر تھی جب اس سے سر ڈھانپتے تو پیر کھل جاتے اور جب پیر چھپاتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) ڈال دیں۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "کان اهل الصفة اضياف اهل الاسلام لاياؤون على اهلٍ ولامالٍ الخ" یعنی اہل صفہ مسلمانوں کے مہمان تھے رہائش کے لئے کسی اہل و مال کے پاس نہیں جاتے (کیونکہ مدینہ میں ان کا نہ گھر تھا اور نہ خاندان) اس اللہ کی قسم ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ البتہ میں ٹیکتا تھا اپنا کلیجہ (پیٹ) زمین پر بھوک کی وجہ سے اور باندھتا تھا پتھر اپنے پیٹ پر بھوک کے مارے، تحقیق ایک دن میں ان کے اس راستہ پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ لوگ نکلتے تھے چنانچہ گذرے مجھ پر ابوبکر تو میں نے ان سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا، میں نے ان سے صرف اس لئے پوچھا تھا تاکہ وہ مجھے اپنے ساتھ (کھانے کے لئے) لے جائے مگر وہ چلے گئے اور ایسا نہ کیا۔ پھر عمر گذرے تو میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت پوچھی اور میں نے نہیں پوچھا مگر صرف اس غرض سے تاکہ وہ مجھے اپنے ہمراہ لے جائے تو وہ بھی گذرے اور انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ پھر ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم گذرے تو جب انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو مسکرائے اور فرمانے لگے ابو ہریرہ! میں نے کہا لبیک یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے ساتھ چلو، آپ آگے چلے اور ان میں کے پیچھے چل پڑا، آپ اپنے گھر میں داخل ہوئے، تو میں نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا (بھرا ہوا) ایک پیالہ پایا آپ نے پوچھا یہ دودھ کہاں سے ملا ہے آپ لوگوں کو؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ ہدیہ بھیجا ہے ہمارے لئے

فلاں نے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوہریرہ! میں نے کہا حاضرِ خدمت ہوں آپ نے فرمایا جاؤ اہل صفہ کے پاس ان کو بلاؤ، وہ اہل اسلام کے مہمان تھے وہ پڑاؤ نہیں ڈالتے تھے کسی خاندان یا گھر میں، جب آپ کے پاس صدقہ آتا تو آپ سارا ان کے پاس بھیج دیتے اور خود اس سے کچھ بھی نہ لیتے مگر جب آپ کو ہدیہ ملتا تو خود بھی اس سے لیتے تھے اور ان کو بھی اس میں شریک فرماتے، چنانچہ مجھے یہ بات ناگوار گذری (یعنی آپ کا مجھے بھیجنا کہ جاؤ اہل صفہ کو بلاؤ) اور میں نے (دل میں) کہا اس پیالے کی اہل صفہ کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ دوسری طرف میں چونکہ اہل صفہ کو بلانے میں آپ کا قاصد ہوں تو پھر (جب وہ لوگ آئیں گے) آپ مجھے حکم دیں گے کہ میں یہ پیالہ گھماؤں ان سب پر (یعنی پہلے ان کو پلاؤں) تو شاید ہی مجھے اس سے کچھ مل جائے حالانکہ مجھے خوشی ہو چلی تھی کہ مجھے اس سے اتنا ملے گا جو میری بھوک کی کفایت کرے گا، مگر اللہ اور اس کے رسول کے حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ میں ان کے پاس آیا اور ان کو بلایا، پس جب وہ لوگ آپ کے پاس آئے اور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا: ابوہریرہ! یہ پیالہ لو اور ان کو دو (یعنی پلاؤ) چنانچہ میں نے وہ پیالہ لیا اور شروع ہوا میں وہ ایک شخص کو دیتا وہ پیتا یہاں تک کہ سیر ہو جاتا پھر واپس کر دیتا تو میں دوسرے کو دے دیتا یہاں تک کہ میں (اس دور کو پورا کرتا ہوا) اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا جبکہ سب لوگ سیر ہو چکے تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ لیا اور اسے اپنے ہاتھ پر رکھا، پھر آپ نے اپنا سر مبارک (میری طرف) اُٹھایا اور مسکرا کر فرمایا ابوہریرہ! تم پیو تو میں نے پیا آپ نے پھر فرمایا اور پیو چنانچہ میں پیتا جا رہا تھا اور آپ فرماتے جاتے پیو، پیو، پھر میں نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے میں اس کے لئے اور گنجائش نہیں پاتا تو آپ نے وہ پیالہ لیا اور اللہ کی حمد اور بسم اللہ کہی اور پیا۔ (صحیح)

قولہ: "لاعتمد بکبدی...... واشد الحجر علی بطنی" یہ بھوک کا احساس ختم کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے جس کی وجہ پہلے گذری ہے فلیراجع نیز سینہ کو زمین پر گرنا بے ہوشی سے کنایہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھوک کی وجہ سے زمین پر گرتا۔

قولہ: "لِیستتبعنی" مجھے اپنے درپے کر دے یعنی اپنے ساتھ گھر لے جائے گویا یہ عملی تعریض تھی، پھر حضرات شیخین کا ابوہریرہ کو نہ لے جانا دو اعتبار سے ممکن ہے کہ یا تو وہ ان کے سوال کو واقعی استفہام پر محمول کر چکے یا پھر ان کے گھروں میں کھلانے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

قولہ: "فسامرني ان ادعوه" کیونکہ حضرت ابوہریرہ آپ علیہ السلام کے خادم خاص تھے اور مہمانوں کی خدمت خادم سے کرائی جاتی ہے۔

اس حدیث پاک سے اہل صفہ کے زہد، علم دوستی، صبر اور حضور علیہ السلام کے معجزے کا بین ثبوت ملتا ہے، صفہ دراصل سائبان اور چھپر کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد وہ کمرہ ہے جو مسجد نبوی کے پچھلے گوشہ میں ان مہاجرین کے لئے بنایا گیا تھا جن کا مدینہ میں اس کے علاوہ کوئی انتظام قیام وطعام کا نہ تھا یہ لوگ بغرض تعلیم اسلام یہاں جمع ہوئے تھے ان کی تعداد سو سے متجاوز تھی البتہ اس تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔

حدیث آخر:۔"عن ابن عمر قال تَجَشّا رجل عندالنبی صلی الله علیه وسلم فقال: كُفَّ عَنّا جُشَاءَ كَ فان اكثرهم شبعاً في الدنيا اطولهم جوعاً يوم القيْمة". (حسن غريب)

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈکار لی، تو آپ نے فرمایا: اپنی ڈکار کو ہم سے دور رکھ (یا روک دو) کیونکہ دنیا میں پیٹ زیادہ بھرنے والے قیامت کے روز لمبے عرصے تک بھوکے رہیں گے۔

قولہ: "جُشاء ک" جُشا بضم الجیم والمد ڈکار کو کہتے ہیں جو عموماً معدہ بھر جانے سے آتی ہے، آج جبکہ دنیا بھر میں غذائی مواد پانی اور گیہوں وغیرہ کے مسائل نے سر اٹھایا ہے اگر اس حدیث کے مطابق ہر شخص اپنے کھانے میں تھوڑی سی کمی لائے تو صرف پاکستان میں یومیہ کروڑوں روٹیوں کی بچت ہو سکتی ہے۔ یہ ڈکار لینے والے حضرت ابو جُحیفہ رضی اللہ عنہ تھے جن کی حدیث کی طرف امام ترمذیؒ نے وفی الباب میں اشارہ کیا ہے، اور جسے امام حاکمؒ نے نقل فرمایا ہے کہ میں نے روٹی اور گوشت کی ثرید کھائی پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ڈکار لی" فقال: یاهذا کفّ الخ" چونکہ ڈکار روکنا آدمی کے بس سے باہر ہے اس لئے مطلب ڈکار کے سبب یعنی زیادہ کھانے سے روکنا ہوا، حاشیہ ترمذی پر ہے کہ انہوں نے اس کے بعد کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا، چونکہ یہ صغار صحابہ کرام میں سے ہے اس لئے کہا جائے گا کہ بچپن سے انہوں نے کثرت اکل کو خیر باد کہہ دیا۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا اے میرے بیٹے! اگر تم ہمیں دیکھتا دراں حالیکہ جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے اور ہم پر بارش ہوتی تو تم یہ سمجھتا کہ ہماری بُو بھیڑ جیسی ہے۔ (صحیح)

یعنی ہم اونی موٹے کپڑے پہنا کرتے تھے تو جب بارش ہوتی اس سے ہمارے لباس میں بدبو پیدا ہوتی۔

قولہ: "ونحن مع النبی "اور" واصابتنا السماء " دونوں جملے حالیہ ہیں ای لو رأیتنا حال کوننا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحال کوننا قد اصابتنا السماء یعنی یہ بدبو اس زمانے میں بارش کے دوران کے ساتھ خاص تھی کہ غربت تھی اور کوئی متبادل انتظام نہ تھا اس لئے گیلے کپڑوں میں بدبو ہو جاتی۔

حدیث آخر:۔"من ترک اللباس تواضعاً للہ الخ"یعنی جو شخص (عمدہ) لباس محض اللہ کے لئے تواضع کی خاطر چھوڑ دے حالانکہ وہ اس (اچھے لباس) کی قدرت رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز تمام خلائق کے سامنے (روبرو) بلائے گا تا کہ اسے اختیار دے کہ وہ (اہل) ایمان کے جوڑوں سے جونسا پسند کرے وہ لے لے۔

یعنی لباس زینت کا ترک کسی مذموم مقصد یا لا اُبالی پن کی وجہ سے نہ ہو بلکہ حقیقی تواضع کی بناء پر ہو تو چونکہ اس سے دنیاوی شہرت ختم یا کم ہوگی اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے بدلے میں اسے عظیم شہرت اور دائمی عزت سے نوازیں گے کہ جب میدان محشر سب خلائق سے بھرا ہوا ہوگا اسے ان کے سامنے مدعو کیا جائے گا اور اہل ایمان کے لئے جو جنتی لباس تیار کیا گیا ہوگا اسے اختیار دے کر کہا جائے گا کہ ان میں جو تجھے پسند ہو لے لو۔

حضرت شاہ صاحبؒ العرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ صابر فقیر اور شاکر امیر میں کون افضل ہے؟ اس میں اختلاف ہے احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیر صابر افضل ہے تاہم شیخ محدث عبدالحقؒ دہلوی کی رائے اس کے برعکس ہے وہ" ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء "کے تحت لکھتے ہیں"فیہ دلیل علی ان الغنی افضل من الفقیر اذا استوت اعمالھم"۔(مشکوٰۃ حاشیہ ۸ ص:۸۹)

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ فقر اختیاری سب سے افضل ہے کیونکہ آپ علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ نے اسے اختیار فرمایا اور حدیث باب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جبکہ غیر اختیاری فقر مع الصبر اور غنا مع الشکر دونوں فضائل میں سے ہیں ان میں افضل کون ہے یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ دونوں کی جھلکیاں انبیاء علیہم السلام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔امام منذریؒ نے بحوالہ ترمذی اس حدیث پر حسن کا حکم نقل کیا ہے اگر چہ ہمارے نسخے میں نہیں ہے۔

حدیث آخر:۔"النفقة کلھا فی سبیل اللہ الا البناء فلا خیر فیہ".(غریب)

(جائز وشرعی) خرچ سارا اللہ کی راہ میں (یعنی باعثِ اجر) ہے سوائے تعمیر (کے خرچ) کے کہ اس میں خیر (بھلائی وثواب) نہیں۔(حدیث غریب)

یعنی جو تعمیر گھر وغیرہ کی خالی از فائدہ دینیہ ہوگی اس پر خرچ کی جانے والی رقم سے کوئی ثواب نہیں ملتا

بلکہ بہت ساری تعمیرات تو وبال ہیں جیسا کہ آگے ابراہیم نخعیؒ کے قول میں ہے ''کل بناء وبال'' ہر تعمیر وبال ہے یہ وہ تعمیرات ہیں جو حاجت سے زائد یا گناہ کے اڈے ہوں جیسے سینما ہال وغیرہ حسب تفاوتِ شناعت وبال ہوں گی تاہم جو تعمیرات ضروریاتِ زندگی اور منافع شرعی کی بناء پر ہوں گی وہ یقیناً وبال سے خالی بلکہ باعثِ اجر و ثواب ہیں جیسے مساجد و مدارس، خیراتی ہسپتال اور دیگر رفاہی تعمیرات غرض حدیث بالا کو عدم ضرورت سے مقید کرنا لازمی ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت حارثہ بن مضرّف فرماتے ہیں کہ ہم حضرت خبّاب کے پاس آئے ان کی عیادت کرنے کے لئے جبکہ انہوں نے سات داغ لگوائے تھے، تو انہوں نے فرمایا کہ میری بیماری بہت لمبی ہوگئی اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے نہ سُن چکا ہوتا کہ ''تم موت کی آرزو مت کرو!'' تو بے شک میں ضرور اس کی تمنا کرتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کو ہر خرچ کرنے پر اجر ملتا ہے سوائے مٹی کے یا فرمایا کہ مٹی میں خرچ کے سوا، کہ اس پر ثواب نہیں۔ (صحیح) اس حدیث میں مٹی سے مراد تعمیر ہے۔

یہ حدیث ابواب الجنائز میں مع التشریح گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ص: ۲۲۴ ج: ۴ باب ماجاء فی النہی عن التمنی للموت) نیز داغ کا کچھ حکم ابواب الطب میں بھی گذرا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر تعمیر تجھ پر وبال ہے (ابوحمزہ کہتے ہیں کہ) میں نے پوچھا بتایئے جس تعمیر کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو؟ انہوں نے فرمایا نہ اس میں اجر ہے اور نہ وبال ہے، یعنی بصورت ضرورت تعمیر مباح ہے، یہ ابراہیم نخعیؒ کا قول ہے مگر اوپر بیان ہوا کہ تعمیرات کی بعض صورتوں پر ثواب بھی ملتا ہے، بہرحال ان روایات سے تعمیرات کے شوق کو کم کرنا مقصود ہے تاکہ لوگ فکر آخرت کو نہ بھولیں کیونکہ جب کنکریٹ کی تعمیرات میں ریس اور مسابقت کی رفتار تیز ہوگی تو اس کے لئے طویل المدتی منصوبہ بندیوں کی ضرورت اور فکرِ آخرت سے بے نیاز ہونے اور غفلت کی اشد ضرورت ہوگی، جو ہلاکت بصورت حیات ہوگی اور آج تقریباً ساری انسانیت اس دلدل میں پھنسی ہوئی ہے؟

حدیث آخر:۔ حضرت حصین بن مالک کوفی فرماتے ہیں کہ ایک سائل آیا اور ابن عباسؓ سے بھیک مانگی تو ابن عباسؓ نے اس سائل سے کہا کیا تم ''لا الٰہ الا اللہ'' کی گواہی دیتے ہو؟ اس نے کہا ''ہاں'' آپؓ نے فرمایا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا جی ''ہاں'' آپؓ نے فرمایا کیا تم رمضان کے روزے رکھتے ہو؟ اس نے کہا بالکل رکھتا ہوں ابن عباسؓ نے فرمایا تم نے خیرات مانگی ہے اور مانگنے

والے کا حق ہوتا ہے اور بات یہ ہے کہ ہمارے اوپر لازم ہے کہ تیرے ساتھ نیک سلوک کریں چنانچہ آپؓ نے اس کو ایک کپڑا (جوڑا) دیا پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ پہنادے کسی مسلمان کو کوئی کپڑا مگر وہ اللہ کی حفاظت میں رہے گا اس وقت تک جب تک اس کپڑے کا ایک ٹکڑا اس کے بدن پر باقی رہے۔ (حسن غریب)

قولہ: "کَسَا مُسلِماً" اور ابن عباسؓ کا سائل سے سوالات پوچھ کر اس کے مسلمان ہونے کے اطمینان کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ فضیلت اور ثواب ذمی کو کپڑے دینے سے حاصل نہیں ہوتا اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ سائل جتنا دیندار ہوگا اتنا ہی خیرات کا ثواب زیادہ ہوگا کیونکہ وہ صدقہ نیکی و بھلائی کی راہ میں استعمال ہوگا یہ تو صدقۂ نفلیہ کے بارے میں ہے، زکوٰۃ و دیگر صدقات واجبہ کا ثواب بھی اگرچہ مصرف کے عمدہ ہونے سے بڑھ جاتا ہے تاہم نفس زکوٰۃ کی ادائیگی کسی بھی فقیر کو دینے سے ہوجائے گی بشرطیکہ وہ مسلمان ہو، البتہ صدقات نفلیہ غیر مسلم کو بھی دیئے جاسکتے ہیں مسئلہ زکوٰۃ میں گذرا ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے یعنی مدینہ، تو لوگ آپؐ کی طرف دوڑے اور کہا جانے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے، تو میں بھی لوگوں کے ساتھ آیا تا کہ آپؐ کو دیکھوں چنانچہ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ کھل کر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ ان کا چہرہ کسی جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہے اور سب سے پہلے الفاظ جو آپؐ نے کہے تھے یہ تھے کہ آپؐ نے فرمایا: اے لوگوں! سلام پھیلاؤ اور کھانا کھلایا کرو اور نماز پڑھا کرو جب لوگ سو رہے ہوں (یعنی تہجد) داخل ہوجاؤ گے جنت میں بے خوفی و سلامتی سے۔ (صحیح)

قولہ: "يعني المدينة" یہ بعض راویوں کی طرف سے بیان مراد ہے۔

قولہ: "اِنجَفَلَ" اى ذهبوا مسرعين، جَفَلَ، اَجفَلَ و انجَفَلَ تیزی سے چلنے کو کہتے ہیں۔

قولہ: "فلما استَبَنتُ" استبان الشئى بمعنى ظهر و تبين یعنی اچھی طرح واضح و نمایاں ہونا۔

قولہ: "والناس نيام" نائم کی جمع ہے یعنی جب لوگوں کی غالب اکثریت سو رہی ہو چونکہ اس وقت ایک تو تلاوت دل کو خوب لگتی ہے "وَاَقوَمُ قِيلاً" دوسرے یہ وقت ریا سے مبراء ہوتا ہے۔

چونکہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ یہودی حبر تھے اس لئے آپؐ کے چہرۂ انور کے نقوش دیکھتے ہی توراۃ وغیرہ کے آئینہ میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس نظر آنے لگا اللہ نے ان پر اپنا فضل کر کے ان کو عناد سے

محفوظ کر کے مشرف باسلام فرمایا۔

حدیث انسؓ:۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو مہاجرین ان کے پاس آئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم نے اس قوم جس کے درمیان ہم اترے ہیں سے بڑھ کر اتنی کثرت سے خرچ کرنے اور مال قلیل میں اتنی غم خواری کرنے والی کسی قوم کو نہیں دیکھا ہے، بلاشبہ انہوں نے ہم کو محنت سے فارغ رکھا اور راحت میں ہم کو شریک رکھا، یہاں تک کہ ہمیں خوف ہونے لگا ہے کہ (ہمارا اور اپنا) سارا ثواب وہ لے جائیں گے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں" جب تک تم ان کے لئے اللہ سے دعا مانگتے رہو گے اور ان کی تعریف (شکریہ ادا) کرتے رہو گے۔ (حسن صحیح غریب)

یعنی جو مہاجرین صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ آچکے تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذکورہ بالا تأثرات بیان کئے، چونکہ مہاجرین سارے یا اکثر قریش سے تعلق رکھتے تھے جو سخاوت میں ممتاز تھے لیکن یہاں آکر جب انصار کا جود وسخا دیکھا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ جس کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے وہ بے دریغ خرچ کرتا ہے اور جس کے پاس کم ہے وہ بھی غم خواری وہمدردی میں کسی سے پیچھے نہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ کام سارا خود ہی کرتے ہیں جبکہ آرام اور قیام وطعام میں ہمیں برابر کے شریک کرتے ہیں، ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ یہ لوگ ہمارا سارا ثواب بھی اپنے نامۂ اعمال میں لے جائیں گے کیونکہ ہم تو دنیاوی مشقت سے بالکل بے نیاز ہو گئے ہیں اور تیار کھانا کھا کر پتہ نہیں کہ ایسی عبادت پر ہمیں ثواب ملے گا بھی یا نہیں، آپؐ نے ان کو تسلی دی کہ ایسی بات نہیں کیونکہ اللہ کا فضل بہت وسیع ہے وہ ان انصار کو بھی دوگنا ثواب دے گا مگر آپ کی ہجرت اور عبادت کا ثواب بھی کسی طرح کم نہیں کرے گا بشرطیکہ تم لوگ ان کے لئے دعا گو رہو گے اور احسان فراموشی نہیں کرو گے، کیونکہ آپ کی دعا اور شکر گزاری ان کے احسانات کا بدلہ بن جائیں گے اور اس طرح تم اور وہ برابر ہو جائیں گے یعنی انصار کا اجر اکثر واثمر ضرور ہو گا لیکن آپ کی نیت، ہجرت وعبادت بھی بے اثر نہ ہوں گی۔

قولہ: "من کثیر" ابذل سے متعلق ہے۔ اور "من قلیل" مواساۃ کے ساتھ متعلق ہے۔

قولہ: "من قوم" ابذَلَ واَحسَنَ دونوں کے ساتھ بنا بر تنازع متعلق ہے۔

قولہ: "المھنأ" بفتح المیم والنون جو چیز آدمی کی ضروریات کے لئے کافی ہو نیز جو چیز بغیر تعب و مشقت کے مل جائے اسے بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں یہی آخری معنی مناسب ہے کیونکہ انصارؓ نے مہاجرین کا بھرپور

خیال رکھا نہ صرف ان کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام کیا بلکہ بعض حضرات نے اپنی بیویوں میں سب سے زیادہ خوب صورت کو طلاق دے کر مہاجرین کا گھر آباد کیا۔

یہ لفظ ہمارے پاس موجود نسخہ میں بغیر میم کے ہے یعنی ہَنَاء اور حاشیہ قوت میں بھی اسے بروزن سحاب دیا ہے والھناء ما اتاک اللہ بلا مشقۃ۔

حدیث آخر:۔"الطاعم الشاکر بمنزلة الصائم الصابر".(حسن غریب)

کھانے والا شکر گذار صبر کرنے والے روزہ دار کی مانند ہے، یعنی دونوں کا ثواب برابر ہے تاہم یہ مساوات و برابری نفس ثواب میں ہے اور کبھی نفس شے میں تشبیہ دی جاتی ہے مگر زوائد کا تفاوت ملحوظ ہوتا ہے

پس مطلب یہ ہوا کہ دونوں کو ثواب ملتا ہے اگر چہ روزہ دار کا ثواب زیادہ ہے مثلاً زید اور عمرو دونوں غنا میں برابر ہیں کہ ہر ایک صاحب نصاب ہے اور ان پر زکوۃ نہیں ہوتی لیکن زید کا مال زیادہ ہے عمرو سے، اس سے معلوم ہوا کہ فقر اختیاری افضل ہے کیونکہ اسے یہاں مشبہ بہ بنایا گیا ہے۔(تدبر)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اقل شکر یہ ہے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں حمد ہو جبکہ صبر کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ روزہ کو مفسدات سے بچائے۔

حدیث آخر:۔اَلاَ اُخبر کم بمن یحرُم علی النار وتحرُمُ علیه النار؟علی کل قریب هَیِن سهل ".(غریب وفی نسخة حسن غریب)

کیا تمہیں نہ بتاؤں وہ جو آگ پر حرام ہے اور آگ اس پر حرام ہے؟ ہر تابعدار، آسانی کرنے والے اور لوگوں سے نزدیک والے پر آگ حرام ہے۔

یہاں تحرم علیہ النار پہلے جملے کی تاکید ہے، جبکہ ھین اور سہل دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں یعنی آسانی پیدا کرنے والے مطلب یہ ہے کہ جو شخص لوگوں کی بات مانتا ہے اور ان کے کام میں سعی کرتا ہے اور اپنے اخلاق وکردار کی وجہ سے لوگوں کے قریب رہتا ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کو ہر ایک پسند کرتا ہے اور اس سے اچھے تعلقات ومراسم رکھتا ہے تو وہ اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے آگ پر حرام اور آگ یعنی دوزخ اس پر حرام ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت اسود بن یزید فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو کیا کام کرنے لگتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ گھر (والوں) کی خدمت (کام کاج) کرنے لگتے اور جب نماز کا وقت آجاتا تو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔(صحیح)

قولہ: "مھنۃ" بروزن رحمۃ کام کاج اور خدمت کو کہتے ہیں بعض نے کہا کہ سخت محنت کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ گھر کا سارا کام ازواجِ مطہرات پر نہ چھوڑتے بلکہ ان کے ساتھ برابر کے شریک رہنے کی کوشش فرماتے، جیسے بکری کا دودھ دوھنا، اپنے جوتوں یا کپڑوں میں پیوند لگانا وغیرہ، غرض آپؐ کا مزاج گرامی آرام طلبی وتعلی کا نہ تھا بلکہ خیر رسانی، غم خواری اور دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانی وراحت دینے کا تھا، اس سے آپؐ کی تواضع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور یہ کہ کوئی دنیوی کام آپؐ کو نماز سے غافل نہیں بناتا۔

حدیث آخر:۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص ملتا اور مصافحہ کرتا تو آپؐ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک وہ شخص خود ہی نہ کھینچتا، اور اپنا چہرہ اس کے چہرے سے نہ پھیرتے تا آنکہ وہ شخص اپنا منہ خود ہی پھیرتا، اور آپؐ کو نہیں دیکھا گیا دراں حالیکہ آپ اپنے پیر پھیلائے ہوں اپنے ہم نشین کے آگے۔ (غریب)

اس حدیث میں ملاقات اور محفل کے عظیم آداب ہیں اور یہ کہ آپؐ باوجود اعلیٰ ترین مقامِ انسانیت کے اپنے ماتحتوں کا کس قدر خیال رکھتے کہ کسی کو احساس کمتری کا اثر لینے کا موقع ہی نہیں دیتے، صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً۔

حدیث آخر:۔ "خرج رجل ممن کان قبلکم فی حلۃ لہ یختال فیھا الخ".

تم سے اگلے لوگوں میں سے ایک شخص اپنے ایک (نئے) جوڑے میں نکلا، وہ اس میں اتراتا تھا، پس اللہ نے زمین کو حکم فرمایا چنانچہ اس کو زمین نے پکڑا (یعنی نگل دیا) پس وہ زمین میں دھنستا چلا جارہا ہے یا فرمایا کہ وہ قیامت تک اس میں گردش کرتا رہے گا۔ (صحیح)

قولہ: "یختال" اِختیال چلنے میں تکبر کرنے یعنی اترانے کو کہتے ہیں۔

قولہ: "یتجلجل" ای یغوص ویضطرب فیھا یعنی وہ شخص مسلسل حرکت کرتا رہتا ہے اور گھستا جارہا ہے، جلجلہ آواز کے ساتھ گھسنے اور دھنسنے کو کہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ العرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ یہ شخص قارون ملعون تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد تھا جس کا قصہ مشہور ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور مال کا تقاضا کیا موسیٰؑ نے اس کے لئے دعا مانگی وہ مال دار ہوگیا پھر زکوٰۃ دینے سے منکر ہوگیا اور ایک عورت کو تیار کیا کہ وہ موسیٰؑ کے وعظ کے دوران کھڑی ہوکر الزام تراشی کرے کہ پہلے میرے وہ پیسے تو ادا کرو جو رات کو میرے ساتھ زنا کی وجہ سے

آپ پر لازم ہوئے ہیں، حضرت موسیٰؑ کو غصہ آیا اللہ نے اس عورت کو سچ بولنے پر گویا کر دیا اس طرح قارون کا رچایا ہوا ڈرامہ ظاہر ہو گیا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اختیار دیا چنانچہ آپؑ کے کہنے پر زمین نے اس کو پکڑ لیا، اس کا خزانہ بھی اس کے اوپر ڈالا گیا جیسا کہ مفسرین نے تفصیل سے نقل کیا ہے۔

حدیث آخر:۔یحشر المتکبرون یوم القیٰمۃ امثال الذر فی صور الرجال الخ".

قیامت کے دن متکبر لوگوں کو چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی مانند انسانی شکل میں جمع کر دیا جائے گا، جن کو ہر طرف سے ذلت گھیرے ہوئے ہوگی، ہنکائے جائیں گے جہنم کے ایک قید خانہ کی طرف جو بولس نام سے یاد کیا جاتا ہے، چھائی رہے گی ان پر آگوں کی آگ، پلائے جائیں گے دوزخیوں کا رستا ہوا مادہ (پیپ وغیرہ) جو بدبودار کیچڑ ہے۔ (حسن)

ہمارے پاس والے نسخے میں امام ترمذیؒ نے اس پر حسن کا حکم لگایا ہے مگر عارضۃ الاحوذی اور تحفۃ الاحوذی کے متن پر حسن کے ساتھ صحیح بھی ہے۔

قولہ:"امثال الذرِّ" ذرۃ کی جمع ہے ایک چھوٹی سی سرخ چیونٹی کہلاتی ہے، بعض حضرات نے اس کو معنی مجازی پر حمل کیا ہے یعنی متکبر لوگ حقارت و بے وقعتی میں چیونٹیوں کی طرح ہوں گے گویا کہ یہ تشبیہ حقارت واہانت میں ہے نہ کہ صغر میں مگر دوسری رائے یہ ہے کہ یہ تشبیہ حقیقت پر محمول ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی شکل وصورت تو اپنی یعنی انسانی ہوگی مگر تکبر کی سزا کے طور پر ان کو چھوٹا بنا دیا جائے گا، تو جس طرح "من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ" خاشعین عالی المرتبۃ اور حقدار جنت بنا دیئے جائیں گے، اسی طرح متکبرین پستی ونیستی کے آخری نقطہ تک پہنچا دیئے جائیں گے، البتہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ہمیشہ اتنے چھوٹے ہوں ہوسکتا ہے کہ وہ میدانِ محشر کے کسی وقفے میں یا حشر سے فیصلہ و جہنم میں داخلے تک چیونٹیوں کی بقدر ہوں اور باقی احوال میں بڑے ہوں۔

قولہ:"بولس" بفتح اللام جبکہ باء کا فتحہ وضمہ دونوں جائز ہیں یہ اس جیل کا نام ہے جہاں ان متکبروں کو رکھا جائے گا، علاوہ ازیں آگوں کی آگ یعنی سخت ترین آگ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گی، حاشیہ قوت میں ہے کہ انیار بمعنی نیران جمع نار ہے جیسے ارياح بمعنی ریاح ہے۔

قولہ:"من عصارۃ اهل النار" بضم العین اصل میں نچوڑ کو کہتے ہیں یعنی اہل جہنم کے جسموں سے جو مادہ ٹپکے گا جیسے پیپ، خون اور زرد پانی اور شیرہ۔ **قولہ:"طِینۃ الخبال"** عصارہ سے بدل ہے

لہٰذا مجرور ہے، خبال بفتح الخاء اصل میں فساد و بگاڑ کو کہتے ہیں یہاں مراد سڑی ہوئی بد بودار ہے یعنی بد بودار کیچڑ۔ (اعاذنا اللہ منہا)

حدیث آخر:۔"من کظم غیظا الخ"جس نے غصہ ضبط کر لیا دراں حالیکہ وہ اس کی تنفیذ پر قادر ہو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے بُلا کر اسے اختیار دیں گے کہ وہ جس حور کو چاہے لے لے۔(حسن غریب)

(اس حدیث کی تشریح تشریحات جلد:۶ ص:۳۰۳ پر گذری ہے باب ماجاء فی کظم الغیظ)

حدیث آخر:۔حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ہیں وہ جس میں ہوں گی اس پر اللہ تعالیٰ اپنا کَنَف پھیلائیں گے (یعنی قیامت کے دن) اور اسے جنت میں داخل فرمائیں گے (۱) کمزور کے ساتھ نرمی (۲) والدین پر شفقت (۳) مملوک (لونڈی، غلام اور نوکر) پر احسان۔(غریب)

قولہ:"کَنَفَہ" اصل میں بازو کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد لازم المعنی ہے یعنی رحمت و حفاظت جیسا کہ متشابہات کے بارے میں پہلے گذرا ہے، پھر مملوک سے مراد عام ہے خواہ اپنا ہو یا کسی دوسرے کا یعنی ناکسوں کے ساتھ حسن سلوک مراد ہے۔

حدیث آخر:۔حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو مگر جسے میں ہدایت دوں پس تم مجھ سے ہدایت مانگو تا کہ میں تمہیں ہدایت دوں، اور تم سب نادار ہو مگر جسے میں غنی کروں، سو تم مجھ سے مانگو تا کہ میں تمہیں رزق دوں، اور تم سب گنہگار ہو مگر جسے میں بچاؤں (گناہ سے) پس تم میں سے جو یقین رکھے کہ میں مغفرت پر قدرت والا ہوں اور وہ مجھ سے بخشش طلب کرے تو میں اس کو بخشتا ہوں، اور میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اگر تمہارے اگلے پچھلے اور زندے اور مردے اور تر و خشک سب کے سب میرے بندوں میں سے سب سے زیادہ متقی دل پر جمع ہو جائیں تو یہ (اجتماع) میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر اضافہ نہیں کر سکے گا اور اگر تمہارے اگلے، پچھلے اور زندے و مردے اور تر و خشک سارے میرے بندوں میں سے سب سے بدبخت کے دل پر جمع ہو جائیں تو یہ میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر کمی نہیں کر سکے گا، اور اگر تمہارے اگلے، پچھلے اور زندے و مردے اور تر و خشک مل کر ایک میدان (خالی ہموار زمین) میں جمع ہو جائیں اور پھر ہر شخص اتنا مانگے جہاں تک اس کی آرزو

پہنچتی ہے، اور میں تم میں سے ہر سائل کو دوں تو یہ عطاء کم نہیں کرے گی میری سلطنت میں سے کچھ بھی مگر اتنا سا جیسے تم میں سے کوئی ایک سمندر پر گذرے اور اس میں ایک سوئی ڈبودے اور پھر اسے نکالے، اور یہ (کم نہ ہونا) اس لئے کہ میں بہت زیادہ فیض کرنے والا ہوں، ہر چیز میں خود کفیل ہوں اور وسعت وشرف والا ہوں، کرتا ہوں جو چاہتا ہوں، میرا دینا فقط کلام ہے اور عذاب میرا فقط کلام (حکم) ہے اور بے شک میرا حکم کسی چیز کے لئے جب میں چاہتا ہوں یہی ہے کہ میں اسے کہتا ہوں "ہوجا" بس وہ ہوجاتی ہے۔ (حسن)

قولہ: "یاعبادی کلکم" بظاہر خطاب ثقلین سے ہے اگرچہ آگے حدیث میں "فسأل کل انسان" سے خطاب صرف انسانوں سے معلوم ہوتا ہے، یعنی تم سب گمراہی کی طرف جارہے ہو مگر جس کو میں ہدایت کردوں وہ گمراہی سے بچتا ہے یا باز آتا ہے پھر ہدایت کرنا انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے ذریعہ، دلائل سمجھانے اور انقیاد کی صلاحیت پیدا کرنے کے ذریعہ مراد ہے۔

قولہ: "وکلکم مذنب" سب کے گنہگار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان میں گناہ کی بنیاد قائم ہے، جیسے قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ جو آدمی کو گناہ کی طرف لے جاتی ہیں جیسا کہ قوت عاقلہ غوایت وگمراہی کی طرف لے جاتی ہے، پھر اللہ ان قویٰ کو اعتدال میں رکھنے کی جس کو توفیق دیتا ہے یہ قوتیں فضائل اخلاق جنم دیتی ہیں جن کو بالترتیب عفت، شجاعت اور حکمت اور تینوں سے مرکب کو عدالت کہا جاتا ہے۔

قولہ: "اجتمعوا علیٰ اتقیٰ قلب عبد، وقولہ اجتمعوا علی اشقیٰ قلب عبد الخ" یعنی اگر سب خلائق سب سے متقی شخص جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا جبرئیلؑ کی طرح متقی ہوجائیں تو اس سے میری سلطنت میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوگا کیونکہ اضافہ قوت وسلطنت میں تب ممکن ہوتا ہے جب اس میں کوئی کمی ہو جبکہ اللہ کی قوت وسلطنت میں کوئی نقص نہیں، اس کے برعکس اگر ساری مخلوق سب سے بدبخت جیسے ابلیس لعین یا دجال وفرعون کی طرح ہوجائے تو اللہ کی سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر کمی نہیں کرسکے گی کیونکہ اللہ عزوجل کی سلطنت مخلوق کی مرہون منت نہیں ہے اللہ تعالیٰ واجب لذاتہ ہے اور اس کی صفات ازلی ہیں وہ حدوث کے شائبہ اور احتیاج سے منزہ ہے جبکہ مخلوق ساری حادث ہے اور اللہ کی صفات کے مظاہر ہیں۔

قولہ: "فی صعید واحد" اس قید میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تمام خلائق سب مل کر یکبارگی سوالات کریں جو بنسبت وقفے وقفے سے مانگنے سے انسان کو مشکل لگ رہا ہے تو بھی ان سب کو وہ تمام اشیاء دینے سے اللہ کی سلطنت اور خزانوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

18/2

قولہ: "اِلّا کمالوا ان احدکم الخ" یہ مثال نہیں ہے بلکہ نظیر ہے جو تقریب الی الفہم کے لئے ہے کیونکہ سوئی پر جتنی نمی آئے گی اس مقدار میں سمندر کا پانی کم ہو جاتا ہے کیونکہ سمندر متناہی ہوتا ہے اور متناہی سے متناہی الگ کرنے سے کمی آجاتی ہے، جبکہ اللہ کی سلطنت لامتناہی ہے اور لامتناہی سے متناہی علیٰحدہ کرنے سے کوئی کمی نہیں آتی مگر چونکہ شریعت کی اصطلاحات واطلاقات میں لوگوں کی سمجھ کی رعایت کی جاتی ہے اس لئے مذکورہ نظیر پیش کی گئی اور اس لئے بھی کہ بادی نظر میں سوئی کا سمندر میں آلودۂ آب ہونے سے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

قولہ: "جواد" کثیر الجود۔

قولہ: "واجد" وہ جو، جو چیز چاہے اور جیسے چاہے اور جب بھی چاہے وہ موجود ہو کوئی چیز غیر حاضر یا غیر موجود نہیں ہو سکتی ہو یعنی جو کبھی بھی کسی چیز کا محتاج نہ ہو۔

قولہ: "ماجد" بمعنی مجید کے مجد لغت میں وسیع شرف کا نام ہے پس معنی ہیں وسعتِ شرف وکرم والا، واضح رہے کہ بعض علماء نے اللہ تبارک وتعالیٰ پر "سخی" کا اطلاق مناسب نہیں سمجھا ہے کیونکہ سخاوت بعض اہل لغت کی نظر میں وہ ہے جو مانگنے والوں کو دے یا صاحب حق کو اس کا حق دینا سخاوت ہے جبکہ اللہ بغیر مانگے اور غیرِ مستحق کو بھی دیتا ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے جو ایک حدیث بیان فرماتے اگر میں یہ حدیث نہ سنتا بلکہ صرف ایک مرتبہ یا دو مرتبہ یہاں تک کہ گِنا سات تک (تو میں یہ بیان نہ کرتا) لیکن میں نے یہ سات بار سے زیادہ سنی ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ بنی اسرائیل کا کِفل (نامی شخص) کسی گناہ کے کام سے گریز نہیں کرتا تھا، چنانچہ اس کے پاس ایک عورت آئی تو اس نے اسے ساٹھ دینار دیئے اس شرط پر کہ وہ اس سے جماع کرے گا، پس جب وہ اس عورت کے پاس بیٹھا اس طور سے جیسا کہ ایک مرد اپنی بیوی کے آگے بیٹھتا ہے تو وہ کانپی اور رونے لگی، کِفل نے کہا کیا چیز تمہیں رُلاتی ہے؟ کیا میں نے تجھ پر جبر وزبردستی کی ہے؟ وہ بولی نہیں مگر یہ ایک ایسا (گندہ) کام ہے جو میں نے کبھی نہیں کیا ہے اور مجھے اس (کام) پر ضرورت نے آمادہ کیا ہے (یعنی غربت نے) کِفل کہنے لگا اچھا تم یہ کام (بمجبوری) کرتی ہو اور (اس سے قبل) تم نے نہیں کیا ہے؟ جاؤ یہ پیسے (مفت میں) تیرے ہوئے اور اس کے ساتھ کِفل نے (توبہ تائب ہو کر) کہا بخدا میں اس کے بعد کبھی بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا چنانچہ اسی رات کو اس کا انتقال ہوا، صبح کو اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ اللہ نے کفل

کو بخش دیا۔ (حسن)

قولہ: "لولم اسمعه الخ" شرط ہے اور جزاء مقدر ہے ای لم احدثه ولکنی الخ۔ **قولہ:** "کفل" بکسر الکاف وسکون الفاء ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں ان حضرات پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ وہی ذوالکفل نبی ہے، کیونکہ ایک تو دونوں کے نام بھی الگ الگ ہیں دوم یہ کہ کفل نے توبہ کر لی مگر اس سے قبل گناہوں سے نہیں بچتا تھا جبکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ **قولہ:** "ارعدت" ای زلزلت من خشیة الله یعنی اللہ کے خوف سے کانپنے لگی اور رونے لگی۔ **قولہ:** "فاصبح مکتوب الخ" یعنی رات کو لکھا گیا تھا جو صبح نظر آیا۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے دو حدیثیں بیان فرمائیں: ایک اپنی طرف سے (یعنی موقوف یا ذاتی رائے کے طور پر) اور دوسری نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قال عبداللہ (یہ اپنی طرف سے فرمایا کہ) مؤمن اپنے گناہوں کو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ گویا پہاڑ کی جڑ (دامن) میں بیٹھا ہوا اور ڈر رہا ہو کہ پہاڑ اس پر آن پڑے گا جبکہ فاجر اپنے گناہوں کو مکھی کی مانند سمجھتا ہے جو اس کی ناک پر بیٹھی اور اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا پس وہ اُڑ گئی، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم (یہ وہ مرفوع اور دوسری حدیث ہے) بلاشبہ اللہ تم میں ایک کی توبہ پر اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہونے والا ہے جو بے آب و گیا، ہلاکت خیز چٹیل زمین میں ہو اس کے ساتھ اس کی اونٹنی ہو جس پر اس کا توشہ اور کھانے پینے کی اشیاء ہوں اور وہ سب کچھ جو اس کے حوائج کے لئے ہو، پس کھو دیا اس نے اس اونٹنی کو پس وہ اس کی تلاش میں نکلا (اور گھومتے پھرتے تھک گیا) یہاں تک کہ موت (کے اسباب) نے اس کو گھیر لیا تو اس نے سوچا (یعنی دل میں کہا) کہ میں واپس اسی جگہ کی طرف لوٹتا ہوں جہاں کھویا ہے میں نے اس اونٹنی کو تاکہ وہاں مر جاؤں، پس وہ اسی مقام کی طرف لوٹا اور اس کی آنکھ لگ گئی اور جیسا ہی جاگا تو یکایک دیکھا کہ اس کی اونٹنی اس کے سر کے پاس (کھڑی ہے) جس پر اس کا کھانا پینا اور ضروریات کا سامان ہے۔ (حسن صحیح)

قولہ: "ان المؤمن یری ذنوبه الخ" ذنوبہ یریٰ کا مفعول اول ہے اور مفعول دوم محذوف ہے ای کالجبال جو کذباب کے قرینۂ تقابل سے معلوم ہوا، چونکہ ایمان ایک معیار ہے اس لئے اس پر نیکیوں اور گناہوں کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے پس یہ کسوٹی جتنی اچھی ہوگی اسی تناسب سے تمیز بھی صاف ہوگی اس لئے اعلیٰ ایمان پر گناہ پہاڑ کی مانند بھاری لگتے ہیں جبکہ فاجر کے کمزور ایمان پر گناہ کے بُرے اثرات کا کوئی بوجھ زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایمان معرفت باری تعالیٰ کا ذریعہ ہے تو ایمان کے قوی ہونے کی صورت میں معرفت میں وسعت ہوتی ہے اس لئے خشیت میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ کمزور ایمان سے زیادہ معرفت نصیب نہیں ہوتی اس لئے گناہ کی شناعت مخفی رہتی ہے۔

قوله: "فَلَاةٍ دَوِّيَّةٍ" فلاة وہ دشت وصحراء جس میں پانی نہ ہو عرف میں بھی اس کو صحراء ہی کہتے ہیں۔ جبکہ "دوية" بفتح الدال وتشديد الواؤ والياء وہ صحراء جہاں کوئی سبزہ ونباتات یعنی گھاس نہ ہو۔ **قوله: "مهلكة"** بفتح الميم جبکہ لام کا فتحہ وکسرہ دونوں جائز ہیں ظرف کا صیغہ ہے یعنی جائے ہلاکت۔

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک صحرائی زمین میں کسی کی سواری زادِ راہ سمیت گم ہو جائے اور وہ شخص تلاش کر کر کے مایوس ہو جائے اور موت کے آگے گردن پھیلا کر انتظار کرنے لگے اور یک دم وہ موت کے منہ سے باہر نکل آنے کا راستہ دیکھے یعنی اس کی سواری بمع سامان کے مل جائے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی حتیٰ کہ مسلم کی روایت کے مطابق وہ شخص خوشی کی بناء پر اپنے حواس پر قابو نہ پاتے ہوئے بول اٹھتا ہے: "اللّٰهم أَنْتَ عَبْدِیْ وَأَنَا رَبُّکَ" تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشی گنہگار کی توبہ پر اس شخص کی خوشی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ "**سبحانک اللّٰهم وبحمدک اشهدان لااله اِلّاانت استغفرک واتوب اليک**"۔ چونکہ اللہ حوادث سے پاک ہے اس لئے خوش ہونے سے مراد غایہ یعنی قبول توبہ ہے۔

حدیث آخر:۔ کل ابن آدم خطّاءٌ وخير الخطائين التّوّابون ". (غريب)

ہر ابن آدم خطا کار ہے اور خطا کاروں میں بہتر توبہ کرنے والے ہیں۔

قوله: "خطّاء" مبالغے کا صیغہ بمعنی کثیر الخطاء ہے پہلے خطّاء کو مفرد ذکر کیا یہ لفظ کُلّ کو دیکھتے ہوئے جبکہ دوسری بار جمع کے صیغے سے ذکر فرمایا یہ کل کے معنی کے اعتبار سے۔ اس حدیث سے انبیاء علیہم السلام مستثنیٰ ہیں حضرت گنگوہیؒ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ خطاء سے مراد وہ عمل ہے جو کرنے والے کے مقام اور شان کے مناسب نہ ہو علیٰ ھذا پھر استثناء کی ضرورت نہیں انتہیٰ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعض خلافِ اولیٰ کام اگرچہ ہمارے بارے میں تو نیکیاں ہیں مگر وہ ان پر باوجود رخصت کے بارِ خاطر گذرتے مثلاً بیان جواز کے لئے خلاف معمول یا خلافِ اولیٰ کام ایک دو مرتبہ کرنا۔

باب

"عن ابی هريرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيراً وليصمُت". (حديث صحيح)

جوشخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اسے اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہئے اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ بھلی بات کہے یا خاموش (چپ) رہے۔

تشریح:۔ حدیث کا پہلا حصہ جو مہمان کی تعظیم سے متعلق ہے ابواب البر والصلہ میں تفصیلاً گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی "باب ماجاء فی الضیافة وغاية الضيافة كم هو؟" ص:۲۳۲ ج:۶)

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی طرف وفی الباب...... میں ابی شریح الکعبی کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

قولہ: "اولیصمت" اس میں میم کا کسرہ اصح ہے جبکہ ضمہ بھی جائز ہے یعنی باب ضرب ونصر دونوں سے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بتقاضائے ایمان آدمی پر لازم ہے کہ وہ بات کرنے سے پہلے سوچے کہ اس کی بات پر کوئی برے اثرات تو مرتب نہیں ہوں گے پس اگر وہ بات اچھی لگے تو کہہ دے ورنہ چپ رہے کیونکہ ایمان امن سے ہے جو فساد کی ضد ہے لہذا مؤمن ہوتے ہوئے بگاڑ وفساد کی بنیاد رکھنا جائز نہیں، واضح رہے کہ یہ ارشاد مباح کلام کے بارے میں ہے جہاں تک نہی عن المنکر کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں پہلے تفصیل گذری ہے (ابواب الفتن میں اس کے لئے دو تین ابواب ہیں "باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنكر" اور اس کے بعد دو باب تشریحات از ص:۵۲۴ تا ص ۵۳۳ ج:۶)

باب کی دوسری حدیث میں ہے "من صمت نجا" جو چپ رہا اس نے نجات پائی اس روایت میں ابن لہیعہ ہیں جو ضعیف کہلاتے ہیں بہر حال مطلب یہ ہے کہ جو شخص بری بات کہنے سے گریزاں رہا تو وہ اس بات کے غلط نتائج سے دنیا وآخرت دونوں میں محفوظ رہا۔ زبان کی حفاظت کے متعلق کچھ ابحاث ابواب البر والصلہ میں گذری ہیں جبکہ تفصیلی مباحث راقم کی کتاب "نقش قدم کامل حصہ دوم یا نقش اخلاق" میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ فمن شاء فلیراجع

باب

"عن ابی موسیٰ قال سُئِل رسول الله صلی الله علیه وسلم :ای المسلمین افضل؟ قال: من سلِم المسلمون من لسانه ویده ".(صحیح غریب)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مسلمانوں میں کون اچھا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں (یعنی دونوں کی اذیت سے)۔

تشریح:۔ چونکہ سوال میں "اَیُّ الناس" کے عنوان کے بجائے "اَیُّ المسلمین" کہا گیا ہے اس لئے مطلب یہ ہوا کہ سائل کا مقصد محض لوگوں میں سے افضل کا سوال نہیں بلکہ مسلمانوں میں سے افضل کے بارے میں سوال کرنا مقصود ہے چونکہ مسلمان تو وہ ہوتا ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو اگرچہ ایمان کے مقتضیات میں لوگوں کے ساتھ بلکہ پوری مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک ونیک برتاؤ کرنا بھی شامل ہے کیونکہ مخلوق کی حیثیت سرکاری اموال واملاک کی ہے جس کی حفاظت اور خیال رکھنا ہر شہری کی ذمہ داری ہے تاہم یہ پہلو کلمۂ شہادت میں صراحۃً موجود نہیں اس لئے آپؐ نے فرمایا "من سلم المسلمون الخ" یعنی افضل اور سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی بھرپور خیال رکھے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو اپنی زبان اور ہاتھ کی ایذاء سے بچائے جو ہر مسلمان کے بس کی بات ہے کیونکہ اس پر کوئی پیسہ وغیرہ خرچ کرنا نہیں پڑتا اس سے زیادہ احسان بھی اگرچہ مستحسن بلکہ مطلوب ومرغوب ہے تاہم وہ اضافی افضلیت میں آتا ہے جو خدمات وصدقات اور تبرعات کے ضمن میں شامل ہے اور چونکہ یہاں ادنیٰ مؤمنِ افضل کی بات ہو رہی ہے اس لئے "من سَلِمَ الناس" نہیں کہا اگرچہ ذمی کو بھی ایذاء بلاوجہ نہیں پہنچانی چاہئے ہاں البتہ ابن حبانؒ کی ایک روایت میں "من سلم الناس" بھی آیا ہے۔

پس مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان لوگوں کی ایذاء رسانی سے اجتناب نہ کرے وہ افضل مسلمان نہیں اگرچہ نفسِ ایمان واسلام رہتا ہے کیونکہ کلام میں اصل قید ہوا کرتی ہے جیسا کہ علامہ نے مطوّل میں اس کی تصریح فرمائی ہے، پھر لسان کی تقدیم اس کی شدت تاثیر وعموم کی وجہ سے ہے کہ۔

جراحات السنان لها التیام

ولا یلتام ما جرح اللسان

پھر قول کے بجائے لسان کالفظ ارشاد فرمایا تاکہ زبان سے طنزیہ اشارہ کو بھی شامل ہو اور چونکہ عام ایذاء رسانی انہی دونوں سے ہوتی ہے اس لئے آنکھوں کے اشارے اور پاؤں کے ذکر کو ضروری نہیں سمجھا گیا اگر چہ وہ بھی مراد ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ "ید" سے مراد مطلق عمل ہے خواہ وہ کسی بھی جارحہ اور عضو سے ہو۔

اس حدیث پاک میں اور بھی عمدہ نکات اور نفیس ابحاث علماء شارحین نے بیان فرمائی ہیں جو بخاری ومشکوٰۃ کی شروحات میں دیکھی جاسکتی ہیں، ہمارے پیش نظر یہاں ضروری تشریح واختصار ہے۔

حدیث آخر:۔"من عَيَّرَ اخاه بذنب لم يمت حتىٰ يعمله". (حسن غريب)

جس نے اپنے (اسلامی) بھائی کو کسی گناہ پر عار دِلایا وہ شخص نہیں مرے گا اس وقت تک جب تک وہ گناہ نہ کرے۔

امام ترمذیؒ نے اپنے شیخ احمد بن منیع سے نقل کیا ہے"قالوا من ذنب قد تاب منه"یعنی اس گناہ پر عار دِلانے کی ممانعت مراد ہے جس سے اس نے توبہ کرلی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ احمد سے مراد امام احمد بن حنبل ہو۔

یہ روایت اگر چہ بتصریح امام ترمذی" منقطع ہے کہ خالد بن معدان کا سماع حضرت معاذؓ سے ثابت نہیں مگر پھر بھی امام ترمذیؒ نے اس کو حسن کہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صحت وضعف کا دارومدار صرف اتصال وانقطاع یا راوی کے ضعف وثقاہت پر نہیں بلکہ اس میں خارجی محرکات و دیگر قرائن وشواہد کو بھی بڑا دخل ہے۔

اگر کوئی شخص گناہ سے توبہ کر چکا ہو تو اسے عار دِلانا بہرحال ممنوع ہے مگر جو شخص توبہ نہ کر رہا ہو تو اسے گناہ سے روکنے کی کوشش ہونی چاہئے جس میں خیر خواہی اور حکمت ونرمی ملحوظ ہونی چاہئے کیونکہ بغیر خیر خواہی کے اپنا نقصان بھی لازمی ہے کہ عجب وتکبر یا ریاکاری بہت مذموم وصف ہے اور کبھی بے موقعہ وسختی سے روکنے کا انجام الٹا نکلتا ہے کہ وہ شخص ضد کرنے لگتا ہے اور گناہ کے کام میں مزید آگے جانکلتا ہے البتہ اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کے بارے میں یقین ہو کہ وہ تعزیر یا تعبیر سے گناہ چھوڑ دے گا تو اس صورت میں عار دلانا بھی جائز ہے۔ اس کی کچھ تفصیل "باب ماجاء فی تعظیم المؤمن" میں بھی گذری ہے "ابواب البر والصلة" میں (دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۳۲۳ ج:۶)

باب

"عن واثلة بن الاَسقع قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتُظهِر الشَّمَاتَةَ لِاَخيك فيرحمه الله ويبتليكَ". (هذاحديث حسن غريب)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم اپنے (اسلامی) بھائی (کے غم) پر خوشی کا اظہار مت کرو ورنہ اللہ اس پر رحم کردے گا اور تجھے (اس میں) مبتلا کردے گا۔

تشریح:۔قولہ: "الشماتة" دشمن یا مخالف کی مصیبت پر خوش ہونے کو کہتے ہیں۔قولہ: "ویبتلیک" کیونکہ تم نے اس کو حقیر سمجھ کر خود کو بلند و عالی سمجھا تھا جو اللہ کو پسند نہیں آیا۔

محشی نے تقریب سے نقل کیا ہے کہ سند میں "امیۃ بن القاسم" کے بجائے صحیح "قاسم بن امیہ" ہے حاشیہ قوت المغتذی میں ہے کہ اس حدیث کو سراج الدین قزوینی نے موضوع کہا ہے اسی طرح ابن جوزیؒ نے بھی اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس میں عمر بن اسماعیل ضعیف ہیں تاہم اس حدیث کی دوسری سند سے عمر بن اسماعیل کا تفرد ختم ہوگیا ہے لہذا حدیث قابل قبول ہے، امام ترمذیؒ نے آگے مکحول کا تذکرہ فرمایا ہے جس کا مقصد مکحول شامی اور مکحول ازدی کے درمیان فرق کرنا ہے۔

قولہ: "ندانم" فارسی کلمہ ہے جس کے معنی "میں نہیں جانتا ہوں" ہیں کیونکہ یہ عجمی تھے ابن سعد نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ مکحول "کابل" کے رہنے والے تھے۔

باب

"عن عائشةؓ قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ماأُحِبُّ انى حكيتُ اَحَداً وان لى كذاو كذا". (حسن صحيح)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں پسند نہیں کرتا ہوں کہ میں کسی کی نقل اتاروں اگرچہ مجھے اتنا اتنا (مال) ملے۔

تشریح:۔قولہ: "حکیت" کسی کے کام کی نقل کرنا کہ مثلاً وہ یوں چلتا ہے اور مقصد اس کی تحقیر اور طنز ہو گویا یہ عملی غیبت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

قولہ: "ولوان لی کذاو کذا" جملہ حالیہ ہے یعنی میں کسی کا عیب نقل کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا اگرچہ اس کے بدلہ اور عوض میں مجھے دنیا کا بہت کچھ دیا جائے۔

یہ ارشاد نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے حضرت صفیہؓ کے قد کی پستی کو ظاہر کرنا چاہا تھا چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں کہ میں نے کہا "یارسول اللہ ان صفیة امرأة وقالت بیدها" "اے اللہ کے رسول! صفیہ ایسی عورت ہے اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا "تعنی قصیرة" یعنی اشارہ سے یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ صفیہ ٹھگنی ہیں یعنی چھوٹے قد کی عورت ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لقدمَزجتِ کلمة لومُزِجَ بهاماء البحرلَمُزِجَ" "تم نے ایسی بات ملائی ہے (اپنی باتوں میں) کہ اگر اس میں سمندر کا پانی شامل کیا جائے تو وہ بھی متغیر ہو جائے گا یعنی خراب ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے عیب کی نقل اُتارنا جائز نہیں خصوصاً جب وہ غیرِ اختیاری ہو جہاں تک اختیاری کا تعلق ہے تو اگر وہ بطور زجر نقل اتارتا ہے اور اس میں اپنے نفس کا علو اور منقول عنہ کا تمسخر مراد نہ ہو تو جائز ہے جبکہ اچھے کام کی نقل اتارنا جائز ہے۔

باب

"عن شیخ من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم أُراه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان المسلم اذاکان یُخالِطُ الناس ویصبرعلی اذاهم خیرمن المسلم الذی لایُخالِطُ الناس ولایصبرعلی اذاهم قال ابن ابی عدی کَاَنَّ شُعبة یری انه ابن عمر".

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام میں سے ایک بزرگ سے مروی ہے (یحییٰ بن وثاب راوی کہتے ہیں کہ) میں گمان کرتا ہوں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (مرفوع) ہے آپؐ نے فرمایا: جو مسلمان لوگوں میں میل ملاپ رکھتا ہو اور ان کی ایذاء پر صبر کرتا ہو وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو نہ لوگوں سے میل جول رکھتا ہو اور نہ ہی ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہو۔

تشریح:۔ ان بزرگ کا نام یحییٰ بن وثاب نے ذکر نہیں کیا ہے مگر شعبہ نے کہا کہ شاید وہ ابن عمرؓ ہیں اور ابن ماجہ میں یہ روایت ابن عمرؓ ہی سے مروی ہے لہذا شعبہ کا گمان صحیح ہے۔

قولہ: "أُراه" بضم الهمزة ای اظن، میں سمجھتا ہوں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص لوگوں کے ساتھ رہتا ہو تو اگرچہ ان کی وجہ سے اس کو تکلیف تو اٹھانی پڑتی ہے مگر اس کی وجہ سے ان کو فائدہ پہنچ رہا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس تکلیف پر صبر کرنا بذات بھی ایک نیکی ہے اس لئے وہ شخص علیحدگی اختیار کرنے والے سے افضل ہے جو کسی طرح لوگوں کو خیر نہیں پہنچا رہا ہے۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب لوگوں کے ساتھ مخالطت میں اپنے دین وغیرہ کا نقصان نہ ہوتا ہو اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی امید جاری یا باقی ہو اگر یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ اختلاط محض شر بن جائے تو پھر عزلت نشینی افضل ہے جس کی تفصیل گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۴۲۱ ج:۴ ''باب ماجاء فی النھی عن التبتّل'' من ابواب النکاح وص:۵۳۷ ج:۶ ''باب ماجاء فی الرجل یکون فی الفتنۃ'' من ابواب الفتن)

حدیث آخر:۔ ''اِیّاکم وسُوء ذات البین فانھا الحالقۃ''. (صحیح غریب)

تم آپس کی ناچاقی سے بچو کیونکہ وہ مونڈنے والی ہے (دین کو)۔

امام ترمذیؒ نے ''سوء ذات البین'' کی تفسیر عداوت اور بُغض سے اور حالقہ کی دین کے مونڈ دینے یعنی صفایا کر دینے سے کی ہے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ لوگوں کے آپس کے تعلقات جب اچھے ہوں تو ان کو صلاح کہتے ہیں جبکہ بُرے تعلق کو سُوء کہا جاتا ہے بشرطیکہ وہ مسلسل اچھے یا بُرے ہوں گویا کبھی کبھار کی خوش گواری و رنجش پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ شاید مونڈنے کا مطلب یہ ہے کہ آپس کی چپقلش وعداوت سے عبادات متأثر ہو جاتی ہیں اور دلجمعی سے کوئی بھی دینی کام نہیں ہو سکتا گویا، یا تو آدمی عبادت کرتا ہی نہیں ہے یا اگر کرتا ہے تو اس میں جان و روحانیت نہیں ہوتی ہے اس طرح آدمی کا دین سے رشتہ تقریباً ٹوٹ جاتا ہے، یہ توجیہ اس لئے کی گئی کہ ہمارے اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک کفر کے علاوہ باقی گناہوں سے نیک اعمال اکارت وضائع نہیں ہوتے ہیں اگرچہ معتزلہ اور ابن قیمؒ اس کے قائل ہیں۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں روزے، نماز اور صدقہ سے زیادہ بہتر عمل نہ بتاؤں؟ صحابہ نے فرمایا: کیوں نہیں (یعنی ضرور بتلائیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس کے اچھے تعلقات ہیں کیونکہ آپس کی پھوٹ مونڈنے والی ہے۔ (صحیح)

اس کے بعد امام ترمذیؒ نے ایک معلق روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کا صفایا کرتی ہے۔

اس حدیث میں صیام وقیام وغیرہ سے مراد نفلی روزے، نماز اور صدقات ہیں، البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص فرائض کا تو پابند ہوتا ہے مگر دوسری جانب وہ قاتل، چغلخور اور ڈاکو بھی ہوتا ہے، ایسے میں شاید وہ شخص افضل ہو جو نمازی تو نہیں مگر حقوق العباد اور اصلاح معاشرہ میں بھرپور کوشش کرتا ہو، واللہ اعلم۔ (''اصلاح ذات البین'' کا ایک مستقل باب ابواب البر والصلۃ میں گذرا ہے، تشریحات ترمذی: ص:۱۹۸ ج:۶)

حدیث آخر:۔ "دَبَّ الیکم داء الامم قبلکم الحسد والبغضاءُ هی الحالقة الخ".

تم سے پہلی امتوں کی بیماری حسد اور بغض (نفرت) تم میں سرایت کر چکی ہے۔

وہ مونڈنے والی ہے میں نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ وہ دین کا استیصال کرتی ہے۔ اور اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک مؤمن نہ ہوں گے اور مؤمن نہیں بن سکو گے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہیں کرو گے اور کیا تمہیں نہ بتاؤں وہ چیز جو تمہیں محبت پر جمائے رکھے ''آپس میں سلام کو ترویج دو''۔ (حسد اور تباغض کی بحث ابواب البر والصلۃ میں گذری ہے، تشریحات: ص:۱۹۳، ۱۹۶ ج:۶)

قولہ: "دَبَّ" بفتح الدال وتشدید الباء، سرایت کرنے اور چھپ کر چلنے کو کہتے ہیں چونکہ نیکیوں اور برائیوں کے بھی شجرے ہوتے ہیں ان کی جڑیں اور شاخیں باہم ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں اس لئے نیکی جالب ہے نیکی کو اور بدی، بدی کو جنم دیتی ہے، اس لئے جب سلام عام ہوگا تو محبت پیدا ہوگی اور جب محبت پیدا ہوگی تو آپس کی نفرت وعداوت ختم ہو کر اس کی جگہ محبت آجائے گی اس طرح ایمان مضبوط اور جنت میں جانے کا ذریعہ بنے گا، اس کے برعکس ترکِ سلام سے یہ ساری عمارت منہدم ہو سکتی ہے کہ بنیاد کچی ہو تو کسی بھی وقت حادثہ پیش آسکتا ہے۔ (تدبر) قال المنذری اسناده جید کذافی تحفة الاحوذی۔

باب

"عن ابی بکرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: مامن ذنب اجدرُ ان یُعَجِّلَ الله لَصاحبه العقوبة فی الدنیامع مایدّخرله فی الآخرة مِن البغی و قطیعة الرحم". (صحیح)

حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی گناہ بغی (بغاوت) اور قطع رحم سے لائق تر نہیں کہ اللہ اس کے مرتکب کو جلد ہی دنیا میں سزا دے بمع اس عذاب کے جو اس کے لئے آخرت میں جمع کردے۔

تشریح:۔ **قوله:** "مامن ذنب" ذنب نکرہ سیاق نفی میں عموم کے لئے ہے یعنی مذکورہ دونوں گناہوں کی سزا اس اعتبار سے سب سے زیادہ اور قابل ذکر ہے کہ وہ دنیا وآخرت دونوں میں ملتی ہے البتہ اس کے لئے لفظ "اجدر" استعمال فرمایا ہے جس کے معنی "احری" کے ہیں یعنی لائق جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں گناہوں پر عاجلاً وآجلاً دونوں سزائیں مرتب ہوتی ہیں لہذا یہاں افعل التفضیل کو صرف اسی معنی میں لینا بہتر ہے کیونکہ آخرت میں کفر کی سزا بہت سخت ہے تاہم وہ باوجود اشد ہونے کے صرف آخرت میں ملتی ہے دنیا میں تو کافر مزے کرتا ہے۔

قوله: "من البغی" امام کے خلاف خروج اور ظلم کو کہتے ہیں، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ چونکہ بغی سے افساد حال ہوتا ہے اور قطعیۃ الرحم سوء ذات البین ہے جو اشد الفساد ہے اس لئے یہ عجلتِ سزا کو مقتضی ہیں۔

غرض ان دونوں سے حقوق کا ضیاع اور خلق کو ایذاء رسانی ہوتی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی سخت ناراضگی کا سبب ہیں اس لئے سزا بھی جلد مرتب ہوتی ہے تو جس طرح اصلاح ذات البین اور صلہ رحمی پر دنیاوی خوش حالی بھی نصیب ہوتی ہے اسی طرح ان کی اضداد پر بھی دنیوی واُخروی دونوں سزائیں مرتب ہوتی ہیں۔

حدیث آخر:۔ "خصلتان من کانتافیه کتبه الله شاکراً صابراً الخ".

دوخوبیاں ہیں جس میں وہ پائی جائیں، اللہ اس کو شکر گذار، صبر کرنے والا لکھے گا اور جس میں وہ نہیں ہوں گی اللہ اسے نہ شاکر لکھے گا اور نہ ہی صابر، (وہ خوبیاں یہ ہیں) (۱) جو اپنے دین کے حوالے سے اس کو دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہو اور اسی کی پیروی کرے۔(۲) اور جو اپنی دنیا کے اعتبار سے اس پر نظر کرے جو اس سے کمتر ہو تو اللہ نے اسے جتنی فضیلت کمتر پر دی ہے اس پر اللہ کا شکر کرے تو اللہ اسے شاکر وصابر لکھتا ہے اور (اس کے برعکس) جو شخص اپنے دین میں اس کو دیکھے جو اس سے کمتر ہو اور اپنی دنیا میں اس کو دیکھے جو اس سے زیادہ (مالدار) ہو اور پھر اس پر افسوس کرے جو اس کو نہیں ملا ہے تو اللہ اسے شاکر وصابر نہیں لکھتا۔ (حدیث غریب)

اس حدیث میں ایک عمدہ ضابطہ بیان فرمایا کہ چونکہ انسان میں طبعی طور پر مسابقت اور ریس کا جذبہ پایا

جاتا ہے اس لئے دین میں اپنے سے آگے والے کی طرف دیکھنا چاہئے تاکہ اعمال کی رفتار اور تیز تر ہو جائے جبکہ دنیا میں اپنے سے پیچھے والے اور نیچے والے کو دیکھنا چاہئے تاکہ آدمی کے پاس جتنا ہے اس پر شکر ادا کرے اور جو نہیں ہے اس پر صبر کرے، دوسری بات کہ دنیا میں مسابقت مطلوب و محمود نہیں ہے اس لئے جب آدمی آگے والے اور اوپر والے کو دیکھے گا تو ایک تو ناشکری کرے گا دوسرے وہ اپنی دنیوی تلاش کو مزید بڑھائے گا۔

اس مضمون کو اگلی حدیث میں خطاب کے صیغے میں بیان فرمایا ہے کہ دنیا میں اپنے سے نچلے کو دیکھو فوق والے کو نہ دیکھو کیونکہ یہ زیادہ لائق ہے کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ جانو گے۔

قولہ: "لاتزدروا" ای لاتحقروا ۔ چنانچہ تجربہ و مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جب آدمی صلحاء کے پاس بیٹھتا ہے تو اپنا عمل معمولی نظر آتا ہے اور زیادہ عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ فساق کے پاس بیٹھنے یا اپنا موازنہ ان سے کرنے سے عجب پیدا ہوتا ہے کہ میرا عمل تو ان سے بہت اچھا ہے، اسی طرح جب آدمی غریبوں کے پاس بیٹھتا ہے تو اپنی دنیوی حالت پر اللہ کا شکر کرتا ہے۔ جبکہ امیر لوگوں کے پاس جانے اور بیٹھنے سے مایوسی اور ناشکری جنم لیتی ہے، چنانچہ آج امت کی اکثریت نے جب یہ نسخہ نظر انداز کر دیا تو دنیا کی ریس میں لگ گئی اور دین سے پیچھے جانے لگی۔

باب آخر: ۔ حضرت حنظلہ اُسیدیؓ سے روایت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں سے تھے "**انہ مر بابی بکر وھو یبکی الخ**" فرماتے ہیں کہ وہ گذرے ابوبکرؓ کے پاس دراں حالیکہ وہ (حنظلہ) رو رہے تھے تو ابوبکرؓ نے پوچھا حنظلہ تمہیں کیا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حنظلہ تو منافق ہو گیا اے ابوبکر! کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور وہ ہمیں دوزخ اور جنت کی یاد دلاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں (لیکن) پھر جب ہم ان کے پاس سے لوٹتے ہیں تو اپنی بیبیوں اور کام کاج (کی چیزوں) میں مشغول ہو جاتے ہیں اور بہت ساری باتوں (یعنی نصیحتوں اور کیفیات) کو بھول جاتے ہیں، ابوبکرؓ نے فرمایا بخدا ہمارا بھی یہی حال ہے چلو ہمارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، چنانچہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو پوچھا اے حنظلہ تمہیں کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا ہے، کیونکہ جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں آگ و جنت کی یاد دلاتے ہیں تو گویا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں مگر جب ہم واپس (اپنے گھروں کو) جاتے ہیں تو اپنی بیویوں اور (دنیا کے) کام کاج (کی اشیاء) میں مشغول ہو جاتے ہیں

اور بہت ساری باتوں کو بھول جاتے ہیں (یعنی وہ سابقہ کیفیت باقی نہیں رہتی) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اس حالت پر جس کے ساتھ میرے پاس سے اٹھتے ہو ہمیشہ باقی رہو، تو فرشتے مصافحہ کریں تم سے تمہاری مجلسوں میں اور تمہارے بچھونوں پر، اور تمہارے راستوں میں ولیکن اے حنظلہ! کوئی گھڑی کیسی ہوتی ہے اور کوئی کیسی!۔ (حسن صحیح)

قولہ: "کُتّاب" بضم الکاف وتشدید التاء کاتبین وحی کی تعداد تقریباً بارہ تھی۔

قولہ: "نافق حنظلہ" یعنی نفاق کا خدشہ واندیشہ پیدا ہوا اور اندیشے کی وجہ انہوں نے خود ذکر فرمائی ہے کہ جب ہم آپؐ کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری حالت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے ہم گویا جنت ودوزخ کو روبرو دیکھتے ہیں مگر جب یہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو وہ کیفیت باقی نہیں رہتی بلکہ ہم دنیا کی چیزوں جیسے بیویوں اور کھیتوں وغیرہ میں مشغول ہوجاتے ہیں، حالانکہ آپؐ کی خدمت میں حاضری کے وقت ان چیزوں میں دل ہرگز نہیں لگتا، چونکہ یہ تو گویا دورخی ہوئی اس لئے نفاق کا گمان ہوتا ہے، اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ نفاق نہیں ہے بلکہ دلوں کا حال کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات میں صاف ستھرے ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات میں کچھ دنیاوی خواہشات وخیالات ان میں داخل ہوجاتے ہیں اگر وہ ہمیشہ دنیا کی آمیزش سے خالی رہے تو پھر تو آدمی فرشتہ یا فرشتہ صفت بن جائے گا وہ انسان کب باقی رہے گا، غرض یہ نفاق نہیں ہے بلکہ قلب کے لوازمات میں سے ہے چنانچہ اسی بناء پر اسے قلب کہتے ہیں کہ انقلابات کی زد میں رہتا ہے، اس لئے آخرت کا تذکرہ بکثرت ہونا چاہئے۔

حدیث آخر:۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی تم میں سے (کامل) مؤمن نہیں بن سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے (اسلامی) بھائی کے لئے وہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (صحیح)

یعنی آدمی جتنا اپنے بارے میں خیر خواہ ہوتا ہے اتنا ہی ہمدرد اور خیر خواہ ہونا اپنے بھائی کے لئے لازمی ہے، جس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے بعینہ وہی چیز اپنے اسلامی بھائی کے لئے بھی پسند کرے تو ایسا شخص کامل مؤمن ہے یعنی یہ فرض کیا جائے کہ اگر میں اس آدمی کی جگہ ہوتا اور میں اس جیسے ہوتا تو میں اپنے لئے کیا پسند کرتا تو جب وہی چیز دوسروں کے لئے پسند کرے گا تو وہ یقیناً ان کے ساتھ خیر خواہی کے معیار پر پورا اُترنے میں کامیاب ہوگا اور نتیجہ میں اس کا ایمان کامل شمار ہوگا۔

حدیث آخر:۔ "یاغلام انی أُعَلِّمُکَ کلمات، احفظ اللہ یَحفَظُکَ احفظ اللہَ تجدہ تُجاھَکَ الخ".

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (سواری پر) تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! میں تجھے چند کلمات بتلاتا ہوں "تم اللہ (کے حقوق واحکام) کی حفاظت کیا کرو وہ تیری حفاظت کرے گا، تم اللہ (کے حقوق واحکام) کی حفاظت کرو تم اس کو اپنے روبرو پاؤ گے اور جب سوال کرو تو اللہ ہی سے سوال کرو! اور جب مدد مانگو تو صرف اللہ ہی سے مدد مانگو اور جان لو کہ اگر سب لوگ جمع ہو جائیں اس پر تا کہ تمہیں نفع پہنچائیں تو وہ ہرگز تجھ کو نفع نہ پہنچا سکیں گے مگر صرف اتنا جتنا اللہ نے تیرے لئے لکھا ہے۔ اور اگر سب اس پر مجتمع ہو جائیں تا کہ تجھے نقصان پہنچائیں کسی چیز سے تو ہرگز نہیں پہنچا سکیں گے تجھے کچھ نقصان مگر صرف اتنا سا جتنا اللہ نے تیرے لئے لکھا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو گئے ہیں۔ (حسن صحیح)

قولہ: "احفظ اللّٰہ" دونوں جگہوں میں مراد اللہ کے اوامر ونواہی پر عمل پیرا ہونا اور اللہ کی رضا تلاش کرنا اور تقویٰ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

قولہ: "یحفظک اللہ" یعنی اللہ دنیا وآخرت میں تجھے مصائب سے بچائے گا۔

قولہ: "تجاھک" بروزن کتاب جبکہ بعض نے تاء کا ضمہ بھی جائز مانا ہے چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ جہت اور سمت سے پاک ہے اس لئے مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ہر وقت تیرے ساتھ شامل حال رہے گی۔ چونکہ مسلمان ایک مسافر کی طرح ہوتا ہے اور مسافر کی نظر آگے منزل پر ہوتی ہے اس لئے یہاں مدد ومعیت کو تجاہ سے تعبیر کیا گویا کامیابی تیرے مقابل سامنے ہوگی۔

قولہ: "رفعت الاقلام وجفت الصحف" کنایہ ہے عدم تغیر سے یعنی جو کچھ تیرے حق میں مقدر ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی چونکہ حین کتابت میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن جب کاتب لکھنے سے فارغ ہوتا ہے تو کاغذ سوکھ جاتا ہے اس لئے عدم تبدیلی کو جفاف یعنی سوکھنے سے تعبیر کیا۔

حدیث آخر:۔ "قال رجل یارسول اللہ اعقلھا واتوکل؟ او اطلقھا وَاَتَوَکل؟ قال اعقلھا وتوَکَّلَ!". (منکرٌ أو غریبٌ) (عارضہ میں ہے کہ معناً حدیث صحیح ہے)

ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول! کیا اس (سواری) کو باندھوں اور توکل کروں یا آزاد چھوڑ کر

توکل کروں؟ آپؐ نے فرمایا باندھو اور توکل کرو!۔

سائل کا مقصد یہ تھا کہ اسباب کے ساتھ توکل کروں یا بغیر اسباب کے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اسباب اختیار کرو مگر سبب کو مسبب میں مؤثر نہ مانو بلکہ اعتماد بہرحال اللہ عزوجل پر کرو، اس طرح اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، اس کی وضاحت پہلے گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ص: ۳۲۷ ج: ۶ ''باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ'' (ابواب الطب) وص: ۱۳۸، ۱۳۹ ج: ۱ ''باب کراھیۃ البول فی المغتسل'' (من ابواب الطہارۃ)۔

حدیث آخر:۔ "عن ابی الحوراء السعدی قال قلت لحسن بن علی: ماحَفِظتَ مِن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال: حَفِظتُ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "دع مایُرِیبُکَ الی مالایریبک "فان الصدق طمانیۃ وان الکذب رِیبۃ". (وفی الحدیث قصۃ). (صحیح)

ابوالحوراء سعدی فرماتے ہیں کہ میں نے حسن بن علیؓ سے پوچھا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا یاد کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ یاد کیا ہے کہ: جو چیز تجھے شک میں ڈالے اسے چھوڑ کر اس چیز کی طرف منتقل ہو جاؤ جو تجھے شک میں نہ ڈالتی ہو! اس لئے کہ سچائی سے دل میں اطمینان حاصل ہوتا ہے اور جھوٹ سے بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ العرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ شافعیہ نے قنوت الوتر میں ابوالحوراء کی روایت عن الحسن بن علی پر انقطاع کا جو اعتراض کیا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ امام ترمذیؒ نے اس سند پر یہاں صحت کا حکم لگایا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کی مراد یہ نہیں کہ صرف یہی ایک بات مجھے یاد ہے وبس بلکہ مطلب یہ ہے کہ مجھے آپؐ کا یہ فرمان بھی یاد ہے۔

قولہ: "دع مایریبک" اس میں یاء کا فتحہ وضمہ دونوں جائز ہیں ریب بفتح الراء سے بمعنی شک وتردد کے ہے جبکہ "وان الکذب رِیبۃ" میں را مکسور ہے بمعنی قلق واضطراب کے۔

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ بے غبار اعمال سے دل مطمئن رہتا ہے جبکہ مشکوک کاموں سے دل بے چین ہو جاتا ہے لہٰذا ان افعال سے بچنا چاہئے جن سے مؤمن کا دل گھبراتا ہو اور وہ کام کرنے چاہئے جن

سے بحیثیت مسلمان دل خوش و مطمئن رہتا ہو۔

قولہ: "وفی الحدیث قصۃ" یہ قصہ مسند احمد میں ہے کہ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے صدقات کی کھجوروں سے ایک کھجور لے کر منہ میں ڈالی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لعاب کے ساتھ نکال پھینک دیا باقی کھجوروں میں ایک شخص نے کہا اگر یہ (بچہ) کھالیتے تو کیا حرج تھا آپؐ نے فرمایا ہم صدقہ نہیں کھاتے قال و کان یقول "دع ما یریبک الخ"۔

حدیث آخر:۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص کا تذکرہ کیا گیا عبادت وریاضت کے حوالے سے اور دوسرے کا ذکر ورع (تقویٰ) کے حوالے سے کیا گیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ورع کے برابر کوئی چیز (عبادت وخصلت) نہیں ہوسکتی۔ (غریب)

قولہ: "واجتهاد" یعنی عبادت میں سخت محنت کرتا ہے۔ قولہ: "بِرِعة" رِعۃ بکسر الراء بِوَزۡعِ اس میں عِدَۃ کی طرح اعلال ہوا ہے۔

قولہ: "لایُعدَلُ بِالرِعۃ" یعنی لایعدل بالرعۃ شیٔ لہٰذا مفعول مالم یسم فاعلہ مقدر ہے جو کہ شیٔ ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ورع اور تقویٰ کے ساتھ کسی چیز کو برابر ومساوی نہیں کیا جاسکتا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یعدل میں ضمیر اجتہاد کی طرف لوٹتی ہو یعنی اجتہاد فی العبادات کو ورع وتقویٰ کے مساوی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ورع میں حرام ومشتبہ اشیاء سے اجتناب کیا جاتا ہے جبکہ بڑے سے بڑا عبادت گذار کبھی کبھی عدم ورع کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہوجاتا ہے حالانکہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم وراجح ہے یعنی ایسے دو آمیوں میں سے جو فرائض کی پابندی کے بعد ایک نفلی عبادت میں بہت زیادہ آگے ہو اور دوسرا تقویٰ یعنی محرمات سے اجتناب میں، متقی افضل ہے، تاہم پہلی تقدیر یعنی لایعدل بالرعۃ شیٔ زیادہ اچھی ہے تاکہ کلام میں تعمیم آجائے بنا بر ہر تقدیر "لایعدل" فعل مجہول ہے۔

حدیث آخر:۔ "من اَکَلَ طَیِّباً وعَمِلَ فی سُنَّۃٍ وَاَمِنَ الناسُ بوائقَه دَخَلَ الجنۃَ الخ".

جس نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کے شر سے محفوظ رہے تو وہ شخص جنت میں جائے گا، پس ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ایسے لوگ تو اس زمانہ میں بہت ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: میرے بعد کے زمانوں میں بھی ہوں گے۔ (غریب)

یعنی جس کے معاملات اور عبادات شرع شریف کے مطابق ہوں اور وہ شخص اسی حالت طیبہ پر زندگی

بسر کرتا ہوا مر جائے تو بغیر عذاب کے جنت میں جائے گا۔

سائل کے سوال کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ بطور شکر اس نے کہا کہ الحمد للہ ایسے لوگ تو آج بکثرت پائے جاتے ہیں اور جواب کا مقصد بھی اظہار تشکر ہے کہ الحمد للہ امت کے آنے والے لوگوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ آج کل تو ایسے لوگ بہت ہیں تو کیا آنے والے وقت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں اس امت کے ہر دور میں ایسے افراد ہوں گے اگرچہ قُربِ زمانہ میں زیادہ اور بُعدِ زمانہ میں قلیل ہوں گے لیکن مجموعی اعتبار سے امت ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوگی۔

قوله: "بوائقه" بائقۃ کی جمع ہے بمعنی مصیبت کے یہاں بمعنی شر کے ہے۔

حدیث آخر:۔ "من اعطیٰ لِلّٰه ومَنَعَ لِلّٰه وَاَحَبَّ لِلّٰه وَاَبغَضَ لِلّٰه واَنکح لله فقداستکمل ایمانه". (حدیث منکر او حسن وصححه الحاکم)

جس نے اللہ ہی کے لئے دیا اور اللہ ہی کے لئے روکا اور اللہ ہی کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے نفرت کی اور اللہ ہی کے لئے (اپنی بیٹی، بہن وغیرہ کی) شادی کر دی تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر دیا۔

یعنی جس آدمی کو ان امور میں اللہ کی رضا کے سوا کوئی لالچ اور طمع نہ ہو بلکہ محض اللہ کی خوشنودی کے حصول کی غرض سے یہ سب کام کرتا ہو تو چونکہ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس پر للّٰہیت کا غلبہ ہو اس لئے اس شخص کا ایمان کامل واکمل ایمان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ امور بغیر کسی لالچ کے آج نہ صرف مشکل ہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہیں ممکن ہے کہ ایسے لوگ آج بھی پائے جاتے ہوں جو صرف اللہ کے لئے بات کرتے ہوں اور کام کرتے ہوں لیکن جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو اکثریت فیل ہو جاتی ہے اللہ ہمیں ثابت قدم رکھے۔ آمین

☆☆☆

ابواب صفۃ الجنۃ

جنت کے احوال کا تذکرہ

باب ماجاء فی صفة شجر الجنة

(جنت کے درختوں کے احوال کا باب)

"عن ابی سعید الخدری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: فی الجنة شَجَرَةٌ یسیر الراکب فی ظلها مائة عام لایقطعها قال وذالک "الظل الممدود".(حدیث صحیح رواه مسلم ص: ۳۷۸ ج: ۲)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ سوار اس کے سایہ میں سو/100 سال تک جاتا رہے اسے ختم (عبور) نہیں کر سکے گا فرمایا یہ ظل ممدود (طویل سایہ) ہے۔

قولہ:"فی الجنة" ج،ن، مادہ میں ڈھکنے اور چھپانے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چونکہ جنت کے اشجار و باغات میں آدمی چھپ جاتا ہے جیسے گھنے درختوں میں اس لئے اسے جنت کہتے ہیں اور اس لئے بھی کہ وہ دنیا سے نظر نہیں آتی بلکہ ہمیشہ دنیا والوں سے اوجھل رہتی ہے۔ اگر چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ اس کا مشاہدہ فرمایا اور اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک جنت اور دوزخ دونوں حالاً موجود ہیں اس بارے میں معتزلہ اور خصوصاً جبائی نے جو اختلاف کیا ہے وہ شرح عقائد میں علامہ نے مدلل انداز سے مسترد کیا ہے، پھر جنت چونکہ یکبارگی نعمتوں اور لذتوں میں جنتی کو چھپاتی ہے اس لئے بھی اس کو جنت کہتے ہیں کیونکہ فعلۃ وزن مرۃ کے معنی میں آتا ہے۔ نیز جنت کے درخت زمین کو چھپاتے ہیں۔ (تدبر)

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ جنتوں کی تعداد چار ہے: دو کے برتن وغیرہ سونے کے ہیں جبکہ دو کے برتن وظروف چاندی کے ہیں **قال اللہ تعالیٰ:"ولمن خاف مقام ربه جنتان" وقال :"ومن دونهما جنتان"** جبکہ ان کے آٹھ دروازے ہیں **"وقیل ھی سبع جنات"**، پھر جو لوگ سات جنتوں کے قائل ہیں وہ

سات آسمانوں کو ہی جنات ٹھہراتے ہیں مگر یہ غلط ہے بلکہ جنات سماوات کے اقطار واطراف سے خارج ہیں جن کی چھت رحمٰن کا عرش ہے خصوصاً جنت الفردوس کی۔

پھر مسند احمد میں ہے کہ جنت کے آٹھ دروازوں میں سے صرف ایک دروازہ باب التوبہ کھلا ہے باقی سب بند ہیں۔ باب التوبہ بھی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے ساتھ بند ہو جائے گا، دوزخ کے سات دروازے دراصل اس کے سات درجے ہیں۔ کذا فی عارضۃ الاحوذی۔ ہوسکتا ہے کہ ہر طبقے کا دروازہ الگ ہو۔

قولہ: "شجرۃ" ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ یہ طوبیٰ درخت ہے ممکن ہے کہ ہر درخت اتنا پھیلا ہوا ہو۔

قولہ: "فی ظلھا" چونکہ جنت میں سورج نہیں اس لئے وہ سایہ وہاں نہیں ہوگا جو یہاں دنیا میں معروف ہے بلکہ صبح سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اسفار کے بعد جیسا وقت ہوگا لہٰذا یہاں ایک گونہ تشبیہ اور نعمت ولذت مراد ہے کہ جس طرح گرم علاقوں میں سایہ دار درخت کے نیچے ایک راحت محسوس ہوتی ہے اسی طرح اس درخت کے تحت ایک لُطف محسوس ہوگا اگرچہ وہ لطف دنیاوی سایہ سے بے شمار درجہ اعلیٰ ہوگا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سایہ سے مراد پھیلاؤ ہو یعنی وہ درخت ہر طرف اتنا پھیلا ہوا ہوگا کہ گھوڑے پر سوار بھی اگر اسے اخیر تک دیکھنا چاہے تو سو سال میں بھی نہیں دیکھ سکے گا پھر اس روایت کے اخیر میں اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا جو سورۂ واقعہ میں ہے "وظِلٍّ ممدودٍ"، مسلم میں یہ آخری الفاظ "قال وذالک الظل الممدود" نہیں ہیں۔

حدیث آخر:۔ "مافی الجنۃ شجرۃ اِلّاوساقھامن ذھب"۔ (غریب حسن)

جنت میں کوئی درخت ایسا نہیں جس کی شاخ (تنا) سونے کی نہ ہو۔

قولہ: "ساقھا" بعض روایات میں "جذوعھامن ذھب وفروعھامن زَبَرجَدٍ ولُؤلُؤٍ" آیا ہے یعنی جنت کے درختوں کے تنے سونے کے اور شاخیں زبرجد اور موتیوں کی ہوں گی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے سارے درخت ایک طرز اور ایک ہی رنگ کے نہیں بلکہ مختلف النوع ومختلف اللون ہیں جس سے باغات کی خوبصورتی مزید بڑھ جاتی ہے، پھر جب ہوا چلے گی تو یہ شاخیں بجنے لگیں گی جن کی آواز اتنی سُریلی اور خوبصورت ہوگی کہ سننے والوں نے ایسی لذیذ آواز کبھی نہیں سنی ہوگی لہٰذا وہ لوگ حُسنِ منظر کے ساتھ حسن صوت سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔

باب ماجاءِ فی صفۃ الجنۃ و نعیمہا

(جنت اور اس کی نعمتوں کے احوال کا بیان)

"عن ابی ھریرۃ قال قلنایارسول اللہ! مَا لَنا اذاکُنّاعندک رَقّت قلوبنا وزھدنا وکنا من اھل الآخرۃ فاذاخرجنامن عندک فا نَسْنَااَھَالِیناوشَمَمناَاولَادَنااَنکرنااَنفُسَنَا؟فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :لوانکم تکونون اذاخرجتم من عندی، کنتم علیٰ حالکم ذالک لزارتکم الملائکۃ فِی بیوتکم ولولم تُذنِبُوالَجَاء اللہ بخلق جدیدکئی یُذنِبُوا فَیَغفِرلھم قال: قلت یارسول اللہاِمِمَّ خُلِقَ الخلقُ؟قال من الماء اقلت الجنۃ مَابِنَاءُ ھا؟قال لَبِنَۃٌ من فضۃ ولبنۃ من ذھب ومِلاطُھاالمِسکُ الاَذفَرُ وحَصباء ھا اللؤلؤوالیاقوت وتربتھا الزعفران من یدخلھا یَنعَمُ لایباَسُ ویخلُد لایموت ولایبلیٰ ثیابھم ولایفنیٰ شَبَابُھم ثم قال ثلثٌ لایُرَدُّ دعوتھم، الامام العادل والصّائم حین یُفطِر ودعوۃ المظلوم یرفعھافوق الغمام ویفتح لھا ابواب السمآء ویقول الرب تبارک وتعالیٰ وعزتی لانصرک ولو بعد حین" ھذا حدیث لیس اسنادہ بذالک القوی ولیس ھوعندی بمتصل وقدروی ....باسنادآخر.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ کرامؓ) نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارا یہ حال کیوں ہے کہ جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو ہمارے دل نرم رہتے ہیں اور دنیا سے بےزار ہوتے ہیں اور ہم اہل آخرت سے ہوتے ہیں مگر جب ہم آپ کے پاس سے نکل جاتے ہیں اور گھر والوں کے ساتھ مشغول ہوجاتے ہیں اور اپنے بچوں کو (پیار و محبت کر کے) سونگھتے ہیں، تو ہم اپنے دلوں کو متغیر پاتے ہیں (یعنی سابقہ حالت سے مختلف) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم اسی طرح ہوتے جب تم میرے پاس سے نکلتے ہو اور تم اپنی اسی حالت پر قائم رہتے تو ضرور تم سے فرشتے تمہارے گھروں میں ملتے اور اگر تم گناہ نہ کرو تو البتہ اللہ دوسری مخلوق (تمہارے سوا) پیدا فرمائیں گے تاکہ وہ گناہ کرے اور اللہ ان کے گناہوں کو معاف کریں (یعنی محض اپنے رحم سے یا ان کی توبہ کی بدولت) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! مخلوق (انسان) کس چیز سے پیدا کی گئی ہے؟ آپؐ نے فرمایا پانی (نطفہ) سے! میں نے پوچھا جنت کی بناء (عمارت) کس چیز کی ہے؟ (پتھر سے بنی ہے یا کسی اور چیز سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک اینٹ چاندی کی ہے اور

ایک سونے کی، جبکہ اس کا گارا عمدہ مہک والی کستوری کا ہے، اور کنکریاں اس کی موتی اور یاقوت ہیں (یعنی خوبصورتی اور صفائی میں) اور مٹی اس کی زعفران ہے (یعنی زرد وخوشبودار ہے) جو اس میں داخل ہوگا وہ خوش باش رہے گا اور کسی طرح کی تکلیف نہیں پائے گا اور ہمیشہ (زندہ) رہے گا، مرے گا نہیں نہ ان کے کپڑے پُرانے (بوسیدہ) ہوں گے اور نہ ہی ان کی جوانی ختم (یا کم) ہوگی پھر آپؐ نے فرمایا تین (لوگ) ایسے ہیں جن کی دعا رد نہیں کی جاتی (۱) عادل بادشاہ (۲) روزہ دار جب روزہ کھولتا ہے (۳) اور مظلوم کی دعا جسے اللہ بادلوں کے اوپر (آگے) اٹھا لیتے ہیں اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں میری عزت کی قسم ہے کہ میں ضرور تیری مدد کروں گا اگر چہ کچھ دیر کے بعد کروں۔

قوله: "وشممنا اولادنا" ظاہری معنی پر بھی محمول کر سکتے ہیں کیونکہ چھوٹے بچوں کی اپنی مخصوص خوشبو ہوتی ہے جبکہ ان کی مائیں ان کو معطر رکھنے کا اہتمام بھی کرتی ہیں تاہم یہ پیار ومحبت سے کنایہ بھی ہوسکتا ہے، حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب وہی ہے جو حضرت حنظلہ اُسیدیؓ کی حدیث میں عنقریب گذرا ہے فلانعیدہ۔

قوله: "ولولم تذنبوا لَجاء الله بخلق جديدالخ" اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی گناہوں پر ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تمہاری جبلت وفطرت کچھ اس طرح ہے، کہ تم ایک حالت پر نہیں رہ سکتے ہو اور دوسری طرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں سے عفو ودرگزر کے مظاہر کے لئے ایک ایسی مخلوق کا ہونا بھی ضروری ہے جو ان صفات کا مظہر بن سکے اس لئے کہ جس طرح اللہ کو یہ بات پسند ہے، کہ اس کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری کی جائے اور سرمو اس کی نافرمانی نہ کی جائے تو اس طرح اس کو یہ بھی پسند ہے کہ وہ کسی گنہگار کی بخشش فرمادیں لہٰذا اگر تم سے گناہ نہ ہوجائے تو کوئی اور مخلوق آجائے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ فرشتوں کے ہوتے ہوئے اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا تو اگر تم فرشتوں کی طرح بن جاؤ گے تو پھر آپ کے بعد ایک اور مخلوق کو لایا جائے گا۔ **قوله:** "كنتم علىٰ حالكم "اى اَبقيتم على حالكم "على هذا كلام میں تکرار نہیں۔ (تدبر)

قوله: "مِمّ خلق الخلق "جب حضرت ابوہریرہؓ نے سابقہ جواب سے بھانپ لیا کہ گناہ کرنا گویا انسان کے ساتھ لازم ہے، تو انہوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آیا یہ انسانی طبیعت کا تقاضا ہے یا ایک امر عارض وطاری کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا یہاں سوال انسان کے بارے میں ہے اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنا طبعی

عمل ہے اور انسانی مزاج وتقاضوں کی تبدیلی بھی طبعی ہے کیونکہ اس کی اصل پانی ہے اور انسانی نطفہ ایک طرف مختلف النوع اشیاء سے بنتا ہے اور دوسری طرف ایک حالت پر نہیں رہتا۔

قولہ: "**ودعوة المظلوم يرفعها فوق الغمام الخ**" کنایہ ہے سرعت قبولیت سے۔ **قولہ:** "**ليس اسناده بذالک القوی**" یعنی یہ تفصیلی روایت متصل نہیں ہے اور مرسل بھی ہے اور چونکہ یہ روایت دراصل چار احادیث سے مرکب ہے کمافی تحفۃ الاحوذی اس لئے کہا جائے گا کہ یہ حکم مجموعی روایت کا ہے، پس اس کا پہلا جزء "**مالنا الخ**" مسند احمد میں ہے، دوسرا جزء "**ولولم تذنبوا الخ**" مسلم میں ہے تیسرا جزء "**مم خلق الخلق**" امام احمد، دارمی، بزار اور امام طبرانی نے ذکر کیا ہے، اور چوتھا جزء یعنی "**ثلاث الخ**" مسند احمد وابن ماجہ میں ہے اور امام ترمذیؒ نے بھی دعوات میں ذکر فرمایا ہے۔ کذا فی التحفہ عن الترغیب والترھیب)

باب ماجاء فی صِفة غُرَف الجنة

(جنت کے بالاخانوں کے احوال کا باب)

"عن علی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان فی الجنة لَغُرَفاً يُریٰ ظهورها من بطونها وبطونهامن ظهورها، فقام اليه اعرابی فقال: لِمن هی یانبی الله؟ قال: هی لمن اَطَابَ الکلام واَطعَمَ الطعام وَاَدَامَ الصیام وصلیٰ لِلّٰه باللیل والناس نیام!" (حدیث غریب)

(اخرجه احمدوابن حبان فی صحیحه)

حضرت علیؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں ایسے بالاخانے ہیں جن کا بیرونی منظر اندر سے دکھائی دے گا اور اندر کا باہر سے نظر آئے گا، پس ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر پوچھا اے اللہ کے رسول! یہ کس کے لئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا جو (حق گوئی میں) شیریں گفتگو کرے اور کھانا کھلائے اور کثرت سے روزے رکھے اور رات کو نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں۔

(اس حدیث کی تشریح ابواب البر والصلہ میں گذری ہے، دیکھئے تشریحات ترمذی: ص ۲۵۳ ج: ۶ "باب ماجاء فی قول المعروف")

حدیث آخر:۔ "**ان فی الجنة جنتین من فضة آنیتهما ومافیهما الخ**".

بے شک جنت میں دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہیں سب چاندی کے ہیں اور

دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے ظروف اور جتنی چیزیں ان میں ہیں تمام سونے کی ہیں (یعنی آرائش وزیبائش اور بیٹھنے کا سارا سامان) اور لوگوں (جنتیوں) اور ان کے رب کی طرف دیکھنے کے درمیان بڑائی کی چادر کے سوا کوئی مانع نہیں ہوگا جو اس کے وجہ پر ہوگی، وہ لوگ خلود کی جنت میں ہوں گے۔

اسی سند کے ساتھ یہ بھی مروی ہے کہ جنت میں ایک خیمہ ہے اندر سے تراشے ہوئے موتی کا، اس کی چوڑائی ساٹھ میل ہے، اس کے ہر گوشے میں (جنتی کے) اہل خانہ ہیں وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے (گویا دوری ان کے درمیان پردہ ہے) مؤمن ان پر چکر لگاتا رہے گا۔ (حسن صحیح)

قولہ: "ان فی الجنة جنتین الخ" جنت سے مراد مطلق اور مصطلح جنت ہے جو مسلمانوں کے ذہن میں ہے اور جس کی دیواروں کی ایک اینٹ سونے کی اور دوسری چاندی کی ہے اس کے اندر دو، دو جنتیں ایسی ہیں جن میں سے دو کا سب کچھ چاندی کا ہے اور دو کا خالص سونے کا ہے۔ **انیتھما** بمع معطوف کے مبتدا مؤخر ہے اور **من فضة** خبر مقدم ہے۔ **قولہ:** "الّا رداء الکبریاء علی وجھه" یہ تشابہات میں سے ہے جو تقریب الی الفہم کے لئے ہے اور **وَجھه** سے مراد ذات ہے یعنی جنتیوں کا اپنے رب کو دیکھنے سے مانع کبریاء اور ہیبت ہوگی اسی ہیبت کو رداء سے تعبیر کیا ہے تا کہ غیر مرئی کی تشبیہ بالمرئی سے کلام کا مفہوم سمجھ میں آجائے پس اللہ تبارک وتعالیٰ وقتاً فوقتاً اس چادر وحجاب نورانی کو اٹھائیں گے اور جنتی اس نعمت عظمیٰ سے محظوظ ہوں گے۔

قولہ: "فی جنة عدن" قوم کے لئے ظرف ہیں یعنی یہ جنتی ان باغات میں ہمیشہ ہوں گے، چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر قسم کے ظرف زمان ومکان سے پاک ہے اس لئے اس کو دبھم کے لئے ظرف بنانا غلط ہے۔

قولہ: "عرضھا ستون میلاً" یعنی ہر طرف سے ساٹھ میل چوڑا ہوگا۔

قولہ: "اھل" یعنی حورعین۔ **قولہ:** "یطوف" ای یجامع گویا جماع وغیرہ سے کنایہ ہے، اور ایک سے ملتے وقت دوسری حورعین کو نظر نہ آنا علت حیاء پر مبنی ہے تا کہ قربت اس کے آزادانہ ملاپ پر اثر انداز نہ ہو۔

باب ماجاء فی صفة درجات الجنة

(جنت کے درجوں کا بیان)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :فی الجنة مائة درجة مابین کل درجتین مائة عام". (حسن غریب)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں ہر دو درجوں کے درمیان سو سال کا فاصلہ ہے۔

ایک اور روایت میں دو درجوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت مذکور ہے لیکن چونکہ اصل مراد تکثیر ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں اسی طرح ان دو درجوں کے درمیان بھی بہت ساری منازل ہیں جو کل ملا کر قرآن کی آیتوں کی تعداد کے برابر ہیں گویا بڑے بڑے درجات سو ہیں اور ان کے مابین اوپر سے نیچے تک قرآنی آیات کے عدد کے مطابق ہیں یا اس سے بھی زیادہ ہیں لہٰذا اس حدیث کا ابواب الدعوات کی حدیث سے کوئی تعارض نہیں:

"یقال یعنی لِصاحب القرآن اقرأ وارقِ ورتّل کما کنت ترتّل فی الدنیا فان منزلتک عند آخر آیة تقرأبها". (ھذا حدیث حسن صحیح، ترمذی ص:۱۱۹ ج:۲)

حدیث آخر:۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رمضان کے روزے رکھے اور نماز (پابندی سے) پڑھی اور بیت اللہ کا حج کیا (راوی نے کہا) میں نہیں جانتا کہ زکوٰۃ کا ذکر فرمایا یا نہیں مگر اللہ پر کریمانہ حق ہے کہ اس کو بخشے خواہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرے یا اسی زمین پر رہے جہاں پیدا ہوا تھا، معاذؓ نے فرمایا کیا میں اس کی خبر لوگوں کو نہ دوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوڑ دو لوگوں کو تاکہ (زیادہ) عمل کرتے رہے کیونکہ جنت میں سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان آسمان وزمین کا جتنا فاصلہ ہے اور فردوس سب سے بالا اور سب (جنتوں) سے افضل ہے اور اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں بہتی ہیں، پس جب تم اللہ سے (جنت) مانگو تو فردوس مانگو۔ (وہذا عندی اصح وکذا رواہ البخاری)

قولہ: "اِلّا کان" معناً زائد ہے۔ **قولہ:** "حقاً علی اللہ" یعنی اللہ کے وعدہ کے مطابق تو جس طرح ایک دنیوی بادشاہ کسی کو دینے کا وعدہ کرتا ہے اور پھر توقع سے بھی زیادہ دیتا ہے اور وعدہ خلافی بھی نہیں کرتا تو مالک الملک کے وعدے کا کیا حال ہوگا۔

قولہ: "آلااُخبر بھاالناس" یعنی تاکہ لوگ خوش ہوجائیں۔ **قولہ:** "والفردوس اعلیٰ الجنة واوسطھا" یعنی فائق بھی ہے سب جنتوں پر اور افضل وبہتر بھی ہے مع ہذا کشادہ اور وسیع بھی ہے اور چونکہ وہ عرش کے نزدیک بھی ہے اس لئے اس کا حسین اور منور ہونا بھی بدیہی ہے پھر اس کا اعلیٰ علیین خاتم النبیین صلی اللہ

علیہ وسلم کے لئے ہے جبکہ عرش کے مقابل فرش کی جانب اسفل السافلین ابلیس علیہ اللعنۃ ہوگا، پس ضابطہ یہ ہوا کہ جو جتنا عرش کے قریب ہوگا وہ اتنا ہی افضل ہوگا اور جو جتنا فرش کے نزدیک ہوگا وہ اتنا ہی ارذل ہوگا۔

اگلی روایت میں نہروں کی تعداد بھی ذکر فرمائی ہے جن کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے یعنی پانی، دودھ، شراب اور شہد کی چار نہریں۔

باب کی آخری حدیث میں جنت کے درجات کی وسعت کا ایک اندازہ بتلایا ہے کہ اگر سب خلائق ایک ہی درجہ میں جمع ہو جائیں تو سب سما جائیں گی۔

باب ماجاء فی صفة نِساء اهل الجنة

(جنتیوں کی بیبیوں کے احوال کے بارے میں)

"عن عبدالله بن مسعود عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ان المرأة من نِساء اهل الجنة لَیُریٰ بیاض ساقها من وراء سبعین حُلّة حتیٰ یُریٰ مُخّهُا وذالک بان الله تعالیٰ یقول: "کانهن الیاقوت والمرجان" فاما الیاقوت فانه حَجَر لو ادخلتَ فیه سِلکاً ثم اِستَصفیتَه لَاُریته من ورائه".

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کی عورتوں میں سے ایک عورت کی پنڈلی کا گوراپن ستر جوڑوں (کپڑوں) کے اندر سے دیکھا جائے گا، یہاں تک کہ اس کی ہڈیوں کا گودا بھی دیکھا جا سکے گا اور یہ اس بناء پر کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "وہ عورتیں (خوبصورتی میں) گویا یاقوت اور مرجان ہیں" پس یاقوت جو ہے وہ ایک (قسم کا ہیرا) پتھر ہے اگر تم نے اس میں ڈورا ڈالا اور اس (پتھر) کو صاف کیا تو وہ ڈورا تمہیں اندر سے دکھائی دے گا۔ (یہ روایت صحاح ستہ میں سے صرف امام ترمذی نے نقل کی ہے ان کے علاوہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور امام منذری نے الترغیب والترھیب میں بحوالہ ابن ابی الدنیا بھی ذکر کی ہے، تاہم حدیث کا اکثر حصہ باب کے اخیر میں صحیح سند سے مروی ہے۔

قوله: "ان المرأة" یعنی جنس عورت یا مخصوص ایک عورت۔

قوله: "لَیُریٰ" بصیغۂ مجہول۔ **قوله: "مخها"** بضم المیم وتشدید الخاء۔

قوله: "الیاقوت والمرجان" یاقوت کے ساتھ تشبیہ صفائی میں ہے اور مرجان کے ساتھ بیاض

وسفیدی میں۔

قولہ: "اِستصفیتہ" یعنی اگر تم اسے رگڑ کر صاف کرو گے تو اندر کا دھاگا باہر سے نظر آجائے گا۔

صحیح روایات سے جو تعداد ازوجاتِ اہل جنت ثابت ہے وہ دو ہے البتہ ترمذی فضائل جہاد میں شہید کے لئے ۷۲ بیبیوں کا ذکر صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ (ص: ۲۹۵ ج: ۱۔ ایچ ایم سعید) بعض روایات میں بہتّر کی تعداد مطلق آئی ہے علیٰ ہذا پنڈلی اور جسم کی یہ خوبصورتی ہر عورت کی بھی ہوسکتی ہے علی ہذا المرأۃ میں الف لام جنس کے لئے ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وصف فقط دو حور عین کا ہو اور باقی عورتیں اس درجے کی نہ ہوں پھر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ دو عورتیں دنیا کی عورتیں ہوں گی جو حور عین سے ممتاز ہوں گی اور چونکہ عورتوں کی پیداوار زیادہ ہے اس لئے ہر جنتی کو دو، دو ملیں گی یعنی دوزخ سے نکلنے کے بعد، مگر بظاہر اصح یہ ہے کہ یہ دو بھی حور عین ہوں گی البتہ یہ اقل تعداد ہے خواص کو دو سے زیادہ ملیں گی۔ واللہ اعلم

امام ترمذیؒ نے "باب ماجاء لادنیٰ اهل الجنة من الكرامة" میں ایک ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ادنیٰ جنتی کو بہتّر حوریں ملیں گی۔

دنیا کی عورتیں جنت میں کس کے نکاح میں ہوں گی؟ مذکورہ حدیث میں مرد جنتیوں کا حکم بیان ہوا ہے جو جنتی عورتیں ہیں ان کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ جو عورت دنیا میں جس مرد کے نکاح میں تھی وہ اسی کے نکاح میں رہے گی چنانچہ ابن الجوزیؒ نے "احکام النساء" میں حضرت عائشہؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے: "المرأة لآخر ازواجها" اس سے متعدد شوہروں والی بیوہ یا مطلقہ کا حکم بھی معلوم ہوا علاوہ ازیں مندرجہ بالا کتاب میں متعدد احادیث روایت کی گئی ہیں جو اس پر ناطق ہیں کہ دنیاوی نکاح اور آخری نکاح میں رہنے والی خاتون اپنے دنیوی اور آخری شوہر کے پاس رہے گی تاہم اسے مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ اصل دارومدار اس کی مرضی پر ہوگا وہ اگر اپنے شوہر کو پسند کرتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے لئے حور مرد کا انتظام کیا جائے گا۔

احسن الفتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے "بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری شوہر کو ملے گی اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو اختیار دیا جائے گا جس کے ساتھ زیادہ موافقت ہو اس کو اختیار کرے اور بعض حضرات نے یوں تطبیق دی ہے کہ اگر سب شوہر حسن خلق میں مساوی ہوں تو آخری شوہر کو ملے گی ورنہ اختیار دیا جائے گا"۔

"عن ام سلمةؓ قلت یارسول الله! المرأة تزوّج الزوجين والثلاثة والاربعة

ثم تموت فتدخل الجنة ويدخلون معها من يكون زوجها منهم؟ قال انها تُخَيَّرُ فتختار اَحسنهم خُلقاً فتقول يارب ان هذا كان احسنهم خُلقا فى دارالدنيا فزوّجنيه، يا ام سلمة! ذهب الخُلق بخير الدنيا والأخرة".

(بحوالہ معجم طبرانی: ج:۲۳ص ۳۶۸حدیث نمبر ۸۷۰)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کی متعدد شادیاں ہوں وہ سب عورتیں اسی کو ملیں گی بشرطیکہ وہ کل یا بعض راضی ہوں۔

جہاں تک کنواری اور مطلقہ کا تعلق ہے تو ان کو بھی اختیار دیا جائے گا کہ جس مرد کو چاہیں پسند کر لیں، اگر کسی کو پسند نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے مذکر حور پیدا فرمائیں گے "ولو ماتت قبل ان تتزوج تخيّرُ ايضاً ان رضيت بآدمي زوجت منه وان لم ترض فالله يخلق ذكراً من الحور العين فيزوجها منه"۔

(مجموعۃ الفتاویٰ بحوالہ غرائب احسن الفتاویٰ: ج:۹ص:۴۴)

حدیث آخر:۔"عن ابى سعيد عن النبى صلى الله عليه وسلم قال ان اول زُمرة يدخلون الجنة يوم القيٰمة على مثل ضوء القمر ليلة البدر والزمرة الثانية على مثل احسن كوكب دُرِّى فى السماء لكل رجل منهم زوجتان علىٰ كل زوجة سبعون حلة يُرىٰ مُخ ساقها من وَرَائها". (حسن صحيح)

اولین جماعت جو جنت میں داخل ہو گی قیامت کے دن وہ چودھویں کے چاند کی طرح خوبصورت ہو گی اور دوسری جماعت آسمان کے چمکدار خوبصورت ستارے کی طرح ہو گی، ان میں سے ہر ایک شخص کے لئے دو بیبیاں ہوں گی۔ ہر بیوی پر ستر جوڑے ہوں گے جن کے پیچھے (اندر) سے اس کی پنڈلی کا گودا دیکھا جا سکے گا۔

تاہم پہلی جماعت انبیاء علیہم السلام کی ہو گی جبکہ دوسری ان کے اتباع کی ہو گی تاہم ان کے درجات ومقامات متفاوت ہوں گے مثلاً صدیقین وعلماء تمام اتباع میں نمایاں ہوں گے پھر شہداء وصلحاء حسب مراتب آسمان کے ستاروں کی طرح مختلف چمک کے حامل ہوں گے۔

باب کی احادیث سے جنتی عورتوں کا حسین ہونا ثابت ہوتا ہے کہ ان کا حُسن اتنا نمایاں ہوگا اور ان کے کپڑے اتنے لطیف ہوں گے کہ ستر جوڑوں کے باوجود ان کے جسم کا گورا پن چھپ نہیں سکے گا اور ان کے جسم اتنے شفاف ہوں گے کہ ہڈی کا گودا بھی دکھائی دے گا جیسے بلّور اور ہیرے کے اندر سے دھاگا دکھائی دیتا ہے،

غرض دیکھنے والے کو کپڑوں کے زیب وزینت سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا کیونکہ برہنہ عورت میں وہ کشش نہیں ہوتی جو لباس والی میں ہوتی ہے اور وہ لباس اس کے جسم کو مکمل چھپائے گا بھی نہیں جس سے جسمانی خوبصورتی محظوظ ہونے کا بھی موقع ملے گا یوں سمجھنا چاہئے جیسے گوری عورت اپنے چہرے پر سیاہ بالوں کا جال ڈالے یا باریک پردہ جس میں بیاض جھلکتا ہو اس طرح اندر اور باہر دونوں مناظر یکجاہ ہونے سے حسن دوبالا ہو جاتا ہے، مع ھذا وہ عورتیں حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی مکمل آراستہ ہوں گی، پس کوئی کدورت، پسینے کی بدبو یا بداخلاقی کی بدمزگی وہاں نہیں ہوگی "فطوبیٰ لمن کُنَّ له و کان لھن"۔

باب ماجاء فی صفة جماع اهل الجنة

(جنتیوں کی قوت جماع کا بیان)

"عن انسؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: یُعطیٰ المؤمن فی الجنة قوة کذا وکذا من الجماع قیل یارسول الله! اَوَیطیق ذالک؟ قال یُعطیٰ قوة مائة". (صحیح غریب)

مومن کو جنت میں اتنی اتنی (عورتوں سے یا مرتبہ) طاقت جماع کرنے کی دی جائے گی عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! کیا وہ اس کی تاب لا سکے گا؟ آپؐ نے فرمایا: اسے سو آدمیوں کی قوت دی جائے گی۔

تشریح:۔ قوله: "کذا و کذا" یا تو کنایہ ہے عورتوں کی تعداد سے مثلاً تیس یا چالیس عورتوں سے بیک وقت جماع کرے گا یا کنایہ ہے مرات سے یعنی حور عین سے بیک وقت اتنی اتنی دفعہ مثلاً تیس یا چالیس دفعہ ہمبستری کر سکے گا اور جب اس پر صحابہ کرامؓ کو تعجب ہوا کہ ایک آدمی بیک وقت اتنی زیادہ مجامعتیں کیونکر کر سکتا ہے کیونکہ جماع سے فراغت پر فتور کا طاری ہونا ایک ناگزیر حقیقت ہے، تو آپؐ نے ان کے تعجب کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ جنتی کو سو (دنیوی) آدمیوں کی بقدر طاقت دی جاتی ہے لہٰذا اس کے لئے کئی مرتبہ جماع کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ جماع کے متصل بھی ہشاش بشاش اور تر و تازہ رہے گا، اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کی بیوی بھی تازگی اور بکارت کے مرغوب وصف پر قائم ودائم رہے گی، تاکہ جنتیوں کے شغل کے تسلسل میں کوئی کمی نہ آنے پائے اس طرح وہ لوگ ہمہ وقت ہمہ تن شغل میں خوش باش رہیں گے "ضربُ الاوتار، فضُّ الابکار، تحت الاشجار علیٰ شطِّ الانھار"۔

باب ماجاء فی صفة اهل الجنة

(جنتیوں کے احوال کا بیان)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :اوّل زُمرة تلج الجنة صورتهم على صورة القمرليلة البدر لايبصُقون ولايَتَمَخَّطُون ولايتغوّطون انيتهم فيهامن الذهب وامشاطهم من الذهب والفضّة ومَجَامِرهم من الاُلُوّةِ ورشحهم المسک ولكل واحد منهم زوجتان يُرىٰ مُخُّ سُوقهامن ورآء اللحم من الحسن لااختلاف بينهم ولاتباغُضَ، قلوبهم قلبُ رجل واحديسبحون الله بُكرةً وَعَشِيّاً". (حديث صحيح)

اولین گروہ جو جنت میں جائے گا ان کی صورتیں چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گی نہ وہ تھوکیں گے، نہ ناک سنکیں گے اور نہ ہی وہ پاخانہ کریں گے، ان کے برتن جنت میں سونے کے ہوں گے اور کنگھیاں ان کی سونے چاندی کی ہوں گی، اوران کی دھونی (کی انگیٹھیاں) اُگر (لکڑی) کی ہوں گی اوران کا پسینہ مشک کی طرح خوشبودار ہوگا، ان میں ہر ایک کے لئے دو بیویاں ہوں گی دیکھا جاسکے گا ان کی پنڈلیوں کا گودا گوشت کے باہر (پیچھے) سے بوجہ خوبصورتی کے، اور جنتیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوگا اور نہ کوئی دوسرے سے بُغض (عداوت) رکھے گا ان کے دل ایک ہی آدمی کے دل (کی طرح متحد) ہوں گے وہ صبح وشام اللہ کی تسبیح کرتے ہوں گے (یعنی ہمیشہ ہمیشہ)

تشریح:۔قولہ: "لایبصقون" بُصاق سے ہے بمعنی تھوک کے ہے۔

قولہ: "ولایتمخّطون" مُخاط بمعنی رینٹ کے ہے دونوں مصدر غراب کے وزن پر ہیں یعنی نہ تو جنتی تھوکیں گے اور نہ ہی ناک پھینکیں گے کہ وہ ان عیوب سے پاک ہوں گے۔ اسی بناء پر غائط یعنی بڑا اور چھوٹا پیشاب بھی نہیں کریں گے تو جس طرح ہمارے جسم میں موجود خلیوں کا نظام ہے کہ جب ان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے تو دوسرے خلیے یا تو ان کو جسم سے خارج کرتے ہیں اور اگر وہ کارآمد ہوں تو ان کو کسی طرح کام میں لایا جاتا ہے اسی طرح جنتیوں کی غذا خلیوں کی طرح خوشبودار پسینے کی صورت میں ہضم ہوگی اور منی کی شکل میں خارج ہوگی غرض اس غذا میں فضلہ نہیں ہوگا۔

قولہ: "انیتھم الخ" ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے برتن سونے کے بنے ہوئے

ہوں گے جبکہ کنگھیاں سونے اور چاندی سے مرکب ہوں گی مگر بخاری شریف کی روایت میں اس کے برعکس مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر روایت میں ایک ایک جانب اختصار کیا گیا ہے یا ایک طرف کو دوسری پر قیاس کیا گیا ہے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حکم الگ الگ درجات کے اعتبار سے ہو کہ بعض جنتیوں کو دونوں طرح کی چیزیں ملیں گی جبکہ نسبتاً ادنیٰ درجے والوں کو ایک قسم کی صرف سونے یا صرف چاندی کی اشیاء مہیا ہوں گی، پھر سونے چاندی کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہر چیز دونوں دھاتوں سے مرکب ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے الگ الگ سیٹ بنے ہوئے ہوں۔

قولہ: "مجامرھم" مِجمر کی جمع ہے مجمر اگر بکسرۂ میم اول ہو تو انگیٹھی کو کہتے ہیں جس میں ایندھن جلایا جاتا ہے جبکہ مُجمر بضم المیم اول ہو تو خوشبو کے لئے جلائی جانے والی چیز کو کہتے ہیں اور یہاں پر یہی معنی مراد یا کم از کم زیادہ مناسب ہے۔

قولہ: "الالوّۃ" اس میں ہمزہ کا فتحہ وضمہ دونوں جائز ہیں جبکہ لام مضموم اور دال مشدد ہے عود ہندی اور اگر کی لکڑی کو کہتے ہیں جس سے اگربتیاں بھی بنتی ہیں اور بازاروں میں عام ملتی ہیں اگرچہ ان میں اصلی کم ہی ہوتی ہیں پس مطلب یہ ہوا "بخورھم بالالوّۃ" پھر ان اعواد سے خوشبو حاصل کرنے کے لئے آگ جلانا اور جنت میں آگ کا ہونا لازمی نہیں کیونکہ آج کل تو اس کی صورت بہت آسان ہے جیسے بجلی کے آلات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

قولہ: "ورشحھم المسک" یعنی رائحۃ عرقھم کرائحۃ المسک ان کے پسینے کی خوشبو مشک کی مانند ہوگی، غرض وہاں طرح طرح کی خوشبو اور قسم قسم کی نعمتوں کی بہتات وفراوانی ہوگی، اور ان نعمتوں کی وجہ سے ان کے آپس میں کوئی اختلاف، حسد اور کینہ بھی نہیں ہوگا کیونکہ یہ رذائل اخلاق وہاں جنم لیتے ہیں جہاں نعمتوں کی محدود مقدار پائی جاتی ہو اور اس کے حاصل کرنے والے بہت ہوں جبکہ جنت میں قلت اور کمی نعمت کا تصور بھی نہیں ہوگا، علاوہ ازیں رذائل اخلاق کا مادہ ہی ان کے دلوں سے نکال باہر کیا جائے گا قال اللہ تعالیٰ: "ونزعنا مافی صدورھم من غِلٍّ اخواناً علیٰ سُرُرٍ متقٰبلین"۔ (حجر آیت ۴۷)

پس ان کے دل آپس میں ایسے موافق ہوں گے جیسے ایک شخص کا دل ہوتا ہے تو جس طرح ایک شخص اپنے جسم کے بعض حصوں اور دل کے بعض اجزاء سے عداوت ودشمنی نہیں کرتا اسی طرح وہ لوگ جسد واحد کی مانند ہوں گے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المؤمنون کرجل واحد ان اشتکیٰ عینہ

اِشتکیٰ کله''۔(الحدیث رواہ مسلم)(تدبر وتشکر)

رہی ان کی تسبیح کرنے کی نعمت تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں مشقت ہوگی کیونکہ مشقتوں کی جگہ دنیا اور پھر دوزخ ہے جنت ہرگز زحمت و مشقت کی جگہ نہیں اس لئے اس عمل تسبیح سے راحت بڑھے گی جیسے ہمارا نظام تنفس ہے۔

حدیث آخر:۔''لو ان مایُقِلُّ ظُفُرممافی الجنة بَدَالَتزخرفت له مابین خوافق السمٰوٰت والارض ولو ان رجلاً من اهل الجنة اِطَّلَعَ فبدا اساوِرُہ لَطَمَسَ ضوء الشمس کماتطمِسُ الشمس ضوءَ النجوم''.(غریب)

اگراتنی (تھوڑی) سی چیز جو ناخن اٹھاتا ہے جنت کی (دنیا میں) ظاہر ہو جائے تو آسمانوں اور زمین کے کناروں کے درمیان سب چیزیں چمک اٹھیں گی اس کی وجہ سے، اور اگر جنتیوں میں سے کوئی شخص (دنیا کی طرف) جھانکے اور اس کے کنگن ظاہر ہو جائیں تو وہ سورج کی روشنی کو مٹادیں گے جیسے آفتاب ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے۔

قوله:''مایُقِلُّ''،بضم الیاء والقاف المکسورۃ وتشدید اللام جبکہ لفظ ما موصولہ ہے اس کا عائد محذوف ہے یعنی ما یُقِلُّه اَقَلَّ الشیء ای حَمَلَه یعنی جس کو اٹھائے الخ۔

قوله:''ظفر'' بضمتین ناخن۔

قوله:''لتزخرفت ''ای تزینت۔

قوله:''خوافق'' خافقة کی جمع ہے جوانب اور کناروں کو کہتے ہیں یعنی تاحد نگاہ چاروں جانب کے افق تک سب چمکیں گے۔

قوله:''اساوِر'' سِوار کی جمع ہے بروزن کتاب بمعنی کنگن کے۔یعنی جنت کی اشیاء انتہائی روشن ہیں اور جنتی لوگ انتہائی حسین ہیں۔

باب ماجاء فی صفة ثیاب اهل الجنة

(جنتیوں کے لباس کا احوال)

''اهل الجنة جُرد مُرد کَحلیٰ لایَفنَیٰ شَبَابهم ولاتبلیٰ ثِیابهم''.(غریب)

جنت والے بے ریش نوخیز سیاہ پلک ہوں گے نہ تو ان کی جوانی کبھی ڈھلے گی اور نہ ہی ان کے کپڑے پُرانے ہوں گے۔

تشریح:۔قولہ: "جُرد" اجرد کی جمع ہے جس کے جسم پر بال نہ ہوں یعنی غیر ضروری جیسے بغلوں کے بال اور زیرناف وغیرہ جبکہ مُردامرد کی جمع ہے جس کی داڑھی ابھی نہ نکلی ہو یہ صرف لڑکے کے لئے استعمال ہوتا ہے امرأۃ جرداء نہیں کہاجاتا کیونکہ اس کی داڑھی کی توقع نہیں کی جاتی۔

قولہ: "کحلی" کحیل کی جمع ہے سرگین آنکھوں والے کو کہتے ہیں بمعنیٰ مکحول جس کی پلکیں پیدائشی سیاہ ہوں جیسے تازہ سُرمہ لگایا ہوا ہو۔نیز ان کی پلکیں سیاہ ہونے کے ساتھ لمبی بھی ہوں گی۔

یعنی اہل جنت ہمیشہ عمر کے اس اسٹیج ومرحلہ پر ہوں گے جو زندگی بھر میں سب سے خوشگوار موڈ ہوتا ہے اور یہ وہ دور ہے جہاں آدمی جوانی میں پہلا قدم رکھتا ہے۔اس میں اندرونی تمام قُویٰ جوش مارتے ہیں اور آدمی اپنے آپ کو انتہائی چُست وتوانا محسوس کرتا ہے وہ خوش وخرم ہونے کے ساتھ عورتوں کی طرف بھی بھرپور میلان رکھتا ہے اور عورتیں اس کی جانب بھی مائلات ہوتی ہیں،غرض اہل جنت شادمانی کی دائمی کیفیت سے مکیف اور دِلشاد ومسرور ہوں گے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ" (الاٰیۃ) کی تفسیر میں فرمایا کہ ان فرشوں کی بلندی اتنی ہوگی جتنی آسمان وزمین کے درمیان ہے یعنی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔**(ھذاحدیث غریب واخرجہ احمدوالنسائی وابن حبان فی صحیحہ)**

قولہ: "ارتفاعھا" مبتدا ہے اور "لکمابین السماء والارض" خبر ہے اور "مسیرۃ الخ" یا تو خبر بعد الخبر ہے یا بیان یا ما سے بدل ہے۔

فرش یعنی جنتیوں کے بستروں کی اونچائی کا مطلب کیا ہے؟ تو امام ترمذیؒ نے خود اس کی تفسیر نقل فرمائی ہے یعنی مراد بستروں اور بچھونوں کی بلندی نہیں بلکہ بلند وعالی درجات میں ان کا بچھایا جانا مراد ہے کہ وہ درجے انتہائی بلند ہوں گے جن کی وجہ سے وہ بچھونے بھی بلند ہوئے۔مگر امام ترمذیؒ نے ابواب التفسیر میں سورۂ واقعہ کی اس آیت کے تحت مرفوعہ کی تفسیر کچھ یوں نقل کی ہے "وارتفاعھاکمابین السماء الخ قال ارتفاع الفرش المرفوعۃ فی الدرجات الخ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذیؒ نفس فرش کی اونچائی یعنی موٹائی پر بھی راضی ہیں نیز انہوں نے وہاں اس حدیث کو حسن کہا ہے،بعض شارحین نے دونوں کا مطلب ایک ہی بیان کیا ہے

مگر یہ دو الگ الگ مطلب بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا کہا جائے گا کہ دونوں مطلب صحیح ہو سکتے ہیں کہ مرفوعۃ نفس فرش کے اعتبار سے ہو یا مرفوعہ تو درجات ہوں البتہ یہ بستر ان درجوں کے بالائی حصوں میں بچھے ہوئے ہوں گے جس سے بستر بھی بلند و بالا نظر آتے ہوں گے۔

پھر اگر نفس بستر بلند ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تو حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ **فُرُش مرفوعة علی الاسرة** یعنی وہ پلنگوں پر بچھے ہوئے ہوں گے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر بچھے ہوئے ہوں گے جیسے آج کل لوگ فوم کے گدّے ایک دوسرے پر بچھا کر پلنگ کی طرح بلند کرتے ہیں جبکہ بعض مفسرین نے ''**فرشٌ مرفوعة**'' سے مراد عورتیں لی ہیں اور عرب عورت پر فرش کا اطلاق کرتے ہیں یعنی عالی القدر عورتیں ہوں گی۔

باب ماجاء فی صفة ثِمار الجنة

(جنت کے پھلوں کا بیان)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے انہوں نے سِدرۃ المنتہٰی کا ذکر فرمایا، آپؐ نے فرمایا ''**یسیر الراکب فی ظل الفَنَن منها مائة سنة او یستظل بظلها مائة راکب شکّ یحییٰ فیها فراش الذهب کان ثمرها القِلال**''۔ (ہذا حدیث حسن صحیح غریب)

سوار اس کی شاخ کے سایہ میں سو سال تک جا سکتا ہے یا فرمایا کہ سو (۱۰۰) سوار اس کے سایہ تلے سایہ کریں گے (تعبیر الفاظ میں راوی) یحییٰ کو شک ہے اس (سدرہ) میں سونے کے پتنگے ہیں گویا سدرۃ المنتہٰی کے پھل مٹکے ہیں۔ (یعنی مٹکے کی طرح بڑے بڑے بیر لٹکے ہیں)

تشریح:۔ قوله: ''**سِدرة المنتهیٰ**'' آخری بیری کا درخت یعنی جہاں اس عالم کی انتہاء ہو جاتی ہے کہتے ہیں کہ یہ درخت ساتویں آسمان کے اوپر عرش رحمٰن کے دائیں واقع ہے اس کے منتہٰی ہونے کی متعدد وجوہات بیان کی گئی ہیں مثلاً وہاں تک جنات پھیلی ہوئی ہیں اس سے آگے عرش ہے۔ یا وہاں تک ملائکہ کا علم پہنچ سکتا ہے اس سے آگے کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہے سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے۔

قوله: ''**الفنن**'' **بفتحتین** غُصن وشاخ کو کہتے ہیں جمع افنان آتی ہے اس بیری کے درخت پر سونے

کے پتنگوں کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ چونکہ درخت پر پتنگے لپکتے ہیں اسی طرح اس سدرہ پر بھی پتنگے ٹوٹ پڑتے ہیں وہ یقیناً نورانی پتنگے ہوں گے تگران پر سونے کا اطلاق خوبصورتی کی بناء پر کیا گیا، اگرچہ اس کو ظاہر پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ وہ واقعتاً سونے کے ہوں بنا بر ہر تقدیر تتلیوں اور پروانوں سے درخت کا حسن بڑھتا ہے خواہ وہ سونے کے ہوں یا کسی اور چیز کے، مگر جنتیوں کے لئے اس میں بڑی خوشخبری ہے کہ وہ اس دلکش منظر سے محظوط ہوں گے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی صفة طیر الجنة

(جنت کے پرندوں کا بیان)

"عن انس بن مالک قال سُئِل رسول الله صلی الله علیه وسلم ماالکوثر؟قال: ذاک نهر اعطانیه الله یعنی فی الجنة اشد بیاضاً من اللبن واحلیٰ من العسل فیه طیرٌ اعناقها کاعناق الجُزُرِ قال عمر: ان هذه لَنَاعِمَةٌ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اَکَلَتُهاانعَمُ منها". (حسن)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کوثر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایک نہر ہے جو مجھے اللہ نے عطا فرمائی ہے (راوی کہتا ہے) یعنی جنت میں جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی مانند (لمبی) ہیں (حضرت) عمرؓ نے فرمایا یہ تو بڑے خوش عیش ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کے کھانے والے ان سے بھی زیادہ خوش عیش ہوں گے۔

تشریح:۔ اس نہر کوثر سے میدان محشر میں حوض کوثر کو بھرا جائے گا جس کا تذکرہ ابواب صفۃ القیمۃ میں گذرا ہے اسی جلد میں دیکھئے "باب ماجاء فی صفۃ الحوض" اور اس کے مابعد والا باب "باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض"۔

قولہ: "الجُزُر" بضمتین جزور بفتح الجیم کی جمع ہے وہ اونٹ یا اونٹنی جسے نحر و ذبح کے لئے مختص کیا گیا ہو چونکہ جنتی ان پرندوں کا گوشت کھائیں گے اور آبِ کوثر پئیں گے اس لئے ان کے بڑے مزے ہوں گے۔

قولہ: "اکلتها" بروزن طلبۃ وبَرَرَۃ بھی پڑھ سکتے ہیں اور فاعلۃ وناعمۃ کے وزن پر بھی، پہلی صورت میں آکل

کی جمع ہے اور دوسری صورت میں آکل کی تانیث مستعمل بمعنی جمع ہے۔

قولہ: ''انعم'' اسم تفضیل بالنسبۃ الی الناعمۃ کے ہے یعنی وہ پرندے اگرچہ بہت خوش باش ہوں گے مگر ان کے کھانے والے ان سے بھی زیادہ خوش باش ہوں گے اگرچہ فی نفسہ دونوں ہی خوش نصیب ہیں۔ جنت میں پرندوں کا ثبوت قرآن کی آیت اور متعدد احادیث سے ہوتا ہے ''وَلَحمِ طَیرٍ مِمَّا یَشتَھُونَ ''۔ (واقعہ آیت: ۲۱) خواہ آبی ہوں یا غیر آبی ہر قسم کے پرندے ہوں گے۔

باب ماجاء فی صفة خیل الجنة

(جنت کے گھوڑوں کا حال)

''ان رجلاً سَئَلَ النبیَ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یارسول اللّٰہ! ھل فی الجنة من خیل؟ قال: اِنِ اللّٰہُ اَدخَلَکَ الجنة فلا تشاء ان تُحمَلَ فیھاعلی فرس من یاقوتة حمرَاء تطیربِکَ فی الجنة حیثُ شئتَ (اِلّاافعلتَ!) قال وساله رجل فقال یارسول اللہ ھل فی الجنة من ابل؟ قال فلم یقل له ماقال لِصاحبه فقالَ اِن یدخلک اللہ الجنة یکن لک فیھامااشتھت نفسُک ولذت عینُکَ''. ھذاحدیث لیس اسناده بالقوی)

حضرت بُریدہ بن حُصیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پس وہ کہنے لگا اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ نے تجھے جنت میں داخل کیا تو تم نہیں چاہو گے کہ سوار کردیئے جاؤ یاقوت کے سرخ گھوڑے پر اور وہ تجھے اُڑا کر جنت میں وہاں لے جائے جہاں تو چاہے گا مگر ایسا ہی ہوگا۔

راوی نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اور شخص نے پوچھا، اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں اونٹ ہوں گے؟ پس آپ نے اس کو وہ جواب نہیں دیا جیسے اس کے ساتھی (پہلے سائل) کو دیا تھا، آپ نے فرمایا: اگر اللہ نے تجھے جنت میں داخل فرمایا تو تیرے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو تیرا جی چاہے اور آنکھیں لطف اندوز ہوں!

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارکؒ کی حدیث جو سفیان ثوریؒ سے مروی ہے اور مرسل ہے حدیث باب یعنی مسعودی کی روایت سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ سفیان بمقابلہ مسعودی اوثق واتقن ہیں۔

تشریح:۔ قولہ: "اِنِ اللّٰہُ اَدخلکَ الجنۃ" شرط ہے اور جزاء اکثر نسخوں میں مقدر ہے یعنی "اِلّافعلت" یا اِلّا حَمَلتَ کماتشاء جبکہ مشکوۃ میں بحوالہ ترمذی "الافعلت" موجود ہے پھر فعلت بصیغہ مخاطب بھی مروی ہے معروف بھی و مجہول بھی، واحد مؤنث معروف بھی صحیح ہے (تدبر) پھر اِنِ اللّٰہ میں اِن بکسر الھمزہ ہے کہ شرطیہ ہے جبکہ لفظ اللہ مرفوع علی شریطۃ التفسیر ہے۔

قولہ: "ان تحمل" بصیغہ مجہول۔

آپؐ نے جواب علی اسلوب الحکیم دیا یعنی جنت میں دنیوی گھوڑوں کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ وہاں کی ہر چیز کی طرح گھوڑے بھی انتہائی نفیس اور عمدہ و مزین ہوں گے چاہے آپ اسے فرش پر چلائیں یا فضاء میں اڑائیں جیسے موٹر، سکوٹر اور جہاز وغیرہ۔

آپؐ نے دوسرے سائل کو جواب قاعدہ کلیہ کی شکل میں دے دیا تاکہ سوالات کا غیر معمولی سلسلہ قائم نہ ہو جائے بلکہ ہر خواہشمند کے لئے یہ ضابطہ ہے کہ وہ جو چیز بھی پسند کرے گا وہ اسے ملے گی خواہ وہ گھوڑا یا اونٹ ہو یا اور طرح کی سواری چونکہ ایک زمانے کے لوگوں کے تصور میں آنے والے وقت کی اشیاء نہیں آتی ہیں اس لئے قاعدہ بتلا دیا کہ جو کچھ دنیا میں ہے وہ جنت میں بھی ہے تاہم دنیاوی چیزیں صرف ماڈل اور نمونے ہیں جبکہ جنتی اشیاء اصلی، حقیقی اور لافانی و جاویدانی ہیں۔

باب کی اگلی حدیث کا مضمون بھی اسی کے مطابق ہے البتہ اس میں یہ اضافہ ہے کہ اس گھوڑے کے دو پر (بازو) ہوں گے، تجھے اس پر سوار کر دیا جائے گا پھر وہ تجھے اُڑا کر لے جائے گا جہاں تو چاہے گا، اگرچہ پہلی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑا اُڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے جیسا کہ لفظ "تَطِیرُ بِکَ" سے معلوم ہوتا ہے مگر کبھی کبھی طیران سرعت سے کنایہ بھی ہو سکتا ہے دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ وہاں معنی مجازی یعنی سرعت سیر مراد نہیں بلکہ اڑنا مراد ہے کیونکہ جناحان اڑنے کی تصریح کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی سَنِّ اھل الجنۃ

(جنتیوں کی عمر کے بارے میں)

"یدخل اھل الجنۃ الجنۃَ جرداً مرداً مکحّلین ابناء ثلاثین اوثلاث وثلثین سنۃ".

(حدیث حسن غریب)

جنت والے جنت میں بالوں سے صاف بے ریش سُرمہ گوں آنکھوں والے داخل ہوں گے جوتیس سال کے یافرمایا کہ تینتیس سال کے ہوں گے۔

تشریح:۔ حدیث کا پہلا حصہ"باب ماجاء فی صفة ثیاب اهل الجنة" میں عنقریب گزرا ہے۔

اس روایت میں اہل جنت کی عمر کے حوالے سے راوی کوشک ہے کہ ۳۰ سال ہوگی یا ۳۳، مگر امام احمدؒ، امام بیہقیؒ، امام طبرانیؒ اور ابن ابی الدنیاؒ نے بغیر شک کے ۳۳ سال نقل کیا ہے۔ کذا فی تحفة الاحوذی

یہاں یہ اشکال بظاہر وارد ہوتا ہے کہ جب داڑھیاں نہیں نکلی ہوں گی تو پھر وہ ۳۳ سال کے کیسے ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ باعتبار ابتدائی عروج شباب کے بے ریش ونوعمر ونوجوان ہوں گے مگر ہڈی واعصاب کی قوت کے لحاظ سے اپنے کمال وانتہاء کو پہنچے ہوں گے علیٰ ہذا ان میں ابتدائی جوانی اور انتہائی طاقت دونوں صفات مجتمع ہوں گی جو ۳۳ سال ہیں۔ (تدبر)

باب ماجاء فی کم صف اهل الجنة

(جنتیوں کی صفیں کتنی ہوں گی؟)

"اهل الجنة عشرون ومائة صف ثمانون منهامن هذه الامة واربعون من سائر الامم". (حسن)

حضرت بُریدہ بن حُصیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت والوں کی ایک سوبیس (۱۲۰) صفیں ہوں گی اسّی (۸۰) ان میں سے اِسی امت کی ہوں گی اور چالیس (۴۰) صفیں باقی (سب) اُمتوں کی ہوگی۔

تشریح:۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ یہ اسی (۸۰) صفیں باقی چالیس کی مساوی فی العدد ہوں گی تا کہ اس روایت کا آنے والی اور اُن دیگر روایات سے تعارض نہ آئے جن میں اس امت کو اہل جنت کا نصف قرار دیا گیا ہے، لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس توجیہ کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام صفوف باہم مساوی ہوں گی علیٰ ھذا امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیۃ وتسلیما باقی اہل جنت کے مقابلے میں دوتہائی ہوگی اور جن روایات میں ربع، ثلث اور نصف فرمایا گیا ہے تو وہ اولین اطلاع اور آپ ﷺ کی رجاء کے

مطابق ہے اور جیسے جیسے امت مرحومہ پر اللہ کا فضل ببرکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑھتا گیا تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ ان کی تعداد اہل جنت کی نسبت بہت زیادہ ہوگئی جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم تقریباً چالیس آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک خیمے میں تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم اہل جنت کے چوتھائی رہو؟ سب نے کہا "ہاں جی" آپؐ نے فرمایا کیا تم اس پر خوش ہو کہ تم جنت والوں کے تہائی رہو؟ صحابہ نے جواب دیا "جی ہاں" آپؐ نے فرمایا کیا تم اس پر رضامند ہو کہ جنتیوں کے نصف (آدھے) ہو (پھر فرمایا) بے شک جنت میں سوائے مسلمان آدمی کے کوئی (غیر مسلم) داخل نہیں ہوگا، تم اہل شرک کی نسبت نہیں ہو مگر (اتنے) جیسے کالے بیل کی کھال پر سفید بال، یا فرمایا کہ سُرخ بیل کی کھال پر سیاہ بال کی طرح۔ (حسن صحیح)

یعنی مشرکین کی تعداد کے مقابلہ میں اس امت کی تعداد ایسی ہے جیسے کالے بیل کے جسم پر سفید بالوں کی تعداد یا سرخ بیل کے بدن پر کالے بالوں کی، جبکہ اہل جنت کے مقابلہ میں امۃ مرحومہ کی تعداد نصف ہوگی مگر اوپر بیان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع سے یہی امید تھی مگر اللہ نے ان کی توقع سے زیادہ آپؐ کو راضی فرمایا اور تعداد دو تہائی فرما دی قال اللہ تعالیٰ: "وَلَسَوفَ يُعطِيكَ رَبُّكَ فَتَرضىٰ"۔ (الضحیٰ آیت:۵)

باب ماجاء فی صفة ابواب الجنة

(جنت کے دروازوں کا تذکرہ)

"بابُ امتی الذی یدخلون منه الجنة عرضه مسیرة الراکب المجوّد ثلاثاً ثم انهم لَيُضغَطُونَ علیه حتیٰ تکاد مناکبهم تزول". (غریب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس دروازے سے میری امت جنت میں داخل ہوگی اس کی چوڑائی تیز رفتار گھڑسوار کے تین (دن یا سال) کی مسافت ہے، پھر بھی اتنا ہجوم ہوگا اس دروازے پر کہ ان کے کندھے اُترنے کے قریب ہو جائیں۔

تشریح:۔ قوله: "الراکب المجوِّد" بصیغہ اسم فاعل راکب کا وصف بھی بن سکتا ہے اور سواری یعنی گھوڑے کا بھی، تجوید کے معنی جید اور عمدہ بنانے کے ہیں یعنی جو خوب تیز چلتا ہو جبکہ "ثلاثا" میں بھی دو احتمال ہیں کہ مراد تین دن ہو یا تین سال کی مسافت ہو۔

قولہ: ''لَیُضغَطُونَ'' ضغط کے معنی دب جانے اور دبانے کے ہیں یعنی رش واز دحام کی وجہ سے ان کے کندھے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے قریب ہو جائیں گے۔ یہ کنایہ ہے کثرت سے ورنہ جنت میں یا اس میں داخل ہونے میں کسی طرح تکلیف نہیں ہوگی اگر چہ صراط پر کچھ کم وبیش مسائل ضرور بعض اہل ایمان کو پیش آئیں گے، مگر جنت کی حدود میں داخل ہونے کے بعد یہ تمام مسائل ختم ہو جائیں گے، مع ھذا یہ حدیث سند کے اعتبار سے کمزور بھی ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ امام بخاریؒ نے فرمایا ہے: ''لِخَالد بن ابی بکر مناکیر عن سالم بن عبداللّٰہ''۔

باب ماجاء فی سُوق الجنة

(جنت کے بازار کے متعلق)

''عن سعید ابن المسیب انه لقی اباهریرة فقال ابوهریرة اسألُ اللهَ ان یجمع بینی وبینک فی سوق الجنة فقال سعید أفیها سوق؟ قال نعم الخ''. (حدیث غریب)

حضرت سعید بن مسیبؒ سے مروی ہے کہ ان کی ابو ہریرہؓ سے ملاقات ہوئی تو ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور آپ کو جنت کے بازار میں جمع کر دے، تو سعید نے پوچھا کیا اس (جنت) میں بازار ہے؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہاں ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتلایا ہے کہ جب اہل جنت اس (جنت) میں داخل ہوں گے تو وہ اپنے اپنے اعمال کے تفاضل کے مطابق اس میں سکونت پذیر ہوں گے، پھر دنیوی دنوں کے حساب سے (ہفتہ بھر کے بعد) بروز جمعہ ان کو بلایا جائے گا تو وہ اپنے رب کی زیارت (دیدار) کریں گے (گویا سب ایک مقام پر جمع ہو جائیں گے) اور ان کو رب کا عرش دکھائی دے گا اور ان کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ جلوہ افروز ہوں گے جنت کے باغات میں سے ایک باغ میں، اور ان کے لئے کچھ منبر نور کے رکھ دیئے جائیں گے، کچھ موتیوں کے، کچھ یاقوت کے، کچھ منبر زبرجد کے، کچھ منبر سونے اور کچھ منبر چاندی کے اور ان (جنتیوں) کے کمتر بیٹھیں گے (دراں حالیکہ جنت میں کوئی کمتر نہیں) مشک اور کافور کے ٹیلوں پر وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ کرسیوں پر بیٹھنے والے ان سے افضل ہیں نشستوں کے اعتبار سے (حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا ہم اپنے رب کو دیکھ سکیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں'' بھلا کیا تمہیں سورج کے دیکھنے میں یا چودھویں رات کے چاند میں شک ہے؟ ہم نے کہا کہ نہیں! آپؐ

نے فرمایا اسی طرح تم شک نہیں کرو گے اپنے رب کے دیدار میں (یعنی کوئی ابہام باقی نہیں رہے گا اور نہ ہی استبعاد رہے گا)۔

چنانچہ اس مجلس میں کوئی نہیں بچے گا مگر اس سے روبرو اللہ گفتگو فرمائیں گے بالمشافہ، یہاں تک کہ ان میں سے ایک شخص سے فرمائیں گے اے فلان ولدِ فلان! کیا تجھے وہ فلان دن یاد ہے جب تم نے ایسا ویسا کہا تھا؟ چنانچہ اسے دنیا کی کچھ بے وفائیاں اس کی یاد دِلائیں گے (یعنی گناہ) پس وہ شخص کہے گا اے میرے رب! کیا تم نے مجھے نہیں بخشا ہے؟ اللہ فرمائیں گے کیوں نہیں میری وسعتِ مغفرت ہی کی بدولت تو تم اپنے اس درجہ پر فائز ہوا، دریں اثناء وہ اسی گفتگو میں مشغول ہوں گے کہ ان کے اوپر سے ایک بادل ان کو ڈھانپ لے گا سو وہ ان پر ایسی (عمدہ) خوشبو برسائے گا کہ انہوں نے اس کی خوشبو کی طرح کوئی چیز نہیں پائی ہوگی، اور ہمارا رب فرمائیں گے جاؤ اس کرامت کی طرف جو میں نے تمہارے لئے تیار کی ہے، اور جو چاہو وہ لے لو، چنانچہ ہم ایک بازار میں آئیں گے جس کو فرشتوں نے گھیر رکھا ہوگا (اس بازار کا عالم یہ ہوگا کہ) نہ تو آنکھوں نے اس جیسا کبھی دیکھا ہوگا اور نہ ہی کبھی کانوں نے سُنا ہوگا، اور دلوں میں اس کا تصور تک نہیں گذرا ہوگا، وہاں ہمارے سامنے ایسی چیزیں پیش کردی جائیں گی جیسا ہی ہم چاہیں گے حالانکہ نہ تو وہاں بیع ہوگی اور نہ ہی شراء، اور اس بازار میں اہل جنت ایک دوسرے سے ملیں گے، آپؐ نے فرمایا کہ اونچے درجے والا ایک شخص اس جنتی کی طرف متوجہ ہو کر ملے گا جو اس سے درجہ میں کمتر ہوگا حالانکہ وہاں کوئی (دراصل) کمتر نہیں ہوگا پس اس کم درجے والے کو وہ لباس پسند آئے گا جو بلند درجہ والے پر ہے، پس ابھی اس سے بات چیت ختم نہیں ہوگی کہ اس کے جسم پر ظاہر ہوگا اس سے بھی اچھا لباس، اور یہ اس لئے کہ کسی جنتی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ جنت میں پریشان ہو جائے، پھر ہم اپنے اپنے محلات کی جانب لوٹیں گے تو ہماری بیویاں ہمارا استقبال کریں گی (یعنی ملنے کے لئے آئیں گی) سو وہ ترحیب وتہلیل یعنی خوش آمدید کہیں گے اور یہ کہ یقیناً آپ جس حالت میں ہمارے پاس سے چلے گئے تھے اس سے زیادہ حسن وجمال لے کر آئے ہیں! پس ہم جواب میں کہیں گے کہ آج ہم نے اپنے رب پروردگار کے ساتھ (بلا بیانِ وتصورِ کیف) مجالست کی ہے اس لئے ہم جس طرح لوٹے ہیں ہم اسی کے سزاوار ہیں۔

تشریحِ لغات:۔ **قوله: "في مقدار يوم الجمعة"** اس سے مراد دنیوی ہفتے جتنا وقفہ بھی ہوسکتا ہے مگر زیادہ ظاہر یہ ہے کہ دنیوی سات دن کے بقدر جمعہ والا دن مراد ہے یعنی ہر جمعہ کے روز۔

قوله: "ویبرز" ای یظهر۔

قوله: "وَیَتَبَدّیٰ" بَدَایَبدُو بمعنی یظهر ویَتَجلّیٰ۔

قوله: "ویجلس ادناهم" چونکہ ادنیٰ بمعنیٰ کم گریڈ اور نچلے درجے کے بھی آتا ہے جو یہاں مراد ہے یعنی اوپر والے درجوں سے نیچے اور بمعنی خسیس ونکمہ کے بھی آتا ہے جن کو عرف میں سَفلَہ کہا جاتا ہے جو یہاں مراد نہیں اس لئے احتمال ثانی کی نفی فرمادی کہ "ومافیهم من دنیّ" یعنی جنت میں کمینہ اور نکمہ کوئی نہیں ہے۔

قوله: "تتمارون" مِریۃ بکسر المیم سے بمعنی شک کرنے کے ہے۔

قوله: "اِلّا حَاضَرَہ" محاضرہ آمنے سامنے گفتگو یعنی مکالمہ کو کہتے ہیں یعنی اس بات چیت کے دوران کوئی حجاب یا کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔

قوله: "غدراته" بفتحاتِ غدرۃ کی جمع ہے اصل میں بے وفائی کو اور دھوکہ کو کہتے ہیں مگر گناہ میں چونکہ عہدِ ربوبیت والتزامِ حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے اس لئے معصیت کو غدر کہا جاتا ہے، یہ تذکیر ازدیادِ شکر کے لئے ہے۔قوله: "مالم تنظر" سوق سے بدل ہے یعنی "نأتی سوقاً لم تنظر العیون الخ"۔ قوله: "فیروعه" ای فیعجبه یعنی اس ادنیٰ کو اعلیٰ جنتی کا لباس پسند آجائے گا۔

قوله: "حتیٰ یُخیّلُ الیه" بصیغه مجهول ای یظهر علیه الخ یعنی اول ملاقات میں ادنیٰ جنتی کے دل میں اعلیٰ لباس پر رشک آئے گا تو ابھی ان کی بات چیت ختم نہیں ہوئی ہوگی کہ اس کے بدن پر اس سے بھی اچھا لباس ظاہر ہوجائے گا، اس سے ملتے جلتے مضمون کی حدیث حضرت انسؓ سے مسلم میں بھی مروی ہے۔(مسلم: ج:۲ص۳۷۹)

حدیث آخر:۔ جنت میں ایک بازار ہے جس میں خرید وفروخت نہیں ہے مگر تصاویر (شکلیں) ہوں گی مردوں اور عورتوں کی پس جب کوئی شخص کوئی شکل پسند کرے گا تو وہ اس میں داخل ہوجائے گا (یعنی اس کی شکل اسی طرح بن جائے گی)

اس حدیث کو ابن جوزیؒ نے موضوعات میں سے شمار کیا ہے جیسا کہ حاشیہ قوت المغتذی پر ہے بوجہ عبدالرحمٰن بن اسحاق کے مگر امام حاکمؒ نے ان کی دوسری حدیث کی تصحیح کی ہے اور ابن خزیمہؒ نے اپنی صحیح میں ان کی حدیث کی تخریج کی ہے امام احمدؒ نے بھی فرمایا ہے کہ "لیس بشئی منکر الحدیث"۔

چونکہ اس حدیث میں "دخل فیها" کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتی اس تصویر کے اندر

داخل ہوگا حالانکہ یہ تو مستبعد ہے اس لئے اس کی سند پر کلام ہوا مگر اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ تصویر سے مراد شکل ہے اور اس میں داخل ہونے سے مراد متشکل ہونا ہے یعنی اس کی شکل مرئی شکل کی طرح ہو جائے گی لہٰذا اس میں استبعاد نہیں ہے۔

بناء بر ہر تقدیر یہ تبدیلی ذات میں نہیں ہوگی بلکہ اوصاف میں ہوگی اور جنتی لوگ مسلسل حسن و جمال میں ترقی کرتے رہیں گے تو جس طرح دنیا کے فیشن کی کوئی انتہاء نہیں ہے اور وقتاً فوقتاً نیا نیا فیشن آتا رہتا ہے اسی طرح جنت میں بھی ہوگا۔ (تدبر)

باب ماجاء فی رؤیة الله تبارک وتعالیٰ

(اللہ تبارک وتعالیٰ کے دیدار کے بارے میں)

"عن جرير بن عبدالله البَجَلي قال كُنا جلوسا عند النبي صلى الله عليه وسلم فنظر الى القمر ليلة البدر فقال: انكم ستُعرضون على ربكم فَتَرونه كما ترون هذا القمر، لاتضامون فى رؤيته فان استطعتم ان لاتُغلبُوا على صلوٰة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا ثم قرأ: "فسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب". (صحيح)

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا تم اپنے رب کے سامنے پیش کئے جاؤ گے پس تم اس کو دیکھو گے جیسا کہ دیکھتے ہو اس چاند کو، اس کے دیکھنے میں تمہارے سامنے کوئی آڑ نہیں کی جائے گی (یا زحمت نہیں اٹھاؤ گے) پس اگر تم سے ہوسکے کہ (اپنے کاموں کی وجہ سے) تم سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے کی نمازوں میں مغلوب نہ ہوں تو ایسا ہی کرو! پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ لی الخ۔

تشریح:۔ قولہ: "لاتضامون" بضم التاء جبکہ میم کو بالتشدید والتخفیف دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں تخفیف کی صورت میں ضیم سے ہے بمعنی ظلم کے یعنی کوئی کسی کے آڑے نہیں آئے گا اور رکاوٹ نہیں بنے گا بلکہ سب لوگ بآسانی دیکھ سکیں گے، جبکہ تشدید کی صورت میں انضمام کے معنی میں ہے بمعنی ازدحام کے یعنی اس دیدار میں کسی طرح مزاحمت نہیں ہوگی کہ بعض نہ دیکھ سکے بلکہ سب لوگ بغیر زحمت و بغیر ازدحام کے اسی طرح

دیکھیں گے جیسے چودھویں کا چاند بغیر رش کے دیکھا جاسکتا ہے، بناء بر ہر تقدیر تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ نہ تو وہاں کوئی کسی پر ظلم کر کے اس کا حق دیدار چھین سکے گا اور نہ ہی رش کی وجہ سے کوئی زحمت اٹھانی پڑے گی۔

یہ حدیث اور اسی طرح دیگر متعدد احادیث اور قرآنی آیات اللہ تبارک وتعالیٰ کی رؤیت پر صریح ناطق ہیں کہ اہل ایمان آخرت میں دیدار الٰہی کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہوں گے، اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ ہے جیسا کہ شرح عقائد وغیرہ میں تفصیلاً بیان ہوا ہے جبکہ معتزلہ ایسی تمام نصوص میں تاویل کرتے ہیں کیونکہ وہ دیدار الٰہی کے منکر ہیں جیسا کہ ان کے اصول ہیں کہ ہر حکم کو مادی فلسفہ واسباب پر، پرکھتے ہیں تو بقول ان کے چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دیدار میں بھی وہی شرائط ہونی چاہیئے جو مادی اشیاء کے دیکھنے کے لئے ضروری ہیں جبکہ اللہ عزوجل ان اسباب سے عالی و پاک ہے اس لئے اس کو دیکھنا ممکن نہیں پس اس آیت ''الی ربھا ناظرۃ'' کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے رب کی نعمتوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے یعنی ''الی نِعَمِ ربھا ناظرۃ'' اسی طرح باقی نصوص میں بھی تاویل کرتے ہیں۔

ہمارے اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک ایسی تمام نصوص کو بلا تاویل ظاہر پر رکھنا اور حقیقی دیدار پر محمول کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ تاویل خلاف ظاہر ہے اور جہاں تک معتزلہ کی دلیل کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عالم آخرت کے احوال کو دنیا کے حالات واسباب پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ جب یہ پردہ اُٹھ جائے گا تو اسباب کی تمام عمارات منہدم ہو جائیں گی۔

پھر حدیث باب میں ان دو نمازوں کا ذکر ان کی زیادہ اہمیت کے لئے بھی ہے اور اس لئے بھی کہ ان دو نمازوں کے قضاء ہونے کا خدشہ پایا جاتا ہے۔ کہ صبح آدمی سویا رہتا ہے بستر چھوڑ کر اُٹھنا مشکل ہوتا ہے جبکہ عصر کا وقت مصروفیات کی بناء پر تنگ ومختصر سا محسوس ہوتا ہے، نیز دیدار الٰہی صبح وشام ہوگا اس لئے ان نمازوں کی تاکید فرمائی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز دیدار خداوندی کا ذریعہ ہے لہٰذا آدمی جتنی زیادہ نمازیں پڑھے گا اتنا ہی کثرت سے دیدار نصیب ہوگا۔ علاوہ ازیں جب کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے تو اس کی ضیافت بھی کی جاتی ہے اور ملاقات بھی، تو شرف ملاقات کا ثبوت تو یہاں سے معلوم ہوا اور ضیافت کا ثبوت مسلم وغیرہ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جتنی مرتبہ مسجد میں جاتا ہے تو ہر مرتبہ جانے کے عوض جنت میں اس کے لئے نُزُل یعنی مہمان نوازی کا کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ (تدبر)

حدیث آخر:۔ حضرت صُہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت "للذین احسنوا الحُسنیٰ وزیادۃ" ۔(یونس) جن لوگوں نے نیک کام کئے ہیں ان کے لئے بڑی خوبی یعنی جنت ہے اور اس پر زیادتی ہے، کے بارے میں فرمایا کہ جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکار کر بولے گا کہ اللہ کے پاس تمہارا ایک وعدہ (باقی) ہے جنتی کہیں گے کیا اللہ نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا؟ اور ہمیں دوزخ سے نجات نہیں بخشی؟ اور ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا (پھر کون سا وعدہ؟) وہ (منادی) کہیں گے کیوں نہیں! اس کے ساتھ حجاب اٹھادیا جائے گا آپؐ نے فرمایا بخدا اللہ کو دیکھنے سے زیادہ کوئی پسندیدہ نعمت ان کو عطا نہیں کی (یعنی حجاب نورانی رفع ہوگا)۔

حدیث آخر:۔ "ان ادنیٰ اهل الجنة منزلةً لَمَن ینظر الی جِنانه وزوجاته الخ".

بے شک جنتیوں میں سب سے کم درجے والا وہ ہوگا جو اپنے باغات، اپنی بیویوں، اپنی نعمتوں، اپنے خادموں اور اپنے تختوں (پلنگوں) کی طرف دیکھے گا جو ہزار سال مسافت کی بقدر پھیلے ہوئے ہوں گے جبکہ جنتیوں میں سے سب سے معزز اللہ کے نزدیک وہ ہوگا جو اللہ کی ذات کو صبح وشام دیکھے گا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "وجوہ یومئذٍ ناضرۃ الی ربها ناظرۃ "بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

قوله: "لَمَن ینظر الخ" یہاں کلام میں تقدیم وتاخیر ہے اصل میں لَمَن ینظر الخ اسم اِنَّ ہے اور ادنیٰ اهل الجنة خبر مقدم ہے کیونکہ اصل مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہزار سال کی مسافت پر پھیلی ہوئی نعمتوں کی طرف دیکھے گا وہ ادنیٰ جنتی ہے اور جو شخص اللہ کا دیدار صبح وشام کرے گا وہ معزز جنتی ہے۔

قوله: "جِنانه" بکسر الجیم جمع جنت کی ہے۔

قوله: "زوجاته" زوجۃ کی جمع ہے۔

قوله: "نعیم" جمع نعمت۔

قوله: "خدم" جمع خادم اور "سُرُر" بضمتین جمع سریر کی ہے، دونوں حدیثوں کی سند پر امام ترمذیؒ نے حکم حتمی نہیں لگایا ہے۔

باب

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ یقول لاھل الجنۃ: یااھل الجنۃ فیقولون لبیک وسعدیک! فیقول: ھل رضیتم؟ فیقول مالنالانرضیٰ وقد اعطیتنامالم تُعطِ احداً من خلقک فیقول: اناعطیکم افضل من ذالک، قالوا وایّ شیٔ افضل من ذالک قال اُحِلُّ علیکم رضوانی فلااسخط علیکم ابداً". (حسن صحیح)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ جنتیوں سے فرمائیں گے: اے جنت والو! پس وہ کہیں گے: لبیک اے ہمارے رب وسعدیک! پھر فرمادیں گے: کیا تم راضی ہو گئے؟ تو وہ عرض کریں گے کہ کیا ہوا ہم کو کہ ہم خوش نہ ہوں گے حالانکہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا، پس اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: میں تمہیں ان سب سے بہتر چیز دے رہا ہوں! جنتی پوچھیں گے: ان سب سے افضل کیا ہوسکتا ہے؟ اللہ جل جلالہ فرمائیں گے کہ میں تم پر اپنی رضامندی نازل کررہا ہوں، چنانچہ میں کبھی بھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔

تشریح:۔ قولہ: "لبّیک وَسعدیک" اس کے لغوی معنی اور صیغوں کے متعلق تحقیق "باب ما جاء فی التلبیۃ" ج:۳ص:۴۵۵ پر گذری ہے۔ فلیراجع

قولہ: "اُحِلُّ علیکم رضوانی" بضم الہمزۃ وکسر الحاء بمعنی انزل اتار رہا ہوں، چونکہ جنتی مہمانوں کی طرح تیار کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں نہ کمانے کی فکر اور نہ ہی پکانے کی، لیکن مہمان کے لئے صاحب خانہ کی طرف سے قدر واکرام کا اظہار ضیافت کی تمام انواع سے بڑی اطمینان بخش تکریم ہے اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ جنتیوں کو ساری نعمتیں فراہم کرنے کے بعد ان کو تسلی واطمینان دلائیں گے کہ میں تم سے خوش ہوں اور یقیناً یہ ایسی بات ہے کہ ہر جنتی کے دل سے ہر قسم کا احساس کمتری، شرمندگی اور ماضی کی تمام کوتاہیوں کے تصور سے گھبراہٹ کا ازالہ کرتی ہے قال اللہ تعالیٰ: "وعداللہ المؤمنین والمؤمنات جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھاومسٰکن طیّبۃ فی جنّٰت عدن ورضوان من اللہ اکبر"۔ (التوبۃ آیت:۷۲) اور جب رضامندی ہوگی تو اہل جنت اللہ کے دیدار سے بھی مستفید ومحظوظ ہوتے رہیں گے۔

باب ماجاء فی ترائی اهل الجنة فی الغُرَفِ

(جنتیوں کا بالاخانوں سے ایک دوسرے کو دیکھنا)

"عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال ان اهل الجنة لَیَتَرَاءَ وَنَ فی الغُرفَة کمایَتَراءَ ونَ الکوکبَ الشرقی اوالکوکبَ الغربی الغاربَ فی الاُفُق اوالطالعَ، فی تفاضل الدرجات فقالوایارسول الله! اولئک النّبیون؟ قال: بلیٰ والذی نفسی بیده واقوامٌ اٰمنوا بالله ورسوله وصَدَّقَ المرسلین". (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنتی ایک دوسرے کو بالاخانوں میں سے دیکھیں گے جیسے وہ (دنیا میں) دیکھتے ہیں شرقی ستارے کو یا مغربی تارے کو افق (کنارہ) میں ڈوبتا ہوا یا طلوع ہوتا ہوا، درجات میں تفاوت کی بناء پر، پس صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ انبیاء ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں" اور بخدا (انبیاء کے علاوہ) وہ لوگ بھی ہوں گے جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہوں گے اور پیغمبروں کی تصدیق کی ہوگی۔

تشریح: قولہ: "فی تفاضل الدرجات" صحیحین کی روایت میں لام اجلیہ کے ساتھ ہے یعنی لِیَتَفَاضَل مابینهم جس کا مطلب یہ ہے کہ نچلے درجوں والے اوپر کے درجات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے دنیا میں ستاروں کو آسمان کے کناروں پر طلوع وغروب کے وقت دیکھا جا سکتا ہے، یعنی جنّات اور جنتیوں کے محلات چونکہ لامتناہی خلاء میں واقع ہیں اور اس خلاء کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر جگہ سے دوسرا مقام ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسا کہ ہم چاند کو اوپر اور افق پر محسوس کرتے ہیں اسی طرح جو شخص چاند پر ہوگا وہ زمین کو بھی چاند کی مانند یا ستارے کی طرح اوپر یا افق پر محسوس کرے گا جیسا کہ اس فن والے ادنیٰ تأمل سے جان لیتے ہیں، نیز باوجود دوری کے دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے البتہ کائناتی نظام میں سیارے اپنی محوری حرکت کی وجہ سے غائب ہوجاتے ہیں یعنی نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں جبکہ جنت میں محلات اپنی اپنی جگہ ساکن رہیں گے اور جنتی جب بھی چاہیں تو ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے البتہ وہاں کوئی عرش سے زیادہ قریب ہوگا اور کوئی کم قریب جس سے ان کے درجات متفاوت ہوں گے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی خلود اهل الجنة واهل النار

(اہل جنت واہل دوزخ کے ہمیشہ رہنے کا بیان)

"عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: یجمع الله الناس یوم القیٰمة فی صعید واحد ثم یطلع علیهم رب العٰلمین فیقول: اَ لَا یَتَّبِعُ کُلُّ انسان ماکانوا یعبدون فیُمَثَّلُ لصاحب الصلیب صلیبه ولِصاحب التصاویر تصاویره ولصاحب النار ناره فیتبعون ماکانوا یعبدون ویبقیٰ المسلمون فیطلع علیهم رب العالمین فیقول: اَ لَاتتبعون الناس؟ فیقولون نعوذ بالله منک ونعوذ بالله منک؟ اللهُ رَبنا وهذا مکاننا حتیٰ نَریٰ ربنا، وهو یأمرهم ویثبّتهم ثم یتواریٰ ثم یطلع فیقول اَ لَاتتبعون الناس؟ الخ". (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کریں گے اور پھر رب العٰلمین ان پر جلوہ فرمائیں گے اور فرمائیں گے: کیا ہر شخص اپنے اپنے معبود کی پیروی نہیں کرتا (یعنی جو جس کی عبادت کرتا تھا اسی کے پیچھے چلا جائے) پس صاحبِ صلیب (سولی) کے لئے اس کی صلیب پیکر محسوس بنادی جائے گی اور مورتیوں والوں کے لئے ان کی مورتیاں، اور صاحب نار کے لئے اس کی آتش (یعنی جو جس چیز کی عبادت کرتا تھا وہی معبود اس کے سامنے اُبھرے گا) پس وہ تمام لوگ ان ان معبودوں کے پیچھے چلے جائیں گے جن جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے جبکہ مسلمان باقی رہ جائیں گے پس ان پر رب العٰلمین جھانکیں گے (یعنی تجلی فرمائیں گے) اور فرمائیں گے کیا تم ان لوگوں کے پیچھے نہیں جاتے؟ پس اہل ایمان کہیں گے ہم تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں وَنَعُوذُ بالله منک، ہمارا پروردگار (یعنی معبود) تو اللہ ہی ہے اور یہی ہماری جگہ ہے (یعنی ہم یہیں رہیں گے) یہاں تک کہ ہم اپنا پروردگار دیکھ لیں، اور وہ (اللہ) بھی ان کو ٹھہرنے کا حکم دیں گے اور ان کو ثابت قدمی دیں گے، پھر اوجھل ہوکر پھر تجلی فرمائیں گے اور فرمائیں گے تم کیوں لوگوں کے ساتھ نہیں جاتے؟ وہ کہیں گے ہم تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں نعوذ بالله منک! ہمارا رب تو اللہ ہی ہے اور ہم اسی جگہ انتظار کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اپنے رب کو دیکھیں! اور اللہ بھی ان کو ٹھہرنے کا حکم دیں گے اور ان کو ثابت قدم رکھیں گے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا ہم اللہ کو دیکھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا کیا تم چودھویں

رات کے چاند دیکھنے میں ضرر پاتے اور پہنچاتے ہو؟ (یعنی کوئی کسی کے دیکھنے میں مزاحم بنتا ہے؟) صحابہ نے فرمایا: نہیں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا تو تمہیں بھی اُس وقت (یعنی دیدار خداوندی میں) کسی طرح کا ضرر نہیں ہوگا، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے غائب ہو جائے گا اور پھر اوپر سے ظاہر ہو کر ان کو اپنی پہچان کرائیں گے، پھر فرمائیں گے: میں تمہارا رب ہوں پس تم میری پیروی کرو چنانچہ سب مسلمان اٹھیں گے۔ اور اس ساتھ کے پل صراط رکھا جائے گا (یعنی نصب کیا جائے گا) پس لوگ اس پر سے تیز رفتار گھوڑے اور تیز اونٹ کی طرح گذریں گے اور ان کا ''بول'' اس پل پر ''سَلِّم سَلِّم'' (بچاؤ بچاؤ ہوگا)۔

اور باقی رہ جائیں گے دوزخی لوگ تو جب ان میں سے ایک گروہ جہنم میں ڈالا جائے گا تو اس سے پوچھا جائے گا: کیا تو بھر گئی؟ تو وہ کہے گی: کیا اور بھی ہیں؟ چنانچہ ایک گروہ مزید ڈالا جائے گا، اس سے پھر پوچھا جائے گا: کیا تو بھر گئی؟ (یعنی سیر ہوگئی؟) وہ کہے گی مزید بھی کچھ ہے؟ (غرض گروہ درگروہ ڈالتے ڈالتے) یہاں تک کہ جب سب اس کے اندر جھونک دیئے جائیں گے تو رحمن اپنا قدم اس پر رکھ دیں گے (کمایلیق بشانه) اور جہنم کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے سمٹ جائے گا پھر اللہ پوچھے گا ''بس!'' وہ کہے گی بس! بس! پس جب اللہ تعالیٰ جنت والوں کو جنت میں داخل فرمائیں گے اور دوزخ والوں کو دوزخ میں، تو موت کو لایا جائے گا گریبان (گردن) سے پکڑ کر، پس اسے اس دیوار پر کھڑا کر دیا جائے گا جو اہل جنت واہل نار کے درمیان ہوگی، پھر کہا جائے گا (یعنی اعلان ہوگا) اے اہل جنت! پس وہ خوف زدہ ہو کر جھانکیں گے پھر پکارا جائے گا اے اہل نار! تو وہ خوش ہو کر جھانکیں گے کہ ان کو سفارش کی امید پیدا ہوگی، پس اہل جنت واہل دوزخ سے کہا جائے گا، کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟ تو یہ اور وہ سب کہیں گے ہم نے اس کو پہچانا یہ وہ موت ہے جو ہم پر مقرر و مسلط کی گئی تھی، پس اسے لٹا دیا جائے گا اور دیوار پر اچھی طرح ذبح کر دیا جائے گا (یعنی یک بارگی خاتمہ کر دیا جائے گا) پھر اعلان کر دیا جائے گا: اے جنت والو! تم جنت میں ہمیشہ رہو اب کوئی موت نہیں آئے گی اور اے دوزخ والو! اب ہمیشہ زندہ رہنا ہے اب کوئی موت نہیں!۔

تشریح: ۔قوله: ''في صعيد'' کشادہ، ہموار زمین۔قوله: ''ثم يطلع عليهم'' طلوع کا لفظ عموماً نورانی مخلوق کے نمودار ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ مخلوق کی صفات اور حدوث کی جمیع سمات سے منزہ، پاک ومتعالی ہے اس لئے یہاں مراد ظہور یعنی تجلی ہے، پھر قیامت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار کس طرح نصیب ہوگا؟ تو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغۃ کے باب ''ذکر عالم المثال'' میں اس پر تفصیلی

بحث فرماتے ہوئے ابن الماجشون کا قول نقل کیا ہے:

"ان كل حديث جاء في التنقل والرؤية في المحشر فمعناه: انه يُغَيِّرُ ابصارَ خلقه فَيَرَونَه نازلاً متجليًا ويناجي خلقه ويخاطبهم وهو غير متغيّر عن عظمته ولا منتقل لِيعلَموا ان الله على كل شئ قدير".

یعنی ہر وہ حدیث جو اللہ تعالیٰ کے منتقل ہونے اور محشر میں اسے دیکھنے کے بارے میں ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی آنکھوں میں تبدیلی کر دیں گے پس وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اُترتا ہوا، تجلی کرتا ہوا دیکھیں گے اور اپنی مخلوق سے سرگوشی فرمائیں گے اور ان سے بات چیت کریں گے جبکہ وہ اپنی عظمت سے نہیں بدلیں گے اور نہ ہی منتقل ہوں گے (یہ صرف اس لئے) تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

اگرچہ امام شاہ ولی اللہؒ نے ایسی تمام روایات کو ظاہر پر حمل کرتے ہوئے عالم مثال پر دلیل بنایا ہے اور اصولی طور پر نصوص کو ظاہر پر محمول کرنا ہی اسلم طریقہ ہے اِلّا یہ کہ کوئی ناگزیر وجہ تاویل کو ضروری کر دے، تب تاویل کا راستہ اپنایا جائے گا۔

یہاں ابن الماجشونؒ کا قول صرف تقریب الی الفہم کے لئے نقل کیا گیا ہے کیونکہ اس سے حدیث الباب کے سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے کہ اہل اسلام کبھی اس کو نہیں پہچانیں گے اور کبھی پہچان لیں گے۔ (تدبر)

قوله: "ويبقىٰ المسلمون" اس روایت میں گویا اس مقام پر اختصار ہے جبکہ صحیحین میں ہے کہ: "وتبقىٰ هذه الامة فيها منافقوها الخ" یعنی باقی اہل ادیان چلے جائیں گے جبکہ اس امت کے مسلمان اور منافق میدان محشر میں باقی رہ جائیں گے جیسا کہ حدیث کے آخر میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ اہل جنت تو تیز گھوڑوں اور اونٹوں کی طرح چلے جائیں گے "ويبقىٰ اهل النار الخ" اگرچہ یہاں اہل نار سے مراد دوسرے کفار بھی ہو سکتے ہیں جو سُست روی کی وجہ سے ابھی تک راستہ میں ہوں گے۔

قوله: "فيقولون نعوذ بالله منک" عارضة الاحوذی میں ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے ابھی تک اللہ تبارک وتعالیٰ کو نہیں پہچانا ہوگا اس لئے وہ یہ سمجھ کر کہ اللہ تو فحشا اور باطل کا حکم نہیں دیتا پھر ہمیں کیسے کہا جا رہا ہے کہ تم ان اہل باطل کے ساتھ کیوں نہیں جاتے؟ شاید یہ کوئی استدراج ہے اس لئے وہ پناہ مانگیں گے، کیونکہ دنیا میں تو وہ اپنے رب کے بارے میں یہی جانتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیشہ حق بات فرماتے ہیں اور اسی لئے جب

اللہ آخری باران کو اپنی پیروی کا حکم دیں گے تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

قولہ: "هل تضارون" بضم التاء جبکہ راء کی تشدید وتخفیف دونوں جائز ہیں شد کی صورت میں یہ ضرر سے مشتق ہے جبکہ تخفیف کی صورت میں ضیر سے مشتق ہے معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ کیونکہ ضمیر راجع ہے ضرر کی طرف یعنی جس طرح تمہیں چودھویں رات کے چاند دیکھنے میں کوئی ضرر نہیں ہوتا اسی طرح اللہ کے دیدار میں بھی کوئی ضرر نہیں ہوگا یعنی مزاحمت نہیں ہوگی، پھر تضارون باب تفاعل کی خاصیت کی بناء پر جانبین سے فعل کو مقتضی ہے، یعنی کوئی کسی کو عدم رؤیت کا ضرر نہیں پہنچا سکے گا جیسے بدر دیکھنے میں کوئی کسی کا مزاحم نہیں بنتا۔

قولہ: "ثم يتوارى" یعنی مکالمہ منقطع فرمادے گا۔

قولہ: "فيُعَرِّفُهم نفسَه" امام ترمذیؒ نے باب کے آخر میں اس کا مطلب بیان کیا ہے یعنی "يتجلّى لهم" یعنی ان صفات کے ساتھ تجلی فرمائیں گے جن کو اہل ایمان جانتے ہیں۔

قولہ: "مثل جياد الخيل الخ" یہاں اختصار ہے جبکہ دیگر صحیح روایات میں ہے کہ بعض بجلی کی طرح صراط عبور کریں گے، گویا یہاں عام اہل ایمان کا ذکر ہے جبکہ دوسری روایات میں تفصیل ہے۔

قولہ: "أُوعِبُوا" بصیغہ مجہول ایعاب مکمل کرنا یعنی سارے ڈالے جائیں گے۔

قولہ: "قَدَمَه الخ" یہ متشابہات میں سے ہے جس کے بارے میں امام ترمذیؒ نے اسلاف کا قول اس باب میں بھی نقل کیا ہے اور ہم نے اس پر تفصیلاً پہلے بحث کی ہے فلا نعیدھا۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ص: ۳۰۷، ج: ۲ "باب ماجاء فی نزول الرب تبارک وتعالیٰ الی السماء الدنیا کل لیلۃ" قُبیل ابواب الوتر) غرض منصوص کا انکار نہیں کیا جائے گا اور کیف بیان کرنے سے اجتناب ضروری ہے جبکہ عند الضرورت مناسب تاویل کی جائے گی۔

حدیث آخر:۔ "أُتِيَ بالموت كالكبش الاملح الخ" یعنی قیامت کے دن موت کو لایا جائے گا جو سفید مائل بسیاہی رنگ کے مینڈھے کی شکل میں ہوگی، سابقہ روایت میں تھا کہ "مُلَبَّباً" ہوگی یعنی گردن سے پکڑی گئی ہوگی لبہ اصل میں اس کو کہتے ہیں جس کے کپڑے یا گریبان ہنسلی کی ہڈی پر جمع کر کے پکڑا جائے، چنانچہ اسے ذبح کرنے سے اہل جنت کی خوشی کی انتہاء نہ رہے گی اور دوزخ والوں کے غم کا کوئی منتہاء نہ ہوگا حتیٰ کہ اگر کوئی خوشی یا غم سے مرتا تو یہ دونوں فریق مرجاتے مگر وہاں تو موت نہیں آتی، ابن تیمیہ وابن قیم جہنم کے فناء کے قائل ہیں مگر یہ ان کا تفرد ہے۔ جیسا کہ پہلے بارہا عرض کیا جاچکا ہے کہ عالم مثال میں معانی کا مجسم ہونا کوئی

انہونی بات نہیں فتذکر۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں عالم مثال پر تفصیلی بحث کی ہے حاشیہ قوت المغتذی میں دوسری توجیہ ذکر کی گئی ہے جو آسان تر ہے فلینظر من شاء۔

باب ماجاء حُفَّتِ الجنة بالمكارِه وحُفَّتِ النار بالشهوات

(جنت ناگواریوں کے ساتھ اور جہنم ہوسوں کے ساتھ گھیری گئی ہے)

"عن انس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: حُفّتِ الجنة بالمكاره وحُفّتِ النار بالشهوات". (حسن غريب صحيح)

جنت کو تکالیف کے ساتھ گھیرا گیا ہے اور دوزخ کو شہوتوں کے ساتھ گھیرا گیا ہے۔

تشریح:۔ قولہ: "حُفَّت" بصیغہ مجہول حفاف سے بمعنی حجاب کرنے، ڈھانپنے اور احاطہ کرنے کے آتا ہے۔ **قولہ:** "المکارہ" مکروہ کی جمع ہے جو چیز طبیعت کو ناگوار گذرے، یعنی جنت اور جہنم دونوں کو حجابوں میں محجوب بنایا گیا ہے تاہم جنت کے پردے امور شاقہ ہیں جبکہ جہنم کے حجاب امور مرغوبہ ہیں البتہ اتنا سا فرق ہے کہ جنتی دراصل جنت کا طالب ومتلاشی ہوتا ہے مگر جنت میں جانے کے لئے اُس حجاب کو چاک کرنا اور عبور کرنا پڑتا ہے جو مشقتوں کا مرقع ہے جیسے جہاد، نماز، روزہ وغیرہ جبکہ جہنمی دراصل ان خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے اور پھر ان میں واقع ہو جاتا ہے جو دوزخ کے اوپر حجاب کی صورت میں موجود ہیں مگر ان میں گھستے ہی وہ جہنم میں جاگرتا ہے یا مستحق ہو جاتا ہے۔

غرض جنت میں جانے کے لئے جنت ہی کی طلب ضروری وناگزیر ہے۔ جبکہ دوزخ میں جانے کے لئے دوزخ کی نیت وطلب شرط نہیں بلکہ جہنم کے اِردگرد خواہشات کے جال میں پھنسنا بھی کافی ہے۔ (تدبر)

حدیث آخر:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب اللہ نے جنت اور جہنم کو پیدا کیا تو جبرئیل امین کو جنت کی طرف بھیجا اور فرمایا جنت دیکھ لو اور ان چیزوں کو دیکھو جو میں نے جنت والوں کے لئے اس میں تیار کی ہیں، چنانچہ جبرئیلؑ نے جنت کی طرف نظر کی اور ان نعمتوں کی طرف بھی جو اللہ نے اہل جنت کے لئے اس میں تیار کی ہیں، آپؐ نے فرمایا پس وہ (جبرئیلؑ) واپس لوٹے اللہ کی طرف اور فرمایا: تیری عزت کی قسم! نہیں سنے گا اس کا حال کوئی مگر وہ ضرور اس میں داخل ہوگا!!! پس

اللہ نے اس کے بارے میں حکم دیا۔ چنانچہ وہ دشواریوں کے ساتھ گھیری گئی پھر فرمایا دوبارہ اس کی طرف جاؤ اور ان چیزوں کی طرف دیکھو جو میں نے جنت والوں کے لئے اس میں تیار کی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت جبرئیلؑ واپس جنت کی طرف لوٹے تو دیکھا کہ وہ تو دشواریوں کے ساتھ گھیر دی گئی ہے تو وہ واپس اللہ کی طرف لوٹے اور عرض کیا تیری عزت کی قسم! اب یقیناً مجھے ڈر ہے کہ اس میں کوئی داخل نہیں ہوگا، اللہ نے فرمایا جاؤ جہنم کی طرف اور نظر کرو اس کی طرف اور ان کی طرف بھی جو میں نے جہنمیوں کے لئے اس میں تیار کی ہیں، پس انہوں نے دیکھا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے پر چڑھ رہا ہے (یعنی شدت جوش سے متلاطم ہے) پس جبرئیلؑ اللہ کی طرف واپس آکر فرمانے لگے تیری عزت کی قسم! اس کے بارے میں جو بھی سنے گا وہ اس میں ہرگز داخل نہیں ہوگا، پس اللہ نے اس کے بارے میں حکم دیا چنانچہ وہ ہوسوں کے ساتھ گھیر دی گئی، پھر فرمایا جبرئیلؑ سے اب جاؤ اس کے پاس چنانچہ جبرئیلؑ اس کے پاس آئے (اور لوٹ کر آئے) اور عرض کرنے لگے تیری عزت کی قسم! تحقیق مجھے ڈر ہے کہ اس سے کوئی نہیں بچ سکے گا ہر شخص اس میں داخل ہو جائے گا۔ (حسن صحیح)

قولہ: "الا دخلھا" یعنی ہر شخص جنت کے احوال سن کر اس کی طمع کرے گا اور اس میں جانے کی کوشش وخواہش کرے گا۔

قولہ: "لقد خِفتُ اَن لا یدخُلَھَا اَحدٌ" یعنی جنت میں جانا چونکہ مشقتوں کی برداشت پر موقوف کر دیا گیا ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ ان تکالیف کو کوئی برداشت نہیں کر سکے گا، کیونکہ نفس تو خواہشات کے درپے رہتا ہے۔

قولہ: "لا یسمع بھا احد فید خلھا" یعنی دوزخ کے بارے میں جو بھی سُنے گا کہ وہاں آگ ہے وہ اس سے ڈرے گا اور بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

غرض جنت ودوزخ اور انسان کے درمیان کچھ واسطے ہیں جو نفس سے شروع ہو کر ان دونوں پر ختم ہو جاتے ہیں تاہم جنت اور نفس کے مابین واسطہ وسلسلہ دشواریوں کا مجموعہ ہے، جسے عبور کرنے کے لئے نفس کو اس دشوار گذار پہاڑ پر چڑھانا، تھکانا اور ماندہ کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ دوزخ اور نفس کے درمیان خواہشات کی ایک ایسی دلدل پھیلی ہوئی ہے کہ اس میں قدم رکھنے سے آدمی خود بخود دھنستا رہتا ہے اِلاّ یہ کہ اللہ کا فضل شاملِ حال ہو کر آدمی کی دستگیری فرمائے، وہ مباح امور جو نفس کو مرغوب ہیں لیکن وہ حرام خواہشات کی طرف کھینچتے ہیں وہ گویا اس دلدل کے سواحل ہیں۔

باب ماجاء فی احتجاج الجنة و النار

(جنت اور دوزخ میں بحث ومباحثہ کا بیان)

"اِحتَجَّتِ الجنة والنار فقالت الجنةُ يدخُلُنِي الضعفاء والمساكين وقالتِ النار يدخلني الجبّارون والمتكبرون فقال للنار انتِ عذابى اَنتَقِمُ بِكِ مِمّن شئتُ وقال للجنة انتِ رحمتى اَرحمُ بِكِ مَن شِئتُ". (حسن صحيح)

جنت اور دوزخ میں تکرار (بحث) ہوئی پس کہا جنت نے میرے اندر کمزور اور مسکین (غریب) لوگ آئیں گے اور کہا دوزخ نے میرے اندر سرکش (ظالم) اور مغرور لوگ داخل ہوں گے! پس اللہ نے (محاکمۃً) فرمایا جہنم سے تو میرا عذاب ہے میں تیرے ذریعہ بدلہ لیتا ہوں جس سے چاہوں! اور جنت سے فرمایا تو میری رحمت (کا اثر) ہے تیرے ذریعہ میں جس پر چاہوں مہربانی کرتا ہوں۔

تشریح:۔قولہ: "اِحتجّت" احتجاج اور محاجہ اپنے اپنے موقف پر حُجت یعنی دلیل قائم کرنے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جنت نے اپنی برتری و بہتری کے لئے یہ دلیل دی کہ میرے اندر ایسے لوگ آئیں گے جو اگر چہ بظاہر حقیر لگ رہے ہوں گے مگر عنداللہ وہ بہت کبیر ہوں گے۔ لہٰذا میں بڑوں کی آرام گاہ ہوں تو میں تجھ سے افضل ہوئی۔

جہنم کا استدلال یہ تھا کہ میرے اندر بڑے بڑے متکبر (تیس مار خان) آئیں گے اور میں ہی ان کو کچل کے رکھ دوں گی اور جو اپنے قدم کے نیچے ایسے ایسے مغروروں کو روند دے اس کی بڑائی وافضلیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟؟؟

پس دونوں میں اللہ عزوجل نے فیصلہ فرمایا کہ ایک کو اپنے اولیاء پر مہربانی کے لئے بنایا ہے اور دوسرے کو دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہر ایک کا کام الگ الگ ہے جبکہ تفاضل وہاں ہوتا ہے جہاں مجانست ہو تو جب ہر ایک کی ذمہ داری ہی الگ الگ ہے تو تفاضل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ اختلاف جنس کی صورت میں ربائے تفاضل نہیں ہوتا۔ (تدبر)

پھر ظاہر یہ ہے کہ یہ مکالمہ ومحاجہ قولی شکل میں ہوا ہے اور اس کے لئے شعور کا ہونا اگر چہ لازمی نہیں لیکن جنت ودوزخ میں اس مکالمہ کے دوران شعور پیدا کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں اور یہ بھی لازمی نہیں کہ ان میں یہ شعور ابھی بھی باقی ہو۔ (تفکر)

باب ماجاء مالِاَدنیٰ اهل الجنة من الكرامة

(سب سے کم درجے کے جنتی کے اِعزاز کا بیان)

"ادنیٰ اهل الجنة الذی له ثمانون الف خادم واثنتان وسبعون زوجة وتنصب له قبّة من لؤلؤوزبرجد وياقوت كمابين الجابية الى صنعاء". (غريب)

ادنیٰ (معمولی) جنتی وہ ہے جس کے اسی ہزار خادم ہوں گے اور بہتر بیویاں ہوں گی اور اس کے لئے موتی، زمرد اور یاقوت کا (اتنا بڑا) خیمہ نصب کیا جائے گا جتنا جابیہ اور صنعاء (مقاموں) کے درمیان فاصلہ ہے۔

اسی سند سے یہ بھی مروی ہے کہ اہل جنت میں سے جو بھی مرتا ہے چھوٹا ہو یا بڑا وہ جنت میں تیس ۳۰/ سال کا بنا دیا جائے گا وہ اس سے کبھی بھی متجاوز نہیں ہوں گے اور یہی عمر اہل نار کی بھی ہوگی۔

اسی سند سے یہ بھی مروی ہے کہ ان (جنتیوں کے سر) پر تاج ہوں گے جن کا ادنیٰ موتی مشرق ومغرب کے درمیان کو روشن کرے گا۔

تشریح:۔قوله: "زبرجد" زمرّد کے مشابہ ایک قیمتی پتھر ہے جو مختلف رنگوں کا ہوتا ہے مصری ہرے رنگ کا اور قبرص کا زرد رنگ کا ہوتا ہے۔

قوله: "یاقوت" مشہور قیمتی پتھر ہے اس کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں سُرخ، نیلا، زرد اور سفید۔

قوله: "جابیه" شام کے ایک علاقے کا نام ہے جبکہ "صنعاء" یمن میں ہے۔ یعنی یہ خیمہ ان مختلف قیمتی پتھر سے مرکب ہوگا پھر یہ بہتر عورتیں حور عین بھی ہو سکتی ہیں اور دنیا کی عورتیں بھی۔

قوله: "یردّون" ای یُصیَّرُونَ یعنی ان کو تیس سال کی عمر میں لایا جائے گا پس چھوٹوں کی عمر بڑھا دی جائے گی اور بڑوں کی کم کردی جائے گی گویا یہاں تین سال کی کسر ذکر نہیں کی گئی ہے لہٰذا اس کا معاذ بن جبلؓ کی حدیث سے تعارض نہیں ہے نیز یہ حدیث ضعیف بھی ہے۔

چونکہ یہ روایت ضعیف بھی ہے اس لئے اس کا مسلم کی روایت سے بھی تعارض نہیں کہ "صغارهم دعاميص الجنة" یعنی جنتیوں کے بچے کیڑوں کی طرح بلا روک ٹوک اپنی مرضی سے گھومتے ہوں گے، اگر اس حدیث کو صحیح مانیں تو پھر تطبیق دو طرح دی جا سکتی ہے کہ ان کو پتہ نہیں چلے گا کہ ہم پہلے دعامیص کی طرح یعنی چھوٹے سے تھے، یا مطلب یہ ہے کہ دعامیص جنتی بچوں یعنی غِلمان کے لئے فرمایا گیا ہے۔

قوله:"التیجان" بکسر التاء تاج کی جمع ہے۔

قوله:"منها"ای من التیجان۔

قوله:"لتضیئ"ای تنوّر۔

حدیث آخر:۔المؤمن اذااشتهیٰ الولد فی الجنة کان حمله ووضعه وسِنّه فی ساعة کما یشتهی".(حسن غریب)

مؤمن جب جنت میں اولاد کی خواہش کرے گا تو اس کا حمل، زچگی اور اس کی عمر (یعنی جنتیوں کے برابر) اسی وقت ہو جائے گی جیسا ہی وہ چاہے گا۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے بعد اہل علم کے دو قول نقل فرمائے ہیں کہ آیا جنت میں بچے پیدا ہوں گے یا نہیں؟ ترجیح اس کو دی ہے کہ اگر چہ اولاد ہو سکتی ہے تاہم جنتی لوگ اولاد کی خواہش نہیں کریں گے۔ چونکہ دنیا میں اولاد کی خواہش کچھ عوارض پر مبنی ہے مثلاً کام کاج میں تعاون، گھر کی رونق، نسل کی بقاء وغیرہ وغیرہ اور یہ عوارض جنت میں نہیں ہیں اس لئے وہاں خواہش کا کچھ مطلب نہیں، دنیا میں بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے جو حج اور عمرہ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں مگر وہ یہ سعادت حاصل نہیں کرنا چاہتے وہ یورپ کو تو بار ہا جانا پسند کرتے ہیں لیکن حرمین کی طرف کوچ نہیں کرتے جبکہ اس کے برعکس بہت سے ایسے بھی ہیں جو بجائے یورپ کے اپنی جمع پونجی حج وعمرہ پر خرچ کرتے ہیں لہٰذا کسی چیز کا امکان اس کی خواہش کو مستلزم نہ سمجھا جائے۔

باب ماجاء فی کلام الحور العین

(حور عین کی گفتگو کا بیان)

"ان فی الجنة لَمُجتَمَعاً لِلحور العین یرفعن باصوات لم یسمع الخلائق مثلها یَقُلنَ:

نحن الخالدات فلا نبید

ونحن الناعمات فلا نبأس

ونحن الراضیات فلا نسخط

طُوبیٰ لِمن کان لنا وکُنّا له (حدیث غریب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ جنت میں

حورعین کے جمع ہونے کی ایک جگہ ہے وہ (وہاں جمع ہوکر) ایسی آوازیں بلند کرتی ہیں (یعنی گاتی ہیں) کہ خلائق نے کبھی ویسی (سُریلی) آواز نہیں سنی ہے (یہ گانے ہمارے وزن شعری پر اگرچہ نہیں مگران کے کہنے کے مطابق ہوں گے) کہتی ہیں:

''ہم سدا رہنے والی ہیں کبھی فنا نہیں ہوں گی ☆ ہم ناز ونعمت میں پلنے والی ہیں کبھی محتاج نہیں ہوں گی۔☆ ہم شاد ماں رہتی ہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی ☆ مبارک ہو اس کو جو ہمارے لئے ہیں اور ہم اس کے لئے ہیں۔''

تشریح:۔قولہ:''الحور''حوراء کی جمع ہے بمعنی گوری کے اور عین بکسر العین جمع ہے عیناء کی جس کے معنی بڑی آنکھوں والی کے ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ جس کی آنکھوں کا سفید حصہ تیز سفید اور سیاہ حصہ تیز سیاہ ہو دونوں صورتیں خوبصورتی کی ہیں۔

قولہ:''لَمُجتَمعاً''لام تاکید ہے اور مجتمع ظرف کا صیغہ ہے۔

قولہ:''خالدات''ای دائمات۔

قولہ:''فلا نبیدُ' ای لانھلک ولانموت۔

قولہ:''بَادَ'' بمعنی فنا کے آتا ہے۔

قولہ:''ناعمات'' بمعنی متنعمات کے ہے۔

قولہ:''فلانبأس''ای لانفتقر ولانحتاج۔

قولہ:''الراضیات''ای عن ربنا یا اپنے شوہروں سے راضی رہتی ہیں۔

قولہ:''فلانسخطُ''ای لانغضب ہم ناراض نہیں ہوتی ہیں کسی حال میں بھی۔

قولہ:''طُوبیٰ''خوش خبری اور خوش گواری کو کہتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:''فھم فی روضۃ یُحبرون''۔(روم، آیت:۱۵) ترجمہ: وہ (بہشت کے) باغ میں خوشحال ہوں گے۔

چونکہ حواس کا لذتوں میں اپنا اپنا حصہ ہوتا ہے جو ہر ایک کا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لہٰذا جنت میں ان سب لذتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ وہاں کھانے کی اشیاء بسیار ومزیدار ہیں، سونگھنے کے لئے بے شماراً عطار، دیکھنے کے لئے لامحدود مناظر مثلاً اشجار وآبشار، انہار وکوہسار اور طرح طرح کے دیگر حسین مناظر اور غلمان وحور قطار در قطار ہیں۔ اور چھونے کے لئے گل بدن حوریں ابکار، انتہائی حیاء دار ہونگی اور گنگنانے کے لئے کلمات

طیبات جبکہ سننے کے لئے حورعین کے نغمے اور ضرب الاوتار علی شط الانہار، تحت الاشجار، مع ھذا ضیافۃ الجبار وفض الابکار اور سب سے بڑی نعمت باری تعالیٰ کا دیدار ہے جس پر خواہشات وتمناؤں کی انتہاء وتکمیل ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی صفة انهار الجنة

(جنت کی نہروں کا بیان)

"ان فی الجنة بحر الماء وبحر العسل وبحر اللبن وبحر الخمر ثم تَشَقَّقُ الانهار بعدُ". (حسن صحیح)

روایت ہے حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں (چار دریا ہیں) پانی کا دریا ہے اور شہد کا دریا ہے اور دودھ کا دریا ہے اور شراب کا دریا ہے، پھر اس کے بعد نہریں پھوٹتی ہیں (یعنی جنت کے باغات اور محلات میں)۔

تشریح:۔ قوله: "بحر الماء الخ" یہاں بحر سے مراد سمندر نہیں بلکہ دریا ہے جیسے دجلہ وفرات اور دریائے سندھ وغیرہ جبکہ انہار سے مراد وہی عرفی نہریں ہیں جو دریا کی شاخ ہوتی ہے جیسے نہر زبیدہ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان بحار سے مراد سمندر رہوں۔

قوله: "ثم تَشَقَّقُ الانهار بعد" یعنی جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو یہ نہریں ان کی جنتوں میں بہادی جائیں گی یا مطلب یہ ہے کہ پہلے یہ مشروبات ان بڑے دریاؤں میں چلتے ہیں اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جنتیوں کے باغات میں منقسم کر کے بہادیئے جاتے ہیں۔

ان چاروں دریاؤں کا ذکر قرآن پاک کی سورۂ محمد میں بھی آیا ہے:

"فیها انهار من مآء غیر آسن وانهار من لبن لم یتغیر طعمه وانهار من خمر لذة للشاربین وانهار من عَسَلٍ مُصَفًّی".

حدیث آخر:۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ سے جنت کی تین مرتبہ دعاء مانگتا ہے تو جنت کہتی ہے اے اللہ! اس کو جنت میں داخل فرما اور جو شخص جہنم سے تین بار پناہ مانگے تو جہنم کہتی ہے اے اللہ! اس کو دوزخ سے پناہ دیں۔ (یہ روایت ابن ماجہ ونسائی میں بھی ہے

اورابن حبان نے اپنی صحیح میں بھی نقل کی ہے)۔

یہ دعائے جنت ان الفاظ کے ساتھ بھی صحیح ہے ''اللّٰھم ادخلنی الجنۃ'' اور یوں بھی صحیح ہے ''اللّٰھم انی اسألک الجنۃ'' جبکہ دوزخ سے پناہ کی دعاء کے الفاظ یہ ہیں ''اللّٰھم اَجرنی من النار'' یہ دونوں دعائیں تین تین مرتبہ مانگنی چاہئے اگر اس کو صبح وشام کا معمول بنایا جائے تو شاید یہ زیادہ مفید ہے۔

قولہ: ''قالت الجنۃ'' یعنی بزبان حال اور بزبان قال بھی ہوسکتا ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جو مُشک کے ٹیلوں پر ہونگے (راوی کہتا ہے) میرا گمان ہے کہ آپؐ نے فرمایا قیامت کے دن، ان پر اگلے اور پچھلے رشک کریں گے: (۱) وہ شخص جو ہر شب وروز پانچوں نمازوں کے لئے اذان دیتا ہے (۲) وہ شخص جو لوگوں کی امامت کرے اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں (۳) اور وہ غلام جو اللہ کا حق بھی ادا کرتا ہو اور اپنے آقاؤں کا حق بھی نبھاتا ہو۔ (حسن غریب)

یہ حدیث ابواب البر والصلہ میں بھی گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ص:۲۵۶ ج:۶ ''باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح وباب فی الحب فی اللہ، من ھذا المجلد ۷)

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے اور وہ اس کو مرفوع روایت کرتے ہیں: تین آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ عز وجل محبت کرتے ہیں۔

(۱) وہ شخص جو رات کو اُٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔

(۲) اور وہ شخص جو اپنے دائیں ہاتھ سے کوئی صدقہ دیتا ہے جس کو وہ چُھپاتا ہے (راوی) کہتا ہے میرا گمان ہے کہ اپنے بائیں سے (چُھپاتا ہے)۔

(۳) اور وہ شخص جو کسی دستے میں ہوتا ہے پس اس کے ساتھی شکست کھا جاتے ہیں اور وہ (تنہا) دشمن کا مقابلہ کرتا رہے۔ حدیث غریب غیر محفوظ والصحیح مارواہ شعبۃ الخ یعنی اس روایت میں ابوبکر بن عیاش ضعیف ہیں اس لئے شعبہ کی روایت جو ابو ہریرہؓ کی حدیث کے بعد آرہی ہے صحیح ہے۔

قولہ: ''أراہ من شمالہ'' یعنی بائیں ہاتھ سے یہ کنایہ ہے انتہائی اِخفاء سے حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ دائیں نے کیا دیا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ بائیں پہلو میں جو شخص بیٹھا ہو اس کو پتہ تک نہ چلے کہ دائیں والے کو کیا دیا؟ بنابر ہر تقدیر اس میں دائیں ہاتھ سے دینے کے اِستحباب کی طرف اشارہ ہے۔ **قولہ:**

"سریة"، لشکر کا حصہ جس کی وضاحت ابواب السیر میں گذری ہے۔

حدیث آخر:۔"یوشک الفُرات یَحسِرُ عن کنزمن الذهب فمن حَضَرَه فلایأخذمنه شیئاً. (صحیح)

حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب دریائے فرات سونے کے خزانے سے ہٹ جائے گا، پس جو شخص اس موقع پر موجود رہے وہ اس میں کچھ بھی نہ لے۔

قوله: "یوشک الفُرات" بروزن غُراب عراق کا مشہور دریا ہے اس کا منبع جنوبِ مشرق ترکی ہے جو براستہ شام، عراق میں داخل ہو کر بصرہ کے پاس دجلہ سے ملتا ہے، ان کی مجموعی لمبائی تقریباً انتیس سو کلو میٹر یعنی دریائے سندھ جتنی ہے۔

چونکہ ایک حدیث میں فرات کو انہارِ جنت میں سے شمار کیا گیا ہے شاید اسی مناسبت سے امام ترمذیؒ نے یہ حدیث یہاں ذکر فرمائی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حدیث کو یہاں لانے کی وجہ یہ ہے کہ فرات کے نیچے کا خزانہ لینا اسباب جہنم میں سے اور ترک، اسباب جنت میں سے ہے۔

قولہ: "یحسِر" اس میں سین کا کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہے بمعنی "یکشف" کے ہے یعنی بروزن یضرب و یسمع دونوں جائز ہے بظاہر یہ صورت حال فرات کے پانی کے خشک ہونے سے پیدا ہوگی، پھر مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں جو اگلی روایت میں بھی ہے "یحسر الفرات عن جبل من ذهب" یعنی سونے کی کان کھل جائے گی، جس کے حصول کے لئے سخت لڑائی ہوگی حتیٰ کہ نوانوے فیصد لوگ لقمہ اجل بن جائیں گے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پیش آئے گی۔ بعض نے اس کو حضرت مہدی کی آمد سے قبل یعنی متصل قُبیل مانا ہے۔

آج کل زیر زمین معدنیات کے بارے میں جو انکشافات جاری ہیں، بعید نہیں کہ فرات کا یہ خزانہ بھی جلد دریافت ہو جائے۔

بہر حال اس خزانہ سے لینا دنیوی و اخروی خطرات سے خالی نہیں اس لئے حدیث میں لینے سے ممانعت فرما دی گئی۔

حدیث آخر:۔ تین آدمیوں سے اللہ محبت کرتے ہیں اور تین شخصوں سے نفرت کرتے ہیں پس وہ

لوگ جن سے اللہ محبت فرماتے ہیں:

(۱) ایک وہ شخص ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور ان سے اللہ کے نام پر مانگا کسی باہمی قرابت کی وجہ سے نہیں مانگا مگر ان لوگوں نے اسے نہیں دیا، پس ان میں سے ایک شخص نے ان لوگوں سے علیحدہ ہو کر اس کو چپکے سے دیا، جس کا عطیہ سوائے اللہ اور سوائے دینے والے کے کسی کو معلوم نہ ہو سکا (تو یہ دینے والا محبوب ٹھہرا)۔

(۲) اور کچھ لوگ رات کو سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ نیند ان کو ہر اس چیز سے زیادہ عزیز ہو گئی جو اس کے مقابل ہو (یعنی رکاوٹ ہو) تو انہوں نے اپنے سر رکھ دیئے (یعنی سو گئے) اور یہ شخص اٹھا اور میری خاطر داری کرتا رہا اور میری آیتیں پڑھتا رہا (تو یہ شخص بھی اللہ کو محبوب ہے)۔

(۳) اور وہ شخص جو کسی چھوٹے لشکر میں تھا وہ لشکر دشمن سے نبرد آزما ہوا، پس اس کے ساتھیوں نے شکست کھائی مگر یہ شخص سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ مارا گیا یا فتح مند ہوا (یہ بھی محبوب الٰہی ہے)۔

اور وہ تین لوگ جن سے اللہ نفرت کرتے ہیں (یہ ہیں) (۱) بوڑھا زناکار (۲) اترانے والا فقیر (۳) اور مالدار ظالم (یعنی حق روکنے والا)۔ (صحیح)

قولہ: "فَتَخَلَّفَ بِاَعْیَانِھِم" تخلف کے معنی یہاں پر تاخر بھی ہو سکتا ہے اور تقدم بھی یعنی وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہو جاتا ہے یا آگے ہو جاتا ہے اصل مقصد ساتھیوں سے جدا ہونا ہے تاکہ اس کے عطیہ کا کسی کو پتہ نہ چل سکے اور صدقہ محض للہ بن جائے "باعیانھم" ای باشخاصھم یعنی ان ساتھیوں کے گروپ سے الگ ہو جاتا ہے۔

قولہ: "یتملقنی" تَمَلُّق چاپلوسی آؤ بھگت اور خوشامد کو کہتے ہیں۔ قولہ: "مختال" یعنی متکبر و مغرور۔

قولہ: "الظلوم" یعنی حقوق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والا چونکہ سابق الذکر تین لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں بہت زیادہ جدوجہد کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان و مال اور راحت و آرام کو اس پر قربان کرتے ہیں اور محبت تو جانبین سے ہوا کرتی ہے اس لئے اللہ بھی ان کو پسند فرماتا ہے، جبکہ آخر الذکر تین شخص خواہ مخواہ کی نافرمانی اور فضول گناہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ بوڑھے کی زناکاری ایک بے لذت سے شوق اور معمولی محرک گناہ کا نتیجہ ہے، جبکہ فقیر کا غرور بھی بغیر سبب تکبر کے ہے اور مالدار کا حقوق ادا کرنے سے

گریز کرنا محض ظلم اور ستانے کا شوق ہی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہ تینوں محض شیطانی گناہ ہوئے چونکہ ہر گناہ ویسے بھی اللہ کے غضب کا ذریعہ ہے اور خصوصاً جب وہ گناہ حیوانی ہونے کے بجائے شیطانی ہو تو اس سے تو اللہ کی ناراضگی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اعاذنا اللہ منہا ومن کل اثم. ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم.

ابواب صفة جهنم

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

(جہنم کے احوال کا بیان۔اعاذنا اللہ منہا)

لفظ جہنم غیر منصرف ہے البتہ سبب منع صرف میں دوقول ہیں :ایک یہ کہ عجمی ومعرفہ ہے کہ آخرت کی آگ کا نام ہے۔دوسرا یہ کہ عربی ہے علیت وتانیث کی وجہ سے "بئر جھنام" گہرے کنویں کو کہتے ہیں یا سخت وغلیظ چیز کو جہنم کہتے ہیں اور دوزخ بھی بہت سخت وغلیظ ہے۔

کائنات میں اوپر اور نیچے کا تعین بہت مشکل ہے کیونکہ زمین اپنی محوری حرکت کی وجہ سے ہر جانب کے لئے مساوی نسبت رکھتی ہے، البتہ عالم میں جس جانب عرش واقع ہے وہ اوپر ہے اور اسی جانب سب جنتیں واقع ہیں، جبکہ دوزخ اس کے بالکل مقابل جانب میں ہے اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمین کے اوپر جنتیں ہیں اور نیچے دوزخ ہے جس کی لپٹ قیامت کے دن زمین تک پہنچ جائے گی، اور اس کے ساتھ جنتیوں اور زمین کے درمیان حائل آسمانوں کا غلاف بھی ختم کردیا جائے گا جس سے اصل صورت حال مکمل طور پر واضح ہوجائے گی۔

باب ماجاء فی صفة النار

(دوزخ کا حال)

"عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :يُوتىٰ بجهنم يومئذٍ لهاسبعون الف زِمام مع كل زِمام سبعون الف ملك يَجُرُّونها". (والثورى لايرفعه)

اس (قیامت کے) دن جہنم کو لایا جائے گا اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی، ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ کر لائیں گے۔یہ روایت حفص بن غیاث کے طریق سے مرفوع بیان کی گئی ہے لیکن امام سفیان ثوریؒ اس کو مرفوع نقل نہیں فرماتے تاہم حفص کی ثقاہت کی بناء پر اسے مرفوع کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

تشریح:۔جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا کہ جنت اور دوزخ ایک دوسرے کے بالکل مقابل جہات پر

واقع ہیں اور چونکہ دنیا دارالتکلیف ہے اس لئے آزمائش کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دونوں انسان وجن کی نظروں سے دور واوجھل ہوں لہٰذا ان کو بہت دور رکھا گیا ہے جن کے اثرات دنیا تک نہیں پہنچتے مگر جب قیامت قائم ہوگی تو دونوں کو قریب لاکر رکھ دیا جائے گا۔

اس لامتناہی خلاء میں جہنم جہاں واقع ہے وہاں سے لانے پر فرشتے مقرر ہیں جیسا کہ حدیث باب میں مذکور ہے وہ دوزخ کو گھسیٹ کر لائیں گے۔ دوسری طرف جنت بھی قریب کردی جائے گی، جنت متقین کو خوش رکھنے کے لئے نزدیک لائی جائے گی۔ جبکہ جہنم متکبرین کو خوف زدہ کرنے کے لئے اور منکرین کو شرمندہ ونادم کرنے کے لئے تاکہ وہ جس سے انکار کرتے اب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرلیں اور انبیاء علیہم السلام کی کھلے عام تصدیق ہوسکے۔

حدیث آخر:۔ "یَخرُجُ عُنُقٌ من النار یوم القیٰمۃ له عینان تُبصِران واذنان تسمعان ولسان ینطق الخ". (حسن صحیح غریب)

قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نکلے گی، اس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھیں گی اور دو کان ہوں گے جو سنیں گے اور زبان ہوگی جو بولے گی وہ (گردن) کہے گی میں تین شخصوں پر مسلط کی گئی ہوں، ہر سرکش ضدی پر اور ہر اس شخص پر جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پکارتا تھا اور تصویریں بنانے والوں پر۔

قولہ: "عُنُقٌ" اس گردنِ جہنم سے مراد کیا ہے؟ تو حضرت گنگوہیؒ الکوکب میں فرماتے ہیں: "ای کصورۃ رقبۃ ورأسٍ" جبکہ محشی نے طیبیؒ سے نقل کیا ہے "ای طائفۃ منھا" دونوں قولین کا مطلب ایک ہے یعنی آگ کا ایک حصہ وشعلہ عظیمہ نکلے گا جس کی شکل گردن اور سر جیسی ہوگی اس میں آنکھیں بھی ہوں گی اور کان و زبان بھی، اس سے معلوم ہوا کہ جہنم میں بھی اللہ نے یہ صلاحتیں ودیعت فرمائی ہیں اور اس میں کسی استبعاد کی ضرورت نہیں کہ اللہ جل جلالہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور چونکہ دنیا کے خاتمہ پر اسباب پر تکیہ کا زعم بھی ختم ہوجائے گا بلکہ پیچھے گذرا ہے کہ جیسے جیسے قیامت آتی رہے گی تو خوارق میں اضافہ ہوتا رہے گا لہٰذا قیامت کے دن خوارق کا رونما ہونا کسی طرح بھی تعجب خیز نہیں یہ وہ دن ہوگا جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کے جمال وجلال کا بھرپور اظہار کیا جائے گا لہٰذا وہاں خوارق دیکھنے کا خوب موقع ملے گا۔

قولہ: "جبار عنید" جبار سرکش اور عنید حد سے بڑھنے والے کو کہتے ہیں مگر لاعلمی سے بڑھنے والے کو نہیں بلکہ جان بوجھ کر تجاوز کرنے والے کو۔

چونکہ سرکش ومتکبر آدمی خلق خدا کو نقصان پہنچاتا ہے اور مشرک زمین میں فساد پھیلاتا ہے اور تصویر بنانے والا تخلیق خداوندی کی مشابہت کرتا ہے اس لئے یہ سب کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکومت اور تدبیر مملکت میں دخل اندازی ہے اس لئے ان کو سخت عبرتناک سزا دی جائے گی، تصویر پر راقم نے مستقل کتاب لکھی ہے ''شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت''۔

باب ماجاء فی صفة قعرِ جهنم

(جہنم کی گہرائی کا بیان)

"ان الصخرة العظيمة لَتُلقىٰ من شفير جهنم فتهوِى فيهاسبعين عاماً ماتُفضِى الى قرارها، قال: وكان عمريقول: اكثِروا ذِكر النارفان حَرَّهاشديد وان قعرهابعيدوان مقامِعَها حديد". (لانعرف للحسن سماعاً عن عُتبة الخ)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے ہمارے منبر یعنی بصرہ کے منبر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپؐ نے فرمایا: پتھر کی بڑی چٹان اگر جہنم کے کنارے سے پھینکی جائے اور وہ جہنم میں ستر سال گرتی رہے تب وہ اپنے ٹھکانے (گہرائی) تک نہیں پہنچے گی۔ اور حضرت عتبہؓ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ دوزخ کا تذکرہ بکثرت کرو (یا دوزخ کو کثرت سے یاد کرو) کیونکہ اس کی تپش سخت ہے اور اس کی تہہ بہت دور ہے اور اس کی موگریاں (گرز) لوہے کی ہیں۔

تشریح:۔قولہ: ''الصخرة'' خاء ساکن ہے گو فتحہ بھی جائز ہے چٹان کو کہتے ہیں۔

قولہ: ''شفیر'' کنارہ۔

قولہ: ''مقامعھا'' مِقمَعَۃ کی جمع ہے لوہے کی وہ سلاخ جس کا سر امڑا ہوا اسے موگری کہتے ہیں۔ یہ کوڑے وسلاخیں دوزخیوں کے مارنے کے لئے ہیں۔

جہنم کی گہرائی اور وسعت انسانی تصور سے بھی بالاتر ہے تاہم باب کی روایت منقطع ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے۔ کہ حضرت حسن بصریؒ کی ولادت حضرت عمرؓ کے دور خلافت کے آخر میں ہوئی ہے جبکہ حضرت عتبہؓ کی وفات اس سے پہلے ہو چکی تھی اس لئے سماع ولقاء ثابت نہیں کیونکہ جس وقت حضرت عتبہؓ مدینہ سے بصرہ آئے تھے اس وقت حضرت حسن بصریؒ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

حاشیہ کوکب پر اسد الغابہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عتبہؓ کا اسلام ساتویں نمبر پر ہے جبکہ ان کی عمر چالیس برس کی تھی، ہجرت حبشہ بھی کر چکے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کو بصرہ پر مقرر فرمایا لیکن ۱۵ھ یا ۱۷ھ میں حج کی غرض سے گئے اور حضرت عمرؓ سے درخواست فرمائی کہ مجھے دوبارہ بصرہ نہ بھیجیں، درخواست منظور نہ ہوئی، انہوں نے دعاء مانگی کہ اے اللہ! مجھے دوبارہ بصرہ نہ بھیجیں چنانچہ سواری سے گر کر فوت ہو گئے۔ ظاہر ہے ایسے میں حضرت حسن بصریؒ کی ملاقات ان سے ممکن نہیں ہے۔ بنا بر صحتِ حدیث سالبہ عدمِ وجود موضوع میں بھی صادق رہتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "الصعود جبل من نار یتصعّد فیه الکافر سبعین خَرِیفاً ویهوی فیه کذالک ابداً". (غریب)

یعنی "سَأُرْهِقُهٗ صَعُوداً" (مدثر آیت: ۱۷) عنقریب میں ایسے (کافر کو) صعود پر چڑھادوں گا۔ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صعود آگ کا ایک پہاڑ ہے جس پر کافر ستر سال تک چڑھے گا اور اتنی ہی مدت میں اس سے گرے گا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ (یہ آیت ولید بن مغیرہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی ہے)۔

قوله: "یتصعد ویهوی" کا ترجمہ معروف کے صیغوں کا کیا گیا ہے اگر ان کو مجہول مانا جائے جیسا کہ ملا علی قاریؒ کی رائے ہے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ کافر کو اس پہاڑ پر ستر سال تک چڑھایا جائے گا اور ستر سال گرایا جائے گا اس صورت میں یقیناً تکلیف زیادہ ہوگی، جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایک شخص چڑھ نہیں سکتا ہو مگر اسے مار مار کر مجبور کیا جاتا ہو تو تکلیف ڈبل ہو جاتی ہے۔ **قوله:** "خریفاً" بخزاں مراد سال ہے۔

بظاہر یہ اشکال سا ہوتا ہے کہ آگ تو لطیف ہے پھر اس کے پہاڑ کا کیا مطلب؟ لیکن اس کا جواب آسان ہے کہ کبھی لطیف چیز بھی ٹھوس جسم بن جاتی ہے۔ چنانچہ ہوا بارش میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بارش کا پانی برف بن جاتا ہے۔ چنانچہ زمین وغیرہ بھی بزبانِ سائنس گیسوں میں عملِ تکاثف کی بناء پر بنی ہے۔

باب ماجاء فی عظم اهل النار

(اہل نار کے بڑے جسموں کا بیان)

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ضرس الکافر یوم القیٰمة

مثل اُحُدٍ وفخذه مثل البيضاء ومقعده من النار مسيرثلاث مثل الرَبَذَة والبيضاء جبل".
(حسن غريب)

کافر کی داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوگی اور اس کی ران بیضاء جتنی ہوگی اور آگ میں نشست (بیٹھنے کی جگہ) تین دن کی مسافت کے برابر ہوگی جتنی رَبَذَہ تک ہے۔

تشریح:۔ قوله :"البيضاء" امام ترمذیؒ نے اس کی تفسیر فرمائی کہ ایک پہاڑ کا نام ہے، چونکہ کافر کی داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوگی اور فخذ یعنی ران تو داڑھ سے بہت بڑی ہوتی ہے اس لئے کہا جائے گا کہ بیضاء پہاڑ احد سے کئی گنا بڑا ہے۔

قوله:"ربذه" بالفتحات مدینہ سے تین دن کی مسافت پر ہے جہاں حضرت ابوذر غفاریؓ مدفون ہیں، چونکہ یہ ارشاد نبی علیہ السلام نے مدینہ میں فرمایا تھا اس لئے مطلب وہی ہوا جو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے یعنی مدینہ سے ربذہ تک جتنی مسافت کو وہ گھیرے گا۔ بیضاء پہاڑ اسی ربذہ کے پاس ہے۔

کافر کے جسم میں زیادتی کرنا عذاب کے احساس کو بڑھانے کے لئے ہے کیونکہ جسم کا جتنا زیادہ حصہ متاثر ہوتا ہے اتنا ہی تکلیف میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ کم جگہ میں احساس کم ہوتا ہے چنانچہ اگر ہم سوئی گرم کر کے اس کا سرا جسم پر رکھدیں تو احساس نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے بعض دفعہ ڈاکٹر انجکشن لگاتا ہے لیکن مریض کو پتہ بھی نہیں چلتا کیونکہ سوئی بہت باریک ہوتی ہے اور معمولی سوراخ بلکہ مسام سے داخل ہو جاتی ہے جبکہ بندوق کی گولی یا دیگر زخموں کو برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ (تدبر)

حدیث ابن عمرؓ:۔"ان الكافر ليَسحبُ لسانه الفرسخ والفرسخين يَتَوطَّاه الناس".
(غريب)

کافر اپنی زبان بقدر ایک فرسخ، دو فرسخ گھسیٹے گا جس کو لوگ روندتے رہیں گے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ یہ کافر نہار الرجال تھا جس نے مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت کی جھوٹی گواہی دی تھی"انه سمع محمداً يقول قداشرَكَ معه فى الرسالة" اس پر بنوحنیفہ نے مسیلمہ کی تصدیق کی حالانکہ اس کو نبی علیہ السلام نے اہل یمامہ کو تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا مگر اس نے خیانت کی۔

قوله:"ليسحب" کسی چیز کو زمین پر گھسیٹنے کو کہتے ہیں۔

قوله:"الفرسخ" تین میل کی مسافت کو فرسخ کہتے ہیں، حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی

مقادیر میں اختلافِ الفاظ کی ایک وجہ یا تو یہ ہے کہ ان الفاظ سے مراد تحدید نہیں بلکہ مبالغہ ہے یا پھر اختلاف کافروں کے مختلف احوال کی طرف مشیر ہے مثلاً کسی کافر کی زبان ایک فرسخ تک لٹکی ہوگی اور کسی کی دو فرسخ تک۔

قولہ: "یتوطاہ" وَطِاہ یطأہ بمعنی کچلنے اور روندنے کے آتا ہے یعنی میدان محشر میں لوگ اس کی زبان پر پاؤں رکھتے ہوئے چلتے رہیں گے۔

حدیث ابی ھریرۃ: "ان غِلظ جلد الکافر اثنتان واربعون ذراعاً وان ضرسه مثل احدوان مجلسه من جهنم مابين مكة والمدينة". (حسن صحيح غريب)

کوئی شک نہیں کہ کافر کی کھال کی موٹائی بیالیس گز ہوگی اور اس کی داڑھ احد پہاڑ جتنی ہوگی اور دوزخ میں اس کے بیٹھنے کی جگہ مکہ اور مدینہ کے مابین جتنی مسافت کے بقدر ہوگی۔ مطلب وتشریح اوپر گذر گئی ہے۔

باب ماجاء فی صفة شراب اهل النار

(دوزخ والوں کے مشروب کا بیان)

"عن ابی سعیدعن النبی صلی الله علیه وسلم فی قوله: "کَالمُهلِ" قال کعکر الزیت فاذا قَرَّبَه الی وَجهِه سَقَطَت فروة وَجهِه فيه". (هذاحديث لانعرفه الامن حديث رِشدين بن سعدالخ).

حضرت ابوسعید خدریؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت "کالمھل" کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: جیسے تیل کی تلچھٹ پس جب وہ (جہنمی) اسے اپنے منہ کے قریب کرے گا تو اس کے چہرے کی کھال اس میں گر پڑے گی۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں رشدین ہیں جن پر کم یاداشت کی وجہ سے کلام ہوا ہے۔

تشریح: پوری آیت اس طرح ہے: "وإن يَستَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالمُهل يَشوِى الوُجُوه"۔ (الکہف آیت: ۲۹) ترجمہ: اور اگر فریاد کریں گے (پیاس کی) تو ایسے کھولتے ہوئے پانی سے ان کی دادرسی کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح (گرم ہوگا اور جو) مونہوں کو بھون ڈالے گا۔

اس آیت میں "کالمھل" کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ وہ مُہل عکر الزیت کی مانند ہوگی، عکر بفتح العین والکاف اصل میں گدلا پن کو کہتے ہیں چونکہ یہاں زیت یعنی زیتون کے تیل کی طرف اضافت ہوئی ہے

اس لئے مراد تلچھٹ ہے، پگھلی ہوئی کوئی بھی دھات، پیپ اور زیتون کا پتلا تیل بھی مہل کہلاتا ہے۔

قولہ:"فروۃ وجھہ" بروزن رحمۃ اصل سر کی کھال مع بال کو کہتے ہیں یہاں مجازاً چہرے کی کھال پر اطلاق ہوا ہے۔

حدیث ابی ھریرۃؓ:۔"ان الحمیم لَیُصَبُّ علی رؤسھم فَیَنفَذُ الحمیم حتیٰ یخلص الی جوفہ فیسلِتُ مافی جوفہ حتیٰ یمرُق من قدمیہ وھو الصھر ثم یعاد کما کان".(حسن غریب صحیح)

کچھ شک نہیں کہ کھولتا ہوا پانی جہنمیوں کے سروں پر ڈالا جائے گا پس وہ کھولتا ہوا پانی نفوذ کرے گا (پار ہوگا) یہاں تک کہ اس کے پیٹ تک پہنچ جائے گا پس وہ کاٹ ڈالے گا اس کو جو اس کے پیٹ میں ہے (یعنی آنتیں اور کلیجہ وغیرہ) حتیٰ کہ یہ چیزیں اس کے دونوں قدموں سے (یعنی دُبر سے) نکل جائیں گے اور یہی وہ "صھر" ہے (یعنی قرآن کی اس آیت میں "یُصَبُّ مِن فَوقِ رُؤسِھِم الحَمِیمُ یُصھَرُ بِہ مَافی بطونھم والجلود") (حج آیت:۱۹،۲۰) ترجمہ: یعنی ڈالا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی جس سے پگھل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے) پھر وہ (کافر) جیسا تھا ویسا ہی لوٹا دیا جائے گا۔

قولہ:"الحمیم" ح،م، میں حرارت کے معنی پائے جاتے ہیں یہاں کھولتا ہوا گرم پانی مراد ہے جو حد درجہ گرم ہوگا۔

قولہ:"فیسلت" لام کا ضمہ و کسرہ دونوں جائز ہیں اصل میں قطع اور کاٹنے کو کہتے ہیں "سلت القصعة"، اس وقت کہا جاتا ہے جب برتن کو چاٹ کر صاف کیا جائے گویا صاف کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

قولہ:"یمرُق" بضم الراء بمعنی یخرج کے مَرَق السھم اس وقت کہتے ہیں جب تیر نشانے سے پار ہو جائے۔

قولہ:"وھو الصھر" بفتح الصاد پگھلانے کو کہتے ہیں یعنی قرآن میں "یُصھَرُ بہ" سے مراد یہی صورت ہے۔

قولہ:"ثم یعاد"ای مافی جوفہ۔

چونکہ کافر دنیا میں اپنی خباثت سے توبہ نہیں کرتا بلکہ زندگی بھر بار بار اور مسلسل گناہ و جرائم کرتا رہتا ہے اس لئے اس کی سزا بھی مکرر مکرر ہوگی اور چونکہ وہ ارادۃً وعزماً ہمیشہ کفر کو اختیار کر چکا ہوتا ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ

ہوتا تو ہمیشہ کافر ہی رہتا اس لئے وہ آخرت میں بھی ہمیشہ عذاب میں مبتلاء رہے گا کیونکہ سزا عمل کے مطابق ہوتی ہے جیسا کہ سابقہ باب میں ابن عمرؓ کی روایت میں کافر کی زبان دو فرسخ کے بقدر نکلنے کا ذکر آیا ہے کہ جب رجال بن عبقرہ نے قرآن پڑھنے اور فقاہت حاصل کرنے کے بعد معلم کی حیثیت سے بنوحنیفہ قبیلہ یعنی یمامہ جا کر اپنی جھوٹی شہادت سے ایسا فتنہ برپا کردیا کہ پورا قبیلہ گمراہ ہوگیا، اس لئے اس کی زبان میدانِ محشر میں لوگوں کے پاؤں کے نیچے بچھائی جائے گی تاکہ وہ لوگوں کے قدموں کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی سزا پائے۔

حدیث آخر:۔ "عن ابی امامة عن النبی صلی الله علیه وسلم فی قوله: وَيُسقىٰ مِن مَاءٍ صَدِيدٍ يَتَجَرَّعُه "قال يُقَرَّبُ الی فيه فيكرهه فاذا اُدنِیَ منه شَویٰ وَجهَه ووقعت فروَةُ رأسه فاذا شربه قَطَّعَ اَمْعَاءَهُ حتیٰ یخرج من دبره یقول الله تبارک وتعالیٰ: "وسُقُوا ماءً حميماً فَقَطَّعَ اَمعاءهم "ويقول: وان يستغيثوا يُغاثُوا بماء كالمهل يشوى الوجوه بئس الشراب وَسَآءَت مُرتَفَقاً". (حديث غريب)

اور اس (کافر) کو پیپ ولہو کے پانی سے پلایا جائے گا، وہ اس کو گھونٹ، گھونٹ پیئے گا (ابراہیمؑ: آیت: ۱۶، ۱۷) اس آیت کی بابت آپؐ نے فرمایا وہ مکسچر اس کے منہ کے قریب کردیا جائے گا تو وہ اسے ناگوار گذرے گا پس جب اور نزدیک کیا جائے گا تو وہ اس کے چہرے کو بھون ڈالے گا اور اس کے سر کی کھال مع بالوں کے گر پڑے گی اور جب وہ اسے پیئے گا تو وہ اس کی آنتوں کو کاٹ دے گا یہاں تک کہ وہ اس کی دبر سے نکلیں گی، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ان کو کھولتا ہوا گرم پانی پلایا جائے گا سو وہ ان کی انتڑیوں کو چور چور کردے گا اور اللہ فرماتے ہیں: اگر جہنمی پیاس کی فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی سے جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا جو مونہوں کو بھون ڈالے گا بُری ہے پینے کی چیز اور بُری ہے آرام گاہ۔

قوله: "صديد" یعنی خون اور پیپ کا مجموعہ۔

قوله: "يتجرعه" جرعة سے ہے گھونٹ کو کہتے ہیں یعنی پی نہیں سکیں گے اس لئے گھونٹ گھونٹ پینا پڑے گا۔

قوله: "مرتفقاً" وہ منزل جہاں آرام کیا جاتا ہے۔ باقی الفاظ کی تشریح گذری ہے۔

قوله: فی حديث ابی سعيد الخدریؓ قال: " لسُرادق النار اربعة جُدُرٍ كثف كل جدار مسيرة اربعين سنة".

اس حدیث میں سرادق کی تفسیر کی گئی ہے جو سورۂ کہف کی آیت میں مذکور ہے: "اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِین نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا" (کہف: آیت:۲۹) ترجمہ: ہم نے ظالموں کے لئے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں اُن کو گھیر رہی ہوں گی۔ آپؐ نے فرمایا: دوزخ کی قناتیں چار دیواریں ہیں، ہر دیوار کی موٹائی چالیس سال کی مسافت ہے۔

قوله: "لَسُرادق" بفتح اللام مبتدأ اربعة جُدُرٍ خبر ہے۔ سُرادق بضم السین سردق بفتح السین کی جمع ہے گھیرنے والی چیز کو کہتے ہیں جیسے دیوار یا قنات تاہم وہ قناتیں کپڑے کا ہونا ضروری نہیں اس احاطہ میں حکمت یہ ہے تا کہ دوزخ کی تپش وحرارت میں مزید اضافہ ہو یعنی گرمی بھی ہو اور حبس بھی۔ قوله: "جُدُر" بضمتین جدار کی جمع ہے۔

قوله: "کِثَف" بکسر الکاف وفتح الثاء موٹائی۔

وبهذا الاسناد: قال "لو ان دلواً من غسّاق يُهراق في الدنيا لَأنتن اهل الدنيا"۔ اگر دوزخیوں کے زخموں سے بہنے والی پیپ کا ایک ڈول دنیا میں بہا دیا جائے (یعنی ڈال دیا جائے) تو سب دنیا والے سڑ جائیں گے۔ ان تینوں اسانید میں رشدین بن سعد ہیں جو متکلم فیہ ہیں۔

قوله: "غساق" سین کی تشدید کے ساتھ اگرچہ تخفیف بھی جائز ہے اس کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں: ایک یہ کہ دوزخیوں کے زخموں کی پیپ کو کہتے ہیں۔ دوم: یہ کہ آنسوؤں کو کہتے ہیں۔ سوم: یہ کہ زمہریر کو کہتے ہیں جو شدت برودت کی وجہ سے آگ کی طرح ان کو جلائے گا۔ بعض نے کہا کہ زنا کاروں کی شرم گاہوں سے بہنے اور رسنے والا مادہ مراد ہے، سورۂ ص میں ہے: "هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ" (ص: آیت:۵۷) ترجمہ: یہ کھولتا ہوا گرم پانی اور پیپ ہے اب اس کے مزے چکھیں۔

حدیث آخر: ۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وانتم مُسْلِمُوْن" قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لو ان قطرة من الزقوم قُطِرَت في الدنيا لَأفسَدَت على اهل الدنيا معايشهم فكيف بمن يكون طعامه". (حسن صحيح)

(پھر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر زقوم (سینڈھ) کا ایک قطرہ بھی دنیا میں ٹپکا دیا جائے تو وہ دنیا والوں کی معیشت تباہ (یعنی جینا حرام) کردے گا پس اس کا حال کیا ہوگا جس کا کھانا یہ ہو۔

قولہ: "الزقوم" انتہائی تلخ، خاردار اور بدبودار درخت ہے جس کے کھانے پر اہل دوزخ کو مجبور کیا جائے گا جسے اردو و ہندی میں تھوہر کہتے ہیں اور سینڈھ بھی کہا جاتا ہے۔

اس آیت اور حدیث میں مناسبت یہ ہے کہ جو شخص صحیح تقویٰ اختیار کرے گا وہ ان مصائب و آفات سے نجات پائے گا جن میں سے ایک زقوم بھی ہے۔

باب ماجاء فی صفة طعام اهل النار

(دوزخ والوں کے کھانے کا بیان)

"عن ابی الدرداء قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : یُلقیٰ علی اهل النار الجوعُ فیَعدِلُ ماهم فیه من العذاب فیستغیثون فیُغاثون بطعام مِن ضریع لایُسمِن ولایغنی من جوع فیستغیثون بالطعام فیُغاثون بطعام ذی غُصَّةٍ فیذکرون انهم کانوایُجیزُون الغُصَصَ فی الدنیا بالشراب فیستغیثون بالشراب فیُدفع الیهم الحمیم بکلالیب الحدید فاذا دَنت من وجوههم شوَت وجوههم فاذا دخلت بطونهم قَطَّعَت مافی بطونهم فیقولون: اُدعوا خزَنَةَ جهنم فیقولون: اَلم تک تأتیکم رُسُلُکم بالبیّنات ؟قالوا: بلیٰ! قالوا: فادعوا وما دعاء الکافرین اِلّا فی ضلال قال: فیقولون: اُدعُوامالِکاً فیقولون یامالِکُ! لِیَقضِ علینا ربک قال صلی الله علیه وسلم فیُجیبُهم اِنکم ماکثون! قال الاعمش نُبِّئتُ اَن بین دعائهم وبین اِجابةِ مالِک اِیّاهم الف عام، قال فیقولون ادعواربکم فلااحدخیرمن ربکم فیقولون رَبَّناغَلبت علینا شِقوَتُنَاو کُنّاقوماً ضالّین، ربّنااَخرِجنامنهافان عُدنافاِنّاظالمون، قال فیجیبُهم اِخسَئوا فیها ولاتکلمون، قال فعند ذالک یَئِسُوامن کل خیروعندذالک یأخذون فی الزفیر والحسرة والویل".

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنمیوں پر بھوک مُسلّط کی جائے گی، وہ بھوک (تکلیف میں) اس عذاب کے برابر ہو جائے گی جس میں وہ مبتلا ہوں گے، پس وہ (بھوک کی) فریاد کریں گے تو ان کی فریادرسی کی جائے گی ضریع (خاردار جھاڑی) سے جو نہ فربہ کرے گی اور نہ ہی بھوک مٹائے گی، پس وہ فریاد کریں گے (اور طرح) کھانے کی تو وہ فریادرسی کئے جائیں گے ایسے کھانے

سے جو گلے میں پھنسنے والا ہوگا، تو وہ یاد کریں گے کہ وہ دنیا میں پھنسے ہوئے نوالوں کو پانی سے اُتارا کرتے تھے، اس لئے وہ پانی کی فریاد (یعنی طلب) کریں گے، تو ان کو لوہے کے آنکڑوں کے ساتھ کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا جب وہ پانی ان کے چہروں کے قریب ہوگا تو وہ ان کے مونہوں کو بھون ڈالے گا اور جب وہ ان کے پیٹوں میں اُترے گا تو ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے کو ریزہ ریزہ کردے گا پس وہ کہیں گے کہ جہنم کے نگرانوں کو (دعا کے لئے) پکارو پس وہ فرشتے جواب میں کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے رسول کھلی نشانیوں کے ساتھ نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں فرشتے کہیں گے تو پھر تم خود ہی پکارو اور کافروں کی دعاء (اس روز) محض بے کار (بے اثر) ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر دوزخی کہیں گے کہ مالک (داروغۂ جہنم) کو (دعاء کے لئے) پکارو! پس وہ کہیں گے اے مالک! (دُعاء کریں تاکہ) آپ کا رب ہمارا کام تمام کردے (یعنی موت دے ہمیں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چنانچہ مالک ان کو جواب دیں گے کہ کوئی شک نہیں کہ تم اس حال میں ہمیشہ پڑے رہو گے!! امام اعمش فرماتے ہیں کہ مجھے بتلایا گیا ہے کہ ان کی پکار اور ان کو مالک کے جواب دینے کے درمیان ہزار سال گذریں گے۔

آپؐ نے فرمایا: وہ لوگ کہیں گے اپنے رب کو (براہِ راست) پکارو کیونکہ تمہارے رب سے بہتر (درشفقت وقدرت) کوئی نہیں، چنانچہ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آئی ہے اور ہم گمراہ تھے، اے ہمارے رب تو ہمیں اس سے نکال! اگر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو یقیناً ہم قصوروار ہونگے۔

آپؐ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جواب میں کہیں گے دُھتکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مجھ سے کوئی بات مت کرنا! آپؐ نے فرمایا: اب کی بار وہ ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے اور اس وقت وہ گدھے کی طرح چلانے لگیں گے اور افسوس وہلاکت کو پکارنا شروع کریں گے۔

تشریح:۔ قولہ: "فَيَعدِلُ ما هم فيه" یعنی اہل جہنم پر ایسی سخت بھوک مسلّط کی جائے کہ اس کی تکلیف آگ میں جلنے کے برابر ہوجائے گی اس طرح وہ ظاہری وباطنی دونوں حالتوں میں عذاب شدید میں مبتلاء ہوجائیں گے اس بھوک کے عذاب سے نکلنے وبچنے کے لئے وہ کھانے کی تلاش شروع کریں گے۔

قولہ: "فيستغيثون" اصل میں غوث یعنی مددگار طلب کرنے یا مدد طلب کرنے کے لئے آتا ہے

یہاں مراد بھوک ختم کرنے کی مدد مانگنا ہے یعنی کھانا طلب کریں گے۔

قولہ: "ضریع" ایک قسم کا خاردار پودا ہے الکوکب میں اسے جواسہ کہا ہے، اور جب کفار نے اس کا مذاق اُڑانا شروع کیا کہ پھر تو ہم دوزخ میں خوب تگڑے رہیں گے، کیونکہ ہمارے اونٹ جب جواسہ کھاتے ہیں تو خوب فربہ اور تازہ موٹے ہوجاتے ہیں تو اس پر نازل ہوا "لایسمن ولا یغنی من جوع" یعنی دوزخ کا جواسہ نہ تو موٹا کرتا ہے اور نہ ہی بھوک مارتا ہے۔ کیونکہ اول تو دنیوی جواسہ اور دوزخ کے جواسہ میں فرق ہے دوم اونٹ جب اسے کھاتے ہیں جب وہ کچا اور تازہ ہو جسے شبرق کہا جاتا ہے مگر جب خشک اور سخت ہوجائے تو اونٹ اسے منہ بھی نہیں لگا سکتے ہیں کیونکہ اس کے کانٹیں بہت سخت ہوجاتے ہیں اس وقت اسے ضریع کہا جاتا ہے اس وقت وہ زہریلا بھی بن جاتا ہے لہٰذا جہنمی ضریع انتہائی کڑوا، خاردار اور زہریلا ہوگا۔

غرض جہنمیوں کی بھوک کسی طرح کم نہ ہوسکے گی بلکہ کھانے کی کوشش سے ان کی مصیبت مزید بڑھ جائے گی۔

قولہ: "الغُصص" بضم الغین غُصَّۃ بالضم کی جمع ہے وہ لقمہ یا ہڈی وغیرہ جو حلق میں پھنس جائے، غرض ان کو ایسا کھانا دیا جائے گا جو گلے میں پھنسے گا ان کو یاد آجائے گا کہ وہ دنیا میں پانی پی کر پھنسے ہوئے لقمے کو اتارتے، چنانچہ وہ پانی مانگیں گے لیکن ان کو جو پانی دیا جائے گا اس میں آنکڑیں یعنی مڑی ہوئی سلاخیں ہوں گی۔

بعض شارحین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کلالیب سے پکڑ کر پانی پلایا جائے گا لیکن حاشیہ کوکب پر ہے کہ اس طرح کلالیب کا فائدہ نظر نہیں آتا اس لئے صحیح یہ ہے کہ پانی کلالیب کے ساتھ ملا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ کلالیب تو منہ میں پھنس جائیں گے جبکہ گرم کھولتا ہوا پانی ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈال دے گا، کلالیب کلّوب بفتح الکاف وتشدید اللام کی جمع ہے۔

قولہ: "ادعوا خزنۃ جھنم" یعنی محافظ فرشتوں سے کہو کہ وہ اپنے رب سے ہمارے لئے دعاء مانگیں اس طرح "ادعوا مالکاً" کا مطلب بھی یہی ہے۔

قولہ: "اخسئوا" اصل میں کُتے کے دُھتکارنے کے لئے جو الفاظ ہوتے ہیں اس کو کہتے ہیں مگر اردو میں اس کے لئے کوئی مُعیّن لفظ مستعمل نہیں ہے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ چونکہ جہنمیوں کے کلام کے صدر و عجز میں اختلاف وتضاد ہے کیونکہ پہلے انہوں نے خود اقرار کیا کہ ہمیں بدبختی نے گھیر لیا ہے اور پھر بھی کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے نکال دیں، اس لئے یہی

جواب مناسب ہے، کیونکہ وہ ایک محال خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

قولہ: "زفیر" گدھے کی آواز کی ابتدائی حالت جبکہ آخری حالت کو شہیق کہتے ہیں۔

امام ترمذیؒ کی تصریح کے مطابق یہ روایت موقوف ہے تاہم اسے مرفوع کے حکم میں کہنا صحیح ہے کیونکہ یہ مدرک بالرائے والعقل نہیں ہے۔ جیسا کہ اصول میں بیان ہوا ہے۔

حدیث ابی سعیدؓ: ۔ "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "وھم فیھا کالحون "قال تشویہ النار فَتَقلّص شَفَتُہ العُلیاحتیٰ تبلغ وسط رأسہ وتسترخی شفتہ السُفلیٰ حتیٰ تضرب سُرَّتہ". (حسن صحیح غریب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے متعلق فرمایا "وھم فیھا کالحون" (مؤمنون: آیت: ۱۰۴)

ترجمہ: وہ جہنمی اس میں بدشکل ہوں گے آپؐ نے فرمایا کہ آگ دوزخی کو بھون ڈالے گی اس طرح اس کا بالائی ہونٹ سکڑ جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے سر کے نصف تک پہنچ جائے گا جبکہ اس کا نچلا ہونٹ لٹک جائے گا یہاں تک کہ اس کی ناف تک آجائے گا۔

قولہ: "کالحون" ترش رُو اور بگڑے ہوئے مُنہ کو کہتے ہیں کالح کی جمع ہے جس کے ہونٹ دانتوں اور منہ کو نہ چھپا سکے۔

قولہ: "فتقلص" ان تنقبض یعنی سکڑ جائے گا اور سمٹ جائے گا جیسے ریشمی کپڑا جلنے سے سکڑ جاتا ہے۔

حدیث آخر: ۔ "لوانّ رصاصۃ مثل ھذہ واشارالی مثل الجُمجُمَۃِ اُرسِلت من السماء الی الارض الخ". (حسن صحیح)

آپ نے فرمایا کہ اگر اس طرح کا سیسہ اور اس کے ساتھ آپؐ نے ایک گول برتن (یا سر وکھوپڑی) کی مانند کا اشارہ فرمایا آسمان سے زمین کی طرف پھینکا جائے (یا چھوڑ دیا جائے) جس کی مسافت پانچ سو سال ہے تو وہ رات سے پہلے ہی زمین پر پہنچ جائے گا لیکن اگر وہ سیسہ (گولا یا گیند) زنجیر کے سرے سے چھوڑا جائے تو وہ چالیس سال تک دن رات چلتا رہے گا جہنم کی تہہ تک جانے یا فرمایا کہ گہرائی سے قبل (یا زنجیر کے دوسرے سرے سے پہلے)۔

قولہ: "رصاصۃ" سفید کو قلعی اور کالے کو اُسرب یعنی سیسہ کہتے ہیں۔ **قولہ:** "الجُمجُمۃ" بضم الجیمین گول برتن کو بھی کہتے ہیں اور کھوپڑی کو بھی، مراد گول گیند کی طرح سیسہ کا گولا ہے۔ **قولہ:** "من رأس

السلسلة'' اس سے مراد وہ زنجیر ہے جس کا ذکر سورۃ الحاقۃ میں آیا ہے ''ثم فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعاً فاسلکوه'' اس زنجیر سے جہنمی کو جکڑا جائے گا والعیاذ باللہ۔

قوله: ''اصلها'' یعنی زنجیر کا دوسرا سرا جبکہ قعرھا سے مراد جہنم کی تہہ ہے راوی کو شک ہے تاہم زنجیر کا نچلا سرا اور دوزخ کی تہہ دونوں مسافت میں مساوی ہیں۔ واللہ اعلم۔

اشکال:۔ آسمان سے زمین تک تو کوئی بھی مادی چیز ایک دن میں نہیں پہنچ سکتی؟ بلکہ روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی ہے جس کی رفتار تقریباً تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔

حل:۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے جواب دیا ہے کہ یہاں مراد تقلیل ہے یعنی اگر آسمان سے زمین تک کی مسافت ایک دن میں فرض کر لی جائے تو وہ زنجیر اس کے مقابلے میں چالیس سال کی مسافت سے بھی زیادہ طویل ہے لہٰذا یہ مثال تقریب الی الفہم کے لئے ہے جیسا کہ قرآن وسنت کا اصول ہے کہ اَمثِلہ میں تفاھم الناس کی رعایت کی جاتی ہے۔

باب ماجاء ان نارکم هٰذه جزء من سبعين جزء من نار جهنم

(دوزخ کی آگ دنیوی آگ سے اُنہتر گنا زیادہ تیز ہے)

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: نارکم هٰذه التی توقدون جزءٌ واحد من سبعين جزء من حَرِّ جهنم، قالوا واللّٰهِ اِن کانت لَکافية يارسول الله! قال فانها فُضِّلت بتسعة وستين جزءً کُلُّهن مثل حَرِّ ها". (حسن صحيح)

تمہاری یہ آگ جسے تم جلاتے ہو جہنم کی حرارت (گرمی) کے ستر/ ۷۰ اجزاء میں سے ایک ہے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! بلاشبہ یہ (دنیوی) آگ بھی یقیناً کافی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شک نہیں کہ اُسے اُنہتر گنا بڑھایا گیا ہے جس کا ہر جزء اِس (دنیوی آگ) کی طرح گرم ہے۔

تشریح:۔ قوله: ''ان کانت'' مخففہ من المثقلہ ہے یعنی اِنّه یا انها کانت الخ۔

قوله: ''قال فانها فُضِّلت الخ'' جواب کا مطلب یہ ہے کہ نہیں بلکہ چونکہ جہنم کی آگ اللہ تبارک

وتعالیٰ کے غضب کا مظہر واثر ہے اور اس کے انتقام کا ذریعہ ہے اس لئے اس کا جوش وخروش اور درجۂ حرارت یقیناً دنیاوی آگ سے زیادہ ہونا چاہئے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ گویا اصلاً آگ جہنم کی ہے مگر جب اللہ نے اسے دنیا والوں کے فائدے یعنی جلانے کے کام کے لئے بھیجنا چاہا تو اسے سمندر میں دو مرتبہ ڈبو کر نکالا، اگرچہ یہ حدیث ایک طرح کی تمثیل ہے اصل آگ جہنم کی بہت گرم ہے تاہم دنیوی آگ کا درجہ حرارت مختلف ہوتا ہے۔ اگر ہم اوسطاً ایک ہزار سینٹی گریڈ لے لیں تو ماننا پڑے گا کہ دوزخ کا درجہ حرارت ستر ہزار سینٹی گریڈ ہے۔ اَعَاذَنَا اللہ منھا ومن کل کرب یوم القیٰمۃ ورَحِمَنَا فی القبر والحشر۔

حدیث آخر:۔ "اُوقد علی النار الف سنة الخ"۔

جہنم کی آگ کو ایک ہزار سال دہکایا گیا یہاں تک کہ وہ سُرخ ہوئی پھر اسے ہزار سال دہکایا گیا تا آنکہ وہ سفید ہوئی پھر اس کو ہزار سال دہکایا گیا حتیٰ کہ وہ کالی ہوگئی، چنانچہ (اب) وہ سیاہ تاریک ہے۔

سائنسی تحقیق کے مطابق بھی سیاہ رنگ تمام رنگوں میں سب سے زیادہ گرم ہے مع ہذا اس کا تاریک ہونا مزید ہیبت ناک ہوگا۔ غرض شدت حرارت کے ساتھ اس میں شدید وحشت بھی ہوگی۔ (یہ حدیث موقوف درحکم مرفوع ہے مگر مرفوعاً بھی مروی ہے)

باب ماجاء ان للنار نَفَسین وماذُکِرَ مَن یُخرِجُ من النار الخ"

(دوزخ کے دو سانس کا بیان اور دوزخ سے مؤمن کے نکلنے کا ذکر)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :اشتكت النار الىٰ رَبها و قالت اَكَلَ بعضى بعضاً فَجَعَلَ لها نَفَسين نَفَساً فى الشتاء وَنَفَساً فى الصيف فامانَفَسُهافى الشتاء فزمهرير واما نَفَسُها فى الصيف فَسَمُوم ".(حسن صحيح)

جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی، اس نے کہا کہ میرے بعض نے بعض دیگر کو کھالیا۔ چنانچہ (درخواست کو قبول فرما کر) اللہ نے اس کو دو سانسوں کی اجازت مرحمت فرمائی ایک سانس سردیوں میں اور دوسرا

سانس گرمیوں میں، پس اس کا سردیوں والا سانس تو وہ زمہریر (سخت ٹھنڈا) ہے اور جو گرمیوں والا سانس ہے تو وہ لُو ہے (یعنی شدید گرم ہوا)۔

تشریح:۔قولہ: "اشتکت النار" یہ شکایت بزبان قال بھی ممکن ہے اور بزبان حال بھی مراد ہو سکتی ہے۔

قولہ: "نَفَساً" بالفتحتین سانس کو کہتے ہیں۔

قولہ: "زمھریر" سخت ٹھنڈا۔

قولہ: "سموم" گرم ہوا۔

اس نظام تنفس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس کو ظاہر یعنی معنی حقیقی پر محمول کیا جائے علیٰ ہذا پھر یہاں کچھ اشکالات پیش آئیں گے یہ مسئلہ تشریحات ترمذی: جلد اول: ص: ۴۰۷ پر گذرا ہے۔ (دیکھئے "باب ماجاء فی التعجیل بالظہر" ص: ۴۰۴: ج: ۱)

مزید برآں گیس کے بارے میں سائنسی تحقیق یہ ہے کہ جب اس کے مالیکیولز قریب ومجتمع ہو جاتے ہیں تو ان میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے جبکہ ان کی تفریق سے ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے جس کی آسان مثال فریج کا کمپریسر ہے کہ جب گیس اس کے اندر ہوتی ہے تو گرم رہتی ہے اور جب پائپوں میں پھیل جاتی ہے تو ٹھنڈی ہو جاتی ہے اس لئے فریج کے برف خانہ سے حرارت نکل کر سرد ہو جاتا ہے، تاہم چونکہ عالم غیب اسباب کے ضابطے سے بالاتر ہے اس لئے وہاں یہ ضابطہ لاگو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ محض خوارق کا مظہر ہے اگرچہ اس ضابطے سے سمجھنے میں کافی حد تک مدد مل سکتی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کو معنی مجازی پر محمول کیا جائے کہ دنیا کی گرمی وسردی دوزخ کے سموم وزمہریر کے مشابہ ہیں گویا یہ وہاں سے آتی ہیں۔

بعض حضرات کو زمہریر کو ٹھنڈا ماننے میں تأمل ہے میرے خیال میں یہ تأمل یا انکار ایک غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ آگ کے اندر سرد خانہ گویا نعمت ہے، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم بچپن میں برف میں کھیلتے اور ہاتھ پاؤں سُن ہو جاتے تو آکر آگ کے پاس بیٹھ جاتے حالانکہ بزرگ اس سے منع کرتے، مگر جب ہاتھ پیر گرم ہو جاتے تو ہم درد کی شدت سے تڑپنے لگتے، لہٰذا گرم اور سرد کا اجتماع ہر ایک کی انفرادی تکلیف سے بہت زیادہ ہے۔ اعاذنا اللہ من غضبہ

حدیث آخر:۔"عن انسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الخ".

قتادہ کے دونوں شاگردوں شعبہ اور ہشام کے الفاظ شروع حدیث میں مختلف ہیں، ہشام نے کہا کہ دوزخ سے نکلے گا اور شعبہ کے الفاظ ہیں کہ جہنم سے ہر اس شخص کو نکالو جس نے "لاالـه الّا اللّٰه" کہا ہو اور اس کے دل میں جَو کے برابر خیر (ایمان) ہو (اور) جہنم سے نکالو اس شخص کو جس نے لاالـه الّا اللّٰه" کہا ہو اور اس کے دل میں گندم کے دانے کے برابر خیر (ایمان) ہو، جہنم سے نکالو اس شخص کو بھی جس نے "لاالٰه الّا اللّٰه" پڑھا ہو اور اس کے دل میں ذرہ کے وزن کے مطابق خیر ہو، شعبہ کی روایت میں ذرۃ بغیر تشدید راء کے ہے جس کے معنی مکئی کا دانہ ہیں۔(حسن صحیح)

یہ روایت بخاری ومسلم میں بھی ہے (بخاری: ص:۱۱ ج:۱ "باب زیادۃ الایمان ونقصانہ") اور (مسلم: ج:۱ ص:۱۰۹) کتاب الایمان میں "یخرج" کا صیغہ مجہول بھی آیا ہے پھر شعبہ کی روایت میں "اخرجوا" باب افعال سے امر کے مخاطب وہ اہل ایمان ہیں جن کو جنت کا پروانہ مل چکا ہوگا، وہ پل صراط عبور کرنے کے بعد دوسرے مؤمنین کی سفارش کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی سفارش منظور فرما کر ان سے فرمائیں گے کہ جاؤ نکالو الخ۔

قوله:"بُرَّة" گندم۔

قوله:"ذرّة" بفتح الذال وتشدید الراء المفتوحہ سُرخ چیونٹی کو بھی کہتے ہیں اور کمرے میں روشندان میں آنے والی دھوپ میں جو گرد کے چھوٹے اجزاء نظر آتے ہیں ان کو بھی کہتے ہیں اور ہاتھ زمین پر رکھ کر جھاڑنے سے جو جزء گرتا ہے اس کو بھی، کنایہ ہے قلیل ترین مقدار سے، اس روایت میں شعبہ نے ذرۃ بضم الذال وتخفیف الراء نقل کیا ہے جو مکئی کو کہتے ہیں لیکن امام مسلمؒ یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "قال یزید صحّف فیھا ابو بسطام" ابو بُسطام شعبہ کی کنیت ہے یعنی انہوں نے اس میں تصحیف کی ہے لہٰذا صحیح ذرّۃ بالتشدید ہی ہے کیونکہ روایت کی ترتیب میں زیادت سے کمی کی طرف انتقالات ہوئے ہیں۔

اس روایت سے بظاہر ایمان کی زیادتی وکمی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جَو گندم سے بڑا ہوتا ہے اور ذرہ سب سے چھوٹا ہوتا ہے، یہ مسئلہ ان شاء اللہ کچھ تفصیل کے ساتھ ابواب الایمان میں عنقریب بیان ہوگا، تاہم چونکہ مذکورہ روایت میں خیر سے اور اس روایت کے مطابق جس میں ایمان کی تصریح ہے سے ایمانی کیفیات بھی مراد ہوسکتی ہیں جو ایمان کے آثار میں شمار ہوتی ہیں پس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جس نے لا الٰہ اِلّا اللہ یعنی کلمہ

شہادت پڑھا ہو جس سے وہ مؤمن شمار ہوتا ہے اور اس کے دل میں اس کے آثار بھی پائے جاتے ہوں، چونکہ نکالنے والے اہل ایمان ہوں گے اور ان کو ایمان کے آثار ہی نظر آ سکتے ہیں اس لئے مراد آثار ایمان لینا زیادہ قرین قیاس ہے نیز اس لئے بھی کہ مسلم، ص:۱۰۳ پر اس حدیث کے آخر میں ہے:

"فیقول اللہ تعالیٰ: شفعت الملائکۃ وشفع النبیّون وشفع المؤمنون ولم یبق اِلّا ارحم الراحمین فیقبض قبضۃ من النار فیخرج منہا قوماً لم یعملوا خیراً قط الخ".

ظاہر ہے کہ بغیر ایمان کے تو کوئی بھی جنت میں نہیں جا سکتا معلوم ہوا کہ خیر سے مراد اعمال اور کیفیات قلبیہ یعنی ایمان کے آثار ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے بخاری و مسلم کی شروحات ملاحظہ ہوں۔

حدیث آخر:۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جہنم سے نکالو اس شخص کو جس نے کسی دن مجھے یاد کیا ہو یا کسی موقع پر مجھ سے ڈرا ہو۔ (حسن غریب)

یعنی جو بتقاضائے ایمان اللہ کو یاد کر چکا ہو یا اللہ سے ڈرا ہو، یہ قید لگانا اس لئے ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ خوف اور ذکر تو کفار بھی کرتے ہیں۔

حدیث آخر:۔ "عن عبداللہ بن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انی لَاَعرف اٰخر اھل النار خروجاً رجل یخرج منہا زَحفاً فیقول یارب الخ". (حسن صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ سے نکلنے والے آخری شخص کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ ایسا شخص ہے جو اس سے نکل کر گھٹنوں کے بل چلے گا اور کہے گا اے میرے رب! لوگوں نے سب گھروں کو (اپنے اپنے قبضے میں) لے لیا ہے آپؐ نے فرمایا: اس سے کہا جائے گا کہ تو جنت کی طرف چلو تو سہی اور اس میں داخل تو ہو جا! آپؐ نے فرمایا پھر وہ چلے گا تا کہ اس میں داخل ہو جائے تو پائے گا لوگوں کو کہ انہوں نے سب مکانات لے لیے ہوں گے، چنانچہ وہ واپس لوٹ کر کہے گا اے میرے رب! لوگوں نے تمام جگہوں کو (اپنی تحویل میں) لیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے فرمائیں گے: کیا تجھے وہ زمانہ یاد ہے جس میں تو تھا؟ (یعنی دنیا کی زندگی) وہ کہے گا "ہاں" (یاد ہے) تو اس سے کہا جائے گا کہ اب تو آرزو کر! آپؐ نے فرمایا: پس وہ آرزوئیں (تمنائیں) کرے گا، پس اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے وہ سب ہے جس کی تم نے خواہش کی اور دنیا کا دس گنا (مزید بھی تمہیں دیا جا رہا ہے) آپؐ نے فرمایا وہ کہے گا (از روئے تعجب) کہ تو مجھ سے مذاق

کرتا ہے حالانکہ تو مالک الکل ہے؟ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ بخدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپؐ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں کھل گئیں (یعنی نمودار ہوگئیں اور نظر آئیں)۔

قولہ: "آخر اھل النار" اگلی روایت جو ابوذرؓ سے مروی ہے میں "و آخر اھل الجنة دخولاً" کا اضافہ ہے تو ملا علی قاریؒ مرقات میں فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں تلازم ہے لہٰذا دونوں کو ذکر فرمانا صرف وضاحت کے لئے ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دفع توہم کے لئے ہو کہ اسے درمیان میں معلق نہیں رکھا جائے گا بلکہ دوزخ سے نکالنے کے بعد سیدھا جنت میں لے جایا جائے گا۔

قولہ: "زَحفاً" بچے کا پیٹ اور کہنیوں کے بل سرکنا۔

یہ روایت یہاں مختصر ہے مسلم: ص:۱۰۵ ج:۱ میں یہ روایت تفصیلاً مروی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص دوزخ سے نکلتے وقت گرتا اُٹھتا ہوا مشکل سے نکل جانے کے بعد واپس مُڑ کر دوزخ کو دیکھ کر اللہ کا شکر کرے گا اور کہے گا کہ اللہ نے مجھے وہ نعمت دی جو کسی کو نہیں دی ہے پھر اسے ایک درخت دکھائی دے گا تو وہ اس کے قریب جانے کی درخواست کرے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے وعدہ لے گا کہ پھر کوئی آرزو تو ظاہر نہیں کرو گے وہ وعدہ کرے گا، چنانچہ جب وہاں پہنچے گا تو آرام کرے گا اور پانی پیئے گا تو ایک اور درخت جو پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگا اسے دکھائی دے گا، اس طرح وہاں بھی جانے کی خواہش کرے گا اور وعدہ کرے گا کہ پھر کوئی سوال نہیں کروں گا، غرض وہاں پہنچنے کے بعد تیسرا درخت نظر آئے گا، پھر وہاں پہنچنے کے بعد جنتیوں کی آوازیں سنے گا اس طرح وہ جنت میں داخل ہونے کی درخواست ودُعاء کرے گا الخ۔

قولہ: "اَتَذکر الزمان الذی کنتَ فیه؟" بعض شارحین نے اس سے جہنم کی زندگی مراد لی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ دوزخ میں تو زیادہ سے زیادہ آرزو یہ ہوسکتی ہے کہ بس دوزخ سے باہر پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے تو زہے قسمت اس لئے مراد دنیا ہے پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شخص کوئی بادشاہ ہو جس کی آرزو دنیا میں مملکت کی توسیع تھی اور عام شخص بھی ہوسکتا ہے کہ اسے بادشاہ بننے کا شوق یا تصور گذرا ہو۔ قولہ: "ضحک" بمعنی تبسم کے ہے اور نواجذ سے مراد انیاب یا انیاب کے بعد والے دانت ہیں، کیونکہ آخری داڑھوں کے دیکھنے کے لئے پورا منہ کھولنا پڑتا ہے جو آپؐ کی عادت شریفہ نہ تھی۔

رہا یہ مسئلہ کہ اس شخص نے اللہ کی طرف تمسخر کی نسبت کی جسارت کیسے کی؟ تو اس کے تین جواب ہوسکتے ہیں: (۱) کہ چونکہ اس شخص نے بار بار اللہ سے وعدہ کیا اور پھر اسے توڑا اور ہر وعدہ خلافی پر اللہ نے اس

کا عذر قبول فرمایا علیٰ ھذا اسی درگذر کو بطور مشاکلت سُخریہ کہا۔ (۲) یا استفہام انکاری ہے یعنی مجھے پتہ ہے کہ تو مذاق نہیں کرتا۔ (۳) یا پھر یہ بات بے ساختہ اس کی زبان پر آجائے گی جس کی ایک مثال پیچھے گذری ہے کہ جس شخص کی سواری گم ہوئی ہو اور مایوسی کے بعد اسے مل جائے اور وہ کہے: ''انت عبدی وانا ربک'' آپؐ کی مسکراہٹ سے تیسرے احتمال کی تائید ہوتی ہے۔ (تدبر)

حدیث ابی ذرؓ۔ قولہ: ''یُؤتیٰ برجل فیقول سَلُوا عن صِغار ذنوبه واَخبِئُوا کبارھا''.

یعنی اس آخری جنتی کو دوزخ سے نکالنے کے بعد لایا جائے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ (فرشتوں سے) فرمائیں گے کہ اس سے چھوٹے چھوٹے گناہوں کے بارے میں پوچھو اور بڑے گناہ پوشیدہ رکھو (یعنی ان کے بارے میں مت پوچھو) چنانچہ اس سے کہا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں کام کئے تھے؟ تو نے فلاں فلاں وقت یہ یہ کام کئے ہیں؟ (تو وہ اقرار کرے گا) آپؐ نے فرمایا پس اس سے کہا جائے گا کہ تیرے ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی ہے آپؐ نے فرمایا وہ شخص فوراً کہے گا اے میرے رب! بلاشبہ میں نے بہت سے کام (گناہ) اور بھی کئے ہیں جن کو میں یہاں نہیں دیکھتا ابوذرؓ فرماتے ہیں بخدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ ہنسے یہاں تک کہ آپؐ کے نواجذ (داڑھیں) ظاہر ہوئے۔ (حسن صحیح)

اس کا ایک مطلب تو سابقہ حدیث میں گذرا ہے کہ مراد ضحک سے تبسم ہے لیکن بعض علماء نے اس کو ظاہر پر محمول کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگرچہ آپؐ کی عادت شریفہ تو مسکراہٹ ہی کی تھی تاہم ہوسکتا ہے کہ بعض دفعہ آپؐ نے ضحک بھی فرمایا ہو علیٰ ہذا کہا جائے گا کہ کبھی کبھار ہنسنے میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ کثرت وشدت کی حد تک نہ ہو، جہاں تک قہقہے اور ضحک کی عادت کا تعلق ہے تو ان سے بہر حال بچنا چاہئے۔

قولہ: ''اَخبئوا'' اِخباء سے امر کا صیغہ ہے یعنی چُھپا وَخَباً کے معنی چھپانے کے آتے ہیں۔ قولہ: ''فان لک مکان کل سَیّئة حسنة'' اگر اسے محض فضل باری کہا جائے تو پھر تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ ''ذالک فضل اللہ یؤتیه من یشاء'' لیکن اگر اسے خصوصیت پر محمول نہ کیا جائے تو اس کو سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۷۰ ''اِلّا من تاب واٰمن وعَمِلَ عملاً صالحاً فاُولٰئک یُبدِلُ اللہ سَیّاٰتھم حسناتٍ وکان اللہ غفوراً رحیماً'' کے تناظر میں دیکھنا چاہئے، جس کا ظاہری مطلب اور عام مفسرین کا قول اگرچہ یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد جاہلیت کی ہر بُری خصلت کے عوض اللہ اس کو اچھی عادت عطا فرماتا ہے، شرک کے بدلے توحید، زنا کے عوض عفت اور بُخل کی جگہ سخاوغیرہ وغیرہ مگر دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تبدیلی زمانہ اسلام میں

کئے ہوئے گناہوں کے بارے میں بھی ہے اور عین گناہ کی جگہ قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ اسے نیکیاں عطا فرمائے گا جیسے سنکھیا زہر ہے لیکن بعض دفعہ وہ مقوی وصحت افزا ثابت ہوجاتی ہے البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسا نرم سلوک کتنے لوگوں سے کیا جائے گا؟ تاہم اتنی سی بات ظاہر ہے کہ ندامت کو ملحوظ رکھا جائے گا، یہ قول سعید بن مسیب اور مکحول کا ہے۔ باب کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے جبکہ پہلا قول ابن عباسؓ ودیگر مفسرین کا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ گناہوں کو مٹا کر عمل صالح اور توبہ کی برکت سے اس کی نیکیوں میں اضافہ کردیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

حدیث آخر:۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوزخ میں اہل توحید میں سے کچھ لوگوں کو عذاب دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس میں کوئلہ بن جائیں گے، پھر ان کو رحمت خداوندی ڈھانپ لے گی چنانچہ ان کو نکالا جائے گا اور جنت کے دروازوں کے پاس ڈالا جائے گا، آپؐ نے فرمایا پس جنتی ان پر پانی چھڑک دیں گے، اس طرح وہ اُگیں گے جیسے کہ اُگتا ہے دانہ سیلاب کے لائے ہوئے کوڑے میں، پھر وہ جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ (حسن صحیح)

قولہ: ''حُمماً'' بضم الحاء وفتح المیم حُممۃ کی جمع بمعنی کوئلہ کے ہے۔

قولہ: ''الغُثاء'' بضم الغین اصل میں سیلاب میں بہنے والی چیز کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد دانہ اور بیج ہے۔

قولہ: ''حُمالۃ السیل'' سیل بمعنی سیلاب اور حُمالہ اور حمیل السیل بمعنی محمولہ کے ہیں یعنی سیلاب کے ساتھ بہنے والی اشیاء جیسے لکڑیاں، درخت کے اوراق اور کیچڑ وغیرہ۔

چونکہ سیلابی کچرہ جب کنارے پر لگتا ہے تو اس میں پائے جانے والے دانے بہت ہی جلد اُگتے ہیں اس لئے ان جنتیوں کی سُرعت صحتِ مندی کی حمالۃ السیل سے تشبیہ دی گئی، گویا راکھ اور کوئلہ سے انسان جلدی جلدی پیدا ہوکر جنت کی طرف بھاگیں گے جبکہ اس سے قبل وہ کوئلہ بن چکے تھے، اگر غور کیا جائے تو کوئلہ بنانا بھی اللہ کی مہربانی ہے کیونکہ جو جگہ جل کر متغیر ہوجاتی ہے وہ سُن ہوکر احساس درد وجلن سے تقریباً عاری ہوجاتی ہے،

غرض حدیث باب کے مطابق عُصاۃ مؤمنین کو جہنم میں عذاب دیا جائے گا لیکن ان کی کھالیں تبدیل نہیں کی جائے گی جبکہ کفار کی کھالیں تبدیل ہوتی رہیں گی تاکہ وہ اپنے کئے ہوئے کی سزا مکمل طور پر چکھیں۔

حدیث ابی سعید الخدریؓ:۔ دوزخ سے ہر اس شخص کو نکالا جائے گا جس کے دل میں ایک ذرّہ کا ہم وزن ایمان ہوگا، ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جس کو شک ہو وہ ''ان اللہ لا یظلم مثقال ذرّۃ'' الآیۃ پڑھ لے۔

قولہ: "مثقال" بمعنی وزن کے جبکہ ذرہ کے بارے میں پیچھے تین اقوال گذرے ہیں فلیتذکر۔
علاوہ ازاں ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں لکھا ہے کہ ذرہ دینار کا ایک ہزار چوبیسواں جزء ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے اور کنایہ ہے تقلیل سے انہوں نے دینار کے باقی اجزاء کا ذکر بھی کیا ہے۔ فمن شاء فلیراجع

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا دوزخ میں جانے والوں میں دو شخص بہت زیادہ چلائیں گے تو رب تبارک وتعالیٰ حکم دیں گے کہ ان دونوں کو نکالو! چنانچہ جب ان کو نکالا جائے گا، اللہ ان سے پوچھیں گے تم دونوں کا زور، زور سے چیخنا چلانا کس بناء پر تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نے ایسا اس لئے کیا تاکہ تو ہم پر رحم فرمائے! اللہ فرمائیں گے تمہارے لئے میرا رحم کرنا یہ ہے کہ تم دونوں جاؤ اور خود کو دوزخ میں وہیں ڈالو جہاں تم تھے، چنانچہ وہ دونوں چلیں گے، پس ان میں ایک تو خود کو گرادے گا جس کے لئے اللہ دوزخ (کی اس جگہ) کو ٹھنڈا خوشگوار بنادے گا جبکہ دوسرا کھڑا رہے گا اور خود کو نہیں گرائے گا، پس رب تبارک وتعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ تمہیں کس چیز نے خود کو گرانے سے روکا جیسے تیرے ساتھی نے خود کو گرایا؟ تو وہ جواب دے گا کہ اے میرے رب! مجھے پوری امید تھی کہ تو مجھے اس میں دوبارہ نہیں لوٹائے گا بعد ازاں کہ تو ایک دفعہ مجھے نکال چکا، تو رب تبارک وتعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تم اپنی امید پر رہو چنانچہ وہ دونوں اللہ کے فضل سے مل کر جنت میں داخل ہوجائیں گے۔

اس روایت میں رشدین بن سعد اور انعم افریقی دونوں ضعیف ہیں۔

حدیث آخر:۔ "لَیُخرَجَنَّ قوم من امتی من النار الخ". (حسن صحیح)

آپؐ نے فرمایا یقیناً میری امت کے کچھ لوگ میری سفارش سے جہنم سے نکالے جائیں گے جن کو جہنمی کہا جائے گا (یعنی اہل جنت ان کو جہنمیوں کے نام سے یاد کریں گے)

قولہ: "لیخرجن" مذکورہ بالا ترجمہ مجہول صیغے کا کیا گیا ہے۔

قولہ: "یُسَمَّونَ الجھنمیین" جہنمی کی جمع ہے تاہم مسلم کی روایت میں ہے کہ یہ لوگ اللہ سے دعاء مانگیں گے جس کی وجہ سے ان کا یہ تسمیہ ختم کردیا جائے گا یعنی اس کے بعد جنتی ان کو جہنمی کہنا چھوڑ دیں گے۔

حدیث آخر:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے دوزخ جیسی سنگین چیز نہیں دیکھی دراں حالیکہ اس سے بھاگنے والا سورہا ہو اور جنت جیسی نعمت نہیں دیکھی دراں حالیکہ اس کا چاہنے والا سورہا ہو۔

حاشیہ قوت پر اس حدیث کو مرفوع کے بجائے عامر بن قیس کا مقولہ قرار دیا ہے امام ترمذیؒ نے بھی اس

کی تضعیف کی ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس کی تحسین بھی کی ہے۔

بہرحال مطلب اس کا یہ ہے کہ دوزخ کی ہولنا کی سُن کر ایک آدمی کیسے سوسکتا ہے، جبکہ جنت کی لامتناہی نعمتوں کا سُن کر کسی کو نیند کیسے آتی ہے؟ اس لئے بعض حضرات نے ''مـا رأیـت'' کو فعل تعجب کا صیغہ مانا ہے یعنی ان دونوں کو نظر انداز کرنا تعجب خیز ہے۔

باب ماجاء ان اکثراهل النار النساء

(دوزخ میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے)

''عن ابی رجاء العطاردی قال سمعتُ ابن عباس یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :اِطَّلعتُ فی الجنة فرأیتُ اکثراهلهاالفقراء واطّلعتُ فی النار فرأیت اکثر اهلها النساء''. (حسن صحیح)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے جنت میں جھانکا تو میں نے جنت والوں میں زیادہ تعداد غریبوں کی دیکھی اور میں نے دوزخ میں جھانکا تو میں نے دوزخ والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی دیکھی۔

تشریح:۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جھانکنا لیلۃ الاسراء یا صلوٰۃ خسوف میں ہوسکتا ہے اور ان کے علاوہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ آپؐ کو یہ مناظر کئی مرتبہ دکھائے گئے ہیں۔

جنت میں فقراء کی اکثریت ایک تو اس لئے ہے کہ غریب آدمی عموماً اللہ کے احکامات کو خوشی سے مانتا ہے جبکہ غنی میں عموماً سرکشی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ دوم ویسے بھی دنیا میں غریبوں کی تعداد زیادہ ہے تو اسی تناسب سے جنت میں تعداد زیادہ ہوئی بلحاظ وجہ اول کے۔

جہاں تک عورتوں کی دوزخ میں اکثریت کا تعلق ہے تو ایک تو دنیا کی عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے دوم عورتوں میں ناشکری اور فسق و فجور کا عنصر زیادہ ہوتا ہے دیکھئے جب وہ بازار کی غرض سے گھر سے نکلتی ہیں تو کس طرح زیب و زینت اختیار کرتی ہیں اس کا مقصد مردوں کو اپنی طرف راغب و مائل کرنا ہے، تاہم یہ ارشاد ابتداء احوال آخرت کے بارے میں ہوسکتا ہے مگر جب اللہ کے فضل سے مؤمنات دوزخ سے نکل جائیں گی تو پھر شاید صورت حال مختلف ہو جائے، بہرحال اس روایت میں حورِعین کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ صرف دنیوی لوگوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

باب

"عن النعمان بن بشیر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :قال ان اھو نَ اھل النار عذاباً رجل فی اخمص قدمیہ جَمرتان یغلی منھمادماغہ". (حسن صحیح)

دوزخ والوں میں عذاب کے حوالے سے ہلکاترین وہ شخص ہوگا جس کے دونوں پیروں کے تلووں میں دوچنگاریاں ہوں گی جن سے اس کا دماغ اُبل رہا ہوگا یعنی کھولے گا۔

تشریح:۔قولہ:"اخمص" پاؤں کے تلوے میں جوخالی جگہ ہوتی ہے، بخاری کی روایت کے مطابق یہ شخص خواجہ ابوطالب ہوں گے، یقیناً ان کی اسلام کے لئے بڑی خدمات ہیں اور حضور علیہ السلام سے انتہائی محبت کرتے جس کی برکت سے عذاب میں تخفیف تو ہوگی مگر عدم ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل ہونے کی اہلیت سے محروم رہے۔ واللہ علیم حکیم۔اس کی کچھ حکمتیں مفسرین نے ذکر کی ہیں۔

باب

"اَ لَااُخبِرکم بِاھل الجنۃ؟کل ضعیف مُتَضَعَّف لواقسَمَ علی اللہ لَاَبَرَّہ اَ لَااُخبِرکُم باھل النار کل عُتُلٍّ جَوَّاظٍ متکبر". (حسن صحیح)

کیا تمہیں جنتیوں کے بارے میں (یعنی ان کی علامات) نہ بتلاؤں ہر کمزور، حقیر سمجھا جانے والا ہے اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھائے تو اللہ اس کی قسم پوری کرے اور کیا تمہیں دوزخیوں کے بارے میں نہ بتلاؤں؟ ہر سخت مزاج (یا بدزبان) مالدار بخیل (یا موٹا پیٹو) اور گھمنڈی۔

تشریح:۔یہ روایت مسلم ،ص:۳۸۲ ج:۲ میں بھی آئی ہے امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "متضعف" ماھوالمشھور کے مطابق بفتح العین ہے یعنی جسے لوگ معمولی سمجھتے ہیں اور اس کے ضعف کی وجہ سے اس پر چڑھ آتے ہیں جبکہ ضعیف بمعنی متواضع کے ہے، چونکہ ایسا شخص نرم دل ہوتا ہے اس لئے ایسا شخص جنتی ہوتا ہے۔

قولہ:"عتل" بضم العین والتاء بدمزاج جھگڑالو۔

قولہ:"جوّاظ" بفتح الجیم وتشدید الواو اس کے کئی معانی بیان کئے ہیں مال جمع کرنے اور بخل کرنے والا یعنی جوحقوق نہ دیتا ہو، یا جو موٹا ہو۔"وقیل القصیر البطین" یعنی بڑے پیٹ والا ٹھگنا۔"وقیل

الفاخر ''یعنی فخر کرنے والا۔

قولہ: ''متکبر'' تکبر اور غرور کرنے والا گھمنڈ کرنے والا۔ چونکہ ایسا شخص اللہ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتا اور حقوق اللہ وحقوق العباد کی پرواہ نہیں کرتا اس لئے وہ دوزخ کا مستحق ہے۔ اِلّا ان یشاء اللہ و یصلحہ

☆☆☆

ابواب الایمان

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ایمان باب افعال کا مصدر ہے مجرد باب ''امن'' ہے جس کے معنی بے خوف ہونے اور مطمئن ہونے کے آتے ہیں باب افعال چونکہ متعدی ہوتا ہے اس لئے اس کے معنی ہوں گے بے خوف ومطمئن کرنے کے چنانچہ جس نبی پر ایمان لایا جاتا ہے مؤمن اس کو اپنی طرف سے اطمینان کا یقین دلاتا ہے کہ آپ میری تکذیب سے بے خوف رہئے!

اسی طرح مؤمن خود بھی نبی ورسول کی بات سے مطمئن ہو جاتا ہے اگر چہ اس بات پر دلیل نہ ہو چنانچہ متکلمین یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک مقلد کا ایمان بھی معتبر ہے یعنی ایمانِ تقلیدی۔

ایمان سے متعلق ابحاث کافی طویل ہیں جس کو تفصیل درکار ہو تو وہ بخاری کی شروحات خصوصاً عمدۃ القاری علامہ عینیؒ کی شرح بخاری میں دیکھ لے یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ اس کے چند پہلوؤں کو اجمالاً بیان کرتا ہوں:

(۱)......ایمان لغت میں وہی تصدیق منطقی بمعنی اذعانُ حکم المخبر کے ہے یعنی خبر دینے والے کو سچا ماننا البتہ تصدیق منطقی اور ایمان میں یہ فرق ضرور ہے کہ ایمان نفس تصدیق کا نام نہیں بلکہ اس اذعان کے ساتھ قبول وانقیاد بھی ضروری ہے، بایں طور کہ اس پر تسلیم کا اطلاق صحیح ہو سکے جسے فارسی میں گرویدن کہا جاتا ہے یعنی بغیر استکبار وانکار اور بلاعناد ماننا، غرض تصدیق مع الانقیاد کو ایمان کہتے ہیں جبکہ تصدیق منطقی کے لئے انقیاد شرط نہیں۔ (تدبر)

اصطلاح شریعت میں ایمان کی تعریف عقائد نسفی وشرح عقائد میں یوں کی گئی ہے:

''والایمان ھو التصدیق بماجاء بہ من عنداللہ تعالیٰ ای تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالقلب فی جمیع ماعلم بالضرورۃ مجیئہ بہ مِن عنداللہ

تعالیٰ اجمالاً والاقرار به الخ"۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے جو کچھ لائے ہیں اور وہ اس طرح ثابت ہیں جیسے بدیہی ہوتا ہے تو ان سب کی تصدیق مع الاقرار باللسان اجمالی طور پر کرنا ایمان ہے۔ ہاں جو چیزیں تفصیلاً مروی ہیں یا جن کی تفصیل ملحوظ ہو تو وہاں ایمان تفصیلی لانا بھی لازمی ہے، نیز اقرار سے مانع کی صورت میں اقرار کا سقوط بھی ہوسکتا ہے لیکن عند المطالبہ بدون المانع اقرار بھی لازمی ہے۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ دین کی وہ موٹی موٹی باتیں جو اس طرح مشہور ہوئی ہوں جو اپنی شہرت کی وجہ سے ہر عام وخاص کو معلوم ہوں تو وہ ان کو دین کی حیثیت سے جانتا ہو جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ ان کی تصدیق مع الانقیاد ایمان ہے اور ان کا تصدیق نہ کرنا کفر ہے۔

(۲)......کفر کیا ہے؟ بظاہر تو کفر انکار کو کہنا چاہئے لیکن اگر ہم کفر کا مصداق انکار کو گردانتے ہیں تو وہ شخص جو نہ انکار کرتا ہو اور نہ تصدیق، وہ نہ مؤمن ہوگا اور نہ ہی کافر کہلائے گا اس لئے سب سے اچھی بات یہ ہے کہ کفر تصدیق وانقیاد کے فقدان کا نام ہے خواہ پھر اس کے ساتھ انکار بھی ہو یا بغیر انکار کے ہو۔

بناء بریں کفر کی متعدد صورتیں بن گئیں (۱) کفر انکار (۲) کفر جحود (۳) کفر عناد (۴) کفر نفاق۔

کفر انکار: یہ ہے کہ دل وزبان دونوں سے انکار ہو۔ کفر جحود: یہ ہے کہ دل تو تصدیق کرتا ہو لیکن زبان پر اقرار وتسلیم اور انقیاد نہ ہو جیسے فرعون اور ابوجہل کا کفر، اگر دل سے تصدیق اور زبان سے گاہے گاہے اقرار بھی ہو مگر تسلیم وانقیاد نہ ہو خواہ عدمِ انقیاد عناد کی وجہ سے ہو یا پھر کسی اور بناء پر ہو جیسے خواجہ ابوطالب کا انکار عار کی وجہ سے تھا اسے کفرِ عناد کہا گیا ہے، جبکہ کفر نفاق قسم دوم کی ضد ہے یعنی ظاہری تسلیم وانقیاد اور اقرار ہو لیکن دل میں تصدیق اور انقیادِ باطنی نہ ہو جیسے عبداللہ بن ابی ابن سلول کا کفر۔

نیز بدیہیات وضروریات دین میں تاویل بھی کفر ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز، روزہ اور زکوٰۃ اور حج کا وہ مطلب تبدیل کرتا ہے جو امت میں مسلّم ہے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے چنانچہ قادیانی اس لئے کافر ہیں کہ ایک تو انہوں نے ایک بدیہی مسئلے کا انکار کیا دوم انہوں نے نصوص کے اجماعی مطالب کو محرّف کر دیا۔

(۳)......ایمان بسیط ہے یا مرکب؟ یہ مسئلہ کافی اختلافی ہے۔ ابتداءً اس میں دو قول ہیں: ایک بسیط ہونے کا اور دوم مرکب ہونے کا۔ اور ثانیاً سات اور علی تقدیرٍ آٹھ اقوال ہیں بایں طور کہ چار مذاہب بساطت کی صورت میں بنتے ہیں اور تین یا چار ترکیب کی صورت میں، ان مذاہب کی تفصیل اس طرح ہے کہ کرامیہ، جہمیہ،

مرجئہ اور جمہور محققین کا مذہب ایمان کی بساطت کا ہے پھران میں اختلاف ہے:

(۱)......کرامیہ فقط اقرار کو ایمان کہتے ہیں، اس کا بطلان ظاہر ہے کہ پھر تو منافق بھی مؤمن ہو جاتا ہے، حالانکہ منافقین بتصریح جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

(۲)......جُہمیہ صرف معرفت کو ایمان قرار دیتے ہیں یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ پھر اہل کتاب کو مؤمنین ماننا پڑے گا۔

(۳)......مرجئہ کہتے ہیں کہ نفس تصدیق ایمان ہے بایں طور کہ کوئی گناہ اس کے منافی یا مضر نہیں جیسا کہ کفر میں نیکی مفید نہیں، نصوص سے اس کی نفی بھی بتصریح معلوم ہوتی ہے اور عصاۃ المؤمنین کا جہنم میں جانا بھی ثابت ہے۔

(۴)......جمہور محققین یعنی متکلمین وفقہاء فرماتے ہیں کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے تاہم یہ نفس ایمان کا درجہ ہے، اس سے اقرار یا اعمال کی اہمیت میں کسی طرح کمی کا توہم نہیں ہونا چاہئے وہ سب اپنی جگہ اہم ہیں تاہم ان کی حیثیت فرعیات وثمرات اور لوازمات کی ہے اگر کسی مؤمن میں تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان سارے موجود ہوں تو نور علی نور ہے اور وہ کامل ایمان ہے جس کی بناء پر وہ عذاب خداوندی سے محفوظ رہے گا۔ لیکن اگر کسی میں فقط تصدیق پائی جاتی ہو تو وہ بھی مؤمن ہی کہلائے گا اور اگر اللہ اسے گناہ پر سزا دینا چاہے تو بالآخر اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

ترکیب ایمان میں بھی چار اقوال ہیں یہ مذہب جمہور محدثین، معتزلہ اور خوارج وغیرہ کا ہے۔ کہ ایمان تین عناصر کے مجموعے کا نام ہے، تصدیق قلبی، زبان سے اقرار اور عمل، پھران کے آپس میں اختلاف ہے۔

(۵)......خوارج کے نزدیک کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے آدمی کافر ہو جاتا ہے ان میں بعض غالی لوگ صغیرہ گناہ کو بھی موجب کفر کہتے ہیں۔

(۶)......معتزلہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ اگرچہ ایمان سے تو خارج ہو جاتا ہے لیکن جب تک تصدیق باقی ہو تو وہ کفر میں داخل نہیں ہوتا، اس کو وہ لوگ منزلۃ بین منزلتین سے تعبیر کرتے ہیں، تاہم حکم وانجام کے اعتبار سے ان دونوں مذہبوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کے نزدیک مرتکب کبیرہ اگر توبہ نہ کرے تو ہمیشہ دوزخ میں پڑا رہے گا اس کی معافی کی صورت ممکن نہیں نہ اس کی شفاعت ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کی سزا ختم ہوسکتی ہے لیکن بے شمار نصوص سے اس موقف کی نفی ہوتی ہے۔

(۷)......اصحاب حدیث فرماتے ہیں کہ ایمان مندرجہ بالاتین امور سے مرکب تو ہے لیکن کسی معصیت سے آدمی ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔

(۸)......اگر ایمان کے لئے اقرار کو شرط کے بجائے شطر یعنی جزء مانا جائے تو پھر ایک اور مذہب بھی قابلِ ذکر ہوگا کہ ایمان دو چیزوں سے مرکب ہے (۱) تصدیق (۲) اقرار عقائد نسفی میں اس کو ذکر کیا گیا ہے ''الایمان ھو التصدیق والاقرار'' اس پر علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:

"ھذاالذی ذکرہ من ان الایمان ھو التصدیق والاقرار مذھب بعض العلماء وھو اختیار الامام شمس الائمه وفخر الاسلام".

پھر جولوگ اقرار کو شرط کہتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہے کہ احکام شرعیہ کا اجراء اقرار پر موقوف ہے جہاں تک فی ما بینہ وبین اللہ کا معاملہ ہے تو اس کے لئے فقط تصدیق ہی کافی ہے، فقہ اکبر میں امام صاحبؒ کا مذہب اسی آٹھویں قول میں نقل کیا گیا ہے۔

ان مذاہب کے دلائل مطولات میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں یہاں اتنی سی بات عرض کی جاتی ہے کہ اہل حق کا جو اختلاف نظر آتا ہے وہ دراصل زمانے کے حالات کا تقاضا تھا، کہ جب معتزلہ اور خوارج نے بڑے شدومد کے ساتھ یہ بات کی کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے تو متکلمین نے فرمایا کہ ہرگز نہیں بلکہ ایمان تو تصدیق کا نام ہے عمل کا نام نہیں۔

اس کے برعکس جب محدثین کے زمانے میں اہل بدع نے عمل کی حیثیت یکسر گرادی جیسے مرجیہ یا تصدیق کی ضرورت ختم کردی جیسے کرامیہ اور جہمیہ یا اقرار کی شرط یا شطریت کو نظر انداز کردیا جیسے مرجئہ وجُہمیہ تو اس وقت کے اہل حق نے ان تینوں کی اہمیت پر زور دیا، اور یہ ہر دور کے اہل حق کا طریقہ رہا ہے۔ یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں متقدمین اور متاخرین کے مابین رہا ہے۔ تدبر وتشکر

باب ماجاء اُمِرتُ ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ

(مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں)

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: اُمِرتُ ان اُقاتل الناسَ حتیٰ یقولوا لاالٰہ اِلّا اللہ فاذاقالوھا عَصَمُوا مِنّی دِمائَھم واموالَھم اِلّا بِحقھا وحسابھم علی

اللّٰہ". (حسن صحیح)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ "لا الہ الا اللہ" کہیں پس جب انہوں نے یہ کلمہ پڑھ لیا تو انہوں نے محفوظ کر لیا مجھ سے اپنے جان ومال کو سوائے اس کلمہ کے حق کے، اوران کا حساب اللہ کے پاس ہے۔

تشریح:۔ "فاذاقالوھااوربحقھا" دونوں کی ضمیریں کلمہ کی طرف راجع ہیں اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جب لوگ اسلام کو قبول کر لیں تو پھر ان سے لڑنے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں البتہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اس کلمہ کے جو حقوق ہیں ان میں کوتاہی پر گرفت کی جائے گی جو ظاہری خلاف ورزی ہوگی ان کا مؤاخذہ ہم کریں گے۔ جیسے حدود کا نفاذ، اور جو مخفی ہوگی اس پر عدم اطلاع کی وجہ سے یا عدم ثبوت کی بناء پر ہم سزا نہیں دے سکتے بلکہ وہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اسی طرح اگر اقرار جھوٹا ہوگا تو اس پر سزا دینا بھی اللہ کا کام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اجرائے احکام کے لئے ظاہری اقرار کافی ہے ہاں البتہ اگر اس سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جو ایمان کے منافی ہو جیسے بُت کو سجدہ کرنا یا زنار باندھنا تو وہ اقرار کالعدم شمار ہوگا۔

پھر لا الہ الّا اللہ اِسمِ علَم ہے مراد اس سے پورا کلمہ طیبہ اور اسلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ صحیحین میں "ویؤمنوا بی، وبماجئت به، اور واَنّ محمداً رسول اللّٰہ" کا اضافہ بھی مروی ہے، اور ترمذی کے اگلے باب میں مزید اضافے بھی ہیں۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے مامور ہیں اس لئے جب آپ فرمائیں کہ اُمِرتُ تو مطلب یہی ہوگا کہ مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور جب صحابی فرمائیں کہ اُمِرتُ تو مراد یہ ہوگی کہ مجھے نبی علیہ السلام نے حکم دیا ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ صحابی کے قول "اُمِرتُ" کا مطلب یہ لیا جائے کہ مجھے صحابی نے حکم دیا ہے اس کی وجہ تحفۃ الاحوذی میں یہ بتائی ہے کہ صحابہ کرامؓ مجتہد تھے اور ایک مجتہد دوسرے مجتہد کے حکم سے استدلال نہیں کرتا "لانھم من حیث انھم مجتھدون لایحتجون بامر مجتھد آخر"۔ غیر مقلدین کو اپنے پیشوا کی یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے۔

قرآن میں تین قسم کے لوگوں سے ان کی حیثیت کے مطابق بات کی گئی ہے:

(۱) ایک عوام الناس کا طبقہ ہے اس کے لئے عام فہم انداز، آسان اور سہل زبان میں قصص وامثال کے

ذریعہ نصیحت بیان کی گئی ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ”ولقد یسرنا القرآن للذِکر فھل من مُدّکر“؟۔

(۲) دوم علماء کی جماعت ہے کہ ان کے لئے ان کے شایانِ شان دلائل اور احکام بیان کرنے کا جامع مختصر طرز اختیار کیا گیا ہے تا کہ وہ ان اصول سے استنباطات کرتے رہیں۔

(۳) سوم معاندین کا گروہ ہے یہ لوگ نہ تو نصیحت سُنتے اور قبول کرتے ہیں اور نہ ہی احکام قبول کرنے کی زحمت کرتے ہیں ان کے لئے جہاد کا حکم ہے کہ جب یہ ائمۃ الکفر راستہ سے ہٹ جائیں گے تو وہ دوسروں کی ہدایت کا سدِّ باب نہیں کرسکیں گے، جہاد کے متعلق بحث تشریحات جلد پانچ میں گذری ہے۔

سوال:۔ بظاہر اس حدیث سے جزیہ کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اس میں دو ہی صورتیں بیان کی گئی ہیں کہ یا تو وہ لوگ اسلام قبول کرلیں یا پھر موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔

جواب:۔ اس کے متعدد جوابات ہیں: ایک جواب: یہ ہے کہ اس میں لفظ ناس سے مراد مشرکین ہیں یعنی عرب کے اہل شرک اور ان کا حکم یقیناً وہی ہے جو سوال میں ذکر ہوا، ان سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا۔

دوسرا جواب: یہ ہے جو علامہ طیبیؒ نے دیا ہے کہ یہ حدیث تو عام ہے اور ناس تمام کفار کو شامل ہے خواہ وہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں تاہم اس حدیث میں آیت کی وجہ سے تخصیص کی گئی ہے یعنی ”**حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن یدوھم صاغرون**“۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ قتال سے مراد قہر اور تسلط ہے خواہ وہ غلبہ قتال کی وجہ سے ہو یا صلحہ اور جزیہ کی وصولی کی صورت میں ہو جبکہ کلمہ شہادت پڑھنے سے مراد انقیاد ہے خواہ اسلام قبول کرنے سے ہو یا جزیہ ادا کرنے سے اور بلاشبہ ذمی لوگ بھی اسلامی ریاست کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اگر چہ ان کو اپنے اپنے مذاہب کے مطابق رسومات ادا کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ مگر وہ اپنی رسوائی پر شرمندہ رہنے کی وجہ سے اسلام کے آگے بے بس بھی ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ اسلام کی جانب راغب بھی ہوتے رہتے ہیں اور یہی گویا حکمی قتال ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکرؓ خلیفہ بنا دیئے گئے تو عربوں میں سے جس کو انکار کرنا تھا وہ منکر ہو گیا (چنانچہ ابو بکرؓ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا) پس عمر بن خطابؓ نے ابو بکرؓ سے کہا آپؓ لوگوں (مانعین زکوٰۃ) سے کیسے لڑیں گے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ”لا الٰہ الا اللہ“ کہیں اور جس نے کہہ دیا ”لا الٰہ الا اللہ“ اس نے مجھ سے اپنی مال و جان محفوظ

کر لی سوائے حقِ اسلام کے اور اس کا حساب اللہ کے پاس ہے پس ابوبکرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم ہے! میں ضرور لڑوں گا اس شخص سے جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرتا ہے، بے شک زکوٰۃ مال کا حق ہے اور قسم ہے اللہ کی! کہ اگر یہ لوگ وہ رسّی مجھے نہ دیں جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کے روکنے پر ان سے بہر حال لڑوں گا حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بس کیا تھا خدا کی قسم! میں سمجھ گیا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کا سینہ جنگ کے لئے کھول دیا ہے تو میں سمجھ گیا کہ یہی بات صحیح ہے۔ (حسن صحیح)

قولہ: "کفر من کفر" حضرت گنگوہیؒ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ منحرفین کے تین گروہ تھے: ایک جو بالکلیہ مرتد ہو گئے تھے دوم جنہوں نے صرف زکوٰۃ کا انکار کیا تھا اور سوم جو زکوٰۃ کی فرضیت کے معترف تھے مگر حکومت کو دینے کے منکر ہو گئے تھے، تاہم عام شارحین نے دو جماعتیں بنائی ہیں ایک جو مرتد ہو گئے تھے اور مسیلمہ کذاب کے حامی ہو گئے تھے دوم جو مانعین زکوٰۃ تھے، یاد رہے کہ ان مرتدین یا مانعین میں مہاجرین اور انصار شامل نہ تھے بلکہ یہ دراصل وہ قبائل تھے جو مدینہ منورہ سے دور افتادہ علاقوں میں آباد تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی تعلیمات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے زیادہ فیض یافتہ بھی نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس شبہہ کے درپیش ہونے کی وجہ سے مانعین زکوٰۃ کو صحابہ نے مرتدین نہیں سمجھا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ زکوٰۃ لینے کا حکم تو آپؐ کو تھا "خذ من اموالھم صدقۃ" الآیۃ حضرت عمرؓ کا ابوبکرؓ سے مناظرہ بھی اسی تناظر میں ہوا ہے علی ھذا اس فریق پر اس حدیث میں کفر کا اطلاق تغلیباً یا کفر دون کفر کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ انکا استدلال اگرچہ غلط تھا مگر اس میں ان کو شبہہ لاحق تھا اب چونکہ زکوٰۃ کا وجوب بدیہیات دین میں سے ایک ہے لہٰذا آج منکر زکوٰۃ کو بالاجماع کافر کہا جائے گا امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"قلنا لا فان من انکر فرض الزکوٰۃ فی ھذہ الازمان کان کافراً باجماع المسلمین". (تفصیل کے لئے دیکھئے نووی بر مسلم ص: ۳۸، ۳۹ ج: اقدیمی کتب خانہ)

ابوبکر صدیقؓ کا جواب بظاہر قیاس جدلی کے طرز پر ہے جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو نص کا علم نہ ہوا ہو کہ قتال بند کرنا صرف کلمہ شہادت پڑھنے پر موقوف نہیں بلکہ نماز، روزہ و زکوٰۃ وغیرہ سب احکام کی ادائیگی سے مشروط ہے لیکن چونکہ حضرت عمرؓ تو تارکین و جاحدین صلوٰۃ کے خلاف قتال کے قائل تھے تو ابوبکرؓ نے ان کو بتلا دیا کہ جس طرح نماز کا حکم ہے اسی طرح زکوٰۃ کا بھی ہے اور ان کی توجہ "الا بحقہ" کی طرف مبذول کرا دی کہ اسلامی حقوق کی عدم ادائیگی بھی جنگ کی وجہ بن سکتی ہے۔ اور چونکہ قیاس جدلی تھا اور یہ مناظرہ اظہار

حق کے لئے تھا اس لئے حضرت عمرؓ کی سمجھ میں یہ باریک نکتہ آتے ہی ان کو بھی شرح صدر ہو گیا، عارضۃ الاحوذی میں ہے: "ولوقاتلهم بالاجتهادلکان ذالک له ولکن النص ثابت من طُرُقٍ"۔

غرض حضرت ابوبکرؓ نے نص اور قیاس دونوں طریقے اپنائے جس سے استدلال مزید مستحکم ہوا اب وہ نص کون سی تھی؟ تو الکوکب الدری کے حاشیہ پر امام حاکم کی اکلیل کے حوالے سے عبدالرحمٰن ظفری رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے:

"قال بَعَثَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم الی رجل من اشجع لِتوخذ صَدَقَته فَاَبیٰ ان یعطیهافَرَدَّه الیه الثانیةَ فَاَبیٰ ثم رده الیه الثالثة وقال: اِن اَبیٰ فاضرب عُنُقَه! قال عبدالرحمن اَحَدُ رُواة الحدیث :قلتُ لِحکیم: ما اُریٰ ابوبکرؓ قاتل اهل الردة اِلاعلی هذاالحدیث ؟ قال: اجل!"۔

اسی طرح حدیث ابی هریرة میں بھی "ویقیموا الصلوٰة ویؤتوا الزکوٰة" ثابت ہے۔

لہٰذا جن شارحین نے کہا ہے کہ حضرات شیخین کے پاس نص نہیں تھی بلکہ یہ استدلال قیاس پر مبنی ہے تو اس کی اب چنداں ضرورت نہیں رہی۔

قوله: "عِقالاً" بروزن کتاب وہ رسی مراد ہے جس سے اونٹ باندھا جاتا ہے عِقال کے کئی معنے آتے ہیں لیکن یہاں چونکہ تشدید اور تضییق مقصود ہے اس لئے رسی ہی مراد ہے جو کنایہ ہے معمولی چیز سے یعنی اگر کوئی اتنی مقدار میں زکوٰۃ روکے جس کی قیمت ایک رسی کی برابر ہو تو بھی اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔

تارک صلوٰۃ وصیام اور مانع زکوٰۃ کا حکم جلد سوم کے بالکل شروع میں عرض کیا جاچکا ہے (دیکھئے ابواب الزکوٰۃ: ص:۹ ج:۳) یعنی مانع زکوٰۃ سے زکوٰۃ زبردستی بھی وصول کی جاسکتی ہے اگرچہ اس میں اُس کی جان چلی جائے۔

قوله: "ماهو الاان رأیت الخ" ھو ضمیر شان ہے جس کی تفسیر مابعد نے کی ہے۔

قوله: "فعرفت انه الحق" یہ تقلید نہیں بلکہ اپنے قول سے رجوع ہے کیونکہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید جائز نہیں ہاں موافقت جائز ہے، امام نووی فرماتے ہیں:

"ومعنیٰ قوله :عرفت انه الحق ای بماظهرمن الدلیل واقامه من الحجة فعرفتُ بذالک ان ماذهب الیه انه الحق لاان عمر قلّدابابکرؓ فان المجتهد

لایقلد المجتھد وقدزعمت الرافضة ان عمر انماوافق ابابکرؓ تقلیداً وبنوہ علی مذھبھم الفاسدفی وجوب عصمة الائمة وھذہ جھالة ظاھرة منھم واللہ اعلم". (شرح مسلم:ص:۴۰ج:۱قدیمی کتب خانہ)

باب ماجاء امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لاالٰہ الااللہ الخ

"عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :امرت ان اقاتل الناس الخ".

تشریح:۔اس حدیث کی تشریح سابقہ باب کی پہلی حدیث میں کی جاچکی ہے البتہ یہاں یہ بھی اضافہ ہے"وان محمداً عبدہ ورسولہ وان یستقبلوا قِبلَتَنَاویاکلوا ذبیحَتَنَاوان یصلوا صلا تَنَا،فاذا فعلوا ذالک حُرِّمَت علینادمائھم واموالھم اِلّابحقھا،لھم ما للمسلمین وعلیھم ماعلی المسلمین"۔(حسن صحیح)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں "لاالٰہ الا اللّٰہ" کی اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ وہ ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں، پس جب وہ ایسا کریں گے تو ہمارے اوپر ان کے خون اور ان کے اموال (املاک) حرام کردیئے جائیں گے (یعنی یہ سب چیزیں محترم ہوجائیں گی) سوائے کلمہ کے حقوق کے (یعنی وہ ان پر لازم ہوں گے) ان کے لئے وہی مراعات وحقوق ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان کے ذمہ وہ ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں۔

اس حدیث میں استقبال قبلہ کا ذکر بطور خاص اس لئے کیا گیا ہے کہ چونکہ ہماری نماز اور اہل کتاب کی نماز میں بہت ساری چیزیں مشترک ہیں جبکہ قبلہ مکمل امتیازی شعار ہے کیونکہ اہل کتاب کعبہ کی طرف نماز نہیں پڑھتے ہیں۔

اور ذبیحہ کا ذکر امتیاز عادی کے لئے ہے کہ جب عبادات میں امتیازات کو بیان فرمایا تو آکل وعادات کا تمایز بھی بیان فرمایا گوکہ ذبیحہ عبادات میں سے بھی ہے۔

غرض جب تک کوئی اسلام کے دائرہ میں پوری طرح داخل نہیں ہوگا اس وقت تک وہ مسلمان شمار نہیں ہوگا اور جب کوئی اسلام قبول کرلے تو پھر اس کے جان ومال سے تعرض جائز نہیں جیسا کہ سابقہ باب میں گذرا ہے۔

باب ماجاء بُنِی الاسلام علی خمس

(اسلام پانچ (ارکانوں) پر بنایا گیا ہے)

"عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: بُنِی الاسلام علی خمس شهادة ان لاالٰه الاالله وان محمداً رسول الله واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة وصوم رمضان وحج البیت". (حسن صحیح)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے: (۱) لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دینا (۲) نماز کو فروغ دینا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) رمضان کے روزے رکھنا (۵) اور بیت اللہ کا حج کرنا۔

تشریح:۔ بناء عمارت کھڑی کرنے کو کہتے ہیں تاہم حسی بناوٹ کے ساتھ اس کا اطلاق معنوی ترکیب وہیئت پر بھی ہوتا ہے اور یہاں یہی معنوی تصویر وتشبیہ مراد ہے کہ جیسے اسلام گویا گول خیمے کی طرح محفوظ چھت ہے جس کا عمود یعنی بیچ کا ستون کلمہ شہادت ہے اور چار اطناب یعنی اطراف کے ستون نماز، روزہ اور زکوٰۃ وحج ہیں، عمود کے بغیر تو اس کی چھت نصب ہو ہی نہیں سکتی بلکہ زمین بوس ہو جاتی ہے جبکہ باقی اطناب کے بغیر یہ خیمہ ناقص رہتا ہے جہاں تک باقی اعمال کا تعلق ہے تو یوں سمجھنا چاہئے جیسے کوئی خیمہ یا گھر زیادہ محفوظ ہوتا ہے اور کوئی کم محفوظ، بڑے سوراخ اور دراڑ سے زیادہ خطرہ لاحق رہتا ہے اور چھوٹے سُراخ سے چھوٹے خطرات اور گرمی وسردی کی آمد کا خطرہ درپیش رہتا ہے۔

قوله: "علی خمس" بعض حضرات کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ مبنی اور مبنیٰ علیہ میں اتحاد ہے کیونکہ اسلام تو عین ارکان خمسہ کا نام ہے تو وہ ان پر کیسے مبنی ہوا؟ اس لئے بعض شارحین نے یہ جواب دیا ہے کہ "علیٰ بمعنی مِن" کے ہے لیکن اس کا یہ بھی جواب ہوسکتا ہے کہ اسلام سے یہاں مراد ہیئت ترکیبی ہے جیسا کہ اوپر تشریح میں گذرا ہے اور ہیئت ارکان سے غیر ہوتی ہے اگرچہ یہ غیریت اعتباری ہوتی ہے لیکن تشبیہ کے لئے کافی ہے۔

قولہ: "شهادة الخ" مجرور و مرفوع دونوں پڑھنا جائز ہے اسی طرح باقی معطوفات کا اعراب ہے، جر بنا بر بدلیت خمس سے اور رفع بناء بر خبریت مبتداء مقدر کے لئے یعنی وهی یا احدهما و ثانیها و هٰکذا۔

قولہ: "واقام الصلوٰة" اقامت کے کئی معنے آتے ہیں یہاں معنی فروغ دینا زیادہ مناسب ہے باقی تحقیق ابواب الصلوٰۃ میں گذری ہے۔ (تشریحات: ج:۱ص:۳۸۶) چونکہ ان پانچ ارکان میں فرض کفایہ کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا اس لئے اِن کی تخصیص کی گئی جبکہ باقی ارکانِ اسلام جیسے جنازہ و تکفین اور جہاد و خدمت والدین اور دیگر حقوق واجبہ دوسروں کے ادا کرنے سے اور ان کی کفایت سے ذمہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

باب ماجاء فی وصف جبرئیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم الایمانَ والاسلامَ

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبرئیل علیہ السلام کا ایمان واسلام کا بیان (یعنی سوال) کرنا)

"عن يحيىٰ بن يعمُرقال اول من تكلم فى القدر مَعبَدالجُهَنى قال خرجتُ انا وحُميد بن عبدالرحمن الحِميَرى حتىٰ أتيناالمدينة، فقلنالولَقِينارجلاً من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم فسألناه عماأحدَث هٰولآء القوم فلقينايعنى عبدالله بن عمر، وهوخارج من المسجد قال فاكتنفتُه اناوصاحبى فقلتُ ياأبَاعبدالرحمن !ان قوماً يقرؤن القرآن ويتقفرون العلم ويزعمون "ان لاقدروان الامرأُنُفٌ" قال فاذالقيتَ أُولٰئک فأخبِرهم انى منهم برئٌ وانهم منى بُراءُ، والذى يحلف به عبدالله لوان احدهم أنفَقَ مثل أُحدذهباماقبل ذالک منه حتىٰ يؤمن بالقدرخيره وشره.

قال ثم أنشأيحدث فقال: قال عمربن الخطاب كناعندرسو ل الله صلى الله عليه وسلم فجاء رجل شديدبياض الثياب شديدسوادالشعرلايُرىٰ عليه اثرالسفرولايعرفه منا احد حتىٰ أتَى النبىَّ صلى الله عليه وسلم فألزَقَ رُكبَتَه برُكبَتِهٖ ثم قال يامحمد!ماالايمان؟ قال ان تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخروالقدرخيره وشره.

قال: فماالاسلام؟قال شهادة ان لااله الا الله وان محمداً عبده ورسوله واقام الصلوٰة

وایتاء الزکوٰۃ وحج البیت وصوم رمضان ،قال فماالاحسان؟قال:ان تعبداللہ کانک تراہ، فان لم تکن تراہ فانہ یراک اقال فی کل ذالک صدقتَ قال فتعجبنامنہ یسألہ ویصدقہ، قال فمتیٰ ا لساعۃ؟قال:ماالمسئول عنھاباعلم من السائل اقال فمااَمارَاتُھا؟؟؟قال:ان تلِدالامۃ رَبَّتَھاوان تَریٰ الحُفاۃَ العُراۃَ العَالّۃ رِعاء الشاء یتطاولون فی البنیان!

قال عمرفلقینی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعدذالک بثلاث فقال:یاعمراھل تدری مَنِ السائل؟ذاک جبرئیل اتاکم یعلمکم امر دینکم":(صحیح حسن)

حضرت یحییٰ بن یعمرؒ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کے بارے میں گفتگو کی ہے وہ معبد جُہنی ہے، یحییٰ بن یعمر فرماتے ہیں کہ میں اور حمید بن عبدالرحمٰن دونوں (مدینہ کی طرف) نکلے، یہاں تک کہ ہم مدینہ پہنچے، ہم نے کہا کہ اگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں کسی سے ہماری ملاقات ہوجائے تو ہم اس سے پوچھیں گے اس مسئلہ کے بارے میں جوان لوگوں (منکرین قدر) نے رچایاہے، چنانچہ ہماری ملاقات (حسبِ منشا) اس سے ہوئی یعنی عبداللہ بن عمرؓ سے جبکہ وہ مسجد سے نکلنے والے تھے تو میں نے اور میرے ساتھی دونوں نے ان کو گھیر لیا (یہاں بعض نسخوں میں یہ اضافہ ہے "فظننتُ ان صاحبی سیکِلُ الکلام اِلَیَّ" یعنی میں نے باور کیا کہ میرا ساتھی بات کرنے کا اختیار مجھے دے گا) چنانچہ میں نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن! بے شک کچھ لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم (حدیث وغیرہ) بھی حاصل کرتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ تقدیر کچھ نہیں، بس ہر چیز پہلی مرتبہ ہی وجود میں آتی ہے، ابن عمرؓ نے فرمایا جب آپ کی ان لوگوں سے ملاقات ہوجائے تو ان کو بتاؤ کہ میں ان سے لاتعلق ہوں اور ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، اور قسم ہے اس کی جس کی عبداللہ قسمیں کھاتا رہتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک اُحد جتنا سونا صدقہ کرے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ اس خرچ کے ساتھ تقدیر پر ایمان نہ ہو اور اس کے بھلے بُرے پر۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ پھر ابن عمرؓ حدیث بیان کرنے لگے پس فرمانے لگے کہ عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، اتنے میں اچانک ایک شخص آیا جو انتہائی سفید کپڑوں والا اور نہایت سیاہ بالوں والا تھا، نہ تو اس پر سفر کا اثر دیکھا جاسکتا تھا اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا، یہاں تک کہ وہ (سیدھا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آکر اپنے گھٹنے کو آپؐ کے گھٹنے سے ملا کر بیٹھ گیا، اور پھر پوچھا: اے محمد! ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا (ایمان یہ ہے) کہ تو ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں

پر، اس کے رسولوں پر، آخری دن (قیامت) پر اور تقدیر پر ایمان لائے، اس کے خیر وشر پر (یعنی ان سب کی تصدیق کرنا ایمان ہے)

اس شخص نے پوچھا تو اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا (اسلام ہے)۔

اس نے پھر پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس طرح (توجہ سے) کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو! اور تم اس کو اگر چہ (عبادت میں) دیکھ تو نہیں سکتے ہو لیکن وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے (اس لئے عبادت میں توجہ ضروری ہے)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ سائل ہر جواب پر کہتا آپ نے سچ فرمایا حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ وہ آپؐ سے سوال بھی پوچھتا ہے اور آپؐ کی تصدیق بھی کرتا ہے

سائل نے پوچھا پس قیامت کب ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا جس سے قیامت کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے وہ (اس حوالے سے) سائل سے زیادہ نہیں جانتا!

سائل نے کہا تو اس کی علامات کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا (اس کی نشانیاں یہ ہیں) کہ جنے گی باندی اپنی سیّدہ کو اور یہ کہ دیکھے گا تو ننگے پیر، برہنہ تن محتاج بکریوں کے چَرانے والوں کو جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہوں گے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تین دن بعد مجھ سے ملے تو فرمایا اے عمر! کیا تم جانتے ہو وہ سائل کون تھا؟ وہ جبرئیلؑ تھے جو (دراصل) تمہارے لئے آئے تھے تا کہ تمہیں آپ کا دین سکھلا دیں۔

تشریح:۔ امام ترمذیؒ نے حدیث کے اسی آخری جملے سے ترجمۃ الباب اخذ کیا ہے چونکہ حضرت جبرئیلؑ نے دین کے بارے میں سوالات پوچھے تھے جو آنحضور علیہ السلام کے جوابات کے موجب بنے اس لئے تعلیم کی نسبت حضرت جبرئیلؑ کی جانب کی گئی یعنی بطور تسبیب جیسے ''بَنَی الامیر المدینۃ''۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ترجمۃ الباب حضرت جبرئیلؑ کی تصدیق سے لیا ہو جبکہ امام بخاریؒ نے اس پر یوں باب باندھا ہے ''باب سوال جبرئیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام

الخ"۔

قولہ:"اول من تکلم فی القدر معبد الجهنی" بضم الجیم جُہینہ قبیلہ کی طرف منسوب ہے، یہ شخص بصرہ میں رئیس القدریہ تھا حضرت حسن بصریؒ کے حلقۂ درس میں بیٹھتا تھا مگر واصل کی طرح اس نے اپنا نظریہ تقدیر کے بارے میں گھڑلیا تھا، پھر مدینہ منورہ آیا تھا ۸۰ھ یا اس کے بعد حجاج بن یوسف نے قتل کردیا تھا، ابواب التقدیر میں قدریہ وغیرہ کے بارے میں تفصیل گذری ہے۔

قولہ:"فاکتنفته الخ" کنف پرندے کے پر اور بازو کو کہتے ہیں یعنی میں ابن عمرؓ کے ایک جانب ہوگیا اور میرا ساتھی دوسری جانب۔

قولہ:"یتقفّرون العلم" یہ لفظ متعدد طریقوں سے پڑھا گیا ہے یہاں قاف، فا، پر مقدم ہے جس کے معنی طلب کرنے اور جمع کرنے کے آتے ہیں، دوسری روایت یتفقرن یعنی یاء کے بعد فاء ہے جیسا کہ حاشیہ ترمذی پر ہے ایک میں یتفقّرون یعنی فاء۔تاء اور قاف مؤخرہ کے درمیان ہے اس کے معنی باریکیوں سے بحث کرنا ہے اور یہی مطلب یتقعّرون کا بھی ہے یعنی علم کی گہرائی اور قعر وتہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قولہ:"وان الامر اُنُف" بضم الهمزة والنون یعنی کوئی بھی کام سابقہ تقدیر کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ نومولود ہوتا ہے، بالکل نیا اور تازہ ہوتا ہے۔

قولہ:"انی منهم بریٔ" یہ تمہید ہے اور اظہار نفرت ہے تاکہ سامعین کے ذہنوں میں اس انکار کی شناعت بڑھ جائے، پھر اس کے بعد دلیل سے اپنا مدعیٰ ثابت فرمایا۔

قولہ:"ماقبل ذالک منهم الخ" بظاہر یہ ان کی تکفیر ہے کیونکہ اعمال کی عدم قبولیت اہل السنة والجماعة کے نزدیک کسی گناہ سے نہیں بلکہ عدم ایمان کی وجہ سے ہوتی ہے علیٰ ہذا کہا جائے گا کہ یہ تکفیر ان قدریہ کی ہے جو تقدیر کے یکسر منکر ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عدم قبولیت سے مراد اس پر ثواب کی نفی ہو عدم فراغ الذمہ نہ ہو، قبولیت کے دونوں معنے ترمذی کے سب سے پہلے باب "لاتقبل صلوٰة بغیر طهور" میں گذری ہیں۔حضرت عمرؓ کی حدیث میں چونکہ ایمان بالقدر کی تصریح ہے اس لئے انہوں نے بطور استدلال کے یہ حدیث ذکر فرمائی۔

قولہ:"کنا عند رسول الله صلی الله علیه وسلم" یہ حجة الوداع کے بعد کا واقعہ ہے اور چونکہ صحابہ کرامؓ کو سوالات پوچھنے سے منع کیا گیا تھا اس لئے وہ کسی ہوشیار اعرابی کے آنے کا انتظار کرتے اور اس کے سوال پوچھنے پر خوش ہوجاتے اس لئے حضرت جبرئیلؑ نے اعرابی کی طرح بیٹھنے کا انداز اختیار کرکے پوچھا

''یا محمد'' تا کہ صحابہ پہچان نہ سکیں، کپڑے سفید تھے جو نورانی مخلوق اور اہل علم کے ساتھ زیادہ مناسب ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفید کپڑے پہنے، اس کے احرام اور کفن کو پسند کیا اور افضل قرار دیا ہے۔ اگرچہ بیان جواز کے لئے دوسرے رنگوں کا بھی بنفس نفیس استعمال کیا ہے جیسے فتح مکہ کے دن آپؐ نے سیاہ عمامہ باندھ رکھا تھا اس لئے کہا جائے گا کہ دوسرے رنگ کے کپڑے بھی جائز ہیں سوائے خالص سرخ رنگ کے جو مردوں کے لئے مکروہ ہے مگر افضل بہرحال سفید ہیں خواہ عمامہ ہو یا کوئی اور لباس۔

جہاں تک کالے بالوں کا تعلق ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ طلب کا اصل اور موزون ترین زمانہ جوانی کا دور ہے جس میں حواس ظاہریہ و باطنیہ مضبوط ہوتے ہیں۔

قولہ: "لایریٰ علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد" پہلے جملے سے اس کے مسافر ہونے کی نفی مراد ہے اور دوسرے سے مقامی باشندے ہونے کی۔ کیونکہ مسافر کی حالت اس طرح نہیں ہوتی ہے وہ تو پراگندہ بالوں اور میلے کپڑوں والا تھکا ماندہ نظر آتا ہے نہ کہ تروتازہ جبکہ مقامی شخص کو وہاں کے لوگ پہچانتے ہیں مگر یہاں یہ کیفیت تھی کہ جب وہ شخص آیا تو سب لوگ اس کو ایسے ہی دیکھتے رہے جیسے کسی انجان شخص کو دیکھتے ہیں۔

جہاں تک اس شخص کے بیٹھنے اور سوال کرنے کا انداز ہے تو یہ صحابہ کرام سے اپنی شخصیت چھپانے کے لئے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتے ہوں کیونکہ غیر معمولی کام کرنے والے کی طرف لوگ متوجہ ہو جاتے ہیں، کسی کی مجال تھی جو آپؐ کے پاس اس طرح قریب ہو کر بیٹھے اور آپؐ کو یا محمد! سے مخاطب کرے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یا محمد! کہنا اسم صفتی کے طور پر ہو یا پھر یا محمد! کہنے کی ممانعت انسانوں کے لئے خاص ہو۔

مسلم کی روایت میں ''فالزق رکبتیہ برکبتیہ'' پر یہ بھی اضافہ ہے ''ووضع کفیہ علی فخذیہ'' کہ اپنے گھٹنے آپؐ کے گھٹنوں سے ملا کر بیٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ آپؐ کی یا اپنی رانوں پر رکھ دیئے، یہ بھی ابہام پیدا کرنے کے لئے تھا یعنی حضور علیہ السلام کی رانوں پر رکھنے کی صورت میں۔

قولہ: "ما الایمان؟" چونکہ ایمان نجات کی بنیاد اور ملاک الحسنات ہے اس لئے اس کا سوال مقدم کیا۔

قولہ: "فما الاحسان؟" اگر احسان کے صلہ میں لفظ ''اِلیٰ'' آجائے تو بمعنی نیک سلوک کرنے کے آتا ہے جبکہ بغیر ''الیٰ'' کے بمعنی اخلاص کے آتا ہے جو یہاں مراد ہے کیونکہ لغت میں احسان کے معنی خوب بنانے اور اچھا کرنے کے آتے ہیں اور چونکہ اخلاص سے بھی اعمال و عبادات میں جان پیدا ہوتی ہے اس لئے اخلاص

کو اور شرع کے موافق عبادت کرنے کو احسان کہا جاتا ہے۔

قولہ: "ان تعبداللہ الخ" یعنی عبادت کرتے وقت تیری کیفیت یہ ہونی چاہئے کہ گویا تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے رُوبرو اس طرح کھڑے ہو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو! اگر چہ تم اللہ کو دیکھ تو نہیں سکتے ہو مگر چونکہ وہ تو تمہیں بہر حال دیکھ رہا ہے اس لئے عبادت میں کبھی کوتاہی نہ کرنا چاہئے!

عبادت میں تین چیزیں ہوتی ہیں جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ لغت میں ذلّۃ کو کہا جاتا ہے "**یقال طریق مُعَبّدٌ ای مُذَلّلٌ وفی الشرع عبارۃ عما یجمع کمال المحبۃ والخضوع والخوف**"۔

(ابن کثیر: ص: ۲۵ ج: ا قدیمی کتب خانہ)

بعض شارحین نے یہاں دونوں جملوں سے دو الگ الگ مقامین کا مطلب بیان کیا ہے کہ پہلا درجہ مشاہدہ کا ہے جو سب سے اعلیٰ ہے جبکہ دوسرا مراقبہ کا درجہ ہے یعنی اوّلاً تو یہ کوشش ہونی چاہئے جیسے آدمی اللہ کو دیکھ رہا ہو لیکن اگر وہ یہ درجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتا تو پھر اس یقین کے ساتھ عبادت کرے کہ اللہ تو اسے دیکھ رہا ہے مثلاً کوئی شخص لوگوں سے براہ راست مخاطِب ہو تو وہ زیادہ چوکنا رہتا ہے بنسبت اس کے کہ وہ ٹی وی/TV پر خطاب کرے۔

لیکن حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں اس مطلب کی سختی سے نفی کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہاں ایک ہی مرتبہ کا بیان ہے یعنی مراقبہ اور مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے مراقبہ میں اضافہ ہوگا تو احسان کے حسن میں بھی زیادتی آئے گی، اور جملہ ثانیہ پہلے جملے کی دلیل ہے یعنی عبادت میں غفلت نہیں ہونی چاہئے بلکہ یوں کرنی چاہئے جیسے آدمی اللہ کو دیکھ رہا ہے اگر چہ وہ اللہ کو دیکھ تو نہیں سکتا لیکن اللہ تو اس کو دیکھ رہا ہے "**فکیف تغفل عنه وکیف تصلي وقلبکَ في مکان وجسمکَ في مکان الخ**" اور علامہ سندھی کے حاشیہ مسلم سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ "**فان لم تکن الخ**" میں ان وصلیہ ہے جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"**والمقصود بیان مراعاۃ الخشوع فی العبادۃ والخضوع ومایتعلق بالعبادۃ علی الوجه الذی واعاہ لو کان رائیاً ولاشک انه لو کان رائیاً حال العبادۃ لم یترک شیئاً لِمَاقدرعلیه من الخشوع وغیرہ ولامنشأ لِتلک المراعاۃ حال کونه رائیاً اِلّا کونه تعالیٰ رقیباً عالماً مطلعاً علی حاله وھذاموجودوان**

لم یکن العبد یراہ تعالیٰ، ولذالک قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی تعلیلہ: فان لم تکن تراہ فانہ یراک وھو یکفی فی مراعاۃ الخشوع علی ذالک الوجہ"فَاِن "علی ھذا وصلیۃ الخ". (حاشیہ سندھی بر مسلم:ص:۲۹ج:۱)

اس سے ان جاہل صوفیاء کے زعم کی بھی تردید ہوگئی جو کہتے ہیں کہ"فان لم تکن تراہ "کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اپنی ہستی کو مٹادیا تو تم اس (اللہ) کو دیکھ لوگے گویا"تـراہ"شرط کے لئے جزاء ہے حالانکہ یہ صراحتاً غلط ہے ایک تو یہ عربیت کے اصول کے منافی ہے کیونکہ اگر"تـراہ"جزاء ہو تو پھر حالت جزمی میں الف ساقط ہونا چاہئے تھا۔ دوم یہ حدیث کے مقصد کے خلاف ہے کیونکہ یہاں بات احسان کی ہو رہی ہے نہ کہ رؤیت باری تعالیٰ کی۔ سوم یہ بلاغت کے بھی مخالف ہے کیونکہ سوال میں رؤیت کا کوئی تذکرہ نہیں لہٰذا پھر جواب سوال کے موافق نہیں بنے گا۔ چہارم اس کے بعد"فانہ یراک"کا کوئی مطلب اور ربط نہیں بنے گا۔

قولہ:"فعجبنا منہ الخ" تعجب کی وجہ خود بیان فرمائی کہ تصدیق سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان حقائق کو جانتا ہے جبکہ سوال تو مجہول کے بارے میں ہوتا ہے۔

قولہ:"ماالمسئول عنہاالخ" یعنی قیامت کی آمد کا وقت سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں تو جیسے تم نہیں جانتے ایسا ہی میں بھی نہیں جانتا ہوں۔

قولہ:"ان تلدالامۃ ربتھا" اس جملے کے مطلب میں شارحین بخاری ومسلم اور مشکوٰۃ کے شراح نے بہت کچھ لکھا ہے جیسا کہ باقی حدیث جبرئیل پر بھی تفصیل سے لکھا ہے، لیکن جو مطلب سب سے زیادہ جلی ہے وہ یہ ہے کہ بیٹی ایسی ہوجائے گی جیسے ماں اس کی لونڈی ہو بیٹی بجائے محکوم کے حاکمہ بن جائے گی وہ سارے اختیارات رشتوں وغیرہ کے ماں سے لے لے گی جیسے آج کل مشاہدہ ہے اور جب لڑکی کا یہ حال ہوگا، تو لڑکا تو بطریق اولیٰ نافرمان وآقا بنے گا۔ ابن رجب حنبلیؒ نے شرح الخمسین میں اس حدیث پر لکھا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ قلب الامور ہوجائے گا، حقائق بالکل اُلٹ پلٹ جائیں گے، جیسے آج کل نظر آرہا ہے کہ علماء کو ان پڑھ کہا جاتا ہے اور دو پیسوں کے کمانے والے کو علم والا، تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے اور زمام اقتدار کو نکمے لوگوں کا حق سمجھا جاتا ہے وغیرہ۔

قولہ:"الحفاۃ" بضم الحاء حافی کی جمع ہے بمعنی ننگے پیر والا۔

قولہ:"عُراۃ" جمع عاری کی ہے یہ مطلب نہیں کہ مکمل ننگے لوگ بلکہ جن کے جسم پر پورا لباس نہ ہو۔

قولہ: "العَالَة" عائل کی جمع ہے فقیر محتاج کو کہتے ہیں۔

قولہ: "رِعاء الشاء" بکسر الراء راعی کی جمع ہے بمعنی چرواہے کے۔

قولہ: "یتطاولون" تفاخر بھی مقصود ہوسکتا ہے کہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بھرپور کوشش کریں گے، اور معنی لغوی یعنی لمبی لمبی اور اونچی اونچی تعمیرات بھی مراد ہوسکتی ہے آج دونوں کا مشاہدۂ عام کیا جاسکتا ہے۔

قولہ: "فلقینی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعدذالک بثلاث" شیخین کی حدیث میں ہے کہ جب حضرت جبرئیلؑ اٹھ کر چلے گئے تو نبیؐ نے فرمایا اس آدمی کو واپس میرے پاس بلالو مگر صحابہ کرامؓ کو کچھ دکھائی نہ دیا تو نبیؐ نے اس وقت فرمایا تھا کہ یہ جبرئیلؑ تھے، گویا اب تک نبیؐ کو بھی معلوم نہ ہوا تھا، ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ بھی تلاش کرنے والوں میں نکلے ہوں مگر وہ شخص نہ ملنے کی وجہ سے اپنے گھر چلے گئے ہوں اور چونکہ ان کا گھر عوالی میں تھا اس لئے اگلے دن نہ آئے ہوں۔

باب ماجاء فی اضافة الفرائض الی الایمان

(فرض اعمال کو ایمان میں شامل کرنے کا بیان)

"عن ابن عباس قال قَدِمَ وفدُ عبدالقیس علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا: اِنّا ھذا الحیُّ من ربیعة ولسنا نَصِلُ الیک الافی الشھر الحرام افَمُرنَابشیء ناْخُذه عنک وندعوا الیه مَن وَرَاءَ نا فقال اٰمُرُکم باربع: الایمان باللہ ثم فَسَّرَھا لھم شھادة ان لاالٰه اِلّا اللہ وانی رسول اللہ واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة وان تؤدّوا خُمُسَ ماغَنِمتُم". (حسن صحیح)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ عبدالقیس کا نمائندہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا انہوں نے کہ ہم اس قبیلے والے (بڑے قبیلہ) ربیعہ سے ہیں اور ہم سوائے حرمت والے مہینے کے آپ تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے ہیں (کیونکہ ہمارا راستہ دشمن قبیلہ مضر پر ہے) اس لئے آپ ہمیں ایسی (جامع) بات کا حکم دیں جس پر ہم خود بھی عمل کریں اور ان لوگوں کو بھی اس کی دعوت دیں جو ہمارے پیچھے (انتظار میں) ہیں! پس آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں چار باتوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ پر ایمان لانے کا پھر آپؐ نے ان کے لئے اس کی وضاحت فرمائی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول

ہوں، اور نماز کوفروغ دینا، اور زکوٰۃ ادا کرنا اور یہ کہ تم جو غنیمت حاصل کرتے ہو اس کا پانچواں حصہ ادا کرو۔

تشریح:۔ قولہ: "وفد عبدالقیس" وافد کی جمع ہے نمائندہ جماعت کو کہتے ہیں جو کسی بڑی شخصیت سے ملنے جائے، بعض نے کہا ہے کہ معززین پر مشتمل جماعت کو کہتے ہیں۔ جبکہ عبدالقیس، ربیعہ قبیلہ کی ایک شاخ کا نام ہے جو مُضر قبیلہ کے مقابل ہے، علی ھذا...... انّا ھذا الحی بنابر اختصاص منصوب ہوگا تقدیر اس طرح ہوگی "انّا ھذا الحیّ حیٌّ من ربیعة"۔ ربیعہ اور مضر دونوں قبیلوں کی جڑ نزار بن معد بن عدنان نامی شخص ہے ربیعہ اور مضر اس کے دو بیٹے تھے جن سے یہ دو قبیلے بن گئے، پھر ربیعہ قبیلہ کے ایک شخص عبدالقیس کی اولاد نے بھی ایک قبیلہ کی شکل اختیار کر لی جس کا یہاں ذکر ہے، یہ لوگ بحرین میں اور اس کے آس پاس رہتے تھے مدینہ جانے کے لئے ان کو مضر قبیلہ کے علاقوں سے گذرنا پڑتا تھا مگر آپس کی دشمنیوں کی وجہ سے اشہر الحرم کے علاوہ باقی مہینوں میں وہ ان کو گذرنے نہیں دیتے جبکہ اشہر الحرم میں باقی عربوں کی طرح یہ لوگ بھی جنگ بندی کی وجہ سے ایک دوسرے پر حملے نہیں کرتے تھے، یہاں شہر حرام سے مراد یا تو جنس ہے جو چار مہینے ہیں ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب، یا پھر صرف رجب مراد ہے کیونکہ مضر اس کا خصوصی اہتمام واعظام کرتے تھے۔

قولہ: "نأخذہ وندعوا الیہ" دونوں کو جزم ورفع کے ساتھ پڑھنا جائز ہے جزم اس لئے کہ جواب امر ہیں اور رفع اس لئے کہ جملہ صفت شئ ہے کیونکہ نکرہ کے بعد جملہ صفت ہوتا ہے۔

قولہ: "آمرکم باربع الخ" یہاں روایت میں اختصار ہے جبکہ صحیحین کی روایت میں ہے: "امرھم باربع ونھاھم عن اربع" یعنی ان کو چار قسم کے برتنوں اور مٹکوں کے استعمال سے بھی روکا تھا جن کا ذکر ابواب الاشربہ میں گذرا ہے۔

قولہ: "شھادة ان لا الٰہ الا اللہ الخ" مبتداء مقدر کی خبر ہے ای ھی شھادة ان لا الخ"۔ قولہ: "و اقام الصلوٰة الخ" اگر اقام اور مابعد کے مصادر معطوفہ کو مجرور پڑھا جائے تو ان کا عطف ایمان پر ہوگا اور اگر مرفوع پڑھا جائے تو عطف شہادۃ پر ہوگا اور یہی امام ترمذیؒ کی غرض اور ترجمۃ الباب کے ساتھ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس صورت میں یہ اعمال ایمان کی تفسیر میں شامل ہوں گے۔

چونکہ حدیث کے الفاظ پر بظاہر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ اعمال ایمان میں شامل ہیں تو پھر ماقی تین اشیاء کیا ہیں؟ اور اگر یہ ایمان پر عطف ہیں تو پھر تو اشیاء چار نہیں بلکہ پانچ ہو جائیں گی: (۱) ایمان (۲) نماز (۳) صیام (۴) زکوٰۃ (۵) اداء الخمس۔

غرض پہلا اعتراض مرفوع ہونے اور دوسرا مجرور ہونے پر مبنی ہے اس لئے شارحین نے دونوں ممکنہ صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا ہے۔ کہ پہلی صورت کے اختیار کرنے میں جواب یہ ہے کہ راوی نے باقی اشیاء کو ذکر نہیں کیا ہے اور چونکہ روایت کو مختصر کر کے نقل کرنا جائز ہے بشرطیکہ مطلب تبدیل نہ ہوتا ہو اس لئے کوئی اشکال نہیں۔

دوسری صورت میں جواب یہ ہے کہ اصل اشیاء اربعہ اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وغیرہ ہیں اگرچہ صوم کا ذکر یہاں نہیں مگر صحیح روایت میں وہ بھی مذکور ہے، جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو یہ ان چاروں میں معدود نہیں کیونکہ بلغاء کے یہاں جو چیز پہلے سے معلوم ہو اس کا تذکرہ مقصودی نہیں ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی وفد کو ایمان کا پہلے سے پتہ تھا، یا پھر اداء الخمس کا ذکر جواب پر اضافہ ہے کیونکہ یہ لوگ جنگجو تھے اس لئے ان کو یہ حکم بتا دیا، یا پھر زکوٰۃ و خمس ایک ہی ہیں لہٰذا تعداد چار ہی ہے۔

رہا حج کا عدم تذکرہ تو اگرچہ جمہور کے نزدیک حج ۶ھ میں فرض ہوا ہے اس آیت سے "واتموا الحج والعمرۃ للّٰہ" اور یہ وفد ۸ھ میں آیا تھا لیکن ابن حجر وابن کثیرؒ وغیرہما کی تحقیق یہ ہے کہ اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کی فرضیت اس آیت سے ہوئی ہے "وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً"۔ (آل عمران: آیت: ۹۷) فلا اشکال۔

جہاں تک ایمان کی کمی وزیادتی کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ دراصل اس کی ترکیب وعدم ترکیب پر مبنی ہے جو حضرات ترکیب کے قائل ہیں تو وہ اس کی کمی بیشی کے قائل ہیں جبکہ ایمان کو بسیط ماننے والے اس کی کمی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

چونکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اہل حق کے درمیان یہ اختلاف دراصل حالات کے تقاضوں پر مبنی ہے اس لئے کہا جائے گا کہ ان کے آپس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے لہٰذا اس کو زیادہ ہوا دینے کی ضرورت نہیں اور جن نصوص سے اس کی زیادتی معلوم ہوتی ہے تو اس سے مراد قوت، انشراح، ثمرات وغیرہ ہیں تفصیل شرح عقائد میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ترمذی کا اگلا باب بھی اسی مسئلہ کے لئے ہے۔

قولہ: "وقال قتیبۃ وکنا نرضیٰ ان نرجع الخ" اس سے مراد عباد کی تحسین وتوثیق ہے کہ ہمیں ان سے روزانہ کم از کم دو حدیثوں کے سننے پر بڑی خوشی محسوس ہوتی۔

باب استکمال الایمان وزیادته ونُقصانه

(ایمان کو کامل بنانے اوراس کے زیادہ اور کم ہونے کا بیان)

"عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :إنّ من اكمل المؤمنين ايماناً احسنهم خُلُقاً واَلطَفُهُم باهله". (حديث حسن)

اہل ایمان میں کامل تر ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق ان میں سے زیادہ اچھے ہوں اور جوان کی بنسبت اپنے گھر والوں سے زیادہ نرمی کا برتاؤ کرتا ہو۔

تشریح:۔قوله: "رضيع لعائشة" رضیع یہاں پر رضاعی بھائی کے معنی میں ہے نہ کہ بمعنی مشہور۔ مطلب یہ ہے کہ روایت میں انقطاع نہیں ہے بلکہ متصل ہے۔

اس حدیث سے حسن اخلاق اور نرم برتاؤ کا اعلیٰ مقام معلوم ہوتا ہے خصوصاً جب اپنے گھر والوں کے ساتھ ہو، کیونکہ بعض لوگ نیک نامی اور داد حاصل کرنے کے لئے اَجانب کے ساتھ تو حسن سلوک کرتے ہیں جبکہ بعض اپنی ملازمتوں اور غربت کی مجبوری کے پیش نظر گھر کے باہر چاپلوسی کے عادی ہوجاتے ہیں مگر وہ اپنے گھر میں شیر کی طرح دھاڑتے رہتے ہیں۔اس حدیث میں ان کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرادی گئی ہے کہ اپنی سلطنت اور غلبہ کی جگہ میں اپنے زیردست لوگوں اور کمزور ومحتاج انسانوں کے ساتھ نرم رویہ ہی آدمی کے اصل اخلاق کی عکاسی کرتا ہے لہٰذا اپنے نوکروں اور ملازمین سے سختی اور اپنے سے زیادہ طاقت ور کے آگے دست بستہ کھڑا ہونا اچھے اخلاق نہیں بلکہ مکاری ہے جو ایمان سے غیر چیز ہے، مزید وضاحت اگلی حدیث میں ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس باب کی مندرجہ بالا اور مندرجہ ذیل دو مزید احادیث سے ایمان کی کمی وبیشی کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔

مگر پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ اہل حق میں یہ اختلاف گویا وقت کے الگ الگ تقاضوں کی بناء پر تھا اور یہی وجہ تھی کہ امام مالکؒ نے ایمان کی کمی کے قول سے اجتناب کیا تاکہ خوارج کے زعم کو تقویت نہ ملے گو کہ اس قول کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایمان کی زیادتی کے بارے میں نصوص ہیں جبکہ کمی کے حوالے سے کوئی حدیث یا آیت نہیں ہے، تاہم جمہور محدثین نے جب یہ دیکھا کہ زیادت وکمی دو مقابل چیزیں ہیں لہٰذا اگر کوئی محل ایک ضد کو قبول کرتا ہے تو وہ دوسری سے بھی موصوف ہوسکتا ہے علیٰ ہذا اگر ایمان زیادت سے موصوف ہوسکتا ہے جیسا

کہ مندرجہ بالا حدیث اور دیگر نصوص میں اس کی تصریح ہے تو وہ کمی کو بھی قبول کرے گا۔

متکلمین کہتے ہیں کہ زیادتی سے مراد قوت وپختگی یا تفصیل بعد الاجمال وغیرہ ہے کیونکہ جو صحابہ کرامؓ اسلام کے پہلے دور میں جبکہ وحی کا نزول جاری تھا، انتقال فرما چکے ہیں وہ بھی یقیناً کامل ایمان والے تھے ان کا ایمان کسی طرح ناقص نہیں تھا، اسی طرح آج بھی جو آدمی بالغ ہونے کے بعد فرضیت حج وزکوٰۃ سے پہلے بغیر حج واداۓ زکوٰۃ کے مرجاۓ اسے بھی ناقص الایمان نہیں کہا جاسکتا، جس کا صاف مطلب یہی بنتا ہے کہ اعمال ثمرات ایمان اور فروع ایمان ہیں اجزاء نہیں ہیں ورنہ تو انتفاۓ جزء سے انتفاۓ کل لازم آتا اور ایسا شخص ناقص الایمان کہلاتا، غرض ایمان تصدیق کا نام ہے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تصدیق میں مراتب ہیں اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اگرچہ ایمان تقلیدی بھی نجات اخروی کے لئے کافی ہے لیکن یقین کا درجہ یقیناً اس سے اعلیٰ ہے اسی طرح یقین میں بھی تین درجات ہیں، نفس یقین، عین الیقین اور حق الیقین جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا "بلی ولکن لیطمئنّ قلبی"۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا اور ان کو نصیحت کی، پھر فرمایا: اے گروہ عورتوں کے! صدقہ دیا کرو! کیونکہ دوزخیوں میں تمہاری تعداد زیادہ ہے، پس ان میں سے ایک خاتون نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ایسا کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے بہت زیادہ لعن وطعن کرنے سے یعنی شوہروں کی ناشکری کرنے سے! آپؐ نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کسی ناتمام عقل اور ناقص دین والے کو جو تم سے زیادہ غالب رہتا ہو پختہ عقل والوں اور ذی راۓ لوگوں پر! ان میں سے ایک عورت نے دریافت کیا کہ عورتوں کی عقل اور دین کی کمی کی نشانی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تم میں سے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے (یہ نقصِ عقل کی نشانی ہے) اور تمہارے دین کا نقصان حیض کا آنا ہے چنانچہ تم میں سے ایک عورت (ہر ماہ کم از کم) تین چار دن رُک جاتی ہے، نماز نہیں پڑھتی۔ (حسن صحیح)

تشریح:۔ **قولہ:** "خَطَبَ النّاسَ" یعنی عیدگاہ میں۔ **قولہ:** "وِلِمَ ذاک یارسول اللہ!" لفظ "لِمَ" اصل میں لِمَا تھا مگر تخفیفاً الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ **قولہ:** "لِکثرۃ لعنکن" یعنی بددعاء یعنی رحمت سے دوری کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** "وکفر کن العشیر" عشیر بروزن غریب اگرچہ مطلق مصاحب کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد شوہر ہے کیونکہ وہ بھی ساتھ رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لعنت کرنا اور ناشکری کرنا کبائر گناہوں میں

سے ہیں۔قولہ:"لذوی الالباب"لُب کی جمع ہے خالص عقل کو کہتے ہیں جس میں شکوک اور خواہشات کی آمیزش نہ ہو اور مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جب مضبوط رائے رکھنے والے ہوشیار شخص پر غالب رہتی ہو تو عام لوگوں پر غالب آنا تو معمولی بات ہے، چنانچہ حقیقت یہی ہے جیسا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ بڑے بڑے عُقلاء کو سوائے انبیاء کے عورت ایک چٹکی اور ایک ہی ہنسی سے بے وقوف بنا لیتی ہے الا ماشاء اللہ وقلیل ماھم، کون ہوسکتا ہے جو یوسفؑ کی طرح بھاگ جائے؟

قولہ:"مِنکن" اغلب کے ساتھ متعلق ہے۔قولہ:"ومانقصان عقلها؟الخ"یعنی عورت کے عقل ودین کے ناقص ہونے کی نشانی کیا ہے؟لہٰذا لفظِ مَا استفسار لمیت کے لئے نہیں بلکہ نشانی دریافت کرنے کے لئے ہے کیونکہ جب آپؐ نے ان کے نقصانِ عقل ودین کی خبر دے دی تو ان صحابیات کو یقین تو آ ہی گیا لیکن ان کے سامنے مرد اور عورت کے عقل ودین کے درمیان تفاوت کی واضح نشانی نہیں تھی۔جس پر آپؐ نے فرمایا کہ ان کا نسیان نقص عقل اور ایام حیض میں ترکِ صوم وصلوٰۃ نقصان دین کی علامت ہے، جہاں تک عورتوں کے نقصانِ عقل کا تعلق ہے تو اگرچہ عام عورتیں اس حقیقت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتیں جو ان کے نقصان عقل کی ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ ہر بے وقوف آدمی اپنے آپ کو دانا وعقلمند گردانتا ہے، مگر ان کا کثرت سے بولنا، ہر بات پر لڑنا، چھوٹی چھوٹی باتوں کو اُچھالنا، مکروفریب کرنا، نقالی کرنا، تیزی سے نشوونما پانا، جلد موٹاپا اختیار کرنا، دردِ زہ کے وقت موت کے قریب پہنچنے کے باوجود اس کے اسباب دوبارہ اختیار کرنا اور سابقہ تکلیف کو بھول جانا، اور بازار اور نامحرم مردوں میں زیب وزینت کے ساتھ یوں چلنا کہ ذھن میں یہ احساس ہر وقت موجزن ہو کہ گویا سارے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں اور زیادہ تر فکر آخرت سے بے نیاز ہوکر گناہوں کی داعیہ ہونا وغیرہ وغیرہ نقصان عقل کی علامات ہیں چنانچہ کوئی عورت منطق نہیں پڑھتی۔اگرچہ اس میں بھی باری تعالیٰ کی حکمت ہے کیونکہ "لو لا الحمقیٰ لَخَرِبَتِ الدنیا "اگر احمق لوگ نہ ہوتے تو دنیا کا نظام نہیں چل سکتا، کیونکہ دنیا کی بقاء جس طرح اللہ والوں کے وجود پر موقوف ہے اسی طرح دنیا کا چلنا بے وقوفوں کی کثرت سے موجودگی پر بھی مبنی ہے، عورت میک اپ کر کے سارا سارا دن دوسروں کو خوش کرنے کے لئے اپنی نماز سے اس لئے بے اعتنائی کرتی ہے کہ وضوء کرنے سے میک اپ خراب ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معذور آدمی کو اگرچہ عذر کی بناء پر ایک عمل ترک کرنے کی رخصت دی جاتی ہے مگر اس کے باوجود وہ عمل کرنے والوں کا جتنا ثواب حاصل نہیں کرسکتا، اور چونکہ اس حدیث میں

نقصانِ دین سے ثواب کی کمی مراد ہے لہٰذا اس سے امام ترمذیؒ کا استدلال زیادت ایمان پر صحیح نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صدقہ دینے سے اللہ کے غضب وعذاب سے بچنے کا قوی امکان پیدا ہوتا ہے۔

پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ اہل دوزخ میں عورتوں کی زیادتی دخول اولیٰ کے اعتبار سے ہے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اس میں رہیں کیونکہ اہل ایمان کا جنت میں جانا طے شدہ ہے، نیز اس حدیث میں حاضرات کو غائبات پر تغلیب دی گئی ہے یعنی یہ حکم صحابیات کے لئے نہیں بلکہ مجموعی عورتوں کے لئے ہے۔

بہرحال اس ارشاد پاک میں عورتوں کو ایک مفید مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر وہ صدقہ دیا کریں گی تو وہ عذاب سے نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ صحابیات نے اس پر بھرپور عمل کیا۔ باقی امت میں آنے والی عورتوں کے لئے بھی یہی مفید ترکیب ہے۔

جہاں تک عورتوں کی ناشکری کا تعلق ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ عورت شوہر کے احسانات کی صریح نفی کرے جیسا کہ اس حدیث کے دوسرے طریق میں ہے: "تقول احداکنّ اذا غضبت علی زوجھا: مارأیتُ منک خیراً قطّ" یعنی غصہ کے وقت بول اٹھتی ہے کہ میں نے کبھی بھی تیری طرف سے نیک برتاؤ کو نہیں دیکھا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر کے احسانات پر شکریہ ادا نہ کرے۔ یہ بھی ایک طرح کی ناشکری اور کفران ہے کیونکہ وہ شکر چھپاتی ہے۔ قولہ: "یعنی وکفرکن العشیر" میں "یعنی" کا لفظ راوی کا مدرج واضافہ ہے کہ راوی کو اپنے استاذ کے الفاظ یاد نہ تھے تو اس کے مفہوم کو یعنی کہہ کر ادا کر دیا۔ ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں اس طرح ہے: "تکثرن اللعن وتکفرن العشیر"۔

حدیث آخر:۔ ایمان کے کچھ اوپر ستر / ۷۰ باب ہیں پس ان میں سب سے معمولی راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے اور سب سے اونچا "لا الٰہ الّا اللہ" کہنا ہے۔ (حسن صحیح)

قولہ: "بِضع" بکسر الباء کا لفظ تین سے نو تک عدد کے لئے استعمال ہوتا ہے، بعض روایات میں بضع وستون بھی آیا ہے لیکن ان میں تعارض نہیں کیونکہ مراد تکثیر ہے یا بعض روایات میں کچھ انواع بعض دیگر میں شامل کی گئی ہیں۔

ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ: ایمان امن سے ہے یعنی خود اپنے لئے امن حاصل کرنا اور دوسروں کو امن دینا اور اس کے اسباب زیادہ ہیں لہٰذا ان سب اسباب پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے پھر جو چیز امن کے منافی ہے اس کے ترک کو بھی ایمان کہا کیونکہ اس کے ارتکاب سے امن ختم ہو جاتا ہے جیسے

زنا اور چوری وغیرہا۔

پھران شعبوں کو بعض علماء نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے مگران کے آپس میں تفاوت پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعیین تفصیلاً مروی نہیں ہے لہٰذا ان پر اجمالاً ایمان بھی کافی ہے۔

ابن حبانؒ نے ان کی تعداد ستتر ۷۷ لکھی ہے جو یہ ہیں: (۱) ایمان باللہ (۲) وبصفاتہ (۳) وحدوث ماسواہ (۴) وملائکتہ (۵) وکتبہ (۶) ورسلہ (۷) والقدر خیرہ وشرہ (۸) والیوم الآخر (۹) ومحبۃ اللہ (۱۰) والحبّ فی اللہ (۱۱) والبغض فی اللہ (۱۲) ومحبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۳) واعتقاد تعظیمہ صلی اللہ علیہ وسلم ودخل فیہ الصلوٰۃ علیہ واتباع سُنتہ (۱۴) الاخلاص ویدخل فیہ ترک الریاء وترک النفاق (۱۵) والتوبۃ (۱۶) والخوف من اللہ (۱۷) والرجاء الی اللہ (۱۸) والشکر علیٰ نعماۂ (۱۹) والصبر علی البلاء (۲۰) والرضاء بالقضاء (۲۱) والحیاء من اللہ (۲۲) والتوکل علی اللہ (۲۳) والرحمۃ علی الخلق (۲۴) والتواضع ویدخل فیہ تعظیم الکبیر والرحمۃ علی الصغیر وترک الکبر والعُجب (۲۵) والوفاء بالوعد (۲۶) ترک الحسد (۲۷) ترک الحقد (۲۸) ترک الغضب (۲۹) النطق بالتوحید (۳۰) تلاوۃ القرآن (۳۱) تعلّم العلوم الشرعیۃ (۳۲) وتعلیمھا (۳۳) الدعاء (۳۴) ذکر اللہ (۳۵) التطھر (۳۶) ستر العورۃ (۳۷) صلوٰۃ الفرائض (۳۸) صلوٰۃ السنن والنوافل (۳۹) الزکوٰۃ بجمیع انواعھا (۴۰) صدقۃ التطوع (۴۱) فکّ الرقاب (۴۲) الجود ویدخل فیہ الإطعام (۴۳) صیام الفرض (۴۴) صیام النوافل (۴۵) الاعتکاف (۴۶) تحری لیلۃ القدر (۴۷) الحج (۴۸) العمرۃ (۴۹) الطواف (۵۰) الفرار بالدین من الفتن (۵۱) الوفاء بالنذر (۵۲) محافظۃ الایمان (۵۳) اداء الکفارات کلھا (۵۴) التعفف من الزنا واللواطۃ بالنکاح (۵۵) القیام بحقوق العیال (۵۶) برّ الوالدین ویدخل فیہ برالاساتذۃ وکل ذی حق (۵۷) تربیۃ الاولاد (۵۸) صلۃ الرحم (۵۹) طاعۃ السید (۶۰) الرحمۃ علی العبد (۶۱) العدل فی الامارۃ (۶۲) مصاحبۃ الجماعۃ (۶۳) طاعۃ اولی الامر (۶۴) الاصلاح بین الناس (۶۵) قتل الخوارج ویدخل فیہ قتل البغاۃ (۶۶) الاعانۃ علی الخیر ویدخل فیہ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر (۶۷) اقامۃ الحدود (۶۸) الجہاد ویدخل فیہ اداء الخُمس (۶۹) انفاق المال فی حقہ وترک التبذیر والاسراف داخل فیہ (۷۰) ردّ السّلام (۷۱) جواب العاطس (۷۲) کفّ الاذیٰ عن الناس (۷۳) اجتناب اللھو (۷۴) ایفاء الدّین (۷۵) الاحسان مع الجار (۷۶) حسن المعاملۃ مع الناس (۷۷) وکف الاذیٰ عن الطریق۔ (بشکریہ مولانا عبیداللہ قندھاری برحاشیہ شرح عقائد)

باب ماجاء الحیاء من الایمان

(حیاء کا ایمان میں سے ہونے کا بیان)

"عن سالم عن ابیه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم مَرَّ برجل وهو یعظ اخاه فی الحیاء فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم :الحیاء من الایمان ".(حسن صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گذرے دراں حالیکہ وہ شخص اپنے بھائی کو (ترکِ) حیاء کے بارے میں نصیحت کرر ہا تھا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیاء تو ایمان میں شامل ہے۔

تشریح:۔امام ترمذیؒ نے اپنی پوری کتاب میں کہیں بھی فقہی مسئلہ میں اپنے استاذ امام بخاریؒ کا قول بطور استدلال یا تحریر مذاھب میں نقل نہیں کیا ہے اگر چہ رجال کے بارے میں زیادہ تر ان پر تکیہ کرتے ہیں یا پھر امام دارمیؒ پر جیسا کہ مقدمہ میں گذرا ہے، تاہم ابواب الایمان میں بطرزِ امام بخاریؒ مصنفؒ نے کئی ابواب ترکیب ایمان کے سلسلہ میں ذکر کئے ہیں، علیٰ ہذا ترجمۃ الباب میں لفظِ ''من'' تبعیض کے لئے ہے اور چونکہ بعینہ یہی الفاظ حدیث پاک کے بھی ہیں لہٰذا کہا جائے گا کہ امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث میں ''من'' کو تبعیضی سمجھا ہے حالانکہ اس میں ابتدائیہ ہونے کا بھی احتمال ہے یعنی ایمان ہی کی بدولت حیاء پیدا ہوتی ہے اور اگر من بمعنی تبعیض ہو تو پھر جزئیتِ حیا نفس ایمان سے نہیں بلکہ کامل ایمان کے اعتبار سے ہے۔

پیچھے عارضۃ الاحوذی کا حوالہ گذرا ہے کہ ایمان امن سے ہے لہٰذا امن کے اسباب کو بھی ایمان کہا گیا ہے۔

"لما کان الایمان الامان حقیقة ،وکانت له اسباب وفوائدسُمِّیت کلها باسمها کقوله "الحیاء من الایمان"فهذه تسمیة سببه بهاالخ".

بہر حال یہ شخص اپنے بھائی کو حیاء کے بارے میں سخت وسُست کہہ رہا تھا تو آپؐ نے منع فرمادیا کہ مثلاً اگر حیاء کی وجہ سے اس کا کچھ حق تلف ہو جائے تو اس کے بدلے اسے اُخروی اجر وثواب ملے گا لہٰذا حیاء سے بچنا نہیں چاہئے بلکہ باحیاء رہنا چاہئے ہاں البتہ جہاں کوئی حق بات کہنی ہو تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہئے جو اس کے بیان سے شرماتا ہے تو وہ حیائے محمود نہیں بلکہ وہ خذلان ہے، حیاء کے متعلق پیچھے باب گذرا ہے۔

باب ماجاء فی حرمة الصلوٰة

(نماز کے تقدس کا بیان)

"عن معاذبن جبل قال کنتُ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفرفاصبحتُ یوماً قریباً منہ ونحن نسیر، فقلت یارسول اللہ اَخبِرنی بعمل یُدخِلُنِی الجنة ویُبَاعِدُنی عن النار! قال: لقدسألتنی عن عظیم وانہ یسیرعلیٰ من یَسّرَہ اللہ علیہ، تعبُدُاللہ ولاتشرک بہ شیئاً وتُقیم الصلوٰة وتؤتی الزکوٰة وتصومُ رمضان وتَحُجُّ البیت ثم قال: اَلااَدُلُّک علی ابواب الخیر؟ الصومُ جُنَّة والصدقة تُطفِئُ الخطیئة کمایُطفِئُ الماءُ النار وصلوٰة الرجل من جوف اللیل، قال ثم تلا " تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم... حتیٰ بَلَغَ ... یعملون" ثم قال: اَلااُخبِرُکَ براس الامر کلّہ وعمودہ وذِروَةِ سَنامہ؟ قلت بلی یارسول اللہ! قال راسُ الامر الاسلام وعمودُہ الصلوٰة وذِروَةُ سَنامہ الجھادثم قال اَلااخبرک بِمِلاک ذالک کلہ؟ قلت بلیٰ یارسول اللہ! قال فَاَخَذَ بلسانہ، قال کُفَّ علیکَ ھذا! قلتُ یانبی اللہ وَاِنَّا لَمُواخذون بما نتکلم بہ؟ قال ثَکِلتک اُمُّک یامعاذ! وھَل یَکُبُّ الناسَ فی النار علی وجوھھم اوعلیٰ مناخرھم الا حَصائِدُالسِنَتِھِم". (حسن صحیح)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سفر (تبوک) میں، میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو ایک دن میں ان کے قریب رہا جبکہ ہم چل رہے تھے پس میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرے اور دوزخ سے مجھے دور کردے!

آپؐ نے فرمایا بلاشبہ تم نے مجھ سے ایک بڑی بات پوچھی ہے، تاہم وہ اس شخص کے لئے آسان ہے جس کے لئے اللہ آسان کردے، تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، نماز کو فروغ دو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو!

پھر آپؐ نے فرمایا کیا میں تجھ کو اچھائی کے دروازوں کی خبر نہ دوں؟ روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہوں کو بجھاتا ہے جیسا کہ پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ اور آدمی کا رات کے درمیانی حصہ میں نماز پڑھنا (خیر کے ابواب ہیں) حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت "تتجافیٰ جنوبھم" کی تلاوت کی

یہاں تک کہ "یعملون" تک پڑھا (ترجمہ: الگ رہتی ہیں ان کی کروٹیں اپنی خوابگاہوں سے اور وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں ڈر سے اور امید سے)۔

پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا میں تجھے پورے امر (دین) کی اصل اور اس کے ستون اور اس کی کوہان کی بلندی کی خبر نہ دوں؟ میں نے کہا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا کہ امر کا سَر (اصل) اسلام (کلمہ شہادت) ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کی کوہان کی بلندی جہاد ہے، پھر آپؐ نے فرمایا کیا میں تجھے ان سب کی جڑ نہ بتاؤں؟ میں نے کہا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا اسے اپنے خلاف استعمال سے روک لو! پس میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! ہم پکڑے جائیں گے ان باتوں کی وجہ سے جو ہم بولتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں تجھے گم کرے، اے معاذؓ! کیا کوئی چیز لوگوں کو اوندھے منہ یا فرمایا نتھنوں کے بل دوزخ میں گراتی ہے زبان کی کاٹی ہوئی کھیتی کے سوا؟ (یعنی زبان ہی کے بے دریغ استعمال سے لوگ دوزخ میں جاتے ہیں)۔

تشریح:۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو سفر تبوک میں ہوئی تھی۔ **قولہ: "یدخلنی الجنۃ ویباعدنی عن النار"** یدخل اور یباعد کو بنا بر جواب امر مجزوم پڑھنا بھی اگرچہ جائز ہے مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان کو مرفوع پڑھ کر عمل کی صفات قرار دیا جائے یعنی ایسا عمل بتائیے کہ جس میں یہ دونوں خوبیاں ہوں کہ جنت میں لے جاتا ہو اور دوزخ سے بچاتا ہو۔

قولہ: "لقد سألتنی عن عظیم وانہ لیسیر الخ" یعنی تم نے ایسے عمل کے بارے میں پوچھا جس کو سرانجام دینا بہت مشکل کام ہے البتہ جس پر اللہ آسان کر دیں تو اس کے لئے یہ عمل بہت آسان ہے اور یہ مشاہدہ کے عین مطابق ہے کیونکہ کسی کافر کے لئے کلمہ شہادت پڑھنا موت سے بھی زیادہ مشکل ہے اور کسی فاسق شخص کے لئے نماز اور روزہ وغیرہ یا تہجد کی نماز انتہائی دشوار کام ہیں لیکن اللہ کے نیک بندوں کی تو غذا یہی ہیں وہ ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ہیں۔

قولہ: "تعبد اللہ الخ" یہ اور اس پر معطوف جملے یا تو اِخبار بمعنی امر کے ہیں جیسا کہ اوپر ترجمہ کیا گیا ہے یا پھر مبتدأ مقدر کی خبر ہیں تقدیر اس طرح ہوگی "ھو ان تعبد اللہ، ای العمل الذی تسألنی عنہ ھو عبادتک اللہ الخ"۔ **قولہ: "ألا أدلک علیٰ ابواب الخیر"** یہاں سے نوافل کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور جب نفلی روزے اور صدقہ کا یہ عالم ہے تو فرائض کا مقام تو یقیناً اس سے اعلیٰ ہوتا ہے لہٰذا فرائض کا حکم بطریق

اولیٰ معلوم ہو جائے گا، گویا یہ ماقبل کی دلیل ہے کہ جب نفل عبادات کا یہ مقام ہے تو سابقہ جو فرض عبادات کا ذکر ہوا ان کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ (کذا فی الکوکب الدری)

قولہ: "الصوم جنة" بضم الجیم وتشدید النون سپر اور ڈھال کو کہتے ہیں چونکہ روزے سے خواہشات ٹوٹ جاتی ہیں اور نفس کمزور ہو جاتا ہے اس لئے صائم پر نفس اور شیطان کا وار نہیں چلتا۔ تاہم یہ مقصد ایک دو روزوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ لگا تار کئی روزے رکھنے سے اضمحلال آتا ہے تو روزہ ڈھال کا کام کر لیتا ہے۔ **قولہ:** "والصدقة تطفیٔ الخ" ابن العربیؒ عارضة الاحوذی میں فرماتے ہیں کہ یہ کنایہ ہے آگ سے حفاظت سے اور مراد حکمی بجھانا ہے جس کی تشبیہ حسی بجھانے والی چیز یعنی پانی سے دی گئی ہے۔

قولہ: "تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع" بچھونوں سے پہلوؤں کا دور رہنا کنایہ ہے نماز پڑھنے سے لیکن یہ کون سی نماز ہے تو مشہور و محقق قول کے مطابق تہجد کی نماز مراد ہے بعض حضرات نے صلوٰۃ اوّابین یعنی مغرب وعشاء کے درمیان کی نماز مراد لی ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ دن میں کھیتوں اور دیگر امور میں مصروف ہوتے اور عام عربوں میں مغرب کے بعد سونے کا رواج تھا مگر صحابہ کرامؓ عشاء کی نماز کا انتظار کرتے اور نوافل پڑھتے۔

قولہ: "برأس الامر" جیسے سر کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح دینِ اسلام بھی بغیر کلمہ شہادت کے معتبر نہیں یعنی اعتقادِ توحید و رسالت ضروری ہے۔ **قولہ:** "عمودہ" بمعنی ستون کے فان الصلوٰۃ عماد الدین۔ **قولہ:** "وذروۃ سنامہ" بکسر الذال چوٹی اور بلندی کو کہتے ہیں۔ سنام بفتح السین اونٹ کے کوہان کو کہتے ہیں جہاد کو اسلام کی اونچی چوٹی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی سربلندی کا دار و مدار جہاد پر ہے اگر جہاد ہوگا تو اسلام کا پرچم اعلیٰ وارفع ہوگا اور ساری دنیا پر اس کا رعب قائم رہے گا لیکن جہاد کے تعطل سے سارے فتنے سر اُٹھا کر بدمست ہاتھی کی طرح حقائق کو مسخ و پامال کرتے رہیں گے۔

قولہ: "مِلاک" بکسر المیم جڑ کو کہا جاتا ہے اس میں فتحہ بھی جائز ہے۔ **قولہ:** "کُفّ" بضم الکاف وفتح الفاء المشددۃ منع کرو، روکو! **قولہ:** "ثَکِلَتکَ" بکسر الکاف بمعنی فَقَدَتکَ لیکن اس سے معنی لغوی یعنی گم کرنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک محاورہ ہے جو رفع غفلت اور انتباہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ **قولہ:** "یکبّ" بفتح الیاء وضم الکاف منہ کے بل گرنے کو کہتے ہیں۔

قولہ: "او مناخرھم" "او" شک من الراوی کے لئے ہے۔ "منخر" بفتح المیم وکسر الخاء کی جمع ہے اس میں خاء کا فتحہ بھی صحیح ہے ناک کے نتھنے کے سوراخ کو کہتے ہیں۔ **قولہ:** "حصائد" بمعنی محصود، حصید اور محصود کٹی

ہوئی کھیتی کو کہتے ہیں اس میں زبان کے بے دریغ استعمال کی تشبیہ درانتی کے ساتھ دی گئی ہے اور باتوں کی مشابہت کٹی کھیتی اور گھاس سے بیان کی گئی ہے تو جس طرح درانتی خشک وتر اور ضار و نافع کی تمیز کئے بغیر کاٹتی ہے اسی طرح اگر زبان کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ بھی ہر طرح کی بات کرتی ہے جس سے اتنا نقصان ہوتا ہے کہ آدمی اوندھا یعنی ذلیل ہو کر جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے پس زبان کی حفاظت نجات کی ضمانت ہوئی۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی شخص کو دیکھو جو مسجد کی دیکھ بھال کر رہا ہو تو اس کے لئے ایمان کی گواہی دے دو، کیونکہ اللہ فرماتے ہیں: ''**انما يعمر مساجدالله من امن بالله**''۔(سورۂ توبہ: آیت:۱۸) بے شک آباد کرتے ہیں اللہ کی مسجدوں کو وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔(حسن غریب)

قولہ:''يتعاهدالمسجد'' تعہّد دراصل تحفظ اور تجدید عہد کو کہتے ہیں پھر یہاں اس سے مراد صورتاً تعمیر و خدمت بھی ہوسکتی ہے اور معنوی عمارت یعنی عبادت بھی ہوسکتی ہے، پھر عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ مراد اذان سن کر مسجد میں جانا ہے (تو چونکہ اذان پانچ دفعہ ہوتی ہے علیٰ ہذا پانچوں نمازیں باجماعت مراد ہیں یعنی یہ تعاہد کا بہرحال مدلول ہے رہا مزید وابستگی تو وہ نور علیٰ نور ہے) وہ مزید لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک ساتھی کو دیکھا جو لوہار تھا جب اذان سنتا تو وہ ہتھوڑا جو پہلے ہی اٹھا چکا ہوتا مارنے کے بجائے پھینک دیتا ''**لئلا يكون عملاً بعدالنداء ولكنه يرميهاويقدم إلى المسجد**''۔

باب ماجاء في ترك الصلوٰة

(نماز چھوڑنے کا گناہ)

''**عن جابر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: بين الكفر والايمان ترك الصلوٰة**''.

(**حسن صحيح**)**وعنه''بين العبدوبين الكفرترك الصلوٰة''.(حسن صحيح)**

(۱) نماز چھوڑنا کفر اور ایمان کو ملانا ہے۔(۲) نماز چھوڑنا بندے اور کفر کو باہم ملانا ہے۔

تشریح:۔ ترک الصلوٰۃ مبتدأ مؤخر ہے اور بین الکفر والایمان خبر مقدم ہے جبکہ لفظ ''**بين**'' جو ظرف ہے کا متعلق محذوف ہے یعنی ''وُصلَةٌ'' تقدیر اس طرح ہوئی ''**تركُ الصلوٰة وصلة بين الكفر و الايمان**'' چونکہ نماز پڑھنا ایمان اور کفر کے درمیان حجاب ہے تو ترک صلوٰۃ سے وہ حجاب ختم ہو کر ملاپ کا

موجب بنتا ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نماز کی وجہ سے کفر اور ایمان اور نمازی وکفر کے درمیان حدفاصل کا واسطہ رہتا ہے لیکن جب یہ واسطہ ختم ہو جائے تو دونوں کی سرحدیں باہم مل جاتی ہیں اور آدمی کفر کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ چونکہ کفر وایمان کلی مشکک ہیں اس لئے اگر چہ وہ تارک صلوٰۃ کلیۃً کافر تو نہیں کہلائے گا لیکن کفر کے انتہائی قریب جانے سے بلکہ بارڈر سے داخل ہونے کی وجہ سے وہ جزوی کافر کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "العهد الذی بیننا وبینهم الصلوٰۃ فمن ترکها فقد کفر". (حسن صحیح غریب)

ہمارے اور ان منافقین کے درمیان عہد وپیمان (کا دارومدار) نماز (پر) ہے پس جس نے نماز چھوڑ دی تو اس نے کفر کیا (یعنی ظاہری کفر کو بھی اختیار کرلیا)۔

چونکہ منافقین کلمہ شہادت پڑھتے اور نماز بھی پڑھتے تھے اس لئے ان پر مسلمانوں کے احکام لاگو کئے جاتے تھے تو نماز کی وجہ سے ان کو تحفظ حاصل تھا پس اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ نماز پڑھنا چھوڑ دیں تو پھر ہمارے اور ان کے مابین امن وامان کا عہد باقی نہیں رہے گا جیسے "**باب ماجاء اُمرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لاالٰه الاالله ویقیموا الصلوٰۃ**" میں عنقریب گذرا ہے علیٰ ھذا "**فمن ترکها فقد کفر**" کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس پر منافق کے احکام نہیں بلکہ کافر کے احکام لاگو ہوں گے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقد کفر بنابر تغلیظ کہا گیا ہو۔ حدیث کا یہ مطلب حاشیہ قوت پر قاضی بیضاویؒ سے نقل کیا گیا ہے۔ (تارک صلوٰۃ کا حکم تشریحات: جلد سوم: ص:۹ پر گذرا ہے)

باب

"عن العباس بن عبدالمطلب انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ذاق طعم الایمان من رضی بالله رباً وبالاسلام دیناً وبمحمد نبیاً". (حسن صحیح)

ایمان کا مزہ چکھا اس نے جو راضی ہوا اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر۔

تشریح:۔ قوله: "ذاق" حاشیہ قوت میں امام راغبؒ سے نقل کیا ہے کہ تھوڑی مقدار کھانے یعنی چکھنے کو ذوق کہتے ہیں جبکہ زیادہ مقدار کو اکل کہا جاتا ہے۔

قولہ: "رَضِیَ" رضا کے معنی قناعت کے ہوتے ہیں یعنی کسی چیز پر اس طرح خوش ہونا اور مطمئن ہونا کہ اس کے علاوہ دیگر کسی چیز کی خواہش، طلب اور توجہ باقی نہ رہے، علیٰ ہذا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اللہ کو رب ماننے، اسلام کو دین ماننے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے پر اس طرح خوش ہو اور مطمئن ہو کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور رب کا تصور تک نہ کرے۔

اور اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کے لئے نرم گوشہ نہ رکھے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور متنبی خواہ وہ قادیانی ملعون ہو یا کوئی اور جھوٹا متنبی ہو کو نبی تسلیم ہی نہ کرتا ہو تو یقیناً وہ ایمان پر مطمئن کہلائے گا اور اسے ایمان کی ایسی حلاوت نصیب ہوگی جیسے مزیدار چیز کے کھاتے وقت دل و دماغ میں سرور و شادمانی کی کیفیت اور خوشی کی لہر اٹھتی ہے اور پورے بدن میں پھیلتی ہے جس سے سُستی ختم اور ہمت تازہ دم ہو جاتی ہے

پھر اس حدیث میں اور آنے والی حدیث میں ایک لطیف تشبیہ ہے کہ جو شخص ان صفات کا حامل ہوگا وہ صحت مند آدمی کی طرح ہے جو لذیذ اشیاء کی مٹھاس واضح طور پر محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص ان خوبیوں سے محروم ہو وہ گویا صفراء کے مریض کی طرح ہے جو میٹھی اشیاء کی حلاوت کا احساس نہیں کرسکتا ہے۔

حدیث آخر:۔ تین خصلتیں (خوبیاں) جو اگر کسی کے اندر آجائیں تو وہ ان کی بناء پر ایمان کی حلاوت پائے گا (۱) وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول باقی سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہوں (یعنی وہ کسی سے اتنی محبت نہ کرتا ہو) (۲) اور یہ کہ وہ اگر کسی شخص سے محبت کرے تو اس کی محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہو۔ (۳) اور یہ کہ وہ کفر کی طرف پلٹنے (جانے) کو جبکہ اللہ نے اسے کفر سے نکالا ہے ایسا ناگوار سمجھے جیسے وہ آگ میں پھینکے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔ (حسن صحیح)

اس حدیث میں کامل ایمان کا ذکر ہے جس کے نصیب ہو جانے کے بعد کیفیت اور حالت یہی ہوتی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے کہ آدمی اپنی مرضی کو بالائے طاق ہی نہیں رکھتا بلکہ بھول جاتا ہے اور صرف اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں زندگی کھپاتا ہے۔

اس حدیث میں "بعد اذ انقذہ اللہ منہ" اس شخص کے لئے ہے جو پہلے کفر میں زندگی گزار رہا تھا مگر اللہ نے توفیق دی اور مشرف باسلام ہوا، اور وہ شخص بھی اس کا مصداق ہے جس کو شروع سے اللہ نے کفر سے محفوظ رکھا ہو مگر آپؐ کے زمانہ میں اکثریت قسم اول سے تعلق رکھتی تھی اس لئے وہ تعبیر غالب رہی علیٰ ہذا "ان یعود" اسی معنی کے مطابق ہے دوسرے معنی کے مطابق بمعنی یصیر کے ہے۔

باب لایزنی الزانی وھومؤمن

(ایمانی کیف میں کوئی زنا نہیں کرسکتا)

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لایزنی الزانی وھومؤمن ولایسرق السارق وھومؤمن ولکن التوبۃ معروضۃ". (حسن صحیح غریب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ زنا کرنے والا شخص زنا نہیں کرتا دراں حالیکہ وہ کامل مومن ہو اور چور چوری نہیں کرتا دراں حالیکہ وہ کامل مومن ہو۔ تاہم توبہ پیش کی ہوئی رہتی ہے۔

تشریح:۔ قولہ: "وھومؤمن" واؤ حالیت کے لئے اور تنوین تعظیم کے لئے ہے پس مطلب یہ ہوا کہ کامل ایمان اور زنا وچوری کبھی بھی جمع نہیں ہوسکتے ہیں یعنی اگر ایمان کامل ہے تو اس کے ساتھ زنا وچوری جمع نہیں ہوسکتیں اور زنا یا چوری کرے تو پھر اس کا ایمان کامل نہیں بلکہ ناقص ہے۔

قولہ: "ولکن التوبۃ معروضۃ" یعنی زنا وسرقہ کی وجہ سے ایمان تو گھٹ جائے گا البتہ اس زانی اور چور کو توبہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے پس اگر اس نے توبہ کرلی تو ایمانی کیف وکمال پھر بحال ہوسکتا ہے۔

حدیث آخر:۔ **"اذازنی العبدخرج منہ الایمان فکان فوق رأسہ کالظلۃ فاذاخرج من ذالک العمل عادالیہ الایمان".**

جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے (کمال) ایمان نکل جاتا ہے اور اس کے سر کے اوپر سائبان کی طرح منڈلاتا ہے پھر جب وہ شخص اس عمل سے فارغ ہوجاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں معلق ہے لیکن ابوداؤد نے اپنی سنن میں متصل ذکر کی ہے امام حاکمؒ نے صحیح علی شرط الشیخین قرار دی ہے اور حافظ ذہبیؒ نے ان کی موافقت کی ہے۔ (کذا فی تحفۃ الاحوذی)

اپنے ظاہری مطلب کے لحاظ سے یہ حدیث بہت مشکل ہے کیونکہ اس میں کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے ایمان کے خروج کی تصریح ہے جو بظاہر معتزلہ وخوارج کی دلیل ہے لیکن اگر سابقہ حدیث کی تشریح کو ملحوظ رکھا جائے تو اشکال ختم ہوجائے گا، پس مطلب یہ نکلا کہ زنا وغیرہ کبیرہ گناہ کے دوران کامل ایمان باقی نہیں رہ سکتا بلکہ وہ نکل جاتا ہے جہاں تک نفسِ ایمان کی بات ہے تو اس حدیث میں اس کی بات نہیں ہورہی ہے تاہم کامل ایمان

کا سر پر منڈلانے میں یہ اشارہ ضرور ہے کہ ایمان کا تعلق اس شخص سے مکمل ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا نور ختم ہو جاتا ہے۔ اور ثمرات ضائع کر دیئے جاتے ہیں اور جڑیں اس زانی کے دل کے اندر باقی رہتی ہیں۔ جیسے آدمی اپنے اوپر چھتری پکڑے تو اس چھتری کا دستہ اس کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور چھتری کا کپڑا سر کے اوپر ہوتا ہے جس کی بناء پر حفاظت رہتی ہے، پھر جب آدمی گناہ وزنا سے نکل جائے تو ایمان لوٹ جاتا ہے کیونکہ کامل ایمان اور زنا میں تضاد ہے جب ایک کسی محل میں داخل ہوگا تو دوسرا وہاں سے نکلے گا اور جب وہ نکلے گا تو یہ داخل ہوگا۔

البتہ یہاں یہ ماننا پڑے گا کہ زنا کرنے کے بعد زانی پھر سے خود بخود کامل مومن بن جاتا ہے کیونکہ جب کامل ایمان لوٹ آیا تو آدمی کامل مومن بن جائے گا حالانکہ یہ ماننا تو بہت مشکل ہے، اس لئے بعض شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں کامل کی بات نہیں بلکہ نفسِ ایمان کی بات کی گئی ہے اور یہ حکم تغلیظاً ہے یعنی زانی گویا نفس ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ توجیہ پہلے اشکال سے زیادہ مشکل لگتی ہے، اس لئے اس کا حل یہ نظر آتا ہے (واللہ اعلم) کہ بات تو کامل ایمان کی ہو رہی ہے لیکن چونکہ حقیقت یہ ہے کہ کامل مومن اول تو زنا کرتا نہیں اگر بالفرض اس سے زنا صادر ہو جائے تو وہ فوراً تائب ہو جاتا ہے کیونکہ توبہ کا موقع تو دیا جاتا ہے جیسا کہ باب کی پہلی حدیث میں گذر گیا لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ زنا سے فارغ ہو جائے اور ایمان کے تقاضے کے مطابق فوراً تائب ہو جائے تو ایمان واپس لوٹ آتا ہے۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ یہ حدیث مفسَّر ہے اور سابقہ حدیث میں توبہ کی قید اس کی تفسیر ہے فان الحدیث یفسر بعضہ بعضاً کما یفسّر القرآن بعضہ بعضاً۔

قولہ: "هذا خروج عن الایمان الی الاسلام" یعنی ایمان جو قلبی تصدیق ویقین کا نام ہے کے ہوتے ہوئے تو کوئی شخص گناہ اور خصوصاً کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتا ہے لہٰذا جو شخص ایسا کرے گا وہ گویا دعوے کی حد تک مسلمان ہے، لیکن اس جملے کا اصل مطلب وہی ہے جو اوپر تشریح میں گذر گیا یعنی کامل ایمان نہیں رہتا لیکن نفسِ ایمان باقی رہتا ہے، شرح عقائد میں اس متن "والکبیرة لاتخرج العبد المؤمن من الایمان ولاتدخله فی الکفر" کے تحت حسن بصری" کا مذہب یہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ کو منافق مانتے تھے۔

"واحتجت المعتزلة بوجهین الاول ان الامة بعد اتفاقهم علی ان مرتکب الکبیرة فاسق، اختلفوا فی انه مؤمن وهو مذهب اهل السنة والجماعة او

کافر وھو قول الخوارج اومنافق وھو قول الحسن البصریؒ الخ". (ص:۸۴)

لیکن مقاصد میں حضرت حسن بصری ؒ کا اپنے قول سے رجوع نقل کیا گیا ہے لہٰذا اب اہل السنۃ والجماعۃ کے مابین اس مسئلہ میں کسی طرح کا کوئی ابہام یا اختلاف نہیں ہے اور متفقہ مسئلہ ہے کہ جب تک کسی گناہ کو حلال و جائز سمجھ کر نہ کیا جائے تو نفس ارتکاب سے کوئی کفر لازم نہیں آتا ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے باب کے آخر میں نقل کیا ہے۔

"وھذا قول اھل العلم لانعلم اَحداً کَفَّرَ اَحداً بالزنا والسرقة وشرب الخمر".

قوله: "وقدروی من غیر وجه عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال فی الزنا والسرقة مَن اصاب مِن ذالک شیئاً فاقیم علیه الحدفھو کفارة ذنبه......روی ذالک عن علی بن ابی طالب وعبادة بن الصامت الخ" یہ حدیث حضرت عبادہ بن صامتؓ سے امام ترمذیؒ نے ابواب الحدود میں نقل کی ہے اس پر وہاں بحث گذری ہے فلانعیدہ۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: جلد پنجم: ص: ۳۴۵ سے آگے "باب ماجاء ان الحدود کفارة لاھلھا")

حدیث آخر:۔"من اصاب حداً فعُجِّل عقوبَتُه فی الدنیافالله اعدل من ان یُثَنِّیَ علی عبده العقوبة فی الآخرة ومن اصاب حداً فستره الله علیه وعفاعنه فالله اکرم من ان یعود فی شیٔ قدعفاعنه". (حسن غریب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کسی (موجب) حد کو پہنچا (یعنی کر گذرا) پس اس کی سزا دنیا میں جلد ہی دے دی گئی تو اللہ کا انصاف اس سے بہت بالاتر ہے کہ وہ اپنے بندے کی سزا قیامت میں دُہرا دیں اور جو شخص کسی حد (گناہ) کو پہنچا اور اللہ نے اس کی پردہ پوشی فرمائی (یعنی معاف کیا) تو اللہ کا کرم اس سے بہت اونچا ہے کہ جو چیز معاف کی ہو اس سے رجوع فرمائیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب الدری میں فرمایا ہے کہ یہاں ہر دو حکموں کی دو دو صورتیں ہیں پہلے حکم کی دو صورتیں یہ ہیں کہ حد قائم ہونے کے بعد وہ محدود دیا تو توبہ کرے گا یا نہیں تو اس میں توبہ والی صورت کو ذکر فرمایا کیونکہ بظاہر حد لگنے کے بعد مومن تائب ہو ہی جاتا ہے جبکہ دوسری صورت حذف کر دی گئی، اسی طرح گناہ پر کسی دوسرے کی اطلاع نہ ہونے کی صورت میں وہ توبہ کرے گا یا نہیں تو اس میں بھی توبہ والی صورت کو ذکر کیا جو مومن

کی شان کے مطابق ہے، غرض یہاں دونوں صورتوں میں توبہ کی قید مراد ہے۔

علیٰ ہذا اس حدیث کا سابقہ حدیث سے کسی طرح تعارض نہیں آیا کیونکہ اس میں مغفرت کو مشیت باری تعالیٰ پر موقوف کیا گیا ہے۔ **"فستره الله فهو الی الله تعالیٰ ان شاء عذّبه یوم القیٰمة وان شاء غفرله وروی ذالک عن علی بن ابی طالب وعبادة بن الصامت وخزیمة بن ثابت عن النبی صلی الله علیه وسلم"۔**

باب ماجاء المسلم من سَلِمَ المسلمون من لسانه ویده

(مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہیں)

"عن ابی هریرة قال قال: رسول الله صلی الله علیه وسلم: المسلم من سَلِمَ المسلمون من لسانه ویده والمؤمن من اَمِنَه الناس علیٰ دمائهم واموالهم". (صحیح)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور اس کے ہاتھ سے (یعنی ایذاء سے) دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے خون (جانوں) اور اپنے مال کے بارے میں مطمئن ہوں (یعنی بے خوف ہوں)۔

تشریح:۔ اس حدیث کے پہلے جزء کی تشریح ابواب صفة القیامة میں باب بلا ترجمہ کے تحت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث میں گذری ہے، اور جو مطلب پہلے جملے کا بنتا ہے وہی دوسرے جملے کا بھی ہے یعنی مسلم سلامتی کے معنی میں ہے اور مومن امن واطمینان کے معنی میں لہٰذا مسلم کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی سلامتی کو یقینی بنائے اور مومن کو چاہئے کہ وہ دوسرے اہل ایمان کے امن واطمینان کی عملی ضمانت دے وہ اپنے قول وعمل سے دوسرے مسلمانوں کو یہ باور کرائے کہ وہ نہ کسی کو زبانی وقولی تکلیف پہنچائے گا اور نہ عملی طور پر کسی کو جانی ومالی نقصان پہنچائے گا۔

اگر کوئی مسلم ومومن قولاً یا عملاً اس کردار وذمہ داری کے خلاف چلتا ہے تو وہ مسلمان ومومن کہلانے کا مستحق نہیں گوکہ وہ اپنے عمل ایذاء رسانی سے خارج از اسلام وایمان تو نہیں ہوگا لیکن یہ ایسا ہوگا جیسے کوئی جاہل اپنا نام بحر العلوم رکھے اگرچہ اس کے پاس تھوڑا بہت علم تو ہوتا ہے لیکن یہ نام یقیناً بے جا رکھا ہوا تصور کیا جائے گا۔ غرض کامل مومن وہ ہے جو سلامتی کے پیغام کے ساتھ امن دینے کا التزام کرتا ہو۔

باب ماجاء ان الاسلام بدأغريباً وسيعود غريباً

(اسلام نامانوس شروع ہوا تھا اور عنقریب وہ دوبارہ نامانوس بن کر لوٹے گا)

"عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الاسلام بَدَأَ غريباً وسيعود كمابَدَأَفطوبىٰ للغُرباءِ". (حسن صحيح غريب)

بے شک اسلام نامانوس ظاہر ہوا ہے اور عنقریب دوبارہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ پہلے ظاہر ہوا تھا۔ پس ابدی عزت ہے نامانوس (اجنبی ہو جانے) والوں کے لئے۔

تشریح:۔ قولہ: "بَدَأَ" یہ لفظ اگر مہموز اللام ہو جیسا کہ امام نوویؒ نے تصریح کی ہے تو بمعنی ابتداء کرنے اور شروع ہونے کے ہے اور اگر بَدَا الف کے ساتھ یعنی ناقص سے ہو تو پھر ظہور کے معنی میں ہے بَدَا یبدُو بُدُوّاً بمعنی ظہور کے آتا ہے مطلب کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تاہم اصل روایت ہمزہ کے ساتھ ہے۔

قولہ: "غریباً" غرابت سے ہے اجنبیت وندرت کو کہتے ہیں چونکہ نادر اشیاء سے تعجب ہوتا ہے اس لئے تعجب کو بھی غرابت کہتے ہیں، غریب پردیسی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دیار غیر اور پردیس میں نامانوس ہوتا ہے اس کا پوچھنے والا نہیں ہوتا یا پھر ایک دو آدمی ہوتے ہیں۔

قولہ: "فطُوبى" بروزن فُعلیٰ طیّب سے مؤنث کا صیغہ اسم تفضیل ہے بمعنی خوش خبری کے یا بمعنی خیر وبھلائی کے۔ جنت اور ایک جنتی درخت وغیرہ کے اقوال بھی ہیں۔

قولہ: "لِلغرباء" غریب کی جمع ہے مراد مسلمان ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ جو امت کے فساد کے وقت جب لوگ سنتوں اور دین کے باقی احکام کو نظر انداز کر دیں گے، یہ ان احکام پر عمل کریں گے اور لوگوں کو سنت کے مطابق زندگی گذارنے کی تلقین کریں گے۔

اس حدیث شریف میں اسلام کی ابتدائی اور آخری حالت کی تشبیہ ایک اجنبی مسافر کے ساتھ دی گئی ہے جو کسی شہر یا بستی میں وارد ہوتا ہے اور کوئی اس کا پُرسان حال نہیں ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو لوگوں پر پیش کرتا ہے اپنا تعارف کرواتا ہے مگر وہ لوگ اس کو مہمان بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں وہ کسمپرسی کے عالم میں مارا مارا پھرے۔ کہیں مسجد میں پہنچتا ہے یا لوگوں کے کسی اور مجمع میں جا گھستا ہے بہت سارے لوگ اس سے بچنے کی

کوشش کرتے ہیں کوئی سنگدل گالیاں بھی دیتا ہے، کوئی بے وقوف دھکے بھی دیتا ہے اور بچے کبھی کبھی اس کے پیچھے لگادیئے جاتے ہیں مگران لوگوں میں ایک خداترس ایسا بھی ہوتا ہے جواس پردیسی غریب کو جگہ دیتا ہے اور کھانا کھلاتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح حال اسلام کا تھا ابتدائی دور میں۔ اور اسلام سے وابستہ لوگوں کا جو معاشرہ میں نہ صرف تنہا کردیئے گئے تھے بلکہ ان پر زمین تنگ کرنے کی ساری چالیں چلی گئیں، بعینہ یہی صورت حال اسلام کے آخری دور میں بن جائے گی کہ دین والوں کو محض دینداری کی وجہ سے معاشرے میں الگ تھلگ کردیا جائے گا، اس طرح ان کے لئے معاشرہ میں کوئی جگہ، کوئی وقار، کوئی رشتہ، کوئی منصب وغیرہ نہیں ہوگا بس وہ اس دنیا میں ایسے ہوں گے جیسے وہ یہاں والوں کے ابنائے جنس ونوع سے نہیں ہیں، یقیناً یہ بہت تکلیف بلکہ ناقابل برداشت صورت حال ہوگی لیکن ہمت والوں کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عظیم خوش خبری دی ہے "فبذالک فلیفرحوا، وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون" یعنی اس وقتی وعارضی ذلت کے بدلے ان کے لئے سرمدی عزت ہوگی۔

حدیث آخر:۔ "ان الدین لَیَارِزُ الی الحجاز کماتارِزُ الحیّة الی جُحرِھا ولَیعقِلَنَّ الدین فی الحجاز معقل الأُروِیّة من رأس الجبل ان الدین بدأغریباً ویرجع غریباً فطوبیٰ للغرباء الذین یصلحون ماافسدالناس من بعدی من سنتی". (حسن)

بے شک دین حجاز کی طرف سمٹ آئے گا جیسا کہ سانپ اپنے بل میں سکڑ جاتا ہے، اور بلاشبہ دین حجاز میں پناہ لے گا جنگلی بکری کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لیتی ہے، بے شک دین نامانوس شروع ہوا تھا الخ۔

قولہ: "لَیَارِزُ" بکسر الراء سکڑ جانے کو کہتے ہیں تاہم مأرز پناہ گاہ کو بھی کہتے ہیں لہٰذا یأرز بمعنی پناہ لینے کے بھی صحیح ہے۔

قولہ: "لَیَعقِلَنَّ" پناہ لینے کے معنی میں ہے لیکن مراد ایسی پناہ ہے جہاں تک رسائی ناممکن ہوجائے کیونکہ عقل بمعنی روکنے اور امتناع کے بھی ہے۔

قولہ: "مَعقِل" مصدر میمی یا ظرف مکان کا صیغہ ہے۔ **قولہ:** "الأُروِیّة" بضم الہمزۃ وتشدید الیاء جنگلی بکری کو کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ خطرات اور فساد امت کے زمانہ میں اسلام حجاز کو جائے پناہ بنائے گا اور باقی دنیا سے

سمٹ کراس طرح واپس آجائے گا کہ اس کا وہاں نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ جیسے سانپ اپنے بل میں اور جنگلی بکری پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے بعد قابل دید اور قابل تناول وحصول نہیں رہتی اور جہاں سے ہوکر یہ دونوں واپس آتے ہیں تو وہاں ان کے نشانات بھی پانا مشکل ہوتا ہے۔

اس حدیث میں غرباء ان لوگوں کو کہا ہے جوان سنتوں کی بحالی میں مصروف عمل ہوں گے جن کولوگوں نے مسخ کر دیا ہوگا، چونکہ عوام کو سنت کے مقابلہ میں بدعت عمل میں بہت زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف علماء کی معاشرے پر گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے اس لئے جیسا کہ مشاہدہ ہے عام علماء اور خصوصاً علماء سوء عوام ومعاشرے کے مزاج پر چلیں گے، ایسے میں جو علماء سنتوں کے احیاء کی کوشش کریں گے ظاہر ہے کہ ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا وہ لامحالہ معاشرہ میں الگ تھلگ ہوجائیں گے، اس حدیث کو ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں بھی حسن کہا ہے۔

باب ماجاء فی علامة المنافق

(منافق کی نشانیوں کا بیان)

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :اٰیة المنافق ثلاث اذا حَدَّثَ کَذَبَ واذاوَعَدَاَخلَفَ واذااُئتُمِنَ خان"(حسن غریب)

منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اسے امانت سونپی جائے تو خیانت کرے۔

حدیث آخر:۔ **"اربع من کُنّ فیه کان منافقاً وان کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتیٰ یَدَعَهَا، اذاحَدَّثَ کذب واذاوَعَدَاَخلَفَ واذاخاصم فجر واذا عاهد غَدَرَ". (حسن صحیح)**

یہ چار باتیں جس میں ہوں گی: وہ منافق ہوگا اگر کسی میں ان میں سے ایک بات (عادت) ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک عادت ہوگی تاآنکہ وہ اسے چھوڑ دے: (۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) اور جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (۳) اور جب کسی سے لڑائی کرے تو بے ہودہ گوئی کرے (۴) اور جب عہد وپیمان کرے تو عہد شکنی کرے۔

تشریح:۔ چونکہ پہلی حدیث میں ثلاث کا عدد حصر کے لئے نہیں ہے لہٰذا یہ اشکال وارد نہیں ہونا چاہئے کہ اگلی حدیث کا اس سے تعارض ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے آپ علیہ السلام کو تین کا علم دیا گیا ہو اور پھر مزید ایک کا اضافہ کیا گیا ہو جیسا کہ علم نبوی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

قولہ: "فجر" فجور دراصل میانہ روی سے ہٹنے کو کہتے ہیں یہاں مراد گالم گلوچ اور دیگر بدزبانی ہے۔ قولہ: "واذا عاھد غدر" یعنی وعدہ کرتے ہی اسے توڑ دیتا ہے جس کو دھوکہ کہا جاتا ہے کیونکہ دھوکہ باز کا وعدہ کرنا دراصل ایک چال ہوتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح اور مطلب میں شارحین کافی پریشان نظر آتے ہیں کیونکہ بظاہر ان خصلتوں میں تو بہت سارے مسلمان مبتلاء ہیں اس طرح ان سب کو منافق کہنا پڑے گا بلکہ بخاری شریف کی روایت میں تو تصریح ہے کہ ایسا شخص خالص یعنی پکا منافق ہے دوسری طرف منافق کی اُخروی سزا تو کافر سے بھی زیادہ سخت بیان ہوئی ہے، تو امام ترمذیؒ نے حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد نفاق عمل ہے جس سے کفر لازم نہیں آتا بلکہ صرف گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ان خصلتوں کا دائمی اجتماع یعنی بطور عادت مستمرہ ہونا مراد ہے وغیرہ وغیرہ لیکن اس کا سب سے بہترین مطلب ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں بیان فرمایا ہے کہ نفاق اس قول یا عمل کا نام ہے جو باطن کے خلاف ہو، پس اگر یہ مخالفت باطن مع الظاہر عقائد میں ہو تو یہ نفاقِ کفر ہے اور اگر عمل میں ہو تو نفاق عمل ہے۔ اس طرح وہ شخص جس میں یہ چار خصلتیں مجتمع ہو گئی ہوں وہ خالص منافق ہوگا۔ اگر قولی مخالفت یا عملی مخالفت توحید میں ہے تو یہ خالص کفر اور اگر عمل میں ہو یعنی توحید اور ذات وصفات کے حوالے سے نہ ہو تو وہ بھی خالص منافق ہوگا مگر کافر نہیں بلکہ عاصی ہوگا:

"والمختار من ذالک ان یقول: الذی یُحَدِّثُ فیکذب ان کان فی التوحید فھو کافر وان کان فی غیر ذالک فھو عاص والکل نفاق وکذالک من عاھد فغدر ووعد فأخلفه ان کان ذالک مع الله فھو کافر کقوله تعالی:

"ومنھم من عاھد الله لئن آتانا من فضله لنصّدّقنّ ولنکونن من الصالحین فلما اٰتھم من فضله بخلوا به وتولّوا وھم معرضون". (توبہ: آیت نمبر: ۷۵، ۷۶)

تاہم اگر جھوٹ کسی غرض صحیح کی بنیاد پر ہو تو اس کا حکم گزرا ہے۔ (عارضۃ الاحوذی: ص: ۲۷۲: ج: ۱۰ حصہ دہم)

حدیث آخر:۔"اذا وعد الرجل وینوی اَن یَفِیَ به فلم یَفِ فلاجناح علیه".(حدیث غریب)

جب آدمی وعدہ کرے اور ارادہ یہی ہو کہ اسے پورا کرے گا مگر وہ اسے (بوجہ عذر) پورا نہ کر سکا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

یہ حدیث بتصریح امام ترمذیؒ ضعیف ہے تاہم اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص وعدہ کرتا ہے اور اسے پورا بھی کرنا چاہتا ہے مگر بوجوہ وہ اسے پورا نہ کر سکے تو اس پر گناہ نہیں یعنی یہ وعدہ خلافی نفاق کی شاخ نہیں کیونکہ منافق تو شروع سے اور اپنی عادت کے مطابق ایفائے عہد کا پابند نہیں جبکہ مسلمان وعدہ پورا کرنے کو اپنی دینی واخلاقی ذمہ داری سمجھتا ہے مگر عذر پیش آنے کی صورت میں وہ بہر حال پورا کرنے کا پابند نہیں۔

باب ماجاء سِبَابُ المسلم فسوق

(مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے)

"قتال المسلم اخاه کفر وسِبَابه فسوق".(حسن صحیح)

مسلمان کا اپنے (مسلمان) بھائی سے لڑنا کفر ہے اور اس کو گالی دینا گناہ ہے۔

اس حدیث پر بحث اور تشریح "باب ماجاء فی الشتم" میں گزری ہے۔(دیکھئے تشریحات ترمذی: ص:۲۵۳ج:۶)

باب ماجاء فی من رَمَیٰ أخاه بکفر

(مسلمان کو کافر قرار دینے کا گناہ)

"عن ثابت بن الضحاک عن النبی صلی الله علیه وسلم قال:لیس علی العبد نذر فیما لایملک،وَلاَعِنُ المؤمن کقاتله ، ومن قَذَفَ مؤمنابکفرفهو کقاتله ومن قتل نفسه بشیء عَذَّبه الله بماقتل نفسه یوم القیٰمة".(حسن صحیح)

لازم نہیں ہوتی بندے پر نذر اس چیز کی جس کا وہ مالک نہیں، اور مومن پر لعنت کرنے والا (گناہ میں) اس کے قاتل کی طرح ہے اور جس نے کسی مومن پر کفر کا الزام لگایا تو وہ (بھی گناہ میں) اس کے قاتل کی مانند

ہے اور جس نے خود کو کسی چیز سے مار ڈالا تو قیامت کے دن اللہ اس کو اسی چیز سے سزا دیں گے جس سے اس نے خودکشی کی ہوگی۔

تشریح:۔ اس حدیث میں چار باتوں کا ذکر ہے:(۱) نذر (۲) لعنت کرنا (۳) تکفیر (۴) اور خودکشی۔ یہاں امام ترمذیؒ نے صرف تکفیر یعنی تیسرے مسئلہ کے لئے باب قائم کیا ہے باقی تینوں مسائل اپنے اپنے متعلقہ ابواب میں گزرے ہیں، نذر کے لئے (تشریحات ترمذی:ص:۴۰۲ ج:۵ ''باب لانذر فی مالا یملک ابن ادم'' اول ابواب النذور والایمان) لعنت کے لئے (دیکھئے:ص:۲۴۶ ج:۶ ''باب ماجاء فی اللعنة من ابواب البر والصلة) اور خودکشی کے لئے (ملاحظہ ہو:ص:۳۴۴ ج:۶ ''باب ماجاء من قتل نفسہ بسم او غیرہ)

تاہم لعنت کے حوالہ سے یہاں مزید شناعت کا ذکر فرمایا ہے کہ لعنت کرنا گویا قتل کرنے کے مترادف ہے کیونکہ لغت میں ملعون کو اللہ کی رحمتِ اخروی سے محروم کرنا مقصود ہوتا ہے اور قتل کرنے سے دنیوی نعمتِ حیات سے انقطاع مطلوب ہوتا ہے البتہ اگر قاتل سے مراد قتال کرنے والا یعنی لڑنے والا لیا جائے تو پھر حکم میں نسبتاً تخفیف آجائے گی کیونکہ قتال سے قتل کرنا لازم نہیں آتا تاہم قتال کرنے میں مراتب ہیں بعض قتال کفر ہے، بعض قریب الی الکفر اور بعض مباح بلکہ باعث اجر وثواب ہوتا ہے جیسا کہ اپنی جگہ بیان ہوا ہے، حاشیہ میں ہے کہ لاعن کو قاتل کہنا الحاق الناقص بالکامل کے قبیل میں سے ہے تغلیظاً وتشدیداً جبکہ قذف کی تشبیہ قتل کے ساتھ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ کفر (ارتداد وغیرہ) قتل وقتال کے اسباب میں سے ہے، پس کسی کو کافر کہنا گویا استحقاق قتل کا فتویٰ ہے ممکن ہے کہ کوئی اس فتوی کی وجہ سے مقذوف کو قتل کرے اس طرح قاذف بھی شریک قتل شمار ہوگا۔

حدیث آخر:۔ **"ایما رجل قال لاخیه "کافر" فقد باءَ بها احدُهُما". (حدیث صحیح)**

جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کو کافر کہا تو یقیناً ان دونوں میں سے کوئی ایک اس کلمہ کا مستحق ہوا۔

قوله: "کافر" مرفوع ہے بنا بر خبریت یعنی انت کافر یا ھو کافر یا پھر حرف نداء محذوف کا منادی ہے۔

قوله: "باء" باء بالشئی کے معنی لوٹنے کے آتے ہیں یعنی ان میں سے ایک اس لفظِ کفر کے ساتھ لوٹے گا کیونکہ اگر وہ شخص جسے کافر قرار دیا جا رہا ہے واقعتاً کفر کا مرتکب ہو تو پھر یہ بات اس پر فٹ و منطبق ہو جائے گی لیکن اگر وہ کفر سے بری ہوگا تو پھر جس نے کافر کہا ہوگا وہ اس کلمہ کا مستحق ہوگا کیونکہ اس نے مسلمان کے اسلام کو کفر کہا اور یہ بات یقینی ہے کہ دین حق کو باطل قرار دینا کفر ہے۔

یہاں تک تو حدیث کا مطلب آسان ہے لیکن اگر الزام لگانے والے کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ وہ اسلام کو باطل کہے تو پھر حدیث مشکلات میں سے ہے، حاشیہ پر اس کی پانچ توجیہات کی گئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا کہنے والا کافر تو نہیں ہوگا البتہ سخت گنہگار ہوگا کہ اس نے انتہائی خطرناک بات کی ہے، علیٰ ہذا اس صورت میں کفر کا استحقاق تغلیظاً وتشدیداً ہوگا۔

تکفیر کا اصول "باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر من ابواب الفرائض" میں بیان کیا جاچکا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ص: ۴۲۵ ج: ۶)

باب ماجاء من یموت وھو یشھد ان لا الٰہ الّا اللہ

(ایمان کی حالت میں موت آنے کا بیان)

"عن الصُنابحی عن عُبادة بن الصامت انه قال: دخلتُ علیه وھو فی الموت فبکیت فقال: مَهلاً لِمَ تبکی؟ فوالله لَئِن اُستُشهِدتُ لَاَشهَدَنّ لکَ ولَئِن شُفِّعتُ لَاَشفَعَنّ لکَ ولَئِن استطعتُ لَاَنفَعَنّکَ ثم قال: والله مامن حدیث سمعته من رسول الله صلی الله علیه وسلم لکم فیه خیر اِلّا حَدَّثتکموه اِلّا حدیثاً واحداً وَسَاُحَدِّثکموه الیوم وقد اُحیط بنفسی سمعتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من شهِد ان لا اله الا الله وان محمداً رسول الله حَرَّم الله علیه النار". (حسن صحیح غریب)

حضرت عبدالرحمٰن بن عُسیلہ فرماتے ہیں کہ میں عبادہ بن صامتؓ کے پاس آیا جبکہ وہ حالتِ نزع میں تھے تو میں رونے لگا، حضرت عبادہؓ نے فرمایا ٹھہر جاؤ...... تم کیوں روتے ہو؟...... خدا کی قسم! اگر مجھ سے گواہی طلب کی گئی تو میں ضرور تیرے لئے گواہی دوں گا اور اگر میری سفارش قبول ہوتی ہے تو میں ضرور تیرے لئے سفارش کروں گا اور اگر میرا بس چلے تو میں ضرور تجھے نفع پہنچاؤں گا، پھر انہوں نے فرمایا بخدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی ایسی حدیث سُنی ہے جس میں آپ لوگوں کا فائدہ ہے تو وہ حدیث میں نے آپ سے بیان کی ہے سوائے ایک حدیث کے اور وہ بھی بیان کر ہی دیتا ہوں کیونکہ مجھے گھیرا گیا ہے (یعنی موت نے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں تو اللہ اس پر دوزخ حرام کر دیتا ہے۔

تشریح:۔ صنابحی کے بارے میں امام ترمذیؒ نے کتاب کے دوسرے باب ''باب ماجاء فی فضل الطهور'' میں تفصیل بیان کی ہے فلیراجع چونکہ حضرت صنابحیؒ کو اپنے استاذ حضرت عبادہ بن صامتؓ کے فراق کا یقین ہو گیا تھا اس لئے صدمۂ فراق برداشت نہ کر سکے اور... رو پڑے جس پر حضرت عبادہؓ نے ان کو تسلی دی۔

موت کے وقت کبھی خوف کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی رَجاء کا حضرت عبادہ بن صامتؓ پر رجاء کا غلبہ تھا جو کہ مستحسن امر ہے اس لئے فرمایا کہ میں تیری ہر ممکن مدد کروں گا۔

قولہ: ''مامن حدیث...... الاحدثتکموہ'' یعنی جو بھی حدیث اعمال سے متعلق تھی وہ میں نے بیان کی ہے اور جس میں احکام نہ تھے اور اس کے عدم بیان میں مصلحت تھی تو وہ میں نے بیان نہیں کی ہے۔ ہاں آج ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جو اگرچہ اعمال سے متعلق تو نہیں اور بیان کرنے میں اس پر تکیہ کر کے اعمال میں سُستی کا اندیشہ تھا لیکن تم میرے خاص شاگرد ہو اور میں بھی آخری لمحات حیات میں ہوں اس لئے بیان کرتا ہوں تا کہ کتمانِ علم لازم نہ آئے اور تم غلط فہمی میں بھی مبتلاء نہیں ہو گے کیونکہ ایسی فضیلت والی احادیث سے عوام سست ہو جاتے ہیں خواص نہیں۔

قولہ: ''حرّم الله عليه النار'' بظاہر اس جملے سے اعمال کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اس لئے علماء نے اس میں تاویل کو ضروری سمجھا ہے۔

امام ترمذیؒ نے امام زہریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ اس وقت کا فرمان ہے جب صرف توحید کا حکم تھا باقی احکام وفرائض وغیرہا ابھی نازل نہیں ہوئے تھے لیکن یہ قول بلا دلیل ہے۔

دوسرا قول جس کی طرف امام ترمذیؒ اشارہ کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ حرّم الله عليه النار کا مطلب یہ نہیں کہ عاصی جہنم میں نہیں جائے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ دوزخ میں جائے بھی تب بھی اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ اسے بالآخر وہاں سے نکال لیا جائے گا علیٰ ہذا حرمت سے مراد خلود کی نفی ہے، اور یہ مضمون کئی صحابہ کرامؓ سے نقل کیا ہے: ''قال سيخرج قوم من النار من اهل التوحيد ويدخلون الجنة'' چنانچہ جب اہل التوحید کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا تو اس وقت کافر آرزو کریں گے کہ کاش! وہ بھی مسلمان ہوتے۔

پھر آگے امام ترمذیؒ نے پرچی والی حدیث نقل کر کے اہل السنۃ والجماعۃ کے مذہب کا دوسرا پہلو مدلل ومبرہن فرمایا ہے یعنی بعض نصوص سے عاصی کا جہنم میں جانا ثابت ہے جبکہ بعض روایات سے عفو ومغفرت بھی ثابت ہے اس لئے اہل السنۃ والجماعت کہتے ہیں کہ عاصی کا معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اگر وہ چاہے

تو بقدر گناہ سزا دے کر جنت میں داخل فرمادیں اور چاہے تو بغیر عذاب وعقاب کے شروع ہی سے جنت میں داخل فرمادیں۔ وماذالک علی اللہ بعزیز

باب کی حدیث کے مطلب میں اور بھی بہت سے اقوال ہیں مثلاً یہ خاصیۃ المفرد ہے جس کی وضاحت پہلے گزری ہے، یا یہ اس شخص کے لئے ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو یا گناہ سے سچی توبہ کرلی ہو، جبکہ حضرت وھب بن منبہ فرماتے ہیں کہ ''لا الہ الا اللہ'' مفتاح الجنۃ ہے تاہم چابی کے لئے دندانے بھی ضروری ہیں لہٰذا کلمہ توحید کے ساتھ اعمال بھی بہت اہم ہیں کیونکہ جس چابی میں دندانے نہیں ہوں گے تو اس سے تالے کا جلدی کھلنا ضروری نہیں کبھی جلدی کھل جاتا ہے اور کبھی پریشانی ہوتی ہے پس جس قدر چابی دندانوں سے خالی ہوگی اسی مقدار میں پریشانی ہوسکتی ہے اگرچہ کبھی کبھی لگاتے ہی تالہ کھل جاتا ہے، ابن العربیؒ نے اس کو پسند کیا ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میری امت سے ایک آدمی کو سب لوگوں سے الگ کردیں گے (یعنی سب خلائق کے سامنے اس سے روبرو بات کریں گے) پھر اس کے سامنے ننانوے رجسٹر کھول دیئے جائیں گے، ہر رجسٹر تاحد نگاہ پھیلا ہوا ہوگا، پھر اللہ فرمائیں گے: کیا تو ان میں سے کسی گناہ کا انکار کرتا ہے؟ کیا تجھ پر میرے (متعین کردہ) نگران فرشتوں نے کوئی ظلم کیا ہے؟ (کہ تجھ پر ناکردہ گناہ کا الزام لگایا ہو؟) وہ کہے گا نہیں اے میرے رب! اللہ فرمائیں گے تو کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا نہیں اے میرے رب! (یعنی خلاصی کا کوئی راستہ نہیں ہے) پس اللہ فرمائیں گے...... کیوں نہیں بے شک ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے اور یہ کہ آج تجھ پر کچھ ظلم نہیں ہوگا، چنانچہ ایک پرچی نکالی جائے گی جس پر لکھا ہوگا ''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ'' پس اللہ فرمائیں گے حاضر ہوجاؤ اپنے وزنِ اعمال کے پاس (تاکہ تمہیں انصاف کا قریب سے مشاہدہ ہو) وہ کہے گا اے میرے رب! اس پرچی کا ان رجسٹروں سے کیا موازنہ ہوگا؟؟؟ پس اللہ فرمائیں گے لیکن تجھ پر ظلم نہیں ہوگا (لہٰذا وزن ضروری ہے تاکہ موازنہ کیا جائے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چنانچہ وہ سارے رجسٹر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں گے اور وہ پرچی دوسرے پلڑے میں، اس طرح سارے رجسٹر ہلکے ثابت ہوں گے اور وہ پرچی بھاری ثابت ہوگی اور اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز بھاری نہیں ہوسکتی۔ (حسن غریب)

قولہ: ''سِجِلّاً'' بکسرۂ سین وجیم وتشدید اللام، دفتر یعنی حساب وکتاب کی بڑی کتاب کو کہتے ہیں

یہاں مراد وہ کتاب ہے جس میں اعمال درج کئے جاتے ہیں۔ **قولہ: "بِطاقة"** بکسر الباء چھوٹی پرچی چونکہ عموماً اس کو کپڑے اور چادر کے پلّو میں لپیٹ کر رکھا جاتا ہے اس لئے اسے بطاقہ کہتے ہیں گویا یہ لفظ طاق سے ہے اور باء زائد ہے۔ **قولہ: "فطاشت"** ای خَفّت۔

اس حدیث سے وزنِ اعمال کی کیفیت کی ایک صورت یہاں سے معلوم ہوئی جبکہ بعض روایات سے اس بندے کا تولنا بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عین اعمال کو مجسم بنا کر وزن کیا جائے۔ شرح عقائد میں ہے: **"والمیزان عبارة عما یُعرف به مقادیر الاعمال والعقل قاصر عن ادراک کیفیته"**۔ (شرح عقائد: ص:۷۹)

بہرحال وزن حق ہے اگرچہ اس کی کیفیت مدرک بالعقل نہیں ہے۔ پھر بظاہر یہ شخص کلمہ شہادت کے علاوہ دیگر نیکیوں سے مکمل عاری وخالی معلوم ہوتا ہے اس کے پاس سوائے اس کلمہ کے کوئی عمل نہیں ہوگا تاہم اس کلمہ کے پڑھنے میں یہ بھی احتمال ہے کہ زندگی میں پہلی بار پڑھا جانے والا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمان ہونے یا بالغ ہونے کے بعد کسی دوسرے موقع پر اس نے پڑھا ہو جو عنداللہ شرف قبولیت حاصل کر چکا نیز اس شخص نے توبہ بھی نہیں کی، مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی دوسری نیکیاں بھی ہوں لیکن نسبت اس پرچی کی طرف کی گئی کیونکہ باقی نیک اعمال میں ثقل اللہ کے نام کی برکت سے آیا۔

باب اِفتراق هذه الامة

(اس امت میں فرقہ بندیوں کا بیان)

"عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: تَفَرَّقت الیهود علیٰ اِحدیٰ وسبعین فرقةً او اثنتین وسبعین فرقةً والنصاریٰ مثل ذالک وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقةً". (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود اِکہتّر فرقوں میں بٹ گئے تھے یا فرمایا کہ بہتّر فرقوں میں اور نصاریٰ بھی اسی طرح (متفرق) ہو گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔

حدیث آخر:۔ "لیاتِیَن علی امتی ما اتیٰ علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی ان

كان منهم من اتى اُمّه علانيةً لكان في امتي من يصنع ذالك وان بني اسرائيل تفرّقت على ثنتين وسبعين ملةً وتفترق امتي على ثلاث وسبعين ملةً كلهم في النار إلا ملة واحدة قالوا من هي يارسول الله؟ قال: ماانا عليه واصحابي". (حسن غريب)

میری امت پر ضرور وہ وقت آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا جیسے ایک نعل دوسری نعل کے برابر ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہو جو کھلم کھلا زنا کرے اپنی ماں سے تو میری امت میں بھی ایسا آدمی ہوگا جو ویسا ہی کرے گا اور بے شک بنی اسرائیل بہتر ملتوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر ملتوں میں بٹ جائے گی، یہ سب کے سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک ملت کے صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! وہ ملت کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگی۔

تشریح:۔ پہلی حدیث میں راوی کو شک ہے کہ آیا آپؐ نے اکہتر فرمایا یا بہتر؟ مگر دوسری روایت میں بہتر ہی کا عدد بغیر شک راوی کے مروی ہے۔ **قوله:** "من اتیٰ امه علانية" اس کا بے غبار مطلب زنا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ باہمی اختلافات کی وجہ سے اپنے اپنے مذاہب پر قائم نہ رہ سکے بلکہ دونوں امتیں آپس میں بہتر، بہتر فرقوں میں بٹ گئیں میری امت بھی ان کے نقش قدم پر چلے گی اور ان کی پیروی و متابعت میں ان کے قدم سے قدم ملا کر چلے گی حتیٰ کہ اگر ان میں کوئی اپنی ماں سے علانیہ زنا کرتا ہو تو اس امت میں بھی ایسا شخص ہوگا جو اس میں بھی ان کی پیروی کرے گا۔

چنانچہ آج کل اس کا صاف مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ ساری اسلامی دنیا کے مسلمان مغرب کی مشابہت اختیار کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں عورتیں عورتوں کی اور مرد مردوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں زندگی کا کوئی شعبہ خواہ وہ سیاست کا ہو یا صحافت کا، تجارت کا ہو یا مناکحت کا، اخلاق ولباس اور زندگی کی بود و باش کے تمام اطوار میں مغرب یعنی یہود و نصاریٰ کا اتباع ضروری تصور کیا جاتا ہے، صرف اتنی سی بات ہے کہ یہود اپنے انبیاء کو بھی قتل کرتے تھے لیکن اب چونکہ انبیاء نہیں ہیں اس لئے اس امت کے لوگ انبیاء علیہم السلام کے وارثوں علماء و صلحاء کو قتل کرتے ہیں۔

ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الجحیم" لکھی ہے جو انتہائی اہم ہے۔ اس میں ایک اشکال کا جواب دیا ہے کہ جب اہل کتاب کی متابعت ناگزیر ہے جیسا کہ "لتتبعن" کے صیغہ تاکید سے معلوم ہوتا ہے تو پھر اہل کتاب کی مشابہت سے ممانعت کیوں فرمادی؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ

اس امت کی غالب اکثریت اہل کتاب کی پیروی کرے گی بمقتضائے حدیثِ باب لیکن پھر بھی آپؐ یہ چاہ رہے تھے کہ میری امت میں ایک طائفہ منصورہ بھی ہونا چاہئے جو یہود ونصاریٰ کی مشابہت سے دور رہے اور دور رہے گی چنانچہ جب صحابہ کرامؓ نے اس طائفہ ناجیہ کے بارے میں آپؐ سے پوچھا تو آپؐ نے جواباً فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کرامؓ کے طریقہ پر ہوگا وہ طائفہ منصورہ وناجیہ ہوگا۔

بعض حضرات نے ان فرقوں کی تقسیم ونشاندہی میں تکلف کیا ہے کسی نے کہا کہ بیس روافض کے ہیں ،بیس خوارج کے،قدریہ معتزلہ کے بھی بیس ہیں اور باقی چھوٹے چھوٹے فرقے ہیں جو کل ملا کر بہتر بنتے ہیں جبکہ ایک جماعت اہل السنۃ والجماعۃ کی ہے، کسی نے دوسرے طریقے سے عدد کو پورا کیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام فرقے مراد ہیں لہٰذا جو گزرے ہیں وہ بھی اس عدد میں شامل ہیں اور جو بھی باقی ہیں وہ بھی مراد ہیں، صرف اتنی بات یقینی ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ ناجی ہیں باقی ناری ہیں۔

تاہم یہ افتراق اصول وعقائد میں مراد ہے فرعیات واعمال کا اختلاف مراد نہیں لہٰذا فقہاء میں جو اختلاف ہے وہ ہرگز نجات کے منافی نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی تضلیل نہیں کرتا نیز ''ما انا علیہ واصحابی ''میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ میں جو چیز مشترک تھی وہ عقائد کی رہتی تھی۔ فروعی مسائل میں صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی اختلاف تھا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ نے ''عقائد الاسلام'' میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جن بہتر فرقوں کے بارے میں '' کلھم فی النار '' آیا ہے اس سے دوزخ کا دائمی عذاب مراد نہیں اس لئے دوزخ کا دائمی عذاب ایمان کے منافی ہے دائمی عذاب کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور چونکہ یہ بدعتی فرقے سب اہل قبلہ ہیں اس لئے ان کی تکفیر میں جرأت نہ کرنی چاہئے جب تک کہ دینی ضروریات کا انکار اور احکام شرعیہ کو رد نہ کریں۔اوران احکام کے جو دین سے ضروری اور بدیہی طور پر ثابت ہوں منکر نہ ہوں۔ (انتہی ملخصاً مکتوب: نمبر ۳۸ از دفتر سوم، عقائد الاسلام: ص: ۲۴۳، ادارۂ اسلامیات، لاہور)

یعنی جب تک کوئی فرقہ ضروریات دین کا صریح منکر یا مؤوِّل نہ بنے اس وقت تک ان کی تکفیر نہیں کرنی چاہئے مگر جو فرقہ کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے تو ان کا جنت میں جانا ممنوع ہو جاتا ہے علیٰ ہذا اہل قبلہ میں سے جو لوگ کفر سے کم درجے کی گمراہی کے مرتکب ہوں گے تو وہ گنہگاروں کی طرح دوزخ کے مستحق ہوں گے وہ اپنی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے اور یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کی رُو سے اسلاف نے فِرَقِ مبتدعہ کی

تکفیر سے اجتناب کیا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابن العربی مالکیؒ نے عارضۃ الاحوذی کے اس باب میں اہل الظاہر پر سخت ناراضگی و برہمی کا اظہار کیا ہے کہ یہ لوگ قیاس کے منکر ہیں حالانکہ قیاس پر تو معرفت باری تعالیٰ مبنی ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ یہ بات بالکل بجا ہے کہ قیاس معرفت باری تعالیٰ کا اہم ذریعہ بلکہ مبنی علیہ ہے چنانچہ عقائد نسفی کی عبارت ''حقائق الاشیاء ثابتة'' سے ہی شروع ہوجاتی ہے کیونکہ جب محسوسات کا علم ہوگا تو تب غائبات کا علم ممکن ہو سکے گا تفصیل شرح عقائد میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ابن العربیؒ نے اس بارے میں بہت سے اشعار بھی لکھے ہیں جو چاہے وہ عارضہ کے اس باب میں ملاحظہ کریں۔

اس حدیث سے ملتا جلتا مضمون ''باب فی لزوم الجماعة'' من ابواب الفتن میں گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ج:۶ص:۵۱۵ تاص:۵۲۲)

حدیث آخر:۔ ''ان الله تبارک وتعالیٰ خَلَقَ خلقه فی ظلمة فالقی علیهم من نوره فمن اصابه ذالک النور اهتدی ومن اخطاه ضَلَّ فلذالک اقول جَفَّ القلمُ علی علم الله''. (حسن)

بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر ان پر اپنی طرف سے کچھ نور ڈالا پس جس کو وہ نور پہنچا اس نے ہدایت پائی اور جس سے چُوک گیا وہ گمراہ ہوگیا، اس لئے میں کہتا ہوں کہ قلم سوکھ گیا ہے اللہ کے علم کے مطابق۔

قوله: ''خلقه'' مراد ثقلین یعنی جن وانس ہیں۔قوله: ''فی ظلمة'' مراد یا تو قوت بہیمیہ یا نفس امارہ بالسوء کی تاریکی ہے یا اخلاق رذیلہ ہیں یا پھر جہالت مراد ہے علی ھذا نور سے مراد علی الترتیب قوت ملکیہ، نور ایمان، اخلاق حسنہ اور نور معرفت باری تعالیٰ ہے جو دلائل اور سمجھنے کی صلاحیتیں ہیں۔

قوله: ''من نوره'' یعنی اپنی جانب سے ان میں ہدایت پانے کے ذرائع بھی ڈالے مثلاً قوت بہیمیہ اور نفس امارہ شہوات کی تکمیل پر آمادہ کرتے ہیں تو قوت ملکیہ اور نور ایمانی اطاعت باری تعالیٰ کی طرف راغب کرتے ہیں اسی طرح اخلاق سیئہ اور جہالت دونوں گمراہی پر اُکساتے ہیں جبکہ اخلاق حسنہ اور نور معرفت

ہدایت پر آمادہ کرتے ہیں۔

قولہ: "فمن اصابه الخ" یعنی جس پر اچھائی کا پہلو غالب آیا تو وہ ہدایت پر رہا جبکہ بُرائی کا دامن تھامنے والا یعنی جس میں فضائل مغلوب اور رذائل غالب ہیں وہ گمراہی پر رہتا ہے۔

قولہ: "ولذالک اقول جفّ القلم علی علم الله" کنایہ ہے عدم تغیر سے یعنی تقدیر لکھی جا چکی ہے اب اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ تقدیر کی تفصیل ابواب القدر میں گزری ہے۔ فلیراجع

حدیث آخر: ۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ میں نے کہا: "الله ورسوله اعلم" اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کا ان پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، آپؐ نے فرمایا تم جانتے ہو کہ جب لوگ ایسا کریں (یعنی صرف اسی کی عبادت کریں) تو ان کا اللہ پر کیا حق ہے؟ (یعنی لائق کیا ہے؟) میں نے کہا: الله ورسولهٗ اعلم، آپؐ نے فرمایا: وہ یہ ہے ان کو عذاب نہ دے۔ (حسن صحیح)

قولہ: "ماحقهم علی الله ؟" اللہ تبارک وتعالیٰ پر کوئی چیز واجب تو نہیں جیسا کہ عقائد نسفی اور شرح عقائد وغیرہ میں ہے البتہ اللہ عزوجل نے جن باتوں اور اعمال پر انعام مقرر کیا ہے اور ثواب کا وعدہ کیا ہے تو وہ اتنا زیادہ یقینی ہے کہ اسے شارع کے کلام میں عموماً ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جو وجوب پر دلالت کرتے ہیں جیسے "ومامن دابة فی الارض الّا علی الله رزقها"۔ (سورۂ ہود: آیت: ۶) یا جیسے باب کی حدیث میں "ماحقهم علی الله" ہے کیونکہ جب کبھی دنیوی بادشاہ کسی کو مدعو کرتا ہے اور اسے انعام دینے کا اعلان کرتا ہے تو نہ تو اسے مایوس کرتا ہے اور نہ اس کی توقع سے کم دیتا ہے بلکہ زیادہ ہی دیتا ہے تو جب دنیا کے ملوک کا یہ حال ہے تو مالک الملک و مالک یوم الدین کی شان تو بہت اونچی ہے۔

حدیث آخر: ۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیلؑ آئے اور مجھے انہوں نے خوش خبری سنادی کہ جو بھی مر جائے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرتا ہو تو وہ جنت میں جائے گا میں نے عرض کیا، اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے؟ انہوں نے فرمایا "ہاں"۔ (حسن صحیح)

یعنی جب آدمی کی موت عقیدۂ توحید پر آئے گی تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا اور شرک کے علاوہ کوئی گناہ

بھی اسے جنت سے دائما روک نہیں سکے گا آگے اللہ کی مرضی ہے کہ ابتداء ہی سے جنت میں داخل کردے بایں صورت کہ سارے گناہ معاف فرمادیں یا کچھ سزا بقدر گناہ دے کر پھر جنت میں بھیج دیں، مگر جنت میں ضرور داخل فرمائیں گے کیونکہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان اللہ لایغفران یشرک بہ ویغفرمادون ذالک لمن یشاء''۔

ان دونوں حدیثوں سے توحید کا اونچا مقام معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سے سابقہ حدیث میں جو حضرت معاذؓ سے مروی ہے عبادت کے بعد ''ولایشرکوا بہ شیئاً'' کی تصریح ہے یعنی صرف نماز و دیگر عبادات ہی کافی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ شرکیہ اعتقادات وعبادات سے بچنا بھی لازمی ہے لہٰذا جو کفار اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں جیسے نصاریٰ اور شرک بھی کرتے ہیں وہ اس خوش خبری کے مستحق نہیں ہیں۔

ابوذرؓ کی یہ حدیث صحیحین میں بھی آئی ہے بخاری شریف کے جنائز میں ہے: ''انہ من مات من امتی لایشرک باللہ شیئاً دخل الجنۃ فقلت الخ''۔ (بخاری: ص:۱۶۵ ج:۱) جبکہ کتاب بدء الخلق میں اس طرح ہے: ''من مات من امتک الخ''۔ (بخاری: ص:۴۵۷: ج:۱، قدیمی کتب خانہ) یعنی حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو یہ خوش خبری ان کی امت کے بارے میں سنادی۔

ابواب العلم

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علم سے مراد شریعت سے آگہی اور معرفتِ باری تعالیٰ کے لئے معاون علوم ہیں اگرچہ علوم کی اقسام تقریباً لاتعداد ہیں مگر سارے علوم ایک جیسے نہیں ہیں کوئی علم فرض ہے، کوئی نفل، کوئی مباح، کوئی مکروہ اور کوئی حرام یہ بعینہ اسی طرح کی تقسیم ہے جیسے اصول فقہ میں عمل اور حکم کی کی گئی ہے۔

ابن قیمؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام "مفتاح دار السعادۃ" لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکال دیا مگر اس کے بدلے میں جنت سے افضل دو چیزیں ان کو عطاء فرمادیں ایک علم دوسرا ارادہ (کسب) وہ لکھتے ہیں: "اذا کان کل من العلم والعمل فرضاً فلابدمنہما کالصوم والصلوٰۃ الخ" یعنی جس عمل کی جو حیثیت ہوگی اس کے لئے حصول علم کی بھی وہی حیثیت ہوگی علی ہذا فرض عمل کے لئے علم کا حصول فرض ہے اور نفل کے لئے نفل، تاہم چونکہ حرام سے بچنا بھی فرض ہے اس لئے رذائل اخلاق کا علم بھی فرض ہے تاکہ تکبر وحسد اور عجب وغیرہ کو پہچان کر ان سے بچا جائے، جبکہ عقائد کا علم بھی فرض ہے خواہ وہ عمل سے متعلق ہو یا توحید وغیرہ سے پس معلوم ہوا کہ جس علم سے امر مباح کا حصول مقصود ہو جیسے عصری علوم تو وہ درجہ مباح میں شامل ہیں گو کہ صحیح نیت سے اس کا درجہ عبادت تک پہنچ جاتا ہے، جبکہ وہ علوم جو معرفت باری تعالیٰ سے دور کرتے ہوں وہ دراصل جہالت درجامہ علم ہے جیسے جادو، علم موسیقی اور غلط ارادے سے حاصل کیا جانے والا علم۔

باب اذا اراد اللہ بعبد خیراً فقّھہ فی الدین

(جب اللہ کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے)

"عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من یرد اللہ بہ خیراً یُفَقِّھہ فی الدین" (ای یجعلہ عالماً فی الدین) (حسن صحیح)

اللہ جس کی خیر و بھلائی چاہتا ہے تو اسے دین کی سمجھ بوجھ عطاء فرماتا ہے یعنی فقیہ بناتا ہے۔

تشریح:۔ قوله: ''خیراً'' اس میں تنوین تعظیم کے لئے ہے ای خیراً عظیماً وعمیماً۔

قوله: ''یُفَقِّهه'' فِقہ لغت میں فہم وبصیرت کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میں دلائل سے احکام شرعیہ کے استنباط کے ملکہ کو کہا جاتا ہے پھر فَقِہَ بکسر القاف اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی بات کا مطلب ومراد سمجھے جبکہ فَقُہَ بضم القاف اس وقت کہتے ہیں جب آدمی فقیہ بن جائے یعنی اسے فقاہت کا ملکہ حاصل ہو جائے، علی ھذا کہا جائے گا کہ فقاہت میں مختلف درجات ہیں، قال اللہ تعالی: ''یرفع اللہ الذین آمنوا والذین أوتوا العلم درجات''۔

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ دین سمجھنے سے دینداری آسان ہو جاتی ہے کیونکہ جب آدمی شریعت کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوگا تو وہ دین وآخرت کے امور میں دلچسپی لے گا اور عمل بھی شریعت کے مطابق کرے گا۔ نیز اسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہوگا جس سے وہ جنت کے اعلیٰ وارفع درجات حاصل کرے گا بخلاف اس شخص کے جو دین کے مزاج اور اس کی افادیت سے ناواقف ہوا ایسا شخص عموماً دنیا کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اگر وہ امور دین پر عمل کرتا بھی ہے تو پوری طرح شرح صدر کے بغیر لگا رہتا ہے۔ جس سے نہ تو عبادت کا بھرپور لطف حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی آخرت میں کوئی اعلیٰ مقام پایا جا سکتا ہے بلکہ ایسا شخص عموماً عمل کے شوق میں شریعت کو نقصان پہنچاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ نیکی کر رہا ہے۔

بہرحال فقیہ شخص نہ صرف خود فائدہ میں رہتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی فائدہ دیتا ہے، صوفیہ کے نزدیک بغیر عمل کے نفس علم سے کوئی شخص فقیہ نہیں بن سکتا جیسا کہ حاشیہ پر حسن بصریؒ کا قول نقل کیا ہے۔

ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں: ''صدقوا'' یعنی انہوں نے سچ کہا ہے کیونکہ جو شخص نجات کو نہیں جانتا وہ کیسے فقیہ ہو سکتا ہے؟

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو شریعت کا ماہر بنانا چاہتا ہے تو اس کی عادت شریفہ ہے کہ اسے شوق علم، ذہانت اور عالی ہمت عطاء کرتا ہے اگرچہ بطور خرق عادت یہ بھی ممکن ہے کہ کسی غبی کو فقاہت عطاء فرمائے۔

بعض لوگ اپنے بچوں میں سے ذہین کو سکول میں داخل کرتے ہیں اور اغبیا کو مدرسہ میں، ان کو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ جس شخص کو اللہ نے علم کے لئے پیدا نہیں کیا ہے اسے کیونکر فقیہ بنایا جا سکتا ہے ایسے میں اہل مدارس کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بچوں کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھیں کہ کون سا بچہ علم پڑھنے کی اہلیت

رکھتا ہے کیونکہ علم ہر ایک کے لئے مفید نہیں بعض لوگ علم پڑھنے سے اپنے خراب مزاج کی وجہ سے بگڑ جاتے ہیں جیسے فرق مبتدعہ کے سارے پیشوا ایسے ہی تھے۔

باب فضل طلب العلم

(علم حاصل کرنے کی فضیلت)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سَلَكَ طريقاً يلتمس فيه علماً سَهّلَ الله له طريقاً الى الجنة". (حسن)

جو شخص کسی راستہ میں چلا، جس میں وہ علم (دین) تلاش کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردے گا۔

تشریح:۔قوله: "طريقاً" سے مراد تحصیل علم ہے خواہ اس کے لئے حسی راستہ اختیار کرکے سفر کرے یا نہ کرے عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اللہ کے راستے بہت ہیں ان میں سب سے افضل طلب علم ہے...... پھر آگے فوائد میں لکھتے ہیں: **"لاخلاف ان طريق العلم طريق الى الجنة بل اوضح الطرق اليها"** چونکہ علم حاصل کرنے سے شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، عمل کے لئے اسے سازگار ماحول مل جاتا ہے، عالم کا حلیہ ولباس بھی گناہ کرنے میں ایک رکاوٹ ہے اس لئے یہ بھی ایک طرح کی آسانی ہے کیونکہ شریعت بعینہ جنت کا راستہ ہے۔

اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ میدان محشر میں اور پل صراط پر علماء کے ساتھ خصوصی رعایت برتی جائے جس کی بناء پر وہ مشکلات وپریشانیوں سے بچیں اور بآسانی جنت میں داخل ہوں۔

چنانچہ ابن قیمؒ مفتاح دار السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ علماء کا مقام ودرجہ انبیاء علیہم السلام کے بعد یعنی صِدیقین کا ہے **"فمن طلب العلم لِيُحيِيَ به الاسلام فهو من الصديقين و درجته بعد درجة النبوة"**۔ (ص:۱۲۴، دار الکتب العلمیہ)

ابن کثیرؒ نے طبرانی سے حدیث نقل کی ہے:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يقول الله تعالىٰ لِلعلماء يوم القيمة اذا قعد على كرسيه لِقضاء عِباده انى لم اجعل علمى وحكمتى فيكم

الّاوانا اریدان اغفرلکم علی ماکان منکم ولااُبالی ". (اسنادہ جید)

(تفسیر ابن کثیر اوّل سورۃ طہٰ: ص:۱۴۶ ج:۳، قدیمی کتب خانہ)

تاہم یہ فضیلت ان علماء کو حاصل ہے جو احیائے دین کی غرض سے علم حاصل کرتے ہیں۔

حدیث آخر:۔ "من خرج فی طلب العلم فھوفی سبیل اللہ حتیٰ یرجع ". (حسن غریب)

جو شخص علمِ (دین) کی طلب میں نکلا تو وہ (مسلسل) راہِ خدا میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ واپس لوٹ کر آئے۔

قولہ: "من خرج " یعنی اپنے گھر وغیرہ سے نیز کسب یعنی مطالعہ وغیرہ بھی اس حکم میں ہے کیونکہ خروج کے اصلی معنی طلب کے ہیں لہٰذا جو شخص گھر بیٹھے بیٹھے مطالعہ کتب یا دوسرا علمی مشغلہ جاری رکھے شائد وہ بھی اس اجر کا مستحق ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

قولہ: "فھوفی سبیل اللہ الخ" سبیل اللہ دراصل جہاد کے لئے بطور اسم علم استعمال ہوتا ہے چونکہ مجاہد کا ثواب اور شہید کا درجہ معروف ومشہور ہے۔ اس لئے جس عمل کا ثواب جہاد کے برابر ہوتا ہے اس کی تشبیہ جہاد سے دی جاتی ہے پھر چونکہ یہ بھی جائز ہے کہ مُشَبَّہ کا درجہ مشبہ بہ سے زیادہ ہو جیسے "اللھم صل علی محمد و علی ال محمد کماصلیت علی ابراھیم الخ " لہٰذا اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاد کا سفر علم کے سفر سے زیادہ باعث اجر وثواب ہو کیونکہ طالب علم کے لئے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں......ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں اسی حدیث کے تحت لکھتے ہیں: "وسُبُل اللہ کثیرۃ منھاو افضلھاطلب العلم "......وہ مزید لکھتے ہیں......"لاخلاف ان طریق العلم طریق الی الجنۃ بل اوضح الطرق الیھا" اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علماء کے قلموں کی روشنائی شہید کے خون کے ساتھ تولی جائے گی تو سیاہی بھاری ثابت ہوگی۔

حدیث آخر:۔ "من طلب العلم کان کفّارۃ لِمَامَضَی". (ضعیف)

جس نے طلب کیا علم کو تو وہ اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔

قولہ: "کفارۃ لمامضی" اگر مراد صغائر ہوں تو چونکہ اس مضمون کی بہت ساری احادیث وارد ہیں اس لئے کہا جائے گا کہ حدیث باعتبار سند کے ضعیف ہے جبکہ مضمون کے لحاظ سے صحیح ہے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"ولا اشکال فی ان الحسنات یذھبن السیئات......ولا اشکال فی ان طریق العلم طریق الجنة لان مِن سُبل اللہ الشریعة اواشرف سُبل اللہ".

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماسبق سے مراد وہ حقوق اللہ ہوں جن کا تدارک نہیں ہوسکتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ وہ حقوق العباد بھی معاف ہوتے ہوں جن کا تدارک نہیں ہوسکتا جیسے کسی سے معمولی لڑائی کی ہے مگر وہ آدمی اب زندہ نہیں رہا وغیرہ ذالک۔

باب ماجاء فی کِتمان العلم

(علم چھپانے کا بیان)

"عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :من سُئِل عن علمٍ عَلِمَه ثم کَتَمَه اُلجِمَ یوم القیٰمه بِلَجَامٍ من نار". (حسن)

جو سوال کیا جائے ایسے علم (مسئلہ) کے بارے میں جس کو وہ جانتا ہو پھر وہ اسے چھپائے (یعنی نہ بتائے) تو قیامت کے دن وہ لگام دیا جائے گا آگ کی۔

تشریح:۔قوله:"من سئل عن علم" یعنی جس کی سائل ومستفتی کو ضرورت ہو اور وہ جواب کو سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔قولـه:"ثم کتمه"لفظ ثم یہاں پر برائے استبعاد ہے یعنی عالم کی شان تو اشاعتِ دین اور تعلیم ہے پس جو عالم باوجودِ تقاضا کے نہیں بتاتا تو گویا وہ ایک تعجب خیز روش اپنائے ہوئے ہے، پھر کتمان عام ہے خواہ زبانی طور پر بتانے سے گریز کرے یا پھر کتاب کی ضرورت کسی کو پیش آجائے اور یہ اسے نہ دے تاہم آج کل لوگوں میں امانت داری بہت کم ہے وہ کسی کی چیز لے کر پھر واپس نہیں کرتے ہیں خصوصاً کتاب کے معاملہ میں لوگ بہت لاپرواہی کرتے ہیں ایسے میں کتاب نہ دینا اس وعید میں نہیں آتا......ہاں ذمہ دار وامانت دار آدمی سے کتاب روکنا اس وعید میں آئے گا۔

قولـه:"الجم الخ" بصیغہ مجہول یعنی جس طرح اس نے دنیا میں اپنی زبان لگام کی مانند بنا کر جواب دینے سے گریز کیا اسی طرح اسے لگام پہنا کر خاموش کردیا جائے گا کیونکہ گناہ وسزا میں مناسبت ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم چھپانے کی اجازت نہیں ہے خصوصاً جب کوئی شخص طالب وسائل بن کر عالم کے پاس آئے تو یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

2/1

(۱) کیونکہ جواب نہ دینے سے سائل جہل کے اندھیرے میں رہے گا۔

(۲) سائل عمل کے ثواب سے محروم ہوگا۔

(۳) خاموشی یا جواب سے انکار کی صورت میں وہ عالم آپؐ کی وصیت جو اگلے باب میں مروی ہے پر عمل نہیں کر سکے گا۔

(۴) اور یہ کہ کتمانِ علم ایک طرح کتمان شہادت بھی ہے۔

(۵) نیز یہ ایسا بخل ہے جس میں دونوں طرفین کو نقصان ہے تاہم اگر وہ سائل ایسا ہو جو مسئلہ کے جواب کو نہ سمجھتا ہو یا غیر مفید یا فضول سوال کرتا ہو یا اس جواب کے اظہار میں کوئی نقصان متوقع ہو یا کسی دیگر مصلحت کے پیش نظر جواب دینا شرعاً ضروری نہ ہو تو پھر وہ کتمان اس وعید میں نہیں آتا۔ خاص کر عوام جب غیر معمولی فضائل سنتے ہیں تو پھر عمل میں سُست ہو جاتے ہیں۔ (تدبر وتذکر)

باب ماجاء فی الاستیصاء بمن یطلب العلم

(طالب کے لئے آپؐ کی وصیت کا بیان)

"عن ابی هٰرون قال کُنّا نأتی اباسعیدفیقول مرحباً بوصیّة رسول الله صلی الله علیه وسلم، ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: ان الناس لکم تَبَعٌ وان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقّهون فی الدین واذا اَتَوکُم فاستوصُوابهم خیراً".

ابوہارون فرماتے ہیں کہ ہم (طلبہ) حضرت ابوسعید خدریؓ کے پاس آتے تھے تو وہ فرماتے تھے خوش آمدید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: لوگ تمہارے تابع ہیں اور یہ کہ تمہارے پاس کچھ لوگ دنیا کے (مختلف) اطراف سے آئیں گے تاکہ وہ (تم سے) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں چنانچہ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے لئے میری وصیت یاد رکھو!

تشریح:۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر ضعف کا حکم نہیں لگایا ہے تاہم اس کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ روایت صرف ابی ہارون کی وساطت سے مروی ہے چونکہ ابوہارون ضعیف شیعہ ہے اس لئے کہا جائے گا کہ یہ روایت ضعیف ہے گو اس کا مضمون صحیح ہے۔

باب کی اگلی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ وہ طلبہ مشرق کی جانب یعنی عراق وغیرہ سے آئیں گے چنانچہ ابوہارون کہتے ہیں کہ ابوسعید خدریؓ جب ہمیں دیکھتے تو ہمیں ترحیب وخوش آمدید کہتے اوراس کی وجہ آپؐ کی وصیت پرعمل قرار دیتے کیونکہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ جب لوگ علم حاصل کرنے کی غرض سے آپ کے پاس آئیں توان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، وہ سلوک خواہ مالی ہو یا قولی وعملی۔

ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں لکھا ہے کہ حدیث میں ''خیــراً'' سے مراد تعلیم ہے یعنی جب تابعین تمہارے پاس آجائیں تو تم چونکہ میرے صحابہ ہو، میرے مکارم اخلاق ودیگر تعلیمات سے آگاہ ہو لہٰذا اُن کو اِن کی تعلیم دیا کرو علیٰ ہذا پھر حدیث کا مضمون صحیح ہوجائے گا، کیونکہ ایک اور صحیح حدیث میں ہے: ''تسمعون ویُسمع منکم ویُسمَع مِمّن یسمَعُ منکم'' اسی طرح ''فلیبلغ الشاھدالغائب'' وغیرہ بہت ساری احادیث ہیں۔قولہ: ''تبع'' بفتحتین تابع کی جمع ہے جیسے خدم جمع خادم ہے۔اس سے تابعین کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوئی یعنی مکارم اخلاق اورشریعت سیکھنے میں ساری امت صحابہ کرامؓ کی تابع ہے، الاول فالاول۔

قولہ: ''فاستوصوابھم خیراً'' سین طلب کے لئے ہے اورکلام میں تجرید ہے یعنی اپنے نفسوں سے ایک شخص منتزع کرکے اس سے طلبہ کے بارے میں وصیت طلب کریں یا مطلب یہ ہے کہ ان کے بارے میں میری وصیت قبول کرو! غور سے سنو! اوراس پرعمل کرو۔

باب ماجاء فی ذھاب العلم

(علم اُٹھ جانے کا بیان)

''عن عبدالله بن عمروبن العاص قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :ان الله لایقبض العلم انتزاعاً ینتزعه من الناس ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتیٰ اذالم یترک عالماً اِتخذالناس رءُ وساً جُھّالاً فسُئِلوا فَاَفتَوابغیرعلم فضلُّوا واضلّوا''. (حسن صحیح)

بے شک اللہ تعالیٰ قبض نہیں کرے گاعلم کو یکبارگی چھین کرکہ اس کولوگوں سے چھین لے لیکن علم کوقبض کرے گاعلماء کےقبض (وفات) کرنے کے ذریعہ، یہاں تک کہ جب نہیں چھوڑے گا کسی عالم کوتولوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے چنانچہ وہ سردار مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بغیرعلم کے فتوے دیں گے پس وہ (سردار) خود بھی گمراہ ہوں گے اوردوسروں کوبھی گمراہ کریں گے۔

تشریح:۔ قولہ: "اِنتزاعاً" یقبض کا مفعول مطلق بمعنی قبضا کے ہے یا ینتزعه کا مفعول مطلق مقدم ہے۔ قولہ: "رُءُوساً" بضم الہمزۃ وبعدھا واؤ رأس کی جمع ہے جبکہ اس کو بعض طرق میں رُءساءَ بھی پڑھا گیا ہے یعنی بفتح الہمزۃ بلا واؤ آخر میں دوسرا ہمزہ بھی ہے رئیس کی جمع ہے مطلب ومعنی دونوں قرأتوں کا ایک ہے کیونکہ رأس اور رئیس دونوں سردار کو کہتے ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ علم ختم ہو جائے گا مگر اس کے ختم ہونے کی صورت یہ نہیں ہوگی کہ لوگوں کے سینوں سے پرواز کر کے چلا جائے بلکہ ایک ایک عالم کا انتقال ہوتا رہے گا اور پیچھے خلاء پُر کرنے کے لئے کوئی نہیں ملے گا اس طرح ایک دور ایسا آجائے گا کہ کوئی عالم بھی نہیں بچے گا۔ پس لوگ جاہل آدمیوں کو اپنا سردار ومفتی بنالیں گے پھر وہ ان سے مسائل پوچھیں گے اور وہ ان کو بغیر علم کے جوابات دیں گے یعنی اپنی سمجھ ورائے کے مطابق اس طرح وہ سردار خود بھی گمراہ ہوں گے کہ غلط فتوی اور غلط عمل بتائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیں گے کہ دوسرے ان کے غلط فتوؤں پر عمل کر کے گمراہی اپنائیں گے۔

اس حدیث سے تعلم کی ترغیب معلوم ہوئی کہ اگر تعلم کا سلسلہ خدانخواستہ منقطع ہو جائے تو علماء ختم ہو جائیں گے اور نتیجتاً جہالت وگمراہی جنم لے گی۔

نیز جاہل کو رئیس بنانے اور بغیر علمِ شریعت کے فتوی دینے کی ممانعت بھی معلوم ہوئی، علاوہ ازیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتہاد وفتوی کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ پہلی امتوں میں ایسا ہوتا تھا کہ علم سینوں سے غائب ہو جاتا تھا، اب صرف علماء کے قبض سے اٹھتا ہے نیز عدم عمل سے بھی علم ضائع وختم ہو جاتا ہے نیز عدم تدریس سے اور علمی مشغلہ ترک کرنے سے بھی علم ختم یا کم ہو جاتا ہے کیونکہ "العلم غرس وماء ہ درس" نیز گناہ کرنے سے بھی علم کم ہو جاتا ہے، لہٰذا کہا جائے گا کہ یہ حدیث عام حالات کے بارے میں ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپؐ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھائی، پھر آپؐ نے فرمایا یہ ایسا وقت ہے کہ لوگوں سے علم (وحی) اُچک لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کی کسی چیز پر قادر نہیں رہیں گے، تو حضرت زیاد بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیسے اُچک لیا جائے گا (علم) ہم سے جبکہ ہم نے قرآن پڑھا ہے اور بخدا ہم اسے ضرور پڑھتے رہیں گے اور پڑھائیں گے اس کو اپنی عورتوں اور بچوں کو! آپؐ نے فرمایا اے زیاد! تجھ پر روئے تیری ماں! میں تو یقیناً تجھے

مدینہ کے سمجھ دار لوگوں میں شمار کرتا تھا، یہ توراۃ وانجیل بھی تو یہود ونصاریٰ کے پاس ہیں مگر ان کو کتنا فائدہ ہو رہا ہے؟ حضرت جبیر بن نفیر فرماتے ہیں اس (حدیث کو سننے) کے بعد میری ملاقات عبادہ بن صامتؓ سے ہوئی تو میں نے ان سے کہا کیا آپ نے سُنا نہیں جو آپ کے بھائی ابو درداءؓ نے کہا؟ چنانچہ میں نے وہ بات جو ابو درداءؓ نے کہی تھی ان کو بتادی، تو انہوں نے فرمایا ابو درداء نے سچ کہا ہے، اگر آپ چاہیں تو میں تجھے ضرور بتادوں کہ سب سے پہلا علم جو لوگوں سے اٹھایا جائے گا وہ خشوع ہے قریب ہے کہ تو جامع مسجد میں داخل ہوگا مگر اس میں کوئی عاجزی کرنے والا نہیں دیکھے گا۔ (حسن غریب)

قوله: "فشخص" اٹھالیا۔ **قوله:** "اَوَانُ" ای وقت۔ **قوله:** "یُختَلَسُ" بصیغہ مجہول ای یُسلب بسرعۃ چھین لیا جائے گا اور اُچک لیا جائے گا۔ **قوله:** "العلم" اس سے مراد کیا ہے؟ تو ایک احتمال یہ ہے کہ مراد وحی ہے اور آپؐ کو آگاہی ہوئی کہ آپؐ کا سفر آخرت عنقریب شروع ہونے والا ہے، لہٰذا آپؐ کے وصال کے بعد لوگوں کا عالم بالا سے ہر قسم کا تعلق وحی ختم ہو جائے گا کیونکہ آپؐ آخری نبی ہیں علی ہذا "حتیٰ لا یقدروا منه علی شیء" کا مطلب یہ ہوا کہ لوگ رسول کی زبانی پھر کچھ نہ سُن سکیں گے کہ وہ اس دار فانی میں نہیں ہوں گے، مگر یہ پیش گوئی چونکہ مطلق نفی علم کو مستلزم تھی کیونکہ اس طرح علم کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہو جائے گا اس لئے حضرت زیاد نے اس کی صورت پوچھی۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یختلس الخ سے مراد نفس علم کی نفی ہو کہ علم کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہو جائے گا حتیٰ کہ لوگ پھر کچھ بھی علم شریعت کے حصول پر قادر نہیں ہوں گے اس پر حضرت زیاد نے بطور استفہام کے پوچھا کہ علم کا سلسلہ تو ہم جاری رکھیں گے بایں طور کہ ہم اپنی اولاد کو پڑھائیں گے اور وہ اگلی نسل میں منتقل کردے گی اس طرح یہ سلسلہ تو بظاہر جاری ہی رہے گا۔

اور آپؐ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ علم صرف قرأت کرنے اور روایت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ علم نجات وفلاح کا ایک ذریعہ ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب اس پر عمل کیا جائے اگر کوئی علم شریعت پر عمل سے عاری ہو تو وہ بجائے نجات کے ہلاکت خیز ثابت ہو جاتا ہے اس مقصد کے سمجھانے کے لئے آپؐ نے اہل کتاب کی مثال دی جو باوجود علم کے گمراہ ہیں۔ نیز عمل سے علم زندہ بلکہ زیادہ پختہ ہو جاتا ہے جبکہ بغیر عمل والا علم بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔

غرض علم اور عمل دونوں ع، م، ل مادہ سے مرکب ہیں لہٰذا ان کا آپس میں ایک دوسرے سے تعلق جسم

وجان کی طرح ہے جوان کو الگ کرے گا وہ ان کو باقی نہیں رکھ سکے گا، لہٰذا علم کو عمل کے لئے سیکھنا چاہئے اور اس پر عمل کرنا چاہئے ورنہ علم اٹھ جائے گا پھر اس کے حصول کی کوئی صورت ممکن نہیں رہے گی۔اس لئے حضرت عبادہ بن صامتؓ نے علم کے اٹھنے کی دلیل اور مثال میں خشوع کا ختم ہونا پیش کیا کیونکہ عاجزی علم کے لوازمات میں سے ہے اور نفی لازم سے ملزوم کی نفی ہو ہی جاتی ہے۔(تدبر)

باب ماجاء فی من یطلب بعلمه الدنیا

(علمِ دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ نہ بنایا جائے)

"عن كعب بن مالك قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من طَلَبَ العلم لِيُجارِيَ به العلماء اوليُمَارِيَ به السُفهاء اويَصرِفَ به وجوهَ الناس اليه اَدخله الله النار". (غريب)

حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جس نے علم حاصل کیا اس لئے تا کہ وہ اس کے بل بوتے پر علماء سے مقابلہ (اور برتری حاصل) کرے یا اس کے ساتھ نادانوں سے تکرار و حجت بازی کرے یا اس کے ذریعہ (امیر) لوگوں کے رُخ اپنی طرف مبذول کرائے تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل کریں گے۔

تشریح:۔قولہ: "لِيُجَارِی" جریاً اور جراءً چلنے اور دوڑنے کو کہتے ہیں یعنی وہ شخص صرف اس لئے علم حاصل کرتا ہے تا کہ وہ علماء کے شانہ بشانہ چلے یا ان کے ساتھ علمی دوڑ میں شامل ہو کر مقابلہ کرے جس سے لوگوں میں چرچا اور شہرت پیدا ہو۔**قولہ:** "اولیُماری" مِریۃ بمعنی شک سے ہے کیونکہ بحث کرنے سے آدمی کو خود بھی شک لاحق رہتا ہے اور دوسرے کو بھی شک میں ڈالتا ہے، اس لئے مِریۃ کو بمعنی جھگڑا بھی لیا گیا ہے اور اگر مِراء سے ہو تو پھر بھی معنی جھگڑا اور بحث و تکرار کے ہیں۔

قولہ: "او یصرف به الخ" لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیر دینے کا مطلب بظاہر مالداروں کی توجہ حاصل کرنا ہے تا کہ ان سے دنیوی مفادات حاصل کر سکے تاہم حاشیہ پر مرقات سے نقل کیا ہے کہ اس میں عوام اور طلبہ کی توجہ حاصل کرنے کی نیت بھی مراد ہے تا کہ اس کی تعظیم و اکرام اور شہرت خوب ہو۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے اگر نیت بگڑ گئی تو کچھ بھی نہیں بچے گا پس اگر نیت علماء

سے مناظروں کی ہو تو حسد کی بناء پر ثواب ختم، اسی طرح حال بے وقوفوں یعنی عوام کے ساتھ مماراۃ کی نیت کا ہے جبکہ تیسرے جملے یعنی لوگوں میں شہرت کا شوق دین کو دنیا کے عوض بیچنے کے مترادف ہے، ایسے شخص کا خاتمہ بالخیر خطرہ میں ہے۔ والعیاذ باللہ

غرض فسادِ نیت انتہائی خطرناک فتنہ ہے اس لئے ہر طالب علم کو نیت کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے تاکہ اس کی نحوست سے خاتمہ بالخیر متاثر نہ ہو تاہم یہ وعید علم شریعت کے بارے میں ہے جبکہ دنیوی تعلیم کا حکم بس دنیاوی عمل کی طرح ہے جو عمل اچھا ہے یا مباح ہے تو اس کی تعلیم بھی اسی طرح ہے اور جو عمل ناجائز ہے تو اس کی تعلیم بھی ناجائز ہے گو کہ زندگی بھر دنیوی عمل اور علم دونوں میں انہماک مذموم ہے خصوصاً جب اس سے غفلت جنم لیتی ہو۔

تحصیل علم میں نیت کیا ہونی چاہئے؟ تو تفسیر خازن میں آیت: ''فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقّهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون ''۔ (توبہ: آیت: ۱۲۲) کے تحت لکھا ہے:

"وفي الآية دليل على انه يجب ان يكون المقصود من العلم والتفقّه دعوة الخلق الى الحق وارشادهم الى الدين القويم والصراط المستقيم فكل مَن تفقّه وتعلّم بهذا القصد كان على المنهج القويم والصراط المستقيم ومن عَدَلَ عنه وتعلّم العِلم لطلب الدنيا كان من الاخسرين اعمالاً".

حدیث آخر:۔ "من تعلّم علما لغير الله او اراد بِهٖ غير الله فليتبوّأ مقعده من النار".

جس نے اللہ (کی رضاء) کے سوا (کسی اور مقصد) کے لئے علم سیکھا یا فرمایا کہ اس نے (حصول رضائے) باری تعالیٰ کے علاوہ کسی اور مقصد کا ارادہ کیا تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔

قولہ: ''او اراد به'' بظاہر لفظ ''او'' ''شک من الراوی کے لئے ہے ابوداؤد ''باب فی طلب العلم لغیر اللہ'' میں حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے:

"من تعلم علما مما يُبتغىٰ به وجه الله لا يتعلمه الا ليصيب به عرضاً من الدنيا لم يجد عَرَفَ الجنة يوم القيٰمة يعني رِيحَهَا". (ص: ۵۱۵ ج: ۲، میر محمد کتب خانہ)

ان دونوں حدیثوں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ علمِ شریعت کے حصول میں نیت خالص لوجہ اللہ

ہونی چاہئے دوسری بات یہ کہ جو غلط نیت سے پڑھے گا تو وہ جنت میں ان لوگوں کے ساتھ داخل نہیں ہو سکے گا جو بہشت میں پہلے داخل ہوں گے اب جہنم میں کب تک پڑا رہے گا یہ صرف اللہ جانتا ہے۔

پھر جس طرح فساد نیت نقصان دہ ہے تو اسی طرح بغیر کسی نیت کے محض بے مقصد پڑھنا بھی کوئی اچھا کام نہیں کیونکہ اتنا بڑا عمل جس کا ثواب بھی بے تحاشا زیادہ ہے اور اس کے لئے وقت بھی بہت زیادہ درکار ہے بغیر کسی مقصد کے کرنا جیسے بعض طلبہ کرتے ہیں ضیاع وقت بھی ہے اور علم کی بے حد ناقدری بھی ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر کوئی حکم نہیں لگایا ہے مگر عارضۃ الاحوذی میں ابن العربیؒ فرماتے ہیں: ''وھو حدیث صحیحُ المعنی ضعیفُ المسندو المبنی'' یعنی اس حدیث کا مضمون صحیح ہے کہ دوسری روایات اور اصول کے موافق ہے اگرچہ سند کمزور بلکہ ضعیف ہے۔

باب ماجاء فی الحَثِّ علی تبلیغ السماع

(یاد کی ہوئی احادیث دوسروں تک پہنچانے کی فضیلت و ذمہ داری)

''عن ابان بن عثمان قال خرج زید بن ثابت من عند مروان نصف النہار قلنا مَابَعَث الیہ ھذہ الساعۃَ اِلّالِشیء یسالہ عنہ، فقمنا فَسَألناہ فقال نعم سَألَنَا عن اشیاء سمعناھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: نَضَّرَ اللہ امرءً سمع منا حدیثا فحفِظہ حتیٰ یُبَلِّغَہ غیرَہ فَرُبَّ حامل فقہ الی من ھو افقَہُ مِنہ ورُبّ حامل فِقہٍ لیس بِفَقِیہٍ''. (حسن)

حضرت ابان بن عثمان بن عفانؓ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ دوپہر کے وقت مروان کے یہاں سے نکلے، تو ہم نے کہا کہ مروان نے اس (آرام اور گرمی کے) وقت ان کے پاس بلاوا اسی ہی لئے بھیجا ہوگا تاکہ ان سے کوئی (اہم) بات پوچھے، چنانچہ ہم کھڑے ہوئے اور ان سے اس بات کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے فرمایا ہاں مروان نے ہم سے کچھ ایسی ہی باتیں پوچھیں جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے سُنا ہے: اللہ اس شخص کو ترو تازہ رکھیں جس نے ہم سے کوئی حدیث سُنی، پھر اسے یاد رکھا یہاں تک کہ اس کو دوسروں تک پہنچائے کیونکہ کبھی کبھار فقہ لئے پھرنے والے ایسے شخص تک لے جاتے ہیں (یعنی پڑھاتے سناتے اور پہنچاتے ہیں) جو اس اٹھانے والے سے زیادہ

سمجھ دار ہوتا ہے، اور بعض فقہ (کے مسائل والفاظ) کے یاد کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے ہیں

حدیث آخر:۔ "نضر الله امرءً سمع مناشيئاً فَبَلَّغَه كماسمعه فرب مُبَلَّغٍ اوعىٰ من سامع". (حسن صحيح)

اللہ تروتازہ رکھے اس کو جو ہم سے کوئی چیز سنے (یا دیکھے) پھر اسے اسی طرح آگے پہنچائے (دوسروں تک) جیسی اس نے سنی ہو کہ بعض پہنچائے ہوئے سننے والوں سے زیادہ یاد کرنے والے ہوتے ہیں (یعنی مطلب کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں)۔

تشریح:۔ قوله: "مابعث اليه هذه الساعة اِلّالشيء يسأله عنه" بعث کا فاعل مروان ہے یعنی ما بعث مروان الى زيدبن ثابت هذه الساعة الخ چونکہ اسلاف کی عادت حکمرانوں کے پاس جانے کی نہ تھی مگر جب ان کو طلب کیا جاتا تھا تو تب جاتے اور وقت بھی دوپہر کا تھا جس میں عموماً لوگ قیلولہ کرتے ہیں اس لئے اس وقت مروان کے پاس جانا بلاوجہ نہیں ہوسکتا تھا تو سوال کی ضرورت پیش آئی۔

قوله: "نعم سَألَناعن اشياء الخ" دفع توہم ہے یعنی میں اس لئے بلاتاخیر مروان کے پاس آیا تھا کہ ان کو بعض احادیث سننے کی طلب تھی اور ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی تبلیغ میں ہرگز سستی نہیں کرتے کیونکہ ایک تو یہ ہماری ذمہ داری ہے دوم اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔

قوله: "نضر الله الخ" مخفف پڑھنا بھی صحیح ہے لیکن بتشدید الضاد باب تفعیل سے پڑھنا اصح ہے نضرة چہرے کی رونق کو کہتے ہیں جو نعمتوں اور خوشیوں کے ملنے سے نصیب ہوتی ہے۔ قوله: "سمع منا حديثا" اگلی روایت میں بجائے حدیثاً کے شیئاً ہے جو عمل کو بھی شامل ہے تاہم اُس روایت کی ابن ماجہ والی سند میں بجائے شیئاً کے حدیثاً کا لفظ ہے پھر منا جمع کے صیغے میں بقول طیبیؒ کے صحابہ کرامؓ کو بھی شامل کرنا مراد ہے۔

قوله: "فبلّغه كماسمعه" اس سے بعض حضرات نے روایت بالمعنی کی ممانعت پر استدلال کیا ہے تاہم جمہور کے نزدیک روایت بالمعنی بشروطٍ جائز ہے تفصیل وصول حدیث وغیرہ کتب میں ہے سیوطیؒ نے الاتقان میں وحی جلی اور وحی خفی یعنی قرآن وحدیث میں فرق کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ومن ههنا جازرواية السنة بالمعنى لان جبرئيل ابداه بالمعنى ولم تجز القراءة (اى قراءة القرآن) بالمعنى لان جبرئيل ابداه باللفظ ولم يُبح له اِيحائه بالمعنى الخ".

قولہ: "فرب حامل فقه الخ" اس میں راویوں کی تین قسمیں بیان کرنا مقصود ہے: (۱) جوفقیہ ہو (۲) جوافقہ ہو (۳) جوغیر فقیہ ہو۔ پہلی قسم: صیغہ افقہ اسم تفضیل سے معلوم ہوا کہ راوی فقیہ ہوتا ہے لیکن محمول الیہ یعنی جس تک پہنچائی جاتی ہے وہ حامل سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔ دوسری قسم: لفظ رُبّ سے معلوم ہوئی کیونکہ رُبّ تقلیل کے لئے آتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اکثر تو حامل افقہ ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار محمول الیہ زیادہ فقیہ ہوتا ہے جبکہ قسم سوم کی تصریح آخر میں کی گئی ہے ورب حامل فقه ليس بفقيه كذافي الكوكب الدرى۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث متعدد طرق سے مروی ہے اور صحیح ہے اگر چہ امام ترمذیؒ نے حسن کی تصریح کی ہے۔

قوله: "فرب مُبَلَّغ اوعىٰ من سامع" مُبَلَّغ باب تفعیل سے صیغہ اسم مفعول ہے یعنی محمول الیہ لہذا لام پر فتحہ پڑھا جائے گا۔ اوعیٰ بمعنی احفظ کے آتا ہے لیکن یہاں مراد افقہ ہے جیسا کہ سابقہ حدیث میں تصریح ہے۔

اس حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سیکھنے اور دوسروں تک پہنچانے کی خصوصاً قابل وذھین لوگوں وطلبہ کو پڑھانے کی انتہائی جامع خوش خبری ثابت ہوئی چونکہ نااہلوں کو پڑھانے سے علم کا ضیاع ہوتا ہے اس لئے بعض علماء نے اس سے منع فرمایا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے کشکول میں مطرف بن عبداللہ بن شخیر کا قول نقل کیا ہے: "لاتطعم طعامک من لايشتهيه قال مهدى كانه يعنى الحديث"۔ (بحوالہ طبقات: ص: ۱۰۵ ج: ۷)

اور مشکوٰۃ میں ابن ماجہ وبیہقی کی ایک ضعیف حدیث ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم وواضع العلم عندغير اهله كَمُقَلِّدِ الخنازير الجواهرَ واللؤلؤ والذهبَ"۔ اس پر ملا علی قاریؒ نے مرقات میں لکھا ہے: "بان يحدّث من لايفهمه اومن يريدمنه غرضاً دنيوياً اومن لايتعلمه لله"۔

باماجاء فی تعظیم الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(من گھڑت احادیث بیان کرنے کی سخت ممانعت)

"عن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :من كَذَبَ عَلَيَّ متعمداً فَلْيَتَبَوَّأْ مقعده من النار". (حسن صحيح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے

مجھ پر جان بُوجھ کر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

تشریح:۔ حاشیہ پر مرقات اور طیبی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ابن صلاح نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے کہا جاتا ہے کہ باسٹھ صحابہ کرامؓ جن میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں سے یہ حدیث مروی ہے گویا یہ صرف اسی حدیث کی خاصیت ہے جو عشرہ مبشرہ کی جماعت سے مروی ہے بیس صحابہ کرامؓ کے نام تو امام ترمذیؒ نے بھی وفی الباب میں ذکر کئے ہیں۔

قوله: "عَلَيَّ متعمداً" تعمد قید سے وہ صورت وعید سے خارج ہوگئی جس میں وہم یا نسیان کی بناء پر حدیث میں غلطی آجائے یا کسی سے روایت سنی ہو اور خیال یا یقین یہ ہو کہ یہ حدیث صحیح ہے حالانکہ وہ موضوع تھی تو وہ بھی معاف ہے بشرطیکہ اس میں روایت کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

ملا علی قاریؒ نے مرقات میں اور ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے کہ بعض صوفیہ جو ترغیب وترہیب کے حوالے سے احادیث بناتے ہیں اور جواز میں یہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے تو "عَلَيَّ" فرمایا ہے یعنی میرے خلاف جو بنائے گا جبکہ ہم تو "لَهُ" یعنی نبی علیہ السلام کے مقصد کے مطابق بناتے ہیں جو ان کے خلاف نہیں بلکہ ان کے حق میں ہیں، تو یہ محض جہالت ہے کیونکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میری طرف ایسی بات منسوب کرے جو میں نے نہ کی ہو تو "فليتبوأ مقعده من النار" امر بمعنی اخبار ہے جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں ہے: "فانه من كَذَبَ عَلَيَّ يَلِجُ النار" بے شک جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ اس کو امر کے صیغہ سے بیان کرنے کی حکمت تہدید اور تہکم ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ تغلیظ اور تشدید کا معنی دے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ:

"ان الامة اجمعت على ان الكذب على الله يكون به الرجل كافراً في نسبته ما لايجوز اليه في ذاته اوصفاته اوافعاله وكذالك عن النبى صلى الله عليه وسلم فى مثله الخ".

یعنی اللہ کی ذات وصفات میں غلط بیانی سے آدمی کافر ہو جاتا ہے خواہ آدمی ازخود ایسی غلط بیانی کرے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کرے کہ مثلاً آپؐ نے یوں فرمایا ہے۔ البتہ اگر وہ ایسا جھوٹ بولے جس سے شریعت میں کمی یا بیشی آتی ہو تو یہ گناہ کبیرہ ہے مگر ایمان سے خارج نہیں ہوگا: "الا ان يقصد بذالك

الاستخفاف بالشریعة فهو کافر ''یعنی اگر شریعت میں کمی بیشی کرنے کے لئے جھوٹ بناتا ہو اور مراد شریعت کی بے وقعتی ہو تو یہ کفر ہے۔

غرض حدیث بیان کرتے وقت انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے حتیٰ کہ حاشیہ پر تو غلط عبارت پڑھنے کو بھی یہ وعید شامل کی گئی ہے۔

آج کل حدیث نقل کرنے کی شرائط:۔ان احادیث میں جو سخت وعید آئی ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ خطاب صحابہ کرامؓ سے ہے وبس کیونکہ صحابہ کرامؓ تو سارے عدول ہیں وہ تو آپؐ پر جھوٹ باندھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے کہا جائے گا کہ وعید قیامت تک آنے والی تمام امت کے افراد کے لئے ہے، تاہم اتنا سا فرق ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جس زمانہ میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی تو راویوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ مختلف اساتذہ کے پاس جا کر ان کی احادیث زبانی سنتے اور لکھتے طلبہ کے سامنے کوئی چھپی ہوئی کتاب یا پہلے سے تیار شدہ مسودہ نہیں ہوتا تھا بلکہ استاذ اپنے ہی مسودہ سے احادیث سناتا اور طلبہ اس املاء کو ضبط کرتے تھے، جس کی تفصیل اصول حدیث اور تاریخ وغیرہ کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

آج کل چونکہ احادیث ساری مرتب ہو گئی ہیں اور کتابیں چھپ چکی ہیں لہٰذا اب راویوں کی وہ سخت شرائط تو اساتذہ کے لئے لازمی نہیں کہ مثلاً جوان ہونا، حافظہ قوی ہونا وغیرہ تاہم ورع اور سمجھداری کی قید اب بھی ملحوظ رکھنا چاہئے طلبہ کو چاہئے کہ ایسے اساتذہ سے احادیث پڑھیں جن کی صحبت وشرف تلمذ حاصل کرنے سے عمل کا شوق بڑھتا ہو، اور وہ استاذ حدیث کا صحیح مطلب سمجھتا ہو۔

دیگر بات جو بہت اہم ہے یہ ہے کہ آج کل احادیث کے بارے میں لوگ افراط تفریط کا شکار ہو گئے ہیں ایک فرقہ تو بالکل حجت حدیث کا منکر ہو گیا ہے کہ ان کے بزعم احادیث پر بھروسہ کرنا مشکل ہے، جبکہ کچھ لوگ محض اس بات پر کہ حدیث میں آیا ہے اعتماد کر کے اسے عمل میں بھی لاتے ہیں اور نقل بھی کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو احتیاط اور علم کی قید سے مبراء سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں طریقے غلط ہیں منکرین حدیث پر تو علماء نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں اور ان کے شبہات کے کافی شافی جوابات دیئے ہیں اگر چہ ان معاندین کو شفاء نصیب نہ ہوئی ہم نے مقدمہ تشریحات میں اس پر مختصر گفتگو کی ہے۔ فلیراجع

جہاں تک دوسرے گروہ کا حال ہے تو یہ بھی ایک فتنہ سے کم نہیں آپ کسی بھی بازار میں عام بازاری آدمی سے سن سکتے ہیں جو کہتے ہیں کہ حدیث میں یوں آیا ہے جبکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے ہیں کہ یہ حدیث کس

کتاب میں ہے اور اس کی سند کا درجہ کیا ہے؟ اور اصل الفاظ کیا ہیں؟ عام خطیب حضرات بھی ایسے ہی ہیں ۔اختصار کے پیش نظر احادیث نقل کرنے کے لئے یہاں دو جامع شرائط پیش کی جاتی ہیں جو شخص ان شرائط پر پورا اُترتا ہو تو وہ روایت کا مجاز ہوگا اور جس میں یہ شرائط نہ ہوں تو وہ اس کی جسارت نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ ہم نے فلاں عالم سے یہ مسئلہ سُنا ہے:

(۱)......پہلی شرط: جواز روایت کی یہ ہے کہ اگر نقل کرنے والا علم رجال میں اتنی مہارت رکھتا ہو کہ وہ سند دیکھ کر خود فیصلہ کر سکے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے؟ تو سند جانچنے کے بغیر اس کے لئے روایت کرنا جائز نہیں وہ پہلے سند دیکھ کر پہلے اطمینان حاصل کرے تب روایت کرے۔تاہم آج کل رجال کے ماہرین کا شاید کہیں وجود نہ ہو یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔

(۲)......دوسری شرط: یہ ہے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس کی تصحیح یا تحسین کی ہے یا نہیں؟ تو اس وقت تک اس کے لئے روایت کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے، چونکہ آج کل یہ مقام صرف علماء ہی حاصل کر سکتے ہیں اس لئے عوام کو بہر حال احادیث کی روایت سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ وہ تو صحیح الفاظ نقل کرنے پر بھی قادر نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ عام شاہدہ ہے، بلکہ اکثر عوام موضوعی احادیث زیادہ پسند کرتے ہیں ہاں اگر کسی مستند کتاب میں دیکھ کر روایت کریں تو وہ الگ بات ہے بشرطیکہ وہ حدیث کا درجہ بھی بیان کریں اور یہ کہ وہ درجہ جانتے بھی ہوں۔

یہ دونوں شرائط صحیحین کے علاوہ دیگر کتب کے لئے ہیں جیسے سُنن ومسانید، جہاں تک صحیحین کا تعلق ہے تو ان کی روایات چونکہ تمام صحاح ہیں اس لئے غیر ماہر بھی ان سے روایت کر سکتا ہے، اگرچہ بخاری ومسلم کی بعض روایات پر بھی کلام کیا گیا ہے:

"قال الحافظ السخاوی فی فتح المغیث وبالجملة فسبیل من اراد الاحتجاج بحدیثٍ من السنن لاسیماابن ماجه ومصنف ابن ابی شیبه وعبد الرزاق مماالامر فیهااشداوبحدیث من المسانید واحد، اذجمیع ذالک لم یشترط من جمعه الصحةَ ولاالحسنَ خاصةً (۱) وهذاالمحتج ان کان مُتَأَهِّلاً لمعرفة الصحیح من غیره فلیس له ان یحتج بحدیث من السنن من غیر ان ینظرفی اتصالِ اسناده وحال رُوَاتِه کماانه لیس له ان

یحتج بحدیث المسانید حتیٰ یحیط علماً بذالک(۲)وان کان غیر متأهل لدرک ذالک فسبیله ان ینظر فی الحدیث فان وجداحداً من الائمة صَحَّحَه ،اوحَسَّنَه فله ان یقلّده وان لم یکن ذالک فلایقدم علی الاحتجاج به فیکون کحاطب لیل فلعلّه یحتج بالباطل وهو لایشعر".

(ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ: ص: ۴۵)

باب ماجاء فی من روی حدیثاً ویُریٰ انه کَذِبٌ

(مشکوک روایت سے پرہیز کا بیان)

"عن المغیرة بن شعبة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال:من حَدَّث عَنِّی حدیثاً وهو یری انه کذب فهواَحَدُالکاذبین". (حسن صحیح)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میرے حوالے سے کوئی حدیث بیان کی جبکہ وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ (دو) جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

تشریح:۔قوله:"وهو یری"لفظ یُریٰ بفتح الیاء وضمها دونوں طرح پڑھنا جائز ہے بالفتح بمعنی یقین کے آتا ہے اور بالضمہ بمعنی ظن وگمان کے آتا ہے مطلب یہاں دونوں کا ایک ہے یعنی روایت کے بے اصل ہونے کا یقین ہو یا ظن ہو دونوں صورتوں میں روایت کرنا جائز نہیں ہے۔

قوله:"اَحَدُ الکاذبین" کاذبین جمع اور تثنیہ دونوں طرح پڑھنا جائز ہے کہ دونوں روایتیں ثابت ہیں۔جمع کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ شخص سند کے باقی راویوں کی طرح جھوٹا ہے جبکہ تثنیہ کی صورت میں مطلب میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ وہ شخص مسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی کی طرح ہے کیونکہ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کر کے اللہ پر بہتان باندھا تھا تو جھوٹی حدیث نقل کرنے والا بھی اللہ اور اس کے رسول پر تہمت لگاتا ہے یعنی ایسی بات کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے نہیں کی ہے۔

دوسرا مطلب جو زیادہ ظاہر ہے یہ ہے کہ یہ شخص حدیث گھڑنے والے کی طرح جھوٹا ہے کہ ایک نے بنائی اور دوسرے نے شائع کی۔غرض اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی روایت بیان کرنی چاہئے۔

امام ترمذیؒ نے امام دارمیؒ سے پوچھا کہ اگر کسی کو سند میں گڑبڑ کا علم ہو جائے اور پھر اسے روایت کرے

تو کیا وہ بھی اس وعید میں شامل ہوگا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ اصل دارومدار متنِ حدیث پر ہے علیٰ ہذا اصل چیز متنِ حدیث کا صحیح ہونا ہے اگر اس کا اطمینان ہو جائے تو کمزور سند کی روایت نقل کرنا بھی صحیح ہوگا جبکہ متن کے بے اصل ہونے کے علم کی صورت میں سند خواہ بظاہر قوی ہی کیوں نہ ہو لیکن روایت کرنے سے بچنا لازمی ہوگا اِلّا یہ کہ اس کی علت بیان کرے۔

باب مانهی عنه ان یقال عندحدیث رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

(حدیث سُن کر بہانے تراشنا جائز نہیں ہے)

"عن ابی رافع وغیرُہ رَفَعَه قال لااُلفِینَّ احدَکم مُتّکِئاً علی اَرِیکته یأتیه امر ممااَمرتُ اونَهَیتُ عنه فیقول لاادری......ماوَجَدنافی کتاب الله اِتَّبَعناه". (حسن)

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور قتیبہ کے علاوہ دوسرے راوی اس کو مرفوع روایت کرتے ہیں (جبکہ قتیبہ نے موقوف علی ابی رافع روایت کیا ہے) آپؐ نے فرمایا: میں ہرگز تم میں سے کسی ایک کو اپنی مسند پر تکیہ لگائے ہوئے نہ پاؤں جس کے پاس میرا کوئی حکم آئے جس کا میں نے امر کیا ہو یا نہی کی ہو......تو وہ کہنے لگے کہ میں نہیں جانتا......بس ہم جو کچھ اللہ کی کتاب میں پائیں گے اسی کی پیروی کریں گے۔

حدیث آخر:۔ **"اَلا هل عَسیٰ رجل یبلغه الحدیث عنی وهومتکئ علیٰ اَرِیکته فیقول بینناوبینکم کتاب الله فماوِجدنافیه حلالاً اِستحللناه وماوجدنافیه حراماً حرّمناه واِنّ ماحرّم رسول الله کماحرّم الله". (حسن غریب)**

آگاہ ہو! کہ وہ وقت قریب ہے کہ ایک آدمی کو میری حدیث پہنچے گی جبکہ وہ ٹیک لگائے ہوگا اپنی مسند پر...پس وہ کہے گا ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے پس ہم جو اس میں حلال پائیں گے اسی کو حلال کہیں گے اور جس کو حرام پائیں گے اسی کو حرام سمجھیں گے ...حالانکہ بلاشبہ اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کہا ہے وہ ویسی ہی حرام ہے جیسی اللہ نے حرام کی ہو۔

تشریح:۔ قوله: "لااُلفِینَّ" ای لااَجِدَنَّ میں نہ دیکھنے پاؤں یعنی ایسا موقع نہیں آنا چاہئے کہ تم میں سے کوئی حدیث کو رد کرے۔ قوله: "متکئاً علیٰ اریکته" دلہن کے لئے جو چھپر کھٹ عربوں میں خاص طور پر سجایا جاتا ہے اسے اریکہ کہا جاتا ہے، یہ تعبیر اس شخص کی حماقت، تکبر اور علم سے بے رغبتی سے کنایہ ہے کیونکہ جو

شخص دنیا کی لذتوں کا عادی اور زیادہ کھانے کا خوگر ہو جاتا ہے تو وہ احمق ومتکبر بھی ہوتا ہے اور جاہل بھی، اور جاہل ومتکبر ہی ایسی بات کر سکتا ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام میں فرق ہے کوئی ذی عقل اور باشعور شخص یہ بات نہیں کر سکتا کیونکہ ہر دانا شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام دیئے ہیں یا جو ارشادات فرمائے ہیں وہ عمل ہی کے لئے ہیں اور یہ کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور یہ کہ قرآن پر عمل بغیر احادیث کے مکمل ہو ہی نہیں سکتا "یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم"۔ (الآیۃ)

بہر حال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے، بخدا نبی کی ہر بات سچی ہوتی ہے کہ ان کا مشن سچائی پھیلانا ہے۔

منکرینِ حدیث کا حکم:۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اگر حدیث کو اہانت کی غرض سے رد کیا جائے تو یہ کفر ہے اور اگر خبر واحد ہونے کی وجہ سے مسترد کرے تو وہ شخص مبتدع ہے جبکہ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک وہ کافر ہے کیونکہ جو خبر واحد کا انکار کرتا ہے تو وہ درحقیقت پوری شریعت کی نفی کرتا ہے: "وبہ اقول فان من انکر خبر الواحد فقد ردّ الشریعۃ کلھا الخ"۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حدیث کو اس لئے قبول نہ کرے کہ وہ قرآن کے ساتھ (بظاہر) معارض ہے... اس میں تفصیل ہے جو اصول فقہ میں بیان ہوئی ہے۔ خلاصہ باب یہ ہے کہ حدیث کا بہت اونچا مقام ہے اس کے متعلق لاپرواہی اور مخالفت کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے، اسی بناء پر مرقات میں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: "ولذا رجّح الامام الاعظم الحدیث ولو ضعیفاً علی الرأی ولو قویاً"۔ یعنی حدیث ضعیف بھی ہو تب بھی رائے اور قیاس اگرچہ قوی ہو پر مقدم ہے۔ (کذا فی تحفۃ الاحوذی)

باب ماجاء فی کراھیۃ کتابۃ العلم

(حدیث لکھنے کی ممانعت کا بیان)

"عن ابی سعید قال اِستاذنّا النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فی الکتابۃ فلم یأذن لنا".

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث لکھنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے ہمیں اجازت نہیں دی۔

تشریح:۔ **قولہ:** "استاذنا" سین وتاء طلب کے لئے ہیں یعنی طلبنا الاِذن فی کتابۃ الحدیث۔

یہ روایت مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: ''لاتکتبوا عنّی ومن کتب عنّی غیر القرآن فلیمحه ''۔ (مسلم: ص:۴۱۴ ج:۲) یعنی قرآن کے علاوہ لکھی ہوئی بات کے مٹانے کا حکم دیا تھا۔

ان دونوں حدیثوں سے کتابتِ حدیث کی ممانعت معلوم ہوتی ہے اور اسی کو بہانہ بنا کر منکرینِ حدیث نے حجیتِ حدیث کی نفی پر استدلال کرنے کی کوشش کی ہے مگر چونکہ کتابت حدیث کے جواز بلکہ استحباب یا وجوب پر امت کا اجماع ہے اس لئے مذکورہ بالا حدیث یا تو منسوخ ہے یا مؤول ہے جس کی تفصیل تشریحات ترمذی کے مقدمہ میں گذری ہے۔ (دیکھئے: ص:۱۹ تا ۲۳ ج:۱) اور کچھ ثبوت اگلے باب میں بھی ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فیه

(احادیث لکھنے کی اجازت کا بیان)

''عن ابی هریرة قال کان رجل من الانصار یجلس الی رسول الله صلی الله علیه و سلم فیسمع من النبی صلی الله علیه وسلم الحدیث فیعجبه ولایحفظه فشکیٰ ذالک الی رسول الله صلی الله علیه وسلم: انی لَاَسمع منک الحدیث فیعجبنی ولااحفظه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اِستَعِن بیمینک وَاَومَابیده لِلخطّ''. (هذاحدیث لیس اسناده بذالک القائم الخ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنتا تھا تو وہ حدیث اس کو پسند آتی لیکن اس کو یاد نہیں رہتی پس انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی کہ میں آپ سے حدیث سنتا ہوں اور بہت پسند کرتا ہوں لیکن مجھے وہ یاد نہیں رہتی پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لیا کرو اور (اس کے ساتھ) آپؐ نے اپنے ہاتھ سے خط کی جانب (لکھنے کا) اشارہ کیا۔

باب کی یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن کتابت احادیث کے بارے میں صحیح احادیث کا بہت بڑا مجموعہ موجود ہے اس لئے کتابت حدیث پر امت کا اجماع ہے اگر بالفرض اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہ بھی ہوتی تب بھی امت کا تعامل استدلال کے لئے کافی تھا جیسا کہ اصول میں بیان ہوا ہے حالانکہ یہاں تو صحیح احادیث بھی بکثرت پائی جاتی ہیں از اں جملہ باب کی دوسری اور تیسری احادیث بھی ہیں یہ دونوں احادیث مقدمہ میں

گزری ہیں۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا (پھر اس کی تفصیل بیان فرماتے ہوئے) فذکر قصۃ یعنی خطبہ حج نقل کیا تو ابوشاہؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول! یہ میرے لئے لکھوا دیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (یہ خطبہ) ابوشاہ کے لئے لکھ دو!۔ (حسن صحیح رواہ الشیخان)

حدیث آخر:۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مجھ سے زیادہ کسی کے پاس نہیں تھیں سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ وہ لکھا کرتے تھے جبکہ میں نہیں لکھتا تھا۔ (حسن صحیح اخرجہ البخاری ایضاً)

رہا یہ سوال کہ پھر ابو ہریرہؓ کی مرویات کی تعداد کیوں زیادہ ہے؟ تو اس کا جواب مقدمہ میں گزرا ہے علاوہ اس کے ایک جواب یہ بھی ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ عبادت وسیاست میں مشغول ہوگئے تھے جبکہ ابو ہریرہؓ تدریس وتحدیث میں لگے رہے۔

چونکہ ابو ہریرہؓ کے پاس لکھی ہوئی احادیث بھی ثابت ہیں اس لئے کہا جائے گا کہ باب کی حدیث میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کتابت کی نفی مراد ہے مطلقاً نہیں، ہوسکتا ہے کہ نبیؐ کے وصال کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے دوسرے صحابہ کی احادیث لکھ کر یکجا کی ہوں یا اپنی یاد کی ہوئی احادیث خوف نسیان کے پیش نظر لکھی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور صحابی کی لکھی ہوئی احادیث سے استفادہ کرتے ہوں۔

باب ماجاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل

(اسرائیلی روایات نقل کرنے کا حکم)

"عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :بَلِّغُوا عنّی ولو اٰیةً وحَدِّثُوا عن بنی اسرائیل ولاحَرَجَ ومن کذب علیَّ متعمّداً فلیتبوأمقعده من النار". (حسن صحیح)

میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل سے نقل کرو اس میں کوئی حرج (گناہ) نہیں اور جو مجھ پر ارادۃً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

تشریح:۔ قولہ: "بَلِّغُوا عنّی ولو اٰیة" عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ بلغوا امر کے صیغہ سے آپؐ کی

طرف سے تبلیغ کی فرضیت معلوم ہوئی تاہم یہ تبلیغ فرض کفایہ ہے علی ھذا البعض کی تبلیغ سے باقی کی ذمہ داری ساقط ہوجائے گی۔ انتہی۔ چونکہ حنفیہ کے نزدیک فرضیت کے ثبوت کے لئے نص کا قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہونا دونوں شرط ہیں اور یہ خبر واحد ہے اس لئے اس سے تو فرضیت کا قول مشکل ہے تاہم دیگر نصوص کو دیکھ کر تبلیغ کو اور خصوصاً امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو فرض کہا جاسکتا ہے۔

محشی نے طیبی سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے ارشادات کے لئے لفظ تبلیغ استعمال فرمایا جس میں متن اور سند دونوں میں احتیاط کی طرف اشارہ ہے جبکہ بنی اسرائیل کی روایت کے لئے لفظ تحدیث میں توسع کی جانب اشارہ ہے کیونکہ زمانہ بہت دراز گزرا ہے اس لئے اسرائیلی روایات میں سند کی رعایت ولزوم میں ضیق وتنگی ہے، اس لئے آپؐ نے فرمایا ''ولا حرج'' یعنی ان کی باتوں میں سچائی کا امکان ہے اور تحقیق مشکل ہے کیونکہ ان لوگوں نے اسانید کی پابندی ملحوظ نہیں رکھی ہے لہٰذا جہاں صدق کا امکان ہو اس کو نقل کرنے میں حرج نہیں ہے۔

یہاں آیت سے مراد بعض حضرات کے نزدیک حدیث ہے کیونکہ اس کے معنی قطعہ بمعنی ٹکڑے کے ہیں جو حدیث پر بھی صادق ہے لیکن قاضی بیضاویؒ اور شیخ عبدالحق'' فرماتے ہیں کہ مراد قرآن کی آیت ہے اور جب قرآنی آیت کی تبلیغ واجب ہے تو حدیث کی بطریق اولیٰ واجب ہے کیونکہ قرآن کی حفاظت کا وعدہ تو اللہ نے فرمایا ہے اور اس کی نشرواشاعت بھی عام ہے تو جب عام کا ابلاغ لازمی ہے تو حدیث کا بطریق اولیٰ ضروری ہے۔

حضورؐ کا معمول شریف تھا کہ جب بھی وحی نازل ہوتی تو فوراً حاضرین کو بتاتے اور کاتبین وحی کو بلا کر ان سے لکھواتے پھر صحابہ اس کو آگے تک اور دوسروں تک پہنچاتے، یہ طریقہ احادیث میں بھی رائج تھا گو لکھنے کا عام معمول نہ تھا۔

ایک روایت میں بنی اسرائیل کی تصدیق وتکذیب سے ممانعت آئی ہے جبکہ باب کی حدیث میں اجازت کی تصریح ہے یہ بظاہر تعارض ہے؟ اس کا حل یہ ہے کہ اسرائیلی روایات تین طرح کی ہیں:

(۱) ایک وہ جو ہمارے عقائد واحکام سے معارض ہوں، ان کا حکم: یہ ہے کہ وہ روایات من گھڑت ہیں اور ان کی روایت، ان پر عمل کرنا اور ان کے مطابق عقیدہ رکھنا جائز نہیں ہے۔

(۲) دوسری وہ روایات ہیں جن کی ہماری شریعت میں تصدیق ثابت ہیں جیسے فرعون کا غرق ہونا۔ ایسی روایات کی تصدیق لازمی ہے کہ وہ ہماری شریعت کا حصہ ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی روایات وہ ہیں جو قرآن کی مجمل آیات کی تفاصیل میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں، وہ

28/2

تورات میں تفصیلاً مروی ہیں اور ہمارے عقائد واعمال سے کسی طرح متصادم نہیں، یاان کی زبانی وہ روایات جوتاریخی حیثیت کی حامل ہیں توایسی روایات کی نقل میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں البتہ جواسرائیلی روایات صریح عقل کے خلاف ہیں جیسے عوج کی قد وقامت کے بارے میں بے سروپاروایات توان کونقل کرناعقل کے منافی ہے، ایسی روایات بچے رات کوشغل کے طور پرنقل کرتے ہیں یاپھران کورد کرنے کی غرض سے نقل کیاجاسکتا ہے۔

غرض وعظ ونصیحت، تفصیل مجمل اورتاریخی روایات جوعقل ونقل صحیح کے منافی نہ ہوں نقل کی جاسکتی ہیں اور باب کی حدیث میں یہی آخری تیسری قسم مراد ہے۔حدیث کے دوسرے جزء کاربط ماقبل سے یہ ہے کہ روایات کے خلط ملط ہونے سے آپؐ کی طرف غلط بات کی نسبت ہوسکتی ہے لہٰذا اختلاط سے بچنے اوراحتیاط کی تاکید فرمائی، اس جملے کی تشریح پہلے گذری ہے۔

باب ماجاء ان الدال علی الخیر کفاعله

(نیکی بتانے والانیکی کرنے والے کی طرح ہے)

”عن انس بن مالک قال اَتَی النبی صلی الله علیه وسلم رجل یستحمله فلم یجد عنده مایحمله فَدَلَّه علی آخرَ فَحَمَلَه فَاَتَی النبیَ صلی الله علیه وسلم فَاَخبَرَه فقال: ان الدال علی الخیر کفاعله“ (غریب من هذه الوجه)

حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکرآپؐ سے سواری طلب کی مگراس نے آپؐ کے پاس ایساجانورنہیں پایاجس پرآپؐ اس شخص کوسوارکرتے، پس آپؐ نے اس کوایک اورشخص کاپتابتادیاچنانچہ (وہ شخص اس کے پاس گیااور) اُس نے اِس کوسواری دے دی وہ شخص (پھر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیااوراس کی اطلاع آپؐ کودی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایاخیر کاپتادینے والااس کام کے کرنے والے کی طرح ہے۔

تشریح:۔قوله: ”فلم یجد عنده الخ“ اس کاظاہری مطلب تو وہی ہے جواوپرترجمہ میں بتایاگیا ہے دوسرااحتمال یہ بھی ہے کہ فلم یجد کی ضمیرآنحضورؐ کی طرف راجع ہوپھرمطلب یہ ہوگاکہ آپؐ کواپنے پاس کوئی ایساجانورنہیں ملاجس پراس شخص کوسوارکرسکیں اس لئے اسے دوسرے کے پاس بھیج دیا۔

چونکہ عمل، علم پرمبنی ومتفرع ہوتاہے اس لئے کسی نیکی کی طرف راہنمائی کرنے والے کوبھی عمل کرنے

والے کے برابر ثواب ملتا ہے، تاہم اگر بتلانے کے باوجود کوئی اس دلالت وعلم اور تبلیغ پر عمل نہ کرے تو اس صورت میں عمل کا ثواب اگر چہ نہیں ملے گا لیکن دلالت کرنے اور راہنمائی کا ثوب بہر حال ملے گا، چنانچہ قاضی بیضاویؒ نے ''سواءٌ علیهم ءَ انذرتهم ام لم تنذرهم لایؤمنون ''۔ (بقرہ بآیت:۶) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جن کفار پر مُہر جباریت لگ چکی تھی وہ اگر چہ ایمان لانے والے نہ تھے مگر پھر بھی اللہ عز وجل نے ''سواء علیک '' نہیں فرمایا کیونکہ وہ ایمان لائے یا نہ لائے آپؐ کے لئے ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں مساوی نہ تھے بلکہ آپؐ کو انذار پر ثواب ملتا رہتا تھا۔

اس کے برعکس جو شخص کسی برائی کی دلالت کرے گا تو وہ بھی عامل کی طرح گناہ میں برابر کا شریک ہوگا جیسا کہ باب کی آخری حدیث میں ہے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ دلالت کرنے میں مماثلت گناہ اور ثواب کے اعتبار سے ہے ضمان اور تاوان میں مماثلت نہیں علیٰ ہذا اگر کسی نے کسی کے دشمن کو اس کا پتا بتلا دیا یا مال کی دلالت کی تو دلالت کرنے والے پر بالاتفاق ضمان نہیں ہوگا ''اِلّا ان اباحنیفة قال ان المحرم اذادلّ الحلال علی صیدفَعَقَرَه الحلال فان الکفارة علی المحرم الدال بماجَنیٰ علی الصیدالخ '' یعنی اگر محرم نے حلال کی کسی شکار میں کسی طرح مدد کی تو یہ موجب جزا ہوگی۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک تسبیب کا مسئلہ کافی تفصیل طلب ہے جو ہدایہ جلد سوم ''کتاب الاکراہ'' میں دیکھا جا سکتا ہے جبکہ ''کتاب الرجوع عن الشہادات'' میں بھی ''صاحب ہدایہ'' نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ: ''لان التسبیب علی وجه التعدی سبب الضمان کحافرالبئرالخ ''۔ (فلینتظومن شاء)

حدیث آخر:۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے سواری طلب کی، اُس نے کہا میرا جانور سواری کے قابل نہیں رہا ہے...... پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم فلاں شخص کے پاس جاؤ! (یعنی وہ تمہیں سواری دے دے گا) چنانچہ وہ فلاں کے پاس گیا تو اُس نے اِس کو سواری دے دی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من دل علی خیرفله مثل اجرفاعله اوقال عامله''۔ (حسن صحیح)

قولہ: ''اُبدِعَ'' بضم الہمزۃ بصیغہ مجہول جانور کے تھک جانے اور ہلاک ہو جانے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہی حدیث دوسری سند سے ذکر کرنے کے بعد امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں ''مثل

اجر فاعله'' بغیر شکِ راوی کے مروی ہے۔

حدیث آخر:۔عن بُریدبن عبدالله بن ابی بُردةَ عن جده ابی بُردَةَ عن ابی موسیٰ الاشعری عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: اشفعوا وَلْتُوجَروا وَلْيَقضِي الله علی لسان نبيّه ماشاء''. (حسن صحیح)

سفارش کریں اور ثواب حاصل کریں اور اللہ اپنے نبی کی زبانی وہ تمام فیصلے ضرور صادر فرمائیں گے جو وہ چاہتے ہیں۔

قوله: ''عن ابی بردة عن جده ابی بردة'' اس میں جَدِّہ کی ضمیر بُرید کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ آگے ترمذی نے اشارہ کیا ہے نیز بُرید اپنے دادا ابو بُردہ کی کنیت سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔

قوله: ''ولتوجروا وليقضی الله'' پہلا لام امر کے لئے اور دوسرا تاکید کے لئے ہے اس میں دوسری قرأت ولیقض ہے یعنی آخر میں یاء کے بغیر ہے، پس یہ صیغہ امر کا ہوگا، جنہوں نے لیقضی کا لام امر کے لئے کہا ہے تو اس سے مراد دعا ہے۔ (تدبر)

حضور علیہ السلام کا صحابہ کرامؓ کو سفارش کی ترغیب دینا دو حکمتوں پر مشتمل ہے ایک ان کو کارِ خیر میں شامل کرنا جیسا کہ سابقہ حدیث میں گذر چکا ہے۔ دوم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عام آدمی بڑی شخصیت سے مل نہیں سکتا ہے رعب کی وجہ سے یا کسی رکاوٹ کی بناء پر پس سفارش کی ترغیب میں اس کی مدد کرانا بھی مقصود ہے۔ پھر یہ ثواب نیک مقصد کی سفارش تک محدود ہے اگر کسی ناجائز کام یا کسی کی حق تلفی وغیرہ کے لئے ہوگی تو وہاں حکم معکوس ہو جائے گا اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''من یشفع شفاعة حَسَنَةً یکن له نصیب منها ومن یشفع شفاعة سیئةً یکن له کِفل منها''۔ (سورۂ نساء: آیت: ۸۵) کفل حصے کو کہتے ہیں لیکن عموماً ناگوار چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی جس نے اچھی سفارش کی تو اس کے لئے ثواب کا حصہ ہے اور جس نے بُرائی کی سفارش کی تو اس کے لئے گناہ میں حصہ ہے، پھر سفارش کا قبول ہونا شرط ثواب نہیں۔

حدیث آخر: ۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: کوئی آدمی ایسا نہیں جو ظلم کی رُو سے قتل کر دیا جائے مگر یہ کہ ہوتا ہے آدم کے بیٹے (قابیل) پر ایک بارِ گناہ اس کے خون کا، یہ اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا راستہ بنایا ہے۔ (حسن صحیح)

قوله: ''وقال عبدالرزاق سَنَّ القتل'' یعنی یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ اور بغیر ہمزہ دونوں طرح یعنی

باب افعال اور مجرد دونوں سے مروی ہے معنی ومطلب دونوں کا ایک ہے یعنی جس نے کوئی راہ بدی وگناہ کی ڈالی تو جتنے لوگ اس راستہ پر چلیں گے ان کے مرتکب لوگوں کے اپنے گناہ اپنی جگہ پورے ہوں گے لیکن مع ھذا ان سب میں سے ہر ایک کے برابر گناہ بنیاد ڈالنے والے شخص کو بھی ملے گا والعیاذ باللہ۔ یہ مضمون اگلے باب میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

باب ماجاء فی من دَعَااِلیٰ هُدًی فاتُّبِعَ اوالی ضلالة

(جس نے نیکی بدی کی دعوت دی اور اس کی پیروی کی گئی)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم :من دعاالی هُدیً كان له من الاجر مثل اجور من يَّتْبِعُه ولاينقُصُ ذالک من اجورهم شيئاً ومن دعا الی ضلالة كان عليه من الاثم مثل اثام من يَّتْبِعُه لاينقُصُ ذالک من اثامهم شيئاً". (حسن صحيح)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے بُلایا ہدایت کی طرف اس کے لئے ان لوگوں کے ثواب کے برابر ثواب ہوگا جو اس کی فرمانبرداری کریں گے جبکہ اس کا ثواب ان لوگوں کے ثوابوں میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ اور جس نے لوگوں کو کسی گمراہی (گناہ) کی طرف بُلایا تو اس کو اتنا ہی گناہ ملے گا جتنے گناہ اس کی پیروی کرنے والوں کے ہیں باوجودیکہ اس کا گناہ ان کے گناہوں میں کچھ بھی نہیں گھٹائے گا۔

حدیث آخر:۔ **"من سنّ سنةً خيرفاتُّبِعَ عليهافله اجرُه ومثل أجورمن اِتَّبَعَه غير منقوص من اجورهم شيئاً ومن سَنَّ سنة شرفاتُّبِعَ عليهاكان عليه وزره ومثل اوزارمن اتبعه غير منقوص من اوزارهم شيئاً". (حسن صحيح)**

جس نے کوئی اچھا طریقہ چلایا اور اس میں اس کی پیروی کی گئی تو اس کے لئے اپنا ثواب (بھی) ہے اور ان لوگوں کے ثواب کے برابر بھی ہے جو اس کی پیروی کریں گے بغیر اس کے کہ گھٹایا جائے ان کے ثوابوں میں سے کچھ...... اور جس نے کوئی بُرا (غلط) طریقہ نکالا پس اس کی اس طریقہ میں تابعداری کی گئی تو اس پر اپنے گناہ کا بوجھ بھی ہوگا اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہوگا جو اس کے تابع ہوئے بغیر اس کے کہ گھٹایا جائے ان کے بارِ گناہ سے کچھ۔

تشریح:۔قوله:"فی السندعن ابن جریر الخ" ابن جریر سے مراد منذر بن عبداللہ ہیں۔قوله: "من دعاالی هُدیً" ہدایت کی تعریف میں معتزلہ اور اہل السنۃ والجماعت کے مابین مشہور اختلاف ہے جو عام طور پر نصابی کتب کے اوائل میں بیان کیا جاتا ہے۔یہاں مراد کسی بھی نیکی کے عمل کی رہنمائی ہے جس کا ادنیٰ درجہ راستہ سے تکلیف دِہ چیز کا ہٹانا ہے۔

قوله:"من سَنَّ سنة خیر" مراد وہ پسندیدہ عمل ہے جو دین کے اصول وضوابط کے موافق ہو۔قوله: "من سنَّ سنة شر" یہ سنة خیر کے مقابل ہے یعنی وہ ناپسندیدہ عمل جو دین کے اصول وضوابط اور مزاج یا صریح نصوص کے منافی ہو یعنی دین اسلام میں اس کے جواز کی کوئی ٹھوس دلیل نہ ہو، اس کی مزید وضاحت اگلے باب میں آرہی ہے۔

قوله:"فاتبع" مجہول کا صیغہ ہے۔قوله:"غیر منقوص" چونکہ نیکی یا بدی کے عمل کی بنیاد ڈالنے والا اس عمل کا محرک اور سبب بنتا ہے تو جس طرح فعل کی نسبت سبب کی طرف ہوتی ہے اسی طرح اس باعثِ عمل شخص کو بھی اجر یا وزر ملتا رہے گا اور اس حدیث کا "اَلّا تزرُ وازرةٌ وِزرَ اُخریٰ وان لیس للانسان اِلّا ما سعیٰ"۔ (نجم: آیت:۳۸،۳۹) سے کوئی تعارض نہیں کیونکہ یہ آیت ایمان اور غیر متعدی عمل کے بارے میں ہے جبکہ متعدی گناہ کے بارے میں ارشاد ہے "وَلیحملن اثقالهم واثقالاً مع اثقالهم ولیسئلن یوم القیٰمة عما کانو ایفترون"۔ (عنکبوت: آیت:۱۳)

غرض اچھائی و برائی کی بنیاد رکھنے والا شخص اس وقت تک عمل میں شریک رہتا ہے جب تک وہ عمل جاری ہو خواہ سال دو سال تک جاری رہے یا قیامت تک باقی وساری رہے۔

باب الاخذبالسنة واجتناب البدعة

(سنت طریقہ پر چلنے اور بدعت سے بچنے کا بیان)

"عن العِرباض بن سارية قال وَعَظَنَا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوماً بعد صلوةِ الغداة موعظةً بليغةً ذَرَفت منها العيونُ وَوَجِلت منها القلوبُ فقال رجل: ان هذه موعظةُ مُوَدِّع ......فماذا تعهَدُ الينا يا رسول الله؟ قال: اُوصيكم بتقوىٰ الله والسمع والطاعة وَاِن عبدٌ حَبَشى، فانه من يَعِيش منكم يَرىٰ اختلافاً كثيراً واِيّاكم وَمُحدَثاتِ الامور فانها ضلالة فمن

ادرک ذالک منکم فعلیہ بسنتی وسنۃِ الخلفاء الراشدین المھدِیِّین عَضُّوا علیھا بالنواجذ". (حسن صحیح)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فجر کی نماز کے بعد ہم کو بڑی کامل نصیحت فرمائی جس سے آنکھیں بہنے لگیں اور دل کانپنے لگے (یعنی ہم خوف زدہ ہوگئے) پس ایک شخص نے کہا کہ یہ وعظ تو رخصت کرنے والے کا لگتا ہے (یا رخصت ہونے والے کی نصیحت کی طرح ہے) سوائے اللہ کے رسول! آپ ہم کو کیا وصیت فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، اور بات سننے اور کہا ماننے کی تاکید کرتا ہوں اگرچہ وہ (حکمران) حبشی غلام کیوں نہ ہو، اس لئے کہ جو تم میں سے زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا، اور تم بدعات سے بچتے رہنا کیونکہ وہ گمراہی ہیں پس جو شخص تم میں سے وہ وقت پائے تو ضرور لازم پکڑے میری سنت کو اور حق پر قائم ہدایت یافتہ جانشینوں کے طریقہ کو! سنت کو ڈاڑھوں سے خوب مضبوطی سے پکڑو!

تشریح: قولہ: "بلیغۃً" یعنی بَلَغت الینا وَ اَثّرت فی قلوبنا وَ جِلاً وفی اعیننا تذراباً۔ غرض مؤثر انداز میں نصیحت فرمائی۔ قولہ: "ذَرَفَت" ای سالت ودمعت آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔

قولہ: "وجِلت" بکسر الجیم ای خافت یعنی ہمارے دل خوف کے مارے، بہت نرم ہوگئے۔

قولہ: "مُوَدِّع" بکسر الدال الوداع کہنے والے، رخصت لینے والے مسافر کو کہتے ہیں چونکہ گھر کا سربراہ سفر پر جاتے وقت یا کسی کو سفر پر بھیجتے وقت خصوصی نصیحت اور وصیت وتاکید کرتا ہے تاکہ اس کے چھوٹے ان ہدایات پر عمل کر کے خطرات اور پریشانیوں سے بچیں اس لئے ان صحابی نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز بیان سے یا دیگر قرائن سے محسوس کیا کہ آپؐ سفرِ آخرت پر تشریف لے جانے والے ہیں اس لئے انہوں نے آپؐ سے مزید نصیحت کی درخواست فرمائی، وہ قرائن کیا تھے؟ تو ممکن ہے کہ سورۂ نصر ہو یا جیسے باب فی ذھاب العلم میں جو احادیث گذری ہیں مثلاً ھذا اَوَان یُختلس العلم من الناس الخ وغیرہ ہوں۔

قولہ: "وان عبد حبشی" یعنی ارباب اقتدار کی سمع وطاعت ضرور کرو اگرچہ وہ حکمران کوئی حبشی غلام کیوں نہ ہو، یعنی امام اگرچہ قریش میں سے ہونا چاہئے لیکن اگر کسی غیر کو بھی بنایا جائے یا کوئی زبردستی بن جائے تو بھی اس کی اطاعت کرتے رہو، یہ مسئلہ تشریحات کی جلد پنجم وششم میں مکرر گذرا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک جب تک صریح کفر نہ ہو تو امام کے خلاف خروج واجب نہیں

بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جائز نہیں کیونکہ اس سے عام اہل اسلام خصوصاً بچوں اور عورتوں کو غیر معمولی نقصان پہنچتا ہے ہاں البتہ فاسق حکمرانوں کا فسق کے امور میں اتباع بھی جائز نہیں، اس لئے اگر وہ کوئی غیر شرعی حکم کریں تو آدمی کو اس سے بچنا لازم ہے خواہ اس کے لئے نوکری یا کرسی قربان کرنا پڑے یا ہجرت کرنے کی نوبت آئے تو بھی اس سے گریز نہ کرے۔ نیز ظالم حکمرانوں کی اطاعت عام امور میں صالح وعادل بادشاہ کی طرح واجب بھی نہیں کمامرّ۔

قولہ: "یَریٰ اختلافاً کثیراً" عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو آنے والے اختلافات ومنکرات کے غلبے کا اجمالی وتفصیلی علم تھا یعنی اللہ نے ان کو آنے والے فتنوں سے آگاہ فرمایا تھا مگر آپؐ نے ہر ایک کو اس کی تفصیل نہیں بتائی تھی البتہ ان فتنوں سے آپؐ امت وصحابہ کو ڈرایا کرتے تھے تاہم بعض صحابہ کرامؓ جیسے حضرت حذیفہ وابوہریرہ رضی اللہ عنہما کو ان کی (بعض) تفاصیل بھی بتلادی تھیں۔

قولہ: "وایّاکم ومحدثاتِ الامور" لفظِ مُحدَث اور بدعت کے معنی اگرچہ نئی چیز، نئے قول اور نئے فعل وعمل کے ہیں تاہم شرع کی اصطلاح میں اس کا اطلاق اس نئے نظریئے، یا قول وعمل پر ہوتا ہے جو قرآن وسنت سے کسی طرح ثابت نہ ہو یعنی نہ صراحۃً، نہ دلالۃً واشارۃً اور نہ استنباطاً مع ہذا اس کو امور شرع میں شمار بھی کیا جاتا ہو یعنی اسے باعث اجر وثواب سمجھا جاتا ہو اور یہ کام کسی دینی ضرورت کی بناء پر نہیں بلکہ کسی دوسری غرض کی وجہ سے کیا جاتا ہے خواہ وہ غرض دنیوی ہو یا اشتباہ فی الدلیل کی وجہ سے کیا جاتا ہو۔ لہٰذا جو کام اَدِلّہ اربعہ یعنی قرآن وسنت یا اجماع اور قیاس سے ثابت ہو تو وہ بدعت نہیں جیسا کہ عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحبؒ نے تحفۃ الاحوذی میں قاضی شوکانیؒ کی کتاب "الفتح الربانی" سے نقل کیا ہے:

"وکانوا اذا اَعوَزَهُم الدلیل من کتاب الله وسنة رسوله (صلی الله علیه وسلم) عَمِلوا بما یظهر لهم من الرأی بعد الفحص والبحث والتشاور والتدبر وهذا الرأی عند عدم الدلیل هو ایضاً من سنته لِمَادَلَّ علیه حدیث معاذ: لَمَّا قال له رسول الله صلی الله علیه وسلم بِمَ تقضی؟ قال بکتاب الله، قال فان لم تجِد؟ قال فبِسنة رسول الله قال: فان لم تجد؟ قال اجتهد رأیی! قالؐ: الحمدلله الذی وَفّقَ رسولَ رسوله او کما قال...... وهذا الحدیث وان تکلم فیه بعض اهل العلم بما هو معروف فالحق انه قسم الحسن لغیره

وهو معمول به وقد اوضحت هذا في بحث مستقل الخ".

یعنی جب صحابہ کرامؓ اور خصوصاً خلفائے راشدین کو قرآن وسنت میں کوئی دلیل عند الضرورت نہ ملتی تو وہ غور وتدبر کر کے اپنی رائے قائم کرتے اور یہ رائے بھی سنت ہی کے موافق ہے (کیونکہ وہ ان اصول سے ماخوذ ہوتی ہے جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں) اس پر حدیث معاذ دلیل ہے اور اگر چہ اس حدیث پر بعض علماء کی طرف سے اعتراض ہے مگر سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے جو قابل عمل ہے۔

اسی طرح جو کام صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں عدم ضرورت کی وجہ سے نہ ہوا اور بعد میں اس کی دینی ضرورت پیش آئی اور علماء نے بغیر افتراق کے وہ کام کیا جیسے علوم کی تدوین تو وہ بھی بدعت کے زمرے میں نہیں آتا جیسا کہ علامہ تفتازانیؒ نے شرح عقائد کے شروع میں بیان کیا ہے اور پیچھے تشریحات میں بھی گذرا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

غرض جو کام بلا منشاء کے کیا جائے اور اسے کار خیر وشرعی امر تصور کیا جائے یا وہ امور شرع کے ساتھ خلط ملط کر دیا جائے تو وہ بدعت ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں اس کی مثال رسم سوئم اور چہلم کی دی ہے ہاں جس کام کو ثواب کی نیت سے نہ کیا جاتا ہو مگر اسے ترویج دی گئی ہو تو وہ رسم کہلائے گا جیسے شادیوں کی رسومات وغیرہ۔

پھر ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ محدث اور بدعت اپنے ناموں کی وجہ سے مذموم نہیں اور نہ ہی معنی کی وجہ سے ممنوع ہیں بلکہ محدث وبدعت خلاف سنت اور داعی الی الضلالت کی بناء پر مذموم ہیں۔

"وليس المحدث والبدعة مذموماً للفظ محدث وبدعة ولا لمعناها فقد قال الله تعالىٰ "ما يأتيهم من ذكر من ربهم محدث". (الانبیاء: آیت: ۲) **وقال عمر: نعمت البدعة هذه وانما يُذَمُّ من البدعة ما خالف السنة ويُذَمُّ من المحدثات ما دعا الى ضلالة".** (انتهى)

یعنی نام سے فرق نہیں پڑتا...... علیٰ ہذا اگر کوئی مبتدع اپنی بدعات کا نام جو بھی رکھے یا کوئی کسی شرعی امر کا نام جو بھی رکھے اس سے حکم پر اثر نہیں پڑے گا مثلاً بریلوی حضرات نے ربیع الاول کے جلوس کا نام جشن عید رکھا ہے اور دعویٰ عشق رسول کا کرتے ہیں مگر یہ عمل چونکہ قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ تھا حالانکہ صحابہ کرامؓ کو آپؐ سے ہم سے زیادہ محبت تھی اس لئے یہ بدعت ہے اس کے برعکس فقہاء کے قیاسی مسائل کو غیر مقلدین

واہل الظاہر بدعت کہتے ہیں مگر وہ سنت کے زمرہ میں شامل ہیں جیسا کہ مبارک پوریؒ کی شرح سے قاضی شوکانیؒ کی عبارت کے اقتباس میں آپ نے ابھی پڑھا۔

قولہ: "فعلیه بسنتی" لغت کے اعتبار سے مطلق طریقہ کو کہتے ہیں جو فرض کو بھی شامل ہے تاہم علماء نے فرض اور سنت اور واجب کی الگ الگ اصطلاحات مقرر کی ہیں تاکہ احکام کی درجہ بندی سمجھانے میں سہولت ہو۔

قولہ: "وسنة الخلفاء الراشدین المهدیّین" علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ خلفائے راشدین سے مراد خلفائے اربعہ ہیں یعنی ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم ابن العربیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے :"وهم اربعة باجماع"......اور یہ کہ اللہ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی ہے:

"وعدالله الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنّهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیُمکِنَنّ لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنّهم من بعدخوفهم أمنا یعبدوننی لایشرکون بی شیئاً". (النور: آیت:۵۵)

پھر ان میں سے حضرات شیخین کی سنت زیادہ مؤکدہ ہے۔تفسیر ابن کثیر میں مرفوع حدیث ہے: "اِقتدوابالذَیْنِ من بعدی ابی بکروعمر" (ص:۷۰اج:۱،قدیمی کتب خانہ) پھر ایک عورت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ابوبکر کو پاؤ گی یہ تب فرمایا تھا جب اس عورت نے کہا تھا کہ اگر میں آپ کے پاس آجاؤں اور آپ کو نہ پاؤں؟ "وهو خصوص خصوص الخصوص"۔(عارضۃ الاحوذی) یعنی صحابہ میں اگر اختلاف ہوجائے تو خلفائے اربعہ کو ترجیح ہوگی پھر اگر ان میں بالفرض اختلاف ہوجائے تو شیخین کا قول مقدم ہوگا اور شیخین میں حضرت ابوبکرؓ کا جیسا کہ پیچھے قاضی شوکانیؒ کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ ان حضرات کی رائے سنت سے مختلف نہ تھی اس لئے ان کی سنت کے اتباع کا حکم دیا اور یہ امر اتفاقی ہے پھر عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ خلفاء کی سنت پر عمل کرنے کا حکم دو وجوہ کی بناء پر ہے ایک تقلید کے لئے کہ جو شخص اپنی رائے سے قاصر ہو (یعنی مجتہد نہ ہو) دوسرے ترجیح کے لئے کہ خلفاء اربعہ کا قول مقدم ہوگا کمامرّ۔

قولہ: "عَضّوا علیها بالنواجذ" نواجذ آخری دانتوں کو کہتے ہیں چونکہ ایک تو وہ مضبوط ہوتے ہیں دوسرے آخر میں ہونے کی وجہ ان کی گرفت سب دانتوں سے پکڑنے کو مستلزم ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ ان کی سنت پوری طرح عمل میں لاؤ جزوی عمل کافی نہیں "فمعناه عضوا علیها بجمیع الفم ولایکون تناولها

نهساًالخ‘‘۔(عارضۃ الاحوذی) غرض ان کی سنت ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

حدیث آخر:۔’’ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لِبلال بن الحارث: اِعلم! قال: ما اعلَمُ یارسول اللّٰہ؟ قال اِنّه من اَحییٰ سنةً من سنتی قدمِیتت بعدی کان له من الاجرمثل من عمل بهامن غیراَن ینقُصَ من اجورهم شیئاً ومن ابتدع بدعةَ ضلالةِ لایرضاهااللّٰہُ ورسولُه کان علیه مثل آثام من عمِل بهالاینقُصُ ذالک من اوزارالناس شیئاً‘‘.(حسن)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارثؓ سے فرمایا: ’’جان لو‘‘! حضرت بلال بن حارثؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول کیا جانوں! آپؐ نے فرمایا یہ کہ جس نے میری سنتوں میں سے کوئی ایسی سنت کو زندہ کیا (یعنی اسے دوبارہ شائع کیا) جسے مردہ بنادیا گیا ہو (یعنی اس پرعمل چھوڑ دیا گیا ہو) میرے بعد تو اس کے لئے اتنا ہی ثواب ہے جتنا ثواب اس پرعمل کرنے والوں کا ہے بغیر اس کے کہ وہ ان کے ثوابوں میں سے کچھ کم کردے۔ اور جس نے کوئی بدعت گمراہی کی نکالی جسے اللہ اور اس کا رسول پسند نہیں کرتے تو اس پر ان تمام لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں کے بوجھ میں سے کچھ کم ہوجائے۔

قولہ:’’اعلم‘‘ یہ کلمہ تنبیہ کی طرح ہے جو مضمون کی اہمیت کے پیش نظر مخاطب کو جگانے اور توجہ سے سننے کے لئے استعمال ہوتا ہے پس حضرت بلالؓ کا مقصد ’’ما اعلم یارسول اللّٰہ؟‘‘ سے یہ ہے کہ میں اس مضمون کے سننے اور اس پرعمل کرنے کے لئے تیار ہوں آپ ارشاد فرمائیں۔ قولہ: ’’من احیاسنتی الخ‘‘ یعنی اس پرعمل کیا یا دوسروں کو عمل کرنے کا کہا جس سے لوگوں نے عمل شروع کیا۔ قولہ: ’’لاینقص‘‘ متعدی ولازمی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس لئے اوپر ترجمہ میں پہلے لاینقص کے ترجمہ میں متعدی کا لحاظ رکھا گیا ہے جبکہ دوسرے میں لازمی کا۔

باقی تشریح پیچھے گذری ہے۔(دیکھئے’’باب ماجاء ان الاسلام بدأ غریباً الخ‘‘ من ابواب الایمان)

گویا متروک سنت کو دوبارہ پروان چڑھانا ’’من سَنّ سُنَّةً حَسَنَةً‘‘ کی طرح ہے اس لئے مُحیِی السنۃ کو تمام عاملین کا جتنا ثواب ہوگا جبکہ مبتدع ’’من سنّ سنة سَیِئَة‘‘ کے زمرے میں آتا ہے اس کا حکم بھی گذرا ہے۔ فلیحفظ۔

حدیث آخر:۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے! اگر تیرے بس میں ہو کہ صبح کرے تو اور شام کرے تو اور تیرے دل میں کسی کے لئے کھوٹ (میل وحسد) نہ ہو تو ایسا ضرور کرو پھر مجھ سے فرمایا اے پیارے بچے! اور یہ خصلت میری سنت ہے

اور جس نے میری سنت زندہ کردی اس نے (گویا) مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ (خوش) کیا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (حسن غریب)

قولہ: "یابُنیّ" بصیغہ تصغیر معلوم ہوا کہ پیار کرنے کی غرض سے اجنبی بچے کو بیٹا کہا جا سکتا ہے۔

قولہ: "لیس فی قلبک غِشٌّ لِاَحَدٍ" بکسر الغین خیر خواہی کی ضد بمعنی بدخواہی کے ہے اور اَحَد میں عموم ہے حتیٰ کہ کافر کے ساتھ بھی خیر خواہی ضروری ہے کہ اس کو ایمان پر لانے کی تدبیر سوچی جائے اور اسے بلاوجہ تنگ نہ کیا جائے۔ قولہ: "فقد احیانی" مشکوٰۃ میں ترمذی کی یہ روایت احیانی کے بجائے اَحَبَّنی نقل کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں من احبَّ سنتی فقد اَحَبّنی بھی ہے۔

قولہ: "وفی الحدیث قصة طویلة" چونکہ یہ روایت ترمذی کے تفردات میں سے ہے اور امام منذریؒ نے "الترغیب" میں اس کو ضعیف کہا ہے۔ اس لئے اس قصہ اور اس کی تفصیل بیان کرنے سے شارحین نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔

باب فی الانتهاءِ عمّانهیٰ عنه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

(ان چیزوں سے دور رہنے کا بیان جن سے آپؐ نے منع فرمایا ہے)

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اُترُکونی ماتر کتُکُم! فاذا حَدَّثتُکُم فخُذُوا عَنّی فانما هلک من کان قبلکم بکثرة سؤالهم وَاختلافهم علی انبیاء هم".
(حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوڑ دو تم مجھے جب تک کہ میں تمہیں چھوڑے رکھوں (یعنی تمہیں کوئی حکم نہ دوں) اور جب میں تمہیں کوئی شے (حکم) بیان کروں تو اس کو مجھ سے لیا کرو (یعنی سیکھو اور عمل کرو) بے شک تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں سے زیادہ سوالات اور ان کی مخالفت کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔

تشریح:۔ قولہ: "اترکونی" یعنی کثرت سے اور فضول سوالات مت پوچھو جیسے بنی اسرائیل کیا کرتے تھے جہاں تک ضرورت کا سوال ہے تو اس کی ممانعت مراد نہیں، چونکہ سوالات سے جواب میں احکام نازل ہوں گے جن پر عمل کرنا پڑتا ہے خواہ اوامر ہوں یا مناہی اور سارے لوگ عمل میں چست تو ہوتے نہیں ہیں

اس لئے امت پر شفقت کی بناء پر آپؐ نے کثرت سوال سے ممانعت فرمائی، نیز بنی اسرائیل سوال پوچھتے مگر اس کے مطابق نازل ہونے والے حکم پر عمل سے کتراتے حالانکہ یہ موجب ہلاکت ہے اس لئے آپؐ نے منع فرمایا۔ معلوم ہوا کہ نبی کی بات پر عمل نہ کرنا اس کی مخالفت کے زمرے میں آتا ہے ہاں البتہ اگر پوری طرح عمل کی استطاعت نہ ہو تو بقدر استطاعت جتنا عمل کرسکتا ہے اُتنا ضرور کرے بالکل ترک نہ کرے جیسے نماز کے درجات ہیں جبکہ مناہی سے مکمل اجتناب لازمی ہے اِلّا یہ کہ اضطرار اور بعض میں ضرورت ہو، چنانچہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: "فاذاأمرتکم بشیء فأتوا منه مااستطعتم واذانهیتکم عن شیء فدعوه".

باب ماجاء فی عالم المدینة

(مدینہ کے بڑے عالم کی فضیلت)

"عن ابی هریرة روایةً یُوشک ان یضرب الناس اکبادَالابل یطلبون العلم فلایجدون احداً اعلم من عالم المدینة". (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوع روایت ہے قریب ہے کہ لوگ اُونٹوں کے جگروں کو ماریں گے وہ علم طلب (تلاش) کررہے ہوں گے پس وہ نہیں پائیں گے کسی کو جو مدینہ کے عالم سے علم میں بڑھ کر ہو۔

تشریح:۔قوله: "روایةً" بناء بر تمیز منصوب ہے اور کنایہ ہے روایت کے مرفوع بیان کرنے سے۔

قوله: "یُوشِک" بکسر الشین ای یقرب وہ زمانہ قریب ہے۔قوله: "ان یضرب الناس اکباد الابل" حالت رفع میں ہے کہ یوشک کا اسم ہے اکباد جمع کبد کی ہے جگر کو کہتے ہیں مراد جگر کے محاذی پہلو ہے اور یہ کنایہ ہے سرعتِ سفر سے کیونکہ طالب علم ہی وہ مسافر ہونا چاہیے جو اپنی طلب میں تڑپتا ہو اور منزل کی طرف لپکتا ہو۔

عبدالفتاح ابوغدہ نے محدث کی تین علامات بلکہ شرائط ذکر کی ہیں: (۱) سریع المشی (۲) سریع الکتابت (۳) سریع القرأت اور اپنی طرف سے چوتھی کا اضافہ کیا ہے (۴) سریع الاکل تاکہ وقت کی بچت ہو۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے لااُبالی پن کی وجہ سے دنیا والوں کو سب سے زیادہ فارغ عالم دین نظر آتا ہے کہ وہ ہمیں اور خصوصاً ان علماء کو جو عوام سے جُڑے ہوئے ہیں جیسے ائمہ مساجد، سکول ٹیچرز اور سیاسی اکثر علماء وہ ان کو اکثر اوقات گپ شپ میں مصروف دیکھتے ہیں اس سے ہمارے اسلاف کی بھی قدر یکسر ختم ہوگئی ا ہ افسوس۔

اس حدیث کے مصداق میں یقین سے کچھ کہنا تو ممکن نہیں البتہ اس کا مطلب ہم یوں بیان کرسکتے ہیں

کہ یا تو جنس عالم مراد ہے کوئی شخص مراد نہیں اس بناء پر صحابہ کرامؓ کا اولین دور مراد ہے کہ علم ابھی دنیا میں پھیلا نہیں تھا اس لئے جب اسلام جزیرہ نما عرب سے باہر نکل گیا تو لوگوں نے علم کی تحصیل کے لئے مدینہ کا رُخ کیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ مراد فرد معین ہے پھر اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اسلام کے آخری دور کی بات ہو رہی ہو یعنی اس کا مصداق ابھی تک رونما نہیں ہوا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شخصیت گزر چکی ہو اس کو امام ترمذیؒ نے بیان کیا جمہور کے نزدیک یہ امام مالکؒ ہیں جبکہ بعض کے نزدیک یہ عمری ہیں تاہم عمری حضرت عمر بن خطابؓ کے پڑپوتے عبدالعزیز نہیں بلکہ عبداللہ بن عمرؓ کے پڑپوتے عبداللہ بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم ہیں گویا ترمذی کی عبارت میں سہو ہوا ہے حافظ ابن حجرؒ نے التقریب میں اس پر تنبیہ کی ہے۔ (کذا فی تحفۃ الاحوذی)

باب ماجاء فی فضل الفِقہ علی العبادۃ

((نفلی) عبادت سے فقاہت کے افضل ہونے کا بیان)

"عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: فقیہٌ اَشَدُّ علی الشیطان من الفِ عابدٍ". (غریب)

ایک سمجھ دار (ماہر) عالم شیطان پر، ہزار عابدوں سے زیادہ سخت تر ہے۔

تشریح:۔ ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ حدیث تو غریب ہے لیکن اس کے معنی ظاہر ہیں اس لئے فقہ فہم کو کہتے ہیں پس اگر ایک طرف عابد مسلسل عمل تو کر رہا ہے لیکن دوسری طرف وہ ابلیس کی تلبیس سے نہیں بچ سکتا جبکہ فہم دین رکھنے والا شخص تذکیر و تذکّر کرتا ہے اس لئے عابد کے مقابلے میں افضل ہے تاہم اگر اس کے ساتھ عمل بھی شریک ہو جائے تو پھر اس کا مصداق وہ عالم بن جائے گا جس کے بارے میں امام ترمذیؒ نے اسی باب میں آگے نقل کیا ہے "عالم عامل یُدعی کبیراً فی ملکوت السمٰوات" ایک روایت میں کبیراً کے بجائے عظیماً آیا ہے۔ اور ایسا عالم وارث انبیاء بھی بن جاتا ہے۔

غرض شیطان فساد پھیلاتا ہے اور شر کا جال بچھاتا ہے جبکہ عالم نہ تو خود اس کے جال میں پھنستا ہے اور نہ ہی لوگوں کو پھنسنے دیتا ہے جبکہ جاہل عابد بسا اوقات عبادت میں لگا رہتا ہے حالانکہ وہ شیطان کے جال میں پھنس چکا ہوتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں ہوتا ہے اس موضوع پر ابن الجوزیؒ کی کتاب تلبیس ابلیس ایک جامع تصنیف ہے

وہ لکھتے ہیں کہ عابد کی عبادت کا نفع اس کے گھر کے دروازے سے آگے نہیں جاتا جبکہ عالم دین خلقِ خدا کو گمراہی سے ہدایت کی طرف بُلاتا ہے یعنی عالم شیطان کی مکاریوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے بغیر علم کے عبادت کا شغل اپنایا تو انہوں نے امت کے خلاف تلواریں نکالیں:

"فقال ابن القاسم :سمعت مالكاً يقول:ان اقواماً ابتغواالعبادة وَاَضاعوا العلم فخرجوا على امة محمد صلى الله عليه وسلم بِاَ سيافهم ولو ابتغوا العلم لَحَجَزَهم عن ذالك". (مفتاح دارالسعادة:ص:۱۲۳)

ابن قیمؒ نے مفتاح دارالسعادۃ کے اسی صفحہ پر یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ہمارے پاس اتنی تعداد میں طلبہ نے قرآن پڑھا تو حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ ان کے نام رجسٹر میں لکھ کر ان کے لئے وظائف مقرر کردیں پھر اگلے سال انہوں نے زیادہ تعداد لکھی اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان کے نام مٹادیں ایسا نہ ہو کہ لوگ جلدی جلدی بغیر تفقہ کے قرآن پڑھنے لگیں:

"فكتب اليه عمران امحهم من الديوان فانى اَخاف من ان يسرع الناس فى القر آن (قبل)ان يتفقّهوافى الدين فيتاوّلوه على غيرتاويله". (ایضاً)

حدیث آخر:۔ حضرت قیس بن کثیر (والصحیح کثیر بن قیس) فرماتے ہیں کہ ایک شخص مدینہ سے حضرت ابودرداءؓ کے پاس آیا جبکہ وہ دمشق (شام) میں تھے، ابودرداءؓ نے پوچھا: میرے بھائی کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا ایک حدیث (سُننے) کی غرض سے مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ اس کو (براہ راست) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا: کیا تم کسی اور کام سے نہیں آئے ہو؟ اُس نے کہا "نہیں" ابودرداءؓ نے پوچھا کیا تجارت کی غرض سے نہیں آئے ہو؟...... اُس نے کہا "نہیں" اس نے کہا بس میں صرف اس حدیث سننے کی نیت سے آیا ہوں!

حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا تو (خوش خبری سُن لو کہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے سُنا ہے کہ جو کوئی ایسے راستہ پر چلے جس میں وہ علم ڈھونڈھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی طرف جانے والے راستہ پر چلاتا ہے، اور یہ کہ فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں طالب علم کی خوشنودی کے لئے، اور یہ کہ عالم جو ہوتا ہے اس کے لئے وہ سب مخلوقات دعائے مغفرت کرتی ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین پر ہیں یہاں تک کہ

پانی میں مچھلیاں بھی۔ اور یہ کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چاند کی باقی ستاروں پر ہے۔

بے شک علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں بے شک انبیاء نے دینار و درھم کی وراثت نہیں چھوڑی ہے بلکہ انہوں نے علم ہی میراث میں چھوڑا ہے، تو جس نے علم حاصل کیا بلاشبہ اس نے بھرپور حصہ حاصل کیا" **"ولا نعرف هذا الحديث الامن حديث عاصم بن رجاء بن حيوة وليس اسناده عندى بمتصل الخ"** یعنی اس حدیث کی سند میں بہت اختلاف ہے اگرچہ یہ متعدد کتب حدیث میں مروی ہے تاہم اس کے اجزاء مختلف صحیح اسانید سے مروی ہیں۔

قوله: "فانى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ" اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ وہی حدیث ہو جس کے لئے وہ شخص آئے تھے، دوم یہ کہ یہ اس کو بطور خوش خبری کے سُنائی کہ تیرا یہ سفر اتنی برکات پر مشتمل ہے۔ **قوله: "من سَلَكَ طريقا ...... سَلَكَ الله به الخ"** اس حدیث کا یہ جزء ابواب العلم کے شروع میں "باب فضل طلب العلم" میں گذرا ہے۔ **سلک الله بـه** میں "بہ" کی ضمیر "من" کی طرف راجع ہے اور "باء" تعدی کے لئے ہے **اى جعلـه سـالِكـاً وَوَفّقه ان يسلك طريق الجنة** جیسا کہ حاشیہ پر مرقات سے نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ضمیر علم کی طرف راجع ہو اور باء سببیت کے لئے ہو اس صورت میں "من" موصولہ کی طرف عائد ضمیر کو مقدر ماننا پڑے گا تقدیر اس طرح ہوگی: **"سَهَّلَ الله لـه بسبب العلم طريقاً الى الجنة۔"**

قولـه: "وان الـمـلائكة لتضع الخ" فرشتوں کے پر اور بازو بچھانے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں متعدد اقوال ہیں: ایک یہ کہ اس کے قدموں کے نیچے بطور فرش بچھا دیتے ہیں یہ معنی حقیقی ہے اور اس کے ماننے میں استبعاد نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرا احتمال بمعنی تواضع کے ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ سیاحین فرشتے جب طالب علم کو دیکھتے ہیں تو اپنا سفر اور طیران منقطع کر کے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، یہ دونوں آخری معنی تاویلی ہیں۔ **قولـه: "وفضل العالم على العابد"** مراد بے عمل عالم اور محض جاہل عابد نہیں بلکہ فرض عبادت اور ضروری علم جن میں دونوں شریک ہوں اس کے بعد ایک شخص نفلی عبادت میں مصروف رہتا ہے جیسے نفلی نمازیں اور روزے جبکہ دوسرا تبحّر فی العلم اور اس کی نشر و اشاعت میں لگا رہتا ہے تو ان میں سے عالم کا درجہ بہت بلند ہے جس کی وجہ سابقہ حدیث میں گذری ہے۔ یاد رہے کہ سنن بھی فرائض میں شامل ہیں بطور تابع کے۔

قولـه: "كـفضل القمر الخ" اس میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک یہ کہ چونکہ چاند کا نور

سورج سے ماخوذ ہوتا ہے اس لئے محمود علم وہی ہے جو نور نبوت جو بمنزلہ شمس کے ہے سے مستفاد ہو۔ دوسرا: یہ کہ امت میں جو بھی جتنا بھی بڑا ہوگا مگر وہ مقام نبوت سے پھر بھی بہت نیچے ہوتا ہے کیونکہ سورج اور چاند کی روشنی میں جو تفاوت ہے وہ سب پر عیاں ہے جبکہ ستارے تو بہت پیچھے ہیں۔

حدیث آخر:۔ "**قال یزید بن سلمة یارسول الله انی سمعتُ منک حدیثاً کثیراً اَخاف ان یُنسِیَ (یُنسِینی) اَوَّلَه آخِرُه فَحَدِّثنی بکلمة تکون جِمَاعاً قال: اِتَّقِ الله فیماتعلم**". (**لیس اسناده بمتصل......مرسل**)

حضرت یزید بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ کے رسول! میں نے آپ سے بہت سی احادیث سنی ہیں لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آخر مجھ سے ان کا اول بھلا دے گا لہٰذا کوئی ایسی حدیث مجھ سے فرما دیجئے جو جامع ترین ہو آپؐ نے فرمایا: ڈرو تم اللہ سے ان چیزوں میں جن کو تم جانتے ہو (یعنی احکام)۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو مرسل کہا ہے مگر ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی صحیح ہیں "**ولکن الحدیث صحیح المعنی الخ**".

قوله: "**ان یُنسِیَ اوله آخره**" اِنساء سے بمعنی بھلا دینے کے ہے اولہ اس کا مفعول بہ اور آخرہ فاعل ہے یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سب احادیث یاد رکھنا میرے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ **قوله:** "**جِمَاعاً**" بروزن کتاب جو تمام خیر و بھلائی کو یکجا کرنے والی ہو۔ **قوله:** "**فیماتعلم**" یعنی جو جو حرام ہیں اور تمہیں معلوم ہیں ان سے بچو اور جو اوامر ہیں اس پر عمل کرو، یعنی بقدر استطاعت، جیسا کہ پیچھے گذرا ہے۔

حدیث آخر:۔ "**خصلتان لاتجتمعان فی منافق حُسنُ سمتٍ ولافقهٌ فی الدین**". (**غریب**)

دو خوبیاں ہیں جو کسی منافق میں جمع نہیں ہوتیں عمدہ اخلاق اور دین کی سمجھ داری۔

قوله: "**لاتجتمعان**" یہ قضیہ سالبہ ہے دونوں کی عدم موجودگی کی صورت میں بھی صادق ہے اور ایک ہو دوسرا نہ ہو پھر بھی صادق ہے مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں منافق میں یکجا نہیں ہوسکتی ہیں کیونکہ فضائل کے لئے محل کی عمدگی چاہئے جو منافق میں نہیں ہے۔ **قوله:** "**سمت**" بروزن شمس اخلاق، سیرت اور اچھے طریقہ وسلیقہ کو کہتے ہیں۔ **قوله:** "**ولافقه فی الدین**" لا تاکید کے لئے ہے جیسے **غیر المغضوب علیهم ولاالضالین**۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دوشخصوں کا تذکرہ کیا گیا، ایک ان میں سے عبادت گذار تھا دوسرا عالم تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم**'' عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری افضلیت تم میں سے معمولی آدمی پر ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مزید) فرمایا بے شک اللہ رحمتیں نازل فرماتا ہے اور فرشتے اس کے اور زمین وآسمانوں والے یہاں تک کہ چیونٹی اپنے سوراخ میں اور حتیٰ کہ مچھلیاں بھی لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والے (عالم) کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ (حسن غریب صحیح)

قولہ: ''**رجلان احدھما عابد والآخر عالم**'' اس کا مطلب عرض کیا جا چکا ہے کہ مراد زائد علم وعمل ہے فرض عمل وعلم کا دونوں کے لئے یکساں ہونا ضروری ہے اس میں تفاوت یا تفاضل مراد نہیں ہے۔

اس حدیث سے عالم کی فضیلت نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے امام ترمذیؒ نے فُضیل بن عیاض کا قول نقل کیا ہے کہ باعمل عالم جو لوگوں کو خیر وبھلائی کی تعلیم دیتا ہے عالمِ بالا میں بڑا شخص پکارا جاتا ہے یعنی بڑی شان وشوکت سے یاد کیا جاتا ہے اور فرشتے اس کا تذکرہ ادب واحترام سے کرتے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ وہ خلق خدا کو صرف گندے تالابوں سے صاف ستھرے تالاب کی طرف رہنمائی ہی نہیں کرتا بلکہ مخلوق کو صاف سُتھرا آبِ حیات ابدی مہیا کرتا ہے اس سے بڑی خدمتِ خلق وخیر خواہی کیا ہو سکتی ہے اس لئے اس کی یہ خدمت اس کے رفع درجات کا باعث بن جاتی ہے۔

قولہ: ''**فضل العالم علی العابد**'' ان دونوں میں الف لام جنس کے لئے ہے۔ **قولہ:** ''**کفضلی علیٰ ادناکم**'' اس میں زبردست مبالغہ فرمایا ورنہ یوں فرماتے کہ ''**کفضلی علی اعلیٰ کم**'' تب بھی مقصد پورا ہو جاتا اور وہ بھی مبالغہ ہی ہوتا مگر عالم باعمل کی شان کو خوب نمایاں کرنے کے لئے فرمایا علیٰ ادناکم۔

حدیث آخر:۔ **لن یشبع المؤمنُ من خیر یسمعه حتی یکون منتهاه الجنة**''. (حسن غریب)

مؤمن ہرگز سیر نہیں ہوتا ہے خیر سے جس کو وہ سنتا ہے یہاں تک کہ اس کی انتہاء جنت پر ہو جاتی ہے۔

قولہ: ''**لن یشبع المؤمن من خیر یسمعه**'' المؤمن میں الف لام عہد کے لئے ہے مراد کامل مؤمن ہے اور خیر سے مراد علم ہے، خواہش چاہے محسوسات کی ہو یا معقولات کی یہ کبھی بھی دنیا میں پوری نہیں ہو سکتی اس کی تکمیل کی واحد جگہ جنت ہے کیونکہ وہاں سب کچھ ہے، یہاں حدیث میں اگرچہ جنت سے مراد موت

ہے کیونکہ موت پر تحصیل علم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے تاہم عالم کی قبر گویا اس کی جنت ہے اس لئے تعبیر جنت سے کردی بخلاف منہوم فی الدنیا کہ اس کی خواہش کے منتہاء کے لئے قبر کی مٹی ذکر فرمائی ہے "ولا یملأ فاہ الا التراب" جیسا کہ ابواب الزہد میں گزرا ہے۔

حدیث آخر:۔ "الکلمة الحکمة ضالة المؤمن فحیث وَجَدَھَا فھو اَحَقّ بھا". (غریب)
دانشمندی کی بات مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، پس وہ جہاں بھی اس کو پائے تو اس کا زیادہ مستحق ہے۔

قولہ: "الکلمة الحکمة" حکمت دانشمندی کو کہتے ہیں اس کا حمل واطلاق کلمہ پر مبالغۃً ہے جیسے زید عدل ایک روایت میں الکلمۃ الحکیمۃ آیا ہے وہاں اسناد مجازی ہے کیونکہ حکیم صاحب حکمت ہوتا ہے ایک روایت میں کلمۃ الحکمۃ اضافت موصوف الی الصفۃ کے ساتھ آیا ہے۔

بہرحال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حکمت کی بات مومن کی گمشدہ چیز کی مانند ہے لہٰذا وہ جس کے پاس اسے پائے اس پر عمل کرے اس کو نہ دیکھے کہ یہ بات میں کس سے سُن رہا ہوں بلکہ بات کی قدر کو دیکھے یا مطلب یہ ہے کہ کبھی حکمت کی بات ایک شخص کے پاس ہوتی ہے مگر وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتا مگر جب حکیم کو ملتی ہے تو وہ گویا اس کا مستحق ہے اسے لاقط سے لے لے۔

اس میں ایک رمز یہ بھی ہے کہ جس کے پاس کچھ علم ہے تو وہ اسے ضائع نہ کرے اور بُخل بھی نہ کرے بلکہ دوسروں تک پہنچائے کیونکہ اگر وہ اس کا مطلب اور قدر نہیں جانتا تو اپنے سے زیادہ اَفقہ تک پہنچائے تا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے بعینہ اسی طرح جیسے کسی کو لُقطہ مل جائے تو وہ اس کی حفاظت کرے اور مالک تک پہنچائے خواہ وہ چیز خسیس ہو یا نفیس۔

فائدہ:۔ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قائل کو نہ دیکھا جائے بلکہ قول کو دیکھا جائے اگر بات صحیح ہے تو مان لینی اور لے لینی یعنی قبول کر لینی چاہئے، مگر یاد رہے کہ یہ کام فقط ماہر ہی جانتا ہے کہ کون سی بات صحیح ہے؟ اور کتنی وزنی ہے؟ اور کون سی غلط ہے؟ جیسے جوہری، جواہرات کو جانتا ہے عام آدمی نہیں جانتا اسی طرح عام آدمی کو یہ لازم ہے کہ مستند عالم دین کی تقلید کرتا رہے وہ از خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتا ہے کہ فلاں کی بات صحیح ہے اور فلاں کی غلط کیونکہ اس کے پاس باتوں کو پرکھنے کی کسوٹی نہیں ہوتی ہے۔

اس مقصد کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو بجائے ابواب الایمان کے ابواب العلم میں ذکر فرمایا کہ یہ کام علماء کا ہے۔ (تدبر)

ابواب الاستیذان والآداب

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(اجازت چاہنے اور اچھی عادتوں کا بیان)

استیذان کے معنی اذن یعنی اجازت طلب کرنے کے ہیں جس کے مختلف مراتب ہیں جوان ابواب میں بیان ہوں گے، اورآداب، ادب کی جمع ہے اصل میں بُلانے اوردعوت دینے کو کہتے ہیں چونکہ خِصالِ حمیدہ اوراخلاقِ حسنہ بھی اچھے اچھے کاموں اوراچھی باتوں پرآمادہ کرتے ہیں گویا اچھی عادتوں کی دعوت دیتے ہیں اس لئے خِصالِ حمیدہ کوآداب کہاجاتا ہے عرف عام میں ایسی عادتوں کوسلیقہ مندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی افشاء السلام

(سلام کی ترویج اور عام کرنے کے بیان میں)

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :والذی نفسی بیدہ لاتدخلوا الجنۃ حتی تؤمنوا، ولاتؤمنوا حتیٰ تحابوا! الا اَدُلُّکم امراً اذا انتم فعلتموہ تحاببتم! اَفشوا السلام بینکم". (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاقسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم جنت میں داخل نہیں ہوسکو گے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ! اورتم مؤمن (کامل) نہیں بن سکتے ہوجب تک آپس میں محبت نہ کرو! کیا میں تمہیں ایساامر نہ بتاؤں کہ جب تم اس پرعمل کرو گے تو ایک دوسرے سے محبت کرو گے؟ آپس میں سلام کوعام کرو!

تشریح: قولہ: "لاتدخلوا" نہی بمعنی نفی ہے یعنی لا تدخلون الجنۃ الخ۔ قولہ: "ولاتؤمنوا" سابقہ جملہ توبدیہی ہے کیونکہ بغیرایمان کے جنت میں جانا محال ہے اوراس میں کسی کواختلاف نہیں۔ یہ اس وقت ہے کہ اس حدیث میں ایمان سے مرادنفس ایمان ہواوراگر کامل ایمان ہوتو مطلب یہ ہوگا کہ

جب تک تم کامل مؤمن نہیں بنو گے اس وقت تک اکرام کے ساتھ جنت میں نہیں جاؤ گے یا دخول اولی نصیب نہیں ہوگا علی ہذا دوسرے جملے کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرو گے اس وقت تک کامل مؤمن نہیں بن سکتے۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تو شرط ایمان ہے ہی اور چونکہ اللہ کو یہ بات پسند ہے کہ لوگ (مسلمان) آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اس لئے حدیث باب میں اسے مدار ایمان قرار دیا۔ پھر اللہ سے محبت یہ ہے کہ دل میں اس کے برابر کوئی دوسری محبت نہ ہو اور اس کے حکم کے مساوی کسی بات کو نہ سمجھے (چہ جائیکہ اس سے اعلیٰ تصور کرے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں ان کے مقام کے برابر کسی کا مقام نہ سمجھا جائے۔ اسی طرح ان سے محبت سب لوگوں سے بڑھ کر ہو۔ مؤمن کی محبت یہ ہے کہ جو اپنے لئے پسند کرے وہی دوسرے مؤمن کے لئے بھی پسند کرے یعنی آدمی جتنا اپنا خیر خواہ ہے اتنا ہی دوسرے کا بھی ہمدرد بنے۔ پھر آپؐ نے اس محبت کے حصول کا طریقہ ارشاد فرمایا کہ آپس میں سلام کو فروغ دیں کیونکہ ایک تو یہ باہمی تعلق کا پختہ ذریعہ ہے، دوم اس سے دین کے شعائر اُجاگر کرنے میں غیر معمولی مدد ملتی ہے، اس سے اہل ایمان میں وحدت و یکجہتی پیدا ہوتی ہے جس سے ان کو اور ایمان کو تقویت اور کفار کو ذلت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں سلام کو رواج دینے کا حکم ہے تاہم تقریباً اکیس مقامات سلام کرنے سے مستثنیٰ ہیں۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی: ص:۲۸۸ ج:۱)

باب ماذکر فی فضل السلام

(سلام کی فضیلت کا بیان)

"عن عمران بن حُصین ان رجلاً جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: السلام علیکم! فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "عشر" ثم جاء آخر فقال السلام علیکم ورحمۃ اللہ! فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "عشرون" ثم جاء اخر فقال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "ثلاثون". (حسن غریب)

حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا السلام علیکم! ۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس (نیکیاں) ہوگئیں (یعنی جواب دینے کے بعد فرمایا کہ

اس کودس نیکیاں مل گئیں) پھرایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، سو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیس (نیکیاں لکھی گئیں) پھرایک تیسرا شخص آیا اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیس (ہوگئیں)۔

تشریح:۔ چونکہ قرآن حمید میں ضابطہ بیان ہوا ہے "**من جاء بالحسنة فله عشر امثالها**" کہ ایک نیکی کے بدلے دس گنا اجر وثواب ملے گا اس لئے پہلے شخص کے لئے دس نیکیوں کی خوش خبری ارشاد فرمائی کہ اس نے ایک ہی جملہ میں سلام ادا کیا جبکہ دوسرے نے دو جملوں میں لہٰذا وہ بیس کا مستحق ہوا اور تیسرا تین جملوں کی وجہ سے تیس نیکیاں کمانے میں کامیاب ہوا۔

اس حدیث پاک سے یہ معلوم ہوا کہ سلام پر ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کا اضافہ مستحسن ہے اور چونکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "**واذا حُيِّيتم بتحيّة فحيُّوا باحسنَ منها اوردّوها**"۔ (النساء: آیت: ۸۶) یعنی اگر تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو یا اسی طرح کا جواب دو! یعنی سلام پر اضافہ کرو یا کم از کم وہ کلماتِ سلام لوٹا دو۔ علی ہذا اگر کوئی سلام میں کہے **السلام علیکم** تو جواب میں **وعلیکم** پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ جواب میں کہا جائے **وعلیکم السلام ورحمة الله** یا کم از کم **وعلیکم السلام** ضرور کہہ دے، اس آیت میں تحیہ سے مراد سلام ہی نہیں بلکہ عام ہدایا کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

تاہم ان دو کلموں کے اضافہ کے علاوہ کسی تیسرے کلمہ کا اضافہ بھی مستحسن ہے؟ تو تحفۃ الاحوذی میں فتح الباری کے حوالے سے کچھ ضعیف احادیث نقل کر کے لکھا ہے کہ ابن عمرؓ وبرکاتہ کے بعد کچھ کلمات کا اضافہ فرماتے نیز باب کی حدیث کے بعض طرق میں یہ اضافہ ہے کہ ایک چوتھے شخص نے آ کر سلام کیا اور ومغفرتہ کا اضافہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: "اربعون" یعنی چالیس نیکیاں ہوگئیں، پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ احادیث ضعیف ہیں مگر ان کے مجموعہ سے کم از کم جواز ثابت ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء في أنَّ الاِستيذان ثلاث

(اجازت تین مرتبہ تک طلب کرنی چاہیئے)

"عن ابی سعید قال اِستأذن ابوموسیٰ علی عمر فقال: السلام علیکم أأدخلُ؟؟ فقال عمر: "واحدة" ثم سَكَتَ ساعةً ثم قال: السلام علیکم أأدخلُ؟ فقال عمر: "ثنتان" ثم

سَکَتَ ساعةً فقال السلام علیکم ااَدخلُ؟فقال عمر: "ثلاث" ثم رجع فقال عمر لِلبوّابِ ماصَنَعَ؟ قال رَجَعَ قال عَلَیَّ به فلماجاءَ ه قال ماهذاالذی صنعتَ؟ قال :"السنةَ" قال السنةَ؟ واللهِ لَتَأتِیَنّی علی هذابرهان وبَیّنَةٍ اولَأفعَلَنّ بک اقال فَاَتَانا ونحن رُفقَةٌ من الانصار فقال: یامعشر الانصار ألستم اعلم الناس بحدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم ؟ألم یقل رسول الله صلی الله علیه وسلم :الاستیذان ثلاث فإن أُذِنَ لَکَ والاّ فارجع؟فجعل القوم یُمازحونه قال ابوسعیدثم رفعت رأسی الیه فقلت ماأصابک فی هذامن العقوبة فَاَنَاشریکُکَ قال فَأتیٰ عمرَ فاخبره بذالک فقال عمر:ماکنتُ علمتُ بهذا".(حسن صحیح)

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ابوموسیٰ (اشعری رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے اجازت مانگی (بایں صورت کہ) کہا "السلام علیکم" کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ تو عمرؓ نے فرمایا ایک بار (اجازت مانگی) پھر وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر کہا "السلام علیکم" کیا میں اندر آجاؤں؟ تو عمرؓ نے فرمایا دو ہوئیں، چنانچہ وہ پھر کچھ دیر چپ کھڑے رہے پھر کہنے لگے "السلام علیکم" کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: تین بار ہوئیں، پھر ابوموسیٰؓ واپس چلے گئے، پس عمرؓ نے اپنے دربان سے کہا: انہوں نے کیا کیا؟ دربان نے کہا وہ لوٹ گئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا جا ان کو میرے پاس لاؤ! چنانچہ جب وہ آئے ان کے پاس تو حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ تم نے کیا کیا؟ (یعنی کیوں واپس چلے گئے؟) انہوں نے جواب دیا کہ سنت کی رُو سے واپس گیا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ سنت ہے؟ بخدا ضروری ہے کہ یا تو تم اس پر گواہ (دلیل) لاؤ گے یا پھر میں تمہیں نمونہ عبرت بنادوں گا! حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس آئے جبکہ ہم انصار ایک گروہ کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے (یعنی کچھ لوگ مل کر بیٹھے تھے) پس انہوں نے کہا اے گروہ انصار کے! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو سب سے زیادہ جاننے والے نہیں ہو؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا ہے کہ اجازت تین مرتبہ طلب کی جائے۔ پس اگر اجازت مل جائے تمہیں (تو داخل ہو) ورنہ واپس چلے جاؤ! پس لوگوں نے (ان کو پریشان دیکھ کر) ان پر ہنسنا شروع کیا ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے اپنا سر اٹھا کر ان کی طرف (دیکھا) اور کہا آپ کو اس مسئلہ میں جو سزا ہوگی میں اس میں آپ کے ساتھ برابر شریک رہوں گا، راوی کہتا ہے کہ ابوسعیدؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور انہیں یہ حدیث سنائی، پس حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی (یعنی کہ تیسری مرتبہ اجازت نہ ملنے کی صورت میں واپس جانا چاہئے اور مزید اصرار نہیں

کرنا چاہئے)۔

تشریح:۔قوله:"فقال عمر واحدة"ای استیذانة واحدة یعنی حضرت عمرؓ نے حاضرین سے کہا کہ ابھی صرف ایک دفعہ اجازت ہوگئی ہے اس لئے ہمارے پاس اجازت دینے میں تاخیر کی گنجائش ہے، حضرت عمرؓ یا تو مصروف تھے جیسا کہ مسلم کی روایت میں اس کی تصریح ہے:"ونحن حینئذٍ علی شغل الخ"۔ (مسلم:ص:۲۱۱ج:۲) یا پھر وہ ایک سنت پر عمل کرنا چاہتے تھے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس باب میں ذکر کیا ہے کہ:"وقد کان عمر استأذن علی النبی صلی الله علیه وسلم ثلاثا فاذن له"تو ذہن میں یہ تھا کہ تیسری بار استیذان کے بعد اجازت دے دوں گا تاہم ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ تیسری مرتبہ کے بعد تو واپسی ہونی چاہئے۔امام بخاریؒ کی"الادب المفرد" کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کوفہ میں اپنے ملنے والوں کو انتظار کرواتے تو حضرت عمرؓ نے ان کی تادیب کے لئے ان سے بھی انتظار کروانا چاہا تا کہ ان کو معلوم ہو کہ لوگوں پر ملاقات کا انتظار کتنا بھاری گذرتا ہے۔**قوله:**"السنة"بالنصب یعنی اتبعتَ السنةَ۔**قوله:**"لَتَاْتِیَنّی علی هذا ببرهان الخ یعنی اپنی بات پر گواہ پیش کرنا ہوگا ورنہ"لافعلن بک"یہ جملہ مختلف تعبیرات میں مروی ہے سب کا خلاصہ یہ ہے کہ تجھے سزا دوں گا۔

جو لوگ حدیث پر عمل کرنے سے جان چھڑواتے ہیں ان کو بہانہ مل گیا اور کہنے لگے کہ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو تحقیق پیش کرنے کا پابند اس لئے بنایا کہ ان کی حدیث خبر واحد تھی جو حجت نہ تھی...مگر یہ تأثر قطعاً غلط ہے۔چونکہ بے شمار واقعات و دلائل اس پر صریح ناطق ہیں اور ثبوت کے لحاظ سے وہ دلائل صحیح بھی ہیں کہ تمام صحابہ کرامؓ بشمول حضرت عمرؓ خبر واحد کو حجت و دلیل تسلیم کرتے تھے اس لئے حضرت عمرؓ کے اس جملے کی تاویل صحیح ضروری ہے۔ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں اس کی سات وجوہات بیان کی ہیں، جن میں سے ایک توجیہ یہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا تھا کہ کہیں لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لئے احادیث بنانے یا بیان کرنے کی جسارت نہ کریں۔یہ خوف ان کو منافقین و مبتدعین کی طرف سے محسوس ہونے لگا تھا حضرت ابوموسیٰ یا صحابہ کرامؓ میں سے کسی کے متعلق ہرگز نہ تھا کلا و حاشا وہ صحابہ کرام کے بارے میں غلط تصور کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کی وساطت سے دوسروں کو سبق پڑھانا چاہتے تھے یعنی انہوں نے یہ کام سد ذرائع اور سد باب کے لئے کیا:

"فَاَرَادسد الباب خوفاً من غیر ابی موسیٰ لاشکاً فی روایة ابی موسیٰ فانه

عند عمر اجل من ان یظن به ان یُحَدِّث عن النبی صلی اللہ علیه وسلم مالم یقل بل ارادزجر غیره بطریقه الخ". (نووی بر مسلم: ص:۲۱۱ج:۲)

بالفرض اگر مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کا مقصود تحقیق ہی کروانا تھا تو پھر کہا جائے گا کہ یہ تحقیق خبر واحد کے غیر معتبر ہونے کی وجہ سے نہ تھی کیونکہ جب ابوموسیٰ اور ابوسعید رضی اللہ عنہما حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور حضرت ابوسعیدؓ نے روایت بیان کی تو یقیناً وہ خبرِ واحد کے درجہ سے نہیں بڑھی کیونکہ خبر متواتر سے کم بہرحال خبر واحد ہے بلکہ وہ مزید اطمینان کے لئے ایسا کرنا چاہتے تھے اور اطمینان بالائے اطمینان تو ہوسکتا ہے جیسا کہ یقین بالائے یقین ہوسکتا "قال بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی"۔(الآیۃ)

قوله: "فجعل القوم یمازحونه" مسلم کی روایت میں ہے: "فجعلوا یضحکون" اس سے ابن العربیؒ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی پریشان حال آدمی کی پریشانی دور کرنے کا طریقہ کسی کے پاس موجود ہو تو (کچھ دیر کے لئے) اس کے ساتھ مذاق کرنا جائز ہے (یعنی حدود شرعی کے اندر) کیونکہ اس مذاق سے بھی اس کی پریشانی میں کمی آتی ہے کہ اس پریشان آدمی کو بھی احساس ہوجائے گا کہ یہ مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہے۔

قوله: "فقال عمر ما کنت علمت بهذا" یعنی مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تیسری مرتبہ اجازت نہ ملنے کی صورت میں واپس لوٹنا چاہئے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: "خفی عَلَیَّ هذا من امر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الهانی عنه الصفق بالاسواق" یعنی تجارت کے شغل کی وجہ سے یہ مسئلہ مجھ پر مخفی رہا۔ امام ترمذیؒ نے اس کی وجہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ چونکہ حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار اجازت طلب کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی تھی۔ تدبر

اس حدیث سے استیذان کی اہمیت معلوم ہوئی کہ بغیر اجازت کے کسی کے گھر میں یا خاص طور پر رہنے اور ٹھہرنے کی جگہ میں نہیں جانا چاہئے بلکہ اجازت طلب کرلی جائے اگر اجازت مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ داخل ہونے کی ضد نہ کی جائے۔ استیذان کی مشروعیت پر اجماع ہے اور قرآن وسنت سے بھی صراحتاً ثابت ہے۔ چنانچہ امام ترمذیؒ کا یہ باب اسی مقصد کے لئے ہے اور قرآن پاک کی سورۂ نور کی آیات میں بھی استیذان کا حکم ہے:

"یاایها الذین امنوا لاتدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتیٰ تستأنسوا وتسلّموا علی اهلها ذالکم خیر لکم لعلکم تذکّرون....الی....وان قیل لکم

ارجعوا فارجعوا.... الی.... لیس علیکم جناح ان تدخلوا بیوتاً غیر مسکونۃ فیھا متاع لکم"۔ (سورۂ نور: آیت: ۲۷، ۲۸، ۲۹)

اس کی تفسیر میں ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اجازت لینے کا رواج نہیں تھا بلکہ لوگ یوں ہی خاموشی سے گھر میں داخل ہو جاتے اور کہتے میں آ گیا وغیرہ، جس کی وجہ سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس رسم کو ختم کیا اور استیذان کا حکم دیا۔ چونکہ استیذان کا مقصد دوسروں کے عیوب سے نظر بچانا ہے اس لئے ملاقاتی شخص کو دروازے کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہئے بلکہ وہ دائیں یا بائیں ایسی جگہ کھڑا رہے کہ نہ تو سامنے سے گھر کا اندرونی حصہ نظر آئے اور نہ ہی دروازہ کھلنے کی صورت میں نظر اندر پڑے۔

پھر اجازت پہلے لے یا سلام پہلے کرے تو اس میں تین اقوال ہیں: ایک اختیار کا دوسرا پہلے استیذان کا تیسرا جو اصح ہے پہلے سلام کرے پھر استیذان۔ مندرجہ بالا آیت میں حتیٰ تستأنسوا کا یہی مطلب ہے کہ حتیٰ تستأذنوا یعنی بغیر اجازت کے داخل مت ہو، لہٰذا اگر تین بار اجازت طلب کرنے کے باوجود اجازت نہیں ملی حالانکہ صاحب خانہ کو استیذان کا علم ہوا یا اس نے صریح الفاظ میں ملنے سے معذرت کر لی تو پھر اصح قول کے مطابق واپس لوٹ جانا چاہئے جیسا کہ باب کی حدیث میں ہے۔

تاہم استیذان ایسے مواقع پر مستحب ہے جہاں آدمی بغیر اجازت کے ملنا پسند نہیں کرتا مثلاً گھر میں یا کسی ادارے یا خانقاہ کے مخصوص کمرہ میں جہاں آدمی اپنے ذاتی معمولات میں مصروف ہو مثلاً ذاتی کام یا کوئی ایسا کام ہو جس کے لئے تنہائی ویکسوئی درکار ہو جیسے تصنیف کا وقت ہو یا دیگر وظائف ہوں یا کمپنی کا حسابی کام وغیرہ ہو اگر وہ عام ملنے کی جگہ ہو تو پھر اجازت لینے کی ضرورت نہیں اسی طرح اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت بھی اجازت کی ضرورت نہیں البتہ اپنی آمد کی اطلاع کے لئے کوئی عمل ہونا چاہئے جیسے دروازے کو ذرا زور سے کھولنا یا کھانسنا وغیرہ تاکہ گھر والوں کو آگاہی ہو کیونکہ جیسے مرد اچانک داخل ہونے والے سے نفرت کرتے ہیں تو عورتیں بھی غیروں کی اپنی حالت پر آگاہی کو بُرا مانتی ہیں۔ غرض حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ اجازت یا کوئی اطلاع آمد کی ہونی چاہئے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، اگرچہ گھر میں اس کی بیوی ہی ہو اور وہ تنہا ہی ہو یا دیگر کوئی محرمہ ہو۔ اگر کسی کا مہمان خانہ ہے جو گھر سے الگ ہے یا اس کا دروازہ الگ ہے اور راستہ گھر سے نہیں گذرتا تو مہمان کو ایک دفعہ داخل ہونے کی اجازت سے ٹھہرنے کے باقی اوقات میں ہر بار داخل ہونے کی اجازت طلب کرنا لازمی نہیں۔ کذا فی تفسیر ابن کثیر

پھر اگر گھر بڑا ہو یا جس کی اجازت درکار ہے اور وہ دروازے سے اتنا دور ہو کہ اس تک نہ سلام پہنچے اور نہ ہی اجازت مانگنے کی آواز پہنچائی جاسکتی ہے تو بجائے لفظی استیذان کے جو رائج طریقہ ہو وہ بھی بروئے کار لانا جائز ہے مثلاً گھنٹی لگی ہو تو اس کو بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دے اور جب کوئی نکلے تو سلام کر کے اجازت مانگے۔

باب کیف ردالسلام

(جوابِ سلام کا بیان)

"عن ابی هریرة قال دخل رجل المسجدورسول الله صلی الله علیه وسلم جالس فی ناحیة المسجد فصلّیٰ ثم جاء فسلّم علیه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: وعَلَیکَ... اِرجِع فَصَلِّ فانک لم تُصَلِّ... فذکر الحدیث بطوله".(حسن)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے پس اس نے نماز پڑھی پھر آ کر آپؐ کو سلام کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وعلیک" واپس جا کر دوبارہ نماز پڑھ کیونکہ تم نے (کامل) نماز نہیں پڑھی۔

تشریح:۔قوله:"دخل رجل" یہ حضرت خلّاد بن رافع رضی اللہ عنہ تھے۔**قوله:**"وعلیک" امام ترمذیؒ نے اس باب میں یہ حدیث ذکر فرما کے یہ کوشش فرمائی ہے کہ سلام کے جواب میں "وعلیک" بھی کافی ہے یعنی اگرچہ افضل پورا سلام ہے اور اس سے زیادہ افضل اس پر رحمت و برکت کی دعاء کا اضافہ ہے جیسا کہ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے لیکن اکتفاء علی الاقل بھی جائز ہے گویا مذکورہ حدیث میں سلام کا یہ جواب بیانِ جواز کے لئے ہے۔لیکن یہ روایت بخاری و مسلم میں بھی آئی ہے جس میں ہے:"وعلیک السلام" لہٰذا ترمذی کی روایت میں اختصار کا امکان پایا جاتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ ابن العربیؒ نے فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؐ نے اس طرح "وعلیک" کہہ کر جواب اس لئے دیا ہو کہ اس شخص نے نماز کامل نہیں پڑھی تھی "**ویحتمل انه لم یکمل علیه السلام لانه لم یکمل صلاته**"۔(عارضۃ الاحوذی)

غرض امام ترمذیؒ کا استدلال محلِ نظر ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابتداء لفظ "علیک السلام" سے ممانعت فرمائی ہے کہ یہ سلام تحیۃ المیت ہے یعنی لوگوں کی عادت زمانہ جاہلیت میں یہ تھی کہ صاحب قبر کو اس طرح سلام کرتے تھے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تحیۃ المیت سے مراد جاہلیت کا سلام ہو اگرچہ وہ آپس

کا سلام کرنا ہو کیونکہ جاہل بھی میت کی طرح ہوتا ہے اس لئے ''علیک السلام'' سے بچنا چاہئے۔

شرح مسلم ص:۲۱۲ ج:۲ میں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابتداء بالسلام بالاتفاق سنت ہے جبکہ اس کا جواب فرض (واجب) ہے پھر اگر کسی نے جواب میں ''علیکم'' یعنی بغیر واؤ کے کہہ دیا تو بالاتفاق یہ ناکافی ہے اور اگر ''وعلیکم'' واؤ کے ساتھ کہہ دیا تو یہ جائز ہے، یعنی جیسا کہ اوپر گزرا ہے (کہ خلافِ اولیٰ ہے) اور جواب میں ''وعلیکم السلام'' جمع کا صیغہ لائے تاکہ دونوں فرشتوں کو بھی شامل ہوجائے۔

پھر سلام کرتے وقت ''السلام علیکم'' الف لام کے ساتھ کہنا چاہئے اور اس میں دو باتوں کا خیال ہونا چاہئے: (۱) ایک یہ کہ سلام میں دوسرے کا اکرام ملحوظ ہو۔ (۲) دوم یہ کہ اس میں تواضع کا حصول ہو لہٰذا چھوٹے بڑوں کو سلام کریں اور راکب پیدل پر اور قلیل کثیر پر۔ راقم نے سلام کے مسائل نسبۃً تفصیل سے ''نقشِ اخلاق'' میں ذکر کئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو بھی سلام کرنے میں پہل کرے گا تو اس کا ثواب زیادہ ہوگا تاہم داخل ہونے والا بہر حال سلام میں پہل کرے۔

قوله: ''فذكر الحديث بطوله'' یہ تفصیلی حدیث مع الشرح ''باب ماجاء فی وصف الصلوٰة'' من ابواب الصلوٰة میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۱۱۴ ج:۲)

باب ماجاء فی تبلیغ السلام

(کسی کا سلام پہنچانا)

''عن عامر قال ثنی ابوسلمة ان عائشة حَدَّثته ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لها: ان جبرئیل یُقرِئُکِ السلامَ اقالت وعلیه السلام ورحمة الله وبرکاته''. (حسن صحیح)

حضرت عامر روایت کرتے ہیں ابوسلمہ سے کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ جبرئیلؑ تم کو سلام کہتے ہیں سو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''**وعلیه السلام ورحمة الله وبرکاته**'' یعنی جبرئیل پر سلام ہے اور اللہ کی رحمت اور برکتیں اس کی۔

تشریح:۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح بالمشافہ سلام کرنا چاہئے اسی طرح بالواسطہ بھی سلام کہلوایا جاسکتا ہے۔ پھر حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ جس کی وساطت سے سلام کہلوایا جارہا ہے اگر وہ پہنچانے کا التزام کرے تو وہ اس کے ذمہ امانت ہے لہٰذا پہنچانا لازمی ہوگا اور اگر وہ التزام نہ کرے تو وہ ودیعت

ہے جس کا قبول کرنا اور پھر ادا کرنا لازم نہیں۔

پھر جب وہ ذریعہ سلام پہنچائے تو مبلّغ الیہ اسی وقت جواب دے دے اور بہتر یہ ہے کہ جواب میں پہنچانے والے کو بھی شامل کرے جیسا کہ نسائی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد کا سلام کہا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: "وعلیک وعلی ابیک السلام" اسی طرح جب حضرت خدیجہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کا "سلام ُالله علیها" پہنچایا تو انہوں نے جواب میں فرمایا: "ان اللّٰه هو السلام ومنه السلام وعلیک وعلی جبرئیلَ السلام"۔ تاہم حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ مبلِّغ کو شامل کرنا واجب نہیں ورنہ حضرت عائشہؓ ضرور "وعلیک وعلیه السلام الخ" فرماتیں۔ باب کی روایت بخاری مناقب عائشہ میں بھی ہے۔

باب ماجاء فی فضل الذی یبدأ بالسلام

(سلام کرنے میں پہل کرنے والے کی فضیلت)

"عن ابی اُمامة قال قیل یارسول الله! الرجلان یلتقیان اَیُّھُما یبدأ بالسلامِ؟ فقال: اولاھما باللّٰه". (حسن)

حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جب دو شخص آپس میں ملیں تو ان میں کون پہلے سلام کرے؟ آپؐ نے فرمایا جو ان میں سے اللہ (کی رحمت) کے زیادہ قریب تر ہو۔

تشریح:۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ متواضع شخص سلام میں پہل کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہر ایک سے کمتر تصور کرتا ہے اس لئے وہ انتظار نہیں کرتا کہ دوسرا مجھے سلام کرے اور متواضع اللہ کی رحمت کے قریب ہوتا ہے اس لئے اس کو "اولاھُما باللّٰه" قرار دیا۔

باب ماجاء فی کراھیة اشارة الید فی السلام

(سلام میں ہاتھ کے اشارہ پر اکتفاء مکروہ ہے)

"عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: لیس

مِنّا من تَشَبَّهَ بغيرنا، لاتَشَبَّهُوا باليهود ولابالنصارىٰ فان تسليم اليهود الاشارة بالاصابع وتسليم النصارىٰ الاشارة بِالاكُفِّ". (اسناده ضعيف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے سوا (کسی اور) کے ساتھ مشابہت اختیار کرے۔ تم مشابہت مت کرو یہود کے ساتھ اور نہ ہی نصاریٰ کے ساتھ کیونکہ یہود کا سلام کرنا انگلیوں کا اشارہ ہوتا ہے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلیوں سے اشارہ کرنا ہوتا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کرتے وقت صرف ہاتھ کا اشارہ کافی نہیں ہے اس سے سلام کا مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہود ونصاریٰ کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ ہے، البتہ اگر سلام زبان سے کرے اور درمیان میں فاصلہ دور ہو یا شور ہو اور سلام سنائی نہ دے تو اشارہ کرسکتا ہے تا کہ مسلم الیہ کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص نے سلام کیا پھر اس کے جواب کا بھی یہی حکم ہے۔

عارضۃ الاحوذی میں ابن العربی ؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ موقوف ہے لہٰذا عند الضرورت اشارہ سے سلام کرنا جائز ہے یعنی زبانی سلام کے ساتھ اشارہ ملایا جاسکتا ہے۔ اگلے سے پیوستہ باب میں اس کی تصریح ہے۔

باب ماجاء فی التسلیم علی الصبیان

(چھوٹے بچوں کو سلام کرنے کا بیان)

"عن سَيَّارقال كنت امشي مع ثابت البُناني فَمَرَّ على صِبيان فَسَلَّمَ عليهم فقال ثابت: كنتُ معَ انس فَمَرَّ علىٰ صِبيان فَسَلَّمَ عليهم فقال: انس كنت مع النبي صلى الله عليه وسلم فَمَرَّ علىٰ صِبيان فسلم عليهم". (صحيح)

حضرت سیّار سے روایت ہے کہ میں ثابت بُنانی کے ساتھ چل رہا تھا کہ ان کا گذر چند لڑکوں پر ہوا تو انہوں نے ان کو سلام کیا، پھر ثابت نے کہا کہ میں انسؓ کے ہمراہ چل رہا تھا کہ وہ چند لڑکوں کے پاس سے گذرے تو ان کو سلام کیا پھر حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا، جب آپؐ بچوں کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا۔

تشریح:۔ اس حدیث سے بچوں کو سلام کرنے کا استحباب معلوم ہوا تاہم سلام کے مخاطب بچوں کی عمر

کم از کم اتنی ہونی چاہئے کہ وہ سلام کی عام کلام سے تمیز کرسکیں۔ پھر نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپؐ کا معمول شریف تھا کہ انصار کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کے بچوں کو سلام کرتے اور ان کے سروں پر ہاتھ مبارک پھیرتے اور ان کے لئے دعا فرماتے۔ بچوں کو سلام کرنے میں تواضع کا حصول ہوتا ہے، اس سے بچوں کی تعلیم بھی ہو جاتی ہے، اور ان کے بڑوں سمیت پورے خاندان کی محبت حاصل کی جاتی ہے، خصوصاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام کرنے سے تبریک اور ازالہ ہیبت بھی اہم مقصد تھا۔

باب ماجاء فی التسلیم علی النساء

(عورتوں کو سلام کرنے کا بیان)

"عن اسماء بنت یزید تُحَدِّثُ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَرَّ فی المسجد یوماً وعُصبةٌ من النساء قعودٌ فَألویٰ بیدہ بالتسلیم واشار عبد الحمید بیدہ". (حسن)

حضرت اسماء بنت یزید بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مسجد میں گذرے جبکہ عورتوں کا ایک گروہ وہاں بیٹھا ہوا تھا پس آپؐ نے اپنے ہاتھ سے سلام کا اشارہ کیا۔ راوی حدیث عبدالحمید نے (سمجھانے کے لئے) اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

تشریح:۔ قولہ: "وعُصبةٌ" واؤ حالیت کے لئے ہے اور عصبہ جماعت کو کہتے ہیں۔ قولہ: "فَألویٰ" اصل میں مائل کرنے اور موڑنے کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد اس سے اشارہ کرنا ہے یعنی زبانی سلام کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ بھی فرمایا۔ چنانچہ امام ترمذیؒ یہی بات کہنا چاہتے ہیں اسی بناء پر انہوں نے باب الاشارۃ علی النساء کے بجائے التسلیم علی النساء قائم کیا ہے۔

اس حدیث سے جواز سلام علی النساء معلوم ہوا اس کی سند میں اگر چہ شہر بن حوشب ہیں مگر ایک تو یہ قابل استدلال راوی ہیں دوم اس کی تائید بخاری کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو "باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال" میں حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے مروی ہے: "قال کُنّا نفرح بیوم الجمعة قلت ولِمَ؟... وفیہ... فاذا صلینا الجمعة اِنصَرَفنا نُسَلِّم علیہا الخ" (بخاری ص:۹۲۳ ج:۲) اس باب میں حضرت جبرئیلؑ کا سلام علی عائشہؓ بھی مذکور ہے جیسا کہ پیچھے حدیث گزری ہے۔

ہاں البتہ جہاں فتنہ کا اندیشہ ہو تو ان تمام صورتوں میں عورتوں کو سلام کرنا مکروہ یا ممنوع ہوگا، اسی طرح

عورتوں سے مصافحہ بھی حرام ہے الا یہ کہ کوئی عورت محرمہ ہو یا بہت زیادہ بوڑھی ہو۔ چنانچہ ہدایہ جلد چہارم کتاب الکراھیۃ میں ہے:

" اَمّا اذا کانت عجوزاً لاتُشتھیٰ فلاباْس بمصافحتھا ومس یدھا لِانعدام خوف الفتنة وقدرُوِیَ ان ابابکرؓ کان یدخل بعض القبائل التی کان مسترضعاً فیھم وکان یصافح العجائز الخ. (ہدایہ: ص:۳۸۹ ج:۴)

قولہ: "ان شھراً ترکوه" یہ لفظ ترک سے یعنی بالتاء والراء بھی آیا ہے جس کے معنی ظاہر ہیں یعنی چھوڑا ہے، مگر یہ نون اور زاء سے بھی آیا ہے ای نزکوہ پھر بمعنی نیزہ زنی کے ہوگا مراد وہی طعن کرنا اور چھوڑ دینا ہے لیکن ترمذی نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ شہر حسن الحدیث ہیں۔

باب ماجاء فی التسلیم اذادخل بیته

(گھر میں داخل ہوتے ہوئے سلام کرے)

"عن سعیدبن المسیب قال قال انس قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: یابُنَیَّ! اذا دخلتَ علی اھلک فسلِّم تکون برکة علیک وعلیٰ اھل بیتک ". (حسن صحیح غریب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ سے فرمایا: میرے پیارے بچے! جب تو اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرلیا کرو اس میں تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے برکت ہوگی۔

تشریح:۔ چونکہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے لئے سلام استیذان کی ضرورت نہیں اس لئے برکت کے حصول کی غرض سے سلام کو مشروع کیا گیا چنانچہ سورۂ نور کی آیت: ۶۱ میں ہے: "فاذادخلتم بیوتاً فسلِمُوا علیٰ انفسکم تحیّةً من عندالله مبارکةً طیبة" " پھر اس سلام کی آواز کی حد باب کیف السلام میں بیان ہوئی ہے:

"فیجیئُ رسول الله صلی الله علیه وسلم من اللیل فَیُسَلِمُ تسلیماً لایوقظ النائم ویسمع الیقظان الخ" یعنی اتنی مقدار میں سلام کرے کہ جاگتے ہوئے سنیں اور سوئے ہوئے کی نیند خراب نہ ہو۔

باب کی حدیث میں اگرچہ علی بن زید بن جدعان ہیں لیکن حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک تو یہ مسلم کے راوی ہیں دوم یہ شہر بن حوشب سے زیادہ اعلیٰ ہیں باب سابق میں امام بخاریؒ کی توثیق شہر کی تصریح ہے پس علی بن زید کی روایت صحیح ہوئی نیز باب کیف السلام میں آنے والی روایت سے بھی باب کا مضمون ثابت ہے

۔جو شخص اپنی بیوی کو سلام کرنا عیب سمجھتا ہے اگر وہ بجائے حمیۃ الجاہلیت کے شریعت کی پیروی کرے تو اچھا ہوگا۔

باب السلام قبل الكلام

(سلام، بات چیت پر مقدم ہونا چاہئے)

"عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :السلام قبل الكلام".

(منكر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام گفتگو سے پہلے ہونا چاہئے۔

تشریح:۔ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں:"رَوَى الترمذى منكراً ضعيفاً عن جابر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"السلام قبل الكلام" وهو معنى صحيح الخ یعنی یہ روایت سند کے اعتبار سے نہایت ضعیف ہے لیکن معناً صحیح ہے کیونکہ سلام بہر حال کلام پر مقدم ہے، مرقات میں ہے کہ سلام کا موقع ابتداء ملاقات ہی ہے پس اگر سلام سے پہلے کوئی اور بات ہو جائے تو سلام کا وقت اور موقع فوت ہو جائے گا جیسے تحیۃ المسجد، مسجد میں داخل ہوتے ہی پڑھنی چاہئے۔

قوله:"لاتدعوا احداً الى الطعام حتىٰ يُسَلِّمَ" کسی کو کھانے پر مدعو نہ کرو جب تک کہ وہ سلام نہ کرے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ابواب الزہد میں ابوسعیدؓ کی حدیث میں ہے:"ولا ياكل طعامك اِلّا تقى" باب ماجاء فی صحبۃ المؤمن یعنی اکرام اور دعوت والے کھانے پر پاک باز لوگوں کو مدعو کرنا چاہئے یا مطلب یہ ہے کہ تعلق اور دوستی متقی اور شرع کے پابند لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے کیونکہ صحبت، حرکات و سکنات حتیٰ کہ باتوں کا بھی اچھا اور برا اثر ہوتا ہے لہٰذا جو شرع پر کاربند ہوگا اس کی معیت سے فائدہ ہوگا اور جو شریعت سے جتنا باغی ہوگا وہ خیر سے اتنا ہی دور ہوگا لہٰذا ایسے شخص کی صحبت سے دور رہنا چاہئے کہ اسی میں سلامتی ہے۔

باب ماجاء فى كراهية التسليم على الذمى

ذمّی کو سلام کرنا مکروہ ہے۔

"عن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تبدَأوُا اليهودَ والنصارىٰ بالسلام فاذا لقيتم احدهم فى طريق فَاضطَرُّوه الى اَضيَقِه".(حسن صحيح)

یہود ونصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تم ان میں سے کسی ایک سے راستہ میں ملو تو ان کو راستہ کی تنگ جگہ (کنارے) کی طرف (جانے پر) مجبور کرو!۔

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کو ابتداءً سلام کرنا مکروہ ہے ہاں البتہ کسی ضرورت کی صورت میں سلام کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں فرمایا ہے اسی طرح اگر وہ لوگ مسلمان کو سلام کریں تو جواب دینا چاہئے جو باب کی اگلی حدیث میں بیان ہوگا، پھر سلام کے الفاظ "سلام علی من اتبع الھدیٰ" ہونے چاہئے اس حدیث کی شرح تشریحات ترمذی: ص:۴۶۲ جلد: ۵ میں گزری ہے۔ دیکھئے "باب ماجاء فی التسلیم علی اھل الکتاب من ابواب السیر"۔

حدیث آخر:۔ "عن عائشة قالت ان رهطاً من اليهود دخلوا على النبي صلى الله عليه وسلم فقالوا السّامُ عليكَ فقال النبي صلى الله عليه وسلم :عليكم!فقالت عائشة:فقلت عليكم السام واللعنة !فقال النبي صلى الله عليه وسلم ياعائشة! ان الله يُحِبُّ الرفق في الامر كله قالت عائشة الم تسمع ماقالوا؟قال قد قلتُ "عليكم". (حسن صحيح)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک گروہ یہود کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا انہوں نے "السّامُ علیکم"، یعنی تجھ پر موت ہو! تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "علیکم"، یعنی تم پر ہو! پس حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: تم پر موت ہو اور لعنت ہو! تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ! بے شک اللہ ہر کام میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کیا آپ نے نہیں سنا جو انہوں نے کہا؟ آپؐ نے فرمایا بلاشبہ میں کہہ چکا ہوں کہ تم پر ہو!۔

قولہ: "السام" موت کے معنی میں ہے چونکہ یہود کی عادت ہے کہ وہ مشتبہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جیسے آج کل مغربی میڈیا کا حال ہے اس سے وہ دوسروں کو غیر محسوس طور پر دھوکہ دے کر اپنا کام نکالتے ہیں لیکن اللہ کے نبی نے ان کے مذموم مقصد اور بد معنی تلفظ کا ادراک کر لیا تھا اور جواب ایسا دیا کہ جو ان کو شرمندگی اور ندامت پر مجبور کر رہا تھا جبکہ اس سے آپؐ کے حُسنِ اخلاق پر کچھ آنچ بھی نہیں آئی، اس لئے حضرت عائشہؓ کو آپؐ نے سخت لہجہ اور انتقام میں لعنت کے اضافہ سے منع فرمایا، اور یہ کہ چونکہ ان کا یہ قول شتم رسول اور گالم گلوچ کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ کینہ اور حسد کے زمرے میں شامل ہے اس لئے اس پر صبر کیا جانا چاہئے گو کہ سبُّ النبی پر خاموشی گناہ اور خوشی کفر ہے امام بخاریؒ کی رائے میں یہ تعریضاً سب وشتم تھا قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ آپؐ

کی نرمی تالیف قلب کے پیش نظر تھی جو شروع کا حکم ہے۔
پھر علیکم واؤ کے ساتھ بھی آیا ہے اور بغیر واؤ کے بھی۔ اس میں علماء کے دونوں قول ہیں بہرحال اگر غیر مسلم سلام کرے تو جواب دے دینا چاہئے مگر علیکم کے ساتھ۔ جہاں تک ابتداء بالسلام کی بات ہے جس کے لئے امام ترمذیؒ نے باب قائم کیا ہے تو اگرچہ بعض علماء کے نزدیک یہ حرام ہے مگر عندالحاجۃ یہ جائز ہے بشرطیکہ مقصود دفع شر وضرر یا جلب منفعت اصلیہ ہو، اکرام مقصود نہ ہو چنانچہ الکوکب الدری کے حاشیہ پر ہے:

"ومسلک الحنفية في مسئلة الباب مافي الدر المختار ويسلّم على اهل الذمة لولہ حاجة، والّا كره وهو الصحيح كما كره للمسلم مصافحة الذمي ولوسلموا على مسلم فلابأس بالرّد لكن لايزيد على قوله وعليك كمافي الخانية ولوسلّم على الذمي تجليلاً (تعظيماً) يكفر لان تجليل الكافر كفر الخ".

باب ماجاء في السلام على مجلس فيه المسلمون وغيرهم

(مسلم وغیر مسلموں کی مخلوط مجلس پر سلام کا حکم)

"عن عروة ان اسامة بن زيد اخبره ان النبي صلى الله عليه وسلم مر بمجلس فيه اخلاط من المسلمين واليهود فسلّم عليهم". (حسن صحيح)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک ایسی مجلس کے پاس سے ہوا جس میں مسلمان اور یہود (ملے جلے) بیٹھے تھے تو آپؐ نے ان پر سلام کیا۔

تشریح:۔ قولہ: "اخلاط" بفتح الہمزۃ خِلط کی جمع ہے اردو میں خلط ملط اور ملے جلے کو کہتے ہیں۔
اس حدیث سے مشترکہ مجلس پر سلام کرنے کی سنیت معلوم ہوئی خواہ وہ مجمع اہل اسلام وکفار کا ہو یا اتقیاء وفساق کا ہو تاہم ایسے میں نیت مسلمانوں پر سلام کرنے کی ہونی چاہئے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اگر اہل السنۃ واہل بدعت ایک ساتھ بیٹھے ہوں تو بھی سلام کرے اور نیت اہل السنۃ کی کرے، ابن العربیؒ فرماتے ہیں

کہ اگر سب لوگ ظالم ہوں (یعنی خواہ کافر ہوں یا دیگر فساق جو علانیہ فسق کرتے ہوں) تو اگر ضرورت ان سے متعلق ہو تو سلام کرے لیکن نیت یہ کرے کہ میری طرف سے تم محفوظ ہو تو تمہاری طرف سے بھی مجھے حفاظت ملنی چاہئے (یعنی لغوی معنی کا ارادہ کرے)۔

باب ماجاء فی تسلیم الراکب علی الماشی

(سوار پیادے کو سلام کرے)

(۱) "عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یُسَلِّم الراکب علی الماشی، والماشی علی القاعدو القلیل علی الکثیر... وزادابن المثنیٰ فی حدیثہ... ویسلم الصغیرعلی الکبیر... وروی بطریق آخر" (۲) وعن فضالۃ بن عبیدمرفوعاً... وفیہ یسلم الفارس علی الماشی والماشی علی القائم والقلیل علی الکثیر". (حسن صحیح) (۳) وفی روایۃ اخریٰ والمارّعلی القاعدو القلیل علی الکثیر". (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوار آدمی پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور پیادہ بیٹھے ہوئے پر سلام کرے اور تھوڑے زیادہ تعداد والوں پر سلام کریں...... اور ابن مثنی کی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

دوسری حدیث میں یہ ہے کہ گھڑ سوار پیدل چلنے والے پر سلام کرے اور پیادہ کھڑے ہوئے شخص پر جبکہ آخری روایت میں ماشی کے بجائے مارّ کا لفظ ہے یعنی گذرنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کرے۔

تشریح:۔ "باب کیف ردّالسلام " میں ضابطہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سلام کے بنیادی اصول دو ہیں: اکرام اور تواضع، اس لئے جہاں اپنی بڑائی کا اندیشہ لاحق ہو وہاں سلام میں پہل کرے تا کہ تواضع حاصل ہو اور تکبر کا سدّ باب کیا جا سکے لہٰذا سوار پیادہ کو سلام کرے اور کبھی بڑا چھوٹے کو سلام کرے مگر جہاں دوسروں کی توقیر ملحوظ ہو تو پھر چھوٹوں کو چاہئے کہ بڑوں کو سلام کریں اور قلیل کثیر کو سلام کریں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ راستہ میں ملاقات کا ہے جہاں تک آنے والے کا تعلق ہے جبکہ دوسرا فریق بیٹھا ہو تو آنے والا ہر صورت میں سلام میں پہل کرے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، قلیل ہوں یا کثیر۔

پھر جماعتی شکل میں سلام کا جواب بھی جماعتی صورت میں دینا چاہئے تاہم بعض علماء فرماتے ہیں کہ

اگر کچھ نے یہ ذمہ داری نباہ دی تو باقی کا ذمہ فارغ ہو جائے گا خواہ وہ بعض آنے والے ہوں یا جواب دینے والے۔

باب کی پہلی روایت سند کے اعتبار سے منقطع ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح کی ہے کہ حسن بصریؒ نے ابو ہریرہؓ سے نہیں سُنا ہے مگر اس کے باقی طرق صحیح ہیں اور صحیحین میں مروی ہیں باب کی اگلی دونوں روایتیں بھی صحیح ہیں۔

باب التسليم عندالقيام والقعود

(اُٹھتے بیٹھتے سلام کرنا)

"عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذاانتهیٰ احدكم اِلیٰ مجلس فليُسَلِّم ،فان بَدَا له ان يجلس فليجلس ،ثم اذاقام فليسلّم فليست الاولیٰ باحق من الأخرة". (حسن)

جب تم میں سے کوئی ایک مجلس میں پہنچے تو اس کو چاہئے کہ سلام کرے پھر اگر وہ بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے، پھر جب کھڑا ہو (یعنی جانے لگے) تو اس کو چاہئے کہ سلام کرے کیونکہ آمد کا سلام دوسرے (جانے کے) سلام سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔

تشریح:۔قوله: "فليست الاولیٰ الخ حاشیہ ترمذی پر طیبی کا قول نقل کیا ہے کہ جس طرح پہلے سلام میں یہ پیغام ہے کہ میری موجودگی میں تم لوگ میرے شر سے محفوظ رہو گے تو جاتے وقت سلام کرنے میں یہ باور کرانا مقصود ہے کہ میری غیر موجودگی میں بھی تم لوگ میرے شر وضرر سے مطمئن رہو اس لئے پہلا سلام بنسبت دوم کے زیادہ ضروری نہیں کیونکہ موجودگی میں شر کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔ نیز جس طرح خاموشی سے آکر مجلس میں داخل ہونا سلیقہ مندی کے خلاف ہے تو اسی طرح چپکے سے اُٹھ کر چلا جانا بھی آداب وشائستگی کے منافی ہے۔ پھر آمدورفت کے لئے دور سے آنا یا دور تک جانا ضروری نہیں بلکہ جب نظروں سے اوجھل ہوا اور مجلس پر نمودار ہو جائے تو سلام کرے اسی طرح اسی مقدار کی غیبوبت کے بقدر جانے کے لئے بھی سلام کرے، پھر دوسرے سلام کا جواب بھی دینا لازمی ہے۔ گویا رخصتی کا اسلامی طریقہ آخری عمل سلام کرنا ہے۔

باب الاستیذان قُبالة البیت

(گھر کے سامنے اجازت طلب کرنے کا طریقہ)

"عن ابی ذر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من کشف سِتراً فادخَلَ بَصَرَه فی البیت قبل ای یؤذن له فرای عورة اهله فقداتیٰ حدّاً لایحل له ان یأتیه لو انه حین ادخل بصره استقبله رجل فَفَقَأ عینیه ماغَیَّرتُ علیه، وان مَرَّ رجل علی با بٍ لاستر له غیر مُغلَق فنظر فلاخطِیْئَة علیه انماالخطیئة علی اهل البیت". (غریب)

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کھولا پردہ (یعنی کسی کے گھر کے دروازے کا پردہ اُٹھایا) اور اپنی نگاہ اندر گھر میں داخل کی قبل اس کے کہ اسے (داخل ہونے کی) اجازت ملے اور دیکھ لیں اس نے گھر والوں کی پوشیدہ چیزیں، تو بلاشبہ اس نے وہ کام کیا جو اس کے لئے جائز نہ تھا۔

اگر اس کے اندر دیکھتے وقت کسی شخص نے اس کے سامنے آکر اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں تو میں اس کے اس عمل کو تبدیل نہیں کروں گا (یا معیوب نہیں مانوں گا) اور اگر کوئی شخص ایسے دروازے کے پاس سے گذرا جس کا پردہ نہ ہو اور (دروازہ بھی) بند نہ ہو پس اس کی نظر (بے اختیار) اندر گئی تو اس پر کچھ گناہ نہیں، گناہ صرف گھر والوں کا ہے۔

تشریح: امام ترمذیؒ چونکہ اجازت لینے کا طریقہ بتانا چاہتے ہیں اس لئے ترجمۃ الباب میں مضاف مقدر ماننا پڑے گا یعنی باب کیفیة الاستیذان الخ یا لفظ کیف مقدر ہے یعنی باب کیف الاستیذان الخ۔

قولہ: "قُبالة" بضم القاف آگے اور سامنے کے معنی میں ہے جیسے قِبلہ۔ قولہ: "عورة اهله" عورۃ یعنی پردے کی چیز، جسے آدمی چھپاتا ہے اور اس کا اظہار یا ظہور شرم وحیاء کے منافی سمجھتا ہے۔ قولہ: "فَفَقَأ" پھوڑ دیں الخ۔

قولہ: "ماغَیَّرتُ علیه". الکوکب الدری میں حضرت گنگوہیؒ نے اس کو بمعنی تغیر کے لیا ہے "ای لم اُغیّر فعله ولم اَمنعه عن اِرتکاب ذالک لانه لم یفعل باساً" تاہم اس میں دیگر احتمالات بھی ہیں تحفۃ الاحوذی میں اس کو عار سے لیا ہے اور روایت عَیّرتُ بالعین المھملۃ نقل کی ہے ای ما نسبتہ الی العیب۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ صاحب خانہ کو اپنے گھر کا دروازہ بند رکھنا چاہیئے یا کم از کم اس پر پردہ

آویزاں ہونا چاہئے تا کہ گزرنے والوں کو اندر دیکھنے کا موقع نہ ملے خصوصاً ایسے گھر کا دروازہ بہر حال بند ہونا چاہئے جس کے سامنے سے عام راستہ گذرتا ہو۔ اگر وہ کوتاہی کرتا ہے تو اس غلطی کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔

جہاں تک ملاقات کرنے والے کا تعلق ہے تو وہ اجازت طلب کرتے وقت ایسی جگہ کھڑا نہ ہو جہاں سے گھر کا اندرونی حصہ نظر آتا ہو بلکہ گھنٹی بجانے یا آواز دینے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ایک جانب کھڑا ہو جائے اور نظر اندر دوڑانے کی کوشش نہ کرے بلکہ اس سے پرہیز کرے اگر کسی نے کوشش کی مثلاً پردہ اٹھا کر دیکھا یا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو اس نے گناہ کیا اور اجازت طلبی کا مقصد ہی نظر انداز کیا، پھر جب اندر جانے کی اجازت مل جائے تو اگر چہ اندر داخل ہوتے ہوئے گھر کے اندر دیکھنا جائز ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ محرمات کو دیکھے بلکہ اجازت کا مطلب بقدر ضرورت دیکھنا ہوتا ہے لہٰذا پورے گھر میں گھومنے اور دیکھنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی عرف میں رائج ہے بلکہ ملاقاتی کو بیٹھک میں بٹھانے کا رواج ہے۔ (تدبر)

اگر کسی نے ان اصول کی پرواہ کئے بغیر اور اجازت ملنے سے قبل گھر کے اندر دیکھا اور گھر والے نے اس کی آنکھ پھوڑ دیں تو امام شافعیؒ کے نزدیک وہ معاف ہے اس پر کوئی قصاص یا دیت نہیں اکثر حنفیہ کے نزدیک اس پر قصاص تو نہیں کیونکہ اس حدیث کی وجہ سے شبہ اباحت پیدا ہوا تاہم اس پر دیت ہوگی، کیونکہ دیگر روایات کو سامنے رکھتے ہوئے نظر کرنے سے آنکھ پھوڑنے کی اجازت مترشح نہیں ہوتی لہٰذا باب کی حدیث تغلیظ پر محمول ہے، ہاں البتہ اگر کسی نے باہر سے دیکھنے کے بجائے سر اندر داخل کر کے دیکھنے کی کوشش کی اور صاحب خانہ نے پتھر وغیرہ پھینک کر اس کی آنکھ ضائع کردی تو اس پر بالاجماع تاوان وقصاص نہیں۔ تاہم قنیہ میں پہلی صورت میں بھی عدم دیت کا قول ہے۔

باب من اطلع فی دار قوم بغیر اذنهم

(بلا اجازت کسی کے گھر میں جھانکنا)

"عن انس ان النبی صلی الله علیه وسلم : کان فی بیته فاطَّلَعَ علیه رجل فاهویٰ الیه بِمِشقَصٍ فتأخر الرجل". (حسن صحیح)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تھے کہ اتنے میں ایک آدمی نے جھانک کر آپؐ کو دیکھا تو آپؐ نے اس کی طرف بڑھا دیا نیزے کا لمبا پھل (یعنی نیزے کی لمبی نوک) تو وہ شخص

پیچھے ہٹ گیا۔

حدیث آخر:۔"ان رجلاً اِطّلع علی رسول الله صلی الله علیه وسلم من جُحْرٍ فی حجرة النبی صلی الله علیه وسلم ومع النبی صلی الله علیه وسلم مِدراۃ یَحُکُّ بھارأسه فقال النبی صلی الله علیه وسلم :لوعلمتُ انک تنظر لَطَعَنتُ بهافی عینک انماجُعِل الاستیذان من اَجَل البصر". (حسن صحیح)

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک دَرز سے جھانکا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پُشت خار (کنگھا) تھا جس سے آپؐ اپنا سر کھجار ہے تھے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (بعد میں) فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوجاتا کہ تو جھانک رہا ہے تو میں اسے تیری آنکھ میں کوچ دیتا (یعنی چبھو دیتا) بے شک اجازت طلب کرنا آنکھ (سے بچنے) ہی کی خاطر تو مشروع کی گئی ہے۔

تشریح:۔قولہ:"فَاَھویٰ" یعنی آپؐ اس کی طرف مائل ہوئے اور جھک گئے۔ قولہ:"بِمشقص" بکسر المیم بروزن منبر نیزے کا لمبا پھل یعنی نوک۔قولہ:"جُحْر" دراڑ وسوراخ کو کہتے ہیں۔قولہ:"مِدراۃ" بکسر المیم کنگھا یا کنگھے کی طرح ایک آلہ ہے جو سر کے بالوں کو کھولنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔یا کمر کے کھجانے کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا۔قولہ:"لَطَعَنتُ" طعن نیزہ مارنے کو کہتے ہیں۔مسئلہ کی نوعیت وحکم سابقہ باب میں گزرا ہے۔

باب التسلیم قبل الاستیذان

(سلام کرنا اجازت طلبی پر مقدم ہے)

"ان کَلَدَة بن حنبل اخبره ان صفوان بن اُمَیَّة بَعَثَه بِلَبَنٍ وَلَبَأٍ وضغابیسَ الی النبی صلی الله علیه وسلم ،والنبی صلی الله علیه وسلم بِاَعلیَ الوادی ،قال فدخلت علیه ولم أستأذن ولم اُسلّم فقال النبی صلی الله علیه وسلم :اِرجِع فقل السلام علیکم أادخل؟وذالک بعدما اسلم صفوان". (حسن غریب)

کلدہ بن حنبلؓ نے عمرو بن عبداللہ کو خبر دی ہے کہ صفوان بن امیہؓ نے ان کو (کلدہ کو) دودھ، کھیس اور چھوٹے کھیروں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وادی کے بالائی

حصہ میں تھے، فرماتے ہیں کہ میں آپ کے پاس داخل ہوا مگر نہ اجازت طلب کی اور نہ ہی سلام کیا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واپس جاؤ (اور دوبارہ آؤ) اور کہو "السلام علیکم" کیا میں اندر آجاؤں؟؟؟ یہ واقعہ صفوان بن امیہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد کا ہے۔

تشریح:۔ قولہ: "لبأ" بمعنی کھیس کے ہے یعنی وہ گاڑھا دودھ جو جانور کے بچہ دینے کے بعد دوھا جاتا ہے اس کو پیوسی اور بوہلی کہتے ہیں چونکہ یہ دودھ بہت طاقت ور ہوتا ہے اس لئے لوگ بطور تحفہ ایک دوسرے کو ہدیہ کرتے ہیں اس کو جب پکایا جاتا ہے تو یہ پھٹ کر کھویا کی طرح بن جاتا ہے بہت لذیذ بھی ہوتا ہے اس کی جمع اَلباء آتی ہے یعنی بروزن لبن وزناً ومعناً فرداً وجمعاً۔ اس کے لئے ابوداؤد میں "جدایۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

قولہ: "ضغابیس" ضغبوس کی جمع ہے چھوٹے اور کچے کھیرے اور ککڑی کو کہتے ہیں۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ کوئی اور طرح کا پودا ہوتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنے والے کو چاہئے کہ پہلے سلام کرے پھر اندر جانے کی اجازت طلب کرے تاہم استیذان کے لئے کوئی بھی رائج ومہذب طریقہ اپنانا جائز ہے مسئلہ کی تفصیل ونوعیت پہلے عرض کی جاچکی ہے۔ دیکھئے "باب ماجاء فی ان الاستیذان ثلاث" عارضہ میں ہے "انہ یجوز الاستیذان بضرب الباب والحجر الخ"۔

حدیث آخر:۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی (یعنی اندر داخل ہونے کی) ایک دین کے بارے میں جو میرے والد پر تھا تو آپؐ نے پوچھا "من ھذا؟" یہ کون ہے؟ تو میں نے کہا "انا" میں ہوں! تو آپؐ نے فرمایا "اَنَا اَنَا" یعنی میں... میں... گویا آپؐ نے میرے جواب کو ناپسند کیا۔ (حسن صحیح)

عارضۃ الاحوذی میں اس ناگواری کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اپنا تعارف کراؤ! جبکہ اَنَا سے یعنی اس جواب سے کہ "میں" ہوں ابہام مزید بڑھ جاتا ہے یا کم از کم ابہام باقی رہ جاتا ہے اس لئے کلام لغو سا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی پوچھے کہ کون ہو؟ تو جواب میں ایسے تعارفی الفاظ یا نام ذکر کرنا چاہئے جن سے ابہام دور ہو اور تعارف ہو جائے۔

باب ماجاء فی کراهیة طروق الرجل اهله لیلاً

(گھر میں سفر سے رات کو اچانک آنا مکروہ ہے)

"عن جابر ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نَهاهم ان یطرُقوا النساءَ لیلاً". (حسن صحیح)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو رات میں (سفر سے اپنی) عورتوں کے پاس داخل ہونے سے منع فرمایا تھا۔

تشریح:۔ قوله: "ان یطرقوا" باب نصر سے طارق رات کو آنے والی چیز کو بھی کہتے ہیں اور کھٹکھٹانے کو بھی کہتے ہیں بہر حال رات کو آنے والے کو طارق کہا جاتا ہے خواہ وہ دروازے پر دستک دے یا نہ دے۔

چونکہ عورتیں بہت حساس ہوتی ہیں اگر ان کے شوہر کسی لمبے سفر پر گئے ہوں اور وہ ان کی جلد واپسی کی امید نہ رکھتی ہوں تو عموماً وہ زیادہ صفائی ستھرائی کا اہتمام نہیں کرتی ہیں پس اگر کوئی شخص اچانک رات کو گھر پہنچے گا تو ایک تو بیوی کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی اور دوم بیوی کی خستہ حالت دیکھ کر شوہر کا دل بھی ٹوٹ سکتا ہے اس لئے حسن معاشرت کو پروان چڑھانے کی خاطر اچانک اور خصوصاً رات کو بغیر اطلاع کے آنے سے منع فرمایا۔

یہ علت مسلم وغیرہ کی روایات سے معلوم ہوتی ہے: "حتیٰ تستحِدَّ المُغیبة وتمتشط الشعثة"

ایک روایت میں ہے: "اِذا اطال الرجل الغیبة" یعنی اگر لمبے سفر سے واپسی ہو جائے تو اچانک گھر میں مت داخل ہو بلکہ بیوی کو صفائی اور بناؤ سنگھار کا موقعہ دے کر بعد میں جاؤ! علی ہذا اگر کوئی شخص غیر شادی شدہ ہو یا سفر قریب کا ہو یا آنا متوقع ہو کہ کہہ کر گیا ہو کہ فلاں تاریخ کو واپس آؤں گا یا آج کل کی سہولت کے پیش نظر فون پر آنے کی اطلاع دے چکا ہو تو پھر کسی بھی وقت گھر میں آنا مکروہ نہ ہوگا۔

باب کی اگلی روایت میں جو یہ ہے کہ اس نہی کے بعد دو آدمی گھروں میں رات ہی کو داخل ہوئے تو ہر ایک نے اپنی اپنی بیوی کے ساتھ آدمی کو پایا تو اس کو حدیث باب کی علت نہیں سمجھنا چاہئے، اس کی علت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی یہ دوسری روایت یا تو سند کے اعتبار سے ثابت نہیں یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہو سکتا ہے، ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں اس تاثر کو سختی سے منع فرمایا ہے:

"وهذا الذی رُوی لم یصح بحال، لو صح لَمَا کان دلیلا علی ان النبی صلی

الله عليه وسلم قصده فلايصح لِاَحدٍ ان يجيزه الخ ".

انہوں نے اس تعلیل کو جہل سے تعبیر کیا ہے۔

باب ماجاء في تتريب الكتاب

(خط کو خاک آلود کرنا)

"عن جابر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا كتب احدكم كِتاباً فَليُتَرِّ به فانه اَنجحُ لِلحاجة ".(حديث منكر)

جب تم میں سے کوئی خط لکھے تو اس پر مٹی چھڑک لے کیونکہ یہ اس کے مطلب کو پورا کرنے میں بہت مفید ہے۔

تشریح:۔ اولاً تو اس حدیث پر حاشیہ قوت المغتذی علی الترمذی میں تفصیل سے بحث کر کے اس کے تمام طرق کو ضعیف قرار دیا جا چکا ہے، اگر بالفرض اس کو صحیح مانیں تو پھر مکتوب پر مٹی ڈالنے کا ظاہری مطلب بھی لیا جا سکتا ہے تا کہ حروف کی سیاہی خشک ہو جائے اور خط لپیٹنے سے حروف مٹنے نہ پائیں ہم سکول کے زمانہ میں ایسا ہی کرتے تھے حالانکہ ہمیں اس حدیث کا علم نہیں تھا البتہ آج کل روشنائی پکی ہوتی ہے اس لئے تحریر جلد خشک ہو جاتی ہے لہٰذا اب مٹی ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ یا اس کو زمین اور مٹی پر رکھ دے تا کہ اپنے مکتوب پر بھروسہ نہ رہے یا یہ کنایہ ہے الفاظ خطاب میں تواضع اختیار کرنے سے، تاہم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ آخری توجیہ اگرچہ آج کل اہلِ دنیا کے مابین متعارف ہے اور خصوصاً بڑے مناصب پر فائز لوگوں کو درخواست لکھنے میں یہ طریقہ معروف ہے مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا تھا۔

بابٌ

قلم کان پر رکھنا

"عن زيد بن ثابت قال دخلتُ على رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين يَديه كاتب فَسَمعته يقول: ضَعِ القلم على اُذُنِك فانه اَذكَرُ لِلمُمِلي ".(وهو اسناد ضعيف)

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس داخل ہوا جبکہ آپؐ کے

سامنے لکھنے والا بیٹھا تھا، پس میں نے آپؐ سے یہ فرماتے سُنا کہ قلم اپنے کان پر رکھ دو کہ ایسا کرنے سے لکھنے والے کو مضمون جلد یاد آ جاتا ہے (یعنی اِلقاء ہوتا ہے)۔

تشریح:۔ اس حدیث کو ابن جوزیؒ نے موضوع قرار دیا ہے لیکن حاشیہ قوت میں اور مرقات میں ابن جوزیؒ کے تأثر کو رد کر دیا گیا ہے کہ ابن عساکرؒ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے ہاں البتہ حدیث ضعف سے خالی نہیں ہے۔

بصورت صحت حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب قلم ہاتھ میں ہو تو معمولی اشارہ ملنے پر وہ لکھنا شروع کر دے گا جبکہ کان پر ہونے کی صورت میں ہاتھ خالی ہوگا تو سوچنے کی فرصت زیادہ مل جائے گی، نیز خط سُنا جاتا ہے تو قلم کان پر ہونے سے گویا لکھنے اور سُننے میں مطابقت کی طرف اشارہ ہے قال الطیبیؒ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ قلم کے لئے جب کان بطور ظرف و محل مقرر ہو گا تو دورانِ تحریر قلم تلاش کرنے کی پریشانی سے بچا جا سکے گا جیسا کہ تجربہ ہے کہ ہم لوگ لکھتے وقت بسا اوقات صفحات پلٹنے کے لئے قلم جلدی میں کہیں رکھ دیتے ہیں پھر وہ اِدھر اُدھر غائب ہو جاتا ہے، علیٰ ہٰذا یہ سلیقہ مندی کے آداب میں سے ہوا۔ تاہم آج کل کے اکثر قلم بھاری ہوتے ہیں ان کا، کان پر تھمنا مشکل ہے۔ **قولہ:** "لِلْمُمْلِي" املاء سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کے معنی تو لکھوانے والے کے ہیں مگر مجازاً یہاں لازم باب سے ہے یعنی لکھنے والا۔

باب فی تعلیم السُّریانِیَّةِ

(سُریانی زبان سیکھنے کا بیان)

"عن زید بن ثابت قال امرنی رسول الله صلی الله علیه وسلم :ان اَتَعَلَّمَ له کلمات من کتاب یهود، وقال انی ما والله ما اٰمَنُ یهودَ علی کتابی، قال فمامَرَّبی نصف شهر حتیٰ تَعَلَّمتُه له قال: فلما تعلمتُه کان اذا کَتَبَ الی یهود کتبتُ الیهم واذا کتبوا الیه قرأت له کتابهم". (حسن صحیح)

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کے لئے یہود کے طرز تحریر کے چند (معتد بہ) الفاظ سیکھ لوں اور آپؐ نے فرمایا بخدا! میں یہود کی تحریر پر بالکل اطمینان نہیں کرتا جو وہ میرے لئے کرتے ہیں، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ مجھ پر ابھی آدھا مہینہ گذرنے نہیں پایا تھا کہ میں نے

آپؐ کے واسطے سریانی زبان سیکھ لی، فرماتے ہیں کہ جب میں نے وہ زبان سیکھ لی تو پھر جب بھی آپؐ یہود کو خط لکھنا چاہتے تو میں ان کو لکھتا اور جب وہ لوگ آپؐ کو خط لکھ کر بھیجتے تو میں آپؐ کو ان کا خط پڑھ کر سُناتا۔

تشریح:۔ زمانہ ہجرت کے ابتدائی دور میں آپؐ یہود سے خط وکتابت میں عموماً یہود پر انحصار فرماتے مگر ان کی موروثی خیانت کی وجہ سے آپؐ کو ان پر اعتماد نہ تھا خصوصاً جب ان کی مخالفت کھل کر واضح ہوگئی اس لئے آپؐ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ان کی زبان سُریانی کے سیکھنے کا حکم دیا جو انہوں نے پندرہ دن سے کم مدت میں مکمل کیا۔

اس حدیث سے ایک طرف صحابہ کرامؓ کی فطانت وذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور دوسری طرف دشمن قوم کی زبان سیکھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے جیسے آج کل انگریزی ہے، تاہم اس عمل میں دو باتوں کو بطورِ خاص ملحوظ رکھنا چاہئے ایک یہ کہ یہ کام ضرورت کے تحت ہو کہ کوئی ایسا داعیہ پیش آیا ہو جس کی وجہ سے ان کی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو محض شوقیہ طور پر یا افتخار کے لئے یا اصلی مقصد کو چھوڑ کر محض زبان سیکھنے میں زندگی بسر کرنا نہ صرف کارعبث ہے بلکہ باعث ندامت بھی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ زبانوں میں بھی تاثیرات ہوتی ہیں، انگریزی زبان کی یہ تاثیر عام مشاہدہ ہے کہ اس سے آدمی میں غرور اور تکبر آتا ہے لہٰذا اس میں جتنا انہماک ہوگا اسی تناسب سے تکبر میں اضافہ ہوگا۔ الا ماشاء اللہ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"وسنذكر ان شاء الله بعض ماقاله العلماء من الامر بالخطاب العربي وكراهة مداومة غيره لغير حاجة ...... واللسان تقارنه امور اُخرىٰ: من العلوم والاخلاق فان العادات لها تاثير عظيم فيما يُحِبُّهُ الله وفيما يكرهه الخ". (اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم: ص: ۱۶۳)

حضرت تھانویؒ نے المسک الذکی میں اس حدیث سے جوازِ تعلیم انگریزی پر استدلال کو رد کرنے میں بہت زور لگایا ہے، اگرچہ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب انگریزوں سے لڑائی چل رہی تھی اور نفرت اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی اس لئے اس تفصیل کو یہاں نقل نہیں کیا گیا لیکن ایک اقتباس آپ بھی پڑھئے:

"اس زمانہ میں اُلٹا معاملہ ہو رہا ہے کہ لوگ عربی خوانوں سے کہتے ہیں کہ تم انگریزی پڑھو تا کہ جامعیت حاصل ہو جائے اور لوگوں کو انگریزی میں دین سمجھا سکو اور یہ نہیں کہتے کہ انگریزی دان

عربی پڑھیں اور اشاعت دین کریں الخ''۔(ص:۵۷۵)

باب ماجاء فی مکاتبة المشرکین

(مشرکین سے خط وکتابت کا بیان)

"عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب قبل موتہ الی کِسریٰ والیٰ قیصر والی النجاشی والی کل جبّار یدعوھم الی اللہ ولیس بالنجاشی الذی صلّیٰ علیہ". (حسن صحیح غریب)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے کسریٰ کو خط لکھا اور قیصر اور نجاشی اور ہر مغرور وسرکش بادشاہ کو خطوط لکھے، جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف بُلایا اور یہ وہ نجاشی نہیں تھا جن کی نماز جنازہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔

تشریح:۔ کسریٰ شاہ فارس کا لقب تھا۔ قیصر شاہ روم کا اور نجاشی شاہ حبشہ کا لقب تھا، علاوہ ازیں ترکی بادشاہ کو خاقان، قبطی کو فرعون، مصری کو عزیز اور حمیر (یمن) کے بادشاہ کو تُبّع کہا جاتا تھا۔ جبکہ مقوقس وغیرہ کے نام بھی خطوط بھجوادیئے تھے۔

یہ خطوط آپؐ نے صلح حدیبیہ کے بعد ارسال فرمائے تھے، اور اس کے ساتھ دنیا والوں کو دعوت کا عمل مکمل ہوگیا تھا کیونکہ باقی لوگ یا تو ان سلاطین وملوک کے زیر فرمان تھے یا پھر ان کے پیچھے دور اُفتادہ علاقوں میں تھے جیسے منگولیا، چین اور مشرق بعید کے ممالک جن کے راستہ میں یہ ملوک حائل تھے اس لئے ان کی ذمہ داری بھی ان ملوک پر عائد ہوتی تھی، ہاں البتہ ان کو بھی دعوت پہنچی مگر آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی فتوحات کے زمانہ میں کیونکہ جب پر امن طریقہ سے دعوت قبول نہیں کی گئی تو سوائے جہاد کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا تھا کیونکہ دعوت کا عمل پھیلانا بہر حال لازمی تھا کہ اللہ کا حکم تھا اس لئے پہلے پُر امن مشن کو آزمایا گیا مگر جب یہ ملوک اس میں رُکاوٹ بنے تو پھر جہاد کا راستہ اختیار کرنا، ناگزیر ہوا۔

قولہ:"ولیس بالنجاشی الخ" یعنی آپؐ نے جس نجاشی کے نام خط ارسال فرمایا تھا یہ وہ والا نہیں تھا جس کا نام اصحمہ بروزن اربعہ ہے اور جنہوں نے مہاجرین اولین کو جگہ وحمایت دی تھی کیونکہ وہ اس خط سے پہلے ہی انتقال کرچکے تھے اور آپؐ نے مدینہ میں ان کی نماز جنازہ ادا فرمائی تھی جس کی تفصیل "ابواب الجنائز"

میں گذری ہے۔(دیکھئے "باب ماجاء فی صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی النجاشی")

باب کیف یُکتب الی اھل الشرک

(غیر مسلموں کو خط لکھنے کا طریقہ)

"عن ابن عباس انه اخبره ان اباسفیان بن حرب اخبره ان هرقل اَرسَلَ الیه فی نفر من قریش و کانوا تُجّاراً بالشام فَاَتوه ...... فَذَكَرَ الحديث ......قال: ثم دَعَابکتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فَقُرِئ فاذافيه بسم الله الرحمن الرحيم ،من محمدعبدالله ورسوله الى هرقل عظيم الروم . . . السلام على من اتبع الهُدى......امابعد!......". (حسن صحيح)

حضرت عبید اللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان کو خبر دی ہے کہ ابوسفیان بن حرب نے ان (ابن عباس) سے بیان کیا ہے کہ ہرقل نے پیغام بھیجا ان (ابوسفیان) کو جبکہ ابوسفیان قریش کی ایک جماعت کے ساتھ تھے یہ لوگ شام میں تاجروں کی حیثیت سے موجود تھے، چنانچہ یہ سب (۳۰ آدمی) ہرقل کے پاس گئے......پھر پوری تفصیلی روایت بیان کی (جو صحیحین میں ہے اور بخاری نے بدء الوحی میں پوری تفصیل کے ساتھ نقل کی ہے) پھر ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی منگوایا اور وہ پڑھ کر سنایا گیا چنانچہ (سرفہرست) اس میں یہ مضمون تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ محمد کی طرف سے ہے جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ہرقل کی طرف جو روم کے بڑے (آدمی) ہیں۔اس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کا پیروکار ہو۔امّابعدُ!

تشریح:۔قولہ: "هِرَقْل" اس میں اصح قول یہ ہے کہ ہاء مکسور اور راء وقاف دونوں مفتوح ہیں۔اس حدیث کی پوری شرح بخاری ومسلم کے شارحین نے کی ہے کیونکہ اس خط کا پورا متن اور تفصیلی پس منظر وہیں مروی ہیں، یہاں پر امام ترمذیؒ نے اس حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کر کے غیر مسلموں کو خط لکھنے کے طریقہ پر روشنی ڈالی ہے کہ ان کو خط لکھا جائے تو پوری بسم اللہ لکھے، اور سب سے پہلے لکھے پھر اپنا نام اور جس کو لکھ رہا ہے اس مکتوب الیہ کا نام لکھے تاہم بعض حضرات سے اپنا نام مکتوب الیہ کے بعد لکھنے کی اجازت منقول ہے جیسے الی زید من عمرو۔اور یہ کہ مشرکین کو سلام کیسے کیا جائے ،اور یہ کہ خط اور خصوصاً دعوت میں مکتوب الیہ کی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر اس کا اقرار ہونا چاہئے تاکہ دعوت میں نرمی رہے جو مؤثر ثابت ہوتی ہے اور یہ کہ سرنامہ کے بعد خطاب فصل یعنی امابعد بھی ہونا چاہئے اور یہ کہ خط میں اختصار و جامعیت ہونی چاہئے اور یہ کہ مکتوب الیہ کو اس کی ذمہ داری

کا احساس بہتر طریقہ سے یاد دلایا جائے اور یہ کہ خط کے ذریعہ سے بھی دعوت کا فریضہ ادا ہوتا ہے اور یہ کہ سربراہ کو دعوت دینے سے داعی کی ذمہ داری جو باقی تک دعوت رسائی کی ہے پوری ہو جاتی ہے۔ مزید فوائد ومسائل کے لئے بخاری کی شروحات ملاحظہ ہوں۔

باب ماجاء فی ختم الکتاب

(خط پر مُہر لگانے کا بیان)

"عن انس بن مالک قال لَمّا اراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی العجم قیل لہ ان العجم لایقبلون اِلّا کتاباً علیہ خاتم فاصطنع خاتماً قال فکأنّی انظر الی بیاضہ فی کَفِّہ". (حسن صحیح)

حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمی بادشاہوں کے نام خطوط ارسال کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ سے کہا گیا کہ شاہانِ عجم مہر شدہ خط کے سوا کوئی خط قبول (وصول) نہیں کرتے ہیں چنانچہ آپؐ نے ایک مہر بنوائی حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں گویا (ابھی بھی) اس مہر (انگوٹھی) کی سفیدی آپؐ کی ہتھیلی میں دیکھ رہا ہوں۔

تشریح:۔ قولہ: "علیہ خاتم" ای نقش خاتم جس پر انگوٹھی سے مہر لگائی گئی ہو کیونکہ انگوٹھی کی مہر میں تبدیلی اور غیر متعلقہ شخص کی طرف سے آنے کا امکان کم از کم رہ جاتا ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کفار کو دعوت دیتے وقت ان کی جائز شرائط کو ماننے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس سے دعوت مفید تر بن جاتی ہے عارضۃ الاحوذی میں ہے: **"جَرَی علی العادۃ معھم اذ کان ذالک ادعیٰ الی قبولھم"** چنانچہ سریانی سیکھنے کی وجہ بھی یہی ضرورت ومصلحت تھی۔ حضورؐ کی انگوٹھی کی تفصیل ابواب اللباس جلد پنجم تشریحات میں گذری ہے۔ فلا نعیدہ

باب کیف السلام

(سلام کیسے کیا جائے)

"عن المقداد بن الاسود قال: اقبلتُ انَا وصاحبان لی قدذھبت اسماعُنا وابصارُنا من

الجَهدفَجَعَلنانَعرِض اَنفُسَناعلى اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم فليس احد يَقبلُنا فاَتينا النبى صلى الله عليه وسلم فاَتىٰ بِنااهلَه فإذاثلاثة اَعنُزٍ... فقال النبى صلى الله عليه وسلم: اِحتَلِبوا هذا اللَّبَنَ فكنانَحتَلِبُه فيشرَب كل انسان نصيبه ونرفع لرسول الله صلى الله عليه وسلم نصيبه فيجئى رسول الله صلى الله عليه وسلم من الليل فيُسلِّم تسليماً لايُوقِظ النائم ويُسمِع اليقضان ثم يأتى المسجدفيصلى ثم يأتى شرابه فيشربه". (حسن صحيح)

حضرت مقداد بن اسود ؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے دو رفیق (مدینہ) آئے، اس وقت بھوک وافلاس کی وجہ سے ہماری سماعتیں اور ہماری بصارتیں بہت کمزور ہو چکی تھیں تو ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے سامنے خود کو پیش کرنا شروع کیا مگر (غربت کی وجہ سے) کوئی ہمیں (مہمان کے طور پر) قبول نہیں کرتا تھا، چنانچہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپؐ ہمیں اپنے گھر لے آئے، پس (خوش قسمتی سے) وہاں تین بکریاں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کا دودھ دوہو! پس ہم دودھ دوہتے تھے اور ہر شخص اپنا حصہ پیتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کا دودھ ہم اوپر رکھتے تھے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تشریف لاتے اور ایسا سلام کرتے جو سونے والے کو جگاتا نہیں تھا اور سنائی دیتا جاگنے والے کو، پھر آپؐ مسجد میں تشریف لے جاتے اور (تہجد کی) نماز پڑھتے پھر اپنے حصے کے دودھ کے پاس آتے تھے اور اس کو پی لیتے تھے۔

تشریح:۔ قولہ: "الجهد" بفتح الجیم بھوک اور مشقت وتھکن کو کہتے ہیں۔ قولہ: "فليس احد يقبلُنا" انہوں نے ایسے صحابہ کرامؓ سے تعرض کیا ہوگا جو خود بھی محتاج تھے، کیونکہ یہ شروع ہجرت کی بات ہے۔
قولہ: "ونرفع الخ" مراد الگ کرنا اور محفوظ رکھنا ہے مگر ایسی نازک چیزیں عموماً اونچی جگہ پر رکھتے ہیں تاکہ محفوظ بھی ہوں اور تلاش کرنے میں دقت بھی نہ ہو اس لئے نرفع کہا۔

اس حدیث سے سلام کی کیفیت معلوم ہوئی کہ نہ تو ایسی پست آواز سے ہو کہ مخاطب سُن نہ سکے اور نہ ہی اتنی بلند آواز سے ہو کہ سونے والوں کی نیند میں خلل ڈالے اور نمازیوں کی نماز میں بھی خلل ڈالے۔

یہ روایت مسلم میں تفصیل سے مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات کو شیطان نے مجھے آپؐ کے حصہ کا دودھ پینے پر اُکسایا لیکن جیسے ہی دودھ پیٹ میں پہنچا تو مجھے سخت ندامت ہوئی میں نے چادر اوڑھ لی مگر نیند کہاں آرہی تھی کہ آپؐ کی بددعاء کا خطرہ لاحق تھا چنانچہ آپؐ آئے جب پیالہ کو

خالی پایا تو آپ نے یہ دعاء پڑھ لی: "اللهم اطعم من اطعمنی واسق من سقانی" تو میں نے چھرا لے لیا تاکہ آپ کے لئے ایک بکری ذبح کرلوں مگر جب بکریوں کے پاس گیا تو ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے میں نے دودھ نکالا اور آپ کے پاس آیا، آپ کو پلایا اور پھر آپ کو ساری صورت حال بتلادی۔ (مسلم ص:۱۸۴ج:۲)

باب ماجاء فی کراهية التسليم على من يبول

(پیشاب کرنے والے پر سلام مکروہ ہے)

"عن ابن عمران رجلاً سَلَّمَ على النبی صلی اللہ علیه وسلم وهويبول فلم يَرُدَّ عليه النبیُّ صلی اللہ علیه وسلم "السلام". (حسن صحيح)

ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اس حال میں کہ آپ پیشاب کررہے تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سلام کا جواب نہیں دیا۔

تشریح:۔ معلوم ہوا کہ پیشاب میں مشغول کو سلام کرنا مکروہ ہے اور اگر کوئی کرے تو اس کا جواب نہیں دیا جائے، مسئلہ کی تفصیل "کراهية ردالسلام غیر متوضیٔ" کے باب میں گزری ہے۔ (دیکھئے: تشریحات ص:۲۸۶ج:۱)

باب ماجاء فی کراهية ان يقول عليک السلام مبتدئاً

(پہل کرنے والے کے لئے علیک السلام کہنا مکروہ ہے)

"عن ابی تميمة الهُجيمی عن رجل من قومه قال طلبتُ النبی صلی اللہ علیه وسلم فلم اقدرعليه فجلستُ ،فاذانفرٌهوفيهم ولااعرفه وهويُصلِح بينهم فلمافرَغ قام معه بعضهم فقالوا يارسول الله افلمارأيتُ ذانک قلت"عليک السلام يارسول اللهٔ!" "عليک السلام يا رسول اللّٰه" "عليک السلام يا رسول اللّٰه" قال"عليک السلام تحيّةُ الميّت"ثم اَقبَلَ عَلَیَّ فقال اذالَقِیَ الرجل اخاه المسلم فليقل السلام عليک ورحمة الله وبركاته ثم رَدَّ عَلَیَّ النبی صلی اللہ علیه وسلم قال:وعليک ورحمة الله وعليک ورحمة الله!(وعليک ورحمة

اللہ). (حسن صحیح)

حضرت ابوتمیمہؒ اپنی قوم کے ایک شخص (ابوجُری جابر بن سُلیم الھجیمی) سے نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈ ھتا رہا لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوسکا تو میں بیٹھ گیا پھر اچانک ایک جماعت (نظر) آئی آپؐ بھی ان لوگوں میں تھے مگر میں آپؐ کو پہچانتا نہیں تھا جبکہ آپؐ ان کے درمیان میں مصالحت کرا رہے تھے، چنانچہ جب آپؐ فارغ ہوچکے تو آپؐ کے ساتھ کچھ لوگ بھی کھڑے ہوئے (یعنی جانے لگے) تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! پس جب مجھے یہ معلوم ہوا (کہ آپؐ یہی ہیں) تو میں نے کہا تجھ پر سلامتی ہو اے اللہ کے رسول! (تین بار کہا) آپؐ نے فرمایا ''علیک السلام'' مُردوں کا سلام ہے! پھر آپؐ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو اس کو (یوں) کہنا چاہئے ''السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے میرے سلام کا جواب دے کر فرمایا ''وعلیک ورحمۃ اللہ''! (تین مرتبہ کہا)۔

تشریح:۔قولہ: ''عن رجل'' اگلی روایت میں ان کے نام کی تصریح ہے یعنی جابر بن سُلیم ہُجیمیؓ چونکہ یہ مدینہ میں نو وارد تھے اور آپؐ کے ہاتھ بیعت اسلام کرنا چاہتے تھے مگر آپؐ کو پہچان نہیں رہے تھے اس لئے تھک گئے اور بیٹھ گئے پھر ان کا تین مرتبہ سلام کرنا لاعلمی کی وجہ سے تھا اور آپؐ کا جواب میں تاخیر کرنا عدم وجوبِ جواب کی وجہ سے تھا کیونکہ غیر مسنون سلام کا جواب ضروری نہیں مگر آپؐ کا تین بار جواب دینا ان صحابی کی دلداری کے لئے تھا ورنہ عام معمول شریف ایک بار ہی جواب دینے کا تھا، چونکہ علیک کی تقدیم سے اختصاص کا شائبہ ہوتا ہے اس لئے آپؐ نے منع کر کے فرمایا ''اِن علیک السلام تحیۃ المیت'' میت سے مراد جاہل بھی ہوسکتا ہے یعنی اسلام سے قبل جاہل لوگوں کا سلام علیک السلام ہوتا تھا جس میں علیک مقدم ہوتا تھا چونکہ جُہلاء کی مشابہت اچھی بات نہیں اس لئے اسلام نے اس لفظ کو تبدیل کیا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میت اپنے معنی پر ہو پھر اضافۃ الی المفعول بھی ہوسکتی ہے اور الی الفاعل بھی، یعنی اس طرح سلام تو مُردوں کو کیا جاتا تھا جیسے عربی اشعار و مراثی میں ہوتا ہے تاہم یہاں کوئی تشریع مقصود نہیں ہے کہ مردوں کو ایسا سلام کیا جائے اور نہ ہی آپؐ کا اہل قبور پر سلام اس طرح ہوتا تھا بلکہ اس میں بھی السلام علیکم ہی کے الفاظ ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں لوگ مردوں کو علیک السلام سے سلام کرتے لہٰذا تمہیں بحیثیت مسلمان ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت تھانویؒ المسک الذکی میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ اضافت الی الفاعل ہے یعنی

مردے کسی زندہ کو سلام تو کر نہیں سکتے ہیں مگر جب زندہ اسے سلام کرتا ہے تو مردہ جواب میں علیک السلام کہتا ہے اور تم تو زندہ ہو لہٰذا مُردوں جیسا سلام نہ کرو!

پھر پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ السلام علیک کے بجائے جمع کا صیغہ علیکم کہنا زیادہ افضل ہے تاکہ کراماً کاتبین بھی اس میں شامل ہوں۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"والافضل ان یقول السلام علیکم لیتناوله ومَلَکیه واکمل منه ان یزید ورحمة الله وایضاً وبرکاته ولوقال سلامٌ علیکم اَجزأه". (نووی: ص:۲۱۲ ج:۲)

یعنی اگر مخاطب ایک ہو تو السلام علیک بھی کافی ہے مگر علیکم افضل ہے۔ اسی طرح جواب کا حال بھی ہے۔ غرض جو پہلے سلام کرے وہ علیکم کو مؤخر کر کے کہے السلام علیکم۔

قولہ: "وذکر قصة طویلة" امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو مختصر نقل کیا ہے تفصیلی روایت ابوداؤد "باب ماجاء فی اسبال الإزار" میں ہے۔ (ص:۵۶۴ ج:۲، لباس، میر محمد کتب خانہ)

حدیث آخر:۔ عن انس بن مالک ان رسول الله صلی الله علیه وسلم: کان اذاسلّم، سَلّمَ ثلاثاً واذاتکلم بکلمة اَعَادها ثلاثاً". (حسن غریب صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام کرتے تو تین بار سلام کرتے اور جب کوئی بات فرماتے تو اس کو تین بار لوٹاتے تھے۔

تشریح:۔ آنحضورؐ کی عادت شریفہ سلام مکرر کرنے اور عام بات دہرانے کی نہ تھی اس لئے کہا جائے گا کہ اس حدیث کا خاص محمل مراد ہے مثلاً پہلا سلام استیذان کے لئے ہوتا تھا دوم تحیہ کے لئے اور سوم واپسی پر الوداع کے لئے۔

یا جب مجمع بڑا ہوتا تھا تو ایک سلام آگے یعنی سامنے والوں کو دوسرا دائیں جانب والوں کو اور تیسرا بائیں طرف والوں کو، یا پہلا مجمع کے شروع میں یعنی داخل ہوتے ہی، دوسرا درمیان میں اور تیسرا اخیر میں بیٹھنے والوں کو۔ اسی طرح جب کوئی بات اہم ہوتی تو اسے تین مرتبہ ارشاد فرماتے یا کوئی مضمون مشکل سا ہوتا تو اسے مکرر فرماتے تاکہ سب لوگ سمجھ جائیں، یا مجمع بڑا ہوتا تو آگے اور دائیں بائیں تین بار ارشاد فرماتے۔

بابٌ

"عن ابی واقد اللیثی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینماھو جالس فی المسجد والناس معہ اِذاَقبل ثلاثۃ نفرٌ فاقبل اثنان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذھب واحد، فلما وقفا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سَلّمَا، فاما احدھما فَرَأی فُرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیھا واما الآخر فجلس خلفھم، واما الآخر فَاَدبَرَ ذاھباً، فلما فَرَغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَلَا اُخبرکم عن النفر الثلاثۃ اما احدھم فَاَوٰی الی اللہ فاٰواہ اللہ واما الاٰخر فاستحییٰ فاستحییٰ اللہ منہ واما الاٰخر فاعرض فاعرض اللہ عنہ". (حسن صحیح)

حضرت ابو واقد لیثیؓ سے روایت ہے کہ دریں اثنا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں جلوہ افروز تھے اور آپؐ کے ساتھ لوگ بھی تھے، اتنے میں تین شخص سامنے سے آئے پس دو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (مجلس کی) طرف آگے بڑھے اور ایک چلا گیا، چنانچہ یہ دونوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کھڑے ہوئے تو انہوں نے سلام کیا، پھر ایک نے حلقہ میں خالی جگہ دیکھ لی تو اسی میں (جاکر) بیٹھ گیا اور رہا دوسرا تو وہ (بتقاضائے حیاء) لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا جبکہ تیسرا پیٹھ پھیر کر چلا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (گفتگو سے) فارغ ہوئے تو فرمایا کیا میں تمہیں تین اشخاص کی خبر نہ دوں؟ کہ ان میں سے ایک نے اللہ سے جگہ مانگی تو اللہ نے اُسے جگہ دی (یعنی حلقہ میں) اور دوسرے کو شرم آئی (حلقہ کے اندر بیٹھنے سے یا واپس جانے سے) تو اللہ نے اس کو محروم نہیں کیا، اور تیسرا جو تھا تو اس نے گریز کیا (بیٹھنے سے) تو اللہ نے اس سے بھی گریز فرمایا (یعنی اس کو نہیں بلایا)۔

تشریح:۔ قولہ: "فاوی الی اللہ فاٰواہ" پہلا بغیر مد کے ہے کیونکہ لازمی ہے جبکہ دوسرا ممدود ہے کہ متعدی ہے، یہ تینوں یا تو مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے جن میں دو اندر آ گئے اور ایک وہیں سے چلا گیا یا پھر تینوں اندر آئے مگر ایک نے آپؐ کے قریب جانے کی کوشش کی تو اللہ نے اس کی مراد پوری کر لی جبکہ دوسرے نے بتقاضائے حیاء مجلس میں داخل ہونے کو مناسب نہیں سمجھا تو حلقہ کے کنارے بیٹھ گیا جبکہ تیسرا واپس چلا گیا اس نے ضرورت بیٹھنے کی محسوس نہیں کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے نے بھی جانے کی نیت کی ہو مگر چند قدم واپس پلٹنے کے بعد اس کو شرم آئی اور مجلس کی جانب لوٹ

گیا لہٰذا "فاستحیی" میں یہ دونوں احتمال ہیں۔ قوله: "فاستحیی الله منه" اگر حیاء وغیرہ صفات المخلوق کا اطلاق اللہ پر ہو جائے تو اس سے مراد غایات ہوتی ہیں یعنی ذکر سبب اور مراد مسبب، مسئلہ کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے علی ہذا اگر مراد یہ ہو کہ وہ مجلس کے اندر بیٹھنے سے شرما گیا تو فاستحیی اللہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اس کی حیاء پر جزاء عطا فرمائی علی ہذا اس کا ثواب پہلے والے سے زیادہ ہوا، اور اگر مطلب یہ ہو کہ وہ واپس جانے سے رُک گیا بتقاضائے حیاء تو فاستحیی اللہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے بھی اس کو مجلس سے محروم نہیں فرمایا اور اس کا ثواب ترک نہیں کیا۔ بناء بر ہر تقدیر حیاء کا اطلاق اللہ پر مشاکلۃً ہوا ہے جیسے "ان المنافقین یخدعون الله وهو خادعهم"۔ (النساء آیت: ۱۴۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص دینی حلقہ اور اللہ کے رسول کے جتنے قریب جانے کی نیت اور کوشش کرتا ہے تو وہ اسی تناسب سے اللہ کا قرب حاصل کر لیتا ہے قال الله "والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سُبلنا" (الایۃ) اس کے برعکس جو شخص بے اعتنائی ولا پرواہی کرتا ہے تو وہ محروم ہو جاتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "عن جابر بن سَمُرَةَ قال کُنّا اذا اتینا النبی صلی الله علیه وسلم جلس احدُنا حیث ینتهی". (حسن غریب)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو ہم میں سے ہر شخص حلقے کے آخر میں بیٹھ جاتا۔

یعنی گردنیں پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جہاں ہجوم ختم ہوتا اس کے پیچھے بیٹھ جاتے کیونکہ اس سے نہ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی بات چیت اور وعظ و نصیحت میں خلل پڑتا ہے، ہاں اگر آگے جگہ خالی ہو یا کوئی معزز شخص ہو اور اس کے آگے جانے سے کسی کو تکلیف نہ ہو یا کوئی اس کو آگے مجمع میں جگہ دے یا صف میں جگہ دے تو اس کی طرف جانا جائز ہے جیسا کہ تشریحات: ص: ۳۸۶ ج: ۲ "باب ماجاء فی کراهیة التخطی یوم الجمعة" میں گذرا ہے۔

باب ماجاء (ما) علی الجالس فی الطریق

(راستے پر بیٹھنے والے کی ذمہ داری)

"عن ابی اسحاق عن البراء ولم یسمعه منه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم مَرَّ بناس من الانصاروهم جلوس فی الطریق فقال: ان کنتم لابُدَّ فاعلین فرُدُّوا السلام واعینوا المظلوم واهدوا السبیل". (حسن)

حضرت ابوسحاق یہ روایت حضرت براء بن عازبؓ سے نقل کرتے ہیں مگر ان سے یہ روایت سنی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے چند لوگوں کے پاس سے گذرے جو راستہ میں بیٹھے ہوئے تھے آپؐ نے فرمایا اگر تمہارے لئے راستہ پر بیٹھنا ناگزیر ہو تو سلام کا جواب دیا کرو! اور مظلوم کی مدد کرو! اور (بھٹکے ہوئے کو) راستہ بتایا کرو!۔

تشریح:۔ قوله: "ولم یسمعه" یعنی ابواسحاق نے یہ روایت حضرت براءؓ سے نہیں سنی ہے تاہم امام ترمذیؒ نے اس انقطاع کے باوجود اس کو حسن قرار دیا ہے کیونکہ اس کے دیگر شواہد موجود ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اولاً تو کوشش یہ ہونی چاہئے کہ راستوں پر نہ بیٹھا جائے کیونکہ وہاں سے عورتوں کے گذرنے کا بھی احتمال ہے جس سے ایک طرف بدنظری ممکن ہے تو دوسری طرف گذرنے والی عورت کو راستہ میں رکاوٹ محسوس ہوگی البتہ اگر کوئی بیٹھنا چاہے تو اس کی اجازت دی گئی مگر اس کو مشروط کیا گیا چند آداب کے ساتھ کہ سلام کا جواب دو گے، مظلوم کی مدد کرو گے، اور بھولے ہوئے کو راستہ بتاؤ گے علاوہ ازیں بھی کچھ آداب ہیں مثلاً بوجھ میں مدد کرنا آج کل جیسے گاڑی کو دھکا دینے کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں تعاون کرنا وغیرہ۔

دراصل شریعت ہر موقعہ پر مسلمان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ اس کی زندگی کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت ذمہ داریوں سے خالی نہیں ہے وہ جہاں بھی ہو اس کی فلاں فلاں ذمہ داری ہوگی از اں جملہ راستہ کی ذمہ داریاں بتلادی گئیں۔

باب ماجاء فی المصافحة

(مصافحہ (ہاتھ ملانے) کا بیان)

"عن انس بن مالک قال قال رجل یارسول اللّٰہ الرجل منّا یلقی اخاہ او صدیقہ اینحنی لہ؟ قال "لا" قال افیلتزمہ ویقبّلہ؟ قال "لا" قال فیأخذ بیدہ ویصافحہ؟ قال "نعم". (حسن)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول! جب ہم میں سے ایک آدمی اپنے (مسلمان) بھائی سے ملے یا اپنے دوست سے ملے تو کیا وہ اس کے لئے جھکے؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں" اس نے عرض کیا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور بوسہ دے؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں" اس نے عرض کیا تو کیا (اس کی اجازت ہے کہ) اس کا ہاتھ پکڑے (یعنی) اس سے ہاتھ ملائے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں"!

تشریح:۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوالات پوچھے گئے ہیں جن میں سے دو کی آپؐ نے نفی میں جواب دیا ہے اور ایک کا اثبات میں۔ مگر دراصل یہاں چار سوالات ہیں: (۱) جھکنا (۲) معانقہ کرنا (۳) بوسہ دینا اور (۴) مصافحہ کرنا۔ (۱) ان میں پہلا یعنی جھکنا مکروہ بلکہ حرام ہے جس کا ضابطہ اگلے باب میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے حضرت شاہ صاحبؒ العرف الشذی میں فرماتے ہیں: "اما الانحناء عند الملاقات فمکروہ تحریماً کما فی فتاوی الحنفیة (۲،۳) معانقہ یعنی گلے ملنا اور بوسہ دینا طرفین کے نزدیک مکروہ ہیں اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے چنانچہ ہدایہ جلد چہارم کتاب الکراھیة میں الجامع الصغیر مع الہدایہ کی عبارت ہے:

"ویکرہ ان یقبّل الرجل فَمَ الرجل اویدہ اوشیئاً منہ اویعانقہ وذکر الطحاوی ان ھذا قول ابی حنیفة ومحمد وقال ابویوسف رحمھم اللّٰہ لاباس بالتقبیل والمعانقة الخ".

مگر متاخرین حنفیہ کی اکثریت کا میلان جواز کی طرف ہے۔ چونکہ دونوں طرف روایات پائی جاتی ہیں اس لئے تطبیق یوں دی گئی ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو یا کوئی اور مفسدہ ہو جیسے مالداری کی وجہ سے ہاتھ چومنا تو پھر مکروہ ہے جبکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہونے کی صورت میں بلا کراہیت جائز ہے العرف الشذی میں ہے:

"وَاَمَّا التقبیل فَمُتَحَمَّلٌ والمعانقة جائزة بشرط الامن عن الوقوع فی الفتنة".

بعض اہل ظاہر نے کہا ہے کہ سفر سے آنے والے سے معانقہ کرنا جائز ہے جبکہ عام ملاقات میں مکروہ ہے اس کے لئے امام ترمذیؒ نے اس کے بعد مستقل باب قائم کیا ہے (۴) چوتھا امر یعنی مصافحہ کرنا بالاتفاق جائز ہے۔ مصافحہ صفحہ سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے یعنی ہاتھ کی سطح اور خصوصاً ہتھیلی کو ہتھیلی سے ملانے کو کہتے ہیں تاہم شریعت کی اصطلاح میں اس کا اطلاق پورے ہاتھ یعنی ہتھیلی انگلیوں سمیت ملانے پر ہوتا ہے۔

مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دونوں سے؟ کسی صریح وصحیح روایت سے مصافحہ کی ایک ہاتھ یا دونوں ہاتھوں کی قید ثابت نہیں ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ ایک ہاتھ سے بھی مصافحہ جائز ہے جیسا کہ دونوں ہاتھوں سے بھی جائز ہے تاہم افضل کون سی صورت ہے؟ تو صاحب تحفۃ الاحوذی نے ایک ہاتھ والی صورت پر بہت زیادہ زور لگایا ہے مگر میرے خیال میں انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے مثلاً وہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث "علمنی النبی صلی الله علیه وسلم التشهد وکَفِی بین کفیه" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ مصافحہ نہیں تھا بلکہ تعلیم کا ایک طریقہ تھا حالانکہ یہ بے جا تکلف ہے کیونکہ اگر ان کی توجیہ صحیح ہوتی تو پھر امام بخاریؒ اس کو کتاب العلم میں ہی ذکر کرتے حالانکہ انہوں نے اس کو کتاب الاستیذان میں ذکر کیا ہے اور اس پر باقاعدہ دو باب قائم کئے ہیں پہلے کا ترجمۃ الباب ہے "باب المصافحۃ" اور دوسرا ہے "باب الاخذ بالیدین وصافحَ حمادُبنُ زیدابنَ المبارک بیدیه"۔ (بخاری: ص:۹۲۶ ج:۲)

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ امام بخاریؒ کے تراجم کو بہت اہمیت دیتے ہیں مگر یہاں نہ معلوم ان کو کیا ہوا؟ شاید ان کے کوئی خاص اصول مقرر نہ ہوں۔ نیز وہ مصافحہ کو بیعت پر قیاس کر کے استدلال فرماتے ہیں کہ چونکہ بیعت ایک ہاتھ سے ہوتی ہے لہٰذا مصافحہ بھی ایک ہاتھ سے ہونا چاہئے حالانکہ یہ بھی بے جا ضد ہے کیونکہ اگر مصافحہ کا طریقہ قیاس سے ثابت کرنے کی گنجائش ہے (حالانکہ آپ تو قیاس کو اہمیت نہیں دیتے ہیں) تو پھر مصافحہ کو استلام حجر اسود پر قیاس کرنا چاہئے کہ دونوں میں مشابہت پائی جاتی ہے بیعت پر قیاس مع الفارق ہے کیونکہ بیعت تو ایک وعدہ ہوتا ہے اور عرب ایسے موقعوں پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتے تھے چنانچہ بیع کو اسی لئے صفقہ کہتے ہیں۔

بہرحال اس مسئلہ میں دونوں جانبین سے افراط وتفریط ہوتی ہے بعض علماء ایک ہاتھ سے ملانے کو غیر مسنون کہتے ہیں یہ بھی درست نہیں جبکہ غیر مقلدین ایک ہی ہاتھ ملانے پر اصرار کرتے ہیں یہ بھی زیادتی

ہے۔حضرت گنگوہیؒ الکوکب میں فرماتے ہیں:

”والحق فیہ ان مصافحتہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابتة بالید وبالیدین اِلّاان المصافحة بید واحدة لماکانت شِعار اھل الافرنج وجب ترکہ لذالک“۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ اس مسئلہ کی نوعیت کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی طرح ہوگئی ہے کہ اصل شریعت میں بول قائما کی گنجائش اور ثبوت تو ہے مگر بوجوہ اس کی علماء ممانعت کرتے ہیں جس کی تفصیل ”باب النھی عن البول قائما“ میں گزری ہے۔(دیکھئے تشریحات: ج:۱ص:۱۰۷)

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح بول قائماً غیر مسلموں اور خصوصاً انگریزوں کا شعار ہونے کی وجہ سے علماء نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے اسی طرح مصافحہ ایک ہاتھ سے بھی غیر مسلموں کے شعار ہونے کی وجہ سے ممنوع قرار پایا خصوصاً جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔

اگر غیر مسلموں کی مشابہت کی شناعت کی تفصیل درکار ہو تو امام ابن تیمیہؒ کی کتاب ”اِقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الجحیم“ کا مطالعہ کیا جائے کہ کس طرح علماء وقت شعارِ غیر ہونے کی وجہ سے مستحب کے ترک کے فتاوی دے چکے ہیں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:”کل سنة تکون شِعار اھل بدعة فترکھا اولیٰ“۔

ابن تیمیہؒ نے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں کہ بہت سے شافعیہ روافض کی مشابہت سے بچنے کے لئے قبر کی تسنیم مسنون کو ترک کرنے کا فتوی دیتے ہیں اور حنفیہ نے کفار کی عید کے موقع پر ان کے مشابہ لباس پہنے کو کفر قرار دیا ہے اور مالکیہ کہتے ہیں کہ جس نے کفار کی عید کے موقع پر بطخ ذبح کر دی گویا اس نے خنزیر ذبح کیا(ص:۱۳۵) اور امام احمدؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مہینوں اور بچوں کے نام فارسی میں رکھنا مکروہ ہیں”واما کلام احمد واصحابہ فی ذالک فکثیر جداً اکثر من ان یُحصر الخ“۔(ص:۱۳۷)

حدیث آخر:۔حضرت قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا صحابہ کرام میں مصافحہ پر تعامل تھا؟انہوں نے فرمایا”ہاں“(حسن صحیح)۔حدیث آخر:۔ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلام(ملاقات) کی تکمیل میں سے ہے ہاتھ پکڑنا(یعنی ہاتھ ملانا)۔

ان کی یہ دوسری حدیث ابواب الصلوٰۃ میں گذری ہے یعنی نماز عشاء کے بعد گفتگو کی اجازت فقط نمازی (تہجد پڑھنے والے) اور مسافر کے لئے ہے۔(دیکھئے تشریحات:ص:۴۱۶ج:۱”باب ماجاء فی رخصة السمر بعد

العشاء") اور اس سے قبل والے باب میں ص: ۴۱۵ پر۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مریض کی پوری طرح عیادت (بیمار پرسی) یہ ہے کہ تم میں سے کوئی ایک (یعنی عیادت کرنے والا) اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ کر یا فرمایا اس کے ہاتھ پر رکھ کر اس سے پوچھے "کیف هو" یعنی آپ کیسے ہیں؟ اور آپس کی دعا و سلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے۔

اس حدیث کی سند علی بن یزید کی وجہ سے بتصریح امام بخاریؒ کمزور ہے تاہم اس میں جو مضمون ہے وہ اعتدال کی تلقین ہے کہ عیادت اور ملاقات کے وقت اتنی سی بات بھی کافی ہے مزید تکلف کی ضرورت نہیں، ہاں اگر کسی امر عارض کی وجہ سے اس میں کمی بیشی کی ضرورت محسوس ہو تو وہ ممنوع نہیں ہے۔

حدیث آخر:۔"مامن مسلمین یلتقیا ن فیصافحان اِلاّ غُفِرَ لهما قبل ان یتفرقا".

(حسن غریب)......ویُروىٰ هذا الحدیث من غیر وجه عن البراء".

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی دو مسلمان ایسے نہیں ہیں کہ وہ آپس میں ملیں اور مصافحہ کریں مگر یہ کہ بخشے جاتے ہیں وہ دونوں قبل اس کے کہ وہ جدا ہوں۔

اس حدیث میں نہ صرف مصافحہ کے جواز کا بیان ہے بلکہ اسے باعث مغفرت بھی قرار دیا گیا ہے تاہم اس بارے میں دوسری احادیث کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ صرف خاموشی سے مصافحہ گناہوں کی مغفرت کا باعث نہیں بلکہ جس سے پہلے سلام ہو اور اپنے گناہوں کی مغفرت کی طلب ہو یعنی زبانی استغفار ہو بعض روایات میں درود شریف پڑھنے کا ذکر ہے بعض میں حمد کا بھی ذکر ہے ایسی ملاقات اور مصافحہ باعث مغفرت ہے۔

بہر حال مصافحہ بالاتفاق مستحب عمل ہے امام مالکؒ اپنے مرجوع عنہ قول کے مطابق اس کو آپؐ کی خصوصیت سمجھتے تھے جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے مگر بعد میں انہوں نے اس سے رجوع فرمایا ہے، البتہ فتنے کے مواضع میں مصافحہ جائز نہیں جیسے اجنبی عورتوں اور بے ریش امرد لڑکوں کے ساتھ البتہ اجنبیہ عورت کے ساتھ ہاتھ ملانا بہر حال ممنوع ہے جبکہ لڑکوں میں خوف فتنہ ملحوظ ہے کیونکہ بعض لوگ اخلاقی مریض اور ہم جنس پرست ہوتے ہیں۔ پھر شافعیہ نماز فجر و عصر کے بعد مصافحہ کو جائز مانتے ہیں جیسا کہ نوویؒ نے "الاذکار" میں لکھا ہے کہ باوجود غیر مشروع و غیر ثابت ہونے کے اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ مصافحہ اصلاً یعنی فی نفسہ سنت ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ نمازوں کے بعد مصافحہ کو سنت کہنا غلط ہے کیونکہ مصافحہ ملاقات کی ابتداء میں

مسنون ہے جبکہ نمازی جب ایک ساتھ کھڑے ہوجاتے ہیں تو ہاتھ نہیں ملاتے ہیں مگر جب فجر وعصر کی نماز سے فارغ ہوجائے تو پھر ہاتھ ملاتے ہیں اس لئے حنفیہ کے نزدیک یہ مکروہ ہے: ''ولهذا صرح بعض علمائنا بانها مكروهة حينئذٍ وانها من البدعة المذمومة'' جناب علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ نے دونوں حضرات کے اقوال نقل کرنے کے بعد ملا علی قاری کے قول کو ترجیح دی ہے۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ ملا علی قاریؒ کا قول واقعتاً صحیح اور راجح ہے لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انہوں نے جو وجہ کراہیت کی بیان فرمائی ہے آیا یہ معقول اور صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر عیدین کی نمازوں کے بعد معانقہ کو کیوں مکروہ نہ کہا جائے؟ جبکہ مصافحہ کے استحباب پر اجماع اور معانقہ طرفین کے نزدیک عام حالات میں اور عند الملاقات بھی مکروہ ہے پس عید کی نماز کے بعد کیسے مستحسن ہوسکتا ہے؟؟؟

باب ماجاء فی المعانقة والقُبلة

(گلے ملنے اور بوسہ دینے کا بیان)

''عن عائشة قالت قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله صلى الله عليه وسلم في بيتي فَأَتَاه فقرع الباب فقام اليه رسول الله صلى الله عليه وسلم عُرياناً يَجُرُّ ثوبه والله ما رأيته عُريانا قبله ولا بعده فاعتنقه وقَبَّلَه''. (حسن غريب)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ زید بن حارثہؓ مدینہ پہنچ گئے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تھے چنانچہ حضرت زیدؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بے ساختہ) ان کی طرف اُٹھے برہنہ حالت میں اپنی چادر کو گھسیٹتے ہوئے، بخدا! میں نے آپؐ کو اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی برہنہ نہیں دیکھا، چنانچہ آپؐ نے ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔

تشریح:۔ قوله: ''قدم زيد بن حارثه'' مشہور صحابی ہیں جن کو آپؐ نے متبنّیٰ بنایا تھا پھر قرآن نے اس اصطلاح اور طرز کو منسوخ کر دیا جیسا کہ سورۂ احزاب میں بیان ہوا ہے تاہم آپؐ کی ان سے محبت قائم ودائم رہی السابقون الاولون میں ہیں، یہ واقعہ کس سفر سے واپسی پر پیش آیا ہے تو کسی روایت میں نظر سے نہیں گذرا ہے ممکن ہے کہ کسی غزوہ سے واپسی مراد ہو یا کسی سفر سے۔ قوله: ''عُرياناً'' اگرچہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپؐ کا پورا بدن مبارک منکشف ہوا ہو اور یہ شان نبوت کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں

بخاری کی روایت ہے، تاہم یہاں صحیح محمل پر حدیث کو بلا تکلف حمل کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ کے کندھوں سے بالائی چادر گرگئی جہاں تک ازار کا تعلق ہے تو وہ بدستور باقی تھا۔

قولہ: "یجرُّ ثوبہ" چونکہ آپؐ شدت مسرت کی وجہ سے فوراً اٹھے تھے اس لئے کندھوں سے چادر کھسک گئی جسے آپؐ سنبھال رہے تھے تو گھسیٹنے کی صورت پیدا ہوگئی۔ قولہ: "واللّٰہ ما رأیتہ عُریاناً قبلہ ولا بعدہ" یعنی میں نے آپؐ کو کسی سے ملتے ہوئے یا کمرے سے باہر اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا ہے، کیونکہ آپؐ عام حالات میں گھر کے اندر بھی پورا لباس زیب تن فرماتے۔ (تدبر)

قولہ: "فاعتنقہ وقبلہ" اس بارے میں "باب ماجاء فی المصافحۃ" میں ہم نے العرف الشذی اور ہدایہ کی عبارات نقل کی ہیں فلیتذکر۔ خلاصہ یہ ہے کہ معانقہ اور قُبلہ کی اباحت وکراہیت کا دارومدار خوف فتنہ سے محفوظ ہونے اور اس میں پڑنے پر ہے۔

بوسہ دینے کی اقسام:۔ الکوکب الدری کے محشی نے الدر المختار سے نقل کیا ہے کہ چومنے کی پانچ صورتیں ہیں: (۱) پیار کرنے کی غرض سے جیسے چھوٹے بچے کو چومنا (۲) رحمت کے لئے جیسے والدینؔ کے سر کو بوسہ دینا (۳) شفقت کے لئے جیسے بھائی کے ماتھے کو بوسہ دینا (۴) شہوت کے طور پر جیسے بیوی کا بوسہ لینا (۵) قبلہ تحیہ (دعا وسلام) جیسے اہل علم وعادل بادشاہ کے ہاتھ کو چومنا جبکہ ماھو المختار قول کے مطابق غیر عالم اور غیر عادل یعنی عام آدمی کے ہاتھ کو بوسہ دینا مباح نہیں بعض حضرات نے قبلہ دیانت کا بھی اضافہ کیا ہے جیسے حجر اسود کا بوسہ لینا جبکہ علماء اور عظماء کے سامنے زمین کو بوسہ دینا حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ چھوٹے بچوں، ماں باپ اور بھائی کے سر، بیوی اور حجر اسود کا بوسہ لینا جائز ہے جبکہ پانچویں قسم میں تفصیل ہے کہ اگر کسی کے علم وعدل یا زہد یا کسی اور دینی شرافت کی وجہ سے ہاتھ کو چومے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ اس میں غلو نہ ہو اور بوسہ دینے والے کی نیت بھی تعظیم دینی ہو اور جس کا بوسہ لیا جارہا ہے وہ بھی بد باطنی تکبر اور عجب میں مبتلاء نہ ہو اس کے علاوہ تمام صورتیں ممنوع ہیں اگرچہ بعض بعض سے زیادہ شنیع ہیں۔

کیا سجدۂ تعظیمی کفر وشرک ہے؟ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ قُبلہ بعض صورتوں میں جائز اور بعض میں ممنوع ہے لیکن ملاقات کے دوران جھکنا یا تعظیمی سجدہ کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں گو کہ بغیر جھکے ہاتھ پاؤں چومنے کی بعض علماء نے اجازت دی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا جھکنے کے ارتکاب سے کفر وشرک تو لازم نہیں آتا؟ یہ سوال سجدۂ تعظیمی کے بارے میں زیادہ زور سے اٹھتا ہے۔

اس مسئلہ پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فضل الباری شرح (تقریر) بخاری میں تفصیل سے بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس کو شرکِ جلی قرار دیتے ہیں لیکن محققین کے نزدیک یہ شرک نہیں ہے جس کی موٹی سی دلیل یہ ہے کہ شرک کو کبھی بھی ایک لمحہ کے لئے جائز نہیں کیا گیا ہے جبکہ سجدۂ تعظیمی کا قرآن میں دو جگہ ذکر ہے، ایک حضرت یوسفؑ کے لئے اور دوم حضرت آدمؑ کے لئے لہٰذا کہا جائے گا کہ سجدۂ تعظیمی شریعت محمدیہ میں بالکل حرام وشرک کا شعبہ اور گناہ کبیرہ ہے اس کا مرتکب مبتدع وفاسق ہے مستحق تعزیر وعذاب جہنم ہے مگر مع ہذا یہ سجدہ بت پرستی شرک جلی اور سجدۂ تعبدی کی طرح نہیں ہاں البتہ شعارِ کفر کے زمرے میں آنے والا سجدہ خواہ کسی بھی نیت سے ہو وہ کفر ہے جیسے بُت کے سامنے سجدہ کرنا چاہے نیت عبادت کی ہو یا تعظیم کی ہر صورت میں کفر وشرک جلی ہے۔ (ص:۲۱۶ تا ۲۲۳ ج:۱)

باب ماجاء فی قبلة الیدو الرجل

(ہاتھ پاؤں چومنے کا بیان)

"عن صفوان بن عَسّال قال قال یهودی لِصاحبه اِذهب بنا الی هذاالنبی فقال صاحبه لاتقل نبی انه لوسَمِعَک کان له اربعة اعیُن فَاَتَیا رسولَ الله صلی الله علیه وسلم فَسَأَلاه عن تسع اٰیات بیِّنات فقال لهم لاتُشرکوابالله شیئاً ولاتسرقوا ولاتزنوا ولاتقتلواالنفس التی حَرّم الله اِلّابالحق ولا تمشوابِبَریئٍ الی ذی سلطان لیقتله ولاتسحروا ولاتاکلوا الربوا ولاتقذفوا محصنة ولاتولّوا الفرارَ یوم الزحف وعلیکم خاصّةً الیهودَ اَن لّاتعتدوافی السبت قال فَقَبَّلُوا یَدیه ورجلیه وقالوانشهداَنّک نبیٌّ ،قال: فمایمنعکم ان تَتَّبِعُونی؟قال قالوا ان داوٗدَ دَعَارَبَّه ان لایزال من ذُرِّیّته نبیٌّ واِنّانَخاف ان تَبِعناک ان تقتُلَنَاالیهودُ". (حسن صحیح)

حضرت صفوانؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ہمیں اس نبی کے پاس لے چلو (یعنی ہمارے ساتھ چلو) تو اس کے ساتھی (یہودی) نے کہا: نبی مت کہو کیونکہ اگر وہ تجھ سے یہ سن لیں گے تو (خوشی سے) ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی یہود کی تصدیق سے) چنانچہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ سے نو/۹ کھلی نشانیوں کے متعلق پوچھا، پس آپؐ نے فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو! (۲) چوری مت کرو (۳) زنا نہ کرنا (۴) اس شخص کو قتل مت کرو جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے

سوائے جائز (شرعی) طریقہ کے (۵) کسی بے گناہ کو (یعنی بے قصور کو) کسی حاکم کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ وہ اس کو قتل کرے (یعنی کسی بے قصور کو مجرم ثابت کرنے اور قتل کروانے کی شرارت مت کرو!) (۶) جادو مت کرو (۷) سود نہ کھاؤ (یعنی سودی لین دین مت کرو) (۸) اور کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت مت لگاؤ (۹) اور بھاگنے کے لئے پیٹھ نہ پھیرو کافروں سے مقابلہ کے وقت! اور (۱۰) بطور خاص تمہارے یعنی یہود پر لازم ہے کہ ہفتہ کے دن حد سے تجاوز نہ کرو (یعنی سبت کی تعظیم میں اور امور شرع میں حد سے آگے نہ بڑھو!)

راوی نے کہا پس انہوں نے آپؐ کے ہاتھوں اور پیروں کو چوما، اور ساتھ ہی کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ (اللہ کے) نبی ہیں! آپؐ نے فرمایا پھر تمہیں میری پیروی سے کیا چیز روکتی ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ یہود کہتے ہیں کہ داؤدؑ نے اپنے رب سے دعا مانگی ہے کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی ہوا کریں! اور یہ کہ ہم ڈرتے ہیں اگر ہم آپ کا اتباع کریں تو یہود ہمیں قتل کردیں گے۔

تشریح:۔ قولہ: "انہ لو سمعک کان لہ اربعۃ اعین" یہ ایک محاورہ ہے جو خوشی اور سرور سے کنایہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یعنی اگر وہ یہود کی زبانی اپنی تصدیق کے الفاظ سنیں تو بہت خوش ہوں گے اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں گی، چونکہ خوشی کے وقت حواس تیز ہوجاتے ہیں اس لئے کنایہ صحیح ہے۔

قولہ: "فَسَالاہ عن تسع آیات بینات" یعنی واضحات یہ سوال نو معجزات کے بارے میں تھا یا نو احکامات؟ تو اس میں دونوں احتمال ہیں: اگر نو معجزات مراد ہوں تو پھر سوال یہ ہے کہ جواب میں تو معجزات کا ذکر نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ نو معجزات مشہور تھے اس لئے راوی نے ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا اور صرف احکام پر اکتفاء کیا علی ہذا "فقال لھم لاتشرکوا الخ" میں لاتشرکوا الخ کلام مستانف ہے اور معجزات کے متعلق جواب محذوف ہے وہ معجزات یہ ہیں: (۱) ید بیضاء (۲) عصا (۳) طوفان (۴) جراد (۵) قمل (۶) ضفادع (۷) دم (۸) سنون (۹) نقص ثمرات۔ بعض نے ید اور عصا کی جگہ طمسہ اور انفلاق البحر کو شامل کیا ہے۔ ان معجزات کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے اس لئے راوی نے حذف کردیئے۔ اور اگر مراد احکام ہوں تو حاشیہ قوت المغتذی میں بحوالہ طیبی کے نقل کیا ہے کہ احکام دراصل دس تھے جن میں ایک یہود کے ساتھ مختص تھا یعنی سبت کی تعظیم والا جبکہ باقی نو/۹ عام تھے جو سب کو شامل تھے یہود نے آپؐ سے امتحان کی غرض سے نو (۹) کے بارے میں پوچھا مگر آپؐ نے وہ سارے نو احکام بھی بتلادیئے جو عام تھے اور یہود کے خاص حکم کو بھی ظاہر فرمایا جس سے ان کو یقین آگیا اور آپؐ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے، احکام کو آیات اس لئے کہا کہ یہ مکلف کی شقاوت اور سعادت

پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ آیت نشانی کو کہتے ہیں۔

قولہ: "فقبّلوا یدیہ و رجلیہ" اس سے ہاتھ پاؤں کے چومنے کا جواز ثابت ہوا جس کے متعلق پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ طرفین مکروہ مانتے ہیں اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے تاہم ہاتھ چومنے کی جائز صورتوں میں یہ احتیاط لازمی ہے کہ جھکنے کے بغیر ہاتھ کو اٹھا کر چوما جائے جبکہ پاؤں کا بوسہ شعار ہندوؤں کی وجہ سے مکروہ ہے۔

قولہ: "قالوا ان داؤد دعا ربّہ الخ" انہوں نے اسلام قبول نہ کرنے کے لئے دو دلیلیں پیش کیں یا یوں کہنا چاہئے کہ دو عذر پیش کر دیئے: ایک یہ کہ یہود میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت داؤدؑ نے دعا کی ہے کہ ان کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ جاری رہے۔ دوم یہ کہ اگر ہم آپ پر ایمان لائیں تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔ گویا پہلی دلیل نقلی ہے اور دوسری عقلی مگر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دراصل یہ دوسری بات پہلی پر مرتب و متفرع ہے مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک ہی بات ہے بایں طور کہ داؤدؑ کی اولاد میں نبی آئیں گے جن پر یہود ایمان لائیں گے جس سے ان کی طاقت بڑھے گی اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو وہ مضبوط ہو کر ہم کو قتل کر دیں گے، لیکن یہ لوگ اپنی بات واستدلال میں جھوٹے تھے کیونکہ زبور میں حضرت داؤدؑ کو بتلایا گیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں گے اور وہ آخری نبی ہوں گے پھر حضرت داؤدؑ وحی کے خلاف کیسے دعا کر سکتے ہیں۔ اور آج تو ان کا جھوٹ بالکل صاف و بے غبار ہے۔ اگر بالفرض مانا جائے کہ حضرت داؤدؑ نے دعا فرمائی تھی تو پھر اس کا مصداق حضرت عیسیٰؑ ہیں حالانکہ یہود ان پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ نزول کے بعد یہود کو قتل کر دیں گے یہاں تک کہ کوئی درخت و پتھر بھی ان کو پناہ نہیں دے گا۔

یہ حدیث ابواب التفسیر میں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے، اس میں یہ اضافہ ہے: **"فسالاہ عن قول اللہ تعالیٰ: "ولقد اٰتینا موسیٰ تسع اٰیات بینات"** باقی حدیث اسی طرح ہے۔

باب ماجاء فی مرحباً

(مرحبا (خوش آمدید) کہنے کا بیان)

"عن ابی النضر ان ابامُرّۃ مولیٰ اُمّ ھانیٔ بنت ابی طالب اخبرہ انہ سمع اُمّ ھانیٔ تقول ذھبت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الفتح فوجدتُہ یغتسل وفاطمۃ تسترہ

بثوب، قالت: فسلّمتُ، فقال: من هذه؟ قُلتُ انا أم هانیٔ! قال مرحباً بِاُمِّ هانیٔ فذكر قصةً في الحديث". (صحیح)

ابوالنضر اُم ہانیؓ کے موالی ابومُرّہ سے روایت کرتے ہیں، ابومرہ نے ابوالنضر کو خبر دی ہے کہ انہوں (ابومرہ) نے ام ہانی سے سُنا ہے فرماتی تھیں کہ میں فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو میں نے آپؐ کو نہاتے ہوئے پایا، اور حضرت فاطمہؓ آپؐ کے کپڑے سے آڑ کئے ہوئے تھیں فرماتی ہیں کہ میں نے سلام کیا، تو آپؐ نے پوچھا یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ام ہانی ہوں، آپؐ نے فرمایا: ام ہانی! مرحبا یعنی خوش آمدید ہو!۔

تشریح:۔قولہ: "مرحبا" رحب کشادگی کو کہتے ہیں لہٰذا مرحبا وسیع اور فراخ جگہ کو کہتے ہیں یہ الفاظ عرب مہمان کو آمد کے وقت کہتے ہیں تا کہ مہمان خوش ہو کہ اہلِ خانہ میری وجہ سے تنگ دل نہیں ہو رہے اور میری وجہ سے ان کی جگہ تنگ نہیں ہوگی گویا میزبان مہمان کو تسلی دیتا ہے کہ ہمارے ہاں آپ کے لئے بہت جگہ ہے آپ بے فکر رہے اسی طرح اہلاً وسہلاً کے الفاظ بھی ہیں یعنی یہ آپ کا اپنا گھر ہے آپ اپنے ہی گھر پہنچ گئے، اور یہاں کی جگہ بہت نرم ہے اور لوگ نرم خو ہیں ای صَادَفتَ اهلاً وسهلاً۔ بعض کہتے ہیں کہ تقدیر اس طرح ہے کہ اتیتَ اهلاً وَوَطِیتَ سهلاً۔

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ سلام کے بعد خوش آمدیدی الفاظ کہنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اگر مرحبا کے مخصوص الفاظ کہے جائیں تو سنت کا ثواب ملے گا جبکہ باقی زبانوں کے الفاظ بھی جائز ہیں جیسے خوش آمدید اور پخیر راغلے وغیرہ۔

اس حدیث میں جس قصہ کی طرف اشارہ ہے وہ صحیحین میں تفصیل سے مروی ہے جو حضرت ام ہانیؓ کے شوہر کے خاندان کے دو شخصوں کی امان سے متعلق ہے۔

حدیث آخر:۔ حضرت عکرمہ بن ابی جہلؓ فرماتے ہیں کہ جس روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے فرمایا: "مرحبا بالراکب المهاجر" دونوں حدیثوں میں مرحبا کے بعد "با" زائد بنانا بھی جائز ہے یعنی اَتَیتَ موضعاً رحباً ای واسعاً لاضیقاً اور تعدیت کے لئے بھی مان سکتے ہیں ای اَتَی اللّٰہُ بِکَ مرحباً۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس ہجرت فتح مکہ کے بعد بھی باقی ہے کیونکہ حضرت عکرمہ فتح مکہ کے دن بھاگ

کر یمن چلے گئے تھے مگران کی بیوی ام حکیم بنت الحارث یمن جا کران کو واپس لے آئیں اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا، اس سلسلہ میں کشتی کا واقعہ بھی مشہور ہے ہوسکتا ہے کہ دونوں اسباب رونما ہوئے ہوں، حضرت عکرمہ مخلص صحابی بن گئے تھے اور جنگ یرموک میں شہید ہوئے، کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ لوگ واہل مدینہ ان کو عدو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا: ''الناس معادن، خِیارھم فی الجاھلیة خِیارھم فی الاسلام اذافقھوا''۔ باب کی دوسری حدیث سند کے اعتبار سے کمزور ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح کی ہے۔

باب ماجاء فی تشمیت العاطس

(چھینکنے والے کے لئے دعائی کلمات)

عارضۃ الاحوذی میں اس باب کو ماقبل سے الگ کرکے ''کتاب الادب'' کا عنوان قائم کیا ہے۔

''عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :للمسلم علی المسلم سِتٌّ بالمعروف یُسَلِّم علیه اذالَقِیَه ویجیبُه اذادعاہ ویُشَمِّتُه اذاعَطَسَ ویعودُہ اذامَرِضَ ویَتَّبِعُ جنازته اذامات ویُحِبُّ له ما یحب لِنفسه''. (حسن)

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ پسندیدہ حقوق ہیں: (۱) اس کو سلام کرے جب اس سے ملے۔ (۲) جب وہ اس کو دعوت دے تو اسے قبول کرے۔ (۳) اور اس کے لئے دعائے خیر کرے جب وہ چھینکے (یعنی جواب میں یرحمک اللہ کہے)۔ (۴) اور اس کی بیمارپرسی کرے جب وہ بیمار ہوجائے۔ (۵) اور اس کے جنازے کے پیچھے جائے جب وہ انتقال کرے۔ (۷) اور اس کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تشریح:۔ قولہ: ''ست بالمعروف'' کلام میں تقدیر ہے اور سِتٌّ صفت اول اور بالمعروف صفت دوم ہے یعنی للمسلم علی المسلم خصال ست مُتَلَبِّسَةٌ بالمعروف ۔ معروف اس بات اور کام کو کہتے ہیں کہ جس پر اللہ راضی ہوتا ہے، اور عقلاً بھی وہ خوبی ہو۔ قولہ: ''اذدعاہ'' دعوت عام ہے چاہے کھانے کی ہو یا کسی کام وحاجت کے لئے۔ قولہ: ''ویشمّتُه'' باب تفعیل کا صیغہ مضارع ہے شماتت سے ماخوذ ہے تکلیف پر دشمن کے اظہارِ مسرت کو کہتے ہیں علی ہذا تفعیل سلب مأخذ کے لئے ہے یعنی اللہ آپ کی تکلیف پر دشمن کو خوشی

منانے کا موقع نہ دے، تاہم یہاں معنیٰ ''یرحمک اللہ'' کہنا ہے۔ اگلے تین جملوں کی تشریح پہلے گذری ہے۔
پھر یہ حقوق واجب علی الکفایہ ہیں یعنی اگر بعض نے ادا کیا تو باقی سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ اس حدیث کے مقابلہ میں باب کی اگلی حدیث زیادہ صحیح ہے اور مسلم میں بھی ہے، دونوں کا مضمون ایک ہی ہے البتہ اُس میں یتبع جنازتہ کے بجائے ''یشھـــــدہ'' کے الفاظ ہیں جس کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ جنازہ میں حاضر ہو جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب اس کی موت قریب ہو جائے یعنی عندالنزع تو یہ اس کے پاس حاضر ہو جائے، نیز اُس میں بجائے ویحب لہ مایحب لنفسہ کے'' ولینصح لہ اذاغاب او شھد'' کے الفاظ ہیں یعنی اس کی غیر موجودگی اور موجودگی دونوں حالتوں میں اس کی خیرخواہی کا خیال رکھے۔ (صحیح)

باب مایقول العاطس اذاعَطَسَ

(چھینک آنے پر کیا کہنا چاہئے)

''عن نافع ان رجلاً عَطَسَ الی جنب ابن عمر فقال الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ فقال ابن عمر: وانااقول: الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ ولیس ھکذاعَلّمَنَارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، عَلّمَنَاان نقول الحمدللّٰہ علی کل حال''. (غریب)

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ ابن عمرؓ کے پہلو میں ایک شخص کو چھینک آئی تو اس نے (چھینکنے کے بعد) کہاالحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ، پس ابن عمرؓ نے فرمایا میں بھی کہتا ہوں کہ الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ (لیکن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح نہیں سکھایا (بلکہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم کہیں الحمدللہ علی کل حال۔

تشریح:۔ ابن عمرؓ کی نکیر و تردید کا مقصد یہ ہے کہ چھینکنے والے نے جو کلمات پڑھے ہیں ان کی اچھائی میں کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ مقام ان کلمات کا نہیں ایسے موقع پر ذکر مسنون وماثور فقط الحمدللہ علی کل حال ہے، درود پڑھنے کا یہ موقع نہیں لہٰذا اذکار ماثورہ میں ردوبدل نہیں کرنا چاہئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ بظاہر ایسی زیادتی مفید معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت وہ نقصان ہوتا ہے جیسے اذان کے جواب میں لاالٰہ الااللّٰہ پر محمدرسول اللّٰہ کا اضافہ نہیں ہونا چاہئے اسی طرح دیگر امثال میں بھی اضافہ سے بچنا چاہئے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ چھینک پر صرف الحمدللہ کہنا چاہیئے جیسا کہ بخاری میں ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے: "فلیقل الحمد لله" مگر دوسرے حضرات اس اضافہ کو اسی طرح الحمدللہ رب العالمین کہنے کو جائز بلکہ افضل سمجھتے ہیں اور حدیث باب میں ابن عمرؓ کے قول کا مطلب ظاہر پر حمل کر کے کہتے ہیں کہ حمد پر اضافہ ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ اضافہ حمد کے متعلقات میں سے ہو، دوسرے اذکار کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا اگلے باب کی احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء کیف یُشمّتُ العاطس؟

(چھینکنے والے کو جواب دینے کا بیان)

"عن ابی موسیٰ قال کان الیھود یتَعاطَسون عندالنبی صلی الله علیه وسلم یرجون ان یقولَ لھم یرحمکم الله، فیقول یھدیکم الله ویصلح بالکم". (حسن صحیح)

یہود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینکا کرتے تھے (یعنی تکلف کر کے) ان کی خواہش ہوتی کہ آپؐ ان کو "یرحمکم اللہ" کہیں، مگر آپؐ فرماتے اللہ تمہیں ہدایت دیں اور تمہاری حالت درست فرمائیں۔

قوله: "بالکم" بال قلب کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد حال ہے چونکہ رحمت تو مؤمنین کے ساتھ مختص ہے اس لئے آپؐ ان کے لئے ہدایت اور توفیق وقلبی حالت کی اصلاح کی دعاء فرماتے تا کہ جو رحمت ایمان پر موقوف ہے اس کا موقوف علیہ پہلے حاصل ہو تب ہی موقوف کا ترتب ہوگا۔

حدیث آخر:۔ حضرت سالم بن عبید (الاشجعیؓ اصحاب صفہ میں سے تھے) سے مروی ہے کہ وہ ایک سفر میں لوگوں کے ہمراہ تھے تو لوگوں میں سے ایک شخص کو چھینک آئی پس اس نے کہا: "السلام علیکم" تو حضرت سالم بن عبیدؓ نے فرمایا "علیک وعلیٰ امک" (یعنی تجھ پر سلام ہو اور تیری ماں پر) تو اس آدمی نے اس بات کو محسوس کیا (یعنی تنگ دل ہوا) پس حضرت سالمؓ نے فرمایا ارے! میں نے تو وہی بات کہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک لی اور کہا: "السلام علیکم" تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علیک وعلی اُمک" (آپؐ نے اس کے بعد فرمایا) جب تم میں سے کوئی ایک چھینک لے تو کہے: "الحمدللہ رب العالمین" اور جو شخص اس کو جواب دے تو کہے "یرحمک اللہ" اور چاہیئے کہ وہ (چھینکنے والا) کہے "یغفر اللہ لی ولکم"۔ ھذا حدیث اختلفوا فی

روایۃ الخ یعنی یہ روایت متعدد کتب میں مروی ہے مگر اس کی سند اختلافی ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے۔

قولہ:"علیک وعلیٰ امک" اس جواب میں دو نکتے ہیں: ایک یہ کہ جس طرح علی امک یعنی مخاطب کے بجائے اس کی ماں غائبہ کو سلام کرنا بے محل ہے تو اسی طرح چھینک کے بعد سلام بھی بے موقع ہے۔ دوسرا یہ کہ تجھے ماں نے تعلیم دی ہے اس لئے تیری ترتیبات غیر مرتب ہیں اگر تم مردوں سے تعلیم حاصل کرتے تو یہ کمی باقی نہ رہتی! کیونکہ عورتیں تو صرف ابتدائی تعلیم ہی دے سکتی ہیں جبکہ کامل تعلیم مردوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

حدیث آخر:۔"عن ابی ایوب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذاعَطَسَ احدکم فلیقل الحمدللہ علی کل حال ولیقل الذی یَرُدُّ علیہ "یرحمک اللہ" ولیقل ھو "یھدیکم اللہ ویصلح بالکم"۔

جب تم میں سے کوئی ایک چھینک لے تو چاہئے کہ وہ "الحمدللہ علی کل حال" کہے اور جو شخص اس کو جواب دے تو اسے چاہئے کہ وہ "یرحمک اللہ" کہے اور اُسے (چھینکنے والے کو) "یھدیکم اللہ ویصلح بالکم" کہنا چاہئے۔

اس مضمون کی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے جسے بخاری نے صحیح میں مرفوعاً روایت کیا ہے:

"اذاعطس احدکم فلیقل الحمدللہ، ولیقل لہ اخوہ او صاحبہ یرحمک اللہ فاذاقال لہ یرحمک اللہ فلیقل یھدیکم اللہ ویصلح بالکم"۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ چھینکنے والے کو جواب دینا الفاظ مذکورہ کے ساتھ یعنی "یرحمک اللہ" کہنا ضروری ہے حنفیہ کے نزدیک مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ جواب واجب علی الکفایہ ہے۔ ایک روایت استحباب کی بھی ہے اسی طرح فرض علی الکفایہ کا بھی قول ہے جبکہ شافعیہ کے نزدیک سنت علی الکفایہ ہے۔ بنا بر ہر تقدیر جواب اس وقت دیا جائے گا جب چھینکنے والا الحمدللہ کہے اور ساتھ والا سنے۔ اس لئے چاہئے کہ چھینکنے والا الحمدللہ اتنے زور سے کہہ دے کہ حاضرین سن سکیں۔ اس بارے میں امام ابوداؤدؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے ساحل پر چھینکنے والے سے الحمدللہ سُنا، کشتی تو گزر گئی لیکن جواب دینے کے لئے آپ نے کرایہ پر کشتی لی اور قریب جاکر یرحمک اللہ کہہ دیا۔

پھر چھینکنے والا یغفر اللہ لنا ولکم کہہ دے جیسا کہ امام طبرانیؒ نے ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہما سے نقل کیا ہے اور حنفیہ نے اسے اختیار کیا ہے یا پھر حدیث باب کے مطابق "یھدیکم اللہ و

یصلح بالکم'' کہے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دونوں میں اختیار ہے جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ دونوں لفظوں کو جمع کردے۔ (کذا فی تحفۃ الاحوذی)

باب ماجاء فی ایجاب التشمیت بحمد العاطس

(چھینکنے والے کی تحمید کرنے پر یرحمک اللہ کہنا واجب ہے)

''عن انس بن مالک ان رجلین عَطَسَا عندالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فَشَمَّتَ اَحَدَهُما ولم یُشَمِّتِ الآخرَ فقال الذی لم یُشَمِّته یارسول اللہ شَمَّتَّ هذاوَلَم تُشَمِّتنی؟فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انه حمداللہ وانک لم تحمده!'' (حسن صحیح)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ دو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینکے آپؐ نے ان میں سے ایک کو دعائے رحمت دی (یعنی یرحمک اللہ کہا) اور دوسرے کو دعائے خیر نہیں دی تو وہ شخص جس کو آپؐ نے دعاء نہیں دی تھی کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کو دعا دی اور مجھے نہیں دی؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ اس نے اللہ کی حمد بیان کی تھی اور تم نے نہیں کی تھی۔

تشریح:۔ سابقہ باب میں عرض کیا جاچکا ہے کہ جواب دینا حمد سننے سے مشروط ہے۔ اس حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے یہ مسئلہ بعینہ سلام اور جواب سلام کی طرح ہے۔ (فتذکر)

چونکہ چھینک آنا اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے کیونکہ ایک تو اس کے ذریعہ وہ گرد وغبار خارج ہوجاتا ہے جو سانس کی نالی میں پھیپھڑوں میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوم اس سے چستی جنم لیتی ہے، اس لئے اس پر اللہ کی ستائش ہونی چاہئے جس نے ہمارے جسم میں ایسا اعلیٰ نظام قائم کیا جو خودکار مشین کی طرح چلتا رہتا ہے اور خود بخود اپنا دفاع کرتا ہے، پس جو شخص چھینکنے کے بعد تحمید نہ کرے اس نے گویا اللہ کی نعمت کی ناشکری کی اس لئے وہ دعا کا مستحق نہیں تو حاضرین میں سے کوئی اس کو دعا دینے کا پابند نہیں بلکہ بعض روایات میں جواب کی نفی ہے۔

باب ما جاء کم یشمّت العاطس

(چھینکنے والے کو کتنی بار دعا دی جائے)

''عن ایاس بن سلمة عن ابیه قال عَطَسَ رجل عندرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وانا شاهد فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :يرحمك الله ثم عَطَسَ الثانية فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :هذا رجل مز كوم". (حسن صحيح)

حضرت ایاس اپنے والد سلمہ بن اکوعؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک آئی اور میں (بھی) وہاں موجود تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یرحمک اللہ'' پھر اس نے دوبارہ چھینک لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زکام زدہ شخص ہے۔

تشریح:۔ باب کی اگلی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے تیسری مرتبہ چھینکنے پر یہ جواب دیا کہ تجھے زکام ہوا ہے، جبکہ تیسری حدیث میں ہے کہ چھینکنے والے کو تین دفعہ جواب دے دو (یعنی یرحمک اللہ کہو) اگر اس سے زیادہ چھینکے تو تیری مرضی ہے جواب دو یا نہ دو!۔ (مگر اس کی سند مجہول ہے)

بظاہر ان تینوں روایات میں تعارض ہے جس کو دُور کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں: (۱) ایک ترجیح کی (۲) دوم تطبیق کی، پس امام ترمذیؒ نے دوسری حدیث کو ترجیح دی ہے اور تیسری کو ضعیف قرار دیا ہے جبکہ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں تیسری حدیث کو ترجیح دی ہے یہ ترجیح باعتبار سند کے نہیں ہے کیونکہ سند تو بتصریح ترمذی مجہول ہے بلکہ از روئے احتیاط ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> **"العاشرة: اذا زاد على الثالثة روى ابو عيسىٰ حديثاً مجهولاً فان شِئتَ فشمّته وان شئت فلا وهو وان كان مجهولاً فانه يستحبُّ العمل به لانه دعاء بخير وصلة لِلجليس وتودد له".**

الکوکب الدری میں ہے کہ پہلا جواب واجب ہے دوسرا مستحب ہے اور تیسرا قریب الی المستحب ہے اور اس کے بعد مباح ہے، اور جب زکام کا علم ہو جائے تو پھر جواب دینا واجب نہیں خواہ چھینک آنے سے پہلے معلوم ہو یا چھینکنے کے ایک یا دو یا تین دفعہ بعد معلوم ہو جائے۔ پھر اگر کسی نے مکرر چھینکوں کا آخر میں ایک ہی جواب دیا تو حاشیہ الکوکب الدری میں بحوالہ طحطاوی علی المراقی من شرح المؤطا للقاری" لکھا ہے کہ یہ بھی کافی ہے جیسا کہ سجدۂ تلاوت کا حکم ہے۔

پھر حدیث باب کا یہ مطلب نہیں کہ زکام والا شخص دعا کا مستحق نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ یرحمک اللہ جو چھینکنے والے کو دعائے خیر ہے کا مستحق نہیں مرض کی شفایابی کی دعا کا تو مستحق ہے ہی۔

باب ماجاء فی خفض الصوت وتخمیر الوجه عندالعُطاس

(چھینکنے کے وقت آواز پست کرنے اور مُنہ ڈھانکنے کا بیان)

"عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذاعَطَسَ غَطّی وجهَه بیده اوبثوبه وغَضّ بهاصوتَه". (حسن صحیح)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تو آپؐ اپنے چہرے کو اپنے ہاتھ یا اپنے کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور چھینک کی آواز کو آہستہ فرماتے تھے۔

تشریح:۔قوله:"وَغَضّ بها"ای خفض بالعطسة صوتَه یعنی چھینک کی آواز کو پست فرماتے ویسے تو عام حالات میں بھی آواز کو پست رکھنا محمود بلکہ مامور بہ ہے قال الله حکایةً عن لقمٰن "وَاغضُض مِن صوتِکَ اِنَّ اَنکرَ الاصواتِ لَصوتُ الحمیر"۔(سورۂ لقمٰن: آیت:۱۹) تاہم چھینکنے کی آواز چونکہ محض صوت ہی ہے کوئی کلام نہیں ہے جو بظاہر ایک بے مقصد آواز ہے البتہ ہے تو غیر اختیاری جس سے مقصود فضلہ اور غیر ضروری بلکہ مضر مواد کا اخراج ہے اور"والضروری یقدر بقدر الضرورة"اس لئے اس کو پست رکھنا محمود ہوا۔

جہاں تک منہ ڈھانپنے کا تعلق ہے تو عارضة الاحوذی میں ہے کہ اگر وہ مُنہ نہ ڈھانکے تو شاید اس کے سامنے کوئی بیٹھا ہو پھر اس کو دائیں یا بائیں جانب مُنہ موڑنا پڑے اور اس میں ایسا ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ منہ موڑ دیا اور چھینک کے ساتھ گردن کی ہڈی یا رگ اپنی جگہ سے اُتر گئی اور منہ ٹیڑھا رہ گیا اور اگر سامنے کی طرف چھینکتا ہے تو آگے والے پر رطوبت کے ذرات لگیں گے (خاص کر جب کوئی کھانا کھا رہا ہو، یا کوئی دوسری نازک چیز موجود ہو جیسے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر وہ خراب ہوگی)۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ یہ علت کھانسنے میں بھی موجود ہے اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کھانستے وقت یا تو منہ پر کپڑا یا ہاتھ رکھے یا پھر منہ دوسری جانب موڑ دے خصوصاً زکام اور ٹی بی (T B) کی صورت میں۔

باب ماجاء ان الله يُحِبُّ العُطاسَ ويكره التثاؤُبَ

(چھینک کی مدح اور جمائی کے ذم کا بیان)

"عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: العُطاسُ من الله والتثاؤُبُ من الشيطان فاذاتثاءَب احدُكم فليضع يده على فِيه واذاقال: "آه آه" فان الشيطان يضحک من جوفه وان الله يحب العُطاس ويكره التثاؤب فاذاقال الرجل "آه آه" فان الشيطان يضحک من جوفه". (حسن)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھینک آنا اللہ کی طرف سے (نعمت) ہے اور جمائی لینا شیطان کی طرف سے (کاہلی کا اثر) ہے، پس تم میں سے جب کسی کو جمائی آئے تو وہ اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لے اور جب وہ (جمائی لینے والا) آہ، آہ کرتا ہے تو شیطان اس کے (کھلے) منہ پر ہنستا ہے (یعنی مذاق اُڑاتا ہے) اور بے شک اللہ (بندے کی) چھینک کو پسند کرتا ہے اور جمائی کو ناپسند کرتا ہے، اور جب کوئی شخص (منہ کھول کر) آہ، آہ کرتا ہے جب جمائی لیتا ہے تو شیطان ہنستا ہے اس کے اندر (کے دیکھنے یا داخل ہونے) سے۔

تشریح:۔ بعض نسخوں میں حدیث کا آخری حصہ جو مکرر معلوم ہوتا ہے موجود نہیں ہے ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو صرف حسن کہا ہے مگر ابن عجلان کی اور احادیث کی انہوں نے تصحیح کی ہے لہذا باب کی حدیث بھی صحیح ہے اور اس مضمون کی حدیث بخاری میں بھی ہے البتہ اس میں آہ، آہ کے الفاظ نہیں بلکہ "فليرده مااستطاع " کے الفاظ ہیں۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ص:۴۶۴ ج:۲ "باب صفة ابلیس وجنوده ،کتاب بدأ الخلق")

جمائی کے بارے میں قدرے تفصیل پہلے گذری ہے فلیراجع تشریحات ترمذی: ص:۲۱۵ ج:۲ "باب ماجاء فی کراھیة التثاؤب فی الصلوٰۃ")۔

چونکہ جمائی زیادہ کھانے اور بدن کے ثقل کا اثر ہے اس لئے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناپسند ہے جبکہ چھینکنا بدن کی تخفیف کا اثر بھی ہے اور خفت کو مقتضی بھی ہے اس لئے اللہ کو پسند ہے، اور ضابطہ یہ ہے کہ اچھی چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف ہونی چاہئے اور بُری اشیاء کی نسبت شیطان کی طرف کیونکہ شیطان بُرائی پر خوش ہوتا ہے اور

اس پر اُکساتا ہے، اگر چہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔

آج کل سائنسی تحقیق کے مطابق انسانی دماغ اور کمپیوٹر میں یہ بات بھی قدرے مشترک ہے کہ کمپیوٹر گرم ہونے کی صورت میں کام کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے اس کی رفتار بتدریج کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو جاتی ہے تو جس طرح کمپیوٹر کو ٹھنڈک کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح دماغ بھی جمائی کے ذریعہ اپنی زائد حرارت خارج کرتا ہے۔ تاہم یہ ایک نظریہ ہے۔ اگر اس وجہ کو صحیح مانیں بھی تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے مزاج انتہائی معتدل ہوا کرتے تھے اس لئے ان کے دماغ کا حد سے زیادہ گرم ہونے اور کام میں سُستی و کاہلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے ان کو جمائی لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

بہر حال چھینک کو روکنا طبی لحاظ سے صحت کے لئے نقصان دِہ ہے جبکہ جمائی کے روکنے سے کچھ بھی نقصان نہیں ہوتا ہے اس لئے جمائی کو روکنے کا حکم ہے کہ جہاں تک ہو سکے جمائی کو روک لیا جائے جبکہ چھینک کو روکنا تو نہیں چاہئے مگر آواز پست کرنے کی بھر پور کوشش کی جانی چاہئے۔

قوله: "فان الشیطان یضحک مِن جوفه" یضحک ظاہری معنی یعنی ہنسنے پر محمول کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ اس سے مراد خوش ہونا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ انسان کا دشمن ہے اور جمائی کے وقت آدمی کی شکل بہت بُری محسوس ہوتی ہے اس لئے شیطان خوش ہو جاتا ہے اس سے بچنے کی اچھی تدبیر جمائی کو روکنا ہے مگر آنے کی صورت میں منہ پر ہاتھ رکھنا ہے تاکہ منہ کھلا ہوا نظر نہ آئے۔ بعض روایات میں ہے کہ شیطان داخل ہوتا ہے بنا بر ہر تقدیر جمائی سے اور خصوصاً مُنہ کھولنے سے بچنا چاہئے۔

حدیث آخر:۔ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :ان الله یحب العُطاسَ ویکره التثاؤُبَ فاذاعطس احدکم فقال الحمدلله فحقّ علی کل من سمعه ان یقول یرحمک الله واماالتثاؤب ،فاذاتثاء ب احدکم فَلیرُدَّہ مااستطاع ولایقول هاه،هاه فانما ذالک من الشیطان یضحک منه". (صحیح)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ (بندے کی) چھینک کو پسند کرتا ہے اور جمائی کو ناپسند فرماتا ہے پس جب تم میں سے کوئی ایک چھینکے اور اس پر الحمدللہ کہے تو لازم ہے ہر اس شخص پر جو اس تحمید کو سُنے کہ یرحمک اللہ کہے اور جمائی جو ہے تو (اس کا حکم یہ ہے کہ) جس کو بھی تم میں سے جمائی آئے تو اس کو جہاں تک ہو سکے روکے اور ہاہ، ہاہ نہ کرے کیونکہ یہ شیطان کی

طرف سے ہے وہ اس سے ہنستا ہے۔ یعنی کسی طرح شیطان کو خوش ہونے، مذاق کرنے اور داخل ہونے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔

باب ماجاء ان العُطاس فی الصلوٰۃ من الشیطان

(نماز میں چھینک آنا شیطان کا اثر ہے)

"عن عدی......عن جدہ (دینار) رفعه قال العُطاس والنعاسُ والتثاؤُبُ فی الصلوٰۃ والحیض والقیء والرعاف من الشیطان". (هذاحدیث غریب)

حضرت عدی ابن ثابت اپنے والد ثابت الانصاری سے، اپنے جد سے (جن کا نام بقول یحییٰ بن مَعین، دینار ہے) روایت کرتے ہیں وہ اس کو مرفوع نقل کرتے ہیں کہ نماز میں چھینک آنا، اُونگھنا، جمائی لینا اور حیض، قے اور نکسیر شیطان کی طرف سے ہیں۔

تشریح:۔ یہ روایت ضعیف ہے لیکن بصورت صحت مراد شدت سے چھینکیں آنا اور اونگھنا ہے جیسا کہ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں یہی توجیہ کی ہے: "ویبیّن ان ماخفّ منه لایعدمنه"۔

پھر ان چھ میں سے تین کو الگ ذکر کیا اور بیچ میں "فی الصلوٰۃ" کے لفظ سے باقی تین کو الگ کر دیا کیونکہ آخری تینوں سے نماز باطل ہو جاتی ہے بخلاف اوائل کے۔ اور شیطان کی طرف نسبت کرنے کی وجہ وہی ہے جو پہلے عرض کی جا چکی ہے یعنی شیطان کو ان امور سے خوشی ہوتی ہے کہ عبادت متاثر یا ختم ہو جاتی ہے۔ پھر چھینک اگرچہ ایک رحمت ہے مگر نماز میں روکنا چاہئے جس کا ضابطہ یہ ہے کہ جب چھینک آئے تو اس کے روکنے کے لئے کسی عضو کو اور خصوصاً اوپر والے ہونٹ کا وہ حصہ جو ناک سے ملا ہوا ہے دبانا مجرب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب دماغ کسی اور جانب متوجہ ہو جاتے ہیں تو چھینک یکسر ختم ہو جاتی ہے علی ہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب نماز میں انہماک رہے تو نہ چھینک آسکتی ہے، اور نہ ہی اُونگھ اور جمائی آسکتی ہے پس ان تینوں کا آنا نماز میں عدم خشوع کی علامت ہے اس لئے ان کو شیطان کی طرف منسوب کیا اور یہ دوسری وجہ ہو جائے گی ان تینوں کو الگ ذکر کرنے کی کیونکہ آخری تین انسانی بس کی بات نہیں اور نہ ہی ان کا خشوع سے کوئی تعلق ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة ان یُقامَ الرجل من مجلسه ثم یجلس فیه

(کسی کو اس کی نشست سے اٹھا کر، اس کی جگہ خود بیٹھنا مکروہ ہے)

"عن ابن عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: لایقیم احدُکم اَخَاه من مجلسه ثم یجلس فیه". (حسن صحیح)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک اپنے (اسلامی) بھائی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے (تا کہ) پھر خود اس میں بیٹھ جائے۔

تشریح:۔قولہ: "من مجلسه" یعنی ایسی جگہ جہاں اس کے لئے بیٹھنا کسی طرح ممنوع نہیں تھا جیسے مباح مواضع مثلاً مسجد کی عام جگہ یا دوسری کوئی جگہ جیسے لوکل بسوں میں جو بھی پہلے سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے تو وہ اُس کا حق تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے میں کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ اسے اٹھا کر خود اس کی سیٹ پر قبضہ کرلے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ نہی تحریم کے لئے ہے، کیونکہ ایسا کرنا دوسرے کی حق تلفی بھی ہے اور تکبر بھی ہے بلکہ ممکن ہے کہ وہ شخص اٹھنے سے انکار کردے اور جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے اس لئے اس کوشش کو ناجائز قرار دیا۔

اس کے برعکس اگر کوئی جگہ دوسرے کے لئے متعین ہے جیسے بک شدہ سیٹ یا استاذ کے لئے بنی ہوئی نشست اور غیر متعلقہ آدمی آکر اس پر بیٹھ جاتا ہے تو اس کو اٹھانا جائز ہے کیونکہ قصور سارا اس کا ہے جو دوسرے کا حق مارتا ہے۔

باب کی اگلی حدیث پر یہ اضافہ ہے کہ: "وکان الرجل یقوم لابن عمر فمایجلس فیه" آدمی ابن عمرؓ کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ جاتا مگر آپؓ اس جگہ میں نہیں بیٹھتے۔ ابن عمرؓ یا تو سد ذرائع کے لئے نہ بیٹھتے یا وہ آدمی بتقاضائے حیاء کھڑا ہو جاتا دل سے اپنی جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا جو قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے۔ پھر قربات میں ایثار میں اختلاف ہے شافعیہ کے نزدیک مکروہ ہے جبکہ باقی اشیاء یعنی ذاتی حقوق میں محبوب ہے۔ کتاب الصلوٰۃ میں گذرا ہے کہ کسی افضل شخص کے لئے صف میں جگہ دینے کے لئے اپنی جگہ سے پچھلی صف میں منتقل ہونا جائز ہے بلکہ امید ہے کہ اس پر اجر و ثواب بھی مل جائے۔

باب ماجاء اذاقام الرجل من مجلسه ثم رجع فهواحق به

(جو شخص اپنی جگہ سے اُٹھے، اور پھر اس میں بیٹھنا چاہے تو اس کا حق بنتا ہے)

"عن وهب بن حُذيفة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الرجل احق بمجلسه، وان خرج لِحاجته ثم عاد فهو احق بمجلسه". (صحيح غريب)

حضرت وہب بن حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی اپنی نشست کا زیادہ مستحق ہے، اور اگر وہ کسی غرض سے نکلے (یعنی مسجد وغیرہ سے) اور پھر واپس آجائے تو وہ اپنی جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔

تشریح:۔ جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ جس جگہ کے ساتھ کسی کا حق متعلق ہو جائے اس پر بیٹھنا درست نہیں اور بیٹھنے کی صورت میں اس کو اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن جو جگہ خالی ہے اور کسی کے ساتھ مختص نہیں تو اس پر جو شخص پہلے بیٹھ گیا وہ اسی کا حق ہے، پھر اگر وہ کسی امر عارض سے وہ جگہ چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور واپس آنے کا ارادہ ہو اور خاص کر جب وہ کہہ دے یا کوئی نشانی چھوڑ دے یا علامات سے واپس آنا معلوم ہو تو وہ جگہ اسی کی رہے گی جب وہ واپس آجائے تو وہی اس پر بیٹھنے کا حق رکھتا ہے مثلاً مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا تھا مگر وضو کی تجدید کے لئے نکلا یا لمبا سفر ہے مگر راستہ میں بس یا دوسری گاڑی رک گئی اور لوگ اتر گئے تو گاڑی روانہ ہونے کی صورت میں ہر شخص اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے گا۔

پھر جیسے تعلیمی اداروں میں یہ عرف ہے کہ سال کے شروع میں جو طالب علم درس گاہ میں جس جگہ بیٹھ جاتا ہے سال کے آخر تک وہ جگہ اسی کے لئے مختص ہو جاتی ہے تو وہ بھی اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے، ہاں دوسری نماز یا اگلے سال کے لئے یہ حق نہیں رہتا۔

باب ماجاء فی کراهیة الجلوس بین الرجلین بغیر اذنهما

(بلا اجازت دو آدمیوں کے درمیان بیٹھنا مکروہ ہے)

"عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايحل لرجل ان يفرق بين اثنين اِلّا باذنهما". (حسن)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کے لئے روا نہیں کہ وہ دو شخصوں کے درمیان جدائی کرے مگران کی اجازت سے۔

تشریح:۔ قولہ: "ان یفرق بین اثنین" دو آدمیوں کے درمیان تفریق کی صورت اور ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ دو شخص مل کر ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھنا ان کا ایک گونہ مقصد ہو خواہ کوئی خفیہ بات کرنا چاہتے ہوں یا ویسے اُنس ومحبت کی وجہ سے، جیسے دو ساتھی ایک ساتھ درس گاہ میں بیٹھتے ہیں یا سفر کے دوران ایک سیٹ پر بیٹھتے ہیں تو کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ آ کر ان کے درمیان گھس جائے کیونکہ یہ بھی حق تلفی اور ایذاء وایحاش ہے۔ ہاں اگر ان کی اجازت اور خوشی سے ہو تو وہ الگ بات ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر وہ قریب قریب نہ بیٹھے ہوں اور بیچ میں تیسرے کے لئے جگہ خالی ہو تو بھی اس میں بیٹھنے کی اجازت ہے بشرطیکہ اس جگہ اجتماع ہوتا ہو۔

باب ماجاء فی کراھیة القعود وسط الحلقة

(حلقہ کے درمیان بیٹھنا مکروہ ہے)

"عن ابی مِجلَزٍ ان رجلاً قعدوسط الحلقة فقال حُذیفة: ملعون علی لسان محمد ولعن اللہ علی لسان محمدمن قعدوسط الحلقة". (حسن صحیح)

حضرت ابومجلزؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص حلقہ کے درمیان میں بیٹھ گیا تو حضرت حذیفہؓ کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ شخص ملعون ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جو حلقہ کے بیچ میں بیٹھتا ہے۔

تشریح:۔ اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ جیسے مداری حلقہ لگاتا ہے اور لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں پھر وہ لوگوں کو ہنساتا ہے، اس میں لعنت کی وجہ ظاہر ہے۔

یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص علمی حلقہ کے درمیان میں آ کر بیٹھ جائے خواہ وہ حلقہ دائرہ کی شکل میں ہو اس صورت میں وہ لوگوں کی توجہ اور مخاطبہ کو متاثر کرے گا یا حلقہ بمعنی مجمع ہو کیونکہ اس میں وہ لوگوں کے درمیان بیٹھنے کے لئے گردنوں کو پھلانگتا ہوا گذرے گا اور بیچ میں بیٹھ کر جگہ تنگ کرے گا دونوں صورتوں میں تکلیف کا باعث بنے گا، تاہم یہ وعید عدم ضرورت کی صورت میں ہے اگر حلقہ کے درمیان بیٹھنا ضروری یا مقصد

میں مفید ہو تو پھر کوئی قباحت نہیں جیسے واعظ کا بیچ میں بیٹھنا جائز ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة قیام الرجل للرجل

(ایک شخص کا دوسرے کے لئے کھڑا ہونا مکروہ ہے)

"عن انس قال لم یکن شخص احب الیهم من رسول الله صلی الله علیه وسلم وکانوا اذارأوهُ لم یقوموا، لِمَایعلمون من کراهیته لذالک". (حسن صحیح غریب)

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی پسند نہیں تھا، اور (مع ہذا) وہ جب آپؐ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ اس کو پسند نہیں فرماتے ہیں۔

تشریح:۔ "باب ماجاء اذاصلی الامام قعوداً فصلوا قعوداً" اوراس کے بعد "باب منه" (تشریحات جلد: دوم ص: ۲۰۷) پر یہ مسئلہ گذرا ہے کہ شروع میں یہ حکم تھا کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو لوگ بھی بیٹھ جائیں اور مقصد اعاجم کی رسم کی مخالفت تھی کیونکہ اہل فارس میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے اعاظم وسلاطین کے لئے کھڑے ہوجاتے اور پھراس کے گرد یا سامنے کھڑے ہی رہتے مگر جب عقائد اسلام اور اسلامی احکام واعمال میں مکمل تمایز عن الغیر آیا تو پھر آپؐ نے مرض الوفات میں نماز بیٹھ کر پڑھائی جبکہ صحابہ کرامؓ کھڑے تھے لہٰذا پہلا حکم منسوخ ہوگیا۔

لہٰذا کہا جائے گا کہ اب نفس قیام میں کوئی حرج نہیں تاہم بوجوہ اس میں بعض صورتیں اب بھی ممنوع یا مکروہ ہیں گویا اس میں جواز لِذاتہ ہے مگر کبھی کبھار یا بسا اوقات اس میں قبح داخل ہوجاتا ہے۔ علی ہذا اس قباحت غیری کے تناسب سے اس کی قباحت کم وبیش ہوتی رہتی ہے اور جہاں کوئی قباحتِ غیری نہ ہوگی تو بذات خود قیام جائز ہوگا۔

لہٰذا جن روایات سے قیام ثابت ہے وہ عدم قبح پر محمول ہیں اور جہاں نفی ثابت ہے وہ قباحت غیری کی وجہ سے گویا قیام جائز لذاتہ، ممنوع لغیرہ ہے۔

اس ضابطے کو سامنے رکھتے ہوئے اب متعدد صورتیں بن جاتی ہیں:

(۱) اگر کوئی شخص اس کا خواہشمند ہو کہ اس کی تعظیم کے لئے لوگ کھڑے ہوں تو قیام کی یہ صورت سب

سے زیادہ شنیع اور اس کے تکبر میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔

(۲) اگر بغیر تکبر اور بغیر خواہش کے ہو مگر ایسا کرنے سے اس آدمی میں عجب اور تکبر پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ صرف مکروہ ہے۔ اس سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح جہاں تشبہ بالاعاجم آتا ہو یا ملحوظ ہو وہاں بھی کراہیت ہوگی جیسے عورت کا اپنے شوہر کے لئے اس وقت تک کھڑی رہنا جب تک وہ بیٹھ نہیں جاتا۔

(۳) تعظیم کے طور پر نہ ہو بلکہ اکرام اور قدر دانی کی وجہ سے ہو اور مندرجہ بالا دونوں علتیں یعنی پہلی دونوں صورتیں نہ ہوں تو پھر جائز ہے جیسے اپنے والد اپنے دوسرے بزرگوں یا استاذ کے لئے کھڑا ہونا اگر چہ اس کا ترک اولیٰ ہے، عارضۃ الاحوذی میں اس صورت کو محظور و مکروہ سے مستثنیٰ کیا ہے:

"قال ابن العربیؒ: الا ان یکون الولد للوالد والتلمیذ مع الاستاذ او الولی الملاطف الذی صفا قلبه و امن غیبه فتزول العلة فیزول الحکم الخ"۔

یعنی اس شرط پر کہ قیام اس کے لئے مضر نہ ہو۔

(۴) اگر کوئی سفر سے واپس آئے تو اس کے استقبال کے لئے، یا کسی کو مبارک باد پیش کرنے کے لئے یا جگہ دینے کے لئے اٹھنا پڑے تو یہ مستحب ہے یا کم از کم جائز ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

تاہم آج کل ہم پر حُب جاہ کا غلبہ ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ کسی بھی شخص کو اپنے حق میں قیام سے روکیں کیونکہ اگر بالفرض ہمارے دلوں پر اس کا بُرا اثر نہ بھی ہوتا ہو تو کم از کم دوسروں کے لئے ایک رہنما اصول بنانا تو پھر بھی قابل تحسین عمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر قیام سے منع کرتے اور شاید حدیث باب میں اس کی طرف اشارہ ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

باب کی اگلی حدیث ابو مجلزؒ سے مروی ہے کہ حضرت معاویہؓ (گھر سے) نکلے تو حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہما دونوں ان کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے، پس حضرت معاویہؓ نے فرمایا: بیٹھ جایئے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سُنا ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ (حسن)

قولہ: "اَن یَتَمَثَّلَ لہ" تمثل کے معنی نقشہ اور مثال پیش کرنے کے ہیں مگر صلہ میں "لام" آجائے تو بمعنی سامنے آنے اور سامنے کھڑے ہونے کے آتا ہے **قال اللہ تعالیٰ: "فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِیًّا"۔**

حضرت معاویہؓ کی اگر چہ یہ خواہش نہ تھی کہ لوگ ان کے سامنے کھڑے رہیں یا کھڑے ہو جائیں مگر

پھر بھی انہوں نے روکا شاید یہ سد ذرائع کے لئے تھا جیسے سابقہ تین باب سے پہلے باب میں گذرا ہے کہ ابن عمرؓ کے لئے کوئی جگہ خالی چھوڑنے کے لئے اٹھتا تو وہ اس جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے۔

بہرحال سب سے اچھی اور بے غبار بات یہ ہے کہ آپ کے سامنے کوئی بھی کھڑا ہو جائے تو اسے سمجھا کر روکنا چاہئے تاکہ تعظیم کی شکل پیدا نہ ہو۔ تاہم اگر کبھی کبھار جائز صورتوں پر عمل ہو جائے تو اس میں زیادہ قباحت محسوس نہیں کرنا چاہئے لیکن معمول بنانے سے بچنا اور منع کرنا چاہئے اس لئے مقتدی اور پیشوا شخص کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو روکے۔

باب ماجاء فی تقلیم الاظفار

(ناخن تراشنے کا بیان)

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: خمس من الفطرة الاستِحداد، والخِتان، وقَصُّ الشارب ونتف الإبط وتقلیم الاظفار". (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ چیزیں فطرت (یعنی انبیاء کی سنت) میں سے ہیں: (۱) زیر ناف بالوں کو صاف کرنا (۲) ختنہ کرانا (۳) مونچھیں کترنا (۴) بغلوں کے بال نوچنا (اکھاڑنا) (۵) ناخنوں کو تراشنا۔

حدیث آخر:۔ "عن عائشة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: عشر من الفطرة قص الشارب واِعفاء اللحیة والسواک والاستنشاق وقص الاظفار وغسل البراجم ونتف الابط وحلق العانة وانتقاصُ الماء قال زکریا قال مُصعب ونسیتُ العاشرة الا ان تکون المضمضة". (حسن)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس باتیں فطری ہیں: (۱) مونچھیں کاٹنا (۲) ڈاڑھی بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی چڑھانا (۵) ناخن تراشنا (۶) انگلیوں کے جوڑ دھونا (۷) بغل کے بال اکھاڑنا (۸) زیر ناف بال مونڈنا (۹) پانی سے استنجاء کرنا (۱۰) راوی مصعب کہتے ہیں کہ دسویں چیز میں بھول گیا ہوں شاید وہ کلی کرنا ہی ہے۔

تشریح:۔ باب کی پہلی حدیث تو بالاتفاق صحیح ہے اور صحیحین کے علاوہ متعدد کتب میں بھی مروی ہے

جبکہ دوسری حدیث اگر چہ مسلم میں بھی ہے مگر اس میں مصعب بن شیبہ ہیں، عارضۃ الاحوذی میں ہے: ''وَغَمْزَہ النّاس''، العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طرف اشارہ کیا ہے لیکن تحفۃ الاحوذی میں ہے کہ ابن معین اور عجلی نے توثیق کی ہے جبکہ امام احمدؒ اور ابو حاتمؒ وغیرہ نے لین بیان کی ہے گویا یہ حسان کے راوی ہیں اس لئے امام ترمذیؒ نے اس کو حسن کہا ہے۔

قولہ: "من الفطرة" مراد سنن مرسلین ہیں کیونکہ ایک تو ان کی عادات فطرت کے مطابق ہوتی ہیں، دوم ان باتوں پر شرائع متفق ہیں اس لئے ان کو فطرت سے تعبیر کیا۔ قولہ: ''اِستحداد'' لوہے کا استعمال یعنی استرے وغیرہ سے زیر ناف بال کو صاف کرنا کیونکہ جب تک یہ بال صاف نہ کئے جائیں اس وقت تک صحیح استنجاء اور مکمل صفائی ممکن نہیں اور یہی مطلب دوسری حدیث میں ''وحلق العانة'' کا ہے عانہ قُبُل اور دُبُر دونوں مواضع کے بالوں کو کہتے ہیں پھر ان موضعین کے بال کسی طرح بھی صاف کرنا جائز ہے خواہ ادویات سے کیوں نہ ہو تاہم مرد کے لئے اُسترہ یا لوہے کا کوئی دوسرا آلہ استعمال کرنا زیادہ افضل ہے جبکہ عورتوں کے لئے اکھاڑنا بہتر ہے کیونکہ کاٹنے سے موضع میں خشونت سی پیدا ہوتی ہے۔

قولہ: "والِختان" یہ سنت ابراہیمی ہے ایک روایت کے مطابق ان کا ختنہ اسی ۸۰ سال کی عمر میں ہوا تھا جیسا کہ صحیحین میں ہے، ختنہ موضع حشفہ کے اوپر کھال کے غلاف کاٹنے کو کہتے ہیں۔ ختنہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا فرض ہے یا واجب یا کم از کم سنت؟ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی بڑی عمر میں ختنہ کرانا اس کی فرضیت کی دلیل ہے کیونکہ بالغ کے لئے سترِ عورت فرض ہے جو واجب یا سنت کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ جمہور شافعیہ، امام احمدؒ، بعض مالکیہ اور ایک روایت امام ابوحنیفہؒ کے مطابق یہ واجب ہے، امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت اس کے سنت ہونے کی بھی ہے، بعض شافعیہ اور عام علماء بھی اس کو سنت کہتے ہیں علی ہذا اگر کوئی غیر مسلم بلوغت کے بعد اسلام قبول کرے تو اس پر ختنہ لازمی نہیں کیونکہ اس کے لئے کشفِ عورت کی ضرورت پڑے گی حالانکہ ستر فرض ہے۔ اور آج کل باندیاں بھی نہیں ہیں تا کہ وہ خرید کر اس سے کروائے، ہاں البتہ اگر وہ شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی بآسانی کر سکے تو وہ الگ بات ہے۔

ختنہ عورتوں کے لئے واجب یا مسنون نہیں ہاں اگر کوئی بچی ایسی ہو جیسا کہ بعض قوموں میں ہوتا ہے کہ زائد ٹکڑا جماع میں حائل ہوتا ہو تو پھر اس کا بھی ختنہ ہونا چاہئے۔ لہٰذا ام عطیہؓ وغیرہ کی احادیث اگر صحیح مانی جائیں تو وہ اسی مذکورہ صورت پر محمول ہوں گی۔ ختنہ کے لئے کوئی عمر اور وقت مقرر نہیں تاہم بلوغت سے پہلے ہونا

چاہئے تاکہ بعد میں ستر کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ابن العربیؒ نے جلدی ختنہ کرانے سے منع کیا ہے کہ اس سے یہود کی مشابہت لازم آئے گی اس لئے دس سال کے بعد ہونا چاہئے لیکن حضرات حسنینؓ کا ساتویں دن ختنہ ثابت ہے۔عارضہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے تھے:''وقد ولد محمد صلی اللہ علیه وسلم ختیناً دهیناً''۔

قولہ:''وقص الشارب'' مونچھوں کو پست کرنا یعنی کترنا۔اس کے لئے آگے مستقل باب آرہا ہے۔

قولہ: ''ونتف الابط'' بکسر الہمزۃ جبکہ باء کا کسرہ اور سکون دونوں جائز ہیں چونکہ بغلوں میں پسینہ جمع ہوتا ہے اور عموماً ہوانہ لگنے کی وجہ سے بغل اکثر تر رہتے ہیں اس لئے بالوں میں بدبو ہوجاتی ہے دوسری طرف بغلوں کی کھال نرم ہوتی ہے اس کے بال اکھاڑنا زیادہ تکلیف دِہ نہیں ہوتا جبکہ کاٹنے سے دوبارہ جلد ہی بال نکل جاتے ہیں اس لئے اکھاڑنے کی ترغیب ہے تاہم کاٹنا بھی جائز ہے اور ادویات سے ازالہ بھی مباح ہے۔پہلے دائیں بغل کو صاف کرنا مستحب ہے۔قولہ:''وتقليم الاظفار''ای قطعهما ناخن کاٹنے کا کوئی مخصوص طریقہ ماثور ومسنون تو نہیں بلکہ جیسے بھی کاٹے جائیں مقصود حاصل ہوجائے گا تاہم اصولی طور پر چونکہ ابتداء دائیں سے ہونا چاہئے اور ہوسکے تو انتہاء بھی دائیں پر ہونا چاہئے علی ہذا جیسا کہ نوویؒ نے شرح مسلم میں ذکر کیا ہے پہلے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے شروع کرے پھر درمیانی پھر بنصر پھر خنصر آخر میں انگوٹھا، پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے شروع کرکے انگوٹھے پر ختم کرے، تاہم مرقات میں ہے کہ دائیں کا انگوٹھا سب سے آخر میں ہوگا۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ ناخن کاٹتے وقت جب دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں آپ کی طرف ہوں گی تو مذکورہ ترتیب دائیں سے بن سکے گی۔(تدبر) پاؤں کے ناخن میں دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور بائیں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے جیسا کہ خلال اصابع میں گذرا ہے۔فلیتذکر۔

قولہ:''وغسل البراجم'' بفتح الباء وکسر الجیم بُرجُمۃ کی جمع ہے ہاتھ کی انگلیوں کی پشتوں پر جوڑ مراد ہیں کیونکہ ان پر میل جمع ہوجاتا ہے تو دھونا اگرچہ ہاتھ یعنی انگلیوں کا مسنون یا مستحب ہے مگر براجم کا ذکر بطور خاص تاکید کے لئے ہے تاکہ ہاتھ مکمل صاف ہوجائیں اور اسی علت کے پیش نظر جہاں بھی میل کچیل جمع ہونے کا اندیشہ زیادہ ہوگا اس میں مبالغہ فی الغسل مطلوب ہوگا جیسے کانوں، بغلوں، ناک، دانتوں اور ناف وغیرہ میں۔

قولہ:''وانتقاص الماء''امام ترمذیؒ نے اس کی تفسیر استنجاء سے کی ہے کیونکہ استنجاء سے پیشاب کے قطرے کم بلکہ ختم ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو انتقاص الماء سے تعبیر کیا، استنجاء بالماء سے پیشاب کیسے رُکتا ہے اس

کی حکمت ''باب ماجاء فی النضح بعدالوضوء من ابواب الطهارت ''میں گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ص:۱۹۹ ج:۱)ابوداؤد میں بجائے انتقاص کے انتضاح کالفظ بھی ہے اس سے نضح کا مطلب مزید واضح ہوجاتا ہے۔

باب ماجاء فی توقیت تقلیم الاظفار واخذالشارب

(ناخن کاٹنے اور مونچھ پست کرنے کی مدت کا بیان)

''عن انس بن مالک عن النبی صلی الله علیه وسلم انه وَقَّتَ لهم فی کل اربعین لیلة تقلیم الاظفار واخذالشارب وحلق العانة. وعنه: وُقِّتَ لنافی قصّ الشارب وتقلیم الاظفار وحلْق العانة ونتف الابط ان لانترک اکثرمن اربعین یوماً''.(هذااصح من الحدیث الاول)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (صحابہ) کے لئے ناخن تراشنے، مونچھ کاٹنے اور زیرناف بال مونڈنے کی مدت چالیس دنوں کے اندراندر کی مقرر فرمائی تھی۔ باب کی دوسری روایت بھی انہی سے ہے کہ ہمارے لئے مونچھ کاٹنے، ناخن تراشنے، زیرناف بال مونڈنے، اور بغل (کے بال) نوچنے کی مدت مقرر کی گئی تھی کہ ہم چالیس دن سے زیادہ تک نہ چھوڑیں۔ یہ حدیث اول سے اصح ہے۔

تشریح:۔ دوسری حدیث بتصریح ترمذی پہلی کی بنسبت اصح ہے کیونکہ پہلی کی سند میں صدقہ بن موسیٰ ہیں جوصدوق ہیں اگرچہ دوسری میں بھی جعفر بن سلیمان کی وجہ سے لین پائی جاتی ہے تاہم جعفر سوء حفظ کے باوجود مسلم کے رجال میں سے ہیں۔ پھر دوسری حدیث گویا پہلی حدیث کی تفسیر ہے یعنی چالیس دن آخری وانتہائی مدت ہے کہ اس سے زیادہ مؤخر نہیں کرنا چاہئے اس سے کم بہرحال مطلوب وپسندیدہ ہے، بہرحال اس میں ضابطہ یہ ہے کہ جب ناخن اور بال اتنے بڑھ جائیں کہ بدنُما محسوس ہوں اور میل ان میں جمع ہوتا ہوتو کاٹنا چاہئے بہتر یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں کاٹے جائیں تاہم جمعرات یاجمعہ کے دن کے بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں مگر پھر بھی بہت سے علماء جمعہ کے دن زوال سے پہلے اور بعض علماء جمعرات کے دن کاٹنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ ایک تو کچھ نہ کچھ روایات بھی ان دونوں کے بارے میں مروی ہیں دوم استقبال جمعہ کی وجہ سے یہ اوقات زیادہ موزوں ہیں۔ امام احمدؒ سے دونوں دِنوں میں اختیار اور ہرایک میں سنیت کاقول ہے۔ پھر ناخن اور سروڈاڑھی کے بال

گندی جگہ پر نہیں پھینکنے چاہئے کہ جزء آدمی محترم ہوتا ہے۔ پھر ناخن اور مونچھ کے بڑھنے سے چونکہ آدمی غیر مہذب سا محسوس ہوتا ہے اس لئے ان دونوں کی تہذیب بہر حال ہفتہ وار ہونا چاہئے جبکہ بغل اور دیگر غیر ضروری بال مونڈنے کی چالیس دن تک مؤخر کرنے کی اجازت ہے اس سے زیادہ تاخیر مکروہ تحریمی ہے۔

باب ماجاء فی قص الشارب

(مونچھیں کترنے کا بیان)

"عن ابن عباس قال كان النبی صلی الله علیه وسلم :يَقُصُّ اويأخذمن شاربه قال وكان خليل الرحمن ابراهيم يفعله". (حسن غريب)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مونچھیں کترتے تھے یا (فرمایا کہ) لیتے تھے اور آپؐ نے فرمایا: رحمٰن کے خلیل ابراہیم (علیہ السلام) بھی ایسا ہی کرتے تھے، اور اسی باب میں حضرت زید بن ارقمؓ کی مرفوع حدیث ہے: ''من لم يأخذمن شاربه فليس منا''۔ (حسن صحیح)

جو شخص اپنی مونچھوں میں سے نہ لے (یعنی نہ کاٹے) وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

تشریح:۔ **قوله:** "الشارب" چونکہ عربوں میں عام دستور مونچھیں بڑھانے کا تھا اور پھر مونچھوں کے بال کھانے پینے کی چیز میں لگ جاتے گویا پینے لگتے اس لئے ان کو شارب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ **قوله:** "يقص اويأخذ" قص کے معنی تراشنے اور کترنے کے آتے ہیں اگلے سے اگلے باب میں احفاء کا لفظ آیا ہے بعض دیگر روایات میں دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں جیسے اَنهِكُوا الشوارب، جَزُّوا الشوارب' وغیرہ۔

چونکہ ان الفاظ کے معانی میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہوا کہ مونچھیں کاٹنے کی مقدار و معیار کیا ہے؟ تو کم از کم اتنی مقدار میں کاٹنے کی ادنیٰ سنیت پر تو اتفاق ہے کہ اوپر والے ہونٹ کا سرخ کنارہ ظاہر ہو جائے، لیکن افضل کیا ہے؟ تو حنفیہ کی ایک روایت مونڈنے کی ہے بلکہ امام صاحبؒ اور صاحبینؒ سے ایک روایت حلق کی سنیت کی ہے کیونکہ لفظ احفاء اسی پر دلالت کرتا ہے، امام شافعیؒ کا مذہب بھی اسی کے مطابق ہے کما نقلہ البعض، عارضۃ الاحوذی میں حدیث باب کے ذیل میں لکھا ہے: ''وهذا نصٌّ فی انه لايحلق خلافاً للشافعیؒ فی قوله انه يحلق ،واحتج بقوله احفوا الشوارب الخ'' امام احمدؒ نے اس کے لئے ''لابأس'' کا لفظ استعمال کیا ہے تحفۃ الاحوذی میں ہے: ''وروى

الاثرم عن الامام احمدؒ انه کان یحفی شاربه احفاءً شدیداً''۔

لیکن اس کے برعکس بہت سے علماء حلق سے منع کرتے ہیں بلکہ امام مالکؒ تو اس کو بدعت اور مثلہ کہتے ہیں، عارضۃ الاحوذیؒ میں اشارہ ہے کہ حلق جمال علی الکمال کے منافی ہے احناف کے ایک قول کے مطابق بھی مونڈنا بدعت ہے جیسا کہ درمختار میں حظر والاباحت کی بحث میں حلق والی روایت کو قیل سے ذکر کیا ہے جو ضعف کی طرف اشارہ ہے۔ الکوکب الدری میں ہے کہ مبالغہ کے ساتھ تراشنا اور کترنا دونوں قسم کی روایات کو شامل ہوسکتا ہے اس لئے یہی طریقہ اصح لگتا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''المختار انه یقص حتیٰ یبدو طرف الشفة ولایحفیه من اصله''۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کم از کم ہونٹ کا بالائی کنارہ ظاہر کرنا بہرحال لازم ہے مزید مبالغہ افضل ہے مگر حلق نہ کرے پھر سبالتین یعنی بالائی ہونٹ کے دونوں جانب کے کنارے بھی لینے چاہیئے تاہم حضرت عمرؓ دونوں کناروں کے بال چھوڑے رکھتے تھے۔

باب ماجاء فی الاخذ من اللحیة

(ڈاڑھی کم کرنے کی حد کا بیان)

"عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی صلی الله علیه وسلم : کان یأخذ من لحیته من عرضها و طولها". (غریب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ڈاڑھی کی چوڑائی اور لمبائی (دونوں طرف) سے لیا کرتے تھے۔

تشریح:۔ امام ترمذیؒ نے عمر بن ہارون پر بحث کرتے ہوئے اگلی روایت ذکر کی ہے جس میں وکیع بن الجراح نے عن رجل کہہ کر ثور بن یزید کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف والوں کے خلاف منجنیق نصب کی تھی۔ قتیبہ نے وکیع سے اس رجل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا ''عمر بن ہارون''! یہ درمیانہ راوی ہیں، مسئلہ کی تفصیل اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فی اِعفاء اللحیة

(ڈاڑھی بڑھانے کا بیان)

"عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :اَحفُواالشوارب واعفوا اللُّحیٰ". (صحیح)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مونچھوں کو صاف کرو اور ڈاڑھی کو بڑھاؤ!۔

تشریح:۔باب کی اگلی روایت میں یہی مضمون بطور خبر کے منقول ہے کہ آپؐ نے مونچھیں صاف کرنے اور ڈاڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے۔**قولہ:**"واعفوا اللحی" اِعفاء کے معنی ترک کرنے کے ہیں "عفا" بمعنی آزاد کے آتا ہے چنانچہ اس بارے میں "اوفوا، وارخوا، وارجوا اور وَفِّروُا" کے بھی الفاظ آئے ہیں سب بمعنی آزاد چھوڑنے اور ترکِ قطع کے ہیں گوکہ یہ ترک محدود ہے جیسا کہ عنقریب آجائے گا۔ "لُحی" لحیۃ کی جمع ہے لِحی بھی صحیح ہے یعنی بکسر اللام وضمھا جبکہ مفرد یعنی لحیہ بکسر اللام ڈاڑھی کو کہتے ہیں اور بفتح اللام جبڑے کو کہتے ہیں تاہم شرعی ڈاڑھی میں صرف نچلے جبڑے کا اعتبار ہے لہٰذا اگر گالوں یعنی رخساروں پر بال اُگیں تو ان کا کاٹنا جائز ہے کیونکہ وہ اوپر والے جبڑے پر ہوتے ہیں اسی طرح گلے کے بال کاٹنا بھی جائز ہے۔

اس پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ ڈاڑھی رکھنا مردوں کے لئے واجب یا کم از کم سنت مؤکدہ ہے اس سلسلہ میں "الفقہ الاسلامی وادلتہ" میں جو بات امام نوویؒ کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ شوافع کے نزدیک ڈاڑھی کاٹنا مکروہ تنزیہی ہے تو یہ انتساب محض غلط ہے کیونکہ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں صرف یہ بات لکھی ہے کہ علماء نے ڈاڑھی کے بارے میں بارہ (۱۲) مکروہات بیان کئے ہیں جن میں بعض، بعض سے زیادہ اور سخت قبیح ہیں اس میں کراہت تنزیہی کی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی ولفظہ:

"وقد ذکر العلماء فی اللحیة اثنتی عشرة خصلة مکروهة بعضها اشدقبحاً من بعض،اِحداها خضابها بالسواد لالِغرض الجهاد...الرابعة نتفها او حلقها اول طلوعها الخامسة نتف الشیب...الحادیة عشر عقدها وضفرها الثانیة عشر حلقها اِلّا اذانبتت للمرأة لحیة فیستحب لها حلقها...".

اسی طرح پیلا رنگنا یا کبریت سے سفید کرنا اور پراگندہ چھوڑنا یا کرنا لاپرواہی کی وجہ سے یا زاہد ہونے کا تاثر دینے کے لئے بھی مکروہ ہے۔ (مسلم: ص:۱۲۹ ج:۱ "باب خصال الفطرۃ")

تاہم اس میں اختلاف ہے کہ آیا بڑھانے کی کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟ تو عام طور پر اہل ظاہر اور بعض دیگر علماء سَلَف اور خَلَف فرماتے ہیں کہ کوئی حد نہیں بلکہ اسے آزاد چھوڑنا ہی سنت اور لازم ہے البتہ حج وعمرہ کے احرام کھولتے وقت اس سے ایک مشت سے زائد کاٹنا جائز ہے جیسا کہ ابن عمرؓ وغیرہ بعض صحابہ کرتے تھے مگر عام حالات میں کاٹنے کی کسی طرح اجازت نہیں ہونی چاہئے، نیز ان کا عمل مرفوع حدیث سے معارض ہے لہٰذا ترجیح مرفوع یعنی اعفاء کو ہونا چاہئے۔

اس کے برعکس جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ ایک مٹھی سے زائد کو کاٹنا جائز ہے اور یہ کہ ہر جانب سے زائد بر مُشت کاٹا جائے گا جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں ہے، تحفۃ الاحوذی میں ہے کہ حسن بصریؒ طول وعرض دونوں سے لینے کا فرماتے:

"وعن الحسن البصریؒ: انه یؤخذمن طُولها وعرضها مالم یفحش وعن عطاء نحوه... وقال عیاض :یکره حلق اللحیة وقصها وتحذیفها واما الاخذ من طولها وعرضها واذا عظمت فحسن بل تکره الشهرة فی تعظیمها کما یکره فی تقصیرها".

اور بخاری وابوداؤد اور موطا میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ حج وعمرے سے حلال ہوتے وقت اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑتے جو زائد ہوتی تو اس کو کاٹتے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ ڈاڑھی کو آزاد چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں البتہ اگر زیادتی قبیح لگے تو پھر زائد کو کاٹنا مستحب ہے:

"ان تَرَکَ لحیته فلاحرج علیه اِلّاان یقبح طولها فیستحب ان یأخذ منها ولیس فی القدر المأخوذ منها حدالاماروی قتادة الخ... وروی ابوداؤد قال قال مروان بن المقفع رأیت عبدالله بن عمر یقبض علی لحیته فیقص مازاد علی الکفّ". (عارضة)

ابن عمرؓ کی یہ روایت بخاری کتاب اللباس باب تقلیم الاظفار میں ہے۔ (بخاری: ص:۸۷۵ ج:۲)

حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری میں فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی ڈاڑھی مسنون ہے کہ جس کی وجہ سے آدمی

مجوس اور ہندوؤں کی تشبیہ سے نکل جائے:

"واما اعفاء اللحية فالظاهر من فعله صلى الله عليه وسلم ان الاعفاء مسنون بحيث يخرج من التشبيه بالهنود والمجوس فحسبُ".

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ اصل مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کا شعار ایسا ہونا مقصود وممدوح اور مطلوب ہے کہ جس سے اغیار کی رسومات سے خواہ وہ مذہبی ہوں یا قومی امتیاز تام ہو جائے چونکہ اہل فارس ڈاڑھیاں کترتے تھے اور رومیوں میں اس کے مونڈنے کا رواج تھا اور یہود سفید رکھنے کو شعار بنائے ہوئے تھے تو آپؐ نے ان سب کے مقابلے میں ڈاڑھی بڑھانے اور سفید کو مہندی لگانے کا حکم دیا تا کہ ان سے مشابہت نہ رہے دوسری طرف یہ سنن انبیاء میں سے بھی ہے اور مردانگی کی علامت اور وقار کی نشانی ہے اور یہ مقصد ایک مُشت ڈاڑھی رکھنے سے پورا ہو جاتا ہے جبکہ زائد بعض لوگوں کے ساتھ اچھی نہیں لگتی چنانچہ مراسیل ابی داؤد میں حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لمبی ڈاڑھی والے کو دیکھا تو فرمایا کہ تم میں سے ایک اپنی شکل کیوں بدنما بناتا ہے: **"عن مجاهد رأى النبى صلى الله عليه وسلم رجلاً طويل اللحية فقال لِمَ يُشَوِّه احدكم بنفسه"۔**

جب بچہ تیرہ چودہ سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے خون میں "ہارمون" پیدا ہوتے ہیں جس کی بناء پر اس کے چہرے اور بعض دیگر مواضع پر بال اُگنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس میں تولیدی صلاحیت یعنی مردانہ قوت جنم لیتی ہے لہٰذا ڈاڑھی کا نہ نکلنا بھی عیب ہوا اور نامردی کی علامت ہوئی اور اسے کاٹنا بھی گویا اس صلاحیت کی شاخ کو توڑنے کے مترادف ہے جبکہ لمبی ڈاڑھی تشویش کا باعث ہے "فخیر الامور اوسطھا" جیسا کہ ابن عمرؓ کے عمل سے ثابت ہے۔

رہا یہ احتمال کہ ابن عمرؓ کا یہ عمل حج وعمرہ کے ساتھ خاص ہے تو یہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے کیونکہ اول تو ڈاڑھی کا حلق وقصر حل میں شامل نہیں دوم اگر زائد کا کاٹنا جائز نہیں تو پھر ہر وقت ناجائز ہونا چاہئے، اور یہ کہنا کہ یہ مرفوع حدیث کے معارض ہے تو اس کا جواب طیبیؒ نے دیا ہے جیسا کہ حاشیہ قوت المغتذی پر ہے کہ مرفوع کا مطلب یہ ہے کہ اعاجم سے زیادہ بڑھاؤ اور یہ زائد کے کاٹنے کے منافی نہیں:

"قال الطيبىؒ هذا لاينافى قوله "اعفوا اللحىٰ لان المنهى عنه قصها كفعل الاعاجم واخذ قليل اطراف وطول ليس من القص فى شيئ".

یہ دراصل دونوں بابوں کی حدیثوں میں تطبیق ہے جس سے ابن عمرؓ کی حدیث کی تطبیق بھی معلوم ہوئی۔
قدیم تاریخ اور انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ اہلِ فارس کے بڑے پوری ڈاڑھی رکھتے اور جو نیچ ذات کے لوگ پوری ڈاڑھی رکھتے تو وہ ان کی ڈاڑھیاں بطور سزا کاٹتے گویا ڈاڑھی وقار کی شناخت تھی اسی طرح ہندوستان اور مغربی یورپ میں ڈاڑھی وقار کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

باب ماجاء فی وضع احدی الرجلین علی الأُخری مستلقیاً

(چت لیٹنے کی حالت ایک پاؤں دوسرے پر رکھنا جائز ہے)

"عن عَبّادبن تمیم عن عَمِّه انه رأی النبی صلی الله علیه وسلم :مُستلقیاً فی المسجد واضعاً اِحدیٰ رجلیه علی الأُخریٰ". (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم المازنیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں چت لیٹے ہوئے دیکھا جبکہ اس وقت آپؐ ایک پیر دوسرے پر رکھے ہوئے تھے۔

تشریح:۔ قولہ: "مُستلقیاً" اِستلقاء چت لیٹنے یعنی منہ آسمان کی طرف کر کے پیٹھ پر چت لیٹنے کو کہتے ہیں اگر دونوں پیر لمبے کئے ہوئے لیٹا ہو تو پھر ایک پاؤں دوسرے پر رکھنے کی کوئی ممانعت نہیں خواہ ازار پہنے ہوئے ہو یا شلوار کیونکہ اس سے کشفِ عورت کا اندیشہ نہیں ہوتا جو نہی کی علت ہے باب کی حدیث میں یہی صورت مراد ہے البتہ اگر ایک ٹانگ کھڑی ہو اور آدمی تہبند پہنے ہوئے ہو تو پھر ایک پاؤں گھٹنے پر رکھنا کشفِ عورت کے اندیشہ کے پیش نظر منع ہے جیسا کہ اگلے باب میں مراد ہے ہاں البتہ اگر پاجامہ یا شلوار اور پتلون کے پہننے کی حالت میں ایسا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ علت مفقود ومعدوم ہے۔

باب ماجاء فی کراهیةٍ فی ذالک

(چت لیٹنے کی مکروہ صورت کا بیان)

"عن جابر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم :نهیٰ عن اشتمال الصَّمّاء والاحتباء فی ثوب واحد وان یرفع الرجل اِحدیٰ رجلیه علی الاخری وهومُستلقٍ علیٰ ظهره". (حسن صحیح)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر میں پیک ہونے اور ایک ہی کپڑے میں حبوہ (سُرین کے بل بیٹھنے) سے منع فرمایا ہے اور یہ کہ کوئی شخص اپنا ایک پیر دوسرے پر رکھ دے جبکہ وہ اپنی پیٹھ پر چت لیٹا ہو۔

تشریح:۔ ترمذی کے ہندی نسخہ میں حضرت جابرؓ کی دونوں حدیثوں کا متن مکرر ہوگیا ہے جبکہ عارضۃ الاحوذی اور تحفۃ الاحوذی کے متون پر پہلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "**اذا استلقیٰ احدکم علی ظہرہ فلایضع احدی رجلیہ علی الأخری**" جب تم میں سے کوئی ایک اپنی پُشت پر چت لیٹے تو وہ اپنا ایک پاؤں دوسرے پر نہ رکھے، امام ترمذیؒ نے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے مگر باب کی دوسری حدیث صحیح ہے اور نہی کی صورت سابقہ باب میں بیان ہوئی ہے۔

اشتمال الصما اور احتباء کی صورتیں ابواب اللباس میں گذری ہیں۔ دیکھئے: تشریحات ص: ۵۶۷ ج: ۵ "باب ماجاء فی النھی عن اشتمال الصماء والاحتباء بالثوب الواحد") جس کی اجمالی صورت یہ ہے کہ چادر اس طرح اُوڑھ لینا کہ ہاتھ اندر ہی اندر بندرہ جائیں اور آدمی مکمل پیک ہو جائے چونکہ اس میں گرنے کا خطرہ ہے اس لئے منع کیا جبکہ احتباء سرین پر بیٹھ کر دونوں ٹانگیں کھڑی کرنے کو کہتے ہیں۔ اگر بدن پر ایک ہی کپڑا ہو تو اگر وہ اوپر والے حصے پر ڈالے گا تو ستر کھلے گا اس لئے منع کیا۔ البتہ اگر ستر کھلنے کا خطرہ نہ ہو تو پھر حبوہ میں خارج صلوٰۃ کوئی حرج نہیں بلکہ ثابت ہے چاہے ٹانگوں اور کمر پر چادر باندھے یا ہاتھوں سے حبوہ باندھے ہر دو جائز ہیں۔

باماجاء فی کراھیۃ الاِضطجاع علی البطن

(اُلٹا لیٹنے کی ممانعت)

"**عن ابی ہریرۃ قال رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً مضطجعاً علی بطنہ فقال ان ھذہ ضِجعۃ لایحبھا اللہ**".

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو مُنہ کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا، پس آپؐ نے فرمایا لیٹنے کا یہ طریقہ اللہ اس کو پسند نہیں کرتا۔

تشریح:۔ **قولہ:** "**ضجعۃ**"، بکسر الضاد بمعنی ہیئت وطریقہ کے جبکہ بالفتح بمعنی مرۃ آتا ہے یہاں طریقہ مراد ہے، لہٰذا اس کو بروزن سِدرۃ پڑھنا چاہئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ طریقہ اس لئے پسند نہیں کہ یہ

طریقہ اہل جہنم کا ہے جیسا کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے، نیز یہ وقار اور ادب کے خلاف ہے، کسی جگہ نظر سے گزرا ہے غالباً کہ شیطان اس طرح لیٹتا ہے مگر حوالہ یاد نہیں۔ فلینظر

باب ماجاء فی حِفظ العورة

(ستر کی احتیاط کا بیان)

"عن معاویة بن حَیدةَ القُشَیرِیؓ قال قلت یارسول الله اعوراتنامانأتی منها وماندر؟ قال احفظ عورتک اِلّامن زوجتک اوماملکت یمینکَ فقال: "الرجل یکون مع الرجل"؟ قال اِن استطعت ان لایراها احدٌفافعَل اقلت فالرجل یکون خالیا؟قال فالله احق ان یُستحییٰ منه!". (حسن)

بہز بن حکیم اپنے دادا حضرت معاویہ بن حیدہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم اپنے ستر کس پر ظاہر کر سکتے ہیں اور کس پر نہیں؟ آپؐ نے فرمایا اپنے ستر کی حفاظت کرو (یعنی چھپائے رکھو) سوائے اپنی بیوی کے اور جس باندی کا تو مالک ہو انہوں نے پوچھا کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی اگر کسی آدمی کے سامنے ستر کھول دے؟) آپؐ نے فرمایا اگر تیرا بس چلے کہ کوئی بھی اسے نہ دیکھ سکے تو ایسا ہی کرو! میں نے عرض کیا کہ آدمی کبھی تنہا ہوتا ہے (تو کیا پھر بھی ستر چھپانا ہے؟) آپؐ نے فرمایا کہ اللہ اس بات کے زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ستر چھپایا جائے!

تشریح:۔ قوله: "مانأتی منها وما نذر"؟ ای مانُری منهاونترک؟ یہ روایت چند ابواب کے بعد دوبارہ آ رہی ہے وہاں بھی امام ترمذیؒ نے اس پر یہی باب مع هذا الترجمہ قائم کیا ہے وہاں روایت کے آخر میں یہ اضافہ ہے "منه الناسُ... یعنی فالله احق ان یستحییَ منه الناس"، فعل معروف کے ساتھ ہے جبکہ یہاں یُستحییٰ مجہول کا صیغہ ہے۔

ستر انسان کے بدن میں وہ جگہ کہلاتی ہے جس کا کھل جانا انسان طبعی وجبلی طور پر عار سمجھتا ہے جو مرد کے گھٹنوں سے ناف تک ہے اور عورت سرتا پا عورت ہی عورت ہے چنانچہ اس تعبیر کے لئے اردو کا لفظ "عورت" بہترین ترجمان ہے۔ البتہ ضرورت کی بناء پر دفع حرج کے پیش نظر عورت کا چہرہ اور یدین وقدمین مستثنیٰ ہیں مگر فتنہ کے احتمال کی صورت میں اس کا حجاب بھی ضروری ہے کیونکہ مرد کے دل کو عورت کے چہرے سے دائرس

منتقل ہو جاتا ہے، اگر دل میں اینٹی وائرس یعنی تقویٰ ہوگا تو وہ کچھ دیر کے لئے وائرس کا مقابلہ کرلے گا مگر جب وائرس کے حملے لگاتار ہوں گے تو تقویٰ مزاحمت سے قاصر ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں حضرت معاویہ بن حیدہؓ نے تین سوال پوچھے ہیں:

(۱)......یہ کہ ہم عورت یعنی ستر کس کس کے سامنے کھول سکتے ہیں اور کس کس کے سامنے نہیں؟ یا "مانذر" کا مطلب یہ ہے کہ ماننرک سترها یعنی کس سے چھپانا لازمی ہے اور کس سے نہیں؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا سوائے بیوی اور باندی (غیر منکوحہ) کے کسی کے سامنے کھولنے کی اجازت نہیں ہے؟ اگرچہ بیوی کے سامنے برہنہ ہونا پسندیدہ نہیں مگر اس حدیث کی رُو سے میاں بیوی کا ایک دوسرے سے پردہ کرنا واجب نہیں کیونکہ جب اس سے بڑھ کر چھونا جائز ہے تو نظر بطریق اولیٰ جائز ہے مگر اولیٰ یہ ہے کہ پردے میں رہیں چنانچہ متن ہدایہ مع الشرح میں ہے:

"وینظر الرجل من امته التی تحل له وزوجته الی فرجها...اِلّاانَّ الاولیٰ ان لاینظر کل واحد الی عورة صاحبه لقوله علیه السلام:اذااتیٰ احدکم اهله فلیستَتِر مااستطاع ولایتجردان تجرد العیر ولان ذالک یورث النسیان الخ".

یعنی گورخر کی طرح مت ملو اور یہ کہ اس سے حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے، نیز حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر کبھی نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا ہے۔

(۲)......دوسرے سوال کا مطلب یہ ہے کہ کبھی لوگ آپس میں کسی جگہ جمع رہتے ہیں جیسے حمام وغیرہ میں جہاں ستر کی حفاظت ضروری نہیں سمجھی جاتی کیونکہ اکثر ایسے مواقع پر دوست اور ساتھی ایک ساتھ نہاتے یا کھیلتے ہیں تو آپؐ نے اس کی ممانعت فرمادی، ہاں البتہ ضرورت کے مواضع مستثنیٰ ہیں جیسے ڈاکٹر کا معائنہ ہو یا آپریشن کی ضرورت داعیہ ہو۔

(۳)......خلوت میں ستر کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے جواب دیا کہ اگر وہاں کوئی بھی نہیں تو کم از کم اللہ سے تو شرم کی جانی چاہئے یعنی اگرچہ آدمی اللہ سے چھپ تو نہیں سکتا لیکن جو آدمی خلوت میں، اندھیرے میں اور خالی کمرے میں ننگا ہوتا ہے تو وہ آداب سے بھی عاری ہوتا ہے اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جبکہ ہر جگہ باپردہ رہنے والا متأدب ہوتا ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے لہٰذا بے ادبی کر کے اللہ کو ناراض نہیں کرنا چاہئے اور چونکہ

ضرورت کی صورت میں جیسے قضائے حاجت اور غسل کرنے میں ننگا ہونا بے ادبی نہیں بلکہ حاجت ہے اس لئے وہ صورت ناپسندیدہ نہیں۔ اور حیاء کے منافی بھی نہیں ہے۔

باب ماجاء فی الاِتکاء

(ٹیک لگانے کا بیان)

"عن جابر بن سمرة قال رأیتُ النبی صلی اللہ علیه وسلم مُتکِئاً علی وِسادة علی یساره". (حسن غریب)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تکیہ پر اپنی بائیں جانب ٹیک لگائے ہوئے دیکھا ہے۔

تشریح:۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھانے کے علاوہ عام حالات میں کسی چیز پر ٹیک لگا کر بیٹھنا جائز ہے خواہ دائیں جانب ہو یا بائیں جانب کیونکہ دونوں کی علت ایک ہی ہے یعنی سہارا لینا اور اس حدیث میں علی یسارہ قید اتفاقی ہے۔

بابٌ

"عن ابی مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: لایُؤَمُّ الرجلُ فی سلطانه ولایُجلَسُ علی تکرِمَتِه فی بیته الابأذنه". (حسن)

کسی آدمی کو ماموم (مقتدی) نہ بنایا جائے اس کی اختیار والی جگہ میں اور نہ اس کے گھر میں اس کی (خاص) نشست پر بیٹھا جائے مگر اس کی اجازت سے۔

تشریح:۔ یعنی کوئی اجنبی آدمی کسی کے معاملات میں اور بالخصوص نماز کی امامت اور نشست کے استحقاق میں مداخلت نہ کرے کیونکہ جہاں کسی کی عمل داری ہو تو وہاں دوسروں کا عمل دخل بدنظمی اور ایذاء رسانی کا موجب بنتا ہے حدیث کی تفصیل تشریحات ابواب الصلوٰۃ میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص:۵۱۲ ج:۱ "باب من احق بالامامۃ")

باب ماجاء ان الرجل اَحَقُّ بصدر دابته

(آدمی اپنی سواری کی اگلی نشست کا زیادہ حقدار ہے)

"عن عبداللہ بن بُریدۃ قال: سمعتُ ابی، بریدۃ یقول بینما النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمشی اذجاءہ رجل ومعہ حمار فقال: یارسول اللّٰہ اِرکب وتأخّرَ الرجلُ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "لا" انت احق بصدر دابتک اِلّاان تجعلہ لی قال: قدجعلتُہ لک قال: فَرَکِبَ". (حسن غریب)

حضرت بُریدہؓ فرماتے ہیں کہ دریں اثنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چل رہے تھے کہ ان کے پاس ایک شخص آیا جس کے ساتھ دراز گوش تھا وہ شخص کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! سوار ہو جائیں! اور خود وہ شخص پیچھے ہٹ گیا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" تم اپنی سواری کی اگلی نشست کا زیادہ حقدار ہو، ہاں البتہ اگر تم مجھے یہ حق دو تو! وہ کہنے لگا کہ میں نے یہ آپ کے لئے کردیا! فرماتے ہیں کہ آپؐ سوار ہوئے۔

تشریح:۔ قولہ: "سمعت ابی، بریدۃ" بریدہ "ابی" سے بدل ہے یعنی میں نے اپنے والد بُریدہ سے سنا ہے۔ قولہ: "ومعہ حمار" اور گدھے کے لفظ کے بجائے دراز گوش سے ترجمہ کیا ہے یعنی لمبے کانوں والا جانور، کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فارسی میں سیرت پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے اس میں فرمایا ہے کہ جب آپؐ کی نسبت سے گدھے کا تذکرہ ہو تو سوءِ ادب سے بچنے کے لئے دراز گوش کہا جائے گا گو کہ آپؐ کمال تواضع کی بناء پر گدھے کی سواری معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص گدھے کی سواری عار سمجھتا ہے وہ گدھے سے بھی زیادہ بدتر وحقیر ہے کیونکہ وہ متکبر ہوتا ہے۔ چونکہ یہ صاحب یہ سمجھ رہے تھے کہ آپؐ کے ہوتے ہوئے مجھے آگے بیٹھنے کا حق نہیں پہنچتا اس لئے پیچھے ہٹ گیا تو آپؐ نے اس کو مسئلہ سمجھایا جیسا کہ واضح ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گاڑی چلانے اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا حق مالک کو ہے ہاں اگر وہ کسی کو یہ حق دے تو اس کے لئے قبول کرنا جائز ہے۔ عارضہ اور تحفہ دونوں کے متن میں "لا" انت کے بجائے لَانتَ احَقّ بصدر الخ ہے یعنی ضمیر مخاطب مؤکد بالام تاکید ہے مطلب دونوں جملوں کا ایک ہی ہے البتہ ہمارے نسخہ کے مطابق معناً دو جملے بن جاتے ہیں ایک "لا" نافیہ مستقل ہے یعنی لا ارکبُ... اور انت الخ دوسرا جملہ پہلے کی دلیل ہے جبکہ لانت ایک ہی جملہ ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی اتخاذالانماط

(بستر پر بچھانے والے کپڑے (چادروغیرہ) کے استعمال کا بیان)

"عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :هل لکم انماط؟قلتُ وَاَنّٰی تکون لنا انماط؟قال:اَمَاانهاستکون لکم انماط؟قال فانااقول لِامرأتی :اَخِری عنیّ انماطک فتقول اَلَم یقل رسول الله صلی الله علیه وسلم :انهاستکون لکم انماط؟قال فَاَدَعُها". (حسن صحیح)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تمہارے پاس انماط (غالیچے) ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس انماط کہاں سے آئے؟ آپؐ نے فرمایا: آگاہ ہو! کہ عنقریب تمہارے پاس انماط ہوں گے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں چنانچہ میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ اپنے انماط کو مجھ سے وددور رکھ تو وہ کہتی ہے: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ تمہارے پاس انماط ہوں گے! حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں چھوڑ دیتا ہوں۔

تشریح: ۔قولہ:"انماط" اسباب کے وزن پر نمط کی جمع ہے بستر کے اوپر بچھائے جانے والا کپڑا، بعض کہتے ہیں کہ وہ کپڑا جس کا جھالر بھی بنا ہوا ہو یا باریک نازک ولطیف کپڑا جو پلنگ وغیرہ پر بھی بچھاتے ہیں اور اس کا پردہ بھی بناتے ہیں۔ بعض نے قالین کی ایک قسم کو کہا ہے جس پر روئیں ہوتے ہیں۔ تاہم حدیث میں بستر کے اوپر والی چادر مراد ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی اگرچہ وسعت اور فراوانی مال کی آئینہ دار ہے مگر آپؐ نے چونکہ اس کے استعمال سے منع نہیں فرمایا اس لئے حضرت جابرؓ کی اہلیہ نے اس کو مباح سمجھ کر استعمال کیا اور حضرت جابرؓ نے بھی نکیر نہیں کی اس لئے امام ترمذیؒ اور امام نوویؒ نے اس کی رخصت کے لئے باب قائم کیا ہے۔ قال: "وفیه جواز اتخاذالانماط اذالم تکن من حریر"۔ (مسلم: ص:۱۹۴ ج:۲)

باب ماجاء فی رکوب ثلاثة علی دابة

(سواری کے ایک جانور پر تین آدمی بیٹھ سکتے ہیں؟)

"عن ایاس بن سلمة عن ابیه قال لقد قُدتُ بنبی الله صلی الله علیه وسلم والحَسَن

والحسين على بغلته الشهباء حتىٰ ادخلته حُجرة النبى صلى الله عليه وسلم، هذاقُدامه وهذا خلفه". (حسن صحيح غريب)

حضرت سلمہ بن اکوعؓ فرماتے ہیں کہ بلاشبہہ میں نے آپؐ کے سفید خچر کو کھینچا ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حسنؓ وحسینؓ بیٹھے تھے یہاں تک کہ میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنگن میں لے آیا، یہ آپؐ کے آگے تھے اور یہ آپؐ کے پیچھے تھے۔

تشریح:۔قوله: "قُدتُ" سَوق کی ضد ہے سائق پیچھے سے ہانکنے والے اور قائد آگے سے کھینچنے والے کو کہتے ہیں۔ **قوله:** "الشهباء" وہ سفید رنگ جو سیاہی مائل ہو پھر ان حضرات میں سے کون آپؐ کے آگے تھا؟ تو روایت میں ہر ایک احتمال ہے۔ اس روایت سے تین شخصوں کا ایک جانور پر سوار ہونا ثابت ہوا اور جن روایات میں منع آیا ہے وہ زیادہ وزن کی علت کے پیش نظر ہے جبکہ یہاں تو حضرات حَسَنینؓ کا وزن زیادہ نہ تھا کہ دونوں کم عمر تھے نیز خچر انتہائی طاقت ور جانور ہے بخلاف گھوڑے کے، لہٰذا کوئی تعارض نہ رہا۔

باب ماجاء فى نظرة الفُجاءة

(ناگہاں نظر پڑ جانے کا بیان)

"عن جرير بن عبدالله قال سألتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم :عن نظرة الفُجاءةِ فَاَمَرَنى ان اصرف بصرى". (حسن صحيح)

حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناگہانی (اچانک) نظر پڑنے کے متعلق پوچھا تو آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی نگاہ پھیرلوں۔

تشریح:۔قوله: "فُجاءة" بضم الفاء کی صورت میں مد کے ساتھ ہے اور بفتح الفاء کی صورت میں بَغتَۃً کے وزن اور معنی کے ہے مراد غیر ارادی نظر ہے، لہٰذا ارادی نظر بہرحال ممنوع ہوئی خواہ وہ پہلی ہو یا غیر ارادی نظر کا تسلسل ہو کیونکہ غیر ارادی اچانک پڑنے والی نظر اگرچہ معاف ہے مگر جب اس نظر کو جاری رکھے گا تو مزید دیکھنا ارادی بن جائے گا اور یہی مطلب ہے باب کی اگلی حدیث کا: **"یاعلى لاتُتبِعِ النظرةَ النظرةَ فان لک الاولىٰ وليست لکَ الآخرة"**۔ (حسن غریب) پہلی نظر کے بعد دوسری مت ڈالو کیونکہ تیرے لئے پہلی نظر جائز (معاف) ہے مگر دوسری معاف نہیں ہے۔

اس میں پہلی سے مراد غیر ارادی اور غیر اختیاری ہے جبکہ دوسری سے مراد ارادی واختیاری ہے اور چونکہ اچانک نگاہ پڑنے کے بعد نظر لوٹانا حلاوۃ ایمانی نصیب ہونے کا ذریعہ ہے اس لئے اُسے ''لَکَ'' سے تعبیر فرمایا یعنی ایسا کرنے سے تجھے نفع ہوگا جبکہ دوسری یعنی ارادی نظر نفع کے بجائے مضر ثابت ہوگی گویا پہلی نظر کی متوقع نفع بھی ضائع کردے گی۔ (تدبر)

باب ماجاء فی احتجاب النساء من الرجال

(عورتیں بھی مردوں کو نہ دیکھیں)

''عن نبهَان مولی ام سلمة انه حدثه ان ام سلمة حَدَّثته انها كانت عندرسول الله صلی الله علیه وسلم ومیمونةُ قالت فبینمانحن عنده اَقبَلَ ابنُ ام مكتوم فدخل علیه و ذالک بعد ماأُمِرنابالحِجاب فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم :اِحتجِبامنه!فقلتُ یارسول اللّٰه! اَلیس هواعمیٰ؟لایبصرناولایعرفنا؟فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم :اَفَعمیاوان انتما؟ اَلستماتُبصِرانه؟''(حسن صحیح)

حضرت ام سلمہؓ کے آزاد کردہ غلام نبہان فرماتے ہیں کہ ام سلمہؓ نے ان (نبہان) کو بتایا ہے کہ وہ اور میمونہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں، ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ دریں اثناء کہ ہم آپؐ کے پاس تھیں (عبداللہ) بن ام مکتومؓ آئے اور آپؐ کے پاس داخل ہوئے یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمیں پردہ کرنے کا حکم کیا گیا تھا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں ان سے پردہ کرو! میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا وہ تو نابینا نہیں ہیں؟ نہ تو وہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی پہچان سکتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم اسے نہیں دیکھتیں؟

تشریح:۔قوله: ''ومیمونةُ'' اس کا رفع ونصب دونوں جائز ہیں اگر کانت کی ضمیر مستتر پر عطف مانیں تو مرفوع پڑھا جائے گا جبکہ اسم اَنَّ (ھا) پر عطف کی صورت میں منصوب ہوگا نصب اولی ہے۔**قوله:** ''اَفَعمیَاوان'' عمیاوان تثنیہ ہے عمیاء کا جو اعمیٰ کی تانیث ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت بھی مرد کو نہیں دیکھ سکتی جیسا کہ مرد کے لئے کسی اجنبی مُشتھات عورت کو دیکھنا جائز نہیں، تاہم اس نہی کی کیا حیثیت ہے؟ تو بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ روایت ورع پر مبنی ہے جہاں

تک نفس دیکھنے کا تعلق ہے تو فتوی کی رُو سے عورت مرد کی ناف کے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے والے حصے کو دیکھ سکتی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ ؓ کا حبشیوں کو دیکھنا ثابت ہے، اس کے برعکس امام نوویؒ شرح مسلم: ص: ۴۸۳ ج: ۱ میں لکھتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک نظر جانبین سے حرام ہے:

"بل الصحیح الذی علیه جمهور العلماء واکثر اصحابنا انه یحرم علی المرأة النظر الی الاجنبی کما یحرم علیه النظر الیها".

اسی طرح ابن العربیؒ نے بھی عارضہ میں لکھا ہے کہ عورت کے لئے بھی مرد کو دیکھنا حرام ہے لیکن لوگ اس مسئلہ سے ناواقف ہیں: "کذالک یحرم نظر المرأة الی الرجل هو امر جهله الناس الخ" جہاں تک حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کی حدیثوں کا تعلق ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کو نبی علیہ السلام نے حبشیوں کا کھیل دیکھنے کی اجازت دی اور فاطمہ بنت قیس ؓ کو عبداللہ بن ام مکتومؓ کے گھر عدت گزارنے کو کہا تھا تو ان احادیث کا جواب یہ ہے کہ عدت گذارنے کے لئے دیکھنا کسی طرح ضروری نہیں اس کے بغیر بھی کسی نابینا کے گھر میں پردے کے ساتھ عدت گذاری جاسکتی ہے لہٰذا اجازتِ عدت نظر کے اذن کو مستلزم نہیں ہوئی۔

حضرت عائشہ ؓ کی حدیث کا جواب علامہ عینیؒ نے یہ دیا ہے کہ انہوں نے کھیل یعنی فعل دیکھا تھا اس سے حبشیوں کے چہروں کو دیکھنا لازم نہیں آتا:

"وفیه جواز نظر النساء الی فعل الاجانب وَاَمّا نظرهن الی وجه الاجنبی فان کان بشهوة فحرام اتفاقاً وان کان بغیرها فالاصح التحریم وقیل هذا کان قبل نزول "قل للمؤمنات یغضضن من ابصارهن".

(حاشیہ نمبر ۷ بخاری: ص: ۱۳۰ ج: ۱ "کتاب العیدین)

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ دیکھنا تو دونوں کے لئے ممنوع ہے تاہم مرد کا نظر کرنا زیادہ شنیع ہے کیونکہ اگر عورت کے دیکھنے سے فتنہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اگر چہ فساد تو ہے مگر جب مرد کی طرف سے فساد کا صدور وآغاز ہوگا تو چونکہ مرد کی حیثیت انسانیت کے ڈھانچے میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے تو پھر اس نظام کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہتی کیونکہ عورتوں کی حیثیت ثانوی ہونے کے ساتھ ان کو روکا بھی جاسکتا ہے مگر مرد کو روکنے والا پھر کون ہوگا؟ اس لئے مرد کو زیادہ پابند بنادیا گیا اگر چہ غضِ بصر دونوں کے لئے ہے۔ غرض مرد کا مقام بلند ہے اس لئے اس کی ذمہ داری بھی زیادہ بنتی ہے تاکہ معاشرہ بگڑنے نہ پائے۔ یہ ذمہ داری اگر مرد اور عورت دونوں پوری

کریں تو نور علی نور مگر مرد بہرحال اسے نباہتا رہے اگر عورت بگڑ بھی گئی تو انسانیت کے بنیادی عنصر یعنی مرد کی اصلاح کی صورت میں دنیا باقی رہے گی ورنہ سب نیست و نابود ہو جائے گا جس کا نام قیامت ہے جو اشرار و زنا کاروں پر ہی قائم ہوگی۔

باب ماجاء فی النهی عن الدخول علی النساء اِلّا باذن ازواجهن

(شوہر کی اجازت کے بغیر کسی عورت کے پاس جانا منع ہے)

"عن مولیٰ عمرو بن العاص ان عمرو بن العاص ارسله الی عَلیّ یستأذنه عَلَیٰ اسماء ابنة عمیس فاذن له حتیٰ اذا فرغ من حاجته ،سأل المولیٰ عمرو بن العاص عن ذالک فقال: ان النبی صلی الله علیه وسلم نَهَانَا او نهیٰ ان ندخل علی النساء بغیر اذن ازواجهن".

(حسن صحیح)

حضرت عمرو بن العاصؓ کے آزاد کردہ غلام (عبدالرحمٰن بن ثابت) سے روایت ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے ان کو (یعنی عبدالرحمٰن کو) حضرت علیؓ کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان سے اسماء بنت عمیسؓ کے پاس جانے کی اجازت مانگے چنانچہ انہوں نے اجازت دے دی چنانچہ جب وہ (عمروؓ) اسماءؓ سے (بات چیت کر کے) فارغ ہوئے تو مولیٰ نے عمرو بن العاصؓ سے اس کی وجہ پوچھی (کہ رشتہ داری کے باوجود آپ نے اجازت کیوں طلب کی؟) حضرت عمروؓ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع کیا ہے یا فرمایا کہ آپؐ نے ممانعت فرمائی ہے کہ ہم عورتوں کے پاس ان کے شوہروں کی اجازت کے بغیر جائیں۔

تشریح:۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت الحارثؓ کی ماں شریک بہن یعنی نبی علیہ السلام کی سالی ہیں یہ اپنے شوہر حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے ہمراہ حبشہ کی ہجرت بھی کر چکی ہیں وہاں ان کی اولاد بھی پیدا ہوئی تھی، حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ان سے نکاح ہوا تھا اور آپؓ کے بعد حضرت علیؓ کے عقد ازدواج میں منسلک ہوئی تھیں۔ باب کی حدیث انہی دنوں کی بات ہے جب وہ حضرت علیؓ کے نکاح میں تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے رشتہ دار بھی ان کے گھر میں آنا چاہیں تو ان کو شوہروں سے صراحتاً یا دلالتاً اجازت لینی چاہئے ہاں عورت کے ماں باپ یا بہن بھائی ہوں تو چونکہ وہ عرفاً آتے جاتے ہیں لہٰذا اگر شوہر نے ان کو اپنے گھر آنے سے منع نہیں کیا ہے وہ بغیر اجازت کے جاسکتے ہیں مگر دوسرے رشتہ داروں کے لئے اجازت لازمی ہے، پھر اگر شوہر نے عورت کے ماں باپ کو گھر میں آنے سے روک دیا تو وہ اپنی بیوی کو اپنے ماں باپ سے ملاقات کی ممانعت نہیں کرسکتا۔

باب ماجاء في تحذير فتنة النساء

(عورتوں کے فتنہ سے خبردار کرنے کا بیان)

"عن اسامة بن زيد وسعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ماتركتُ بعدي في الناس فتنةً أَضرَّ على الرجال من النساء". (حسن صحيح)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے پیچھے مردوں کے حق میں عورتوں سے بڑھ کر کوئی ضرر رساں فتنہ نہیں چھوڑا ہے۔

تشریح:۔قوله: "ماتركت بعدي" ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال فرمایا کہ وصال یقینی امر تھا جس کو عندالبلغاء ماضی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔قوله: "فتنةً" یعنی امتحان اور آزمائش پھر "بعدی" میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ آنحضورؐ کے وجودِ میمون کی وجہ سے یہ فتنہ سر نہیں اٹھا سکتا تھا مگر آپ کے بعد میں ایسا ہوا۔

پھر عورت کا فتنہ ضرر رساں ہونے کا مطلب دین وتقویٰ کے لئے تباہ کن ہونا ہے چونکہ عورت ایک بنیادی ضرورت بھی ہے اور ہر دلعزیز مخلوق بھی ہے دوسری طرف عورت میں عقل ودین کی کمی کا تقاضا ہے کہ دنیوی امور کی جانب میلان ہو اور آخرت کی فکر سے بے نیازی ہو اسی بناء پر وہ اپنے شوہر اور عاشق وغیرہ کو خسیس امور پر اُکساتی ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق اسے گندے اور بیہودہ مشورے دیتی ہے، مرد اس کی محبت کی وجہ سے اس کے جال میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے اگر یہ صورت حال کہیں کہیں نظر آجائے تو اس سے خاندانی نظام ودین تو متاثر ہوجاتا ہے مگر پورا معاشرہ اس وقت بگڑے گا جب من حیث الامت پوری مسلم آبادی اس فتنہ میں مبتلا ہوگی حدیث میں اسی ہولناک منظر کی طرف اشارہ بلکہ تصریح ہے اور مرد کو تنبیہ ہے کہ وہ اپنی عقل کو مستحکم رکھنے کی کوشش کرے، کہیں بے وقوفی کا مرتکب نہ ہوجائے کہ اس کی حیثیت معاشرہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے اگر

اسے بیماری لاحق ہو جائے تو پھر معاشرہ کے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة اتخاذ القُصَّة

(بالوں میں بالوں کا گچھا شامل کرنا مکروہ ہے)

"حميدبن عبدالرحمن انه سمع معاوية خطب بالمدينة يقول: اين عُلماءُ كم؟ يااهل المدينة! سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهىٰ عن هذه القُصّة ويقول: انماهَلكت بنو اسرائيل حين اِتخذهانساءُ هُم". (حسن صحيح)

حُمید بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ سے سُنا ہے وہ (معاویہؓ) مدینہ میں خطاب فرمارہے تھے آپؓ نے فرمایا اے مدینہ والو! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ (تاکہ تمہیں روکیں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گچھے (کے استعمال) سے منع کرتے ہوئے سُنا ہے اور یہ کہ آپؐ نے فرمایا بنی اسرائیل کی اس وقت تباہی آگئی جب ان کی عورتوں نے ان گچھوں کا استعمال کرنا شروع کیا۔

تشریح:۔ **قولہ: "قُصہ"** بضم القاف وتشدید الصاد بالوں کا گچھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب حضرت امیر معاویہؓ ۵۱ھ میں حج کر کے واپس شام جارہے تھے اور مدینہ میں قیام کیا تھا یہ آپؓ کا آخری حج تھا، انہوں نے یہ تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر منور پر کی تھی اور اس میں بالوں کے ملانے کے متعلق مذکورہ مرفوع حدیث بیان فرمائی۔ اس میں این علماء کم؟ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ علماء اپنی ذمہ داری (نہی عن المنکر) کو کیوں ادا نہیں کررہے ہیں؟ تاہم علماء کی طرف سے یہ عذر ہوسکتا ہے کہ یا تو ان کے علم میں یہ بات آئی نہیں ہوگی کہ مسلمان عورتیں اس طرح کی حرکت کرتی ہیں چنانچہ ایک روایت کے مطابق حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میں نے یہ گچھا اپنے خاندان کی ایک عورت کے پاس دیکھا اور اس نے مجھے بتایا کہ دوسری عورتیں بھی ایسا کرتی ہیں جیسا کہ حاشیہ کوکب میں بحوالہ طبرانی منقول ہے: **"قال وجدتُ هذه عنداهلي وزعموا ان النساء يَزِدنَه في شعورهن"** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل ابھی تک فروغ نہیں پاچکا تھا یا پھر اگر یہ مشہور ومعروف تھا تو علماء نے بنوامیہ کے بعض حکمرانوں کے خوف سے خود کو معذور سمجھا ہوگا کہ بنوامیہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں ہم پر حکومت وخلافت میں مداخلت کا الزام لگا کر ظلم وجبر نہ کریں، اور سب سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس وقت اسلامی حکومت اور خلافت موجود تھی اس لئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی

ذمہ داری حکومت کی تھی، ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ ارکان خلافت نے اپنی ذمہ داری کو نظر انداز کیا ہو اس لئے علماء کے آگے آنے کی چنداں ضرورت نہ تھی حضرت معاویہؓ کا یہ خطاب علماء کو آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ اب آپ کے آگے آنے کا وقت قریب ہے کہ حکمرانوں کی اکثریت اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے لگی ہے چونکہ شام میں تو حضرت امیر معاویہؓ براہ راست دیکھ بھال کرتے تھے اس لئے وہاں کے بازاروں اور معاشرے میں یہ چیز نہیں تھی جبکہ مدینہ کی شام (دار الخلافہ) سے دوری کی وجہ سے صورت حال بدلی ہوئی نظر آئی تھی اس لئے تنبیہ کی ضرورت پیش آئی اس میں ارباب اختیار کے لئے بھی انتباہ ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علماء نے عورتوں کو منع کرنے کی کوشش کی ہوگی مگر شہر کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں مختلف النوع لوگوں کا ہونا غیر معمولی بات نہیں تو ممکن ہے کہ یہ کام باہر سے آنے والی عورتیں کرتی ہوں۔

پھر آپؐ نے اس کی علت بتائی کہ بنی اسرائیل کی ہلاکت اس عمل میں لگنے کے بعد آئی کہ ان کی عورتیں بالوں میں بال ملایا کرتی تھیں، چونکہ اس سے عورت کے بالوں کا حسن بڑھ جاتا ہے اس لئے عورت کا ایسا کرنے سے اس کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے اور فتنہ شدید تر ہوجاتا ہے۔

غرض اس حدیث کی وجہ سے بالوں میں انسانی بال ملانا مکروہ ہے اگر غیر انسانی بال یا پلاسٹکی بال ہوں تو اگرچہ بذات خود یہ عمل جائز ہے مگر تزئین کرکے اگر عورت باہر نکلتی ہے تو یہ بعلتِ معاشرہ بگاڑنے کے ناجائز ہوگا گھر کے اندر شوہر کی رضامندی سے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ہدایہ میں ہے:

"ولا یجوز بیع شعور الانسان ولا الانتفاع بہ لان الآدمی مُکرَّم لامبتذل...... وقد قال علیہ السلام لعن اللہ الواصلة والمستوصلة الحدیث وانما یُرَخَّصُ فیمایُتَّخَذُ من الوبر (اونٹ وغیرہ کی پشم اور بال) فیزید فی قرون النساء وذوائبهن". (ہدایہ: ص: ۴۳ جلد: سوم "باب البیع الفاسد")

واصلہ اور مستوصلہ کے بارے میں اگلا باب آرہا ہے۔

باب ماجاء فی الواصلة والمستوصلة والواشمة والمُستوشمة

(بالوں میں بال پیوست کرنے والی اور کروانے والی، گودنے والی اور گدوانے والی کا بیان)

"عن عبداللہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن الواشمات والمستوشمات والمُتنَمِّصات مُبتغیاتٍ لِلحُسن مُغَیِّراتِ خَلقَ اللّٰہ". (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے گودنے والی عورتوں پر اور بدن گدوانے والیوں پر اور بناؤ سنگھار کی غرض سے چہرے کے بال صاف کرنے والی عورتوں پر جو اللہ کے طرز پیدائش کو تبدیل کرنے والی ہیں۔

تشریح:۔ باب کی اگلی روایت جو حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے اس میں الواصلة والمستوصلة کا اضافہ ہے پس واشمہ وہ عورت ہے جو بدن کے کسی حصہ کو سوئی سے گود کر اس پر نیل چھڑک دے۔ مستوشمہ: جو کسی سے یہ کام کروائے۔ "وشم" بدن کے کسی بھی حصہ میں گودنے کا نام ہے مگر حضرت نافع فرماتے ہیں کہ الوشم فی اللِّثَةِ یعنی وشم مسوڑے میں ہوتا ہے شاید یہ اس زمانے کی عورتوں کا دستور تھا آج کل عورتیں چہرے میں اور مرد ہاتھ پر کرتے ہیں۔ واصلہ: بال شامل کرنے والی اور مستوصلہ کروانے والی، وصل سے ہے بمعنی پیوست کرنے اور جوڑنے کے ہے، جبکہ مُتنَمِّصَہ دھاگے سے پیشانی اور چہرے کے بال اُکھاڑنے والی کو کہتے ہیں۔ آج کل بیوٹی پالر والے اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ بعض حضرات نے متنمصہ اس عورت کو کہا ہے جو دانتوں کو سوہن کر کے باریک بناتی ہے۔ بہر حال یہ تمام حرکتیں حرام ہیں کہ ایک تو ان میں فریب اور دھوکا ہے دوم ان میں تغییر لخلق اللہ ہے البتہ کوئی زائد بدنما چیز بدن پر رونما ہو جائے جیسے عورت کی ڈاڑھی نکلے یا مونچھیں یا کوئی زائد دانت جس سے تکلیف محسوس ہوتی ہو تو اس کا ازالہ جائز ہے۔ پھر ان امور میں مستقل وغیر مستقل کا بھی تھوڑا سا فرق ہے جو ابواب اللباس میں گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات: ص:۵۶۸ ج:۵ "باب ماجاء فی مواصلة الشعر")

باب ماجاء فی المُتَشَبِّهات بالرجال من النساء

(مردوزن کاایک دوسرے کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے)

"عن ابن عباس قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم :المُتَشَبِّهات بالرجال من النساء والمُتَشَبِّهِينَ بالنساء من الرجال". (حسن صحيح)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت بھیجی ہے۔

حدیث آخر:۔"لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المُخَنِّثِينَ من الرجال والمُتَرَجِّلات من النساء". (حسن صحيح)

یہ روایت بھی ابن عباسؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے زنانہ پن اختیار کرنے والے مردوں پر اور مردانہ پن اپنانے والی عورتوں پر۔

تشریح:۔ چونکہ باب تَفَعُّل کی خاصیت تکلف کرنا ہے اس لئے تَشَبُّہ، تَخَنُّث اور تَرَجُّل کے معنی بتکلف اپنی صنف وصورت میں تبدیلی لانا ہوئے پھر مُخَنَّث اگر بفتح النون ہوتو اس سے مراد وہ مرد ہوتا ہے جس سے عورتوں کی طرح مجامعت یعنی لواطت کی جاتی ہو، یہ بھی اگرچہ گناہ کبیرہ ہے مگر یہاں روایت بکسر النون مُخَنِّث ہے یعنی جو شخص عورتوں کی طرح حرکات وسکنات اختیار کرے اگر یہ وصف خلقی اور پیدائشی ہوتو اگرچہ عرفاً یہ عیب میں شمار ہوتا ہے مگر غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے اس سے کوئی گناہ لازم نہیں آتا جیسے آدمی مرد ہو لیکن اس کی باتوں میں نزاکت ہو یا اعضاء میں نرمی ہو یا اس کی چھاتیاں ہوں وغیرہ ایسے شخص کو خُنثیٰ یعنی ہیجڑا کہا جاتا ہے، مذموم صورت یہ ہے کہ آدمی جان بُوجھ کر خود کو ہیجڑا بنالے یعنی بتکلف عورتوں کی مشابہت اختیار کرے اور یہاں یہی مراد ہے ایسا آدمی بموجب حدیث ملعون ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت مردانہ جسمانی صفات اختیار کرے خواہ لباس میں ہو یا بول چال میں ہو ہر صورت میں معیوب اور موجب لعن ہے اس سے توبہ کرنا لازم ہے کیونکہ صِنف اور صِفت کو تبدیل کرنا بھی ایک گونہ تغییر لخلق اللہ ہے البتہ مَلَکاتِ فاضلہ حاصل کرنا معیوب اور مذموم نہیں جیسے کوئی عورت علم اور رائے میں مردوں کے ہمسر ہونے کی کوشش کرے تو یہ ہرگز مذموم نہیں کیونکہ ملکات فاضلہ کسی ایک صِنف کے ساتھ مختص نہیں

اگرچہ رائے کی پختگی مردوں میں عام ہیں لیکن عورتوں کے لئے ممنوع نہیں۔

بہرحال اگر کسی شخص میں دوسری صنف کی صفات خلقی اور پیدائشی پائی جاتی ہوں تو اسے بتکلف ختم کرنا چاہئے لیکن اپنے اختیار سے دوسری صنف کی صفاتِ مختصہ کسی طرح اپنانا جائز نہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة خروج المرأة مُتَعَطِّرةً

(عورت کے لئے خوشبو لگا کر گھر سے نکلنا جائز نہیں)

"عن ابی موسیٰ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: کل عین زانیة والمرأة اذا استعطرت فَمَرّت بالمجلس فهی کذاو کذایعنی زانیة". (حسن صحیح)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ہر آنکھ (جو عورتوں کو دیکھے) زنا کرنے والی ہے اور جب عورت خوشبو لگا کر (گھر سے نکلے اور) کسی مجلس سے گذرے تو وہ ایسی ایسی ہے یعنی زنا کار ہے۔

تشریح:۔ جیسا کہ اگلے باب میں آرہا ہے کہ عورتوں کی خوشبو میں مہک ونکہت نہیں ہونی چاہئے صرف رنگ کی حد تک اسے زینت کے استعمال کی اجازت ہے ہاں گھر میں شوہر کے لئے کوئی بھی خوشبو استعمال کرسکتی ہے لیکن خوشبودار اور مُعَطَّرہ ہوکر جب عورت گھر سے نکلے گی اور کسی ایسی مجلس پر سے گذرے گی جہاں مرد بیٹھے ہوں تو وہ زانیہ ہے کیونکہ زنا کا مطلب نامحرم عورت سے لطف اندوز ہونا ہے اور چونکہ خوشبو سے دماغ میں شادمانی اور نفس میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اس لئے ایسی عورت سے لوگ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اس لئے وہ زانیہ ٹھہری اسی بناء پر آنکھ کو بھی زانیہ کہا کیونکہ جب آنکھ عورت کو دیکھتی ہے تو اسے لطف حاصل ہوتا ہے اور لذت محسوس ہوتی ہے تو یہ بھی زنا ہوا گو چھوٹے پیمانے پر ہی سہی۔

نیز جو عورت باہر جانے کے لئے مردوں کی رغبت کا سامان کرتی ہے تو یہ اس کی بدباطنی اور شوق زنا کا آئینہ دار ہے اس لئے یہ اس کے زنا کار ہونے کی نشانی ہے ہاں شوق اور خواہش میں تفاوت درجات ضرور ہوتا ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی طِیب الرجال والنساء

(مردوں اور عورتوں کی خوشبوؤں کا بیان)

"عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :طِیب الرجال ماظَھَرَ رِیحُہ وخفی لونہ وطیب النساء ماظھرلونہ وخفی ریحہ". (حسن)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کی خوشبو وہ ہے جس کی بُو ظاہر ہو اور اس کا رنگ چُھپا ہوا ہو، اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ ظاہر ہو اور اس کی بُو پوشیدہ ہو۔

حدیث آخر:۔ "اِنَّ خیرطِیب الرجال ماظھرریحہ وخفی لونہ وخیرطِیب النساء ماظھرلونہ وخفی ریحہ ونَھیٰ عن المِیثرۃالأرجُوان". (حسن غریب)

مردوں کی اچھی خوشبو وہ ہے جس کی مہک ظاہر ہو اور رنگ خُفیہ ہو اور عورتوں کی بہتر خوشبو وہ ہے جس کا رنگ ظاہر ہو اور اس کی بُو چھپی ہوئی ہو اور آپؐ نے سُرخ زین پوش سے منع فرمایا ہے۔

تشریح:۔ باب کی دونوں حدیثوں سے مرد اور عورت کی خوشبوؤں میں فرق معلوم ہوا اور یہ فرق و تقسیم ان کے مناسب حال کے اعتبار سے ہے کہ عورت کے ساتھ زینت مناسب ہے لیکن شہرت حجاب کے منافی ہے۔ اس لئے وہ زینت ضرور اختیار کرسکتی ہے لیکن گھر کے اندر۔ باہر جانے کے لئے حجاب لازمی ہے اور خوشبو حجاب کے فائدہ اور غرض کا ازالہ کرتی ہے جبکہ مرد مسجد اور جماعات ومجالس میں شرکت کرتے ہیں تو ان کے لئے خوشبو مناسب ہے اور رنگین زینت نسوانی وصف ہے جو مردانہ وصف سے مختلف ہے۔

قولہ:"عن المیثرۃ الأرجُوَان" بکسرالمیم اس کے متعلق بحث ابواب اللباس تشریحات ج:۵ ص:۵۷۰ پر گذری ہے، وہ سرخ کپڑا جو زین کے اوپر بچھایا جاتا تھا جبکہ "اُرجُوان" بضم الھمزہ والجیم گہرے سُرخ کو کہتے ہیں علی ہذا اس کا ذکر بعد المیثرہ مبالغہ کے لئے ہے جیسے "وغَرابِیبُ سُود" (سورۂ فاطر آیت:۲۷) جولوگ سرخ رنگ کے استعمال کو مکروہ کہتے ہیں ان کے نزدیک تو کسی دوسری علت کی ضرورت نہیں لیکن جن کے نزدیک سرخ رنگ کا استعمال جائز ہے وہ یہاں دوسری علتوں کی بناء پر کراہیت کا قول بیان کرتے ہیں مثلاً یہ ریشمی کپڑا ہوتا تھا یا تَنَعُّم کی وجہ سے یا تشبہ بالاعاجم یا اسراف کی وجہ سے یا چونکہ یہ زین پوش درندوں کی کھالوں سے بنائے جاتے تھے وغیرہ وغیرہ مگر آسان بات یہ ہے کہ آپؐ نے اس قسم کے تکلفات کی عادت ومعمول بنانے

سے منع کیا ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة ردّالطیب

(خوشبوقبول نہ کرنا مکروہ ہے)

”عن ثمامة بن عبدالله قال كان انس لَايَرُدُّ الطِيبَ وقال انسؓ ان النبی صلی الله علیه وسلم كان لايردالطيب“. (حسن صحیح)

حضرت ثمامہ بن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ خوشبومسترد نہیں کرتے تھے اور حضرت انسؓ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (بھی) خوشبو لینے سے انکار نہیں تھے۔

حدیث آخر:۔”عن ابن عمر قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :ثلاث لَاتُرَدُّ (۱)الوَسَائِد(۲) والدهن(۳) واللبن“. (غریب)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کو لینے سے انکار نہیں کرنا چاہئے: (۱) تکیہ (۲) تیل (خوشبو) (۳) دودھ۔

حدیث آخر:۔”اذااُعطِیَ احدُکم الرَیحَانَ فلایَرُدّه فانه خرج من الجنة“. (غریب حسن)

جب تم میں سے کسی کو خوشبو دی جائے تو وہ اسے لینے سے انکار نہ کرے کیونکہ وہ جنت سے نکلی ہے۔

تشریح:۔ باب کی آخری یعنی تیسری روایت ابوعثمان نہدی سے مروی ہے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن مُلِّ ہے۔ یہ آپؐ کے زمانہ میں تھے مگر آپؐ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ایسے شخص کو مُخضَرَم کہا جاتا ہے لہٰذا روایت مرسل ہے علی ہذا امام ترمذیؒ کا اس کو حسن کہنا محل نظر ہے، یا تسامح پر محمول ہے۔ ان احادیث میں خوشبو، تکیہ اور دودھ قبول کرنے کی ترغیب بیان ہوئی ہے، پہلی حدیث میں خوشبو کے لئے طیب کا لفظ استعمال ہوا ہے دوسری میں دُھن کا اور تیسری میں ریحان کا جو دراصل پودا ہوتا ہے جیسے گلاب اور چنبیلی وغیرہ کا پھول۔ جہاں تک دھن کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق اگرچہ عام تیل پر ہوتا ہے مگر یہاں مراد عطر ہے یعنی ذکر عام والمراد منہ الخاص اس کو عموم پر حمل کرنا بھی صحیح ہے۔

بہرحال ان اشیاء کو قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ دوسرے کا اکرام کیا جاتا ہے اور اکرام

کرنے والے یعنی ہدیہ دینے والے پر کوئی خاص بوجھ بھی نہیں پڑتا، کیونکہ خوشبو کا استعمال عربوں میں زیادہ ہوتا تھا اور دودھ بھی عام ہوا کرتا تھا جبکہ تکیہ تو وقتی طور پر استعمال کے لئے دیا جاتا ہے لہٰذا اسے رد کرنے سے، دینے والے کے دل میں تکدر پیدا ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے، کیونکہ عربوں پر سخاوت اور اکرام کا غلبہ ہے وہ ہدیہ رد کرنے کو بُرا مانتے ہیں، ہاں کوئی قیمتی ہدیہ ہو تو چونکہ اس کا بدلہ دینا مشکل محسوس ہوتا ہے اس لئے اس کے نہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم

قولہ: "فانہ خرَجَ من الجنة" چونکہ تمام عمدہ اور نفیس اشیاء کی اصل تو جنت میں ہے دنیا میں ان اشیاء کے نمونے موجود ہیں اس لئے کسی بھی عمدہ چیز کو جنت کی طرف منسوب کرنے سے اس کی عمدگی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی کراهیة مباشرة الرجلِ الرجلَ والمرأةِ المرأةَ

(بے حجابانہ اختلاط کی کراہیت کا بیان)

"عن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لاتباشر المرأةُ المرأةَ حتیٰ تَصِفَهَا لزوجها کانه ینظر الیها". (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت سے بے حجاب بدن نہ لگائے یہاں تک کہ پھر اس کا خال اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرے گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

تشریح:۔ مباشرت بَشَرۃ سے مشتق ہے ننگے بدن اور جسم کو ننگے جسم سے ملانے کو کہتے ہیں۔ نسائی میں ہے کہ ایک کپڑے میں دونوں مباشرت نہ کریں یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ایک ننگی عورت دوسری ننگی عورت کے ساتھ ایک چادر وغیرہ میں لیٹ جائے اور بالخصوص اس کا تذکرہ بھی اپنے شوہر کے سامنے نہ کرے کیونکہ شوہر کے ذہن میں وہ خیالی منظر آجائے گا جس سے فتنہ کا اندیشہ ہے بلکہ اس خیالی منظر کا تصور بذاتِ خود ایک فتنہ ہے چونکہ جسم کی حرارت سے شہوت وخواہش میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ حضرت لوطؑ کی قوم کی عورتیں

ایک دوسرے سے چپٹی بازی کیا کرتی تھیں اس لئے بھی ایک عورت دوسری کے ساتھ بلا حائل نہ ملے تاکہ بدن کی حرارت محسوس نہ ہو پھر یہ علت مردوں میں بوجہ اتم پائی جاتی ہے اس لئے دو مردوں کا ایک ساتھ برہنہ ہو کر لیٹنا یا ملنا بطریق اولیٰ حرام ہوا جیسا کہ اگلی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

حدیث آخر:۔"لاینظر الرجل الی عورة الرجل ولاتنظر المرأة الی عورة المرأة ولایُفضِی الرجل الی الرجل فی الثوب الواحد ولاتفضی المرأة الی المرأة فی الثوب الواحد".(حسن غریب)

ایک آدمی دوسرے آدمی کے ستر کو نہ دیکھے اور کوئی عورت دوسری عورت کے ستر کو نہ دیکھے اور ایک آدمی دوسرے آدمی سے ایک ہی کپڑے کے اندر نہ لگے (یعنی نہ ملے) اور کوئی عورت دوسری عورت سے ایک ہی کپڑے میں نہ ملے۔

قوله:"لایُفضِی"، بضم الیاء الاولیٰ ای لایصل، یعنی نہ تو کسی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھے خواہ ایک ہی جنس سے ہوں یا الگ الگ جنس سے ہوں اور نہ کسی کے لئے یہ رَوا ہے کہ وہ ایک ہی کپڑے میں برہنہ حالت میں دوسرے سے جسم ملائے البتہ اگرچہ یہ کام کسی طرح جائز نہیں تاہم دو مردوں اور دو عورتوں کا ایک دوسرے کو دیکھنا نسبۃً کم درجہ کا حرام ہے کیونکہ جنس ایک ہے جبکہ مخالف جنس والے کو دیکھنا سخت حرام ہے اور عقلی قباحت بھی شدید تر ہے اور چونکہ بات جسموں کی ہو رہی ہے اس لئے مرد کا مرد سے مصافحہ اور عورت کا عورت سے مصافحہ کرنا اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس میں کسی ممنوع کا ارتکاب نہیں ہوتا، اسی طرح اگر ضرورت ہو جائے جیسے ڈاکٹر کا آپریشن کی غرض سے دیکھنا تو وہ بھی بقدر ضرورت جائز ہے، نیز زوجین بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ متن ہدایہ میں ہے:

> **"ویجوز للطبیب ان ینظر الی موضع المرض منها(المرأة)للضرورة وینبغی ان یُعَلِّمَ اِمرأة مُداواتَهَا...وکذایجوز للرجال النظر الی موضع الاحتقان منِ الرجال ...وینظر الرجل من الرجل الی جمیع بدنه اِلّامابین سُرّته الی رکبتیه ...ومایباح النظر الیه للرجال من الرجل یُباح المس"...ویجوز للمرأة ان تنظر من الرجل الی ماینظر الرجل الیه منه اذاامنت الشهوة...وتنظر المرأة من المرأة الی مایجوز للرجل ان ینظر الیه من**

الرجل". (کتاب الکراھیۃ: ص:۳۹۰، ۳۹۱ ج:۴)

باب ماجاء فی حفظ العورة

اس باب کی حدیث مع ترجمہ حدیث اور ترجمۃ الباب پندرہ باب پہلے گذرا ہے فلیراجع باب ماجاء فی حفظ العورة قوله: فَلا تُرِیَنَّهَا اپنا ستر کسی کو مت دکھا۔

باب ماجاء ان الفخذ عورة

(ران ستر میں داخل ہے)

"عن جَرهدٍ قال مرّالنبی صلی الله علیه وسلم بِجرهدفی المسجدوقدانکشف فخذه فقال: "ان الفخذ عورة". (حسن)

حضرت جرہدؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد (نبوی) میں جرہد (راوی جو اصحاب صفہ میں سے ہیں) کے پاس سے گذرے جبکہ ان کی ران کھلی ہوئی تھی پس آپؐ نے فرمایا ران (بھی) ستر (میں سے) ہے۔

تشریح:۔ اگلی حدیث کے الفاظ ذرا مختلف ہیں اس میں ہے کہ آپؐ نے ان سے فرمایا: "غطِّ فَخِذَکَ فانهامن العورة" اپنی ران چھپاؤ کہ یہ ستر میں سے ہے، اس باب میں آخری روایت حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: " الفخذ عورة"۔ ران اور اسی طرح گھٹنے کے بارے میں متعدد روایات ان کے ستر کا حصہ ہونے پر ناطق ہیں تاہم ان روایات میں ضعف بھی پایا جاتا ہے، جمہور حنفیہ کے نزدیک ناف سے گھٹنوں تک کا پورا حصہ ستر ہے البتہ ناف اس میں شامل نہیں تاہم روایات کے درجات کو اور بنیادی اصول کو دیکھتے ہوئے ان کی حدبندی اس طرح کی گئی ہے کہ شرمگاہ یعنی قُبُل و دُبُر تو عورت غلیظہ ہیں اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں جبکہ ران ہمارے حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک بھی ستر میں شمار ہوتی ہے مگر اس کا درجہ قُبُل و دُبُر سے نسبۃً ہلکا ہے جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک یہ ستر میں شامل نہیں البتہ اس کا ڈھانکنا مستحب ہے جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے۔ امام احمدؒ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے اور اہل ظاہر بھی ران کو عورت نہیں مانتے، جبکہ گھٹنے کے ستر ہونے کا ائمہ ثلاثہ میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بھی ستر کا حصہ ہے کیونکہ ایک تو یہ ران کا حصہ ہے لہٰذا اس پر ران کا حکم جاری ہوگا دوسرے اس کے بارے میں بھی روایات آئی

ہیں لہٰذا احتیاط کی بناء پر اس کو بھی ستر کا حصہ شمار کیا جانا چاہئے البتہ اس کا درجہ تیسرے نمبر پر ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے:

"وينظر الرجل من الرجل الى جميع بدنه اِلّا اِلىٰ مابين سُرّته الى رُكبتيه ....وفيه....وحكم العورة فى الركبة اخف منه فى الفخذ،وفى الفخذ اَخفُّ منه فى السوءَ ةِ حتىٰ ان كاشف الركبة ينكرعليه بِرِفق و كاشف الفخذيُعْنَفُ عليه و كاشف السوء ة يُؤدّب اِن لَجّ".

(کتاب الکراھیۃ: ص:۳۹۰ ج:۴)

یعنی گھٹنے کھولنے والے کو نرمی سے سمجھایا جائے گا کہ ڈھانک لو جبکہ ران کھولنے والے کو سختی سے ڈانٹا جائے گا یعنی سرزنش کی جائے گی مگر مارا نہیں جائے گا مگر شرمگاہ ظاہر کرنے والے کی تادیب ضرب وغیرہ سے کی جائے گی اگر وہ ضد و اصرار کرے کھلا رکھنے پر۔

ہمارا استدلال باب کی احادیث اوران احادیث سے ہے جن کی طرف امام ترمذیؒ نے وفی الباب عن علیؓ الخ کہہ کر اشارہ کیا ہے، امام قاضی شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں اور امام نوویؒ وحافظ ابن حجرؒ نے اِن احادیث کے مجموعہ کو قابل حجت قرار دیا ہے، امام بخاریؒ نے دونوں قسم کی احادیث پر مختصر مگر جامع تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سند کے لحاظ سے حضرت انسؓ کی حدیث قوی ہے مگر احتیاط کی رُو سے حضرت جرہدؓ کی حدیث (باب) وزنی ہے ولفظہ:

"وَيُروى عن ابن عباس وجرهدومحمدبن جحش عن النبى صلى الله عليه وسلم :الفخذ عورة وقال انس حَسَرَ النبى صلى الله عليه وسلم عن فخذه قال ابوعبد الله وحديث انس اَسنَدُ وحديث جرهداَحوَطُ حتىٰ نخرج من اختلافهم". (ص:۵۳ ج:۱ "باب مایذکر فی الفخذ")

خلاصہ یہ ہے کہ باب کی روایات محرم وقولی ہیں جبکہ حضرت انسؓ کی حدیث کہ میں نے خیبر کی گلی، کوچے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ران کا بیاض دیکھا تھا واقعہ حال اور فعلی حدیث ہے قاعدہ باب کی حدیث میں بیان ہوا ہے لہٰذا یہ راجح ہوگئی، اسی طرح ایک روایت حضرت عائشہؓ سے بھی مروی ہے کہ آپؐ کی ران کھلی ہوئی تھی اس کے باوجود آپؐ نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو اندر آنے کی اجازت دے دی تھی، یہ بھی واقعہ حال ہے۔

باب ماجاء فی النظافة

(صفائی ستھرائی کا بیان)

"عن صالح بن ابی حسّان قال سمعتُ سعیدبن المسیّب یقول: ان الله طیّب یُحِبُّ الطِّیبَ، نظِیف یُحِبُّ النظافة، کریم یُحِبُّ الکرم، جَوّادٌیُحب الجُود، فَنَظِّفُوا اُراہ قال اَفنِیَتِکم ولاتشبّھُوا بالیهود قال فذکرتُ ذالک الخ". (غریب وخالدبن الیاس یُضَعَّفُ)

صالح بن ابی حسّان کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیّب کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے، نظیف (ستھرا) ہے نظافت (ستھرائی) کو دوست رکھتا ہے، کریم (فیاض) ہے کرم (فیاضی) کو محبوب رکھتا ہے جواد ہے، سخاوت کو پسند کرتا ہے، پس تم صاف ستھرا رکھو! (راوی صالح کہتے ہیں) میرا گمان ہے کہ فرمایا (سعید بن المسیب نے) اپنے آنگنوں (صحنوں) کو اور یہود کی مشابہت نہ کرو!

تشریح:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء حُسنیٰ سب توقیفی ہیں شریعت میں جونام منصوص ہو، صرف اسی کے اطلاق کی اجازت ہے یا دوسری زبانوں میں اس کے ہم معنی الفاظ کی، مگر چونکہ عام لغات میں وہ جامعیت نہیں پائی جاتی جو عربی میں ہے اس لئے اوپر ترجمہ میں وہی الفاظ نقل کرنا ہی مناسب سمجھا گیا ورنہ تو بعض لوگ جواد کا ترجمہ "سخی" سے کرتے ہیں مگر یہ غلطی ہے کیونکہ سخاوت کا مفہوم بہت محدود ہے۔ قولہ: "یُحِبُّ الطِّیبَ" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو اچھی حالت پسند ہے، جو بندہ صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا ہے اور اہتمام کرتا ہے تو وہ اللہ کو پسند ہے کیونکہ انسان کا ظاہر اس کے باطن پر اثر انداز ہوتا ہے وبالعکس، یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کو خوشبو سونگھنا پسند ہے کیونکہ یہ تو صفات جسمانی میں سے ہے جبکہ اللہ اس سے پاک ہے۔ اسماء حُسنیٰ کے لئے امام ترمذیؒ نے ابواب الدعوات میں مستقل باب ذکر کیا ہے، یہاں صرف اتنی سی بات عرض ہے کہ اس حدیث کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ ہر قسم کے عیوب سے پاک اور منزہ ہے یہ مضمون نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے اور اس پر انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمم کا اجماع ہے۔ حدیث باب میں خالد بن الیاس اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس سے حدیث کے شروع حصہ کے اوپر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ متواتر ہے۔ قولہ: "افنیتکم" فِناء کی جمع ہے گھر کے سامنے والی جگہ کو کہتے ہیں چونکہ یہود جانور پالتے اور ان کو گھروں کے باہر باندھتے اور گھروں کا کوڑا کرکٹ بھی وہیں پھینکتے تھے جو ایک طرف ان کے خبث باطن کا آئینہ دار ہے دوسری طرف بخل کا عکاس ہے

لہٰذا تم اپنے گھروں اور ہر چیز کو صاف رکھو تاکہ مہمانوں کی آمد جاری رہے۔

باب ماجاء فی الاِستِتار عند الجماع

(ہم بستری کے وقت پردے کا اہتمام)

"عن ابن عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: اِیّاکم والتعرّی فان معکم من لایفارقکم اِلّا عندالغائط وحین یُفضی الرجل الی اهله فاستحیوهم واکرموهم". (غریب)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بچو تم برہنگی سے اس لئے کہ تمہارے ساتھ وہ لوگ (فرشتے) ہیں جو تم سے جُدا نہیں ہوتے مگر بڑے استنجے کے وقت اور جب آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرتا ہے پس تم ان سے حیاء کرو اور ان کی تعظیم کرو!

تشریح:۔ اس حدیث میں ضرورت کے علاوہ کسی بھی موقع پر ستر کھولنے کی ممانعت بیان کی گئی ہے کیونکہ اگر کہیں پر آدمی نہ ہوں تو فرشتے تو ہوتے ہیں جن کو برہنہ آدمی سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور یہ کام ان کی تعظیم اور شان کے بھی منافی ہے اس لئے ان کا خیال رکھنا اور اکرام کرنا ضروری ہے اور ان سے شرمانا بھی چاہئے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ فرشتوں کے علاوہ اہل ایمان جنات بھی خوراک کی تلاش میں گھروں میں آتے رہتے ہیں: "فان الملائکة تکتب وتحفظ والمؤمنون من الجن یطلبون الزادالخ" غرض حفظہ اور کرام کاتبین ہر دو قسم کے فرشتے مراد ہیں وہ مزید لکھتے ہیں کہ ابن عمرؓ بلی کی گھر میں موجودگی کے وقت بھی بیوی سے جماع نہ کرتے۔ جہاں تک ضرورت کے مواقع کا تعلق ہے تو ان صورتوں میں اگرچہ برہنہ ہونا جائز ہے مگر اس میں بقدر ضرورت برہنہ ہونے پر اکتفاء کرنا چاہئے چنانچہ ایک روایت میں اونٹوں کی طرح ملنے سے ممانعت آئی ہے۔

باب ماجاء فی دخول الحمام

(حمام میں جانے (اور نہانے) کا بیان)

"عن جابرؓ ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: من کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلایُدخِل حلیلته الحَمّام ومن کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلایدخُلِ الحمام بغیرازارومن

کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلایجلس علی مائدۃ یُدار علیھم الخمر". (حسن غریب)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنی بیوی کو حمام میں نہ لے جائے اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیا پر ایمان رکھتا ہو تو وہ حمام میں بغیر تہ بند (لنگی) کے نہ جائے، اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ا ہو وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جس (کے شرکاء) میں شراب کا دور چل رہا ہو۔

حدیث آخر:۔"عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ الرجال والنساء عن الحمامات ثم رَخّصَ للرجال فی المیازر". (ھذاحدیث ... واسنادہ لیس بذالک القائم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (پہلے) مردوں اور عورتوں کو حماموں میں جانے سے منع کیا تھا، پھر مردوں کو تہ تہبند باندھ کر جانے کی اجازت دی۔

حدیث آخر:۔"عن ابی الملیح الھذلی ان نِساءً من اھل حمص اومن اھل الشام دخلن علی عائشۃ فقالت: انتُنّ اللاتی یدخلن نساء کن الحمامات؟ سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: مامن اِمرأۃ تضع ثیابھافی غیر بیت زوجھااِلّاھتکتِ السترَ بینھاوبین ربھا". (حسن)

ابوالملیح ھذلیؒ فرماتے ہیں کہ حمص یا شام کی کچھ عورتیں حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا تم وہی ہو کہ تمہاری عورتیں حماموں میں (نہانے) جاتی ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو بھی عورت اپنے شوہر کے گھر کے علاوہ کہیں اپنے کپڑے اتار دے تو وہ پھاڑ دیتی ہے وہ پردہ جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہے۔

تشریح:۔باب کی تمام احادیث سے حمام کی مذمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ وہاں لوگ پردے کے اہتمام کے بغیر اجتماعی غسل کرتے تھے ایسے میں تو مردوں کے لئے بھی وہاں جانا جائز نہیں چہ جائے کہ وہاں عورتیں جائیں خصوصاً جب عورت بذات خود بھی پردے کا التزام نہ کرے، یہ ممانعت ان حماموں کے بارے میں ہے جہاں تالاب اور حوض بنے ہوتے ہیں جیسے آج کل بڑے ہوٹلوں اور بعض تفریحی پارکوں میں ہوتے ہیں، جہاں تک عام رائج حماموں کا تعلق ہے جن میں الگ الگ غسل خانے بنے ہوتے ہیں اور پردے کا بھی بھرپور خیال رکھا جاتا ہے وہ اس وعید و نہی میں شامل نہیں ہیں ایسے حماموں میں اگر کوئی دیگر قباحت نہ ہو تو مذکورہ

احادیث میں نہی کی علت ان کو شامل نہیں پھر ان میں نہانا مباح ہوگا گو کہ عورتوں کا حکم پھر بھی وہی رہے گا کہ وہ اپنے گھروں میں غسل کا التزام کریں تاہم اگر کوئی ایسی ناگزیر ضرورت پیش آئے مثلاً سفر کی حالت میں شدید سردی کی وجہ سے کوئی متبادل انتظام نہ ہو اور غسل ضرورت کی نوبت آئے تو پردے کے ساتھ حمام میں جانے کی اجازت ہے جبکہ محرم ساتھ ہو اور کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

قوله: "اِلّاهتكت السترَ بينهاوبين ربها" یہاں پردے سے مراد حیاء ہے یعنی جو عورت اپنے شوہر کے گھر کے علاوہ کسی دوسری جگہ کپڑے اتارے گی تو وہ حیا کا جنازہ نکالے گی کیونکہ اس کے لئے شوہر کے سوا کسی کے سامنے کپڑے اتارنے کی اجازت نہیں۔ یہ کام فقط وہی عورت کرسکتی ہے جس نے اپنی خداداد شرم وحیا بالائے طاق رکھ کر حیا سے عاری ہونے کا فیصلہ کیا ہو ایسی بے حیا عورت کے لئے کہیں بھی کپڑے اتار کر عاری ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ باحیا خاتون ایسا نہیں کرسکتی ہے۔

باب ماجاء ان الملائكة لاتدخل بيتاً فيه صورة ولا كلب

(فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر یا کتا ہو)

"عن ابن عباس يقول سمعت اباطلحة يقول سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا تدخل الملائكة بيتاً فيه كلب ولاصورةُ تماثيلَ". (حسن صحيح)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوطلحہؓ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ فرشتے داخل نہیں ہوتے ہیں اس گھر میں جس میں کتا ہو یا کسی جاندار کی تصویر ہو۔

حدیث آخر:۔ عن اسحاق بن عبدالله بن ابى طلحة ان رافع بن اِسحاق اخبره قال دخلتُ اناوعبدالله بن ابى طلحة على ابى سعيدالخدرى نعوده فقال ابو سعيد: اَخبَرَنارسول الله صلى الله عليه وسلم ان الملائكة لاتدخل بيتاً فيه تماثيل اوصورة شكَّ اسحاق لايدرى ايهماقال". (حسن صحيح)

اسحاق بن عبداللہ سے روایت ہے رافع بن اسحاق نے ان کو خبر دی ہے کہ حضرت رافع بن اسحاق نے فرمایا کہ میں اور عبداللہ بن ابی طلحہ ابوسعید خدریؓ کی عیادت کے لئے گئے تو ابوسعیدؓ نے فرمایا: اخبرنا رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم ... باقی حدیث ابن عباسؓ کی سابقہ حدیث کی طرح ہے۔

حدیث ابی ہریرۃ:۔ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :اَتَانی جبرئیل فقال انی کنتَ اَتیتُکَ البارحة فلم یمنعنی ان اکون دخلتُ علیک البیت الذی کنت فیه اِلّاانه کان فی باب البیت تمثال الرجال وکانَ فی البیت قِرام سِترفیه تماثیل وکان فی البیت کلب،فَمُربرأس التمثال الذی بالباب فَلیُقلع فیصیر کھیئة الشجرة وَمُربالسِّترفلیُقطَع ویُجعل منه وِسادتین مُنتبذتین توطأن ومُربالکلب فیخرج ففعل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وکان ذالک الکلب جِرواً لِلحُسین اوللحَسَن تحت نَضَدٍ له فامربه فاخرج". (حسن صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جبرئیل (علیہ السلام) آئے تو انہوں نے کہا کہ میں آپ کے پاس گذشتہ رات آیا تھا تو مجھے آپ کے پاس اس گھر میں جس میں آپ تھے داخل ہونے سے نہیں روکا مگر یہی کہ گھر کے دروازے پر مردوں کی تصویر تھی، اور گھر میں ایک باریک (یا رنگین) پردہ تھا جس میں جاندار کی تصویریں تھیں اور (یہ کہ) گھر میں ایک کتا (بھی) تھا (اس لئے میں اندر نہ آیا) پس آپ حکم فرمادیجئے کہ سراس تصویر کا جو دروازے پر ہے کاٹ دیا جائے تاکہ وہ درخت کی شکل کی مانند ہوجائے اور پردے کے بارے میں حکم کیجئے کہ اسے پھاڑ دیا جائے اور اس سے دو تکیے بنائے جائیں جو زمین پر پڑے رہیں جن کو پامال کیا جاتا رہے (یعنی روندے جائیں) اور کتے کے متعلق حکم دیجئے کہ اسے نکال باہر کیا جائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا، وہ کتا حضرت حسینؓ یا حضرت حسنؓ کا پلا تھا (یعنی کھیلنے کے لئے) جو چھوٹی میز (یا چارپائی) کے نیچے تھا، چنانچہ آپؐ نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اسے نکال دیا گیا۔

تشریح:۔ قوله: "تماثیل" تمثال بکسر التاء کی جمع ہے لغوی اعتبار سے تصویر اور تمثال دونوں مترادف یا قریب المعنی الفاظ ہیں کہ ہر ایک میں انتقال کے معنی پائے جاتے ہیں خواہ پتھر کا تراشا ہوا مجسمہ اور مورتی ہو یا کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر بنا ہوا فوٹو ہو دونوں پر صورت اور تمثال کا اطلاق ہوتا ہے اگرچہ اصطلاح میں عموماً تمثال کا اطلاق جاندار کی شکل وصورت اور مورت پر ہوتا ہے لہٰذا پہلی حدیث میں "صورت کے بعد تمثال" کا ذکر جاندار کی تخصیص کے لئے ہوا۔ قوله: "قِرام ستر" ستر تو پردے کو کہتے ہیں جبکہ قرام بروزن کتاب باریک پردہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور اونی رنگین ومنقش کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قوله: "منتبذتین" نبذ سے بمعنی پھینکنے

اور ڈالنے کے ہے یعنی وہ تکیے زمین پر، پڑے رہیں تا کہ اُن تصاویر کی توہین ہوتی رہے، اور شکل بھی مِٹ جائے۔
قوله: "جِروا" بکسرالجیم پلّے یعنی کتے کے چھوٹے بچے کو کہتے ہیں۔قوله: "نَضَد" بروزن قمر اصل میں تہ بہ تہ چیزوں کے رکھنے کو کہتے ہیں میز کی طرح تپائی اور چار پائی پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ ان پر بھی کپڑے یا بستر وغیرہ سامان تہ بہ تہ رکھا جاتا ہے، پہلے زمانہ میں ایک معمول تھا کہ زمین پر بیٹھنے کے لئے چھوٹی چار پائی نمانشست بنائی جاتی تھی جو کبھی کرسی کی طرح بھی ہوتی تھی اس کے پائے بہت چھوٹے ہوتے تھے ممکن ہے کہ یہاں وہی مراد ہو۔ واللہ اعلم

باب کی احادیث سے تصویر بنانے اور استعمال کرنے کی حرمت اور کُتے پالنے کی ممانعت معلوم ہوئی البتہ ضرورت کے مواضع مستثنٰی ہیں کتے کے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے تشریحات جلد پنجم ص:۲۰۶ "باب ماجاء فی ثمن الکلب" اور تصویر کے لئے جلد چہارم ص:۳۵۵ تا ص ۳۵۹ "باب ماجاء فی تسویۃ القبر اور جلد پنجم "باب ماجاء فی الصورۃ" ص:۵۵۶ ملاحظہ ہو۔

علاوہ ازیں آج کل ڈیجیٹل تصویر کے متعلق بھی راقم نے جدید سائنسی اصول کے مطابق مستقل کتاب لکھی ہے "شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت" اس پر ماہرین کی آراء بھی آئی ہیں۔اس میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جدید شعاعی تصویر اور کاغذ کے فوٹو اور مجسمہ سب حرمت میں برابر ہیں، ان سے بچنا چاہئے صرف شدید ضرورت کے وقت استعمال کی جائے جبکہ بنانا تو کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة لُبس المُعصفر للرجال

(مردوں کے لئے عُصفر (سرخ یا زرد رنگ) سے رنگا ہوا کپڑا مکروہ ہے)

"عن عبدالله بن عمرو قال مَرَّ رجل وعليه ثوبان احمران فَسَلَّمَ على النبى صلى الله عليه وسلم فلم يَرُدَّ عليه النبى صلى الله عليه وسلم السلامَ". (حسن غريب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص گذرا اور اس پر دو سُرخ کپڑے تھے (یعنی پہنے ہوئے تھے) اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

تشریح:۔قوله: "المُعصفَر، عُصفُر (بضم الاول والثالث) "کُسُم" ایک بوٹی ہے جس سے رنگائی

کی جاتی ہے تاہم اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟ تو کسی نے زرد قرار دیا ہے اور کسی نے سرخ، دوسرے مطلب اور باب کی حدیث کے لفظ "احمران" کے مطابق سُرخ رنگ کے کپڑوں کا استعمال مردوں کے لئے مکروہ ہے اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔ اس مسئلہ کے لئے امام ترمذیؒ نے ابواب اللباس میں ایسا ہی باب ذکر کیا ہے جس کی تفصیل وہاں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص:۵۳۷ ج:۵)

البتہ اِس باب میں یہاں امام ترمذیؒ نے ایک تاویل کی ہے کہ "انه كره لبس المعصفر ورأوا ان ماصبغ بالحمرة بالمَدَرِ اوغير ذالک فلابأس به"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سُرخ رنگ مکروہ ہے جو کسی پودے اور بوٹی کا ہو جسے عصفر کہتے ہیں لیکن اگر مَدَر یعنی مٹی کا سرخ رنگ ہو تو اس میں کوئی حرج وکراہیت نہیں۔ یہاں مَدَر سے مراد گیرو ہے جو ایک لال قسم کی مٹی ہوتی ہے۔

المسترشد: عرض کرتا ہے کہ کراہیت کی علت جب تیز سرخی ہے تو پھر اس قسم کا فرق سمجھ سے بالاتر ہے۔ لہٰذا ہر گہرا سرخ رنگ مکروہ ہے البتہ ہلکا سرخ جائز ہے۔

حدیث آخر:۔ "قال علی بن ابی طالب نهیٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن خاتم الذهب وعن القَسيِّ وعن المِيثرة وعن الجَعَةِ قال ابوالاحوص وهو شراب يتخذ بمصر من الشعير". (حسن صحيح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی (پہننے) سے منع فرمایا ہے اور قسی (ریشمی ملاوٹ والے) کپڑے سے اور سرخ زین پوش سے اور جو کی شراب سے...... ابوالاحوص کہتے ہیں کہ جَعَہ شراب تھی جو مصر میں جو سے بنائی جاتی تھی۔

سونے کی انگوٹھی مردوں کے لئے جائز نہیں امام ترمذیؒ نے ابواب اللباس میں اس پر باب قائم کیا ہے۔ **قوله:** "وعن القسی" وہ کپڑا جس میں ریشم کی آمیزش ہو، بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس میں سین زاء کا متبادل ہے اصل میں یہ قزی تھا قز خام ریشم کو کہتے ہیں یہ مسئلہ بھی ابواب اللباس میں گذرا ہے۔ **قوله:** "وعن المیثرة"، بکسر المیم، یہ بھی چند ابواب پہلے باب ماجاء فی طیب الرجال والنساء میں گذرا ہے، نیز ابواب اللباس میں اس کے لئے مستقل باب آیا ہے۔ (دیکھئے تشریحات: ص: ۵۷۰ ج:۵) جو وغیرہ کی شرابوں کی تفصیل ابواب الاشربہ میں گذری ہے۔ فلانعیدہ۔

حدیث آخر:۔ "عن البراء بن عازب قال اَمَرَنارسول الله صلى الله عليه وسلم بسبع

ونهاناعن سبع، امرنا باتباع الجنائز وعيادة المريض وتشميت العاطس واجابة الداعي ونصر المظلوم وابرار المقسم وردّ السلام ونهاناعن سبع عن خاتم الذهب اوحلقة الذهب وآنية الفضة ولبس الحرير والديباج والاِستبرق والقسيّ". (حسن صحيح)

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا ہے اور سات چیزوں سے ہمیں منع کیا ہے: (۱) ہمیں جنازوں کے ہمراہ (پیچھے) جانے کا حکم دیا ہے (بیمار کی عیادت کا) (۳) اور چھینکنے والے کو جواب دینے (یعنی دعاء) کا (۴) اور دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنے کا (۵) اور ستم رسیدہ کی مدد کرنے کا (۶) اور قسم کھانے والے کی قسم سچا کرنے کا (۷) اور سلام کا جواب دینے کا حکم دیا ہے۔ اور آپؐ نے ہمیں سات باتوں سے منع فرمایا ہے: سونے کی انگوٹھی سے یا فرمایا (شک الراوی) سونے کے چھلے سے (یعنی مردوں کے لئے منع فرمایا ہے) اور چاندی کے برتن کے استعمال سے اور (ہر قسم کے) ریشم سے دیباج یعنی نرم اور استبرق یعنی موٹے ریشم سے اور قسی سے یعنی جس کپڑے میں ریشم کی آمیزش ہو سب سے منع فرمایا ہے کہ مرد اس قسم کے کپڑے نہ پہنیں۔

بخاری کی روایت میں "میاثر حُمر" کا بھی ذکر ہے یعنی سُرخ زین پوش سے ممانعت فرمائی ہے اس سے ترجمہ سے مناسبت بھی معلوم ہوئی، ان تمام جزئیات پر بحث گذری ہے جو مختلف ابواب میں مذکور ہے۔

باب ماجاء في لُبس البياض

(سفید کپڑے پہننے (کی افضلیت) کا بیان)

"عن سمرة بن جندب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اِلبَسُوا البياض فانها اطهر واطيب وكَفِّنُوا فيها موتاكم". (حسن صحيح)

حضرت سمرہ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: سفید کپڑے پہنا کریں اس لئے کہ یہ زیادہ پاکیزہ اور زیادہ عمدہ (وخوب صورت) ہیں اور اسی (سفید) میں اپنے مردیں کفناؤ۔

تشریح:۔ اس باب میں سفید کپڑوں کے استعمال حیاً ومیتاً کی ترغیب اور افضلیت کا بیان ہے اگر چہ مَردوں کے لئے تیز سُرخ اور زرد کے علاوہ باقی سب رنگ کے کپڑے پہننا جائز ہے بشرطیکہ کوئی دوسرا مانع نہ ہو، سرخ میں حنفیہ کے آٹھ اقوال ہیں حرمت کا بھی ہے اور استحباب کا بھی مکروہ تحریمی اور تنزیہی کے اقوال بھی ہیں

جبکہ باقی ائمہ کے نزدیک وہ سرخ مکروہ ہے جو معصفر ہو باقی جائز ہے، یہ مسئلہ سابقہ باب میں اور اس سے پہلے بھی بیان ہوا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس باب کے بعد بھی متعدد ابواب قائم کئے ہیں۔ بہر حال ان تمام رنگوں میں سب سے افضل سفید ہے خصوصاً علماء وطلبہ کے لئے کیونکہ ایک تو یہ علم کے ساتھ مناسب ہے کہ نورانی لگتا ہے دوم اس میں صفائی وستھرائی نمایاں نظر آتی ہے، سوم ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے اس لئے سفید استعمال کئے جائیں تاکہ باطن بھی صاف ہو۔ نیز قیمت کے لحاظ سے بھی سفید کپڑے مناسب اور درمیانہ ہوتے ہیں: ''وخیر الامور اوسطها'' نیز یہ جلدی دھونے پڑتے ہیں جس سے وہ پاک رہتے ہیں اور نماز کی ادائیگی کے لئے موزوں ترین بن جاتے ہیں۔ تاہم آپؐ سے دوسرے رنگ کے کپڑے پہننا بھی ثابت ہیں لہٰذا کہا جائے گا کہ اصل سفید ہے اور باقی کا استعمال بیان جواز کے لئے ہے، پھر یہ حکم عمامہ وغیرہ سب کے لئے یکساں ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فتح مکہ کے دن کالا عمامہ پہننا بیان جواز کے لئے تھا وہ لکھتے ہیں:

''فيه جوازلباس الثياب السُّودوفي الرواية الأُخرى''خطب الناس وعليه عمامة سوداء''فيه جوازلباس الاسودفي الخطبة وان كان الابيض افضل منه كماثبت في الحديث الصحيح''خيرثيابكم البياض''واماِلباس الخطباء السِوادَفي حالة الخطبة فجائزولكن الافضل البياض كماذكرنا،وانمالَبِسَ العمامة السوداء في هذاالحديث (اى ان النبي صلى الله عليه وسلم دخل يوم فتح مكة وعليه عمامة سودآء'')بياناً لِلجواز''. والله اعلم

(شرح مسلم للنوویؒ: ص:۴۳۹ ج:۱ ''باب جواز دخول مکۃ بغیر احرام'')

باب ماجاء في الرخصة في لُبس الحُمرة للرجال

{(ہلکے) سُرخ رنگ کے کپڑوں کا استعمال مردوں کے لئے جائز ہے}

''عن جابربن سمرة قال رأيت النبي صلى الله عليه وسلم في ليلة إضحِيان فَجَعلتُ انظرالى رسول الله صلى الله عليه وسلم والى القمر وعليه حُلّة حمراء فاذا هوعندى احسن من القمر''. (حسن غريب)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آٹھویں شب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا پس میں (نے موازنہ کیا) کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا اور کبھی چاند پر نظر ڈالتا، آپؐ سُرخ جوڑا پہنے ہوئے تھے تو اس وقت میرے نزدیک آپؐ چاند سے زیادہ حسین تھے۔

تشریح:۔ قوله: "فی لیلة اِضحِیَان" عارضة الاحوذی میں ہے کہ ترکیب اضافی ہے اور اِضحیان مہینہ کی آٹھویں رات کو کہتے ہیں انتہیٰ یا مطلق چاندی رات مراد ہے چونکہ چاند، بذات خود کوئی نورانی جسم نہیں ہے بلکہ ہماری زمین کی طرح مختلف النوع کرہ ہے جب سورج کی شعاعیں اس پر پڑ جاتی ہیں تو وہ حصہ انعکاس اَشِعَّہ کی بناء پر چمکدار نظر آتا ہے، جبکہ آنحضورؐ چاند کی روشنی کے علاوہ دوسرے انوار و تجلیات اور ظاہری و باطنی محسّنات وخوبیوں اور خداداد محبوبیت کا مرکز تھے، اس لئے چاند کہاں آپؐ کا حسن میں مقابلہ کرسکتا ہے، باقی کمالات کی تو بات ہی اور ہے۔

رہا سُرخ کپڑوں کا مردوں کے لئے استعمال کا مسئلہ تو سابقہ باب میں عرض کیا جاچکا ہے کہ اس بارے میں حنفیہ کے آٹھ قول ہیں جن اقوال کے مطابق ممنوع ہے ان کی طرف سے حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ یہ جوڑا خالص سُرخ نہیں تھا بلکہ ہلکا سرخ تھا یا اس میں سرخ دھاریاں تھیں سارا سرخ نہ تھا۔ (تفصیل تشریحات جلد:۵ ص:۵۳۵ پر گذری ہے "باب ماجاء فی الرخصة فی الثوب الاحمر" من ابواب اللباس)

قوله: "وفی الحدیث کلام اکثر من هذا الخ" شاید یہ سند پر کلام کے بارے میں فرمایا ہو کہ مختصراً بحث تو فرمادی اور اس کے لئے امام بخاریؒ کا قول بھی نقل کیا کہ یہ حدیث جو بواسطہ اشعث عن ابی اسحاق عن جابر بن سمرہؓ مروی ہے اور وہ حدیث جو بواسطہ شُعبہ عن ابی اسحاق عن البراءؓ مروی ہے دونوں صحیح ہیں اور باقی تفصیل حذف فرمادی ورنہ اگر متنِ حدیث کی بات کی جائے تو شمائل ترمذی میں بھی یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ مروی ہے اس سے زیادہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

باب ماجاء فی الثوب الاخضر

(سبز کپڑوں کا استعمال)

"عن ابی رِمثة قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلیه بُردان اخضران".

(حسن غریب)

حضرت ابورمثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جبکہ آپؐ دو سبز چادر زیب تن کئے ہوئے تھے۔

تشریح:۔دو باب قبل ''باب ماجاء فی لُبس البیاض'' میں عرض کیا جاچکا ہے کہ سب سے بہتر لباس سفید ہے جبکہ باقی رنگوں کا استعمال آپؐ نے بیان جواز کے لئے فرمایا، لہٰذا اگر باب کی حدیث میں ''اخضران'' کو خالص سبز مان بھی لیا جائے تو اس سے سُنّیت پھر بھی ثابت نہیں ہوتی زیادہ سے زیادہ استحباب ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں بھی اہل جنت کے سبز لباس کا ہار ہاذکر آیا ہے لیکن آپؐ نے اس کو معمول کے طور پر کبھی بھی استعمال نہیں فرمایا ہے۔

یہ تو نفس مسئلہ کی نوعیت تھی ،لیکن آج کل یہ مسئلہ درپیش ہے کہ سبز رنگ کو بعض لوگوں نے اپنا شعار بنایا ہے وہ اس رنگ کو بطور مارکہ اور مونوگرام کے استعمال کرتے ہیں اس لئے آج کل اس کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اگر سنت بھی اہل بدع کا شعار بن جائے تو اسے ترک کرنا اولیٰ ہے جبکہ سبز رنگ تو سنت بھی نہیں ہے ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ کے کتاب الجنائز میں یہ ضابطہ بیان کیا ہے:

''وفیه اشارۃ الی ان کل سنة تکون شِعار اهل البدعة ترکها اولی''.

(مرقات:ص:۱۴۶ ج:۴''باب المشی بالجنازۃ والصلوٰۃ علیها''،فصل ثالث کی دوسری حدیث، مکتبہ رشیدیہ)

باب ماجاء فی الثوب الاسود

(کالے لباس کا بیان)

''عن عائشة قالت خرج النبی صلی الله علیه وسلم ذات غداۃٍ وعلیه مِرطٌ من شعر اسود''.(حسن صحیح غریب)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک صبح کو (گھر سے) نکلے جبکہ آپؐ پر بالوں کی کالی چادر تھی۔

تشریح:۔قوله:''مِرط''بکسر المیم بروزنِ سِدر چادر کو کہتے ہیں خواہ اُونی ہو یا کاٹن اور بالوں سے بنی ہوئی ہے پھر مسلم کی روایت میں ہے کہ اس چادر پر کجاوے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

اس حدیث کو بھی سابقہ باب کے ضابطہ کے تناظر میں دیکھنا چاہئے کہ کالا،اونی اور بالوں کا بنا ہوا

لباس جائز ہے لیکن مسنون نہیں ہے، گوکہ ہندوستان میں کسی وقت یہ مسلمانوں کا شعار شمار ہوتا تھا جیسا کہ عالمگیری میں اس مُردے کے بارے میں لکھا ہے جو کسی نامعلوم جگہ پایا جائے تو یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ ہندو ہے یا مسلمان؟ تو اس کی تین علامات بیان کی ہیں: (۱) ختنہ (۲) خضاب (۳) اور کالا لباس، ان میں کوئی ایک ملے تو اسے مسلمان قرار دیا جائے گا، مگر اب چونکہ کالے کو روافض نے اور خصوصاً محرم کے مہینہ میں اپنا شعار بنایا ہے اس لئے کالے لباس سے اور خصوصاً محرم کے مہینہ میں اس سے بچنا چاہئے۔

باب ماجاء فی الثوب الاصفر

(زرد رنگ کے لباس کا بیان)

"عن قیلة بنت مخرمة و کانتا رَبیبَتیها، وقیلة جدة ابیهما اُمّ اُمّه انها قالت قَدِمنا علی رسول الله صلی الله علیه وسلم فذکرت الحدیث بطوله ... حتیٰ جاء رجل وقد ارتفعت الشمس فقال السلام علیک یارسول الله فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: وعلیک السلام ورحمة الله اوعلیه تعنی النبی صلی الله علیه وسلم اَسمَالُ مُلَیّتینِ کانتا بزعفران وقد نفضتا ومعه عُسیبُ نخلة".

حضرت صفیہ اور حضرت دُحیبہ دونوں اپنے والد کی نانی حضرت قیلہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (ہجرت کرکے) آئے...... پھر انہوں نے پوری طویل حدیث بیان کی...... یہاں تک کہ ایک شخص آیا جبکہ سورج بلند ہو چکا تھا تو اس نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ! سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ ...... اور آپؐ پر، ان کی مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہیں پرد و پرانے کپڑے بغیر سلائی والے تھے جو زعفران سے رنگے ہوئے تھے جن کا رنگ جھڑ (اُڑ) گیا تھا (یعنی ہلکا ہلکا باقی تھا) اور آپؐ کے پاس کھجور کی ٹہنی تھی۔

تشریح:۔ قولہ: "و کانتا رَبیبَتیها" یعنی صفیہ اور دُحیبہ دونوں حضرت قیلہؓ کی پروردہ ہیں، ان دونوں بہنوں میں سے دحیبہ راوی حسان کی حقیقی دادی ہیں۔ قولہ: "فذکرت الحدیث بطوله" یعنی یہاں اس طویل حدیث کا صرف ایک جزء نقل کیا گیا ہے جو ترجمۃ الباب سے متعلق ہے باقی حدیث نقل نہیں کی ہے، اس طویل حدیث کا ایک حصہ امام ابوداودؒ نے کتاب الخراج کے باب فی اقطاع الارضین جلد دوم ص ۴۳۷ پر نقل کیا ہے۔

قولہ: "اسمال" سَمَل بروزن قمر کی جمع ہے پُرانے کپڑے کو کہتے ہیں جمع کا صیغہ مافوق الواحد کے اعتبار سے ہے۔قولہ: "مُلیّتین" مُلَاءَۃ کی تصغیر ہے چادر کے معنی میں ہے یعنی وہ کپڑا جو ازار کے طور پر استعمال ہوتا ہے یا جو بغیر سلائی کے ہو جیسے احرام کی موجودہ تولیے ہوتے ہیں۔الکوکب الدری میں ہے کہ جب تثنیہ کی اضافت تثنیہ کی طرف ہو جائے تو مضاف کو جمع ذکر کرنا بھی جائز ہے، علیٰ ہذا پھر مراد دو کپڑے ہوں گے جیسا کہ اوپر ترجمہ میں ذکر ہے مگر ترمذی کے حاشیہ پر اضافت بیانی کو ظاہر کیا ہے پھر مطلب یہ ہوگا کہ صرف ازار والی چادر مراد ہے (جو ممکن ہے کندھوں سے پیروں تک ہو) اور اَسمال اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر یہ باعتبار اجزاء کے ہے نہ کہ باعتبار تعداد کے۔قولہ: "نفضتا" یعنی رنگ کی شدت اور تیزی اڑ گئی تھی اور صرف تھوڑا بہت اثر باقی تھا کیونکہ کپڑا پُرانا تھا اس لئے بار بار دھونے سے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔قولہ: "عُسیب" بصیغہ تصغیر یعنی آپؐ کے ہاتھ مبارک میں کھجور کی چھوٹی شاخ تھی اس کا مکبر عَسِیب بفتح العین وکسر السین آتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب زعفرانی رنگ کا کپڑا دھو، دھو کر اس کے رنگ کا اثر کم کر دیا جائے تو اس کا استعمال جائز ہے، لہٰذا آئندہ باب میں "مُزعفر" کی جو ممانعت آئی ہے وہ تیز رنگ کی صورت میں ہے۔یہی ضابطہ باقی تیز سُرخ اور زرد کے لئے بھی ہے، غرض مردوں کو ہر تیز رنگ سے بچنا اولیٰ ہے۔پھر طیبیؒ نے سفید لباس کی افضلیت کی یہ علت بیان کی ہے کہ اس میں تواضع زیادہ ہے لہٰذا اس سے یہ علت بھی نکالی جاسکتی ہے کہ تیز رنگ سے آدمی کے اندر رعونت وتکبر پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جبکہ سفید اور کالے اور ہلکے رنگ میں یہ علت نہیں ہے ان تمام ابواب کی احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ لباس میں تکلف کو پسند نہیں فرماتے بس جو مُیسّر ہوا اسی کو زیب تن فرمایا، اگرچہ آپؐ کو سب سے زیادہ پسند سفید لباس تھا۔اسی طرح کھانے کی چیزوں میں بھی تکلف نہ فرماتے۔

باب ماجاء فی کراھیة التزعفر والخَلُوق للرجال

(مردوں کے لئے زعفرانی رنگ اور رنگین خوشبو مکروہ ہے)

"عن انس بن مالک قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم: عن التزعفر للرجال". (حسن صحيح)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے لئے زعفران سے رنگین ہونے

کی ممانعت فرمائی ہے۔

حدیث آخر:۔"عن یعلیٰ بن مُرَّةَ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابصر رجلاً مُتخَلِّقاً قال اذهب فاغسله ثم اغسله ثم لاتَعُدْ!". (حسن)

حضرت یعلی بن مرۃؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو خلوق (رنگین مکس خوشبو) لگائے ہوئے تھا، آپؐ نے فرمایا: جاتو! اس کو دھو! اور پھر (دوبارہ) دھوڈال! اور پھر دوبارہ ایسا نہ کرو (یعنی پھر نہ لگاؤ!)۔

تشریح:۔ امام ترمذیؒ نے پہلی حدیث میں تزعفُر اور دوسری حدیث میں لفظ خَلُوق کو ہم معنی بتایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "**ومعنی کراهية التزعفر للرجل ان يتزعفر الرجل يعنی ان يتطيب به**" یعنی مطلب یہ ہے کہ مرد کو زعفران کا رنگ خوشبو کے طور پر یا دوسری خوشبو میں شامل کر کے نہیں لگانا چاہئے، لیکن سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ زعفران کے رنگ سے کپڑے رنگنے کے بعد اگر معمولی اور ہلکا اثر رہ جائے تو وہ استعمال کئے جاسکتے ہیں جبکہ تیز رنگین مردوں کے لئے مکروہ ہے لہٰذا پھر باب کی دونوں حدیثوں کا الگ الگ محمل ہو جائے گا کہ زعفران کا تعلق کپڑوں کے رنگ سے ہے اور خلوق بفتح الخاء جو دراصل چند خوشبوؤں کو ملا کر بناتے تھے اور عموماً اس پر زعفران کا رنگ غالب رہتا تھا کا تعلق جسم اور کپڑوں دونوں سے ہے یعنی مرد ہر قسم کے رنگ والی خوشبو سے گریز کریں خواہ چہرے پر لگانے کی ہو یا کپڑوں پر، کیونکہ یہ عورتوں کی خوشبو ہوتی ہے جیسا کہ پیچھے گذرا ہے، اس لئے اس حدیث میں بار بار دھونے کا حکم دیا تا کہ رنگ ختم ہو جائے۔ محشی نے نہایہ سے نقل کیا ہے کہ خلوق کے بارے میں جوازِ استعمال کی بھی روایات ہیں لیکن بظاہر وہ منسوخ ہیں نہی کی روایات سے۔

باب ماجاء فی کراهية الحرير والديباج

(ریشمی لباس کی ممانعت)

"عن ابن عمر قال سمعتُ عمر یذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من لَبِسَ الحرير فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة". (حسن صحیح)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے (حضرت) عمرؓ سے اس حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے سُنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ اسے آخرت میں نہیں پہنے گا۔

ملحوظ:۔ ریشمی لباس پر ابواب اللباس کے شروع ابواب میں بحث گزری ہے۔(دیکھئے تشریحات ص:۵۳۱ج:۵)

بابٌ

(کوٹ وغیرہ پہننا جائز ہے)

"عن المِسوَرِبن مخرَمَةَ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قَسَمَ اَقبِیَةً ولم یُعطِ مخرمة شیئاً فقال مخرمةُ یابُنَیَّ اِنطلَق بنا الی رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فانطلقتُ معه ،قال: اُدخل فادعُه لی افدعوته له فخرج النبی صلی الله علیه وسلم وعلیه قباء منها فقال: خَبَاتُ لَکَ هذا قال فنظر الیه فقال رَضِیَ مخرمةُ؟". (حسن صحیح)

حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائیں تقسیم فرمادیں اور (میرے والد) مخرمہ کو کچھ نہیں دیا تو مخرمہ نے کہا میرے پیارے بیٹے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو حضرت مسورؓ فرماتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ گیا (جب آپؐ کے گھر پر پہنچے تو) انہوں نے کہا جا اندر! اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے لئے بلالے! (تا کہ میں ان کی خدمت میں درخواست کروں) چنانچہ میں نے آپؐ کو ان کے لئے بلایا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور آپؐ پر (یعنی آپؐ کے پاس) ان قباؤں میں سے ایک قبا تھی، پس آپؐ نے فرمایا کہ یہ میں نے آپ کے لئے بچا رکھی تھی حضرت مسورؓ کہتے ہیں کہ مخرمہ نے اسے (قبا کو) دیکھا تو آپؐ نے فرمایا مخرمہ خوش ہو گئے؟

تشریح:۔ قولہ: "اقبیة" قباء کی جمع ہے جبہ اور چوغے کو کہتے ہیں عام طور پر ایسے چغے باہر سے آتے تھے جو ریشمی ہوتے تھے یہ تقسیم ریشم کی ممانعت سے پہلے کی ہے اگر چہ ممانعت کے بعد بھی دینا ثابت ہے لیکن اس کا مطلب استعمال کی اجازت نہیں ہے بلکہ تملیک ہے استعمال الگ چیز ہے اور تملیک الگ شے ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کے وقت حضرت مخرمہؓ کے لئے ایک جبہ الگ کرلیا تھا اس لئے یہاں "ولم یعط مخرمة شیئاً" سے مراد اسی مجلس میں دینے کی نفی ہے، چونکہ حضرت مخرمہؓ عمر رسیدہ تھے اس لئے اپنے بیٹے سے کہا کہ مجھے لے چلو اور چونکہ حضرت مسورؓ نابالغ تھے اس لئے کہا اندر جاؤ الخ۔ قولہ: "خبأت لک هذا" چونکہ حضرت مخرمہؓ جلالی مزاج کے تھے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتضائے حال کے مطابق ارشاد فرمایا جو

بلاغت کا مقام ہے۔ قولہ: "فنظر الیه فقال" فنظر کی ضمیر مخرمہ کی طرف اور فقال کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے جیسا کہ ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا ہے اور "رضی مخرمه" استفہام ہے یعنی تم راضی ہو گئے؟؟؟

دوسرا احتمال یہ ہے کہ فنظر کی ضمیر نبیؐ کی طرف اور الیہ کی ضمیر مخرمہ کی طرف راجع ہے اور فقال مخرمہ کی طرف علی ھذا رضی مخرمہ حضرت مخرمہ کا مقولہ ہوگا۔

اس حدیث سے شیروانی، کوٹ اور عباء وغیرہ کا جواز ثابت ہوا، بخاری ج:۲ص:۸۷۱ باب بالذھب کتاب اللباس میں ہے کہ اس چغّے میں سونے کے بٹن بھی لگے ہوئے تھے۔

باب ان اللہ یُحِبُّ ان یُریٰ اَثَرُ نعمته علی عبده

(اللہ اپنے بندے کے اظہارِ نعمت کو پسند کرتا ہے)

"عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ان اللہ یحب ان یُریٰ اثر نعمته علی عبده". (حسن)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اس کے بندے پر اس کی نعمت کا اثر دیکھا جائے۔

تشریح:۔قولہ: "ان یریٰ" بعض نسخوں میں مجہول کا صیغہ ہے اور بعض میں معروف کا، مجہول اصح ہے۔

اس حدیث سے اظہار نعمت کا استحباب معلوم ہوا تاہم عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ صوفیہ نے اس سے مراد جود وسخاوت لی ہے کہ صاحب استطاعت کو چاہئے کہ اللہ کا دیا ہوا مال اللہ کی مخلوق پر خرچ کرتا رہے اگر چہ خود ننگا اور بھوکا رہنا پڑے یعنی محتاج رہے، لیکن فقہائے کرام اس سے مراد بذات خود استعمال لیتے ہیں یعنی آدمی کو چاہئے کہ اللہ نے اس کو جو نعمت دی ہے اس کو ظاہر کرے۔ حاشیہ پر ہے کہ مناسب حال استعمال کرے تا کہ ایک طرف اللہ کا شکر ادا ہو تو دوسری طرف غریب لوگوں کو اس کی مال داری معلوم ہو تا کہ اگر وہ اس سے اپنے حوائج بیان کرنا چاہیں تو یہ عمدہ لباس اس کی نشانی ہو۔

اس طرح غریبوں پر خرچ کرنے کا موقع آسانی سے مل جائے گا، گویا محشی نے صوفیائے کرام اور فقہائے عظام دونوں کی مرادوں کو یکجا کیا ہے۔ بہر حال دوسری طرف بھی روایات ہیں جن سے فقر اور تواضع کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اس لئے بعض علماء باب کی حدیث کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض فقرِ اختیاری کو بشرطیکہ بخل

اور کنجوسی کی نیت سے نہ ہو۔

اعدل الاقوال یہ ہے کہ شریعت نے اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے لہٰذا معتدل لباس اور اپنے ہمعصروں کے مطابق لباس پہننا چاہئے گو کہ عیدین اور جمعہ وغیرہ مستثنیٰ ہیں جیسا کہ ابواب اللباس میں گذرا ہے۔(دیکھئے تشریحات: ج:۵ص:۵۸۰ "باب ماجاء فی ترقیع الثوب وباب ماجاء فی لُبس الصوف" ص:۵۴۷ ج:۵)

باب ماجاء فی الخف الاسود

(سیاہ موزے کا بیان)

"عن ابن بريدة عن ابيه ان النجاشي اهدىٰ للنبي صلى الله عليه وسلم خُفَّينِ اسودين ساذجين فَلَبِسهماثم توضأومسح عليهما". (حسن)

حضرت بُریدہؓ سے روایت ہے کہ نجاشی (اصحمہؓ) نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چمڑے کے دو کالے سادہ موزے بطور ہدیہ بھیجے تھے آپؐ نے دونوں کو پہنا پھر وضو کر کے ان پر مسح کیا۔

تشریح:۔قولہ: "ساذجین" ساذج بفتح الذال کے معنی سادہ کے ہیں مگر یہاں مراد کیا ہے؟ تو اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ اس پر ڈیزائن اور نقوش نہیں بنے تھے۔ دوم یہ کہ ان پر بال نہ تھے بلکہ صاف تھے۔ معلوم ہوا کہ کالے رنگ کے جرابے، موزے اور جوتے استعمال کئے جاسکتے ہیں نہ اس سے کوئی رنگ مانع ہے اور نہ ڈیزائن اِلّا یہ کہ کوئی دوسری وجہ ممانعت کی ہو مثلاً مردوں کے لئے نسوانی ممنوع ہے اور غیر مسلموں کا شعار مطلقاً ممنوع ہے۔

باب ماجاء فی النهی عن نتف الشیب

(سفید بال نوچنا منع ہے)

"عن عمروبن شعيب عن ابيه عن جده ان النبي صلى الله عليه وسلم :نهى عن نتف الشيب وقال انه نورالمسلم". (حسن)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفید بال اُکھاڑنے سے ممانعت فرمائی ہے اور آپؐ نے فرمایا کہ وہ مسلمان کا نور ہے۔

تشریح:۔عمرو بن شعیب کی سند پر تفصیلاً بحث گذر چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سند کی روایت درجہ حسن میں ہوتی ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے حکم لگایا ہے تاہم ابن العربیؒ عارضہ میں فرماتے ہیں کہ لفظاً تو یہ حدیث صحیح نہیں لیکن معناً صحیح ہے مگر پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ امام بخاریؒ اور ابن العربیؒ درجہ حسن کی روایت کو ضعیف کہتے ہیں بہرحال ابن العربیؒ نے بھی اس مضمون اور معنی کو صحیح تسلیم کیا ہے اور نور کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ سفید بال موت کا پیغام لے کر آتا ہے گویا کہ وہ نذیر ہے اس لئے آدمی آخرت کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے نیز اس میں وقار بھی ہے کیونکہ جوانی تو دیوانگی کا ایک شعبہ ہے اصل سنجیدگی تو بڑھاپے میں آتی ہے جبکہ اسے اُکھاڑنا تغییر لخلق اللہ میں بھی آتا ہے بخلاف خضاب اور مہندی لگانے کے کہ ایک تو وہ دیکھنے والے کی نظر میں حقیقت سے مختلف نہیں ہوتا کیونکہ دیکھنے والا جانتا ہے کہ اس نے مہندی لگائی ہے، دوم وہ تبدیلی عارضی ہوتی ہے جبکہ اُکھاڑنا مستقل تغییر ہے۔

باب ماجاء ان المستشار مؤتمن

(صاحب مشورہ امانت دار ہوتا ہے)

"عن ام سلمة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المُسْتَشَارُ مُؤتَمَنٌ".

(غریب)

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس سے مشورہ لیا جائے وہ باھروسہ سمجھا جاتا ہے (یعنی اس کی امانت وخیر خواہی پر اعتماد ہوتا ہے)۔

تشریح:۔یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے تو مشورہ لینے والا اس کی دیانت اور خیر خواہی دونوں پر اعتماد کرتا ہے کہ مجھے صحیح مشورہ دے گا اور میرا راز افشاء نہیں کرے گا اس لئے صاحب مشورہ کو چاہئے کہ ان دونوں اعتمادوں پر پورا اُترے۔

اس حدیث میں مُستشار اور مُؤتمَن دونوں اسم مفعول کے صیغے ہیں ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے کہ چونکہ ایک طرف لوگوں کی آراء مختلف ہوتی ہیں اور دوسری جانب معانی میں بعض اوقات تعارض بھی آجاتا ہے اس لئے ایک شخص کبھی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہتا ہے اسی بناء اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسروں سے رائے میں مدد لینے کا حکم دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بنفس نفیس عمل بھی فرمایا، لہٰذا مشورہ قرآن وسنت سے ثابت

ہوا بلکہ از روئے عقل بھی رائج ہے کہ جاہلیت کے دور میں بھی لوگ مشورے کرتے تھے۔اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی ملت میں بھی مشورہ تھا انہوں نے حضرت اسماعیلؑ سے ذبح کے بارے میں مشورہ لیا تھا۔

قولہ:"انی لَاُ حَدِّث بالحدیث فَمَااَخرِمُ منه حرفاً" اخرم باب ضرب سے واحد متکلم کا صیغہ ہے ای لااحذف منہ حرفاً یہ عبدالملک بن عمیر کا مقولہ ہے کہ میں جب حدیث بیان کرتا ہوں تو اس سے ایک حرف بھی کم نہیں کرتا ہوں۔امام ترمذیؒ کا مقصد اس بات کو نقل کرنے سے عبدالملک کی توثیق کرنا ہے کہ وہ روایت میں کمی بیشی سے بچتے تھے،غرض باب کی دوسری حدیث صحیح ہے اگرچہ پہلی میں ابن جدعان کی دادی نامعلوم ہیں۔

باب ماجاء فی الشُؤم

(بدشگونی کا بیان)

"عن عبدالله بن عمر ان رسو ل الله صلى الله عليه وسلم قال:الشُؤم فى ثلا ثة فى المرأة والمسكن والدابة". (حسن صحيح)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:نحوست (یا ناگواری) تین چیزوں میں ہے عورت میں اور گھر وسواری میں۔

حدیث آخر:۔"اِن كان الشؤم فى شئى ففى المرأة والدابة والمسكن".(رواه البخارى ومسلم عن ابن عمر)

اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی (یا ہے) تو پھر عورت اور سواری اور گھر میں ہوتی (یا ہوگی)۔

حدیث آخر:۔"لاشؤمَ وقديكون اليمن فى الدارو المرأة والفرس". (حافظؒ نے فتح الباری میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے)

نحوست نہیں ہے (یعنی کسی چیز میں) اور کبھی گھر اور عورت اور گھوڑے میں برکت ہوتی ہے۔

تشریح:۔قولہ:"الشؤم" اصل میں شین کے بعد ہمزہ ہے لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لئے اس کی جگہ واؤ پڑھنا بھی جائز ہے،یُمن وبرکت کی ضد ہے یعنی نقصان اور اس سے خوف کرنے کو کہتے ہیں بعض علماء کرام اس پر مصر ہیں کہ اس حدیث میں شؤم سے مراد ناگواری طبع یعنی طبعیت کی ناموافقت ہے اور

ناپسندیدگی ہے۔ **قوله: "وقد یکون الیُمن "** یمن بضم الیاء شؤم کی ضد ہے بمعنی برکت کے۔

باب کی احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے آخری حدیث سے شؤم ونحوست کی نفی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح "لاطِـیَرَة" کی حدیث سے بھی نفی معلوم ہوتی ہے جبکہ پہلی حدیث سے بظاہر اس کا ثبوت معلوم ہوتا ہے۔ اس تعارض کو دور کرنے اور اصل مطلب تک رسائی حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ان تین اشیاء میں نحوست کو تسلیم کر کے باقی روایات میں تاویل یا تخصیص کی جائے جبکہ دوسری صورت اس کے برعکس ہے کہ نحوست کی نفی کر کے باب کی پہلی حدیث میں تاویل کی جائے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں اس پر زور لگایا ہے کہ باب کی حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تین اشیاء میں یہ تاثیر ڈالی ہے جیسا کہ اس کی عادت ہے کہ اشیاء میں تاثیرات پیدا فرماتا ہے، لہٰذا اس عقیدے کے مطابق کہ یہ اللہ کی ودیعت کی ہوئی تاثیرات ہیں ان تین اشیاء میں نحوست ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس پر موطا (اور ابوداؤد) کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کو خبر دی کہ ہم تعداد میں زیادہ تھے اور ہمارا مال بھی زیادہ تھا لیکن اس (نئے) گھر کی وجہ سے ہماری تعداد بھی گھٹ گئی اور مال بھی چلا گیا، آپؐ نے فرمایا: "دعوها فانها ذمیمة" یعنی اس گھر کو چھوڑو کیونکہ یہ بُرا ہے، ابن العربیؒ باب کی دوسری حدیث یعنی "ان کان الشـؤم الـخ" کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی عادت کے مطابق جو اس قسم کی تاثیرات بعض دفعہ پیدا فرماتے ہیں تو غالب طور پر ان تین اشیاء میں ودیعت فرماتے ہیں، البتہ وہ فرماتے ہیں شوم صرف دنیوی نہیں ہوتی ہے بلکہ اخروی بھی ہوتی ہے کہ جس گھر میں عبادت نہ ہو اور جو عورت (بیوی) عبادت وطاعت میں معاون ثابت نہ ہو اور جس گھوڑے پر جہاد نہ کیا جائے تو وہ آدمی کی آخرت کے لئے منحوس ہیں جبکہ امام مالکؒ اس کو ظاہر پر یعنی دنیوی نقصان پر حمل کرتے ہیں یعنی اللہ نے ان میں یہ تاثیرات پیدا کی ہیں جو گاہے بگاہے مرتب ہو جاتی ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے المسک الذکی میں اس طرف میلان کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> "احقر کے نزدیک معلوم تو ہوتا ہے کہ ان تین چیزوں میں حق تعالیٰ نے کچھ اثر رکھا ہے لیکن اس کا اظہار عوام کے سامنے نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ اس کو سُن کر اس کو مؤثر حقیقی سے زیادہ متصرف سمجھیں گے اور آدمی کو تو یہ چاہئے کہ یہ سمجھے کہ مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں اور ان چیزوں میں اثر ان کا رکھا ہوا ہے نہ کہ بالذات، پس اس اعتقاد میں کچھ مضائقہ نہیں"۔

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ بعض دیگر علماء کی رائے اس سے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں: "ان کان الشؤم فی شئی الخ" کا مطلب یہ ہے کہ نحوست کسی چیز میں نہیں اگر ہوتی تو پھر ان تین میں ہوتی مگر ان میں تو نہیں لہذا کسی چیز میں نہیں اور یہ ایسا ہے جیسے دوسری حدیث میں ہے کہ: "لو کان شئی سابق القدر لسبقه العین" جبکہ باب کی پہلی حدیث میں شؤم سے مراد ناگواری طبع اور عدم موافقت ہے یعنی اگر ان تین چیزوں سے طبعی میلان وہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تو پھر پریشانی ہی پریشانی رہتی ہے اور چونکہ ناگواری طبع تو دوسری اشیاء میں بھی ہوسکتی ہے لیکن ان تین کے ساتھ تعلق طویل ہوتا ہے اس لئے ان تین کا بطور خاص ذکر فرمایا، گویا ان کے نزدیک اصل "لاطیرة" والی حدیث ہے اور باقی مؤول ہیں۔ الکوکب الدری میں ہے کہ شؤم کے ایک معنی نحوست کے ہیں اور دوم ناپسندیدگی اور پریشانی کے تو جہاں شؤم کی نفی ہوئی ہے تو وہاں معنی اول مراد ہے اور جن روایات میں اثبات ہوا ہے وہاں معنی ثانی مراد ہیں فلا اشکال۔

باب ماجاء لایَتَنَاجَی اثنان دون الثالث

(تین آدمیوں میں سے دو، الگ سرگوشی نہ کریں)

"عن عبدالله قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :اذاکنتم ثلاثة فلایَتَنَاجَی اثنان دون صاحِبِهما......فان ذالک یحزنه". (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم تین شخص ہوتو اپنے (تیسرے) ساتھی کو چھوڑ کر دو شخص سرگوشی نہ کریں کیونکہ یہ بات (طرز سرگوشی) اس کو غم میں ڈالتی ہے (یعنی وہ اس سے پریشان ہوجاتا ہے)۔

تشریح:۔ حدیث کے الفاظ میں راویوں کا تھوڑا سا اختلاف ہے لیکن اس سے حدیث کی صحت پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ معنوی لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں اس لئے امام ترمذیؒ نے لفظی اختلاف نقل کرنے کے بعد اس کو حسن وصحیح کہا ہے۔ بعض حضرات نے اس نفی کو اول اسلام پر محمول کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لئے سرگوشیاں کرتے تھے، جبکہ بعض شارحین نے اس کو سفر کی حالت پر محمول کیا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ حکم عام ہے اور آج تک باقی ہے، پھر اس نفی کی وجہ حدیث میں خود مذکور ہے "فان ذالک یحزنه" کہ تیسرا شخص تنہا رہ کر پریشان ہوجائے گا اور ممکن ہے کہ کوئی بدگمانی بھی اسے پریشانی میں ڈالے اس

علت کے مطابق چار میں سے تین کے لئے بھی الگ ہوکر سرگوشی ممنوع ہوئی اسی طرح دو آدمی ایک زبان کے ہوں اور تیسرا کسی دوسری زبان کا بولنے والا ہو تو اگر وہ اُن دو کی زبان نہ جانتا ہو تو ان کو بھی اپنی زبان میں بات نہیں کرنی چاہئے ہاں اگر تیسرے کی اجازت ہو یا وہاں دوسرے لوگ بھی موجود ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں چنانچہ مسلم کی روایت میں بھی اس علت کی طرف اشارہ ہے: ''حتیٰ تختلِطوا بالناس من اجل ان یحزنه''۔ (مسلم ص:۲۱۹ ج:۲) عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اس حدیث میں حُسنِ معاشرت اور آدابِ مجلس کا بیان ہے کہ آدمی کو کریمانہ اخلاق کے زیور سے اور مروت کی دولت سے آراستہ ہونا چاہئے اپنے ہمنشینوں کا خیال رکھنا چاہئے اور ان کی ایذاء رسانی سے بچنا چاہئے وغیر ذالک من الآداب۔ (هذا معنی ما فی عارضة الاحوذی لا لفظه)

باب ماجاء فی العِدَةِ

(ایفائے عہد کا بیان)

''عن ابی جُحیفةَ قال رأیتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم ابیض قدشابَ و کان الحسن بن عَلیّ یُشبِهُه، وَاَمَرَلنابثلاثة عشر قَلُوصاً فَذَهَبْنَا نقبِضُهافاتاناموتُه فلم یعطونا شیئا فلما قام ابوبکر، قال: من کانت له عندرسول الله صلی الله علیه وسلم عِدَة فلیجیئُ فقُمتُ الیه فاخبرته فَاَمَرَلنابها''. (حسن)

حضرت ابوجُحیفہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ گورے تھے اور بڑھاپا آچلا تھا آپ پر (یعنی کچھ بال آپؐ کے سفید ہوچکے تھے گو کل ملاکر ان کی تعداد بیس سے کم تھی) اور حسن بن علیؓ آپؐ کے مشابہ تھے (یعنی دونوں کے جسموں کے بالائی حصوں میں مشابہت تھی) اور آپؐ نے ہمارے لئے تیرہ جوان اونٹنیوں کا حکم دیا تھا، چنانچہ ہم (مدینہ) گئے تاکہ وہ اونٹنیاں لے لیں، تاہم اتنے میں ہمیں آپؐ کی وفات کی خبر پہنچی، تو انہوں نے ہم کو کچھ نہیں دیا (کیونکہ معاملات حکومت موقوف ہوچکے تھے) پھر جب ابوبکرؓ کھڑے ہوئے تو انہوں نے فرمایا جس سے کچھ وعدہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو وہ ہمارے پاس آئے (یعنی ہم سے رجوع کرے) پس میں ان کی طرف کھڑا ہوا اور حضورؐ کے وعدہ کا ذکر کیا تو انہوں نے ہمارے لئے ان اونٹنیوں کا حکم دیا۔

تشریح:۔قولہ:''عِدَۃ''اصل میں وعد تھا مشہور اعلال کی بناء پر عِدَۃ بن گیا ہے۔قولہ:'' قلوصا'' بفتح القاف جوان اونٹنی کو کہتے ہیں۔قولہ:''فلم یعطونا الخ'' یعنی جن کے پاس اونٹ تھے تو انہوں نے اُن سے ہمیں نہیں دیا مراد عاملین ہیں۔قولہ:''فلما قام ابو بکر''ای خطیباً او بامر الامامة یعنی خطبہ مراد ہے یا خلیفہ بننا مراد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آنے والے خلیفہ اور ارباب اقتدار کو اپنے پیش رو کے اور ورثہ کو اپنے مورث کے وعدے پورے کر لینے چاہئے یعنی جو جائز ہوں۔

باب ماجاء فی فِداک ابی وَاُمِّی

(میرے ماں باپ تجھ پر قُربان کا بیان)

"عن علی قال ماسمعتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم :جَمَعَ ابویه لِاَحَدٍ غیر سعد بن ابی وقاص...وبالسندالآخر...وفیه...قال له یوم اُحد:اِرمِ فِداک ابی واُمِّی ! وقال له:اِرمِ ایها الغلامُ الحَزَوَّرُ!".(حسن صحیح)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں سُنا ہے کہ آپؐ نے کسی کے لئے اپنے ماں باپ کو (فِداک میں) جمع کیا ہو سوائے سعد بن ابی وقاصؓ کے......دوسری حدیث میں ہے کہ......آپؐ نے احد کے دن سعدؓ سے فرمایا تیر چلا! میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں! اور آپؐ نے ان سے فرمایا: تیر چلا! اے پہلوان جوان!۔

تشریح:۔قولہ:''فِداکَ''فَدَی یفدی، جان چھڑانے کے لئے فدیہ دینا مثلاً قیدی کی آزادی یا جان بخشی کا بدلہ دے کر اسے آزاد کرایا جائے۔قولہ:''الحَزَوَّرُ''اصلاً تو اس لڑکے کو کہتے ہیں جو مراہق ہو یعنی جوانی کے قریب ہو لیکن یہاں مراد پہلوان اور طاقت ور ہے۔قولہ:''یوم احد''مراد جنگ احد ہے۔

اس حدیث سے حضرت سعدؓ کی بڑی منقبت معلوم ہوئی کیونکہ جو شخص محبوب ہو اسی پر لوگ قربان ہوتے ہیں اور اپنے ماں باپ اس پر قربان کرتے ہیں اور چونکہ ایسا کہنے سے کسی کو قربان کرنا لازم نہیں آتا اس لئے یہ کلمہ محض حوصلہ افزائی اور داد دینے کے لئے مستعمل ہوتا ہے تاکہ اس سے مخاطب وممدوح کی تشجیع کی جائے یا محبوبیت ظاہر کی جائے لہٰذا اس کلمہ کے کہنے میں جمہور کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے۔پھر حضرت علیؓ کا یہ کہنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے لئے فداک ابی وامی نہیں کہا ہے سوائے سعدؓ کے تو یہ ان کے اپنے علم کے مطابق ہے ورنہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن العوامؓ کے لئے بھی قریظہ کے دن فرمایا تھا "بابی وامی" جیسا کہ ان کے مناقب میں ان شاءاللہ آئے گا۔

باب ماجاء فی یابُنَیَّ

(کسی کو بیٹا کہنے کا بیان)

"عن انسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال له:یابُنَیَّ !". (حسن صحیح غریب)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (انسؓ) سے کہا اے میرے پیارے بیٹے!۔

تشریح:۔قولہ: "بُنَیَّ" تصغیر کا صیغہ ہے لیکن اردو میں بجائے چھوٹے کے پیارے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں "یابنی" بطور شفقت کہنے کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے یعنی کسی چھوٹے کو،اسی طرح کسی کو بھائی کہنا بھی جائز ہے "واما قول الرجل للصغیر: یابُنَی ......فانه جائز اجماعاً لانها شفقة و کرامة" بلکہ امام نوویؒ نے تو مستحب قرار دیا ہے۔

باب ماجاء فی تعجیل اسم المولود

(نومولود بچے کا نام جلدی رکھنا چاہئے)

"عن عمروبن شعیب عن ابیه عن جدّه ان النبی صلی الله علیه وسلم اَمَرَ بتسمية المولود یوم سابعه وَوَضعِ الاذی عنه والعَقّ". (حسن غریب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوزائیدہ بچے کے ساتویں دن نام رکھنے کا اور اس کے بال وناخن وغیرہ صاف کرنے اور عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

تشریح:۔یعنی نومولود بچے کا نام جلدی رکھنا چاہئے اس میں ساتویں دن سے زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہئے اگر کسی نے ساتویں دن سے پہلے نام رکھ دیا تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ سات یوم سے پہلے بلکہ ولادت سے قبل بھی نام رکھنا ثابت ہے: "ان الله یُبشرک بکلمة منه اسمه المسیحُ عیسی ابن مریم"۔(آل عمران آیت:۴۵) "ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد"۔(الصف: آیت:۶) اور "علّم آدم الاسماء کلها"۔(الآیہ) میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔پھر نام کا مقصد تعیین ذات اور تمیز کرنا

تو ہے ہی لیکن نام کا اپنا ایک اثر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادتِ شریفہ ہے کہ اشیاء میں تاثیرات پیدا فرماتا رہتا ہے اس لئے اہتمام بلکہ التزام کے ساتھ اچھے اچھے معنوں کے نام رکھنے چاہئے جن میں سب سے اچھے نام وہ ہیں جو آدمی کی بندگی اور عبدیت پر دلالت کریں اور اس سے اس کا بندۂ خدا ہونا معلوم ہوتا ہو جیسے بچی کے لئے اَمَۃُ اللہ رکھنا یعنی اللہ کی بندی اور بچے کے لئے عبداللہ یا عبدالرحمٰن یعنی خواہ اضافت اسم ذات کی طرف ہو یا اسماء صفات کی جانب جیسے عبدالعزیز۔ نیز صلحاء کے نام رکھنا بھی جائز ہے تاہم امام مالکؒ کے نزدیک فرشتوں کے نام رکھنا ثابت نہیں اس لئے نہیں رکھنا چاہئے جبکہ حضرت عمرؓ محمد نام رکھنے سے منع فرماتے کیونکہ لوگ ایک دوسرے کو کبھی بُرا بھلا کہتے ہیں اس لئے بے ادبی ہوگی، جمہور کے نزدیک تمام انبیاء علیہم السلام کے نام رکھنا جائز ہے۔ **قولہ: "ووضع الاذی"** اذی تکلیف دِہ چیز کو کہتے ہیں بہتر یہ ہے کہ اسے عام رکھا جائے تاکہ ختنہ، ناخن اور بالوں سب کو شامل ہو جائے۔ **قولہ: "والعَق"** اس کے معنی شق یعنی قطع کے آتے ہیں سر کے بال کاٹنے پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے اور عقیقہ پر بھی، جس کی تفصیل گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۳۹۴ ج: ۵ "باب ماجاء فی العقیقۃ")

باب ماجاء مایُستحب من الاسماء

(اچھے اچھے ناموں کا بیان)

"عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَحَبُّ الاسماء الی اللہ عبداللہ وعبدالرحمن". (حسن غریب)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ کو ناموں میں سے سب سے زیادہ پسند عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام ہیں۔

تشریح:۔ یعنی اللہ کو ایسے نام پسند ہیں جن سے آدمی کی بندگی اور خدائے تعالیٰ کی الوہیت وتوحید کا اظہار ہو جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے۔

باب ماجاء مایکرہ من الاسماء

(ناپسندیدہ ناموں کا بیان)

"عن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :لَأنهَيَنَّ ان يُسَمّىٰ رافع وبركة ويسار". (غريب)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بے شک میں منع کرتا ہوں رافع، برکت اور یسار نام رکھنے سے۔

حدیث آخر:۔ لاتُسَمِّ غلامک رَبَاح ولاافلح ولایسار ولانجیح یقال اَثَمّ هو؟فیُقال "لا". (حسن صحیح)

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے لڑکے (یاغلام) کا نام رباح نہ رکھو اور نہ افلح اور نہ ہی یسار اور نہ ہی نجیح رکھو کیونکہ اگر پوچھا جائے کہ وہ وہاں ہے؟ تو کہا جائے گا کہ نہیں ہے!

تشریح:۔ رافع کے معنی بلند وعالی کے ہیں۔ برکت کے معنی خیر کے اور یسار کے معنی آسانی وآسائش کے ہیں جبکہ رباح بمعنی سود ونفع کے۔ افلح بمعنی کامیاب اور نجیح بمعنی فتح مندی کے آتا ہے۔

ان ناموں کے معنی تو صحیح ہیں لیکن حدیث شریف میں بیان کردہ علت کے مطابق کل اگر کوئی پوچھے گا کہ برکت وغیرہ وہاں ہے؟ اور وہ مُسمّیٰ نہیں ہوگا تو جواب ملے گا کہ نہیں ہے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے الفاظ جن میں خیر وبرکت کی نفی ہوتی ہو پسند نہیں تھے۔ لیکن بظاہر مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی نہی کی وجہ بدشگونی سے روکنا تھا کیونکہ عام لوگ ایسی قسم کے الفاظ یعنی برکت نہیں ہے اور فلاح وافلح نہیں ہے سے بدفالی لیتے ہیں اس لئے لوگوں کو تطیُّر سے بچانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا لہٰذا جو شخص یا جو لوگ اس تطیُّر سے بچ سکتے ہیں جیسے عجمی لوگ عربی نام تو رکھتے ہیں لیکن پھر ان اسامی کے استعمال کے وقت ان کے معانی کی طرف ذھن نہیں جاتا تو ایسے لوگوں کے لئے کوئی ممانعت نہیں کیونکہ ان کے حق میں علت منتفی ہے۔ بہر حال ان ناموں سے نہی تحریم کے لئے نہیں بلکہ تنزیہ کے لئے ہے وہ بھی اس شخص یا اس قوم کے لئے جو بدشگونی کے تصور سے نہیں بچ سکتی تو سدذرائع کے طور پر ان کے لئے مکروہ ہے جیسے نومسلموں کو یہ مسئلہ درپیش رہتا ہے، علی ہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ

شاید یہ نہی شروع اسلام سے متعلق ہے۔ واللہ اعلم

حدیث آخر:۔ "عن ابی هريرة يبلغ به النبی صلى الله عليه وسلم قال: اَخنَعُ اسم عند الله يوم القيٰمة رجل تسمیّٰ بِمَلِک الاملاک قال سفيان شاهان شاه" (شهنشاه). (حسن صحيح)

قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بُرا نام اس آدمی کا ہوگا جس نے شہنشاہ نام رکھا ہو۔

قوله: "اخنع" امام ترمذیؒ نے اس کے معنی اقبح یعنی سب سے زیادہ قبیح بتائے ہیں جبکہ ملک الاملاک کے معنی امام سفیان بن عُیینہ نے شاھان شاہ بتلائے ہیں یعنی شاہِ شاہان جسے فارسی میں شہنشاہ کہتے ہیں۔ امام حمیدی شیخ البخاری نے اخنع کے معنی اَذَل ذکر کئے ہیں یعنی سب سے زیادہ ذلیل، یہ دونوں مطلب صحیح ہیں کیونکہ جو شخص اتنا بڑا دعوی کرتا ہے کہ وہ سارے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، یا بڑا بادشاہ ہے تو یہ دعوی اور بات اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ بھی ہے کیونکہ وہ آدمی اپنے مقصدِ تخلیق یعنی بندگی کی نفی کر رہا ہے۔ کہ ؎ زندگی آمد برائے بندگی، اور ایسا شخص قیامت کے دن اپنے اس نام اور غلط کام کی وجہ سے ذلیل ورسوا بھی ہوگا کہ وہ اپنی سلطنت ثابت کرے مگر وہ سرِ ذلت خم کئے ہوئے ہوگا۔ من تكبر وضعه الله

ان ابواب کی احادیث سے معلوم ہوا کہ اچھے نام رکھنے چاہئے خصوصاً جن سے بندگی وعاجزی کا اظہار ہوتا ہو، بُرے نام اور خصوصاً جن سے تکبر اور غرور ٹپکتا ہو سے بچنا چاہئے، نیز بزرگوں اور صلحاء کے نام بھی اچھے ناموں میں آتے ہیں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں انگریزوں اور فلمی اداکاروں کے نام رکھنے کا رجحان بھی جنم لے رہا ہے اس سے بچنا چاہئے۔

باب ماجاء فی تغيير الاسماء

(بُرے نام تبدیل کرنے کا بیان)

"عن ابن عمر ان النبی صلى الله عليه وسلم: غَيَّرَ اسم عاصِيَةَ وقال: انتِ جميلة"!. (حسن غريب)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عاصیہ کا نام بدل دیا اور فرمایا تم جمیلہ ہو۔

تشریح:۔ قوله: "عاصية" کے معنی نافرمان کے ہیں جبکہ جمیلہ خوبصورت کو کہتے ہیں نیک سیرت کو

جمیلہ کہتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کا نام نادانی سے غلط رکھا گیا ہو تو پھر اس کی یہی صورت ممکن ہے کہ اس کو تبدیل کر کے کوئی اچھا نام رکھا جائے، غلط نام پر اصرار و مداومت ہرگز نہ چاہئے۔ بعض لوگ اپنے نام کے ساتھ آثم ومذنب اور عاصی وغیرہ لکھتے ہیں الکوکب میں ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ اگلی روایت میں ہے کہ آپؐ بُرے ناموں کو تبدیل فرمایا کرتے تھے، عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ پہلی حدیث حسن وغریب ہے جبکہ دوسری مرسل ہے۔ تاہم اس کا مضمون صحیح ہے وہ مزید لکھتے ہیں کہ ایسے ناموں سے بھی بچنا چاہئے جو آدمی کے تزکیہ نفس پر دلالت کرتے ہوں تا کہ جھوٹ لازم نہ آئے، بہر حال نام کی اپنی ایک خداداد تاثیر ہوتی ہے اس لئے بُرے معنی کے الفاظ سے گریز ضروری ہے۔

باب ماجاء فی اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی)

"عن جبیر بن مطعمؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :إِنَّ لی اسماء، انا محمد وانا احمد وانا الماحی الذی یمحو اللہ بِیَ الکفر وانا الحاشر الذی یُحشَرُ الناس علی قَدَمَیَّ وانا العاقب الذی لیس بعدی نَبِیٌّ". (حسن صحیح)

حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے متعدد نام ہیں، میں محمد ہوں، میں احمد بھی ہوں، میں ماحی ہوں (یعنی مٹانے والا) کہ اللہ میرے ذریعہ کفر کو مٹاتا ہے، اور میں حاشر (جمع کرنے والا) ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر (یعنی میرے افتتاح سے) جمع کئے جائیں گے، اور میں عاقب (آخر میں آنے والا) ہوں کیونکہ میرے بعد کوئی (نیا) نبی نہیں۔

تشریح:۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ میرے پانچ نام ہیں "لی خمسة اَسماء" اس سے مراد مختص نام ہیں جو آپؐ سے پہلے کسی کے لئے نہیں رکھے گئے ورنہ نفس نام تو آپؐ کے بہت زیادہ ہیں، جن کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں تاہم ایک ہزار تک اسماء کا قول ہے ابن العربیؒ نے عارضہ میں ایسے ناموں کی تعداد جو ماثور ومنقول ہیں سڑسٹھ (۶۷) ذکر کی ہیں، مولانا موسیٰ خانؒ نے ۸۰۵ نقل کئے ہیں۔

ناموں کی کثرت سے صفات کی کثرت اور خوبیوں کا پتہ چلتا ہے چونکہ آپؐ کے بہت سارے اعلیٰ اوصاف ہیں اس لئے آپؐ کے نام بھی بسیار ہیں، قاضی عیاضؒ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اوصاف کے

مختلف پہلوؤں پر شفاء میں تفصیل سے بحث فرمائی ہے، یہ کتاب پچاس سے زیادہ پہلوؤں پر مشتمل ہے بہت سے علماء کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے صرف ایک ایک پہلو پر مستقل کتابیں لکھی ہیں مثلاً آپؐ بحیثیت استاذ وغیرہ ذالک۔

چنانچہ "محمد" نام اسی بناء پر رکھا گیا ہے یعنی اللہ نے آپؐ کے بزرگوں کے دلوں میں بطور الہام اس نام کا القاء کیا کہ وہ یہ نام تجویز کریں، چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم محمود ہیں ساری خلائق آپؐ کی مداح ہیں خصوصاً جب آپؐ مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ اور میدان محشر میں سوائے آپؐ کے کسی کو سفارش کی بظاہر ہمت نہیں ہوگی تو اس وقت آپؐ کی تعریف ومدح پر سب یک زبان ہوکر مدح کریں گے۔ اس لئے آپ "محمد" ہوئے یعنی جس کی بکثرت تعریف کی جاتی ہے چنانچہ ہر منبر پر آپؐ پر درود پڑھا جاتا ہے اور ہر اذان میں آپؐ کا نام لیا جاتا ہے جبکہ دنیا میں کوئی گھنٹہ ایسا نہیں گذرتا جب کہیں نہ کہیں اذان نہ ہوتی ہو۔

آپؐ احمد بھی ہیں یعنی کثرت سے تعریف کرنے والا، چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کوئی نہیں کرسکتا کہ آپؐ نے خود بھی سب سے زیادہ اللہ کی تعریف کی ہے اور آپؐ کی امت بھی اللہ کی ثناں خواں ہے جو آپؐ کی حمد شمار ہوتی ہے، گویا آپ محمد ہیں باعتبار محمودیت کے اور احمد ہیں باعتبار حامدیت کے۔ دونوں صیغے مبالغے کے ہیں۔ آپؐ مقام محمود میں جب سجدہ ریز ہوں گے تو آپؐ کو اللہ کی وہ تعریفات اور محامد القاء ہوں گے جو اس سے پہلے القاء والہام نہیں ہوئے، گویا مقام محمود میں آپؐ کی حامدیت بھی نقطہ عروج پر پہنچ جائے گی اور محمودیت بھی۔

اشکال:۔ آپؐ سے قبل تو بعض لوگوں کا احمد اور محمد نام ثابت ہے جبکہ تشریح میں ان ناموں کو آپؐ کا خاصہ قرار دیا ہے؟

حل:۔ دراصل جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ قریب ہوا تو آپؐ کے نام کا چرچا ہونے لگا لوگوں نے یہ نام اس منصب کے حصول کے لئے رکھا گویا یہ آپؐ کے اتباع میں رکھا لہٰذا یہ اگرچہ زماناً مقدم ہے لیکن رُتبۃً مؤخر ہی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے مہدی بننے کی خواہش میں بہت سے لوگوں نے مہدویت کا دعوی کیا اور بعض نے جیسے غلام احمد قادیانی نے عیسیٰ ہونے کا جھوٹا دعوی کیا تو جیسے ان دعوؤں اور ناموں کی کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں اسی طرح وہ نام بھی اصلی شمار نہیں ہوں گے۔

باب ماجاء فی کراهية الجمع بين اسم النبی ﷺ وکنيته

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور کنیت کو یکجا کرنا مکروہ ہے)

"عن ابی هريرة ان النبی صلی الله عليه وسلم :نهىٰ ان يجمَعَ احدٌ بين اسمه وکُنيته ويُسَمِّيٌ محمداً اباالقاسم". (حسن صحيح)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس سے کہ کوئی شخص جمع کرے آپؐ کے نام اور کنیت کو اور اپنا نام محمد ابوالقاسم رکھے۔

حدیث آخر:۔"عن جابر قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم :اذا تَسَمَّيْتُم بِی فلا تکنوا بی". (حسن غريب)

یعنی جب تم میرا نام رکھو تو میری کنیت مت رکھو!

ایک دفعہ بازار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے سُنا جو اباالقاسم کو آواز دے رہا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے اس نے کہا لم اعنک میں آپ کو مراد نہیں لے رہا تھا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"لاتکنوا بکنيتی"! میری کنیت نہ رکھو!۔

حدیث آخر:۔"عن علی بن ابی طالب انه قال يارسول الله!اَرأيت اِن وُلِدلی بعدک اُسَمِّيه محمداً واُکَنِّيه بِکنيتکَ؟قال"نعم" قال فکانت رخصةً لِیّ". (حسن صحيح)

حضرت علیؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! فرمایئے اگر آپ کے بعد میرا کوئی لڑکا پیدا ہوا تو میں اس کا نام محمد رکھوں؟ اور اس کی کنیت رکھوں آپ کی کنیت کے مطابق؟ آپؐ نے فرمایا"ہاں" حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ رخصت میرے ہی لئے خاص تھی۔

تشریح:۔ محشی نے اس بارے میں چھ اقوال نقل کئے ہیں:

(۱) پہلا قول: یہ ہے کہ ابوالقاسم کنیت مطلقاً ممنوع ہے خواہ کسی کا نام محمد ہو یا نہ ہو، یہ امام شافعیؒ واہل ظاہر کا مذہب ہے۔

(۲) جمہور کا قول یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میمون کے زمانہ تک محدود تھی تا کہ اشتباہ نہ رہے اب یہ منسوخ ہے لہٰذا ابوالقاسم کنیت مطلقاً جائز ہے۔اس پر ملا علی قاریؒ نے مرقات میں لکھا ہے کہ اسے منسوخ نہیں کہنا چاہئے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آج وہ علت باقی نہ رہی اس لئے کراہیت بھی ختم ہوگئی لیکن اس پر علامہ عینیؒ نے کہا ہے کہ نفی علت بھی نفی حکم کو مستلزم نہیں کیونکہ غسل جمعہ وغیرہ بہت سے احکام ہیں جن کی علتیں ختم ہوگئی ہیں مگر وہ احکام باقی ہیں (جیسے رمل فی الطواف)۔

(۳) ابن جریرؒ کے نزدیک نہی آج بھی باقی ہے لیکن تنزیہاً دیتاً دیا یہی قول ابن العربیؒ کا بھی ہے۔

(۴) نہی کا تعلق جمع بین الاسم والکنیت سے ہے امام ترمذیؒ کا میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے لہٰذا صرف ایک نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ باب کی پہلی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

(۵) ابوالقاسم کنیت اور اس کے ساتھ قاسم نام دونوں رکھنا مکروہ ہے۔

(۶) حضرت عمرؓ محمد نام رکھنے سے منع فرماتے تا کہ سوء ادب نہ ہو جائے۔چونکہ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ آپ کے بعد اگر میرا کوئی لڑکا پیدا ہوا الخ تو جمہور کہتے ہیں کہ چونکہ آپؐ کے بعد وہ علت سب کے حق میں ختم ہوگئی تھی لہٰذا تخصیص کی کوئی وجہ نہیں بلکہ رخصت عام ہوگئی، بہر حال جنگِ یمامہ میں حضرت علیؓ کے حصہ میں جو باندی آئی تھی ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کا نام آپؓ نے محمد اور کنیت ابوالقاسم رکھی دی تھی۔

باب ماجاء ان من الشعر حکمة

(بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں)

"عن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من الشعر حکمة". (غریب)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض شعر حکمت (مطابق واقعہ) ہوتا ہے۔

تشریح:۔باب کی اگلی روایت جو ابن عباسؓ سے مروی ہے اس میں بجائے حکمت کے حکماً کا لفظ ہے اس کا مطلب بھی حکمت ہے یعنی ہر شعر برا اور مذموم نہیں ہوتا اگر چہ عام شعراء تخیلات اور واہیات کو یکجا کرتے

37/1

اورعشقیہ اشعار کہتے ہیں لیکن اشعار میں بعض ایسے بھی ہیں جوواقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں جیسا کہ اگلے باب میں بیان ہوا ہے لہٰذا شعر کی حیثیت کلام کی سی ہے، جس میں اچھا بھی ہوتا ہے اور برا او مذموم بھی، البتہ شعر چونکہ ایک منظوم کلام ہوتا ہے اس لئے نفس اسے پسند کرتا ہے کہ اس کی فریکوینسی متناسب ہوتی ہے تو جب اس کا مضمون اچھا ہوتو وہ نفس میں بہت اچھی تاثیر کرتا ہے اس لئے وہ انتہائی مفید بن جاتا ہے لہٰذا حکمۃ بمعنی مفید لینا زیادہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی انشاد الشعر

(شعر گوئی کا بیان)

"عن عائشة قالت كان النبى صلى الله عليه وسلم :يَضَعُ لِحَسَّان مَنبراً فى المسجد يقوم عليه قائماً يفاخرعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اوقالت يُنافح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ويقول رسول الله صلى الله عليه وسلم :ان الله يُؤَيِّدُحَسّان بروح القدس مايفاخراوينافح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ".(حسن صحيح غريب)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابتؓ کے لئے مسجد میں منبر رکھواتے تھے، حسان اس پر کھڑے ہوجاتے اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فخریہ اشعار پڑھتے، یا فرمایا (ام المؤمنین نے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع (طرف داری) میں اشعار پڑھتے، اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: بے شک اللہ روح القدس (حضرت جبرئیلؑ) کے ذریعہ حسان کی مدد کرتا رہے گا تاوقتیکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے افتخار یا فرمایا کہ جواب دہی کرتے رہیں گے۔

تشریح:۔قوله:"انشادالشعر" اِنشاد اور اِنشاء میں یہ فرق ہے کہ انشاء بنانے کو کہتے ہیں جبکہ انشاد پڑھنے کو چاہے اپنے اشعار ہوں یا کسی دوسرے شاعر کے ہوں آپؐ سے انشاء ثابت نہیں بلکہ "وَمَاعَلَّمنه الشعرَ ومايَنبغي له "۔(سورۂ یٰس: آیت:۶۹) کی رو سے آپ کے لئے ممنوع ہے نہی تکوینی جبکہ انشاد میں اختلاف ہے، اس باب کی بعض احادیث سے اثبات معلوم ہوتا ہے۔

امام ترمذیؒ اس باب سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مطلق شعر گوئی مذموم یا ممنوع نہیں ہے کیونکہ اچھے اشعار مسجد میں پڑھنا بلکہ آپؐ کے سامنے صحابہؓ کا اشعار پڑھنا ثابت ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ اس کا اہتمام کرواتے اور فرماتے کہ حضرت جبرئیلؑ حسان کی مدد کرتے رہتے ہیں کیونکہ حضرت حسان کے

اشعار مسلمانوں کی ہمت افزائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور دفاع پر مشتمل ہوتے جن سے کفار کی ہجو بھی ہوتی اور ان کی حوصلہ شکنی بھی ہوجاتی اس بناء پر ان کے اشعار کی حیثیت جہاد کی مانند تھی اس لئے حضرت جبرئیل اللہ کے حکم سے مدد کے لئے تشریف لاتے جیسا کہ بدر میں فرشتوں کا نزول ہوا تھا۔

قولہ: "یفاخر" چونکہ اس کے معنی بھی دفاع کے ہیں اس لئے صلہ میں "عن" لایا گیا۔ قولہ: "ینافح" ای یدافع، چونکہ کفار اپنے بعض اشعار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض کرتے اس لئے حضرت حسان آپؐ کی طرف سے دفاع فرماتے اور چونکہ آپ ایک زبردست شاعر تھے اس لئے کفار ان کے اشعار کے آگے بے بس نظر آتے۔ قولہ: "یفاخر او ینافح" چونکہ راوی کو شک ہے کہ او پر کون سا لفظ بولا گیا ہے اسی پر یہاں مناسب جملہ کا ترتب ہوگا۔

دوسری حدیث:۔"عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل مکة فی عمرة القضاء وعبداللہ بن رواحة بین یدیه یمشی وھو یقول :

خَلُّوا بنی الکُفّار عن سبیله

الیوم نضربکم علی تنزیله

ضرباً یُذیل الھام عن مَقیله

ویُذھِلُ الخلیلَ عن خلیله

فقال له عمر: یا ابن رواحة! بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم تقول الشعر؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: خَلِّ عنه یا عمر فھی اسرع فیھم من نَضحِ النّبلِ".

(حسن غریب صحیح)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں عمرۃ القضاء کے لئے داخل ہوئے جبکہ عبداللہ بن رواحہؓ آپ کے آگے چل رہے تھے اور وہ مندرجہ ذیل اشعار پڑھ رہے تھے۔

کفار کی ذریت آپؐ کے راستہ سے ہٹو! ☆ آج ہم تم کو ماریں گے آپؐ کے اترنے پر (یعنی آپؐ پر نازل شدہ کتاب کے حکم سے) ایسی ضرب لگائیں گے جو کھوپڑی کو جدا کردے گی اپنی جگہ سے ☆ اور دوست سے دوست کی فکر بھلا دے گی۔

پس حضرت عمرؓ نے کہا: اے ابن رواحہ! کیا تم اللہ کے رسول کے سامنے اشعار پڑھتے ہو؟ تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرؓ! اسے رہنے (پڑھنے) دو بخدا! یہ اشعار کفار کو تیر مارنے سے زیادہ گراں گذرتے ہیں۔

قولہ: "علی تنزیلہ" ای علی حکم تنزیلہ۔ قولہ: "الھام" ہامۃ کی جمع ہے کھوپڑی اور سر کے اگلے حصے کو کہتے ہیں جہاں حس مشترک ہے۔ قولہ: "مَقِیلہ" قیلولہ کی جگہ یعنی آرام گاہ وٹھکانہ۔ قولہ: "یُذہِلُ" ذہول نسیان اور غفلت کو کہتے ہیں۔ قولہ: "اسرع فیھم" ای فی الکفار یعنی یہ اشعار کفار میں تیر پھینکنے سے زیادہ مؤثر ہیں۔ قولہ: "من نضح النبل" نبل تیر، اور نضح کے معنی برسانے اور بوچھاڑ کرنے کے ہیں۔

قولہ: "وروی فی غیر ھذا الحدیث ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل مکۃ فی عمرۃ القضاء وکعب بن مالک بین یدیہ وھذا اصح عندبعض اھل الحدیث لان عبداللہ بن رواحۃ قُتِلَ یوم مُؤتۃ وانما کانت عُمرۃ القضاء بعدذالک" یعنی بعض اہل حدیث کے نزدیک باب کی روایت سے زیادہ وہ روایت اصح ہے جس میں ہے کہ عمرۃ القضاء کے موقع پر یہ اشعار حضرت عبداللہ بن رواحہ کے نہیں بلکہ حضرت کعب بن مالک کے ہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن رواحہ تو غزوۂ موتہ میں شہید ہوگئے تھے جبکہ عمرۃ القضاء غزوۂ موتہ کے بعد ادا ہوا ہے۔ لیکن ابن حجرؒ نے امام ترمذیؒ کے اس تبصرہ پر تعجب کا اظہار کیا ہے حالانکہ عمرۃ القضاء میں حضرت جعفر، حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ کا بنت حمزہ رضی اللہ عنہ میں تنازعہ مشہور ہے، حالانکہ حضرت جعفرؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ تینوں موتہ میں شہید ہوئے ہیں۔ پس امام ترمذیؒ جیسے محدث پر یہ قضیہ کیسے مشتبہ ہوگیا؟ اگرچہ ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے لیکن موجودہ نسخہ جو کروخی کے اپنے خط کا ہے ہمارے پاس تمام طرق میں اسی طرح یعنی عمرۃ القضاء کے بارے میں۔

تیسری حدیث: عن شریح عن عائشۃ قال قیل لھا: ھل کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یَتَمَثَّلُ بشئی من الشعر؟ قالت کان یَتَمَثَّلُ بشعر ابن رواحۃ ویقول: ویأتیک بِالاَخبار من لم تُزَوِّد".

حضرت شُریح حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا: کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی شعر پڑھتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ہاں پڑھتے تھے، ابن رواحہؓ کا شعر پڑھتے اور فرماتے "ویأتیک بالاخبار الخ" اطلاعات دے گا تمہیں وہ جس کو تو نے توشہ نہیں دیا۔

قولہ: "یتمثل" اصل میں بطور مثال اور بطور استشہاد شعر پڑھنے کو کہتے ہیں مگر یہاں نفس پڑھنے کے

معنی میں ہے۔ قولہ: "بشعرابن رواحہ" حاشیہ قوت پر ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا کہ آپؐ کو شعر تمام باتوں سے زیادہ ناپسندیدہ تھا تاہم ایک دفعہ انہوں نے اخی بن قیس کا شعر پڑھا تو اسے آگے پیچھے کر کے پڑھا، ویاتیک ومن لم تزوّدِ بالاخبار ابوبکرؓ نے فرمایا ایسا نہیں ہے فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم "انی والله ماانا بشاعر وماینبغی لی" پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ آپؐ کے بطور نقل شعر پڑھنے میں اختلاف ہے، ہر فریق کے لئے دلائل موجود ہیں۔ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ شعر جو ابن رواحہ کی طرف منسوب کیا ہے یہ نسبت مجازی ہے کیونکہ یہ شعر دراصل طرفہ بن عبد بکری کا ہے، پورا شعر اس طرح ہے۔

سَتُبدی لک الایام ماکنت جاھلا

ویاتیک بالاخبار من لم تزوّد

زمانہ تیرے پاس بہت جلد وہ خبریں پیش کرے گا جن کو تو نہیں جانتا۔ اور خبریں لائے گا تیرے پاس وہ جسے تو نے توشہ نہیں دیا۔ من لم تزود میں "من" زمانہ اور ایام سے عبارت ہے یعنی مرور زمانہ کے ساتھ خود بخود مُفت میں آدمی کے سامنے خبریں آتی رہتی ہیں کیونکہ حوادث اور واقعات پیش آتے ہیں پھر ان پر آثار مرتب ہوتے ہیں اس طرح اسباب ومسببات کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اور زمانہ والے ان سے آگہی حاصل کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان اطلاعات کے لئے کسی قاصد کو زادراہ دے کر بھیجنا نہیں پڑتا بلکہ خواہی وناخواہی وہ اطلاعات روزانہ آتی رہتی ہیں۔

چوتھی حدیث:۔ "عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: اَشعَرُ کلمة تَکَلَّمت بھاالعرب کلمة لبید: اَلَاکُلُّ شئی ماخلاالله باطل". (حسن صحیح)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے اچھا شعر جو عربوں نے کہا ہے یہ کلام ہے "آگاہ ہو اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ اختتام پذیر ہے"۔

اس میں اشعر بمعنی اجود اور عمدہ کے ہے اور عرب سے مراد عرب شعراء ہیں یعنی عربی شعراء میں سب سے اچھا شعر لبید کا یہ شعر ہے۔ حضرت لبید بن ربیعہؓ کی آدھی زندگی شعر وشاعری میں گذری تھی مگر پھر اپنی قوم کے وفد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے اس کے بعد شاعری سے مکمل اجتناب کرتے رہے اور فرماتے بس میرے لئے قرآن کافی ہے کوفہ چلے گئے تھے اور ۴۱ھ میں وفات پائی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس شعر کی تعریف اس لئے فرمائی کہ یہ قرآن کے ساتھ موافق ہے۔

پانچویں حدیث:۔ ”عن جابربن سمرة قال جالستُ النبی صلی اللہ علیه وسلم اکثر من مائة مرة فکان اصحابه یتناشدون الشعروتذاکرون اشیاء من امرالجاهلیة وهو ساکت فَرُبمایتبسَّمُ معهم“. (حسن صحیح)

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سو مرتبہ سے بھی زیادہ بیٹھ چکا ہوں، آپؐ کے صحابہ اشعار پڑھتے تھے اور آپس میں امور جاہلیت کا مذاکرہ (تذکرہ) کیا کرتے تھے جبکہ آپؐ خاموش رہتے تھے اور کبھی ان کے ساتھ مسکراتے تھے۔

یہ روایت مسلم میں بھی ہے اس میں تصریح ہے کہ یہ نشست فجر کی نماز کے بعد ہوا کرتی تھی اور طلوع شمس تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا ”فاذاطلع الشمس قام وکانوایتحدثون فیأخذون فی امرالجاهلیة فیضحکون ویَتَبَسَّمُ“۔ (مسلم:ص:۲۳۵ج:۱) مثلاً کوئی کہتا کہ میں نے حیس (کھجور، پنیر اور گھی) کا بُت بنایا تھا لیکن قحط پڑا تھا تو میں نے اسے کھالیا، دوسرا کہتا کہ میں نے ایک دفعہ دیکھا کہ میرے بُت پر لومڑی چڑھ کر پیشاب کررہی تھی اس لئے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر مسلمان ہوگیا۔

باب ماجاء لَأن یَمتَلِیَٔ جوفُ احَدِکم قیحاً خیرله من ان یمتلیٔ شعراً

(پیٹ کا پیپ سے بھر جانا، شعر کے بھرنے سے بہتر ہے)

”عن سعدبن ابی وقاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :لَأن یَمتَلِیَٔ جوفُ احدکم قیحاً خیرله من ان یمتلیٔ شعراً“. (حسن صحیح)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اگر تم میں سے کسی ایک کا پیٹ، پیپ سے بھر جائے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اشعار سے بھر جائے۔ اور اگلی روایت جو حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے میں قیحاً کے بعد ”یَرِیه خیراله الخ“ کا اضافہ ہے یعنی وہ پیپ بھی ایسی ہو جو اس کے پیٹ کو سڑا کر بگاڑ دے اور فاسد کردے تب بھی وہ اشعار سے افضل ہے۔

تشریح:۔ قوله: ”یَرِیه“ رَاه یرِیه رَیهاً ووَرْی بروزن رَمْی وہ بیماری اور مواد جو پیٹ کو خراب

کردے، مطلب یہ ہے کہ غلط اشعار یا کثرت سے شعروشاعری کو معمول بنانا موذی بیماری سے بھی زیادہ تباہ کن ہے کیونکہ شاعری میں انہماک آدمی کو قرآن پاک سے غافل کردیتا ہے، جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

"ولهذا تجدمَن اكثرمِن سماع القصائدلطلب صلاح قلبه تَنْقُصُ رغبته فى سماع القرآن حتىٰ ربمايكرهه ومَن اكثرمن السفرالى زيارة المشاهد ونحوها لايبقى لحج البيت المحرم فى قلبه من المحبة الخ".

(اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم: ص:۲۱۷)

باب ماجاء فى الفصاحة والبيان

(بولنے میں تکلف کا بیان)

"عن عبدالله بن عمروٍ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان الله يَبغَضُ البليغَ من الرجال الذى يَتخَلَّلُ بلسانه كماتَتَخَلَّلُ البقرة". (حسن غريب)

بے شک اللہ ناپسند کرتا ہے لوگوں میں سے اس بلیغ آدمی کو جو باتوں کو اپنی زبان سے اس طرح لپیٹتا ہے جس طرح گائے (اپنی زبان سے چارہ کو) لپیٹتی ہے۔

تشریح:۔قولہ: "البليغ" یعنی فصاحت میں مبالغہ کرنے والا جو باتیں بنانے میں بہت تکلف کرتا ہے۔قولہ: "من الرجال" تخصیص مراد نہیں مگر مردوں میں فصاحت پیدا کرنے کا شوق زیادہ ہوتا ہے اگر کوئی عورت بھی یہ شوق رکھے جیسا کہ آج کل اس کی بھی رسم چلی ہے تو اس کو بھی یہ وعید شامل ہوگی۔قولہ: "يتخلَّلُ" گھماتا ہے اپنی زبان کو، اس بارے میں تفصیلی بحث پیچھے گذری ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو تکلف سے بچنا چاہئے یہ ضابطہ جیسے بولنے کا ہے ایسا ہی لکھنے والوں کے لئے بھی ہے کہ اپنی تقریر و تحریر میں اپنی استعداد کے مطابق بولنا اور لکھنا چاہئے، ہاں البتہ اگر کسی کو اللہ نے خداداد صلاحیت دی ہے یا وہ کثرت سے تقریر و تحریر پر عمل پیرا رہا ہے جس کے بعد مُسَجَّع عبارات خود بخود اس کی نوکِ زبان پر آنے لگیں تو وہ مذموم نہیں جیسے آپؐ کے خطبات وادعیہ میں یہ رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔

بابٌ

"عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: خَمِّروا الآنیةَ واوکُوا الاسقیةَ واجیفوا الابوابَ واطفئوا المصابیح فان الفُوَیْسِقَةَ رُبَمَا جَرَّت الفتیلة فاحرقت اهل البیت". (حسن صحیح)

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برتن کو ڈھانک دیا کریں! مشکیزہ کا منہ باندھا کیجئے! اور دروازے بند کیا کریں! اور چراغوں کو گل کیا کریں، کیونکہ کبھی کبھار چوہا بتی کو گھسیٹتا ہے اس طرح گھر والوں کو جلا دیتا ہے، یعنی رات کو سوتے وقت ان ہدایات پر عمل کریں!۔(یہ روایت بمع تفصیلی شرح تشریحات: ج:۶ص:۴۹ پر گذری ہے فلیراجع "باب ماجاء فی تخمیر الاناء واطفاء السراج الخ من ابواب الاطعمة")

بابٌ (بلا ترجمه)

(جانوروں کا بھی خیال رکھنا چاہئے)

"عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: اذا سافرتم فی الخِصبِ فاعطوا الابل حَظَّها من الارض واذا سافرتم فی السَّنَةِ فبادروا بها نقیها واذا عَرَّستُم فاجتنبوا الطریق فانها طُرُق الدوابِ ومأوی الهَوَامِّ باللیل". (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم شادابی میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین میں سے اُن کا حصہ دیا کرو! اور جب تم خشکی اور قحط زدہ جگہ میں (یا وقت میں) سفر کرو تو ان کو جلدی گذارو، ان کی قوت باقی رہنے کی خاطر! اور جب تم آخر شب میں آرام کے لئے اترو تو راستہ سے الگ ہو جاؤ اس لئے کہ وہ راستے ہیں جانوروں کے اور ٹھکانا ہے زہریلے کیڑوں کا۔

تشریح:۔ قوله: "خِصب" بکسر الخاء بروزن سِدر مراد وہ موسم ہے جس میں گھاس اور ہریالی بکثرت ہوتی ہے، ہریالی والی جگہ بھی مراد ہو سکتی ہے۔ قوله: "السنة" خصب کے مقابل ہے وہ زمانہ جس میں گھاس خشک ہو جاتی ہے جیسے خزاں کا مہینہ، مراد خشک جگہ بھی ہو سکتی ہے یعنی جب تم ایسی جگہ سے گذرو جہاں جانوروں کا

چارہ کثرت سے موجود ہو تو ایسے میں جانوروں کا خیال رکھو بایں صورت کہ وہاں کچھ دیر کے لئے پڑاؤ ڈالو تا کہ اونٹ چر جائیں اس کے برعکس جب چارہ نہ ہو تو وہاں سے جلدی گذرنے کی کوشش کرو تا کہ جانوروں کو بھوک لگنے سے پہلے پہلے مناسب جگہ پہنچ سکو تا کہ جانوروں کے چارے کا وہاں انتظام ہو سکے۔ اور جب تمہیں رات کو کہیں سونے اور آرام کرنے کے لئے اترنا پڑے تو راستہ سے ایک جانب ہو کر آرام کرو کیونکہ راستہ میں خطرہ ہوتا ہے وہاں سے چوپائیں بھی گزرتے ہیں اور موذی جانور بھی راستوں کی طرف آتے ہیں۔

قوله: "نقیها" نقی اصل میں ہڈی کے گودے کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد قوت ہے کیونکہ ہڈی کی نالیوں میں جب تک گودا ہوتا ہے تو طاقت قائم رہتی ہے جبکہ بھوک اور قحط کی وجہ سے اس میں کمی کی بناء پر کمزوری لاحق ہوتی ہے۔

باب (بلا ترجمہ)

(کھلی چھت پر نہیں سونا چاہئے)

"عن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان ينام الرجل على سطح ليس بمحجور عليه". (غريب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چھت پر سونے سے ممانعت فرمائی ہے جس (کے گرد منڈیر وغیرہ دیوار بنا کر اس) کو محفوظ نہ بنایا گیا ہو۔

تشریح:۔ ایسی چھت جس کے اطراف پر دیوار یا کوئی دوسری رُکاوٹ کرنے سے نہ ہو تو ایسی چھت پر سونے سے نیند کی حالت میں بھی گرنے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رات کو اُٹھنے کی ضرورت پیش آئے اور بے خیالی میں نیچے گر جائے۔ ہاں جو چھت بہت بڑی ہو اور گرنے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر کراہیت نہیں ہوگی۔

حدیث آخر:۔ "عن عبد الله قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخوّلنا بالموعظة في الايام مَخَافَةَ السَّآمَةِ علينا". (حسن صحيح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کرنے میں وقتاً فوقتاً ہماری نگہداشت فرماتے (یعنی ہمارا خیال رکھتے) اس خوف کے پیش نظر کہ ہم اُکتا نہ جائیں۔

تشریح:۔ قوله: "يَتَخَوَّلُنَا" خائے معجمہ کے ساتھ بمعنی دیکھ بھال کرنے اور خیال رکھنے کے ہے بعض

نے حائے مہملہ کے ساتھ بھی نقل کیا ہے پھر یہ حال سے بنا ہے ای یطلب احوالنا یعنی آپؐ ہمیں نشاط کی حالت میں وعظ فرماتے مگر خائے معجمہ والانسخہ اصح ہے امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں ترجمۃ الباب میں "یتخوّلھم" خائے معجمہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ قولہ: "مخافۃ السامۃ" مخافۃ مضاف اور بناء بر مفعول لہ منصوب ہے سامۃ بمعنی تھکن و ماندگی کے ہے، یعنی آنحضورؐ وعظ ونصیحت میں صحابہ کرامؓ کے شوق اور ماندگی دونوں کو ملحوظ رکھتے جب شوق ہوتا تو وعظ فرماتے اور جب تھکاوٹ محسوس فرماتے کہ صحابہ کرامؓ تھک گئے ہیں تو وعظ ختم فرماتے، یا روزانہ وعظ نہ فرماتے تا کہ صحابہ کرامؓ کا شوق نہ ٹوٹنے پائے، چنانچہ یہی آدابِ تبلیغ ہیں کہ مصروف اور تھکے ہوئے آدمی کو اس اندیشہ کے پیش نظر وعظ نہیں کہنا چاہئے کہ شاید اس کو اچھا نہ لگے۔

باب (بلا ترجمہ)

(اچھا عمل وہ ہے جو دائمی ہو)

"عن ابی صالح قال سُئِلت عائشۃُ و ام سلمۃ :اَیُّ العمل کان احَبَّ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟قالتا مادِیمَ علیہ وان قلَّ". (حسن صحیح غریب)

حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا عمل پسند تھا؟ دونوں نے فرمایا جس پر ہمیشگی و مداومت کی جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔ دوسری سند میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ عمل سب سے زیادہ پسندیدہ تھا جس پر ہمیشگی کی جائے۔ (صحیح)

تشریح:۔قولہ: "دِیمَ" ای دُووِمَ علیہ جو ہمیشہ کے لئے ہو ہمیشہ کا عمل اگرچہ قلیل ہو مگر وہ وقتی کثیر عمل سے اس لئے بہتر ہے کہ جب وہ تسلسل سے قائم رہے گا تو اس کی مقدار بالآخر بہت بڑھ جائے گی، دوم مداومت شوق اور محبت کی دلیل ونشانی ہے پس جو شخص عمل میں لگا رہتا ہے تو یہ اس کے شوق اور محبت کی نشانی ہے۔ اور یقیناً جو عمل محبت کے ساتھ ہوتا ہے وہ اللہ کو بہت پسند ہوتا ہے کہ اس میں عبدیت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے بخلاف عمل کر کے چھوڑنے کے کیونکہ یہ اسکتبار واستغناء کی نشانی ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے۔ لہٰذا ہر مومن کو چاہئے کہ جو بھی نیک عمل شروع کرے تو اسے ہمیشہ جاری رکھے۔
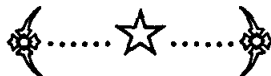
ابواب الامثال

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امثال، مَثَل بفتحتین کی جمع ہے اس کی مختلف ومتعدد صورتیں اور معانی ہیں تاہم یہاں بمعنی مثال کے ہے جیسا کہ اردو میں استعمال ہوتا ہے، لفظ مثال لغوی اعتبار سے بمعنی انتقال کے آتا ہے ''مَثَلَ فلان'' اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی اپنی جگہ سے ہٹ جائے، چونکہ عام لوگ محسوسات سے مانوس ہوتے ہیں اس لئے معقولات کا سمجھنا ان کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے خاص کر جب کوئی خالص معقولی امر ہو تو جب اس کی تشبیہ کسی محسوس چیز کے ساتھ دی جاتی ہے تو وہ معقول کالمحسوس ہو جاتا ہے اور جلد ہی سمجھ میں آ جاتا ہے، اس لئے کلام باری تعالیٰ میں اور انبیاء علیہم السلام اور دیگر حکماء کے کلام میں اَمثِلہ بکثرت بیان کی جاتی ہیں۔ گویا مثال میں معنی معقول سے محسوس کی طرف انتقال ہوتا ہے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ سوائے امام ترمذیؒ کے کسی محدث کو میں نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کتاب میں اَمثال کے لئے کوئی مستقل باب قائم کیا ہو اگرچہ امام موصوف نے بہت اختصار سے کام لے کر صرف چودہ احادیث ذکر فرمائی ہیں تاہم اس پر بھی ہم ان کے شکر گذار ہیں گویا امثال کے لئے مستقل باب باندھنا جامع ترمذی کی خصوصیت ہے۔

باب ماجاء فی مثل اللہ عزوجل لعبادہ

(اللہ عزوجل کی بیان کی ہوئی مثال کا تذکرہ)

''عن النَوّاس بن سِمعان الکِلابی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ ضرب مَثَلاً صراطاً مستقیماً علی کَنَفی الصراط زُورَان لھما ابواب مُفَتَّحة علی الابواب سُتُورٌ وداعٍ یدعُوا علی رأس الصراط وداعٍ یدعُو فوقَه ''واللہ یدعوا الی دار السلام ویھدی من یشاء الی صراط مستقیم'' والابواب التی علیٰ کَنَفی الصراط حدود اللہ فلایَقَعُ احدٌ فی

حدود اللہ حتیٰ یُکشَفَ السِّترُ والذی یدعُو من فوقه واعظ ربه". (حسن غریب)

حضرت نواس بن سمعانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے کہ ایک سیدھا راستہ ہے، اس راستہ کی دونوں جانبوں میں دو دیواریں ہیں، ان دیواروں میں کُھلے ہوئے دروازے ہیں، دروازوں پر پردے پڑے ہیں راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا پکارتا ہے (کہ سیدھا چلو) اور ایک دوسرا داعی اس کے اوپر سے پکارتا ہے، اور اللہ سلامتی کے گھر (جنت) کی طرف بلا رہا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اسے سیدھی راہ دکھاتا ہے، وہ دروازے جو راستہ کی دونوں طرف ہیں اللہ کی حدود ہیں پس کوئی شخص اللہ کی حدود میں اس وقت تک واقع نہیں ہوتا جب تک کہ پردہ نہ اُٹھایا جائے، اور جو داعی اس کے اوپر سے پکار رہا ہے وہ اس (مومن) کے رب کی طرف سے واعظ ہے۔

تشریح:۔ **قوله**: "ضرب" ای بَیَّنَ ۔ **قوله**: "صراطاً مستقیماً" مثلاً سے بدل ہے۔ **قوله**: "علی کنفی الصراط" کَنَف بروزن قمر جانب وطرف کو کہتے ہیں کَنَفی اس کا تثنیہ ہے۔ **قوله**: "زُوْرَان" بضم الزاء زُور کا تثنیہ ہے دیوار کو کہتے ہیں ایک روایت میں "سُوران" آیا ہے سُور بھی دیوار کو کہتے ہیں شاید زور، سور سے بنا ہے۔ **قوله**: "سُتُورٌ" سِتر کی جمع ہے بمعنی پردہ کے۔ **قوله**: "وداعٍ یدعُو فوقه" ای فوق الداعی الاول ۔ **قوله**: "واعظ رَبِّه" یعنی مومن کا قلب وضمیر یا مُلہم فرشتہ مراد ہے، الہام کے مقابل شیطانی وسوسہ ہے۔

حدیث شریف اور مثال کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہر مومن کے آگے اسلام کا سیدھا راستہ منزل تک پُہنچایا ہے جب آدمی اس راستہ پر چلتا ہے تو ابتدائے سفر سے راستہ کے آغاز ہی پر قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھا چلنے اور اِدھر اُدھر نہ جھانکنے کی تلقین کرتے ہیں کہ "**وَاَنَّ هذا صراطِی مستقیماً فاتَّبِعُوه ولاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فتفرَّق بکم عن سبیله ط ذالکم وَصّٰکم به لعلکم تتقون**"۔ (الانعام آیت: ۱۵۳) اور ارشاد ہے "**ان هذا القرآن یهدی لِلّتی هی اقومُ**"۔ (بنی اسرائیل: آیت: ۹)

اس راستہ کی دونوں جانب دیواروں میں کُھلے دروازے ہیں یہ مُحرّمات ہیں جیسے زنا وغیرہ ان دروازوں پر، پردے پڑے ہوئے ہیں جو حدود ہیں یعنی حرام وحلال کے درمیان حاجز اور رُکاوٹیں ہیں جیسے حَیا، مروت، عفت اور عار وغیرہ اسی طرح حرام وحلال کے درمیان محسوس پردے وحدود بھی ہیں جیسے خیطِ ابیض من الفجر رمضان میں حرام میں آدمی تب ہی واقع ہوتا ہے جب اس پردہ کو اٹھا دے اور آگے بڑھ جائے پس جب

مسلمان اسلام کے مطابق زندگی گذارتا ہے تو دورانِ سفر اِدھر اُدھر کے محرمات کی طرف خواہش مائل کر دیتی ہے تو آدمی یہ سوچتا ہے کہ صرف پردہ اٹھا کر جھانک لوں گا اس کے پیچھے گلی میں کیا ہے اندر جاؤں گا نہیں لیکن وہاں اوپر (غیب سے) ایک دوسرا داعی اسے پکارتا ہے کہ ارے! پردہ ہرگز نہ اُٹھاؤ ورنہ پھر واپسی نہ ہو سکے گی یہ دوسرا داعی مومن کا ضمیر یا فرشتے کا الہام ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے تو نفس و شیطان وسوسہ ڈالتا ہے کہ تھوڑا پردہ اٹھانے اور اندر جانے میں کیا حرج ہے؟ لیکن داعی روکتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ حرام کا اس طرح تجربہ کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اندر تک چلے جاتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہی چلتے جاتے ہیں، کتنے ایسے لوگ ہیں جو انسان کے قتل سے ڈرتے ہیں مگر ایک مرتبہ کسی کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد وہ اس کو پیشہ بناتے ہیں اور بعض لوگ شوقیہ بھی ایسا کرتے ہیں جبکہ اللہ والے مقدمات سے بچتے ہیں اس لئے وہ اصل گناہ سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔

قولہ: "**ولا تاخذوا عن اسماعیل بن عیاش الخ**" جمہور کے نزدیک اسماعیل کی روایت اگر شامیین سے ہو تو حجت ہے بشرطیکہ راوی ثقہ ہو لہٰذا امام ترمذیؒ نے ابو اسحاق کا یہ جو حکم نقل کیا ہے یا تو یہ غیر اہل شام کے بارے میں ہے یا پھر یہ ابو اسحاق کی اپنی رائے ہے، جو جمہور کے قول سے متصادم ہے۔

(۲)...... **حدیث آخر:۔ ان جابر بن عبداللہ الانصاری قال خرج علینا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً فقال: انی رأیت فی المنام کَاَنَّ جبرئیلَ عندرأسی ومیکائیل عندرِجلی یقول احدھما لصاحبہ: اِضرب لہ مثلاً فقال: اِسمع اَسَمِعَت اُذُنُک واعْقِل! عَقَلَ قلبُک اِنّما مَثَلُک وَمَثَلُ اُمتِک کمثل مَلِکٍ اِتّخذ داراً ثم بنیٰ فیھا بیتاً ثم جعل فیھا مائدۃ ثم بَعَثَ رسولاً یدعُو الناس الی طعامہ فمنھم من اجاب الرسول ومنھم من ترکہ فاللہ ھو المَلِک والدار الاِسلام والبیت الجنۃ وانت یا محمد رسول فمن اجابک دخل الاسلام ومن دخل الاسلام دخل الجنۃ ومن دخل الجنۃ اَکَلَ مافیھا".** (مرسل... وقدروی... باسناد اصح من ھذا جیسا کہ بخاری میں ہے)

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا۔ ہے گویا جبرئیلؑ میرے سر کے پاس ہیں اور میکائیلؑ میرے پیروں کے پاس ہیں، ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہتا ہے آپؐ کے لئے کوئی مثال بیان کرو! پس دوسرے نے (مجھ

سے) کہا سماعت فرمائیں! (دارمی کی روایت میں ہے: "لِتَنم عینُکَ ولِتسمَع اُذُنُکَ") اللہ کرے آپؐ کا کان سنے، اور سمجھیں! اللہ کرے آپ کا دل سمجھے، بے شک آپؐ کی حالت اور آپؐ کی امت کی حالت اس بادشاہ کی حالت جیسی ہے جس نے کوئی حویلی بنائی پھر اس میں ایک کمرہ (بیٹھک) تیار کیا پھر اس کمرہ میں دعوت (عام) کا انتظام کیا پھر ایک قاصد بھیجا جو لوگوں کو کھانے کی طرف بُلائے پس کچھ لوگوں نے قاصد کی بات مانی اور کچھ لوگوں نے اسے نظر انداز کر دیا پس اللہ تبارک وتعالیٰ بادشاہ ہے اور حویلی دین اسلام ہے اور کمرہ (بیٹھک) جنت ہے جس میں دستر خوان بچھا ہوا ہے اور آپؐ اللہ کے قاصد ہیں جو شخص آپؐ کی بات مانے گا وہ دائرہ اسلام میں آئے گا اور جو اسلام میں داخل ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جو جنت میں جائے گا وہ جنت کی نعمتیں کھائے گا۔

(۳)...... **حدیث آخر:**۔ "عن ابن مسعودؓ قال صَلّیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العشاء ثم انصرف فاخذبیدعبداللہ بن مسعود حتیٰ خرج به الی بطحاء مکة فَاَجلَسَه ثم خَطَّ علیه خطّاًثم قال: لَاتبرَحَنَّ خَطَّکَ فانه سینتهی الیک رِجالٌ فلا تُکَلِّمُهُمْ فانهم لن یکلّموک ثم مَضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیث اراد فبینا اناجالس فی خَطِّی اذ اَتَانی رجال کانهم الزُّطُّ اَشعارهم واجسامهم لااَرَیٰ عورةً ولااَرَیٰ قِشراً وینتهون اِلَیَّ ولایجاوزون الخطَّ ثم یصدرون الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اذاکان من آخرالليل، لکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدجاء نی واناجالس فقال: لقداَرَانی مُنذالليلة ثم دخل عَلَیَّ فی خَطِّیَ فَتَوَسَّدَ فَخِذِی فَرَقَدَوکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذارقدنفخ فبینااناقاعدورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متوسِّدفخذی اذاانابرجال علیهم ثیاب بِیضٌ، اللّٰهُ اعلم مابهم من الجمال فانتهوااِلَیَّ فجَلَسَ طائفة منهم عندرأس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وطائفة منهم عند رجلیه ثم قالوابینهُم: مارأیناعبداًقَطُّ اُوتی مثل مااُوتی هذاالنبی صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ عینیه تنامان وقلبه یقظان اضربواله مَثَلاً، مَثَلَ سیِّدٍ بَنیٰ قصراً ثم جعل مائدة فدعاالناس الی طعامه وشرابه فمن اجابه اکل من طعامه وشرب من شرابه ومن لم یجبهُ عاقبه اوقال عذَّبه ثم ارتفعواواستیقظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عندذالک فقال: سَمِعتُ ماقال هٰؤلاء وهل تدری من هم؟ قلتُ اللہ ورسوله اعلم قال: هم الملائکة فتدری ماالمثل الذی ضربوه؟ فقلتُ اللہ ورسول اعلم قال المثل الذی ضربوه

الرحمن بَنَى الجنة ودعا اليها عِباده فمن اجابه دخل الجنة ومن لم يجبه عاقبه او عَذَّبَه". (حسن صحيح غريب)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے (یہ واقعہ مکی دور کا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھی، پھر آپؐ جانے لگے پس عبداللہ بن مسعودؓ کا ہاتھ پکڑا یہاں تک کہ آپؐ ان کو مکہ کے پتھریلی میدان کی طرف لے گئے پس آپؐ نے ان کو بٹھایا اور ان کے گرد ایک خط کھینچا پھر فرمایا آپ ہرگز اپنے دائرہ سے نہ نکلیں پس بے شک شان یہ ہے کہ آپ کے پاس کچھ لوگ (جنات) آئیں گے! آپ ان سے بات نہ کریں کیونکہ وہ بھی آپ سے بات نہیں کریں گے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے جہاں آپ چاہ رہے تھے، پس دریں اثناء کہ میں اپنے دائرہ میں تھا کہ یکا یک میرے پاس کچھ لوگ آئے جیسے وہ زُطّ (جاٹ) کے ہیں (یہ قوم ہندوستان اور سوڈان وغیرہ میں آباد ہے) ان کے بال اور ان کے جسم اُن (زطیوں) جیسے تھے، نہ تو میں ننگے دیکھتا تھا اور نہ ہی ان پر کپڑے دیکھتا تھا (یعنی ان کے جسموں پر اگر چہ لباس نہیں نظر آتا تھا مگر ان کا ستر اور کھالیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں) وہ لوگ میرے پاس پہنچے مگر دائرہ کے اندر نہیں آئے پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے یہاں تک کہ جب رات آخر ہوگئی (پھر بھی وہ لوگ نہیں لوٹے) لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے جبکہ میں بیٹھا ہوا تھا، آپؐ نے فرمایا واقعہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا اپنے تئیں آج رات (یعنی میں پوری رات نہیں سویا) پھر آپؐ میرے پاس دائرہ میں داخل ہوئے اور میری ران کو تکیہ بنا کر سو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سوتے تو خراٹے لیتے تھے پس دریں اثنا کہ میں بیٹھا ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ران کو تکیہ بنا کر سوئے ہوئے تھے پس اُچانک میرے پاس کچھ لوگ آئے جنہوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں اُس خوبصورتی کو جو ان کو حاصل تھی (یعنی وہ نہایت حسین تھے) پس وہ میرے پاس پہنچے اس میں سے ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کے پاس بیٹھی اور دوسری جماعت ان کی، آپؐ کے پیروں کے پاس بیٹھی (یہ سب فرشتے تھے اور ان میں حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ تھے جیسا کہ سابقہ روایت میں ہے) پھر انہوں نے آپس میں کہا ہم نے کبھی کوئی بندہ ایسا نہیں دیکھا جو دیا گیا ہو ان کمالات کے مانند جو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیئے گئے ہیں، ان کی دونوں آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کا دل بیدار ہے ان کی کوئی مثال بیان کرو! (مثال) آپؐ کا حال اس آقا (سردار) کے حال جیسا ہے، جس نے کوئی حویلی بنائی پھر دعوت کا انتظام کیا اور لوگوں کو اپنے کھانے اور پینے کی طرف بلایا، پس جس نے اس دعوت کو قبول کیا تو وہ اس کے

کھانے سے کھائے گا اور اس کے پینے سے پئے آئے گا، اور جس نے وہ دعوت قبول نہیں کی تو سزا دے گا وہ سردار (راوی کو شک ہے کہ لفظ "عَاقَبَه" فرمایا ہے یا "عَذَّبَه" مطلب دونوں کا ایک ہے) پھر وہ لوگ (فرشتے) اُٹھ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بیدار ہوئے پس آپؐ نے فرمایا جو کچھ انہوں نے کہا وہ میں نے سُن لیا! اور کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون لوگ تھے؟ میں نے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلم، آپؐ نے فرمایا یہ فرشتے تھے اور کیا تم جانتے ہو جو مثال انہوں نے بیان کی وہ کیا تھی؟ میں نے کہا اللہ ورسوله اعلم آپؐ نے فرمایا انہوں نے جو مثال بیان کی (اس کی حقیقت) یہ ہے کہ اللہ نے جنت بنائی اور اس کی طرف اپنے بندوں کو بلایا پس جس نے اس کو قبول کیا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو قبول نہیں کرے گا اسے اللہ عذاب دے گا۔

دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے میں بھی بیداری کی حالت کی طرح بات کو سُنتے اور سمجھتے اگرچہ آنکھیں بند رہتی تھیں اس لئے کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں کیونکہ ان کے قلوب پر کبھی بھی غفلت نہیں آتی ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ سابقہ روایت میں "سَمِعَت اُذُنک اور عَقَل قلبُک" دعائی جملے ہیں مگر اس کے ساتھ معنی اخباری پر بھی مشتمل ہیں۔

قولہ: "کانھم الزُط" اس کا واحد زُطی آتا ہے ایک قبیلہ ہے محشی نے نقل کیا ہے کہ یہ لوگ سوڈان اور ہندوستان میں بستے ہیں۔ **قولہ:** "اشعارھم واجسامھم" دونوں منصوب بنزع الخافض بھی ہو سکتے ہیں ای کانھم الزُطُّ فی اشعارِھم واجسامِھم یعنی ان کے بال اور جسم زطیوں کی طرح تھے، اور بناء بر مبتداء مرفوع بھی ہو سکتے ہیں اس صورت میں خبر محذوف ہوگی ای اشعارھم واجسامھم مثلُ الزُطِّ۔ زط بضم الزاء وتشدید الطاء پڑھا جاتا ہے۔

چونکہ وہ پہلے لوگ جنات تھے اس لئے وہ دائرہ کے اندر نہ آسکے جبکہ دوسرے فرشتے تھے وہ اندر تشریف لے آئے کیونکہ وہ لکیر جنات کے لئے تھی، تاکہ حفاظت رہے۔

باب ماجاء مَثَلُ النبی والانبیاء صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین وسلّم

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی مثال)

"عن جابربن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انمامَثَلِی وَمَثَلُ الانبیاء کَرَجُلٍ بَنیٰ داراً فاکملھاواَحسنھااِلّاموضع لَبِنَۃٍ فجَعَلَ الناس یدخلونھاویتعَجَّبُون منھاویقولون لولاموضع اللبنۃ". (حسن صحیح غریب)

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال اور انبیاءؑ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے ایک گھر بنایا اور اسے پورا کر دیا اور بہت خوبصورت بنایا سوائے ایک اینٹ کی جگہ کے (کہ اسے خالی رکھا) پس لوگ داخل ہونے لگے اس گھر میں اور اس سے تعجب کرتے رہے اور کہتے تھے کہ کاش یہ ایک اینٹ کی جگہ خالی نہ ہوتی (تو کیا خوب ہوتا)

تشریح:۔ یہ تشبیہ تمثیلی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مُشَبّہ کے اوصاف میں سے ایک وصف کی تشبیہ دی جائے مُشَبّہ بہ کے اوصاف میں سے ایک وصف کے ساتھ، علیٰ ہذا یہاں مشبہ کے مفرد اور مشبہ بہ کے جمع ہونے پر اعتراض وارد نہیں ہوگا۔ اس تشبیہ کے بارے میں ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے کہ مجھے کسی سے تسلی بخش وضاحت نہ ملی پھر میں نے خود سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپؐ اس عمارت کی بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اگر آپؐ نہ ہوتے تو ساری عمارت گر جاتی، لیکن الکوکب الدری میں جو مطلب حضرت گنگوہیؒ نے بیان کیا ہے وہ اس اعتبار سے زیادہ اچھا ہے کہ اس سے باقی انبیاءؑ کے ادیان کی تنقیص کی طرف اشارہ نہیں ہوتا ہے بلکہ امتوں کا نقصان ہی ان کے مذاہب میں کمی کا سبب بنایا گیا ہے یعنی جب سابقہ امتوں کے لوگ کمزور تھے اس لئے ان کو ان کی شان کے مطابق شریعتیں دے دی گئیں اگرچہ وہ شریعتیں تو کامل تھیں مگر وہ لوگ اپنی عقلی کوتاہی کی بناء پر شرائع کے اسرار و رموز کو نہ جان سکے مثلاً وہ معقولات کے زیادہ ادراک سے قاصر تھے تو ان کو محسوس معجزات دکھائے گئے جبکہ آپؐ کی آمد کے وقت انسان طفولیت اور پھر جوانی کے مراحل سے گذر کر سنجیدگی کے دور میں داخل ہو گیا تھا اس لئے آپؐ کو قرآن کا معجزہ دے دیا گیا جو قیامت تک باقی ہے اور اہل عقل وارباب

دانش کے لئے عقل وفکر آزمانے، مسائل مستنبط کرنے اور اس کے عجائبات سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک بحر بے کنار ہے، اسی پر قیاس کرلیا جائے اخلاق اور باقی احکام کی تکمیل کو" قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بُعِثتُ لِاُتمم مکارم الاخلاق " اور چونکہ کمال واتمام کے بعد پھر کوئی درجہ نہیں اس لئے آپؐ پر نبوت کا خاتمہ ہوا۔

باب ماجاء مَثَلُ الصلوٰة والصيام والصدقة

(نماز، روزہ اور صدقہ کی مثال)

"عن زيد بن سلاّم ان اباسلاّم حدثه ان الحارث الاشعرى حدثه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان الله اَمَرَ يحيىٰ بن زكريابخمس كلمات اَن يعملَ بهاويَأمُرَبنى اسرائيل ان يعملوابها، وانه كاداَن يُبطِئَ بهافقال عيسىٰ ان الله اَمَرَك بخمس كلمات لِتعمل بهاوتأمربنى اسرائيل اَن يعملوابهافَاِ مّااَن تأمُرَهم واِمّااَن ا مُرَهم افقال يحيىٰ اَخشىٰ اِن سَبَقتَنِى بهااَن يُخسَفَ بى اواُعَذَّبَ فجمع الناس فى بيت المقدس فامتلأ (المسجد)وقعدواعلى الشُرَفِ فقال: ان الله اَمَرَنى بخمس كلمات ان اعمل بهن واٰمُرَكم ان تعملوابهن اَوّلُهُنَّ ان تعبدوالله ولاتشركوابه شيئاً وان مثل من اشرك بالله كمثل رجل اشترى عبداً من خالص ماله بذهب اووَرِقٍ فقال هذه دارى وهذاعملى فاعمَل واَدِّاِلَىَّ! فكان يعمل ويؤدّى الى غير سيده فايكم يرضى ان يكون عبده كذالك(۲)....وان الله اَمَرَكم بالصلوٰة فاذاصليتم فلا تلتفتوا فان الله ينصب وجهَه لوجه عبده فى صلوٰته مالم يلتفت (۳)...وامركم بالصيام فان مَثَلَ ذالك كمثَل رجل فى عِصابة معه صُرَّةٌ فيهامسك فكلهم يعجب اويعجبه ريحهاوان ريح الصائم اطيب عندالله من ريح المسك (۴)...واٰمُرُكم بالصدقة فان مَثَلَ ذٰلك كمثَلِ رجل اَسَرَه العَدُوُّ فاوثقوايده الى عُنُقِه وقَدّموه ليضربوا عُنُقَه فقال: اَنَااَفدِيه منكم بالقليل والكثيرففَدانفسه منهم(۵)...واٰمُرُكم ان تذكروالله فان مَثَلَ ذالك كمثل رجل خرج العدوُّ فى اَثَرِه سِراعاً حتىٰ اذااَتىٰ على حِصن حَصِين فاحرَزنفسَه منهم كذالك العبد لايُحرِز نفسَه من الشيطان الابذكرالله

...قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: وانا اٰمرکم بخمس: اللہُ اَمَرَنی بھن السمع والطاعة والجھاد والھجرة والجماعة فانہ من فارق الجماعة قِیدَشِبر فقد خلع رِبقة الاسلام من عُنُقِہ اِلّاان یُراجِع ومَن ادّعیٰ دعوَیٰ الجاھلیة فانہ مِن جُثیٰ جھنم فقال رجل: یارسول اللّٰہ! وان صلیٰ وصام؟ فقال وان صلیٰ وصام فادعوا بدعوی اللہ الذی سَمّٰاکم المسلمین المؤمنین عباداللّٰہ!". (حسن صحیح غریب)

حضرت حارث اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت یحییٰؑ کو پانچ باتوں کا حکم دیا کہ وہ ان پر (خود بھی) عمل کریں اور بنی اسرائیل کو حکم دیں کہ وہ ان پر عمل کریں، اور بے شک یحییٰ قریب تھے کہ ان باتوں (کے اظہار) میں دیر کرتے، پس حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ باتوں کا حکم دیا ہے تاکہ آپ ان پر عمل کریں اور بنی اسرائیل کو حکم دیں کہ وہ بھی ان پر عمل کریں، پس یا تو آپ ان کو حکم دیں یا پھر میں ان کو حکم دوں گا! یحییٰ (علیہ السلام) نے کہا اگر آپ نے مجھ سے یہ باتیں بتانے میں سبقت کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے زمین میں دھنسا دیا جائے یا فرمایا مجھے سزا دی جائے (یعنی آپ نہ بتائیں بلکہ میں ہی بتاؤں گا) چنانچہ آپ نے لوگوں کو بیت المقدس میں جمع کیا پس مسجد بھر گئی اور لوگ بالکنیوں میں بیٹھے، پس یحییٰ (علیہ السلام) نے فرمایا بے شک اللہ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم دیا ہے تاکہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور آپ لوگوں کو بھی ان کا حکم دوں تاکہ آپ لوگ بھی ان پر عمل کریں۔ (۱)...ان میں سے پہلی بات (مثال) یہ ہے کہ آپ لوگ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور اس شخص کی مثال جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اس شخص جیسی ہے جس نے کوئی غلام اپنے ذاتی مال سے سونا یا چاندی سے خریدا، پس اس نے (غلام سے) کہا یہ میرا گھر ہے اور یہ میرا کام ہے پس تو کام کر اور آمدنی مجھے دیا کرو! پس وہ کام کرنے لگا اور آمدنی اپنے آقا کے علاوہ (کسی اور) کو دینے لگا، بتاؤ تم میں سے کون راضی ہوگا کہ اس کا غلام ایسا کرے؟؟؟

(۲)......اور بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے پس جب تم نماز پڑھو تو اِدھر اُدھر نہ جھانکو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی نماز میں اپنا چہرہ (کما یلیق بشانہ تعالیٰ) اس کے چہرے کے سامنے کر دیتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت بندے کی طرف کامل متوجہ ہوتی ہے) جب تک وہ اِدھر اُدھر نہ جھانکے۔

(۳)......اور اللہ نے تمہیں روزوں کا حکم دیا ہے بے شک روزوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو کسی

38/2

مجمع میں ہو اُس کے پاس ایسی تھیلی ہو جس میں مشک ہو پس سب لوگ حیرت کر رہے ہوں یا فرمایا کہ مشک کی خوشبو ان کو حیرت زدہ کئے ہوئے ہو اور بے شک روزہ دار (کے منہ) کی بُو اللہ کے نزدیک مشک کی بُو سے زیادہ پسندیدہ ہے (اس کا مطلب ابواب الصوم میں گذرا ہے)۔

(۴)......اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں خیرات کرنے کا حکم دیا ہے بے شک اس کی مثال اس آدمی جیسی ہے جس کو دشمن نے قید کیا ہو پس انہوں نے اس کے ہاتھ کو اس کی گردن سے باندھ دیا ہو اور انہوں نے اس کو آگے بڑھایا ہو تا کہ اس کی گردن ماریں، پس اس شخص نے کہا میں تم سے اپنی جان چھڑاتا ہوں ہر قلیل اور کثیر کے ذریعہ (یعنی سب کچھ دینے کو تیار ہوں) چنانچہ اس نے اپنے نفس کا ان لوگوں کو بدلہ (عوض) دے دیا (اور قتل سے بچ گیا اسی طرح صدقہ عذاب سے بچاتا ہے)۔

(۵)......اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اللہ کو یاد کرو کیونکہ اللہ کے ذکر کی مثال اس شخص جیسی ہے جس کے پیچھے دشمن تیزی سے چلا آ رہا ہو یہاں تک کہ جب وہ شخص کسی مضبوط قلعہ پر پہنچا تو اس نے اپنے آپ کو ان دشمنوں سے محفوظ کر لیا اسی طرح بندہ شیطان سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کر سکتا مگر اللہ کے ذکر کے ذریعہ (پس دشمن شیطان ہے اور ذکر قلعہ ہے)...... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی آپ لوگوں کو ایسی ہی پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: (۱) امیر کی بات سُننا (۲) امیر کی فرمان برداری کرنا (۳) جہاد کرنا (۴) ہجرت کرنا (۵) جماعت (اہل حق) کے ساتھ لگا رہنا کیونکہ جو شخص جماعت سے بقدر ایک بالشت کے جُدا ہوا اس نے اسلام کا پھندا اپنی گردن سے نکال دیا مگر یہ کہ وہ جماعت کی طرف لوٹ آئے اور جو شخص پکارتا ہے جاہلیت جیسا پکارنا (یعنی فتنہ وفساد پر اُکساتا ہے) یقیناً وہ جہنم کے انگاروں میں سے ہے، پس ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول! اگر چہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو؟ آپؐ نے فرمایا اگر چہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو۔ پس تم اللہ کی پُکار کے ساتھ پُکارو، وہ پُکار جس سے اللہ تعالیٰ نے تم مسلمانوں اور مؤمنوں کا نام رکھا......اے اللہ کے بندو!

تشریح: ۔قولہ: "وانہ کادان یبطئ" تاخیر کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ سوچ رہے تھے کہ بنی اسرائیل کو کس طرح سمجھاؤں؟ قولہ: "فامتلأ" یعنی مسجد بھر گئی اور لوگ بلندیوں پر بیٹھ گئے کیونکہ فرش پر جگہ خالی نہیں بچی تھی۔قولہ: "شرف" بضم الشین وفتح الراء شُرفۃ کی جمع ہے بروزن غرفۃ۔قولہ: "حِصن" بکسر الحاء قلعہ اور حصین بمعنی محکم اور مضبوط کے ہے۔قولہ: "وانا اٰمُرُکم بخمس الخ" چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع

الکلم عطاء کئے گئے تھے اس لئے آپؐ کی یہ پانچ باتیں بظاہر مقدار میں قلیل ہیں لیکن قدر میں کثیر ہیں کیونکہ ان سے کوئی بات باہر نہیں رہتی۔

حدیث میں مندرجہ باتوں پر پیچھے شرح میں مختلف مواقع پر تفصیلاً ابحاث گذر چکی ہیں۔ قولہ: "من ادّعی دعوی الجاهلية" یہ پانچ باتوں پر اضافہ ہے کیونکہ امت کا اس میں مبتلاء ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے آپؐ نے بطور خاص اس کا ذکر کیا دعوی جاہلیت سے مراد بے جا قومی عصبیت ہے اور شرکی الفاظ بھی ہو سکتے ہیں۔

باب مثل المؤمن القارئ للقرآن وغير القارئ

(قرآن کی تلاوت کرنے اور نہ کرنے والے کی مثال)

"عن ابی موسیٰ الاشعری قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: مَثَلُ المؤمن الذی یقرأ القرآن کمثل الاُترنجة ریحها طیّب وطعمها طیّب، ومثل المؤمن الذی لایقرأ القرآن کمثل التمرة لاریح لها وطعمها حُلوٌ، ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن کمثل الریحانة ریحها طیّب وطعمها مُرٌّ، ومثل المنافق الذی لایقرأ القرآن کمثل الحنظلة ریحها مُرٌّ وطعمها مُرٌّ". (حسن صحیح)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس مؤمن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اس تُرنج کی مانند ہے جس کی خوشبو بھی اچھی اور ذائقہ بھی عمدہ ہے، اور وہ مؤمن جو قرآن نہیں پڑھتا ہے اس کی مثال کھجور کی ہے جس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی تاہم اس کا مزہ شیرین ہوتا ہے، اور اس منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے ریحان (نازبو) کی ہے جس کی بُو عمدہ ہوتی ہے مگر ذائقہ کڑوا ہوتا ہے، اور اس منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کی ہے جس کی بُو بھی کڑوی (کریہ) ہوتی ہے اور ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے۔

تشریح:۔ یعنی قرآن پڑھنے والے مومن کا ظاہر اور باطن دونوں اچھے ہیں اس کے برعکس قرآن کی تلاوت نہ کرنے والے منافق کا ظاہر اور باطن دونوں خبیث ہیں جبکہ تلاوت نہ کرنے والے مومن کا باطن تو ایمان کی وجہ سے اچھا ہے لیکن اس کا ظاہر اچھا نہیں لگ رہا ہے کیونکہ قرآن سے دوری اگر چہ ظاہری ہو مؤمن کے ظاہر کو بدنما بناتی ہے اس کے برعکس قرآن کی تلاوت کرنے والے منافق کا ظاہر تو اچھا ہے لیکن باطنی خباثت کی وجہ سے پوشیدہ فائدہ نہیں ہے تاہم اگر منافق سے مراد عملی منافق ہو تو پھر کہا جائے گا کہ اس کا باطن فی الجملہ

خبیث ہے۔(تدبر)

قولہ: "ترنج" ایک مشہور پھل ہے مالٹے کی طرح ہوتا ہے لیکن پیلا ہوتا ہے کھٹا ہونے کی وجہ سے ہاضم ہوتا ہے جبکہ حنظلہ خربوزے کی مانند چھوٹے چھوٹے پھل ہوتے ہیں جو بدمزہ اور بدبودار سے ہوتے ہیں اُردو میں اندرائن کہلاتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :مَثَلُ المؤمن کمثل الزرع لاتزال الریاح تُفَیِّئُه ولایزال المؤمن یُصیبه بلاءٌ ،ومثل المنافق کمثل شجرة الاَرَزِ لاتهتزُّ حتیٰ تُستحصَدَ". (حسن صحیح)

مؤمن کی مثال کھیتی کی مانند ہے ہوائیں ہمیشہ اس کو جھکاتی رہتی ہے، اور مؤمن (بھی) ہمیشہ رہتا ہے کہ پہنچتی ہے اس کو آزمائشیں، اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی طرح ہے وہ ہلتا نہیں یہاں تک کہ اسے جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

یعنی جس طرح فصلوں پر مختلف سمتوں سے ہوائیں آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب کی بار یہ فصل ختم ہو جائے گی لیکن ایک جانب لیٹ جانے اور گر جانے کے باوجود وہ دوبارہ سیدھی کھڑی ہونے کی کوشش کرتی ہے اور اتنے میں دوسری جانب سے ہوا آکر اسے دوسری طرف زمین بوس کر دیتی ہے اور یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہتا ہے اسی طرح مؤمن بھی ہر وقت بیماریوں ،حوادث اور پریشانیوں کی زد پر رہتا ہے جبکہ منافق نہ تو بیمار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی غم دل پر کھاتا ہے البتہ ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ وہ اچانک جان دیتا ہے اور اس دنیا سے اس کا رابطہ یک دم ختم کر دیا جاتا ہے نہ مال، نہ اولاد اور نہ ہی دوست وغیرہ اس کے کام آتے ہیں جیسے صنوبر کا درخت سیدھا آسمان کی طرف بڑھتا ہے اور جنگل کے درختوں میں نمایاں قد، تنہ اور حُسن حاصل کرتا ہے لیکن ایک دن اس پر آسمانی بجلی گرتی ہے اور اس کا استیصال ہو جاتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "عن ابن عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم قال:ان من الشجر شجرة لایسقط ورقهاوهی مثل المؤمن ،حَدِّثونی ماهی؟قال عبدالله فوقع الناس فی شجر البوادی ووقع فی نفسی انهاالنخلة فقال النبی صلی الله علیه وسلم :هی النخلة فاستَحییتُ یعنی ان اقول ،قال عبدالله فَحَدّثتُ عمربالذی وقع فی نفسی،فقال لَاَن تکون قُلتَهااَحَبُّ اِلَیَّ من ان یکون لی کذاوکذا". (حسن صحیح)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں گرتے (یعنی ہمیشہ ہر موسم میں وہ تازہ رہتا ہے) اور وہ درخت مومن کی طرح ہے مجھے بتائیں وہ کون سا درخت ہے؟ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ لوگ جنگل کے درختوں میں سوچنے لگے جبکہ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کھجور ہی ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے، پس میں شرمندہ ہو رہا تھا یعنی یہ بتانے سے (کہ وہ کھجور ہے) عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ (گھر میں) وہ بات جو میرے دل میں تھی میں نے عمرؓ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا اگر تم بتا دیتے تو وہ میرے لئے اتنے اتنے مال سے بھی زیادہ خوش افزا ہوتا۔

قولہ: "لایسقط ورقھا" یہ وجہ تشبیہ بھی ہو سکتی ہے اور دوسرا قرینہ جواب پر بھی ہو سکتا ہے جبکہ پہلا قرینہ جُمار تھا جیسا کہ بخاری وغیرہ کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جُمار لایا گیا آپؐ نے ہاتھ میں لیا اور یہ سوال پوچھا جُمار کھجور کے تنے کا گودا ہوتا ہے جو چربی کی طرح سفید اور نرم سا ہوتا ہے، نمکین بھی ہوتا ہے، شہد کے ساتھ کھاتے ہیں۔

اس حدیث میں مومن کی تشبیہ کھجور کے درخت کے ساتھ دی گئی ہے عارضہ میں ہے کہ کوئی چیز مومن کے مساوی و برابر نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ کعبہ بھی، لیکن تمثیلات ہر طرح کی جائز ہے۔ اس کی وجہ تشبیہ ایک یہ ہے کہ جس طرح کھجور کبھی بھی اپنے لباس سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح مؤمن بھی لباس التقوی سے عاری و مجرد نہیں ہوتا اور جس طرح کھجور کی ہر حالت نفع بخش ہے اسی طرح مؤمن کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، مشورہ لینا اور ہر طرح کی مشارکت میں فائدہ ہی فائدہ ہے، جس طرح کھجور کاٹنے کے بعد بھی مفید ہے اس کے پتوں اور تنے کا نفع منقطع نہیں ہوتا ہے اسی طرح مومن کی موت کے بعد بھی اعمال کے فوائد جاری رہتے ہیں۔ نیز کھجور کے درخت کے سر سے اگر پانی گذر جائے تو وہ خشک ہو جاتا ہے یا اس کا سر کاٹا جائے تو بھی وہ مر جاتا ہے اسی طرح مؤمن کا حال ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی مومن کی مثال کھجور کے ساتھ دی "**وضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء**"۔ (سورۂ ابراہیم: آیت: ۲۵) یعنی جس طرح کھجور کی جڑ مضبوط اور فوائد و اغراض عالی ہیں اسی طرح مومن کا ایمان مضبوط و محکم اور نفع عالی ہے۔ کھجور ہر سال پھلتا ہے، مومن ہر سال زکوٰۃ دیتا ہے، کھجور کی تابیر ہوتی ہے اور مومن کو تعلیم دی جاتی ہے۔

اس حدیث سے کئی مسائل بھی معلوم ہوئے، مثلاً اپنے طلبہ کا وقتاً فوقتاً امتحان لینا، جواب پر قرینہ نصب کر لینا، اور یہ کہ جب حیاء سے مقصود فوت نہ ہوتا ہو تو خاموشی مذموم نہیں ہے، اور یہ کہ چھوٹوں کو بڑوں کے سامنے

خاموشی اختیار کر لینا افضل ہے، اور یہ کہ جس کے گھر میں ذہین و دیندار بچہ ہو تو اس سے خوشی ہونی چاہئے، دیگر وجہ حضرت عمرؓ کی خوشی کی یہ تھی کہ اگر ابن عمرؓ یہ جواب بروقت دیتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشی ہوتی جو حضرت عمرؓ کے لئے سُرخ اونٹوں کے گلے سے بھی زیادہ محبوب تھی۔ جن روایات میں اغلوطات سے ممانعت آئی ہے ان سے مراد ایسے اُلٹے سیدھے سوالات ہیں جن سے فائدہ ملحوظ نہ ہو بلکہ علماء کو پریشان کرنا، یا شرمندہ کرنا اور ان کا وقت ضائع کرنا ہو یا پھر اپنی بڑائی ثابت کرنا وغیرہ مذموم مقاصد ہوں۔

باب ماجاء مثل الصلوٰت الخمس

(نمازِ پنجگانہ کی مثال)

"عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَرَأَیتم لو ان نهراً بباب احدکم یغتسل فیه کل یوم خمس مرات هل یبقیٰ من درنه؟ قالوا: لایبقیٰ من درنه شیءٌ قال فذالک مثل الصلوٰت الخمس یمحو اللہ بهن الخطایا". (حسن صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بتایئے اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر کوئی نہر ہو، جس میں وہ روزانہ پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل بچے گا؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اس کے میل کچیل میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا! آپؐ نے فرمایا یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹاتا ہے۔

تشریح:۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ یہاں وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح آدمی کا بدن میل کچیل سے آلودہ ہوتا ہے اور غسل سے (خصوصاً صاف پانی سے جو جراثیم کُش بھی ہے) جسم بالکل صاف ہوجاتا ہے اور جب یہ عمل مکرر ہو تو جسم ہروقت صاف ستھرا رہتا ہے، اسی طرح جب آدمی وضو کرتا ہے تو اس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور چونکہ گناہ پریشانیوں کے بھی اسباب ہیں اس لئے جب آدمی وضو کرتا ہے تو اسبابِ ہموم کے مٹنے کی وجہ سے پریشانیاں بھی ختم یا کم ہوجاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نے خواب میں غسل کیا تو اس کی پریشانیاں ختم ہوں گی اور دَین ادا ہوگا۔ باقی کون سے گناہ معاف ہوتے ہیں صغائر یا کبائر؟ تو یہ بحث کتاب کے شروع میں گذری ہے۔

بابٌ (بلا ترجمہ)

(اس امت کی مثال بارش کی طرح ہے)

"عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :مثل امتى مثل المطر لايُدرىٰ اَوّله خير ام آخره؟". (حسن غريب وصححه ابن حبان من حديث عمار)

میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر اس کا؟

تشریح:۔ اس حدیث کے بارے میں تین آراء ہیں:

ایک یہ ہے کہ یہ ضعیف ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

دوسری حافظ ابن عبدالبرؒ کی ہے جو اس کو ظاہر پر حمل کرتے ہیں اس تقدیر پر یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ مابعد کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ کے بعض سے افضل آسکتا ہے وہ اسی باب کی حدیث کے ظاہر سے استدلال کرتے ہیں۔

تیسری رائے جمہور کی ہے جو پہلی دونوں آراء کے خلاف ہے جمہور کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ امت کے بہترین لوگ ہیں مابعد کے زمانہ میں کوئی ایسا شخص نہیں آسکتا جو صحابہ کرامؓ سے افضل ہو، جمہور کہتے ہیں کہ اس حدیث کے دو مطلب ہیں:

ایک یہ کہ اس میں افضلیت کی بات نہیں بلکہ نفع کی بات ہوئی ہے اور نفع کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں لہٰذا اس حدیث میں یہ امکان بیان کیا گیا ہے کہ مابعد میں ایسے لوگ آسکتے ہیں جن سے اہل اسلام کو بہت زیادہ نفع ہو مثلاً صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں تدوین کتب اور مناظروں کی ضرورت نہیں تھی مگر بعد میں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی تصنیفات امت کے ایک بڑے حصے کے لئے مفید بن گئیں یہ ایک جزوی فضیلت ہوگئی جو کلی فضیلت کے منافی نہیں پس صحابہ کرامؓ کو کلی فضیلت حاصل ہے اور مابعد والوں کو جزوی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے جیسے ایمان بالغیب ہوا، لہٰذا قیامت تک امت میں وقتاً فوقتاً اچھے اچھے لوگ پیدا ہوں گے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہاں صحابہ کرامؓ کا زمانہ بلکہ خیر القرون کا زمانہ جو کہ ابتداء حقیقی ہے اس موازنہ میں شامل ہی نہیں ہے کیونکہ فصل بغیر پہلی بارش کے اُگتی نہیں البتہ مابعد کی بارشیں کبھی ایک وقت میں مفید ہوتی ہیں اور کبھی دوسرے وقت میں جبکہ اولین بارش جو بیج کے لئے ناگزیر ہے وہ تو لامحالہ افضل ہے پس صحابہ کرامؓ وتابعینؒ اور تبع تابعینؒ تو امت کے افضل لوگ ہیں ہی ان کی بات تو اور ہے یہ موازنہ مابعد کے لوگوں

میں مراد ہے۔ (کذا فی الکوکب الدری)

باب ماجاء مَثَلُ ابن اٰدم واَجَلِه وَاَمَلِه

(آدمی اور اس کی موت اور امید کی مثال)

"عن بُریدة قال قال النبی صلی الله علیه وسلم :هل تدرون مامثل هذه وهذه ورَمیٰ بحصاتین ؟قالو االله ورسوله اعلم،قال هٰذاک الاَمَلُ وهٰذاکَ الاجل". (حسن غریب)

حضرت بُریدہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ اور وہ کس کی مثال ہیں؟ اور (اس کے ساتھ) آپؐ نے دو کنکریاں پھینکیں (ایک قریب اور دوسری دور) صحابہؓ نے عرض کیا اللہ ورسوله اعلم، آپؐ نے فرمایا وہ (دور والی) تمنا اور امید ہے اور یہ (قریب کی کنکری) اجل ہے۔

تشریح: ۔قوله: "هٰذاک" اس میں ھاء تنبیہ کے لئے اور کاف خطاب کے لئے ہے اصل میں "ذا" ہے، دونوں کنکریاں اگر چہ ایک ساتھ نہ تھیں ایک دور تھی لیکن دونوں آپؐ کے قریب تھیں اس لئے اشارہ ایک طرح کے لفظ کے ساتھ صحیح ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ابن اٰدم اپنی زندگی سے زیادہ طویل المدتی منصوبے بناتا ہے۔ اس مضمون کی حدیث ابواب صفۃ یوم القیمۃ میں گذری ہے۔ فلیتذکر وہاں نقشہ بھی دیا گیا ہے۔

حدیث ابن عمرؓ: ۔"عن ابن عمر قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :انماالناس کاِبِلٍ مائة لایجدالرجلُ فیهاراحلة". (حسن صحیح)

بے شک لوگ سو/۱۰۰ اونٹوں کی طرح ہیں کہ آدمی اس میں نہ پائے عمدہ سواری۔

قوله: "راحلة" طاقت ور اُونٹ و مضبوط جوان اونٹنی کو کہتے ہیں جو ہر قسم کے سفر کے لئے موزوں ہو راحلۃ میں تاء تانیث کے لئے نہیں ہے اس لے اونٹ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے تو جس طرح سو اونٹوں میں بمشکل ایک عمدہ سواری مل سکتی ہے اسی طرح انسانوں کی صلاحیتیں بھی مختلف ہیں اگر ان کے اندر با اخلاق اور زاہد اور شریف موصوف باوصاف مرضیہ تلاش کیا جائے تو سو میں بھی ایک کا ملنا مشکل ہے کیونکہ اس حدیث کی دوسری سند میں ہے "لاتجد فیهاراحلة" یعنی سو میں بھی ایک نہیں ملے گا۔

حدیث آخر: ۔"عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال:اِنَّمامثلی وَمَثَلُ اُمَّتی کمثل رجل استوقدناراً فجعلتِ الدوابُّ والفَراشُ یقعن فیهافاناآخذبِحُجزِکم

وانتم تَقَحَّمُونَ فيها". (حسن صحيح)

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری اور میری امت کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے کوئی آگ جلائی، پس جانور اور پروانے اس میں گرنے (کودنے) لگے تو میں تمہیں کمر سے پکڑتا ہوں (کہ آگ میں نہ جاؤ) اور تم اس میں پوری قوت سے گھسے جا رہے ہو۔

قولہ: "الفراش" بفتح التاء پتنگے اور پروانے۔ قولہ: "بِحُجَزِ" بضم الحاء وفتح الجیم کمر پر ازار باندھنے کی جگہ چونکہ اس جگہ سے پکڑنے کی صورت میں گرفت مضبوط ہوتی ہے اس لئے اس کی تخصیص فرمائی یعنی میں تمہیں مقدور بھر کوشش کر کے روکتا ہوں لیکن لوگ پتنگوں کی طرح جہنم کی آگ کی طرف کودتے، بڑھتے اور گھستے چلے جا رہے ہیں تو جس طرح میں پورا زور لگاتا ہوں بچانے کے لئے اسی طرح لوگ بھی جہنم میں جانے کی پوری کوشش کرتے ہیں کیونکہ تقحم قوت کے ساتھ داخل ہونے کو کہتے ہیں۔

اس حدیث میں لوگوں کی تشبیہ پروانوں کے ساتھ دینے کی وجہ خواہشات کی تاریکی میں اندھا پن ہے کہ جس طرح پروانے اندھیروں سے آگ کی طرف بھاگتے ہیں اور اپنے انجام سے بالکل بے خبر رہتے ہیں اسی طرح دنیا کے لوگ ہیں۔ اور آگ جلانے کا مطلب محرمات بیان کرنا ہے لیکن محرمات کے بجائے آگ کا ذکر فرمایا کہ ایک تو آگ جلانے کا مقصد آس پاس کے ماحول کو روشن کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے اندر جانا مراد نہیں لیکن لوگ اس مقصد کو نظر انداز کرتے ہیں۔ دوم چونکہ دنیا کی آگ جہنم کی آگ کے مشابہ ہے اس لئے لفظ نار استعمال کیا۔

آخری حدیث:۔ "عن ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنما أجَلُكم فيما خلا من الأُمم كما بين صلوٰة العصر الىٰ مغارب الشمس، وانما مَثَلُكم ومَثَلُ اليهود والنصارىٰ كرجل استعمل عُمّالاً فقال: من يعمل لي إلىٰ نصف النهار على قيراطٍ قيراطٍ؟ فعمِلتِ اليهود على قيراط قيراط قال: من يعمل لي من نصف النهار الى صلوٰة العصر على قيراط قيراط فعمِلت النصارىٰ على قيراط قيراط، ثم انتم تعملون من صلوٰة العصر الى مغارب الشمس على قيراطين قيراطين فَغَضبت اليهود والنصارىٰ وقالوا نحن اكثر عملاً واقل عطاءً فقال: هل ظَلَمتُكُم من حقكم شيئاً؟ قالوا "لا" قال: فانه فضلي اوتيه من اَشاءُ". (حسن صحيح)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری مدتِ عمر (زندگی) ان امتوں کی بنسبت جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں ایسی ہے جیسے عصر کی نماز اور غروب آفتاب کے درمیان کا وقت ہے

اور تمہاری مثال اور یہود و نصاریٰ کی مثال بس اس شخص کی طرح ہے جس نے کام کے لئے مزدور لگائے پس اس نے کہا کون ہیں؟ جو میرے لئے دو پہر تک کام کریں ایک ایک قیراط پر؟ پس یہود نے ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر اس شخص نے کہا کون ہیں جو میرے لئے دو پہر سے نمازِ عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کریں؟ پس نصاریٰ نے ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر تم لوگ کام کر رہے ہو عصر کی نماز سے غروب آفتاب تک دو دو قیراطوں پر، پس یہود و نصاریٰ غضب ناک ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم نے محنت زیادہ کی اور مزدوری کم پائی (یعنی ہمارا کام ان آخری اجیروں سے زیادہ ہے تو اجرت بھی زیادہ ہونی چاہئے) پس مالک نے کہا کیا میں نے تمہارے حق میں سے کچھ کمی کی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں پس مالک نے کہا یہ میری مہربانی ہے میں جسے چاہوں دوں!

تشریح:۔ بعض حضرات نے اس حدیث کا مطلب یہ لیا ہے کہ دنیا کی مدت صرف اتنی باقی ہے جتنا وقت عصر سے مغرب تک ہوتا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں کیونکہ اس طرح تو قیامت کی آمد کا وقت بآسانی معلوم ہو سکے گا جو خلافِ نصوص قطعیہ ہے، اس لئے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ تقابل اس امت کی مدت کا سابقہ امتوں کی مُدّتوں سے ہے مدتِ دنیا سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے یعنی جو لوگ ہم سے پہلے گذرے ہیں ان کی عمریں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں جبکہ اس امت کے افراد کی اوسط عمر ساٹھ ستر سال ہے لہٰذا سابقہ امتوں کے لوگوں نے لمبی اور طویل زندگیوں میں بہت زیادہ اعمال کئے لیکن اس امت مرحومہ کی نیکی کم از کم دس گنا بڑھا دی گئی جبکہ لیلۃ القدر و دیگر اَزمنہ واَمکنہ مبارکہ اس کے علاوہ ہیں، پس اُن کا عمل زیادہ مگر ثواب ہم سے کم ہوا۔

ترمذی میں جو مثال بیان ہوئی ہے یہ اُن یہود و نصاریٰ کی ہے جو نسخ مذاہب سے پہلے فوت ہوئے اور جو یہود حضرت عیسیٰؑ کو نہیں مانتے تھے یا وہ یہود و نصاریٰ جو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لا سکے یعنی نسخ مذاہب کے بعد مر گئے ان کی مثال دوسری ہے جو بخاری شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث میں ہے یعنی ان کا اجر باطل ہو گیا ہے۔ (''باب الاجارۃ من العصر الی اللیل من کتاب الاجارۃ'' بخاری ص:۳۰۲ ج:۱، قدیمی کتب خانہ) یہ مکالمہ یا تو قیامت کے دن ہوگا جسے تیقّن کی بناء پر ماضی سے تعبیر کیا یا پھر بزبانِ حال مراد ہے۔ قولہ: ''قیراط'' نصفِ دانق ہوتا ہے اور دانق درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے۔ غرض اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے زیادہ ثواب سے نوازا ہے، اے اللہ! ہمیں بھی اپنا فضل اور اپنی رضا عطا فرما!

آخر ابواب الامثال ویلیہ ابواب فضائل القرآن ان شاء اللہ تعالیٰ

راہِ معرفت

کائنات انسان قیامت

○ تخلیقِ کائنات اور اس کا حیرت انگیز نظام

○ حیاتِ انسانی کے لئے خالق کی نعمتوں اور حکمتوں کا بیان

○ قیامت کا ظہور اور جنّت و جہنم کے احوال

تالیف

مولانا کمال الدین المسترشد

خادم الاحادیث النبویۃ ۔ جامعہ مخزن العلوم

قدیمی کتب خانہ ۔ مقابل آرام باغ ۔ کراچی ۱

شائقینِ علومِ قرآن کے لئے انمول تحفہ

زادِ یسیر فی علوم التفسیر (اردو)

تاریخ وعلوم القرآن | علوم التفسیر

اقسام تفسیر | تعارف کتب تفاسیر

تالیف
حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
خادم الاحادیث النبویہ، جامعہ اسلامیہ مخزن العلوم

قدیمی کتب خانہ
مقابل آرام باغ۔ کراچی ۱

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

میں تو اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی اخلاق

تالیف

مولانا محمد ہارون معاویہ
فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
واستاد مدرسہ عربیہ قاسم العلوم میرپورخاص

قدیمی کتب خانہ
آرام باغ کراچی

ڈاکٹر العریفی کی انتہائی دلچسپ اور مفید کتاب

اِسْتَمْتِعْ بِحَیَاتِكَ کا مکمل اردو ترجمہ

زندگی کو خوشگوار بنایئے

اُسوۂ رسول اکرم ﷺ اور اکابر ملت کے طرزِ عمل کی روشنی میں معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے طریقے

مصنف: ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمٰن العریفی

مترجم: معراج محمد بارقؔ

قدیمی کتب خانہ

آرام باغ کراچی